تجربہ وہ ہے جو دوسروں سے سیکھا جائے
کیوں کہ اپنا تجربہ تو ــــــــــــــ
ہمیشہ محرومی کی قیمت پر حاصل ہوتا ہے

قیمت فی پرچہ ـــــ تین ۳ روپے

سبق آموز واقعات

مرتبہ

مولانا وحید الدین خاں

مکتبہ الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

اشاعت اول ۱۹۸۲ قیمت تین روپیہ

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انسان کی زندگی میں جو واقعات پیش آتے ہیں وہ گویا تاریخ کی عملی کتاب کے اوراق ہیں۔ یہاں زندگی کی تمام حقیقتیں اپنے واقعاتی روپ میں متشکل ہو رہی ہیں۔ زندگی کی تلخیاں اور شیرینیاں، کردار کی پستیاں اور بلندیاں اور خارجی حقائق کے مقابلہ میں انسان کی رسائی اور نارسائی سب یہاں کسی نہ کسی کی زندگی میں صورت پذیر ہو رہی ہیں، سب کو تاریخ کے واقعاتی اسٹیج پر دیکھا جا سکتا ہے۔

تاہم دیکھنے کی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ زندگی کے واقعات کو بس ایک سرسری تماشائی کی نظر سے دیکھا جائے۔ یہ دیکھنا گویا کیمرہ جیسا دیکھنا ہے جو دیکھتا ہے مگر نصیحت نہیں لیتا۔ وہ دیکھنے کے بعد بھی کچھ نہیں پاتا۔

دوسرا دیکھنا یہ ہے کہ ان واقعات کو "انسان" کی نظر سے دیکھا جائے۔ یعنی آدمی جو کچھ دیکھے ان پر وہ غور بھی کرے۔ اس کی آنکھ نے جو کچھ پایا ہے اس کو وہ اپنے دماغ سے بھی پانے کی کوشش کرے۔

بظاہر دونوں دیکھنا بالکل یکساں معلوم ہوتا ہے۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے ان میں اتنا زیادہ فرق ہے کہ صرف دوسری قسم کے دیکھنے ہی کو دیکھنا کہا جا سکتا ہے۔ پہلی قسم کا دیکھنا ایسا ہی ہے جیسے نہ دیکھنا۔ انسان کے اندر اعلیٰ ترین صلاحیت فہم و بصیرت کی صلاحیت ہے۔ آدمی جس چیز کو فہم و بصیرت کی سطح پر نہ پائے اس کو انسان کا پانا نہیں کہا جا سکتا۔

انسان کی زندگی اپنی متنوع صورتوں کے ساتھ ہر قسم کے واقعات کا ریکارڈ ہے۔ ہر انسان کی زندگی میں دوسرے انسان کے لئے سبق موجود ہے۔ آدمی اگر آنکھ کھول کر دنیا میں رہے تو اپنے ہم جنسوں کے واقعات میں وہ اتنی کافی رہنمائی پالے کہ ہر قسم کے نشیب و فراز کو سمجھ کر زندگی گزارنا اس کے لئے ممکن ہو جائے۔ وہ ہر ٹھوکر سے دور رہے، وہ ہر پست حرکت سے اپنے آپ کو بچائے، وہ ہر نادانی میں پڑنے سے محفوظ رہے۔

مگر کوئی انسان اپنے گرد و پیش کے واقعات سے سبق نہیں لیتا۔ آدمی کسی حقیقت کو اس وقت تک نہیں مانتا جب تک اس کو ذاتی طور پر اس کا تجربہ نہ ہو جائے۔ مگر تجربہ وہی ہے جو دوسروں سے حاصل ہو، کیونکہ اپنا تجربہ تو ہمیشہ ہلاکت کی قیمت پر حاصل ہوتا ہے۔

انسانی واقعات سے نصیحت لینے کے لئے عبرت کی نگاہ درکار ہے، اور یہی وہ چیز ہے جو ہر دور کے انسانوں میں سب سے کم پائی گئی ہے۔

وحیدالدین

۱۶ اکتوبر ۱۹۸۱

لکھنے کی دو قسمیں

ایک بہت بڑے شاعر کو میں نے ایک بار دیکھا۔ وہ ایک غزل لکھ رہے تھے۔ غزل کا آخری لفظ تھا: "انساں بنا دیا"۔ میں نے دیکھا کہ کاغذ کے کنارے انھوں نے بہت سے ہم وزن الفاظ لکھ رکھے ہیں۔ مثلاً گلستاں، چمستاں، زنداں، خموشاں، ویراں، بہاراں وغیرہ۔ ان الفاظ کو ذہن میں رکھ کر مضامین سوچتے ہیں اور جب کوئی مضمون اس ردیف وقافیہ میں ڈھل جاتا ہے تو اس کو فوراً کاغذ پر لکھ لیتے ہیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ دو گھنٹے کے بعد وہ اس پوزیشن میں تھے کہ مشاعرہ میں یہ کہہ سکیں کہ: "تازہ غزل حاضر ہے"۔

میں نے بزرگ شاعر سے کہا: آپ کو اللہ تعالےٰ نے غیر معمولی صلاحیت دی ہے۔ آپ اردو، عربی، فارسی اور انگریزی زبانوں سے بخوبی واقف ہیں۔ آپ کو تو نثر کی چیزیں لکھنی چاہئیں۔ اس قسم کی شاعری آپکے شایانِ شان نہیں"۔ انھوں نے جواب دیا: تم سچ کہتے ہو۔ مگر نثر میں لکھنے کے لئے مطالعہ اور تحقیق کی ضرورت ہے، اور وہ مجھ سے ہوتی نہیں۔ اگر مطالعہ اور تحقیق کے بغیر نثر لکھوں تو ایک پارۂ ادب ضرور تیار ہو جائے گا۔ مگر ایسی کوئی کتاب نہیں بن سکتی جس کی آج کی دنیا میں قدر وقیمت ہو"۔

یہ شعر کی مثال تھی۔ اب دیکھئے کہ ایک "کتاب" کس طرح لکھی جاتی ہے۔

ایک امریکی لاری کولنس (Larry Collins) اور فرانسیسی ڈامینیک لیپری (Dominique Lapierre) نے مل کر ہندوستان کی آزادی پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے: "نصف شب کی آزادی" اس کتاب کی تیاری میں ان کے چار سال سے زیادہ لگے۔ انھوں نے لندن کے اخبار ٹائمس میں اشتہار دیا کہ جن لوگوں نے ۴۷۔۱۹۴۰ کے درمیان ہندستان میں کام کیا ہے، وہ اپنے پتے سے ہم کو مطلع کریں۔ جواب میں ان کو دو ہزار خطوط ملے۔ انھوں نے ان تمام لوگوں کے پاس اپنی ٹیم بھیج کر انٹرویو لئے اور رپورٹ تیار کی۔ انھوں نے ہندستان، پاکستان اور برطانیہ کے تین سفر کئے اور مختلف جاننے والوں سے مل کر بارہ ہزار انٹرویو تیار کئے۔ ان کی تحقیق اور دستاویزات اور انٹرویو کے کاغذات کا وزن ایک ٹن سے زیادہ تھا۔ مگر ان کے فرانس کے دفتر میں ان کو اس طرح ترتیب سے رکھا گیا تھا کہ ان کی خاتون سکریٹری کسی مخصوص کاغذ کو صرف ایک منٹ میں نکال سکتی تھی۔

اب انھوں نے کتاب لکھنا شروع کی۔ نصف حصہ کالنس نے انگریزی میں لکھا اور بقیہ نصف لیپری نے فرانسیسی میں۔ ہر ایک دوسرے کے لکھے ہوئے کو دیکھتا، اور بے رحمانہ تنقید کرتا۔ جب دونوں مطمئن ہو جاتے تو آخری مسودہ کو ایک مقامی کسان کی بیوی کو پڑھنے کے لئے دیتے۔ اگر خاتون یہ کہتی کہ میں ٹھیک سے سمجھ نہ سکی تو وہ فرض کر لیتے کہ ابھی کچھ غلطی ہے اور اس حصہ کو دوبارہ لکھتے۔ آخری ایک سال انھوں نے روزانہ اٹھارہ گھنٹے کام کیا اور اس طرح اپنی کتاب تیار کی۔

مصنف نے یہ تفصیل بتاتے ہوئے انٹرویور سے کہا:

We lived like hermits,
and we produced ---
'Freedom at Midnight'

ہم نے رہبانوں کی طرح زندگی بسر کی اور پھر ہم نے اپنی کتاب تیار کر لی۔

ایک کو کیچڑ دکھائی دیا، دوسرے کو ستارے

ڈیل کارنیگی کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے:

How to Stop Worrying and Start Living

اس کتاب میں اس نے جنگ عظیم ثانی کا ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔

ٹامسن ایک امریکی فوجی تھا۔ اس کی ڈیوٹی کیلی فورنیا کے صحرائے موجاوی (Mojave) میں تھی۔ اس کی بیوی (Thelma Thompson) اپنے شوہر سے قریب رہنے کے لئے وہاں گئی اور قریب کی ایک بستی میں مکان لے کر رہنے لگی۔ تھوڑے دنوں رہنے کے بعد اسے محسوس ہوا کہ یہ جگہ اس کی پسند کے بالکل خلاف ہے۔ گرمی، ریت اور آندھی ہر وقت وہاں اس کا استقبال کرنے کے لئے موجود رہتے تھے۔ اس کے ساتھ تنہائی، کیونکہ اس کے شوہر کا بیشتر وقت فوجی گشت میں گزرتا تھا۔ اس کے واحد ساتھی اس کے دیہاتی پڑوسی تھے۔ مگر وہ لوگ انگریزی بالکل نہیں جانتے تھے، اس لئے وہ ان سے بھی مانوس نہ ہوسکی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس جگہ کو چھوڑ دے اور اپنے گھر واپس چلی جائے۔ اس نے اپنے والدین کو ایک مایوسانہ خط لکھا اور ان کو بتایا کہ وہ جلد ہی ان کے پاس لوٹ آنا چاہتی ہے۔

اس کے باپ کا جواب آیا۔ مگر وہ بہت مختصر تھا۔ باپ نے اپنے خط میں صرف دو سطریں لکھی تھیں:

Two men looked out from prison bars.
One saw the mud, the other saw the stars

دو آدمیوں نے قیدخانہ کے جنگلے سے باہر نظر ڈالی۔ ایک کو کیچڑ دکھائی دیا۔ دوسرے کو ستارے۔

ان دو سطروں نے اس کی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا۔

اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اسی صحرائی گاؤں میں رہے گی اور یہاں اپنے لئے بہتر زندگی بنائے گی۔ اس نے محسوس کیا کہ جہاں کیچڑ ہیں، وہیں اس کے اوپر ستارے بھی چمک رہے ہیں۔ اس نے "کیچڑ" کے بجائے "ستاروں" کو دیکھنے کی کوشش شروع کر دی۔ اس نے مقامی لوگوں میں اپنے دوست بنائے۔ ان کا کلچر اور زبان سیکھی۔ اس نے صحرائی زندگی کی رنگا رنگیوں کو سمجھا۔ اس نے صحرا میں ڈوبتے اور نکلتے ہوئے سورج کے حسن کا مشاہدہ کیا۔ دھیرے دھیرے اس کو اس علاقہ سے اتنی دلچسپی ہوگئی کہ اس کا شوہر جب اپنی فوجی ملازمت سے ریٹائر ہوا تو دونوں نے طے کیا کہ وہ اپنی آئندہ زندگی اسی مقام پر گزاریں گے حتیٰ کہ اس نئے تجربہ نے مسز ٹامسن کو ایک مصنف بنا دیا۔ اس نے اپنے تجربات کے متعلق ایک کتاب (Bright Ramparts) کے نام سے لکھی جو بے حد مقبول ہوئی اور اس کے کثیر ایڈیشن شائع ہوئے۔

اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے ایک مصنف نے لکھا ہے:

The most important thing about suffering is
not what happens to us but how we react to it

زیادہ اہم بات یہ نہیں ہے کہ ہمیں کن مشکلوں سے سابقہ پیش آرہا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ہم ان کے مقابلہ میں کس قسم کا ردعمل ظاہر کرتے ہیں۔

مرداں چنیں کنند

لارڈ ٹامسن (۱۹۷۶ — ۱۸۹۴) کی پیدائش کناڈا میں ہوئی ۔ انھوں نے اخبارات کو صنعت کی حیثیت سے شروع کیا اور اس میں اتنی کامیابی حاصل کی کہ آج تک اخبارات کے کسی بھی دوسرے تاجر نے حاصل نہ کی تھی۔ کناڈا، برطانیہ، امریکہ اور دوسرے ملکوں کے ایک سو سے زیادہ اخبارات "ٹامسن ایمپائر" کا حصہ تھے۔

ٹامسن بے حد شریف آدمی تھا۔ اخلاقی حیثیت سے کبھی اس سے کسی کو شکایت نہیں ہوئی ۔ ایڈیٹروں کے انتخاب میں وہ انتہائی چھان بین کرتا تھا۔ مگر جب کسی شخص کو کسی اخبار کا ایڈیٹر مقرر کردیتا تو اس کو اپنے دائرہ عمل میں مکمل آزادی دے دیتا تھا۔ حتیٰ کہ اس کے اڈیٹروں کو یہ حق بھی تھا کہ وہ خود ٹامسن کے خلاف مضامین لکھ سکیں۔

ٹامسن کی سوانح عمری رسل بریڈن نے لکھی ہے جس کا نام ہے :

Roy Thomson of Fleet Street

سوانح نگار لکھتا ہے کہ ٹامسن کی واحد کمزوری یہ تھی کہ وہ "لارڈ" بننے کا بہت زیادہ حریص تھا۔ اس نے دیکھا کہ اپنے ملک کناڈا میں اس کی یہ تمنا پوری نہ ہوسکے گی۔ کیونکہ کناڈا نے لارڈ کا خطاب دینے کے برطانوی طریقے کو ختم کردیا تھا۔ چنانچہ ٹامسن نے برطانوی شہریت اختیار کرلی۔

اسے یقین تھا کہ برطانیہ آنے کے بعد وہ ضرور لارڈ بننے کا خواب پورا کرسکے گا۔ مگر یہاں بھی ایک رکاوٹ سامنے آگئی۔ ہیرولڈ میکملن کے بعد لارڈ ہوم برطانیہ کے وزیراعظم (۶۴ — ۱۹۶۳) مقرر ہوئے۔ ٹامسن کے مشہور اخبار "ٹائمز" کے ایڈیٹر اس وقت ڈینس ہملٹن تھے۔ انھیں اس تقرر پر اعتراض تھا ۔ انھوں نے خاموش رہنے کے بجائے کھلم کھلا نئے وزیر اعظم کے خلاف لکھنا شروع کردیا۔

ٹامسن کے لئے یہ ایک انتہائی نازک صورت حال تھی۔ انھوں نے اپنے اڈیٹر کو گفتگو کے ذریعے قائل کرنے کی کوشش کی۔ مگر جب وہ اپنی رائے بدلنے پر تیار نہ ہوا تو انھوں نے اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔ بلکہ یہ کہہ کر معاملہ کو ختم کردیا:

What you say is your own province

یعنی یہ تمھارے اپنے دائرہ کار کا معاملہ ہے۔ تم کو اختیار ہے کہ جو کچھ لکھنا چاہتے ہو لکھو۔

برطانوی شہریت اختیار کرنے کے باوجود ٹامسن کے لئے اب بظاہر "لارڈ" بننے کا امکان ختم ہوچکا تھا۔ ان کا اخبار برابر برطانوی وزیر اعظم پر تنقیدی مضامین شائع کررہا تھا۔ مگر سر ایلک ڈگلاس ہوم نے بھی عالی ظرفی سے کام لیا۔ صاحب اقتدار ہوتے ہوئے بھی انھوں نے اپنے دل میں ٹامسن کے خلاف کوئی انتقامی جذبہ پیدا ہونے نہیں دیا۔ اور ان کے لئے لارڈ کے اعزاز کی منظوری دے دی۔

یہی عالی ظرفی ہے جو افراد اور قوموں کو ترقی کے اعلیٰ مقام کی طرف لے جاتی ہے۔

قابلیت اور مستعدی

راجہ مہندر پرتاپ (۱۹۷۹-۱۸۸۶) ہندوستان کے ان لوگوں میں ہیں جنھوں نے روس جاکر ولادیمیر لینن (۱۹۲۴-۱۸۷۰) سے ملاقات کی تھی۔ وہ ۱۹۱۹ میں آزادی پسندوں کے ایک وفد کے ساتھ لینن سے ملے تھے۔ وہ جب اشتراکی روس کے پہلے حکمراں کے کمرے میں داخل ہوئے تو لینن کھڑا ہو گیا۔ کمرے کے ایک گوشہ سے وہ خود ہی ایک چھوٹی آرام کرسی اٹھا کر لایا۔ راجہ مہندر پرتاپ کہتے ہیں کہ میں آرام کرسی پر بیٹھا اور میرے ساتھ قریب کے ایک چھوٹے صوفہ پر لینن بیٹھ گیا۔ لینن کا پہلا جملہ یہ تھا:

In which language should I speak : English, German, French or Russian

میں کس زبان میں بولوں۔ انگریزی میں، جرمن میں، فرانسیسی میں یا روسی میں۔ بالآخر طے ہوا کہ انگریزی زبان میں گفتگو ہو۔ راجہ مہندر پرتاپ نے اپنی ایک کتاب لینن کو پیش کی۔ اس کتاب کا نام تھا ——— پریم دھرم

The Religion of Love.

لینن نے کتاب کو ہاتھ میں لیتے ہی فوراً کہا: "میں اس کتاب کو پڑھ چکا ہوں"۔ راجہ مہندر پرتاپ کہتے ہیں کہ میں حیران ہوا کہ لینن کو آخر یہ کتاب کہاں سے ملی۔ پوچھنے پر لینن نے بتایا کہ پچھلے دن شام کو جب آپ میرے سکریٹری سے ملاقات کا وقت مقرر کرنے کے لئے ملے تھے تو آپ نے سکریٹری کو اس کتاب کا ایک نسخہ دیا تھا۔ سکریٹری نے آپ کا تعارف کرتے ہوئے یہ کتاب مجھے دکھائی۔ میں نے کتاب اس سے لے لی اور رات ہی کو اسے پڑھ ڈالا تاکہ کل صبح میں جس شخص سے ملنے والا ہوں، اس کے خیالات سے واقف ہو جاؤں"۔

لینن جدید روس کا بانی ہے۔ وہ غیر معمولی صلاحیتوں والا آدمی تھا۔ اوپر کے واقعہ سے اس کی دو خصوصیات کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک قابلیت، دوسرے مستعدی۔ اس نے تعلیم اور مطالعہ میں اتنی محنت کی تھی کہ وہ چار مختلف زبانیں جانتا تھا اور بیک وقت چاروں زبانوں میں گفتگو کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اسی کے ساتھ اس کی مستعدی کا عالم یہ تھا کہ دنیا کا انتہائی مصروف حکمراں ہونے کے باوجود ایک غیر معروف ہندستانی کی کتاب اس نے راتوں رات محض اس لئے پڑھ ڈالی کہ کل کے دن وہ جس سے ملنے والا ہے اس کے خیالات کا اس کو پیشگی اندازہ ہو جائے۔ اس نے اپنی فطری صلاحیتوں کو بھرپور طور پر بروئے کار لانے کی کوشش کی اور اسی کے ساتھ عمل کے مواقع پر بھرپور عمل کیا، وہ دنیا کا ایک کامیاب لیڈر بن گیا۔

اسلام کی خدمت کا میدان ہو یا غیر اسلام کی خدمت کا، وہی لوگ دنیا میں کوئی بڑا کام کرتے ہیں جو ان دو خصوصیات کا ثبوت دیں، ایک طرف وہ وقت کے مطابق مکمل علمی قابلیت رکھتے ہوں۔ دوسرے وہ اپنی کارکردگی میں پوری طرح مستعدی کا ثبوت دیں۔ قابلیت اور مستعدی کے ان ضروری اوصاف کے بغیر نہ اسلام کا کوئی کام کیا جا سکتا ہے اور نہ غیر اسلام کا۔

اپنے خلاف

۱۔ ۱۹۷۱ میں آسٹریلیا کے وزیر اعظم اور پارلیمنٹری لبرل پارٹی کے صدر مسٹر جان گارٹن تھے۔ پارٹی میں ان کے خلاف شکایت پیدا ہوئی۔ اس کے بعد پارٹی کی پارلیمنٹری باڈی کی میٹنگ ہوئی جو قاعدہ کے مطابق انھیں کی صدارت میں تھی۔ میٹنگ میں ان کے خلاف عدم اعتماد کی تجویز پیش ہوئی۔ اس وقت حاضر ممبران ۶۶ تھے۔ ووٹ جب لئے گئے تو دونوں طرف ۳۳، ۳۳ ووٹ پڑے۔ یعنی تحریک کے موافق اور مخالف دونوں برابر ہو گئے۔ اب فیصلہ صدر کے ایک زائد ووٹ سے ہونا تھا۔ صدر نے اپنا زائد ووٹ استعمال کیا۔ مگر خود اپنے خلاف۔ اس طرح انھوں نے خود اپنے ہی ووٹ سے شکست کھائی۔ اس کے بعد وہ پارٹی کی صدارت سے علیحدہ ہو گئے اور کہا: جب ممبران کی اتنی بڑی تعداد صدر کے خلاف ہے تو صدر، صدر باقی رہنے کے قابل نہیں۔ (الجمعیۃ ویکلی ۲۰ جولائی ۱۹۷۳)

۲۔ انیسویں صدی کے وسط کی بات ہے۔ پھلواری شریف (بہار) میں دو رئیس رہتے تھے۔ ایک کا نام قاضی غلام امام اور دوسرے کا قاضی مخدوم عالم تھا۔ دونوں رشتہ دار تھے۔ کسی وجہ سے دونوں میں جھگڑا ہو گیا اور مقدمہ بازی کی نوبت آ گئی۔ مخدوم عالم سرکاری ملازمت میں تھے۔ اسی دوران ان کا تبادلہ دور کے مقام پر ہو گیا جہاں سے پٹنہ کی عدالت میں تاریخوں پر حاضری سخت مشکل تھی۔ انھوں نے چاہا کہ اپنے مقدمہ کی پیروی کے لئے کسی کو مقرر کر دیں۔ کافی سوچنے کے بعد جب کوئی موزوں آدمی سمجھ میں نہ آیا تو وہ اپنے فریق مخالف قاضی غلام امام کے پاس گئے اور کہا کہ میں تبدیل ہو کر ایسی جگہ جا رہا ہوں کہ مقدمہ کی پیروی خود نہیں کر سکتا۔ یہ تمام کاغذات آپ کے حوالے ہیں۔ اب آپ ہی میری طرف سے مقدمہ کو دیکھیں۔ یہ کہہ کر انھوں نے قاضی غلام امام کو اپنے مقدمہ کے کاغذات دئے اور سفر پر روانہ ہو گئے۔

قاضی غلام امام کے لئے اس اعتماد کو مجروح کرنا ناممکن تھا جو ان کے فریق نے ان پر کیا تھا۔ انھوں نے مخدوم عالم کے مقدمہ کی پیروی کا کام اپنے ذمہ لے لیا اور خود اپنے کاغذات کسی دوسرے کے حوالے کر دئے۔ اب صورت یہ ہوئی کہ قاضی غلام امام کے اپنے مقدمہ کی پیروی تو دوسرا شخص کر رہا ہے اور وہ خود اپنے فریق مخالف قاضی مخدوم امام کی طرف سے مقدمہ کی پیروی کر رہے ہیں۔ اور یہ سب مصنوعی طور پر نہیں بلکہ حقیقی طور پر۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خود ہار گئے اور ان کے مخالف قاضی مخدوم عالم جیت گئے (حسب روایت جعفر شاہ پھلواری، مطبوعہ زندگی ستمبر ۱۹۸۰)

یہ بہادری اور اعلیٰ ظرفی کی بات ہے کہ آدمی اصول کے آگے جھک جائے، نہ کہ وہ اصول کو خود اپنے آگے جھکائے۔ وہ نقصان اور فائدہ اور عزت اور بے عزتی کے خیالات سے اوپر اٹھ کر اصول کے تقاضوں کو اپنا لے۔ اسی طرح یہ آدمی کی بہادری اور اعلیٰ ظرفی ہے کہ اگر اس کا مخالف بھی اس کے اوپر اعتماد کرے تو وہ اس کے اعتماد کو مجروح نہ کرے۔

بلند اخلاقی کی ایک مثال

۲۷ ستمبر ۱۹۷۶ کی بات ہے۔ پنڈی جوئلرس (چاندنی چوک دہلی) میں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ یہ سردار بشن سنگھ ہیں۔ ۲۸۔ بی ساؤتھ ایکسٹنشن پارٹ ۲، نئی دہلی میں رہتے ہیں۔ وہ ضلع راولپنڈی کے باشندے تھے۔ تقسیم کے بعد یہاں چلے آئے۔ راولپنڈی سے ۳۰ میل کے فاصلہ پر گوجرخاں ایک قصبہ ہے، وہاں ان کی زمینداری تھی۔ اسی کے ساتھ وہ اس وقت آنریری مجسٹریٹ بھی تھے۔

انھوں نے اپنے زمانہ کے انگریز افسران کے بہت سے واقعات بتائے۔ ان میں سے ایک واقعہ مسٹر مارسڈن (Marsdon) کا تھا جو اس وقت راولپنڈی میں ڈپٹی کمشنر تھے۔ ۱۹۴۲ کا واقعہ ہے، مسٹر مارسڈن سردار صاحب کے قصبہ میں آئے۔ ان کو گوجرخان کی تحصیل کا معائنہ کرنا تھا۔ تحصیل جانے سے پہلے سردار صاحب سے ملاقات ہوئی۔ سردار صاحب نے خواہش ظاہر کی کہ دوپہر کا کھانا میرے ساتھ کھائیے۔ مسٹر مارسڈن نے دعوت قبول نہ کی اور وہ تحصیل چلے گئے۔ کچھ دیر بعد دوبارہ مسٹر مارسڈن کی کار سردار صاحب کے مکان کے سامنے رکی۔ وہ باہر نکلے تو سردار صاحب نے کہا: اگر آپ نے میری دعوت قبول کر لی ہوتی تو اتنی دیر میں میں نے کھانا تیار کرا لیا ہوتا اور آپ کھانا کھا کر یہاں سے جاتے۔ انگریز ڈپٹی کمشنر نے اب بھی سردار صاحب کی کھانے کی دعوت قبول نہ کی۔ البتہ اپنی لڑکی کو جو اس وقت ساتھ تھی سردار صاحب کے مکان پر چھوڑ دیا اور کہا کہ یہ کل تک آپ کے یہاں رہے گی۔ آپ جو کچھ کھلانا چاہتے ہیں اس کو کھلائیے۔ سردار صاحب حیرت میں تھے کہ یہ معما کیا ہے۔ ڈپٹی کمشنر صاحب خود تو ایک وقت کھانے کے لئے تیار نہیں ہیں اور لڑکی کو کئی وقت کے لئے چھوڑے جا رہے ہیں۔ ان کو متعجب دیکھ کر مسٹر مارسڈن نے کہا: اصل بات یہ ہے کہ راولپنڈی میں میرے کچھ عزیز آئے ہوئے ہیں مجھے وہاں پہنچ کر ان کے ساتھ کھانا کھانا ہے، کیونکہ میں ان سے وعدہ کر چکا ہوں۔ مگر میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ لوگوں پر یہ تاثر ہو کہ ڈپٹی کمشنر صاحب یہاں آئے اور انھوں نے آپ کے مکان پر کھانا نہیں کھایا۔ اس سے آپ کی عزت پر اثر پڑے گا۔ آپ کی عزت کو بچانے کے لئے میں لڑکی کو آپ کے یہاں چھوڑے جا رہا ہوں:

I want to keep your prestige

بڑا آدمی وہ ہے جو دوسرے کے بارے میں بھی اتنا ہی حساس ہو جتنا کوئی شخص اپنے بارے میں ہوتا ہے۔ جو دوسرے کی بے عزتی کو اپنی بے عزتی سمجھے اور دوسرے کی عزت کو اپنی عزت۔

اعتراف

بھوپال کے قریب ایک گاؤں کا واقعہ ہے۔ لوگ عام طور پر جاہل اور نماز وغیرہ سے بے تعلق تھے۔ ایک عالم اس گاؤں میں جانے لگے۔ انھوں نے لوگوں کو غیرت دلائی اور ان کو جوڑ کر نماز پر آمادہ کیا اور وہاں جمعہ بھی قائم کیا۔ اب وہاں پنج وقتہ نماز اور جمعہ ہونے لگا۔

اس کے بعد ایسا ہوا کہ شاہ محمد یعقوب مجددی (۱۳۴۹ - ۱۲۰۳ھ) کا اس گاؤں میں جانا ہوا۔ اگلے دن جمعہ تھا۔ لوگوں نے کہا کہ آپ کل تک یہاں ٹھہریں اور کل آپ ہی یہاں جمعہ پڑھائیں۔ حضرت شاہ صاحب کی نظر مسئلہ پر گئی۔ انھوں نے کہا کہ ایسے چھوٹے گاؤں میں مسئلہ کی رو سے جمعہ کی نماز جائز نہیں۔ یہ کہہ کر وہ شہر واپس آگئے تاکہ یہاں جمعہ کی نماز ادا کر سکیں۔

اس کے بعد مذکورہ عالم کا اس گاؤں میں جانا ہوا۔ انھوں نے دیکھا کہ وہاں نماز کا نظام ٹوٹ گیا ہے۔ لوگوں نے اپنے گاؤں میں نماز جمعہ کی ادائگی چھوڑ دی اور کسی بڑے مقام پر بھی جمعہ پڑھنے کے لئے نہیں گئے۔ لوگوں نے شکایت کی کہ آپ نے یہاں جمعہ قائم کر دیا اور حضرت پیر صاحب آئے تھے تو انھوں نے بتایا کہ اس گاؤں میں جمعہ کی نماز جائز ہی نہیں۔ چنانچہ ہم نے جمعہ پڑھنا چھوڑ دیا۔

مذکورہ عالم یہ صورت حال دیکھ کر بہت پریشان ہوئے اور فوراً روانہ ہو کر حضرت شاہ صاحب کے پاس پہنچے۔ انھوں نے حضرت شاہ صاحب سے پوچھا کہ کیا آپ نے گاؤں والوں سے یہ کہا ہے کہ یہاں جمعہ کی نماز جائز نہیں۔ حضرت شاہ صاحب نے کہا ہاں میں نے کہا ہے۔ اور مسئلہ تو یہی ہے۔ مذکورہ عالم نے کہا کہ حضرت آپ درست فرماتے ہیں۔ مگر صورت حال یہ ہے کہ اس گاؤں کے لوگ نماز چھوڑے ہوئے تھے۔ ان کو کہہ سن کر نماز کی طرف متوجہ کیا ہے۔ شرائط جمعہ کے مسائل اپنی جگہ صحیح ہیں۔ مگر ابھی ان لوگوں میں اتنی رغبت نہیں کہ وہ جمعہ کی خاطر سفر کر کے باہر جائیں اور مرکزی مقام پر جمعہ کی نماز ادا کریں۔ ان کے مزاج کی رعایت کرتے ہوئے میں نے وہاں جمعہ کی نماز شروع کرادی تھی تاکہ کسی طرح وہ عادی ہو جائیں۔

حضرت شاہ محمد یعقوب مجددی نے یہ سنا تو فرمایا کہ آپ بالکل صحیح کہتے ہیں۔ مجھ سے غلطی ہو گئی۔ اس کے بعد اگلے جمعہ کو وہ دوبارہ گاؤں میں گئے اور لوگوں سے کہا کہ مذکورہ عالم کا جمعہ قائم کرنا بالکل صحیح تھا۔ "اصل یہ ہے کہ میں نے متن دیکھا تھا، حاشیہ نہیں دیکھا۔ حاشیہ میں وہ مسئلہ موجود ہے جو مولوی صاحب نے تم لوگوں کو بتایا۔ اب تم لوگ پہلے کی طرح یہاں نماز جمعہ ادا کرو" اس کے بعد خود وہاں کے لوگوں کے ساتھ نماز جمعہ ادا کی۔ اور پھر شہر واپس آئے۔

ہمت کے ذریعہ

سیف اللہ خاں (پیدائش ۱۹۵۲) ایک نوجوان انجینئر ہیں۔ وہ ٹونک (راجستھان) کے ایک شریف خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے گھر کے مالی حالات اچھے نہ تھے۔ ہائر سکنڈری میں انھوں نے سائنس لی تھی مگر اچھے نمبر نہ لاسکے۔ ہائر سکنڈری کا نتیجہ آیا تو اس نے ان کو صرف یہ خبر دی کہ وہ "علم کے دروازہ" میں داخل ہونے کی کوشش میں ناکام ہو چکے ہیں۔

سیف اللہ خاں بازی ہار چکے تھے مگر وہ ہمت نہیں ہارے تھے۔ ہائر سکنڈری کے امتحان میں ناکامی نے ان کے اندر حوصلہ کا ایک نیا طوفان پیدا کر دیا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ گھر کے حالات ان کے لئے مزید تعلیمی جدوجہد کے سلسلہ میں حوصلہ افزا ثابت نہ ہوں گے۔ انھوں نے ایک نئے اقدام کا فیصلہ کیا۔ وہ اپنا آبائی وطن ٹونک چھوڑ کر بھوپال چلے گئے اور جاتے ہوئے یہ کہہ گئے کہ اب میں ٹونک اسی وقت واپس آؤں گا جب کہ میں انجینیرنگ کی ڈگری حاصل کرلوں۔

سیف اللہ خاں بھوپال میں اکیلے تھے۔ مگر اکیلے ہو کر انھوں نے اپنے کو زیادہ طاقت ور بنا لیا تھا۔ اب نہ ان کے شاعر دوست تھے جو اپنی "تازہ غزل" سنا کر ان کا وقت چھیننے کی کوشش کریں۔ نہ گھر کے وہ حالات ان کے سامنے تھے جو ان کے ذہن کو مسلسل منتشر کرتے رہتے تھے۔ نہ وہ ماحول تھا جو ان کی ناکامی کو یاد دلا کر ان کے حوصلے پست کر دیتا تھا۔ اب وہ تھے اور ان کی جدوجہد تھی۔ انھوں نے ٹیوشن کے ذریعہ اپنی ضروریات کا انتظام کیا اور خاموشی کے ساتھ تعلیمی محنت میں لگ گئے۔ ہر سہارے کا ٹوٹنا ان کے لئے زیادہ بڑا سہارا بن گیا۔ کیوں کہ اس نے ان کی چھپی ہوئی تمام قوتوں کو جگا دیا تھا۔

سیف اللہ خاں نے بھوپال میں اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے بے پناہ جدوجہد کی۔ پہلے انھوں نے انجینیرنگ کا ڈپلوما لیا۔ اس کے بعد ان کو بھوپال میں ایک ملازمت مل گئی۔ اب وہ ٹیوشن کی دوڑ دھوپ سے آزاد ہو گئے۔ تاہم انھوں نے تعلیم نہیں چھوڑی۔ ملازمت کے دوران ہی انھوں نے بھوپال سے ۷۰ میل دور ودیشہ کے انجینیرنگ کالج میں داخلہ لیا اور بالآخر وہاں سے انجینیرنگ کی ڈگری حاصل کرلی۔ تقریباً آٹھ سال تک ان کا معمول یہ تھا کہ صبح ۴ بجے اٹھنا، دو گھنٹہ ریل کے سفر کے بعد ودیشہ پہنچنا، وہاں کلاس میں حاضری دے کر واپس آنا اور پھر ملازمت کی ڈیوٹی انجام دینا، اور اس سے فراغت کے بعد کورس کی کتابیں پڑھنا۔ اس دوران ان کے گھر میں کئی اتار چڑھاؤ آئے۔ بھوپال کے تقریباً دس سالہ قیام میں ان کو طرح طرح کے خطوط ملتے رہے۔ مگر وہ ہر خط کو پڑھ کر نہایت خاموشی سے رکھ دیتے۔ وہ یکسوئی کے ساتھ ۱۰ سال تک اپنے عہد پر قائم رہے۔ انھوں نے کسی بات کا اثر لئے بغیر اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ اپنے لئے کامیاب زندگی حاصل کرنے کی تڑپ نے ان کے اندرونی احساس کو اتنا طاقتور کر دیا کہ تمام ناموافق حالات کے باوجود انھوں نے اپنا سفر جاری رکھا اور بالآخر اپنی منزل پر پہنچ گئے۔

کام پر انعام

روس کے سابق وزیر اعظم مسٹر خردشچیف اور مسٹر بلگانن ۱۹۵۶ میں ہندستان آئے تھے۔ مسٹر خردشچیف کو بتایا گیا کہ دہلی یونیورسٹی نے طے کیا ہے کہ آپ کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دے۔ انھوں نے طنزیہ انداز میں کہا :

In Russia we have to work for it

روس میں اس کے لئے ہمیں کام پیش کرنا پڑتا ہے (ٹائمس آف انڈیا ۱۲ جون ۱۹۸۰) کسی قوم کی زندگی کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ اس میں خطابات اور مناصب اور اعزازات حقیقی کام کی بنیاد پر دئے جاتے ہوں نہ کہ سیاست اور خوشامد کی بنیاد پر۔ اہلیت کی بنیاد پر جب کسی کو کوئی اعزاز ملتا ہے تو لوگ اس کو ایک ہونے والے واقعہ کی حیثیت سے قبول کر لیتے ہیں۔ لوگوں کے اندر یہ جذبہ ابھرتا ہے کہ ہم بھی اسی طرح محنت کریں تاکہ ہم کو بھی یہ مقام ملے۔ اس کے برعکس جب اہلیت کے بغیر کسی کو کوئی اعزاز دیا جائے تو لوگوں کے اندر اس کا سخت ردعمل ہوتا ہے۔ اب ایک دوسرے کے بارے میں بے اعتمادی کی فضا پیدا ہوتی ہے۔ محنت کرکے پانے کا جذبہ سرد پڑ جاتا ہے۔ اس کے بجائے اِدھر اُدھر کی تدبیروں سے حاصل کرنے کا جذبہ فروغ پاتا ہے اور بالآخر پورے سماج کی فضا خراب ہو جاتی ہے۔

اہلیت کے بجائے دوسری بنیادوں پر انعام دینے کا رواج خود ہمارے مذہبی اداروں میں بھی چل پڑا ہے۔ آج ایک مذہبی ادارہ میں سب سے بڑی لیاقت نیازمندی ہے اور سب سے بڑی نااہلی یہ ہے کہ آدمی نیازمند بن کر نہ رہتا ہو۔ ایک آدمی اگر اپنے گروپ کا ہے تو اس کے ساتھ فیاضی کا معاملہ کیا جائے گا اور اگر وہ اپنے گروپ کا نہیں ہے تو اس کے ساتھ تنگ ظرفی کا معاملہ ہوگا۔ کوئی شخص تنقیدی مزاج رکھتا ہو تو ان اداروں میں اس کی کوئی قیمت نہ ہوگی اور جو آدمی ہاں میں ہاں ملاتا ہو وہ ہر قسم کے اعزاز کا مستحق سمجھا جائے گا خواہ وہ کتنا ہی نااہل کیوں نہ ہو۔

اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ہمارے تمام اداروں میں علم اور محنت کی فضا ختم ہو گئی ہے جہاں مقام حاصل کرنے کے لئے محنت اور قابلیت غیر اہم چیزیں بن جائیں، وہاں کسی کے اندر محنت او قابلیت کا شوق کیوں پیدا ہوگا۔ آدمی اسی چیز پر اپنی توجہ لگاتا ہے جس کو وہ اپنے لئے عزت اور ترقی کا ز سمجھتا ہو۔ جب عزت اور ترقی محنت اور قابلیت کے بغیر سستی چیزوں کے ذریعہ مل رہی ہو تو کون احمق ہ جو سستی چیز کو چھوڑ کر مہنگی چیز کا خریدار بنے۔

فرشتہ کا ٹیلیفون

وہ ایک ڈاکٹر تھا۔ زندگی بہت مصروف تھی۔ دولت کی بارش اور پیشہ کی سرگرمیوں میں دین کا کوئی خانہ نہ تھا۔ اس کو یہ موقع ہی نہ تھا کہ وہ دینی کتابیں پڑھے یا دینی موضوعات پر کچھ سوچ سکے۔ اس کے پاس آنے والے سب وہی ہوتے تھے جو اس کے پیشہ کے تقاضوں کے اعتبار سے اس سے ملنے کے لئے آتے تھے۔ البتہ ایک شخص کبھی کبھی اس کے یہاں آتا تھا اور دین کے بارے میں اس سے بات کرتا تھا۔ مگر یہ گفتگو ہمیشہ ناتمام ختم ہو جاتی تھی۔ آنے والے آدمی کو تھوڑی دیر کے بعد محسوس ہوتا کہ ڈاکٹر اس قسم کی گفتگو کو غیر اہم سمجھ کر اس سے بے توجہ ہو رہا ہے۔ چنانچہ وہ آدمی خود ہی اپنی گفتگو کو ختم کرکے تھوڑی دیر ادھر اُدھر کی باتیں کرتا اور اس کے بعد چلا جاتا۔

ایک روز ڈاکٹر اپنے گھر کے کمرہ میں اکیلا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ "ہلو" کے تبادلہ کے بعد دوسری طرف سے آواز سنائی دی "میں جبریل بول رہا ہوں۔ خدا تم کو بلانا چاہتا ہے ۔ ۔ ۔" آواز عجیب بھیانک تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی غیر انسانی مخلوق انسانی زبان میں بول رہی ہے۔ ڈاکٹر پر ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ وہ کچھ جواب نہ دے سکا۔ اور رسیور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ کچھ دیر بعد جب اس کے ہوش و حواس درست ہوئے تو اس نے سوچنا شروع کیا کہ یہ کیسی آواز تھی جو ٹیلیفون پر سنائی دی کہ "میں جبریل بول رہا ہوں۔ خدا تم کو بلانا چاہتا ہے"۔ سنی ہوئی آواز اس کو لفظ لفظ یاد تھی۔ مگر اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ معاملہ کیا ہے اور اس کے جواب میں اس کو کیا کرنا چاہئے۔ اس نے اپنے تمام دوستوں کو ٹیلی فون کر ڈالا اور ہر ایک سے پوچھتا رہا۔ مگر کسی نے یہ نہیں کہا کہ اس نے ڈاکٹر کو اس قسم کا ٹیلی فون کیا ہے۔

ڈاکٹر کئی روز تک اسی سوچ میں پڑا رہا۔ ٹیلی فون پر سنی ہوئی بھیانک آواز کسی طرح اس کی یاد سے نہیں نکلتی تھی۔ آخر ایک روز مذکورہ آدمی آیا۔ ڈاکٹر نے اس سے اپنے واقعہ کا ذکر کیا۔ آدمی ایک منٹ خاموش رہا اور اس کے بعد بولا: یہ تمہارے نام فرشتہ کا پیغام تھا۔ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ تم کو حج پر جانا چاہئے۔ ڈاکٹر کی سمجھ میں یہ بات آگئی۔ اس نے فوراً تیاری شروع کر دی۔ اور پہلا موقع آتے ہی حج کے لئے روانہ ہو گیا۔ ڈاکٹر کا حج اس کی زندگی کا بڑا تاریخی واقعہ تھا۔ حج کے دوران اس پر عجیب کیفیت طاری رہی۔ اس کو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ رب کعبہ کے مخصوص بلاوے پر دیار حرم میں حاضر ہوا ہے۔ واپس آنے کے بعد چہرہ پر داڑھی اور پنج وقتہ نمازوں کے اہتمام نے بتایا کہ ڈاکٹر اب نیا انسان بن چکا ہے۔

ڈاکٹر کی زندگی میں یہ انقلاب اس لئے آیا کہ "جبریل" کی آواز سن کر اس نے سمجھا کہ براہ راست آسمان سے اس کو پکارا جا رہا ہے۔ جب کہ مذکورہ شخص کی تبلیغ اس کو محض ایک انسان کی آواز معلوم ہوتی تھی۔ تاہم اگر آدمی کی فطرت بیدار ہو جائے تو اس کو "ٹیلی فون" پر جبریل کی آواز سننے کی ضرورت نہیں۔ اس کو نظر آئے گا کہ ستاروں سے لے کر درختوں تک ہر چیز خاموش زبان میں وہی پیغام دے رہی ہے جس کو ڈاکٹر نے "جبریل" کی طرف سے ٹیلی فون کی زبان میں سنا۔
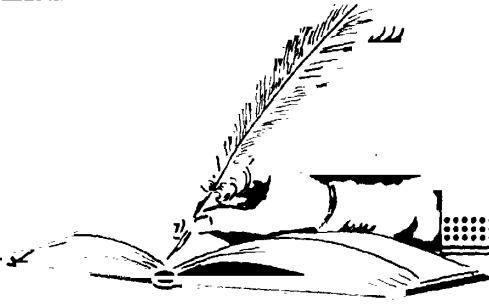
یہ ۳۱ جنوری ۱۹۷۶ء کا واقعہ ہے جب کہ راقم الحروف لیبیا جاتے ہوئے ۳۶ گھنٹے کے لئے روم (اٹلی) میں ٹھہرا تھا۔ روم کی یادوں میں سے ایک یاد وہ جرمن پادری ہے جس سے وہاں میری ملاقات ہوئی:

Dr. Hans Georg Asmussen
P r o p s t
Beselerstrabe 28-2240 Heide
Telefon (0481) 3220
W Germany.

ایک موقع پر میں نے دیکھا کہ موصوف عربی انجیل کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ اس سے میں نے سمجھا کہ وہ عربی زبان جانتے ہیں۔ گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ مجھے بائبل اور اس سے متعلق لٹریچر کے مطالعہ کا شوق ہے۔ میرے پاس انگریزی میں چھپی ہوئی چیزیں موجود ہیں۔ مگر میں بائبل کا مکمل عربی ترجمہ حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

میرا مقصد صرف ناشر کا پتہ پوچھنا تھا تاکہ وہاں سے عربی بائبل منگائی جا سکے۔ مگر پادری موصوف نے ناشر کا پتہ بتانے کے بجائے خود میرا پتہ دریافت کیا اور اپنی ڈائری میں میرا پتہ نوٹ کرتے ہوئے کہا: میں آپ کو عربی بائبل بھجواؤں گا۔

اس واقعہ کو تقریباً ایک برس گزر چکا تھا اور میں نے سمجھ لیا تھا کہ پادری صاحب یا تو اپنا وعدہ بھول گئے یا انھوں نے کتاب روانہ کی اور وہ کسی وجہ سے مجھ تک نہیں پہنچی۔ مگر فروری ۱۹۷۷ کی ایک تاریخ کو ڈاک میں ایک پیکٹ ملا۔ کھولا تو اس کے اندر پرانے اور نئے عہدنامہ پر مشتمل "الکتاب المقدس" کا ایک نیا نسخہ موجود تھا۔ فولڈنگ جلد کے ساتھ بائبل پیپر پر چھپا ہوا یہ خوبصورت نسخہ ۱۶۸۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کو دیکھنے سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ روانگی میں تاخیر کا امکانی سبب کیا تھا۔ پرنٹ لائن کے مطابق بائبل کا یہ عربی نسخہ کوریا میں ابھی ۱۹۷۶ میں چھپا ہے۔ غالباً پادری موصوف کے پاس یا ان کے ادارہ میں عربی نسخے ختم ہو گئے تھے اور جب کوریا سے چھپ کر وہ انہیں پہنچے ہیں تو حسب وعدہ انھوں نے فوراً اس کی روانگی کا انتظام کیا۔

پادری موصوف کے نام جب میں نے شکریہ کا خط روانہ کیا تو خیال آیا کہ کاش ہم بھی اسی طرح "شکریہ کے خطوط" وصول کرنے کی پوزیشن میں ہوتے۔ آج ساری دنیا میں بے شمار لوگ ہیں جو قرآن کو اپنی زبان میں پڑھنا چاہتے ہیں۔ مگر ہم ان کو قرآن کے ترجمے ان کی زبان میں اس طرح فراہم نہیں کر سکتے جس طرح مسیحی حضرات دنیا کی تمام زبانوں میں اپنی مقدس کتاب کو

دوسروں تک پہنچا رہے ہیں۔

قرآن کے مطابق، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم بنی آدم کی طرف خدا کے آخری منذر (آگاہ کرنے والے) تھے۔ آپ نے قرآن کے ذریعے انذار کی یہ ذمہ داری ادا فرمائی اور اپنے بعد کتاب اللہ کو محفوظ حالت میں چھوڑ گئے کہ وہ قیامت تک لوگوں کے لئے آگاہی کا ذریعہ بنتی رہے۔

آپ کے بعد یہ قرآن کس طرح لوگوں تک پہنچے گا۔ اس کا ذریعہ امت محمدی ہے۔ امت محمدی کی پہلی اور لازمی ذمہ داری ہے کہ وہ قرآن کی آواز کو تمام اقوام عالم تک پہنچائے۔ مگر افسوس کہ آج ساری دنیا میں کوئی بھی ادارہ خاص اس مقصد کے لئے قائم نہیں۔ حتیٰ کہ مسلمان اپنی اس ذمہ داری کے شعور تک سے غافل ہو چکے ہیں۔

عجیب بات یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے تو یہ کہا تھا کہ میں "بنی اسرائیل کی کھوئی بھیڑوں" کے پاس بھیجا گیا ہوں، مگر آپ کے پیروؤں کے جوش تبلیغ نے مسیحیت کو ساری دنیا کے لئے قابل مطالعہ بنا دیا۔ اس کے برعکس پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح لفظوں میں اعلان فرمایا کہ میری بعثت سارے عالم کے لئے ہے مگر آپ کے پیروؤں کے اندر یہ آگ نہیں بھڑکتی کہ آپ کے پیغام کو سارے عالم تک پہنچائیں —— جرمن پادری کی طرف سے میں نے عربی بائبل کا نسخہ وصول کیا تو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ زبان حال سے کہہ رہا ہو: "دیکھو تم اسلام کا پیغام پھیلانے میں ناکام رہ گئے اور ہم ساری دنیا میں مسیحیت کا پیغام پہنچا رہے ہیں۔"

وحید الدین خاں (پیدائش ۱۹۲۵)

جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ۔ دہلی

خارجی ختم ہو گئے
خارجیت زندہ ہے

ایک بار خارجی فرقہ کے چالیس آدمیوں نے ابن زیاد کے دو ہزار سپاہیوں کو مار بھگایا تھا۔ اس پر ایک خارجی شاعر نے فاتحانہ نظم لکھی۔ چند اشعار یہ ہیں:

أألفا مومن فيما زعمتم
ويقتلكم بآسك اربعونا
كذبتم ليس ذاك كما زعمتم
ولكن الخوارج مومنونا
هي الفئة القليلة قد علمتم
على الفئة الكثيرة ينصرونا

کیا تم اپنے گمان کے مطابق دو ہزار مومن تھے اور تم کو مقام آسک پر صرف چالیس نے مار بھگایا، تم جھوٹے ہو اور تمہارا خیال غلط ہے، درحقیقت خوارج مومن ہیں، تم نے جان لیا کہ یہی وہ تھوڑی جماعت ہے جو بڑی جماعت پر غالب آتی ہے۔

خارجی شاعر کی اس دلیل کو آج کوئی بھی تسلیم نہیں کرے گا۔ مگر حیرت انگیز بات ہے کہ آج بھی ہمارے درمیان بے شمار لوگ ہیں جو اس قسم کی وقتی اور ظاہری کامیابیوں کو اپنی صداقت کا لازمی ثبوت سمجھتے ہیں —— خارجی فرقہ دنیا سے ختم ہو گیا، مگر خارجیت آج بھی دنیا میں زندہ ہے۔

غلطی میری

۱۹۵۴ء میں جب کہ میں بنارس ہندو یونیورسٹی میں انجینئرنگ کا طالب علم تھا، ایک واقعہ پیش آیا جو کہ اب تک مجھے یاد ہے۔ میرے استاد ڈاکٹر پران ناتھ نے لاپلاس ٹرانسفارم کو پڑھانا شروع کیا تو انھوں نے بتایا کہ اس سلسلے میں ایک دلچسپ کہانی ہے جو ہمارے موجودہ پرنسپل سے متعلق ہے۔ یہ پروفیسر ایم۔ سین۔ گپتا تھے جو اس وقت ہندو یونیورسٹی کے انجینئرنگ کالج کے پرنسپل تھے اور اب ریٹائر ہو چکے ہیں۔

پروفیسر گپتا مزید تعلیم کے لیے گلاسگو یونیورسٹی گئے تھے اور وہاں سے انھوں نے ٹاپ کیا تھا۔ گلاسگو کا پروفیسر ایک روز بلیک بورڈ پر ایک الیکٹریکل پرابلم کو حل کر رہا تھا۔ اس درمیان میں Differential Equation کا ایک سوال آ گیا۔ گلاسگو پروفیسر نے اس کو عام طریقے سے حل کیا جس میں کافی وقت لگا اور سارا بلیک بورڈ بھر گیا۔

پروفیسر گپتا نے اس موقع پر اپنے پروفیسر سے کہا: میرا خیال ہے کہ یہاں لاپلاس ٹرانسفارم کو اپلائی کیا جا سکتا ہے۔ اس سے یہ سوال بہت مختصر طریقہ سے حل ہو جائے گا۔ پروفیسر نے اس تجویز پر عمل کیا تو صرف دو لائنوں میں سوال حل ہو گیا۔ اگرچہ دونوں طریقوں کا آخری جواب ایک ہی تھا۔ مگر پروفیسر نے کہا: جب مختصر طریقہ ہمارے پاس موجود ہے تو لمبے طریقے کو اختیار کرنا ہی سرے سے غلط ہے۔ اس نے بلیک بورڈ پر اپنے حل کو مٹا دیا اور پروفیسر گپتا کے طریقہ کو لکھتے ہوئے کہا:

This is the only method یہی واحد طریقہ ہے۔

اسی قسم کا ایک اور واقعہ ۱۹۶۴ء کا ہے۔ حکومت ہند کی وزارت تعلیم نے امریکی حکومت کے ایجوکیشن ڈویژن کے تعاون سے "سمر اسکول فار ٹیچرس" کا ایک پروگرام شروع کیا۔ ہندوستانی شخصیتوں کے علاوہ تین امریکی پروفیسر آئے تھے۔ اس وقت میں چندولی پالی ٹکنیک میں سینئر لکچرر تھا اور اسی حیثیت سے چنڈی گڑھ کے اسکول میں شرکت کی تھی۔ یہ پہلا کورس تھا جو ۱۵ جون سے ۲۴ جولائی ۱۹۶۴ء تک ہوا۔

امریکی پروفیسر مچل نے ایک روز کلاس میں سوال کیا: .Who Are Creatives تخلیقی لوگ کون ہوتے ہیں۔ مختلف لوگوں نے مختلف نام لیے۔ ایک شخص نے کہا پوئیٹ (شاعر) پروفیسر نے کہا، کیا (What) پروفیسر مچل کی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ بار بار "واٹ" کہتے رہے اور ہمارے ساتھی بار بار "پوئیٹ" دہراتے رہے۔ بالآخر انھوں نے اس کی اسپلنگ بتائی: پی او ای ٹی۔ اب پروفیسر مچل سمجھ گئے کہ ہمارے ساتھی کی مراد شاعر سے ہے۔ مگر ہندوستانی اور امریکی تلفظ کے فرق کی وجہ سے وہ سمجھ نہیں پاتے تھے۔ کیونکہ ہندوستانی تلفظ اس لفظ کا پوئیٹ ہے جبکہ امریکی تلفظ میں اس کو پائیٹ کہتے ہیں۔ انھوں نے کہا:

You are right, I am wrong
because I am in your country

آپ صحیح ہیں۔ میں ہی غلطی پر ہوں۔ کیونکہ میں اس وقت آپ کے ملک میں ہوں۔

عبد المجیط خاں (پیدائش ۱۹۳۴)
پرنسپل گورنمنٹ پالی ٹکنیک فیض آباد

تاریخ ساز بنئے

ایک بزرگ نے ایک تعلیمی ادارہ قائم کیا۔ شروع شروع میں اس تعلیم گاہ کو بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اساتذہ کو وقت پر تنخواہیں نہ ملتیں۔ طلباء کے لیے بعض اوقات کھانے کا انتظام ناممکن ہو جاتا۔ چھپر کے سایہ کے نیچے تعلیم دی جاتی۔ اس طرح کی بے شمار دشواریوں کے درمیان اس درس گاہ کو سفر کرنا پڑا۔

مگر دشواریاں جس طرح آدمی سے کچھ چیزیں چھینتی ہیں، اسی طرح وہ اسے کچھ چیزیں دیتی بھی ہیں۔ ظاہری اسباب کی کمی عزم و ہمت کو بڑھانے کا سبب بنتی ہے۔ **ایسے جذبات اس کے اندر پیدا ہوتے ہیں جو فراوانی کے اندر کبھی پیدا نہیں ہوتے۔**

اس تعلیمی ادارے کے ابتدائی زمانہ کا واقعہ ہے ایک روز سارے ادارے میں اداسی چھائی ہوئی تھی۔ حالات بے حد نامساعد نظر آرہے تھے۔ درس گاہ کے ناظم نے طلبا و اساتذہ کا ایک اجتماع کیا جب وہ تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو بے اختیار ان کی زبان سے نکلا۔

"موجودہ حالات میں ممکن ہے آپ کا جی ملامت کرتا ہو کہ آپ کہاں آکر پھنس گئے۔ کسی بنی بنائی درس گاہ میں گئے ہوتے تو آرام سے رہ سکتے تھے۔ مگر یہ گھبرانے کی بات نہیں۔ کیونکہ دوسرے اگر حال کے وارث ہیں تو یہاں آپ ایک نئے مستقبل کی تعمیر کر رہے ہیں لوگ تاریخ خواں ہوتے ہیں مگر آپ کو قدرت نے ایک ایسے مقام پر کھڑا کیا ہے کہ آپ تاریخ ساز بن سکتے ہیں۔"

یہ الفاظ جن حالات میں کہے گئے تھے اس کے اعتبار سے وہاں اس نے بجلی کا کام کیا۔ طلبہ اور اساتذہ میں ایک نیا جوش پیدا ہو گیا۔ وہ زندگی کی ایک اعلیٰ ترین اخلاقی قدر سے آشنا ہوئے۔ یہ کہ مستقبل کی تعمیر کے لیے حال میں جدوجہد کی جائے۔ یہ قدر، نفسیاتی طور پر، اس وقت ان کے لیے لامعلوم رہتی جب کہ وہ ایسے حالات میں نہ ہوتے۔ اسی طرح ناظم درس گاہ کی زبان سے بھی ہرگز یہ الفاظ نہ نکلتے اگر وہ آسودگی اور فارغ البالی میں ہوتے۔ ناظم اسی لیے یہ الفاظ بول سکے اور سننے والے اسی لیے ان کو سمجھ سکے کہ وہ دشوار حالات میں تھے۔ آسانیوں کی فضا میں انھیں یہ سبق نہیں مل سکتا تھا۔

جو لوگ اپنے آپ کو مشکل حالات میں پائیں وہ اسے اپنی بدقسمتی تصور کرتے ہیں حالانکہ یہ صرف سمجھنے کی غلطی ہے اگر صحیح ذہن ہو اور عزم بیدار ہو تو مشکل حالات اس سے زیادہ بڑی چیزیں دیتے ہیں۔ جو آسانیوں اور راحتوں میں کسی کو ملتی ہے۔ دشواریاں آپ کو اعلیٰ ترین انسانی قدروں سے آشنا کرتی ہیں۔ آپ کے اندر سوز و درد پیدا کر کے آپ کے کلام کو بے پناہ بنا دیتی ہیں۔ مشکلات کو عبور کرنے کا نیا ولولہ پیدا کرتی ہیں اور بالآخر آپ کو ان بلند ترین انسانوں میں شامل کرتی ہیں جن کو تاریخ خواں کے مقابلے میں تاریخ ساز کہا جاتا ہے۔

اب خدا کے فضل سے یہ ادارہ "چھپر" کے دور سے نکل کر "بلڈنگ" کے دور میں داخل ہو چکا ہے اور تعلیم کے میدان میں ملت کو ایک نئی راہ دینے کے لیے کوشاں ہیں۔ ہر بار جب کوئی شخص نیا کام شروع کرتا ہے تو اس میں تذبذب کا مرحلہ لازماً آتا ہے، لیکن اگر وہ جما رہے تو استحکام کے مرحلہ پر پہنچنے سے بھی کوئی اسے روک نہیں سکتا۔

حوصلہ

نومبر کا مہینہ تھا اور رات کے تقریباً ۱۲ بجے کا وقت۔ طالب علم اپنے کمرہ میں سو رہا تھا۔ اس کی چارپائی کے پاس شلف میں مجلد کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ طالعبلم نے نیند کی حالت میں کروٹ لی اور اس کا ہاتھ شلف پر چلا گیا۔ اچانک وہ ایک چیخ کے ساتھ اٹھ بیٹھا۔ دیکھا تو ہاتھ کی انگلی میں دانت دھنسنے کا نشان تھا اور خون بہہ رہا تھا۔ "مجھے سانپ نے کاٹ لیا" وہ چلایا اور کمرہ کے باہر نکل آیا۔ اس کی آواز سن کر قریب کے کمروں کے لڑکے بھی جمع ہو گئے۔ اس وقت طالب علم کا جسم پسینہ سے تر تھا اور وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ دہشت کا یہ عالم تھا کہ ایک شخص نے علاج کی غرض سے نیم کی پتیاں لا کر دیں تو وہ بے تکلف ان پتیوں کو کھا گیا اور اسے کڑوے پن کا احساس تک نہیں ہوا۔

وہاں ایک اور طالب علم تھا جس کا پورا خاندان طبیبوں کا تھا۔ اس نے آکر (مارگزیدہ) طالب علم کا ہاتھ دیکھا۔ اس کے زخم پر نظر ڈالی" دانت تو ضرور دھنسے ہیں۔ مگر یہ دانت ......" اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے ایک ڈنڈا لیا اور کمرے میں روشنی کر کے اس کو اندر سے بند کر لیا۔ جو لوگ کمرہ کے باہر کھڑے تھے انھوں نے اندر سے ڈنڈا پیٹنے کی آواز سنی تو انھوں نے سمجھا کہ وہ سانپ کو مار رہا ہے۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد جب وہ طالب علم کمرہ سے باہر نکلا تو اس کے ہاتھ میں سانپ کے بجائے ایک مرا ہوا چوہا تھا جس کو وہ دُم سے پکڑ کر لٹکائے ہوئے تھا۔ "دیکھو یہ تھی وہ چیز جس نے تمہیں کاٹا ہے"۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "مجھے تمہاری انگلی کا زخم دیکھتے ہی شبہ ہو گیا تھا کہ یہ سانپ کا کاٹا نہیں ہو سکتا۔ چوہے کے دانت اور سانپ کے دانت میں فرق ہوتا ہے لیکن اگر میں یوں ہی کہتا تو تمہیں یقین نہ آتا۔ اس لیے میں نے چاہا کہ پہلے چوہے کو پکڑ کر ماروں اور اس کے بعد تمہیں بتاؤں کہ حقیقت کیا ہے۔"

یہ باتیں سن کر اور مرا ہوا چوہا دیکھ کر یکایک طالعبلم اٹھ بیٹھا۔ اب وہ بالکل اچھا تھا "مجھے یاد آیا" اس نے کہا "کل ہی میرے یہاں نئی کتابیں جلد بن کر آئی ہیں نئی جلدوں میں لئی کی بو پا کر اکثر چوہے آجاتے ہیں اور وہی قصہ یہاں بھی پیش آیا۔"

وہی طالب علم جس پر چند منٹ پہلے موت کی بدحواسی طاری تھی اب بالکل ہشاش بشاش اپنے ساتھیوں سے باتیں کر رہا تھا۔ حالانکہ اس کا کوئی علاج نہیں کیا گیا تھا۔ اس کو صرف یہ یقین دلا دیا گیا تھا کہ اس کو جس چیز نے ڈسا ہے وہ سانپ نہیں بالکل چوہا ہے۔

یہی حال ہماری قوم کا ہے۔ ہماری قوم اس وقت اپنے مسائل سے اس قدر پریشان ہے کہ زندگی کا حوصلہ تک اس سے رخصت ہو رہا ہے مگر یہ پریشانی حقیقی سے زیادہ نفسیاتی ہے۔ اگر قوم کے دل میں یہ بات اتاری جا سکے کہ تمہارا مسئلہ چوہے کا مسئلہ ہے نہ کہ سانپ کا مسئلہ تو قوم کی حالت بالکل بدل جائے گی اور وہ حوصلہ اور اعتماد کی ان تمام نعمتوں کو دوبارہ پالے گی جن کو وہ موجودہ حالت میں کھو چکی ہے۔

محمد خالد اعظمی (پیدائش ۱۹۲۸)
اردو ڈائجسٹ پریس۔ اسٹریٹ نمبر ۴
شاہدرہ، دہلی

ڈاکٹر تارا چند

جنھوں نے اسلامی تاریخ پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی۔

ڈاکٹر تارا چند (۱۹۷۳ - ۱۸۸۸) فارسی زبان بہت اچھی جانتے تھے۔ اسی لیے پنڈت نہرو نے ۱۹۵۲ء میں ان کو ایران کا سفیر مقرر کیا تھا۔ انھوں نے سراکبر (اپنشد کا فارسی ترجمہ، از دارا شکوہ) کو اڈیٹ کیا تھا جس کو حکومت ایران نے خصوصی اہتمام کے ساتھ چھپوایا۔

۱۹۱۳ میں انھوں نے میور سنٹرل کالج الہ آباد سے امتیاز کے ساتھ تاریخ میں ایم اے کیا۔ اس کے بعد وہ کائستھ پاٹھ شالہ (ڈگری کالج) میں استاد ہوگئے۔ کائستھ پاٹھ شالہ ٹرسٹ کے صدر کرنل رنجیت سنگھ ان کی صلاحیتوں سے متاثر ہوئے۔ انھوں نے ٹرسٹ کے اگزیکیٹو کے سامنے تجویز پیش کی کہ نوجوان استاد کو ریسرچ کے لیے یورپ بھیجا جائے۔ بیشتر ممبروں نے شدت سے اس تجویز کی مخالفت کی۔ مگر کرنل رنجیت سنگھ نے بزور اس تجویز کو منظور کرایا اور ان کے سفر کے تمام انتظامات کیے۔

اس کے بعد ڈاکٹر تارا چند آکسفرڈ گئے۔ وہاں وہ کوئنس کالج میں تین سال (۲۲ - ۱۹۱۹) رہے۔ اور ڈی فل کی ڈگری حاصل کی۔ ان کے مقالہ کا عنوان تھا، ہندوستانی کلچر پر اسلام کا اثر:

The influence of Islam
on Indian culture

حکومت ہند کی وزارت تعلیم کے تحت انھوں نے ہندوستان کی آزادی کی تاریخ پر چار جلدوں میں ایک کتاب لکھی۔ اس کتاب کی تیاری میں اپنی آخری زندگی کے ۱۴ سال صرف کیے۔ اس کتاب کی پہلی جلد ۱۹۶۱ میں اور چوتھی جلد ۱۹۷۳ میں شائع ہوئی۔

مسٹر سریش رام نے بجا طور پر لکھا ہے کہ یہ کتاب ڈاکٹر تارا چند کے غیر جانب دارانہ رائے قائم کرنے Dispassionate Judgment کا حیرت انگیز نمونہ ہے۔ ۱۹۳۷ء میں یوپی میں کانگریس کا مسلم لیگ کو وزارت میں شریک نہ کرنا ایک انتہائی نزاعی مسئلہ ہے۔ مگر اس کے بارے میں ڈاکٹر تارا چند نے لکھا:

Admitting that there could be two opinions concerning the constitutional propriety of the decision to refuse the appointment of the Muslim leaguers to the Congress cabinet, it is difficult to justify its wisdom. (Vol. iv, P. 238)

یہ مانتے ہوئے کہ کانگرس کابینہ میں مسلم لیگی نمائندوں کو شریک کرنے کی قانونی اہمیت پر دو رائیں ہو سکتی ہیں، اس کی معقولیت کو ثابت کرنا سخت مشکل ہے۔

نیشنل ہیرلڈ (لکھنؤ)، ۷ نومبر ۱۹۷۳

ڈاکٹر تارا چند کا خاتمہ بظاہر اس بات کی علامت تھا کہ غیر مسلموں میں وہ نسل اب ختم ہوگئی جو اردو، عربی، فارسی زبانیں جانتی ہو اور اسلامی تاریخ اور مسلم تہذیب کے پس منظر میں سوچنے کی علمی صلاحیت رکھتی ہو۔ مگر حالیہ برسوں میں پٹرول کی کرامت نے از سر نو عربی اور فارسی کو زندہ کر دیا ہے۔ اب مسلمانوں سے زیادہ غیر مسلم ان موضوعات میں داخلے لے رہے ہیں۔ یہ بھی شاید بالواسطہ طور پر اس حدیث نبوی کی تصدیق ہے کہ یہ دین ہمیشہ زندہ رہے گا۔ سیاسی اور زمانی انقلابات کبھی اس میں کامیاب نہ ہوں گے کہ خدا کے دین کو ماضی کی چیز بنا کر تاریخ کی الماری میں بند کر دیں۔

حادثات ہیرو بنا دیتے ہیں

۳۱ اگست ۱۹۷۶ کا واقعہ ہے۔ دہلی کے روزری اسکول (نزد ریڈیو کالونی) کے میدان میں لڑکے جمع تھے۔ اتنے میں ایک کالا سانپ نکلا اور ایک چھ سالہ بچے کو لپیٹ لیا۔ بچہ چیخنے لگا اس کے ساتھی بھی چیختے ہوئے بھاگے۔ چیخ پکار اسٹاف روم تک پہنچی اور اسکول کی استانیاں بچہ کی طرف دوڑیں۔

مگر اس کا خوفناک حال دیکھ کر سب سہم گئیں۔ اتنے میں ایک استانی خاموشی کے ساتھ آگے بڑھی۔ اس کے ہاتھ میں صرف ایک اخبار تھا۔ اس نے اخبار کو سانپ کے منہ پر رکھا اور پوری طاقت سے اس کو پکڑ کر بچے کے پاؤں سے الگ کر دیا۔ لڑکا فوراً قریب کے ہندو راؤ اسپتال میں لے جایا گیا، جہاں وہ چند دن کے علاج سے اچھا ہو گیا۔ سانپ کو اسپتال کی لیبورٹری میں پہنچا دیا گیا جہاں وہ زندہ حالت میں موجود ہے۔

استانی کا نام مسز جان ہے۔ اور بچہ کا نام راجن کپور۔

مسز جان نے اس سے پہلے کبھی سانپ نہیں دیکھا تھا۔ انھوں نے اپنا تاثر بتاتے ہوئے کہا: "مجھے یقین نہیں آتا کہ میں نے اس موذی سانپ کو اپنے ہاتھوں سے پکڑ لیا تھا۔ اب تو مجھے اس کو سوچ کر بھی ڈر لگتا ہے۔"

یہ دراصل "حادثہ" تھا، جس نے مسز جان کو اس حیرت ناک بہادری کے لئے آمادہ کیا۔ حادثات آدمی کو ہیرو بنا دیتے ہیں۔

مولانا محمد علی (۱۸۷۸ - ۱۹۳۱) جب بیتول جیل میں نظربند تھے، ان کی اہلیہ جیل خانہ میں ان سے ملاقات کے لئے گئیں۔ انھوں نے اپنے شوہر مولانا محمد علی سے کہا:

"تم ہماری فکر نہ کرنا۔ خدا ہی پہلے بھی رازق تھا اور اب بھی وہی رازق ہے۔ تم صرف ایک واسطہ تھے۔ اور خدا بلا واسطہ بھی دے سکتا ہے اور دوسرا واسطہ بھی پیدا کر سکتا ہے۔" اس کے بعد انھوں نے کہا "رہا تمہارا کام، سو اگر اجازت ہو تو میں اسے کرتی ہوں"

مضامین محمد علی، جلد اول، صفحہ ۸۴ - ۸۳

چنانچہ انھوں نے "کام" شروع کیا اور دو سال کے عرصے میں ۴۵ لاکھ روپے کا چندہ خلافت تحریک کے لئے جمع کر لیا۔

یہ ۴۵ سال پہلے کا واقعہ ہے جب کہ "لاکھ" کا مطلب اس سے بہت زیادہ تھا جو آج سمجھا جاتا ہے

پہلے کچھ سہنا پڑتا ہے

بعض قوموں میں گودنا گدانے کا رواج ہے، پہچان کے لئے یا تبرک کے لئے جسم کے کسی حصہ پر خاص شکلیں یا نام بنوا لیتے ہیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ مطلوبہ شکل کے مطابق پہلے سوئی سے چھید کیا جاتا ہے اور پھر ان چھیدوں میں مسالہ بھر دیا جاتا ہے۔ اس طرح کالے رنگ کا نقشہ بن جاتا ہے جو عمر بھر رہتا ہے۔

قصہ ہے کہ ایک آدمی گودنا گودنے والے کے پاس گیا اور کہا کہ میرے ہاتھ پر شیر کی شکل بنا دو۔ گودنے والے نے اپنی سوئی اٹھائی اور نشان لگانا شروع کیا۔ سوئی کی چبھن آدمی کے لئے تکلیف دہ ثابت ہوئی۔ اس نے کہا "کیا بنا رہے ہو" گودنے والے نے کہا "دم"۔ آدمی نے کہا "کیا دم کے بغیر شیر نہیں ہوتا"۔ گودنے والے نے کہا اچھا۔ اور دوسری چیز بنانے لگا۔ اب پھر سوئی کی نوک چبھنے لگی۔ آدمی نے کہا اب کیا بنا رہے ہو۔ اس نے کہا "پاؤں"۔ آدمی نے کہا "کیا پاؤں ضروری ہے" گودنے والے نے کہا ٹھیک ہے۔ اس کو چھوڑ دیتا ہوں۔ اب وہ دوسری چیز گودنے لگا۔ آدمی کے اندر پھر بے چینی پیدا ہوئی۔ اس نے کہا "اب کیا بنا رہے ہو"۔ اس نے کہا "جبڑا"۔ آدمی نے کہا کیا جبڑا ضروری ہے۔ تم بغیر جبڑے ہی کے شیر بنا دو"۔ غرض اس طرح وہ ایک ایک چیز کو منع کرتا گیا اور بالآخر یہ ہوا کہ شیر کی تصویر نہ بن سکی، صرف چند متفرق نشانات اس کے ہاتھ پر بن کر رہ گئے —— ہر مقصد کے لئے ابتداءً کچھ سہنا پڑتا ہے۔ اگر آدمی سہنے کے لئے تیار نہ ہو تو وہ کسی بھی مقصد کو حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

عبدالحمید چھوٹانی (پیدائش ۱۹۲۳) پاکستان کے ایک ممتاز سائنس داں ہیں۔ وہ بمبئی آئے۔ اس موقع پر ایک اخباری رپورٹر نے ان سے انٹرویو لیتے ہوئے سوال کیا: "انجینیرنگ کے میدان میں پاکستان اتنا پیچھے کیوں ہے" مسٹر چھوٹانی نے جواب دیا: "یہ صحیح ہے کہ ہم انجینیرنگ میں ابھی تک قابل قدر ترقی حاصل نہ کر سکے۔ اس کی خاص وجہ ہے ہمارے یہاں بنیاد (Base) کی کمزوری۔ اکادکا انڈسٹری سے آخر کتنی ترقی کی امید کی جا سکتی ہے (اخبار عالم ۱۴ اپریل ۱۹۷۹)

یعنی تعلیم گاہیں اسی وقت انجینیر زیادہ پیدا کریں گی جب کہ ان کی کھپت کے لئے ملک میں زیادہ صنعتیں بھی موجود ہوں۔ صنعتوں کی کمی ہو تو کوئی ملک زیادہ انجینیر پیدا نہیں کر سکتا۔

اسی طرح ہر کام کی ایک بنیاد ہوتی ہے۔ بنیاد کے بغیر کوئی اقدام کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔ مثلاً جمہوری دور میں سیاست کی بنیاد عوامی رائے ہے۔ اگر آپ کو عوامی ووٹروں کی اکثریت حاصل نہ ہو تو گویا آپ کے پاس وہ بنیاد ہی نہیں ہے جس پر الیکشن لڑے جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر آپ الکشن میں کود دیں تو لازماً آپ ہاریں گے اور اگر آپ کے اندر اعتراف کا مادہ نہیں ہے تو مزید یہ حماقت کریں گے کہ اپنی ہار کو چھپانے کے لئے یہ شور کریں گے کہ الکشن میں دھاندلی ہوئی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اگر موقع ملے گا تو فوج سے ساز باز کر کے مقبول عوام لیڈروں کو قتل کرائیں گے تاکہ آپ عوامی بنیاد نہ ہونے کے باوجود وہ حکومت کی گدی پر پہنچ سکیں۔ اگرچہ اس قسم کی کوشش کبھی کسی کے لئے نتیجہ خیز نہیں ہوئی ہے۔ مستقبل کے اعتبار سے، یہ ملک کی بربادی ہے اور بالآخر خود اپنے آپ کی بھی۔

خود نمائی کے شوق میں

ایک صابن ہے۔ اس کا اشتہار اخبارات میں ایک خاص منظر کے ساتھ شائع ہوتا ہے۔ اس منظر میں ایک لڑکی آبشار کے نیچے نہاتی ہوئی دکھائی گئی ہے۔ یہ منظر کسی آرٹسٹ کے برش نے نہیں بنایا ہے۔ وہ ایک حقیقی منظر ہے۔ یہ مہم ۱۹۶۹ میں شروع کی گئی اور برسوں کے بعد تکمیل کو پہنچی۔ اس مقصد کے لئے ایک خاص لڑکی کا انتخاب کیا گیا، جنگل، سمندر اور دوسرے مقامات کا تجربہ کرنے کے بعد بالآخر آبشار کے غسل کو سب سے زیادہ موزوں سمجھا گیا۔ کیوں کہ آبشار کے گرتے ہوئے پانی میں نہانے کا منظر سب سے زیادہ عوامی کشش رکھتا تھا۔ مختلف آبشاروں کا جائزہ لینے کے بعد کوڈائی کنال کو مقام غسل کے لئے چنا گیا۔

سب سے مشکل یہ تھا کہ یہ کام صرف جاڑوں میں ہو سکتا تھا۔ کیوں کہ اسی موسم میں پہاڑی آبشاروں میں تیز دھارا ہوتا ہے۔ دوسری طرف اس مقصد کے لئے ایک نازک لڑکی کا انتخاب ضروری تھا جو نہاتے وقت "پانی کی پری" معلوم ہو۔ یہ ایک جان جوکھم منصوبہ تھا۔ مگر ماڈلنگ کے پیشہ نے اس کو آسان بنا دیا۔ ایڈورٹائزنگ کمپنی کا عملہ جس کو انتظام کرنا اور فوٹو لینا تھا، مکمل طور پر گرم کپڑوں سے لدا ہوتا تھا۔ دوسری طرف ان کی پارٹی کی سب سے زیادہ نازک اور کمزور ممبر صبح ۷ بجے ٹھٹھرتے ہوئے پانی کے ریلے میں چھلانگ لگاتی تھی۔ پھسلتی ہوئی چٹانوں پر پانی کے مسلسل گرتے ہوئے دریا کے نیچے اس کو اس طرح نہانا پڑتا تھا کہ اس کے چہرے پر صرف فرحت اور خوش گواری کی ہنسی ہو۔ خوف اور گھبراہٹ کی کوئی علامت اس پر ظاہر نہ ہونے پائے۔ کیڑے مکوڑے اور پانی کے سانپ ان سب کے علاوہ تھے۔ کمپنی کے لوگوں کو کبھی لڑکی کو جگانا نہیں پڑا۔ وہ ہر روز صبح کو ۵ بجے اپنے گھر پر تیار ملتی تھی۔

یہ واقعہ درجن سے زیادہ بار دہرایا گیا اور ہزاروں کی تعداد میں فوٹو لئے گئے۔ پھر اس ایک فوٹو کا انتخاب ہوا جو آج لوگوں کو اخبار کے اشتہارات میں نظر آتا ہے۔ لڑکی کے لئے اس ایک فوٹو کی قیمت تھی پندرہ ہزار روپیہ —— ماڈلنگ کا یہ پیشہ آج ساری دنیا میں بہت بڑے پیمانہ پر رائج ہے۔

"کیا چیز ہے جو لڑکوں اور لڑکیوں کو ماڈلنگ کے اس سخت کام کی طرف راغب کرتی ہے" ایڈورٹائزنگ کمپنی کے ایک افسر نے اس سوال کے جواب میں کہا:

It is, primarily, a case of vanity (Famina, 22.7.1978)

بنیادی طور پر اس کی وجہ نمود و نمائش کا جذبہ ہے۔ کیوں کہ اس کے بعد ہر طرف اس کو اخبارات و رسائل میں اپنا چہرہ چھپا ہوا دکھائی دینے لگتا ہے —— خود نمائی کا یہ جذبہ جو ایک "پرو فیشنل ماڈل" کو جان جوکھم کام کی طرف لے جاتا ہے وہی ایک "لیڈر" کے کام کا محرک بھی ہے۔ اگرچہ اول الذکر کے مظاہروں کو پیشہ ورانہ نمائش کہا جاتا ہے اور ثانی الذکر کے اسی قسم کے مظاہروں کو قربانی کے پر فخر نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ انسان کا حقیقی کمال یہ ہے کہ وہ خود نمائی کے شوق سے اوپر اٹھ جائے۔ اگرچہ تمام کاموں میں انسان کے لئے سب سے زیادہ مشکل کام یہی ہے۔

نیاز فتحپوری

جب آپ دلدل میں پھنس جائیں

۱۹۰۹ء میں میرا تعلق ریاست باؤنی کدورہ (بندیل کھنڈ) سے ہو گیا تھا۔ نواب ریاض الحسن خاں کا عہدِ حکومت تھا۔ اس وقت میرے بہنوئی محمد سلیمان خاں مودھا (ضلع ہمیرپور) کے تھانہ میں مامور تھے۔ اور میں ہر پندرہویں دن اپنی بہن کو دیکھنے وہاں چلا جاتا تھا۔ فاصلہ صرف دس بارہ میل کا تھا جسے میں گھوڑے پر طے کرتا تھا۔

میں شام کو کدورہ سے چلا۔ میں جاگیر بیری کے قریب پہنچا جو کدورہ سے صرف تین میل دُور تھی۔ تو آفتاب غروب ہو چکا تھا اور رات کا دھندلکا شروع ہو گیا تھا۔ جاگیر بیری ایک اونچی پہاڑی پر دریا کے کنارے واقع ہے اور مودھا جانے کے لئے اس دریا کو عبور کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس دریا کے دونوں کناروں پر دور دور تک ریت پھیلی ہوئی ہے۔ میں ریت کے اس حصے کو معمولاً پیدل طے کرتا تھا تاکہ گھوڑے پر زیادہ بوجھ نہ پڑے۔ لیکن اس مرتبہ دیر ہو جانے کی وجہ سے میں گھوڑے پر سوار رہا اور اسے تیز تیز چلانے لگا۔

اس دریا کے متعلق مشہور تھا کہ اس کے کناروں پر کہیں کہیں چور بالو بھی پائی جاتی ہے۔ چور بالو سے مراد وہ رتیلا حصہ ہے۔ جو بظاہر صاف اور مسطح نظر آتا ہے لیکن پانی کی سطح سے قریب تر ہونے کی وجہ سے اس کے نیچے دلدل ہو جاتی ہے اور اس پر پاؤں رکھتے ہی آدمی ہو یا جانور اندر دھنسنے لگتا ہے۔ اس مرتبہ چونکہ مجھے جلدی تھی اس لئے معمولی راستہ سے ہٹ کر میں نے مختصر راستہ اختیار کرنا چاہا۔ اور گھوڑے کو اسی طرف ڈال دیا۔ تھوڑی دُور چل کر مجھے ایک رتیلی ننگنا رے ملی۔ اور میں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی تاکہ وہ اسے پھاند کر گزر جائے۔ میں تاریکی میں اس کی چوڑائی کا صحیح اندازہ نہ کر سکا۔ زیادہ سے زیادہ میں اسے تین گز کا سمجھتا تھا۔ حالانکہ وہ چھ گز سے کم نہ تھا۔ میرے ایڑ لگانے پر گھوڑے نے جست تو کی، لیکن وہ اس فاصلہ کو عبور نہ کر سکا۔ اور اس کے اگلے پاؤں رتیلے حصے کے اندر ہی رہے۔ اس کے بعد دفعتاً گھوڑا اندر دھنسنے لگا تو مجھے پتہ چلا کہ میں چور بالو میں پھنس گیا ہوں۔ چور بالو سے جان بچانے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے، وہ یہ کہ اس سے نکلنے کے لئے ہاتھ پاؤں نہ مارے جائیں (اس طرح آدمی اور اندر دھنستا چلا جاتا ہے۔) بلکہ اپنے آپ کو بالو پر چت یا پٹ ڈال دیا جائے۔

گھوڑا سینہ تک دھنس چکا تھا اور میں بھی اس کے ساتھ گھٹنوں گھٹنوں بالو کے اندر غرق تھا۔ غور کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ گھوڑے کو بچانا تو ممکن نہیں اس لئے اس کے ساتھ اپنی جان کیوں گنوائی جائے۔ میں نے آہستہ آہستہ اپنے دونوں پاؤں رکاب سے الگ کر کے اوپر نکالے اور فوراً چور بالو پر بے حس و حرکت لیٹ گیا۔ اتفاق کی بات کہ اس وقت بیری کے دو راجپوت گھر لوٹتے وقت میرے پاس سے گزرے۔ اور میں نے انہیں آواز دی —— وہ دونوں دوڑے ہوئے آئے اور انہوں نے اپنی پگڑی کھول کر اس کا سرا میری طرف پھینکا کہ اسے مضبوط پکڑ لوں۔ اور جب میں نے اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا تو انہوں نے مجھے آہستہ آہستہ گھسیٹنا شروع کیا۔ اور میں اس چور بالو سے نکل گیا۔ اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ گھوڑے کو کیوں کر نکالا جائے۔ اس کے لئے انہوں نے یہ ترکیب نکالی کہ پگڑی کا ایک سرا پھندا بنا کر اس کی گردن میں ڈالا جائے اور اس کو بھی گھسیٹا جائے۔ میں لگام کا جھٹکا دینے لگا۔ مگر گھوڑا تھک کر اس قدر بے جان ہو گیا تھا کہ جھٹکے سے بھی اس کے جسم میں کوئی حرکت پیدا نہ ہوئی۔ اور آخر کار وہ دھنستے دھنستے غائب ہو گیا

قدر دانی

میں جس زمانہ (از ستمبر ۱۹۶۲ تا جون ۱۹۶۳)
میں مکگل یونیورسٹی (کناڈا) کے اسلامک ریسرچ اینڈ
ایجوکیشن انسٹی ٹیوٹ سے بحیثیت معلم کے وابستہ تھا اس
زمانہ میں ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ مئی ۱۹۶۳ کے پہلے ہفتہ
میں انسٹی ٹیوٹ کی گورننگ باڈی کی ایک میٹنگ ہوئی
جس میں میں بھی شریک تھا اور پروفیسر ولفریڈ کینٹول اسمتھ
انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے اس میں صدر نشین
تھے۔ ایجنڈے پر بہت سے تعلیمی مسائل کے ساتھ ایک مسئلہ
یہ بھی تھا کہ انسٹی ٹیوٹ کے ایک طالب علم مسٹر مشیر الحق
(حالیہ پروفیسر اسلامیات جامعہ ملیہ) ایم۔ اے کا امتحان
دے چکے تھے اور اب وہ پی۔ ایچ۔ ڈی میں داخلہ چاہتے
تھے۔ میٹنگ میں جب یہ مسئلہ زیر غور آیا تو پروفیسر اسمتھ
نے کہا کہ مشیر ایم۔ اے کے امتحان میں اچھے نمبروں سے
کامیاب ہو جائیں گے اور اس بنا پر پی۔ ایچ۔ ڈی میں
داخلہ اور اس کے اسکالرشپ کے مستحق ہوں گے ہی لیکن
اس سلسلہ میں انسانی ہمدردی کی بنیاد پر ہمیں اس پر بھی
غور کرنا چاہیے کہ مشیر شادی شدہ ہیں اور ان کے بچے بھی
ہیں اور مشیر کو ان سے جدا ہوئے دو برس ہو چکے ہیں۔
اب اگر یہ پی۔ ایچ۔ ڈی میں داخلہ لیتے ہیں تو اس کے معنی
یہ ہوں گے کہ اب مزید تین برس اور یہ اپنی بیوی بچوں سے
جدا رہیں گے اور یہ ایک جوان میاں بیوی کے لئے نامناسب
بات ہے، اس بنا پر میں دو تجویزیں پیش کرتا ہوں۔ ایک یہ
کہ مشیر کے لئے ہندوستان آنے جانے کا انتظام کیا جائے
تاکہ وہ موسم گرما کی تعطیل کے تین مہینے اپنے بچوں میں
گزاریں اور دوسری تجویز یہ ہے کہ ان کی بیوی اور بچوں
کو یہاں بلوا لیا جائے اور ان کے اسکالرشپ کی رقم میں اتنا
اضافہ کر دیا جائے کہ سب مل کر آسانی سے گزارہ کر لیں۔
کچھ دیر بحث و گفتگو کے بعد اسمتھ صاحب کی دونوں تجویزوں
کو علی سبیل التبادل نہیں بلکہ علی سبیل الاجتماع منظور کر لیا
گیا۔ چناں چہ مشیر صاحب ہندوستان آئے۔ تین مہینے کے
قریب یہاں رہے اور پھر اپنی بیوی بچوں کو لے کر کناڈا واپس
لوٹ گئے۔

(مولانا) سعید احمد اکبرآبادی (پیدائش ۱۹۰۸)
ہمدرد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، تغلق آباد، نئی دہلی

اعتراف

غالباً ۱۹۳۰ کا واقعہ ہے۔ جارج اسلامیہ
ہائی اسکول گورکھپور (جو بعد کو اسلامیہ کالج بنا) کے
ایک استاد مسٹر شرف الدین تھے۔ بہت ذہین اور لائق
استاد تھے۔ انگریز انسپکٹر ایک روز ان کی کلاس کا معائنہ
کرنے کے لئے آیا۔ اس وقت وہ غالباً نویں کلاس کو
انگریزی زبان پڑھا رہے تھے۔ انگریز انسپکٹر ان کی
کلاس میں بیٹھ گیا اور ان کے درس کو سنتا رہا۔ بعد کو
اس نے انسپکشن رپورٹ میں لکھا:

I did not inspect the class of Mr. Sharfuddin, actually I attended it. He is so learned a teacher.

میں نے مسٹر شرف الدین کی کلاس کا معائنہ نہیں کیا۔
بلکہ حقیقۃً ان کے کلاس میں شرکت کی۔ وہ واقعی ایک
لائق استاد ہیں۔

ڈاکٹر محمود قادری (پیدائش ۱۹۱۴)
قاسم جان اسٹریٹ۔ دہلی ۱۱۰۰۰۶

غلطی کا اعتراف

۱۹۴۱ کے شروع کا واقعہ ہے۔ میں فوجی دفتر ں ایک شاخ (اے جز برانچ) کے سیکشن (اے جی نمبر ۱) اقع نئی دہلی میں ملازم تھا۔ میرے ایک ساتھی عالم چند سنگھ تھے۔ انھوں نے ایک موقع پر دفتر کی ایک فائل اس وقت لے ہمارے سیکشن کے انچارج افسر کے پاس کاغذات پر دستخط کرنے کے لئے بھیجی۔ یہ ایک انگریز کرنل تھا جس کا م اب مجھے یاد نہیں۔ اس افسر نے فائل دیکھی تو اس کو یک کاغذ نظر نہیں آیا جس کی اسے خاص ضرورت تھی۔ ں نے نہایت ناراضگی کے لہجہ میں یہ نوٹ لکھ کر فائل کو پنے ماتحت مسٹر عالم چند سنگھ کے پاس بھیجا کہ فلاں کاغذ ں میں کیوں نہیں ہے۔

عالم چند سنگھ نے فائل کو غور سے دیکھا تو اس میں مطلوبہ کاغذ موجود تھا۔ چنانچہ انھوں نے فائل کو دوبارہ اپنے انگریز افسر کے پاس بھیجا اور لکھا کہ جناب فائل کے فلاں صفحہ کو ملاحظہ فرمائیں جس میں مطلوبہ کاغذ موجود ہے۔

افسر نے دوبارہ فائل کا جائزہ لیا تو کاغذ اس کے اندر موجود تھا۔ اس کو اپنی غلطی کا شدید احساس ہوا۔ اس نے اس کا اعتراف کرتے ہوئے فائل پر موٹی سرخ پنسل سے اپنے سابقہ نوٹ کے ساتھ لکھ دیا:

I was blind then

میں اس وقت اندھا تھا۔

حاجی اختر محمد خاں (پیدائش ۱۹۱۵)
محلہ کوٹ، بگراسی، ضلع بلند شہر

ایسے زندہ انسان ہمارے اندر کیوں نہیں

ہندوستانی انجینیر غیر ضروری تعمیرات اور غیر ضروری ڈزائنوں پر کروروں روپیہ ضائع کرتے ہیں، اس کی مثال دیتے ہوئے مسٹر کے۔ ڈی۔ مالویہ (سابق وزیر پٹرولیم) نے بتایا کہ مشرقی ہندستان میں ایک پل پر کام ہو رہا تھا۔ اسی دوران ڈرلنگ مشین کو پل پر لے جانے کی ضرورت ہوئی۔ اس وقت موقع پر دو انجینئر تھے۔ ایک روسی اور دوسرا ہندوستانی۔ ہندستانی انجینئر نے کہا کہ ڈرل کرنے کی بھاری مشین پل کے اوپر لے جائی گئی تو پل ٹوٹ کر گر جائے گا۔ اس لئے مشین اس وقت تک پل پر نہ چڑھائی جائے جب تک اس کے استحکام کا مزید انتظام نہ کر لیا جائے۔

روسی انجینئر کو اس سے اختلاف تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ڈرلنگ مشین کو ہم پل پر لے جا سکتے ہیں اور اس سے پل کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ بحث بڑھی یہاں تک کہ یہ مسئلہ متعلقہ وزیر تک پہنچا۔ روسی انجینئر نے اپنے نقطۂ نظر کی وکالت کرتے ہوئے وزیر سے کہا: "روس میں میری بیوی اور بچے ہیں، اور میں ان سے محبت کرتا ہوں۔ مگر میں اس کے لئے تیار ہوں کہ پل کے نیچے کھڑا ہو جاؤں جب کہ مشین پل کے اوپر چڑھائی جائے"۔ اپنی بات کو ثابت کرنے کے لئے روسی انجینئر نے فی الواقع ایسا ہی کیا اور بے ضرر بچ کر نکل آیا۔

کے۔ سی۔ کھنا، مطبوعہ السٹریٹڈ ویکلی ۲۱ ستمبر ۱۹۷۵

اس کا ارادہ

اس کی بیماری پر

غالب آیا

کلاس میں صحت کی بات چھڑ گئی۔ ماسٹر صاحب صحت کے اصول لڑکوں کو سمجھا رہے تھے۔ اتنے میں ایک طالب علم کھڑا ہو گیا۔ "ماسٹر صاحب" وہ بولا "اجازت ہو تو ایک بات دریافت کروں۔"

"ضرور"

"ماسٹر صاحب اس عمر میں آپ کی اتنی اچھی صحت ہے، اس کا راز کیا ہے۔"

اس کے بعد ماسٹر صاحب نے اپنی کہانی بیان کرنی شروع کی۔ انھوں نے کہا۔ "یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ میں تم سے بھی چھوٹا تھا اس وقت میں کلکتہ میں تھا، میری صحت بہت خراب ہو گئی، میں اتنا دُبلا اور کمزور ہو گیا کہ چلنا پھرنا مشکل ہو گیا ڈاکٹر بھی میرے علاج سے مایوس ہو گئے۔ ایک روز ڈاکٹر نے کہا "اس کو گھر لے جاؤ۔ اب یہ بچ نہیں سکتا تاکہ یہ مرے تو اپنے ماں باپ کے پاس مرے۔"

"ڈاکٹر کو میری موت پر اتنا یقین تھا کہ اس نے میرے سامنے ہی یہ بات کہہ دی۔ مجھے ڈاکٹر کی بات سن کر بہت غصہ آیا۔ میں نے اپنے دل میں کہا "مجھے زندہ رہنا ہے" اور میں نے اس کے فوراً بعد زندگی کی جدوجہد شروع کر دی۔

"میں نے سوچا کہ سب سے پہلا کام مجھے یہ کرنا ہے کہ اپنے دماغ سے اس خیال کو نکال دوں کہ میں بیمار ہوں یا مرجانے والا ہوں۔ میں نے فیصلہ کیا کہ چاہے کچھ ہو مجھے بہرحال جینا ہے۔ اس کے بعد نہ میں کسی ڈاکٹر کے پاس گیا اور نہ کوئی دوا کھائی۔ البتہ اپنی زندگی کو نہایت منظم کر لیا۔ میں روزانہ صبح کو کھلی ہوا میں ورزش کرتا، روزانہ نہاتا، روزانہ اپنے بدن پر تیل کی مالش کرتا اور دن رات کے سارے اوقات کو ایک نظام کے تحت گذارتا۔

میرا ارادہ میری بیماری پر غالب آیا۔ میں دھیرے دھیرے اچھا ہونے لگا۔ میرے چہرے پر موت کے پیلے پن کے بجائے زندگی کی سُرخی دوڑنے لگی۔ اب میں ایک تندرست نوجوان تھا جس کی صحت پر لوگ رشک کرتے تھے۔ وہ دن ہے اور آج کا دن، میں بچپن سے جوان ہوا اور جوانی کے بعد اب بڑھاپے کا دور شروع ہو گیا ہے لیکن ڈاکٹر کے اندازہ کے خلاف نہ صرف یہ کہ میں زندہ رہا بلکہ پھر کبھی بیمار نہیں ہوا میں نے طے کیا تھا کہ مجھے زندہ رہنا ہے اور قدرت نے یہ الفاظ صحیح ثابت کر دکھائے۔"

درخواست کے بغیر

ڈاکٹر پی۔ ایل بھٹناگر (۱۹۷۶) نے ۱۹۲۳ء میں ایم ایس سی میں ٹاپ کیا تو گھر والوں کی بہترین تمنا یہ تھی کہ وہ آئی سی ایس کے مقابلہ میں بیٹھیں۔ اس وقت ممتاز طالب علموں کے لئے سب سے زیادہ پرکشش چیز یہی تھی۔ مگر ڈاکٹر بھٹناگر کے علمی شوق نے انھیں مجبور کیا کہ وہ آئی سی ایس افسر بننے کے بجائے ٹیچر اور اسکالر بننے کو ترجیح دیں۔

۱۹۵۶ کا واقعہ ہے پروفیسر ہمایوں کبیر وزارت تعلیم میں سکریٹری تھے۔ ان کو ایک ایسے قابل ریاضی داں کی تلاش تھی جس کو انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس بنگلور میں اپلائیڈ میتھیمیٹکس کے شعبہ کا صدر بنایا جاسکے۔ انٹرویو کے لئے سلکشن کمیٹی مقرر ہوئی جس کے صدر خود ہمایوں کبیر تھے۔ کمیٹی کو درخواست دہندگان میں کوئی بھی شخص عہدہ کے لائق نہ ملا۔

پروفیسر ہمایوں کبیر نے پروفیسر ڈی۔ ایس۔ کوٹھاری سے کہا جو کہ سلکشن کمیٹی کے ممبر بھی تھے: "کیا ہمارے ملک میں کوئی ایسا شخص نہیں جو اس عہدہ پر بیٹھنے کے لائق ہو" کوٹھاری نے کہا: "کم از کم ایک شخص تو مجھے معلوم ہے، اور وہ ڈاکٹر بھٹناگر ہیں"۔ پروفیسر ہمایوں کبیر نے تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے فوراً ڈاکٹر بھٹناگر کے نام اپائنٹمنٹ لیٹر بھیج دیا، اگرچہ موصوف نے اس عہدہ کے لئے کوئی درخواست نہیں دی تھی۔

ڈاکٹر بھٹناگر نے ٹیچر کے مقابلہ میں صدر بننے کی پیش کش کو بجبر قبول کیا تھا۔ تاہم وہ ان کے لئے مزید عہدوں کا زینہ بنا۔ وائس چانسلر راجستھان یونیورسٹی اور جے پور یونیورسٹی، ممبر یونین پبلک سروس کمیشن۔ ۱۹۶۸ میں ان کو پدم بھوشن کا خطاب دیا گیا۔ یہ تقریب ڈاکٹر ذاکر حسین کے ہاتھوں انجام پائی تھی جو اس وقت صدر جمہوریہ ہند تھے۔

ایک خاندان کے یہاں دوسرے فرقہ کا ایک آدمی ملازم تھا۔ اس نے چوری کی۔ نوجوان صاحبزادے جوش میں اس کو مارنے کے لئے دوڑے۔ باپ نے منع کیا۔ "تم چوری کے لئے اس کو مارو گے"، باپ نے کہا "اور اس کے بعد اس سے بھی زیادہ بڑا مسئلہ، فرقہ وارانہ فساد کا مسئلہ، کھڑا ہوجائے گا۔" اب گھر کے لوگ مارنے سے رک گئے اور مسئلہ کو حکمت کے ساتھ حل کیا۔

"حکمت عملی" کا یہ راز جو ایک معمولی آدمی اپنے ذاتی معاملہ میں پالیتا ہے، اس کو پاکستان کے رہنما اسلامی تحریک کے معاملہ میں نہ جان سکے۔ وہ صورت حال کے تمام پہلوؤں کا اندازہ کئے بغیر بار بار ایسے اقدامات کر رہے ہیں کہ اصل مقصد (اسلامی نظام کا قیام) تو حاصل نہیں ہوتا۔ البتہ ہنگامہ کے نتیجہ میں کچھ دوسرے شدید تر مسئلے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ نئی نئی پیچیدگیاں ابھر کر راستہ کی مشکلات کو کچھ اور زیادہ بڑھا دیتی ہیں ——— مجیب ازم (بنگالیت) بھٹو ازم (پاکستانی نیشنلزم) ولی ازم (سرحدی علاقائیت) وغیرہ سب اسی قسم کے نادان اقدامات کے پیدا شدہ نتائج ہیں۔ "چوری" ختم نہیں ہوتی۔ البتہ "فرقہ وارانہ فسادات" نئے نئے عنوان سے بڑھتے چلے جارہے ہیں۔ کیسی عجیب ہے یہ سیاست اور کیسے عجیب ہیں یہ خادمانِ اسلام۔

لڑائی ختم ہوگئی

جون ۱۹۷۵ کا واقعہ ہے۔ میں نینی تال کے ایک اسکول میں فزکس کا استاد تھا۔ ایک لڑکا میرے پاس ٹیوشن کے طور پر پڑھنے آتا تھا۔ اس کا نام وزیر سنگھ تھا۔ عمر تقریباً سترہ سال تھی۔ ایک روز وہ کسی قدر دیر سے آیا۔ حال یہ تھا کہ قمیص پھٹی ہوئی، ہونٹوں سے خون جاری، بال بکھرے ہوئے۔ اس کا یہ حلیہ دیکھ کر میں نے خیریت دریافت کی۔

اس نے بتایا کہ وہ آرہا تھا کہ راستہ میں ایک مقام پر ایک رکشہ والے سے اس کا ٹکراؤ ہوگیا۔ اس کے بعد لڑکے میں اور رکشے والے میں تو تو میں میں ہوئی اور دونوں لڑگئے۔ رکشے والا سردار تھا اور اپنے روایتی حلیہ میں تھا۔ مگر لڑکا بے داڑھی مونچھ اور بغیر پگڑی تھا۔ بظاہر یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ سردار ہے۔

لڑائی میں رکشے والے نے لڑکے کو پٹک دیا۔ اور مارنے لگا۔ اتنے میں لڑکے نے پنجابی زبان میں رکشے والے کو برا بھلا کہا۔ یہ سن کر رکشے والا ٹھٹھک گیا۔ اس نے پوچھا:

"تم کون ہو، تمھارا نام کیا ہے"

"وزیر سنگھ"

"کیا تم سردار ہو"

"ہاں"

اس کے بعد رکشے والا فوراً اٹھ گیا۔ "پہلے کیوں نہیں بتایا۔ سردار سردار کو نہیں مارتا" اس نے کہا اور دونوں گرد جھاڑتے ہوئے اپنے اپنے راستہ پر چلے گئے۔

سید حیدر علی ایم۔ ایس۔ سی (پیدائش ۱۹۴۴) دہلی

کمزور طاقت ور کے اوپر غالب آسکتا ہے

یہ قوی ہیکل ج[illegible] امریکی ہوائیہ [illegible] ایک افسر ہے جس کا نام میجر [illegible] اڈگر جانسن [illegible] دسمبر ۱۹۷۲ [illegible] شمالی ویٹ[illegible] کی ایک معمو[illegible] نے اس کو پک[illegible] اور اس کو [illegible] کی نوک پر [illegible] ساتھ چلنے [illegible] مجبور کردیا

US Air Force Maj. Richard Edgar Johnson, a B-52 pilot, was captured by North Vietnamese militia women in Kim Anh District, Vinh Phu Province of North Vietnam.

فرد کا جھکنا قوم کا سربلند ہونا ہے

لارڈ سالسبری (۱۸۳۰ - ۱۹۰۳) ملکہ وکٹوریہ کے زمانہ حکومت میں برطانیہ کے وزیر اعظم تھے۔ اس زمانہ میں کار کا رواج نہ تھا۔ وزیر اعظم سالسبری اپنی سائیکل پر سوار ہو کر جا رہے تھے۔ ایک مقام پر وہ سڑک کے غلط رخ سے گزرنے لگے۔ سڑک پر متعین کانسٹیبل نے انھیں روکا۔ وزیر اعظم نے کانسٹیبل کو بتایا کہ میں وزیر اعظم ہوں اور چوں کہ مجھے عجلت تھی اس لئے مجھ سے ٹریفک کے ضابطہ کی خلاف ورزی ہوگئی۔ کانسٹبل نے جواب دیا کہ میں اپنی ڈیوٹی کو بجالانے والا کانسٹبل ہوں۔ میرا فرض صرف یہ ہے کہ کہ ٹریفک کی خلاف ورزی نہ ہونے دوں۔ چوں کہ آپ ایک سفید ریش بزرگ ہیں اس لئے میں صرف اتنی رعایت کر سکتا ہوں کہ آپ کا چالان نہ کروں۔ لیکن اتنا آپ کو بہرحال کرنا پڑے گا کہ آپ واپس جائیں اور جہاں سے سڑک شروع ہوتی ہے وہاں سے سیدھی سمت میں آئیں۔ وزیر اعظم نے بے چون وچرا ٹریفک کانسٹبل کا حکم مان لیا۔ نیز اس واقعہ کا ذکر ملکہ وکٹوریہ کے پرائیویٹ سکریٹری سے خود کر کے اس فرض شناس کانسٹبل کو خراج تحسین پیش کیا۔

برطانیہ کے دوسرے وزیر اعظم مسٹر بالڈون (۱۸۶۷ - ۱۹۴۷) کا واقعہ ہے۔ وہ اپنی کار میں سفر کر رہے تھے۔ ایک چوراہہ پر کار رکی۔ ٹریفک کی قطار میں ان کی گاڑی پیچھے تھی۔ راستہ کھلا تو ڈرائیور نے قبل اس کے کہ آگے کی موٹریں گزریں، وزیر اعظم کی موٹر آگے نکال لینے کی کوشش کی۔ ٹریفک کانسٹبل نے فی الفور روکا۔ ڈرائیور نے کہا کہ وزیر اعظم صاحب کو سرکاری کام کی وجہ سے جلدی ہے۔ کانسٹبل نے کہا، مجھے اس سے کوئی بحث نہیں کہ موٹر نشین کون ہے قانون کی رو سے ٹریفک کی پابندی عام شہری اور وزیر اعظم دونوں پر لازم ہے۔ یہ سن کر وزیر اعظم نے موٹر سے اتر کر کانسٹبل سے معافی مانگی اور ڈرائیور کو ہدایت کی کہ وہ کانسٹبل کے حکم کی تعمیل کرے۔

(نیشنل ہیرلڈ جنوری ۱۹۷۸)

لیڈر اپنے کو اصول کے آگے جھکائے تو ساری قوم اصول کے آگے جھکنے والی بن جاتی ہے اور یہی کسی قوم کی طاقت کا سب سے بڑا راز ہے

سیاست کا راز

ابو فراس حمدانی عباسی دور کا شاعر ہے۔ وہ اپنے ایک قصیدہ میں کہتا ہے:

اذا ما ارسل الامراء جیشا

الی الاعداء ارسلنا الکتابا

یعنی ہماری دھاک کا یہ عالم ہے کہ جہاں دوسرے امراء کو مقابلہ کرنے کے لئے لشکر بھیجنا پڑتا ہے، وہاں ہم صرف خط بھیج دیتے ہیں اور وہی فیصلہ کے لئے کافی ہو جاتا ہے۔

یہاں ایک شعر میں شاعر نے سیاست کا راز بتا دیا ہے، سیاست یہ نہیں ہے کہ حریف سے لڑائی بھڑائی جاری رکھی جائے۔ سیاست یہ ہے کہ اپنے آپ کو اتنا طاقت ور اور مستحکم بنا لیا جائے کہ جب ضرورت پڑے تو صرف ایک "تحریر" بھیج دینا معاملہ کو ختم کرنے کے لئے کافی ہو۔

کام میں انہماک

سرجادو ناتھ سرکار (۱۸۷۰ - ۱۹۵۸) کو مغل تاریخ کا کولمبس کہا جاتا ہے۔ یہ مقام انھیں کس غیر معمولی انہماک کے ذریعہ ملا، اس کا ایک ہلکا سا اندازہ ان کے خطوط سے ہوتا ہے جو انھوں نے اپنے استاد ڈاکٹر رگھوبیر سنبہ کو اپنی عمر کے آخری ۲۰ برسوں میں لکھے۔ ۸۰ برس کی عمر کو پہنچ کر بھی ان کے اندر کام کا شوق اتنا بڑھا ہوا تھا کہ کلکتہ میں اپنے وسیع مکان کو چھوڑ کر وہ صرف اس لئے کامشیت چلے گئے کہ کلکتہ کے ناموافق موسم کی وجہ سے وہ وہاں پوری طرح کام نہیں کر سکتے تھے۔ یہ منتخب ۳۲۹ خطوط جس زمانہ (۱۹۳۲ - ۱۹۵۸) سے تعلق رکھتے ہیں اس میں ملک کے اندر اور باہر زبردست واقعات ہوئے۔ دوسری جنگ عظیم، ہندستان کی آزادی مہاتما گاندھی کا قتل، وغیرہ۔ مگر خطوط میں ان واقعات کا کوئی حوالہ نہیں ملتا۔ تاہم دوسری جنگ عظیم میں جرمنی کی شکست کی خبر انھیں متاثر کرتی ہے ۲۸ جون ۱۹۴۵ کو وہ اپنے ایک دوست کو لکھتے ہیں:

"اگر تم اپنے لندن کے فوٹوگرافر کو خط لکھو تو اس کو ہدایت کرو کہ وہ برٹش میوزیم کے (فلاں) مخطوطہ کی فوٹو اسٹیٹ کاپی لے لے۔ یورپ میں امن قائم ہو جانے کی وجہ سے برٹش میوزیم نے اپنے مخطوطات کے ذخیرہ کو شاید دوبارہ نکال لیا ہو جو (جنگ کے زمانہ میں) تہ خانوں میں رکھ دیے گئے تھے"

لطیفہ

"دیکھو ترکیب استعمال سمجھ لو"۔ حکیم صاحب نے مریض کو نسخہ دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں ارشاد ہو"

"اس کو گرم پانی میں اچھی طرح جوش دے کر، چھان کر سوتے وقت پی لینا۔ اللہ نے چاہا تو پہلی ہی خوراک میں آرام محسوس ہوگا۔"

"بہت اچھا حضور"

"اور دیکھو کل صبح آکر اطلاع دینا"

"بہت اچھا"

دوسری صبح مریض پھر آیا، حکیم صاحب نے نبض پر ہاتھ رکھا اور پوچھا، کہو کچھ فرق محسوس ہوا۔ مریض نے کہا "نہیں حضور کچھ فرق نہیں بلکہ آج تو تکلیف اور بڑھ گئی ہے"۔ حکیم صاحب گہری سوچ میں پڑ گئے، ماتھے پر ہاتھ رکھا، لمبی سانس لی اور کچھ یاس آمیز لہجہ میں کہا اچھا لاؤ نسخہ دکھاؤ۔

"نسخہ؟" مریض بولا "حضور نسخہ تو آپ کے ارشاد کے مطابق میں نے جوش دے کر پی لیا"

حکیم صاحب نے گھبرا کر آنکھیں اوپر اٹھائیں "کیا کہا! نسخہ پی لیا"

"جی حضور نسخہ جوش دے کر پی لیا جیسا کہ آپ نے بتایا تھا کہ اس کو ...."

"ارے بدبخت" حکیم صاحب غصہ سے بولے "کہیں نسخہ بھی جوش دے کر پیا جاتا ہے، نسخہ میں جو دوا لکھی جاتی ہے وہ استعمال کی جاتی ہے نہ کہ نسخہ کا کاغذ"

وہ اسلام پر کتاب لکھ رہے ہیں

ڈاکٹر آر۔ پی۔ تریپاٹھی مغل تاریخ پر سند کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی کتاب ہسٹری آف دی مغلس نے اپنے موضوع پر غیر معمولی شہرت حاصل کی ہے۔ وہ اردو، فارسی، ہندی، سنسکرت اور انگریزی زبانوں سے بخوبی واقف ہیں۔ آج کل وہ لندن کے قریب اسکس میں مقیم ہیں اور اسلام پر ایک کتاب لکھ رہے ہیں ۸۶ سال کی عمر کے باوجود وہ چار سال سے ہر روز کم از کم سات مکمل گھنٹے مطالعہ میں صرف کرتے ہیں تاکہ اس عظیم مذہب کے بارے میں اپنی کتاب کے لئے مواد جمع کر سکیں۔

ڈاکٹر تریپاٹھی کی ابتدائی تعلیم لکھنؤ میں ہوئی جہاں ان کے والد سرکاری ملازمت میں تھے۔ بنارس یونیورسٹی سے انھوں نے ایم۔ اے کیا۔ اس کے بعد الہ آباد یونیورسٹی میں لکچرر کی جگہ مل گئی۔ اس زمانہ میں ایک بار ایسا ہوا کہ ایک انگریز افسر نے اتفاقاً ان کا لکچر سنا۔ اس لکچر سے وہ متاثر ہوا اور اس نے اس کا اعتراف اس طرح کیا کہ لندن کے اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز میں ان کو اسکالرشپ دلوادی۔ یہ ۱۹۱۶ء کا واقعہ ہے مگر جب وہ لندن پہنچے تو اسکول کے پرنسپل نے کہا کہ میں آپ کو براہ راست ریسرچ میں داخلہ نہیں دے سکتا۔ پہلے آپ کو ہمارے یہاں سے ایم۔ اے کا امتحان پاس کرنا ہوگا۔

ڈاکٹر تریپاٹھی کو پرنسپل کی بات پسند نہیں آئی۔ وہ مشہور پروفیسر لاسکی سے ملے اور ان کو ساری بات بتائی۔ پروفیسر لاسکی نے کہا کہ آپ کسی بھی اپنے پسندیدہ موضوع پر ایک مضمون لکھ کر مجھ کو دکھایئے۔ انھوں نے مغل ایڈمنسٹریشن پر دس صفحات کا ایک مضمون لکھ کر پیش کیا۔ پروفیسر لاسکی کو وہ مضمون پسند آگیا۔ انھوں نے ان کے اسی مضمون پر انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری دیدی۔ اور پھر لندن اسکول آف اکنامکس میں ان کو ریڈر کی جگہ دلوادی جو اس زمانہ میں کسی ہندوستانی کے لئے بہت بڑا اعزاز تھا۔ وہ ۲۰ سال تک اس اسکول میں ریڈر اور پھر پروفیسر رہے۔

Dr, R.P. Tripathi
Hornchurch
Essex, England

توسع اور رواداری

برطانیہ کی یہودی ایکٹرس وینیسا ریڈگریو (Vannesa Regdrave) کو ۱۹۷۷ میں ہالی وڈ کا بہترین انعام "آسکر ایوارڈ" ملا ہے۔ مالٹا کے سفر میں ایک اخبار نویس نے اس سے سوال کیا: "کسی فن کار کے سیاسی نظریات کس حد تک عوام کو اس کے فن کے خلاف برگشتہ کر سکتے ہیں"؟ ریڈگریو نے جواب دیا: "میں نے ایک سامع کی حیثیت سے واجنر (Wagner) کی موسیقی کو سننے سے اس لئے کبھی انکار نہیں کیا کہ ظالم ہٹلر اس کو بہت پسند کرتا تھا"

رعایت نہیں صلاحیت

ہمارے ملک کی مسلم قیادت نے مسلمانوں کے مسئلہ کے حل کا جو آخری راز دریافت کیا ہے، وہ یہ کہ "مسلمانوں کو وہ رعایتیں دی جائیں جو شیڈیولڈ کاسٹ کے لیے مخصوص کی گئی ہیں" اولاً تو یہ ممکن نہیں۔ اور بالفرض یہ ناممکن اگر ممکن بھی ہو جائے تو یہ مسئلہ کا حل نہیں۔ کیونکہ اس قسم کی کوئی رعایت زندگی کے وسیع تر حقائق کا بدل نہیں بن سکتی۔ یہ دنیا استعداد کی بنیاد پر جگہ حاصل کرنے کی دنیا ہے۔ یہاں محض رعایت سے کوئی شخص بلند مقام حاصل نہیں کر سکتا۔

دنے کرپال اور گووند کیلکر نے شیڈیولڈ کاسٹ اور قبائل کی موجودہ حالت کا جائزہ لیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ان رعایتوں نے ان طبقات کی حالت میں کوئی حقیقی تبدیلی پیدا نہیں کی ہے۔ اب بھی اگر کوئی ہریجن کامیاب ہے تو وہ وہی ہے جس نے اپنے اندر کوئی خاص صلاحیت پیدا کی تھی۔ مثلاً ڈاکٹر امبیدکر، شری جگ جیون رام، شری کے۔ آر نارائن وغیرہ۔

لکشمن ہلدر ایک مزدور تھے، پھر انھوں نے کچھ تعلیم حاصل کی اور ٹائپ کرنا سیکھا۔ اس کے بعد ان کو مرکزی حکومت میں رزروسیٹ کے تحت کلرکی کی ایک جگہ مل گئی۔ مگر ان کی انگریزی کمزور تھی۔ ان کے افسر نے ان کی کتاب میں لکھ دیا:

His English is weak

اس قسم کی رپورٹ تین سال تک درج ہوتی رہی۔ قاعدہ یہ ہے کہ اگر تین سال تک مسلسل کسی کے خلاف "بیڈ رپورٹ" ہوتی رہے تو اس کی ملازمت ختم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ لکشمن ہلدر کو ختم ملازمت کا نوٹس مل گیا۔ تاہم انھوں نے دوڑ دھوپ کی۔ ایک ڈائرکٹر کو ان پر رحم آگیا اور اس نے ان کی ملازمت میں چھ ماہ کی توسیع کر دی۔ اب لکشمن ہلدر نے محنت شروع کی اور مدت ختم ہونے تک انگریزی بولنے کی اچھی صلاحیت پیدا کر لی۔ اس کے بعد وہ دوبارہ ملازمت میں لے لئے گئے۔ (السٹریٹڈ ویکلی ۲۳ اپریل ۱۹۷۶)

لکشمن ہلدر کو بالآخر جس چیز نے جگہ دی وہ ان کی صلاحیت تھی نہ کہ رعایت۔ یہی بات ہر ایک کے لئے صحیح ہے، چاہے وہ ہریجن ہو یا غیر ہریجن

خاموشی اختیار کر لی

۱۹۶۲ میں جب چین نے ہندستان پر حملہ کیا، اس وقت مسٹر وی۔ کے۔ کرشنا منن ہندستان کے وزیر دفاع تھے۔ اس کے بعد "ان سائڈ اسٹوری" اور "ان ٹولڈ اسٹوری" قسم کی بہت سی کتابیں لکھی گئیں جن میں مسٹر منن کو اس حادثہ کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا تھا۔ اس طرح کی کتابیں اور مضامین نے اس موضوع کو لوگوں کے لئے انتہائی طور پر دلچسپ کا موضوع بنا دیا۔ کرشنا منن اس موضوع پر ایک کتاب لکھ کر ایک "بسٹ سیلر" وجود میں لا سکتے تھے۔ متعدد ناشرین نے ان کو ایسی ایک کتاب کے لئے بڑی بڑی رقموں کی پیش کش کی۔ اخبارات نے اس موضوع پر مضامین لکھنے کے لئے گراں قدر معاوضے پیش کئے۔ مگر کرشنا منن نے بالکل خاموشی اختیار کر لی۔

الفاظ جو فضا میں گم ہو گئے

مولانا محمد علی نومبر ۱۹۳۰ء میں لندن کی گول میز کانفرنس میں شریک ہوئے تھے۔ یہاں انہوں نے جو طوفان خیز تقریر کی، اس کے چند الفاظ یہ تھے:

"آج میں جس مقصد کے لئے یہاں آیا ہوں، وہ یہ ہے کہ میں اپنے ملک کو ایسی حالت میں واپس جاؤں جب کہ آزادی کا پروانہ میرے ہاتھ میں ہو۔ میں ایک غلام ملک کو واپس نہیں جاؤں گا۔ اگر آپ مجھے ہندوستان کی آزادی نہیں دیں گے تو پھر آپ کو یہاں مجھے قبر کے لئے جگہ دینی پڑے گی۔۔۔

ہمارے پاس ۳۲ کروڑ آدمی ہیں۔ جب وہ قحط اور پلیگ سے لاکھوں کی تعداد میں مرنا جانتے ہیں تو یقیناً وہ برطانوی گولی سے بھی جان دے سکتے ہیں" آج ان الفاظ کو تلاش کیا جائے تو وہ تاریخ کی الماری کے سوا اور کہیں نہیں ملیں گے۔

دہرا نقصان۔۔۔

"نیٹ جہاز کیا ہے" طالب علم سے یہ سوال پوچھا جائے اور اس کے جواب میں وہ جیٹ جہاز کی تفصیلات بتانے لگے تو امتحان کے ایک اصول کے مطابق اس کے نمبر کم کر دیئے جائیں گے۔ یعنی سوال اگر پانچ نمبر کا تھا تو غلط جواب کی وجہ سے اس کے دس نمبر کاٹ لئے جائیں گے کیونکہ غلط جواب اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ وہ نہ صرف نیٹ جہاز سے ناواقف تھا بلکہ جیٹ جہاز کو بھی نہیں جانتا تھا۔ امتحان کے اس اصول کو نمبر کی نفی (Minus Marking) کہتے ہیں۔

بعض امتحانات میں نمبر کی نفی کا جو طریقہ رائج ہے، وہ زندگی کے معاملہ میں بھی نہایت بے رحمی کے ساتھ کار فرما ہے۔ اگر کوئی شخص یا گروہ غلط اقدام کر بیٹھے تو صرف اتنا ہی نہیں ہوگا کہ وہ منزل پر نہیں پہنچے گا۔ بلکہ وہ پہلے سے بھی زیادہ منزل سے دور ہو جائے گا۔

دو سو سال کے بعد

آسٹریلیا کا رقبہ ہندوستان کے مقابلہ میں دگنا سے بھی زیادہ ہے۔ مگر اس کی آبادی بمبئی اور کلکتہ کی مجموعی آبادی سے بھی کم ہے۔ ۱۷۸۸ء میں جب برطانیہ کے کچھ مجرموں کو بطور سزا اس مقام پر لا کر ڈالا گیا جہاں آج سڈنی ہے، تو اس وقت یہاں کھانے کے لئے کچھ بھی نہ تھا۔ مایوسی اور جھنجلاہٹ میں یہ لوگ آپس میں لڑ لڑ کر مرنے لگے۔ مگر آج آسٹریلیا ایک مکمل طور پر خود کفیل براعظم ہے۔ وہ ۴۰۰ کروڑ روپے کا گیہوں ہر سال برآمد کرتا ہے اور دنیا کی اون کی کل پیداوار کا چوتھائی سے بھی زیادہ حصہ یہاں پیدا ہوتا ہے۔ قدرتی مناظر سے بھرپور اس ملک کے باشندوں کا معیار زندگی دنیا کے انتہائی چند ترقی یافتہ ملکوں میں سے ایک ہے۔

قومی کردار

دوسری جنگ عظیم میں جب کہ برطانوی فوج کے سامنے یہ مہم تھی کہ وہ ڈنکرک میں پھنسے ہوئے پانچ لاکھ فوجیوں کو فوری طور پر نکالے۔ اس وقت کے برطانی وزیر اعظم ونسٹن چرچل نے قوم سے اپیل کی کہ جن لوگوں کے پاس کشتیاں اور اسٹیمر ہیں، وہ بطور خود ان کو فلاں مخصوص مقام پر پہنچا دیں۔ پوری قوم نے اس اعلان کی تعمیل اس طرح کی کہ کوئی ایک شخص بھی نہ بچا جس نے اپنی کشتی اور اسٹیمر مقررہ مقام پر نہ پہنچادی ہو۔

ایک انسانی کمزوری

لارڈ ریتھ (۱۹۷۱—۱۸۹۰) بی بی سی لندن کے "فادر" کہے جاتے ہیں۔ وہ حیرت انگیز شخصیت کے مالک تھے۔ اور انھوں نے برطانی عوام کے اندر غیر معمولی مقبولیت حاصل کی۔

۵۲۵ صفحات پر مشتمل ان کی ذاتی ڈائری (The Reith Diaries) شائع ہوئی ہے۔ ڈائری میں حیرت انگیز طور پر وہ ہٹلر (۱۹۴۵ - ۱۸۸۹) کے لئے شاندار کارکردگی (Magnificient Efficiency) کا اعتراف کرتے ہیں۔ اس کے برعکس خود اپنے ملک کے لارڈ ونسٹن چرچل (۱۹۶۵ - ۱۸۷۴) کے لئے ان کے پاس مکار (Imposter) اور خبطی (Lunatic) کے الفاظ ہیں۔

اس فرق کی وجہ ہم کو خود ان کے اعتراف میں مل جاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں ایک انتہائی قسم کا خود پسند (Self Centered) آدمی ہوں۔ بہت کم ایسا ہو سکتا ہے کہ میں کسی دوسرے کے اندر بڑائی کا اعتراف کروں:

I will rarely admit greatness in other

لارڈ چرچل نے برطانیہ کی وزارت عظمیٰ کا مقام حاصل کر لیا۔ یہ وہ عہدہ ہے جس کے لئے لارڈ ریتھ اپنے آپ کو سب سے زیادہ موزوں سمجھتے تھے۔ چرچل کا تصور آتے ہی ان کے اندر حریفانہ نفسیات کام کرنے لگتی تھی، جبکہ ہٹلر ان کے لئے ایک غیر متعلق شخص تھا، ہٹلر کا نام ان کے اندر معاصرانہ نفسیات پیدا نہیں کرتا تھا —— یہ تھی سادہ سی وجہ مذکورہ بالا فرق کی۔

میں سوچ رہا ہوں

راجہ راؤ ایک میسوری برہمن ہیں اور ہندستان کے مشہور فلسفی ہیں۔ ہندستان میں اپنی تعلیم کی تکمیل کے بعد ۱۹۲۹ میں وہ مزید مطالعہ کے لئے پیرس گئے۔ اور ۱۹۵۰ میں پہلی بار امریکہ کا سفر کیا۔ ۱۹۷۳ میں امریکہ کی ٹیکسس یونیورسٹی میں ان کو فلسفہ کے مہمان پروفیسر کی حیثیت سے بلایا گیا۔ اس قیام کے دوران ایک امریکی مصنفہ الزبتھ وول نے ان سے مفصل انٹرویو لیا۔ الزبتھ وول دوبار ہندستان آچکی ہیں۔ انٹرویو کا ایک فقرہ یہ ہے:

راؤ اپنی ذہنی زندگی کی حفاظت کرنے میں بڑے مستعد ہیں۔ وہ بغیر کسی احساس ندامت کے محض اس بنا پر کسی ملاقاتی سے ملنے سے انکار کر سکتے ہیں کہ وہ "سوچ" رہے ہیں۔

اس میں ہم صرف اتنا اضافہ کریں گے کہ یہ کہنے کے لئے بھی امریکہ کی سرزمین چاہئے۔ ہندستان میں اگر کوئی ایسا کہے تو اس کو پاگل کا خطاب ملے گا یا مغرور کا۔

کامیابی کا راز یہ ہے کہ آدمی اپنی ناکامی کے راز کو سمجھ لے

مولانا عبدالماجد دریا بادی (۱۸۹۲-۱۹۷۷) کے دادا مفتی محمد مظہر کریم صاحب اپنے وقت کے ایک ممتاز عالم تھے۔ ۱۸۵۷ کے ہنگامہ میں علما نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا جو فتویٰ دیا، اس پران کے بھی دستخط تھے۔ اودھ کے دوسرے علما مثلاً مولانا فضل حق خیر آبادی، مفتی عنایت احمد (مؤلف علم الصیغہ) وغیرہ کے ساتھ انھیں بھی حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ملی۔

قید کے زمانہ میں کوئی کام نہیں تھا۔ چنانچہ مولانا مظہر کریم صاحب نے ایک ضخیم عربی کتاب کا اردو ترجمہ کرڈالا۔ وہاں کے انگریز افسر کو اس کی خبر ملی تو اس نے اس کو ایک "علمی کارنامہ" قرار دیا، اور اتنا خوش ہوا کہ حکومت سے ان کے حق میں پر زور سفارش کی۔ اس سفارش کے بعد اگرچہ فوری طور پر ان کی رہائی نہ ہوسکی تاہم ان کی قید کی میعاد میں کافی کمی کردی گئی —— سیاسی حریف کی حیثیت سے انگریز مولانا مظہر کریم کا دشمن تھا، علمی اور تعمیری کام کرنے والے کی حیثیت سے وہ ان کا دوست بن گیا۔

یہ چھوٹا سا واقعہ ہماری جدید تاریخ کی تصویر ہے۔ جن میدانوں میں ہمارے لئے کام کے مواقع تھے، وہاں کام کرنے سے ہم کو کوئی دلچسپی نہیں ہوئی، اور جس میدان میں کام کا موقع نہیں ہے، وہاں ہم اپنا سر ٹکرا رہے ہیں۔ مزید نادانی یہ کہ اس لاحاصل کام کا نام ہم نے جہاد رکھ لیا ہے۔

یہ بے اعتمادی کی فضا

یہ اعظم گڑھ ریلوے اسٹیشن کا واقعہ ہے۔ میں بکنگ کی کھڑکی پر اپنا ٹکٹ لے رہا تھا۔ اتنے میں ایک دیہاتی آیا اس کو کسی مقام کا ٹکٹ لینا تھا جس کی قیمت پانچ چھ روپے ہوتی تھی۔ اس نے ریزگاری بکنگ کلرک کے سامنے پیش کرتے ہوئے اپنا ٹکٹ مانگا۔ مٹھی بھر ریزگاری دیکھ کر کلرک بگڑ گیا۔ "روپیہ لے آؤ۔ ہم کب تک اس کو گنتے رہیں گے"۔ اس نے کہا اور دوسرے مسافر کی طرف متوجہ ہوگیا۔

دیہاتی آدمی کھڑکی سے نکل کر باہر آگیا۔ مجھے اس کی حالت پر ترس آیا۔ میں اس کے قریب گیا اور اس سے کہا کہ یہ ریزگاری مجھ کو دے دو اور اس کے بدلے مجھ سے نوٹ لے لو۔ دیہاتی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک لمحہ کے لئے اس نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر خاموشی سے ایک طرف روانہ ہوگیا۔

دیہاتی نے میری پیش کش کیوں قبول نہ کی۔ اس کی وجہ بے اعتمادی ہے۔ ہم ایک ایسے سماج میں ہیں جہاں کسی کو دوسرے پر بھروسہ نہیں۔ آج اگر کوئی شخص کسی پر مہربان ہوتا ہے تو صرف اپنے فائدہ کے لئے نہ کہ حقیقتہً دوسرے کی مدد کے لئے۔ دیہاتی نے غالباً یہ سوچا کہ میرے پاس کچھ خراب نوٹ ہوں گے اور اس موقع سے فائدہ اٹھا کر میں ان کو دیہاتی کی ریزگاری سے بدل لینا چاہتا ہوں۔

اور ہمارے عوامی حکمراں!

ROYAL FARE FOR RICKSHAW-PULLER

KATHMANDU, Nov 1[illegible].—King Birendra and Queen Aishwarya rode a cycle rickshaw through the border town of Birganj, in eastern Nepal, says Samachar.

An English daily, Motherland, yesterday reported that as the tired rickshaw-puller was calling it a day after paltry earnings, he found a young couple briskly walking across the road and boarding his rickshaw.

The passengers wanted to see the town and the rickshaw-puller was too pleased to show the "tourists" around. He explained the various landmarks to them and talked about his hopes to earn a lot of money.

After half-an-hour's ride the passengers got down and the rickshaw-puller stared in disbelief when he was paid [illegible] as fare.

The Motherland reported that the King often travelled incognito to study the problems of the poor.

بیرگنج، نیپال کا ایک قصبہ ہے جو ریاست کی مشرقی سرحد پر واقع ہے۔ نیپال کے مہاراجہ اور مہارانی یہاں حفاظتی عملہ یا افسروں کے غول کے بغیر تنہا گھومتے رہے۔ ان کی سواری ایک معمولی سائیکل رکشا تھا۔ غریب رکشے والا دن بھر کا تھکا ہوا اپنی معمولی کمائی پر افسردہ چلا جا رہا تھا کہ ایک جوڑے نے اس کو روکا، جو سڑک کے کنارے پیدل چل رہا تھا اور اس پر سوار ہو گئے۔

دونوں سواروں نے شہر کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی اور رکشے والا ان "سیاحوں" کو خوشی خوشی قصبہ کی سیر کراتا رہا۔ اور مختلف مقامات کے بارے میں ان کو بتاتا رہا۔ آدھ گھنٹہ کی سواری کے بعد دونوں مسافر رکشے سے اتر گئے۔ رکشے والے کو اس وقت سخت حیرانی ہوئی جب اس نے دیکھا کہ دونوں مسافروں نے اسکو کرایہ کے طور پر دو ہزار روپے دیئے ہیں۔ مہاراجہ نیپال کے لئے یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں تھا۔ وہ اکثر اسی طرح بھیس بدل کر ریاست کے مختلف مقامات پر جاتے ہیں تاکہ غریب عوام کے مسائل کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں۔

موت کے وقت توبہ

پچاس برس پہلے کی بات ہے جب کہ ساری دنیا میں یورپ کی مسیحی قوموں کا غلبہ تھا۔ قاہرہ کے ایک عیسائی مشنری مسٹر واٹسن سے ایک شخص نے پوچھا: کتنے دنوں سے آپ مسیحی تبلیغ کے میدان میں کام کر رہے ہیں۔ "پچاس سال سے" پادری نے جواب دیا۔ "اتنے دنوں میں کتنے مسلمانوں نے عیسائیت کو اختیار کیا" اس کا اگلا سوال تھا۔ "تقریباً ڈیڑھ سو" پادری نے کہا۔ اور پھر فوراً ہی بولا: "مگر پھر بھی آپ کو خبردار رہنے کی ضرورت ہے۔"

سوال کرنے والے کے لئے پادری کا یہ جملہ غیر متوقع تھا۔ "اس سے آپ کی کیا مراد ہے" اس نے دوبارہ پوچھا۔ اس کے بعد پادری نے جو جواب دیا وہ یہ تھا:

> They are apt to become Christian for material motives. Then at their death they recant.

وہ مادی محرک کے تحت عیسائی ہو جاتے ہیں اور پھر موت کے وقت توبہ کر لیتے ہیں

Stanwood Cobb,
Security for a Failing World,
Baha'i Publishing Trust
P. O. Box 19, New Delhi 1
1971, P. 91

خدا کی طرف

مارکونی پہلا شخص تھا جس نے ۱۹۰۱ء میں بحر اٹلانٹک کے ایک طرف سے دوسری طرف ریڈیو لہریں بھیجنے میں کامیابی حاصل کی۔ اس وقت یہ معلوم نہ ہوسکا تھا کہ وہ کون سا ذریعہ ہے جس نے لہروں کے اس سفر میں مدد دی ہے۔ ۱۹۲۴ میں ایڈورڈ اپیلٹن وغیرہ نے دریافت کیا کہ یہ زمین کی اوپری فضا میں آئنواسفیر کی موجودگی ہے جو لاسلکی پیغام رسانی کو ممکن بناتی ہے۔

تاہم یہ سوال اب بھی باقی ہے کہ فضا میں آئنواسفیر کا یہ حیرت انگیز نظام کس نے قائم کر رکھا ہے —— اس قسم کے سوالات کا سائنس کے پاس کوئی جواب نہیں۔ ساری ترقیات کے باوجود علم کی یہ بے بسی انسان کو خدا کے سامنے جھکنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اس سلسلے کا تازہ واقعہ یہ ہے کہ چاند پر جانے والے امریکی خلاباز جیمز ارون نے اپنا آبائی مذہب چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا ہے۔ علم کی ترقی نے انسان کے اس احساس میں صرف اضافہ کیا ہے کہ خدا کے آگے جھکنے کے سوا اس کے لئے کوئی دوسرا راستہ نہیں۔

کام کا صحیح طریقہ

شری نانک جی موٹوانی (۱۹۰۲ - ۱۹۷۰) ایک آزادی پسند ہندستانی تھے۔ ۱۹۴۲ میں ان کو نظربندی کی سزا ہوئی۔ وہ آٹھ مہینے جیل میں رہے۔ مہاتما گاندھی، سردار پٹیل، پنڈت نہرو، راجندر پرشاد وغیرہ سے ان کے قریبی تعلقات تھے۔

یہی نانک جی موٹوانی ہیں جنھوں نے ہندستان میں سب سے پہلے لاؤڈ اسپیکر کی صنعت قائم کی۔ انھوں نے دیکھا کہ ہندستانی لیڈروں کے جلسہ میں بہت بڑا بڑا مجمع اکٹھا ہوتا ہے۔ مگر لاؤڈ اسپیکر نہ ہونے کی وجہ سے مقرر کی آواز پوری طرح لوگوں تک نہیں پہنچتی۔ انھوں نے اس کمی کو پورا کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسی فیصلہ کا نتیجہ مشہور لاؤڈ اسپیکر شکاگو ریڈیو (Cincago Radio) تھا، جس سے آج سارا ہندستان واقف ہے۔

صرف اخبار نکالنا اور جلسہ کرنا کام نہیں۔ کام یہ ہے کہ مختلف لوگ مختلف ضرورتوں کو پورا کرنے میں لگیں۔ اس کے بغیر حقیقی ترقی نہیں ہوسکتی۔

کون کس کی جیب میں

پہلی جنگ عظیم کے بعد جس زمانہ میں خلافت تحریک کا زور تھا، علی برادران نے ملک کا دورہ کیا۔ ان کے ساتھ مہاتما گاندھی اور مولانا ابوالکلام آزاد بھی تھے۔ جو ان دنوں ترک موالات کی تحریک چلا رہے تھے۔ مولانا شوکت علی ان دنوں اکثر فخریہ انداز میں کہتے تھے "گاندھی جی میری جیب میں ہیں"۔ کچھ دنوں بعد سیاسی اختلافات ہوئے اور علی برادران نے مہاتما گاندھی کا ساتھ چھوڑ دیا اور اپنا راستہ الگ اختیار کیا۔ مولانا محمد علی لندن میں انتقال کر گئے۔ اور مولانا شوکت علی محمد علی جناح کے ساتھ مل گئے۔

ایک بار مسلم لیگ کے جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے مولانا شوکت علی نے کہا: "مہاتما گاندھی کہاں ہیں جنھوں نے گول میز کانفرنس میں اعلان کیا تھا کہ وہ مسلمانوں کو سادہ چک دینے کے لئے تیار ہیں"۔ مہاتما گاندھی کو معلوم ہوا تو انھوں نے اپنی پرارتھنا کی تقریر میں اس کا جواب دیتے ہوئے کہا: "بڑے بھائی کو اپنی جیب دیکھنا چاہئے۔ وہ مجھ کو وہاں پائیں گے" (ریڈینس ۲۹ نومبر ۱۹۸۰)

کیسا عجیب

مغربی پاکستان کے سابق گورنر امیر محمد خاں (متوفی ۱۹۶۷ء) نے یورپ میں زرعی سائنس کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ صدر ایوب کی حکومت کے زمانہ میں پاکستان میں جو "سبز انقلاب" آیا تھا اس کا سہرا دراصل ملک امیر محمد خاں ہی کے سر ہے جو اس وقت پاکستان کے غذائی و زرعی کمیشن کے صدر تھے اور بعد کو اپنی خدمات کے اعتراف میں گورنر بنا دیے گئے۔ وہ مشرقی تہذیب کا نمونہ تھے گورنر ہاؤس میں نماز روزہ کی سختی سے پابندی کرتے اور ان کے گھر کی خواتین ہمیشہ پردہ کے اندر رہتیں۔

جب پاکستان کے تیسرے منصوبہ میں خاندانی منصوبہ بندی کے لیے ۳۰ کروڑ روپے کی رقم رکھی گئی تو انھوں نے اس کی سخت مخالفت کی۔ بات بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ صدر ایوب نے جھنجھلا کر کہہ دیا کہ اگر آبادی کی روک تھام نہ ہوئی تو ایک وقت وہ آئے گا جب اناج کی کمی کی وجہ سے ایک پاکستانی دوسرے پاکستانی کو بھون کر کھائے گا خوشی صرف اس بات کی ہے کہ اس وقت میں زندہ نہیں رہوں گا۔

ملک امیر محمد خاں نے ستمبر ۱۹۶۶ میں گورنری سے استعفا دے دیا۔ اور اپنے آبائی وطن کالا باغ چلے گئے۔ جہاں ان کے کھیت اور باغات تھے یہاں ان کے گھر پر جائداد کا جھگڑا شروع ہوا۔ بالآخر ایک روز وہ خود اپنے بیٹے ملک محمد اسد خاں کے خلاف رائفل لے کر کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے اپنے بیٹے پر گولی چلائی مگر وہ کندھے کو زخمی کرتی ہوئی نکل گئی۔ اب بیٹے کی باری تھی۔ اس نے چھ گولیاں اپنے باپ کے جسم میں اتار دیں۔ اور وہ وہیں موقع پر ختم ہو گئے۔

وہ شخص جس نے خاندانی منصوبہ بندی کو قتل قرار دے کر گورنری کے عہدہ کو چھوڑ دیا تھا، بالآخر خود اپنے بیٹے کے خلاف بندوق لے کر کھڑا ہو گیا اگرچہ اس مقابلہ میں جوان بیٹا بوڑھے باپ پر غالب آیا اور نتیجہ برعکس شکل میں برآمد ہوا۔

توہم پرستی کہاں تک لے جاتی ہے

اہل کارتھیج اور رومیوں کی مشہور جنگ میں جب کارتھیج کے باشندوں کو شکست ہوئی تو انھوں نے سمجھا یہ اس غلطی کا نتیجہ ہے جو مولوک دیوتا کی عبادت کے سلسلہ میں ان سے ہوتی رہی ہے۔ یہ دیوتا ان کے عقیدے کے مطابق ان کے اشراف کے لڑکوں کی قربانی پسند کرتا تھا۔ مگر کارتھیج کے اعلیٰ خاندانوں نے اپنے لڑکوں کو بچانے کے لیے کئی سال یہ کیا کہ وہ قربانی کے دن چپکے سے کسی معمولی لڑکے کو پکڑ کر اسے قربان کر دیتے تھے۔ جب انھیں شکست ہوئی تو انھوں نے سمجھا کہ ان کی اس بدعنوانی کی وجہ سے دیوتا ناراض ہو گیا ہے۔ چنانچہ اعلیٰ خاندان کے کئی لڑکے مقدس آگ میں جھونک دیے گئے۔

خود را فضیحت دیگراں را نصیحت

ڈاکٹر محمد اقبال کے پاس ایک بزرگ وراثت کے معاملہ میں قانونی مشورہ کے لئے آیا کرتے تھے۔ چونکہ ڈاکٹر صاحب داڑھی نہیں رکھتے تھے، وہ اکثر داڑھی کی اہمیت پر وعظ کہتے۔ آخر ایک دن ڈاکٹر اقبال نے کہا: آپ کی وعظ وتلقین کا میرے اوپر بہت اثر ہوا ہے۔ اب میں نے طے کیا ہے کہ آپ سے ایک معاہدہ کروں۔ جس طرح داڑھی نہ رکھنا ایک شرعی کوتاہی ہے، اپنی بہن کو وراثت سے محروم کرنا بھی اسی طرح شریعت کی خلاف ورزی ہے پہلے گناہ میں میں مبتلا ہوں تو دوسرے میں آپ مبتلا ہیں۔ آئیے طے کیجئے۔ آج سے میں داڑھی رکھ لیتا ہوں اور آپ اپنی بہن کا وراثتی حصہ دے دیں۔ بزرگ اس معاہدہ کے لئے تیار نہ ہوئے۔ انھوں نے نہ اپنی بہن کو وراثت کا حصہ دیا اور نہ ڈاکٹر اقبال کے چہرہ پر داڑھی اگ سکی۔

آدمی کو اپنی غلطیوں کا پتہ نہیں ہوتا۔ البتہ وہ دوسرے کی غلطیوں سے خوب باخبر ہوتا ہے۔ حالاں کہ آدمی کو جو چیز سب سے زیادہ جاننا چاہئے وہ خود اپنی غلطی ہے۔ کیوں کہ اپنی غلطیوں کا جاننا ہی آخرت میں کسی کے کام آئے گا نہ کہ دوسروں کی غلطیوں کو جاننا۔

آپ کو ڈاکٹر کی ضرورت نہیں ہوگی

ایک شخص نے ایک دیہاتی آدمی کو دیکھا ساٹھ سال سے زیادہ عمر ہونے کے باوجود وہ خوب تندرست اور سرگرم دکھائی دیتا تھا "آپ کی صحت کا راز کیا ہے" اس نے پوچھا۔ دیہاتی کا جواب یہ تھا:

"میرے من میں جب بھی ایسا ہوتا ہے کہ کھاؤں یا نہ کھاؤں تو میں ہمیشہ نہ کھاؤں کو ترجیح دیتا ہوں"

یہ بات جو ایک دیہاتی ان پڑھ نے بتائی، یہی بات سقراط نے ان لفظوں میں کہی تھی "اس وقت تک نہ کھاؤ جب تک تم بھوک سے بے تاب نہ ہو جاؤ"

غذا ہی میں انسان کی طاقت ہے مگر یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ غذا ہی آدمی کی ساری بیماریوں کی جڑ ہے۔ غلط خوراک یا ناقص خوراک جتنی مضر ہے اتنی ہی مضر یہ بات بھی ہے کہ آدمی بھوک کے بغیر کھائے یا ضرورت سے زیادہ اپنے پیٹ کو بھرے۔

صحت کا راز ایک لفظ میں صرف یہ ہے: "صحیح خوراک معتدل مقدار میں"

اگر آدمی صرف اس ایک اصول کو پوری طرح پکڑ لے تو اس کو زندگی بھر ڈاکٹر کی ضرورت نہیں ہوگی۔

ہر شعبہ میں کام کی ضرورت

جنوب مغربی سمت سے ماؤنٹ ایورسٹ پر چڑھائی کرنا اب تک بہت مشکل سمجھا جاتا تھا۔ اگست ۱۹۷۵ میں پہلی بار اس کو ایک برطانوی ٹیم نے سر کیا جس کے قائد کریس بونگٹن تھے۔ کہا جاتا ہے کہ برطانوی ٹیم کی اس کامیابی کا اہم سبب ایک برطانوی فرم کی ایک ایجاد تھی۔ اس نے بہت ہلکے وزن کے آکسیجن سلنڈر بنائے۔ ان سلنڈروں کے ذریعہ یہ ممکن ہوگیا کہ ایک سو لیٹر آکسیجن ایک ایسے سلنڈر میں رکھا جا سکے جس کا وزن صرف ۳ر۴ کیلو گرام ہو۔ یعنی تقریباً نہیں کے برابر۔

یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قومی زندگی میں کس طرح ایک شعبہ میں کچھ لوگوں کے آگے بڑھنے کے لئے ضروری ہے کہ دوسرے شعبوں میں کچھ دوسرے لوگ آگے بڑھے ہوئے ہوں۔ جس قوم میں سارے لوگ صرف تقریر و تحریر کا کمال دکھانے لگیں، وہ کبھی ترقی کے مقام پر نہیں پہنچ سکتی۔

ملک خدا بخش مشہور مسلم قانون داں گزرے ہیں۔ وہ انگریزی ہندوستان میں ایڈوکیٹ جنرل تھے اور ۱۹۳۲ سے ۱۹۳۷ تک لیجسلیٹو کونسل میں حزب مخالف کے لیڈر رہے۔ انھوں نے برطانوی صحافی بیورلی نکلس سے ایک ملاقات کے دوران بڑی شدت کے ساتھ کہا تھا:

"ہندو اردو زبان کو ہٹا کر ہندوستانی کو اس کی جگہ بٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن اردو بڑی سخت جان ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ لفظ "اردو" کیا معنی رکھتا ہے؟ اس لفظ کے معنی ہیں لشکر۔ گویا یہ ایک لشکر ہے جس پر ہندوستانی زبان کبھی فتح نہیں پا سکتی۔"

ورڈکٹ آن انڈیا (۱۹۴۴)

اس قسم کا استدلال صرف ادبی استدلال ہوتا ہے اور

ادبی استدلال

ضروری نہیں کہ حقیقت واقعہ بھی ادبی استدلال کے ساتھ موافقت کرے۔

شعر و شاعری اور خطابت کے رواج نے ہماری ذہنی زندگی میں جو خرابیاں پیدا کیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ خالص حقیقت پسندانہ اور سائنٹفک انداز فکر ہمارے یہاں پیدا نہ ہو سکا۔ کتنے عالی دماغ لوگ اس قسم کے دلائل کے بھروسہ پر صدیوں جیتے رہے ہیں۔ یہاں تک کہ جب ان کی خیالی دلیل خارجی حقیقت سے ٹکرائی تو معلوم ہوا کہ وہاں سرے سے کوئی دلیل ہی موجود نہ تھی۔

وہ صفحہ جو خالی رہا

مولانا عبدالماجد دریا بادی (۱۹۷۷ - ۱۸۹۲) مولانا محمد علی (۱۹۳۱ - ۱۸۷۸) کے بارہ میں فرماتے ہیں:
میرے دوست مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت بھی میرے لئے مشعل راہ ثابت ہوئی۔ بیتاب ہوکر تڑپ کر جوش و خروش
للکارتے تھے "عبدالماجد اٹھو، چل کر ملحد یورپ میں تبلیغ اسلام کریں" صدق جدید (لکھنؤ) ۲ رجون ۱۹۷۷
لٹر محمد اقبال (۱۹۳۸ - ۱۸۷۷) نے آخر عمر میں ایک کتاب لکھنے کا ارادہ کیا تھا۔ جس کا نام انھوں نے تجویز کیا تھا:

An introduction to the study of Quran

طالعہ قرآن کا ایک تعارف)۔ فرماتے تھے "ایک بار کتاب شروع کی تو انشاء اللہ اسلام کے بارے میں یورپ
تمام نظریات توڑ پھوڑ کر رکھ دوں گا" شیرازہ (سری نگر) اقبال نمبر، صفحہ ۶۶

اس طرح کے پرجوش ارادہ کی مثالیں ہمارے یہاں بہت سی ملیں گی۔ مگر عجیب بات ہے کہ اس پوری مدت
کوئی ایک بھی قابل ذکر شخص نہیں ملتا جس نے مغرب کے انسانوں کے سامنے ان کی زبان میں اسلام کا پیغام
نچانے کی کوشش کی ہو۔

بطرس بن بولس بستانی مارونی (۱۸۸۳ - ۱۸۱۹) بستان کا ایک عیسائی عالم تھا۔ وہ عربی، سریانی،
لاطینی، اطالوی، انگریزی، عبرانی، یونانی زبانیں جانتا تھا۔ فلسفہ، علم الٰہیات، قانون، تاریخ، جغرافیہ اور
حساب کی تعلیم حاصل کی۔ اس نے امریکی عیسائیوں کی ایک ٹیم کے ساتھ مل کر تورات کا ترجمہ کیا۔ المدرسۃ الوطنیہ
کے نام سے ایک اسکول قائم کیا۔ یہ مدرسہ اتنا مقبول ہوا کہ شام، مصر، آستانہ، یونان اور عراق تک کے طلبہ
اس میں تحصیل علم کے لئے آتے تھے۔ اس نے قاموس المحیط کے نام سے جدید طرز کا عربی لغت لکھا۔
قطر المحیط کے نام سے ایک انسائیکلو پیڈیا لکھنی شروع کی۔ چھ جلدیں شائع کرسکا تھا کہ اس کا
انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد اس کے لڑکے سلیم نے ساتویں اور آٹھویں جلدیں شائع کیں۔ نویں جلد کو ترتیب
دیتے ہوئے اس کا بھی انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد دوسرے بیٹوں نے نویں جلد مکمل کی۔ اس کے بعد
بطرس بستانی کے بھائی سلیمان بستانی نے دسواں اور گیارھواں حصہ لکھا۔
ایک کام کو پشت در پشت آگے بڑھانے کا یہ طریقہ اس کی کامیابی کی سب سے زیادہ یقینی ضمانت ہے۔

عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

لا تعتمد علیٰ خلق رجل حتی تجربه عند الغضب
(العبقریات الاسلامیه، ۵۰۵)

کسی آدمی کے حسن اخلاق پر بھروسہ مت کرو جب تک غصہ کے وقت اس کا تجربہ نہ کر لو۔

اشتعال کے بغیر

جب غصہ دلانے والی بات کی جائے تو اس کے جواب کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی بھڑا ٹھے اور ناقد پر طعن طعن کرنے لگے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ناقد کی بات کو بالکل ٹھنڈے ذہن سے سنا جائے۔ اس کی بات کے غیر متعلق پہلوؤں کو نظر انداز کرتے ہوئے اصل بات کا جواب بالکل سادہ طریقے سے دے دیا جائے۔ دونوں طریقوں میں صرف دوسرا طریقہ اسلامی طریقہ ہے۔ اس سلسلے میں یہاں چند مثالیں نقل کی جاتی ہیں۔

۱۔ ابن عبد البر اندلسی (م ۴۶۳ ھ) لکھتے ہیں:

ددیانان طاؤس و وهب بن منبه التقیا فقال طاؤس لوهب یا ابا عبد الله بلغنی عنك امر عظیم۔ فقال ماهو۔ قال تقول ان الله حمل قوم لوط بعضهم علیٰ بعض۔ قال اعوذ بالله۔ ثم سکتا قال نقلت هل اختصما قال لا۔

جامع بیان العلم وفضلہ، جزء ثانی، صفحہ ۹۵

ہم سے بیان کیا گیا کہ طاؤس اور وہب بن منبہ دونوں ایک دوسرے سے ملے۔ طاؤس نے وہب سے کہا۔ اے ابو عبد اللہ، آپ کے بارے میں مجھے ایک بڑی سنگین بات پہنچی ہے۔ انھوں نے پوچھا وہ کیا۔ طاؤس نے کہا، میں نے سنا کہ آپ کہتے ہیں کہ اللہ ہی نے تو قوم لوط کے بعض لوگوں کو بعض لوگوں پر چڑھایا تھا۔ یہ سن کر وہب نے کہا اللہ کی پناہ۔ پھر دونوں چپ ہو گئے۔ میں نے راوی سے پوچھا۔ کیا دونوں میں بحث ہوئی۔ انھوں نے جواب دیا نہیں۔

۲۔ مولانا احمد علی لاہوری کے صاحبزادہ مولانا حبیب اللہ لاہوری نے مولانا سید حسین احمد مدنی (۱۸۷۹–۱۹۵۷) کا ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ وہ دار العلوم دیوبند میں مولانا مدنی کے دورۂ حدیث میں شریک تھے۔ شرکاء درس میں سے کسی طالب علم کو شرارت سوجھی۔ اس نے مولانا کے پاس ایک رقعہ بھیجا اور اس کے ذریعہ تحریری طور پر یہ سوال کیا کہ آپ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ آپ حرامی ہیں۔ مولانا مدنی نے رقعہ لے کر رکھ لیا اور پہلی نشست میں کوئی جواب نہیں دیا۔ دوسری نشست میں جب طلبہ جمع ہوئے تو آپ نے فرمایا "کسی دوست نے مجھ کو رقعہ لکھا ہے کہ تو اپنے باپ سے نہیں ہے۔"

یہ سنتے ہی تمام مجلس میں ہیجان برپا ہو گیا۔ طلبہ غیظ و غضب سے بھر گئے کہ کس گستاخ نے یہ حرکت کی ہے۔ مولانا مدنی نے فرمایا "خبردار کسی کو غصہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ میرا حق ہے کہ میں سوال کرنے والے کی تسلی کر دوں"، پھر سنجیدگی کے ساتھ فرمایا۔ "میں ضلع فیض آباد قصبہ ٹانڈہ کا رہنے والا ہوں۔ اس وقت بھی میرے والدین کے نکاح کے گواہ زندہ ہیں۔ خط بھیج کر سمجھ لیا جائے۔"

یہ داستانیں

مشہور ہے کہ مہلہل کے یہاں جب اس کی لڑکی
[ک]ہ پیدا ہوئی تو اس نے اس کو زندہ درگور کر دینے کا حکم
[د]ے دیا۔ مگر بچی کی ماں نے اس کو چھپا دیا۔ رات کو
[م]ہلہل نے خواب دیکھا کہ ایک شخص اس کو بتا رہا ہے
[ا]س کی لڑکی ایک قابل لڑکا جنے گی۔ صبح ہوئی تو اس
[ل]ڑکی کے بارے میں پوچھ گچھ کی۔ اس کو بتایا گیا کہ وہ
[ا]س کے حکم کے مطابق زندہ دفن کر دی گئی ہے۔ مہلہل
[نے] نہ مانا۔ اس نے مزید اصرار شروع کیا۔ آخر کار لڑکی
[ا]س کے سامنے پیش کی گئی۔ اس نے حکم دیا کہ اس کو عمدہ
[غذ]ائیں کھلائی جائیں۔

اس لڑکی کی شادی کلثوم سے ہوئی۔ اب لڑکی اکثر خواب دیکھنے لگی کہ کوئی شخص آتا ہے اور اس کے ہونے والے بچہ کے بارے میں عجیب عجیب باتیں بتاتا ہے۔ بالآخر اس کے یہاں ایک بچہ پیدا ہوا۔ یہی وہ مشہور شاعر ہے جس کو دنیا عمرو بن کلثوم کے نام سے جانتی ہے۔

تاریخ ادب کے ناقدین اس قصہ کو من گھڑت کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ قصہ عمرو بن کلثوم کی شہرت کے بعد فرضی طور پر بنا لیا گیا ہے۔ مگر اسی قسم کے، اس سے زیادہ من گھڑت قصے "بزرگوں" کے بارے میں تصنیف کر لئے گئے ہیں اور ان کو لوگ اس طرح پڑھتے اور سنتے ہیں جیسے وہ وحی آسمانی ہو۔ جس چیز کے ساتھ تقدس کا عنصر شامل ہو جائے وہ ہر جانچ سے بالاتر ہو جاتی ہے۔ بالکل بے اصل کہانیوں کو لوگ اس طرح ماننے لگتے ہیں جیسے وہ کوئی حقیقی تاریخ ہو۔

لطیفہ

شیخ سعدی شیرازی (۱۲۹۲ - ۱۱۹۳) کی عمر کا بیشتر حصہ بے سروسامان درویشوں کی طرح سفر میں گزرا۔ ایک مرتبہ دمشق میں تھے، وہاں کے لوگوں سے کسی بات پر ناراضگی ہوئی تو فلسطین کے بیابان میں چلے گئے۔ یہ صلیبی جنگوں کا زمانہ تھا۔ وہاں عیسائیوں نے ان کو پکڑ لیا اور طرابلس الشرق (لبنان) کے علاقہ میں خندق کھودنے کے کام پر دوسرے قیدیوں کے ساتھ لگا دیا۔ وہ خاموشی کے ساتھ اس مشقت کو برداشت کرتے رہے۔ مدت کے بعد حلب کا ایک معزز آدمی اس طرف سے گزرا۔ وہ شیخ سعدی کو جانتا تھا۔ انھیں اس حال میں دیکھ کر اس کو بہت افسوس ہوا۔ دس دینار دے کر شیخ کو قید فرنگ سے چھڑایا اور اپنے ساتھ حلب لے گیا۔ وہاں عزت کے ساتھ اپنے گھر رکھا اور مزید عنایت یہ کی کہ اپنی ناکتخدا بیٹی سے ان کا نکاح ایک سو دینار مہر موجل پر کر دیا۔ مگر بیوی سخت بدمزاج اور تیز زبان نکلی۔ اس نے شیخ کو بے حد پریشان کر دیا۔ ایک روز طعنہ دیتے ہوئے کہا: "تم وہی ہو جس کو میرے باپ نے دس دینار میں خریدا تھا۔" شیخ سعدی نے فوراً جواب دیا:

"ہاں میں وہی ہوں جس کو آپ کے باپ نے دس دینار میں خریدا اور سو دینار میں آپ کے ہاتھ بیچ ڈالا۔"

استعمال کا فرق

ڈاکٹر پرمود کمار نے دہلی سے امراض نسواں (Gynaecology) میں خصوصی ڈگری لی اور اس کے بعد لندن (آکسفورڈ اسٹریٹ) میں اپنا مطب کھولا۔ ایک روز ایک انگریز خاتون تیزی سے ان کے مطب میں داخل ہوئی۔ "ڈاکٹر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اپنی بات کو کس طرح بیان کروں" اس نے کہا اور پھر ایک وقفہ کے بعد بولی:

I think I have a touch of the sun

ڈاکٹر کمار نے اس جملہ کا مطلب یہ سمجھا کہ خاتون غالباً کسی کھلے مقام پر گئی تھیں اور وہاں ان کو تیز دھوپ لگ گئی ہے۔ "آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں" ڈاکٹر نے مریضہ کو مشورہ دیتے ہوئے کہا "آپ ٹھنڈے مشروبات، خاص طور پر لیموں برف کے ساتھ لیجیے اور آپ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گی،، اگر جلد پر کچھ اثر محسوس ہو تو زیتون کا تیل یا کریم مل لیجیے۔"

خاتون پریشان چہرہ پر مزید حیرانی کے اثرات لئے ہوئے باہر نکل گئی اور ڈاکٹر کمار یہ سوچنے لگے "انگریز خواتین آخر اتنی معمولی معمولی باتوں کے لئے کیوں ڈاکٹر کے پاس آتی ہیں"

شام کو وہ اپنی قیام گاہ پہنچے۔ وہاں مسز گلوریا، ان کی انگریز بیوی نے ان کا استقبال کیا۔ جب دونوں کھانے کی میز پر اکٹھا ہوئے تو انگریز خاتون نے دوبارہ وہی جملہ کہا جس کو وہ اپنے مطب میں ابھی سن آئے تھے:

Darling, I think I have
a touch of the sun

ڈاکٹر کمار نے حیرانی کے ساتھ کہا "نہیں نہیں۔ اس طرح تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔ لندن کی خواتین ہر وقت بس سورج کی ہی بات کرتی ہیں۔ دیر تک الفاظ کے تبادلہ کے بعد گلوریا نے محسوس کیا کہ اس کا ہندوستانی شوہر اصل بات کو سمجھ نہیں رہا ہے، اس نے ہنستے ہوئے کہا "میرا مطلب یہ ہے کہ ہم جلد ہی تین ہونے والے ہیں۔" انگریزی زبان میں ایک عورت اپنے حاملہ ہونے کو درجنوں طریقے سے بتا سکتی ہے۔ مذکورہ بالا جملہ بھی اسی قسم کا ایک استعاراتی انداز ہے۔ جس کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ "مجھے سورج چھو گیا ہے"

لطیفہ

مرزا غالب (۱۷۹۷ — ۱۸۶۹) جس مکان میں رہتے تھے، اس مکان میں چھت کے اوپر ایک کمرہ تھا اور اس کمرہ سے ملی ہوئی ایک تنگ و تاریک چھوٹی سی کوٹھری تھی۔ گرمی کے موسم میں وہ ٹھنڈی رہتی تھی۔ سخت موسم میں مرزا اسی کوٹھری میں بیٹھتے تھے۔

ایک بار رمضان کا مہینہ تھا، سہ پہر کے وقت مرزا غالب اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ اس کوٹھری میں بیٹھے ہوئے چوسر کھیل رہے تھے اور تفریح کر رہے تھے۔ اتنے میں مفتی صدرالدین خاں آزردہ وہاں آگئے۔ کوٹھری میں لہو و لعب کا منظر دیکھ کر انھوں نے مرزا سے کہا: ہم نے حدیث میں پڑھا تھا کہ رمضان کے مہینے میں شیطان کو قید کر دیا جاتا ہے۔ آج اس حدیث کی صحت پر شبہ ہو گیا۔

مرزا غالب فوراً بولے: "مولانا! حدیث بالکل صحیح ہے۔ بات یہ ہے کہ شیطان جہاں قید کیا جاتا ہے وہ یہی کوٹھری ہے۔"

لطیفہ

گاما پہلوان (۱۹۵۸-۱۸۷۶) کو ۲۰ سال کی عمر میں "رستم ہند" اور اس کے بعد رستم زماں کا خطاب ملا تھا۔ ایک بار جلسہ ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر محمد اقبال صدر تھے۔ گاما بھی جلسہ میں موجود تھے۔ لوگ بول چکے تو آخر میں ڈاکٹر اقبال نے اعلان کر دیا کہ گاما اپنے خیالات کا اظہار کریں گے۔

گاما پہلوان کھڑے ہوئے۔ کچھ دیر انھوں نے جسم کو حرکت دی، ہاتھ ادھر ادھر ہلایا اور کہا "بھائیو! ورزش کیا کرو"

جب وہ اپنی مختصر تقریر ختم کرکے بیٹھے تو دیکھنے والوں نے یہ دیکھا کہ گاما پہلوان کی نہ صرف پیشانی پر قطرات نمایاں تھے بلکہ کرتا بھی بھیگ چکا تھا

زندہ لوگ

چینی کمیونسٹ پارٹی کے چیرمین اور وزیر اعظم مسٹر ہوا کوفنگ کا چھوٹا لڑکا ۱۹۷۷ میں کالج کے داخلہ کے ایک قومی امتحان میں فیل ہوگیا۔ داخلہ کے لئے جتنے نمبر مقرر کئے گئے تھے، وزیر اعظم کے لڑکے کا نمبر اس معیار سے کم تھا۔ اس لئے اس کا انتخاب نہ ہو سکا۔ بعد کو وزیر اعظم ہوا کے کچھ آدمیوں نے یہ مسئلہ ان کے سامنے رکھا اور چاہا کہ وزیر اعظم اس مسئلہ کو دوبارہ زیر غور لائیں اور خصوصی اختیارات سے کام لے کر لڑکے کو داخلہ دلوا دیں۔ مگر وزیر اعظم نے اس معاملہ میں دخل دینے سے صاف انکار کر دیا۔ انھوں نے اپنے لڑکے سے کہا کہ اگلے سال تم زیادہ سخت محنت کرو تاکہ تم کو زیادہ نمبر ملیں اور قاعدہ کے مطابق تمھارا داخلہ ہو سکے۔ (ہندستان ٹائمس ۷ اکتوبر ۱۹۷۸)

اس میں آپ کے لئے سبق ہے

ہنری ہراس (۱۹۵۶ - ۱۸۸۹) ایک اسپینی مسیحی تھے۔ وہ ۳۴ سال کی عمر میں ۱۸ نومبر ۱۹۲۲ کو بمبئی کے ساحل پر اترے۔ ہندستان کی زمین نے انھیں متاثر کیا اور انھوں نے طے کر لیا کہ وہ اسی ملک میں رہ کر کام کریں گے۔

فادر ہراس (Fr Henry Heras) چند دن بعد سینٹ زیویرس کالج کے پرنسپل سے ملے۔ وہ ایک تاریخ داں تھے۔ اس لئے پرنسپل نے پوچھا "آپ کون سی تاریخ پڑھانا پسند کریں گے"۔ فادر ہراس نے فی الفور جواب دیا "ہندستانی تاریخ"۔ پرنسپل کا اگلا سوال تھا "ہندستانی تاریخ کے بارے میں آپ کا مطالعہ کیا ہے"۔ انھوں نے جواب دیا "کچھ نہیں"۔ "پھر آپ کیسے ہندستانی تاریخ پڑھائیں گے"۔ فادر ہراس کا جواب تھا:

I shall study it

"میں ہندستانی تاریخ کو پڑھ کر اپنے آپ کو تیار کروں گا پھر اس کو پڑھاؤں گا"

فادر ہراس نے ہندستانی تاریخ کے مطالعہ میں اتنی زیادہ محنت کی کہ وہ سر جادو ناتھ سرکار اور ڈاکٹر سریندر ناتھ سین کے درجہ کے مورخ بن گئے۔ آج بمبئی میں ان کے نام پر تاریخی مطالعہ کا ایک بہت بڑا ادارہ قائم ہے جس کا نام ہے۔ ہراس انسٹی ٹیوٹ۔

چند واقعات

۱۔ اموی خلیفہ سلیمان بن عبد الملک نہایت خوبصورت اور وجیہہ شخص تھا۔ ایک روز اس نے سبز جوڑا پہنا اور سبز عمامہ باندھا۔ پھر اپنے آپ کو آئینہ میں دیکھ کر بولا "میں ایک جوان بادشاہ ہوں" اتنے میں اس کی ایک کنیز اس کی طرف دیکھنے لگی۔ سلیمان نے پوچھا تو کیا دیکھ رہی ہے۔ اس نے جواب میں یہ اشعار پڑھے:

انت نعم المتاع لو کنت تبقی
غیر ان لا بقاء للانسان
لیس فیما علمته فیک عیب
کان فی الناس غیر انک فان

ترجمہ: تو بہترین سرمایہ ہے، کاش تجھے بقا نصیب ہوتی،
مگر انسان کے لئے بقا نہیں
جہاں تک مجھے علم ہے، تجھ میں کوئی عیب نہیں جو
لوگوں میں پایا جاتا ہو۔ بجز اس کے کہ تو فانی ہے۔

اس واقعہ پر ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ سلیمان کا انتقال ہو گیا۔ یہ واقعہ ۱۰ صفر ۹۹ھ کا ہے۔ اس نے تقریباً پونے تین سال حکومت کی اور ۴۵ سال کی عمر پائی۔

۲۔ مصر کے فرعون (Tutankhamen) کا مقبرہ ۱۹۲۲ء میں کھولا گیا۔ مصری علوم کے ماہر لارڈ کارناوون (Carnarvon) مقبرہ کے اندر داخل ہوئے تو فوراً بیمار پڑ گئے اور چند ہفتے کے اندر مر گئے۔ اس کے کچھ دنوں بعد آرتھر میس (Arthur Mace) اور جارج بینڈائٹ (George Benedite) مقبرہ میں گئے، وہ دونوں بھی چند دنوں بعد اچانک مر گئے۔ یہ واقعہ جب عوام میں مشہور ہوا تو انھوں نے کہا کہ یہ لوگ فرعون کی لعنت سے ہلاک ہوئے۔ (بعد کو ڈاکٹر جارج ڈرین نے مقبرہ میں تین مہینے تک کام کیا۔ انھوں نے تحقیق کر کے بتایا کہ ہزاروں برس سے ابابیلیں اس مقبرہ کو اپنا گھونسلا بنائے ہوئے تھیں۔ ان کے بیٹ کی بدبو سے مقبرہ بھر گیا تھا۔ مذکورہ افراد اس سخت بدبو میں سانس لینے کی وجہ سے ہلاک ہوئے)

۳۔ کرنل اشٹافن برگ (Stauffenberg) نے ہٹلر کے خلاف نہایت کامیاب منصوبہ بنایا تھا۔ جولائی ۱۹۴۴ میں اس نے ایک بریف کیس میں ایک ٹائم بم رکھ کر ہٹلر کے کیمپ ہیڈ کوارٹر میں پہنچا دیا۔ اگر بروقت یہ بم پھٹ گیا ہوتا تو برلن میں مقیم تھوڑے سے جرمن فوجی افسر ریڈیو اسٹیشن پر قبضہ کر لیتے اور نازی لیڈر کے خاتمہ کا

اس قسم کے واقعات بزرگی کا ثبوت نہیں

سکھ دیو پرشاد بسمل الہ آبادی (۱۸۹۳–۱۹۷۵) اردو کے شاعر تھے۔ ۲۳ نومبر کو انھوں نے ایک غزل لکھی جس کا شعر تھا:

بسمل آیا ہے اکیلا بسمل جائے گا اکیلا

اگلے روز ۲۴ نومبر ۱۹۷۵ کو ان کا انتقال ہو گیا۔

اعلان کرکے جرمنی کی حکومت پر قبضہ کر لیتے ۔ مگر تاہم بم اس وقت پھٹا جب کہ ہٹلر کیمپ سے باہر آچکا تھا ۔

۴ ۔ ۱۹۴۷ میں کشمیر کے وزیر اعظم مسٹر مہر چند مہاجن تھے ۔ انھوں نے اپنی کتاب " لوکنگ بیک " (Looking Back) میں الحاق کی کہانی بتاتے ہوئے لکھا ہے : پاکستان کا ایک منصوبہ یہ تھا کہ مہاراجہ کشمیر کو اور مجھ کو اغوا کر لیا جائے اور سنگین کی نوک پر ہم سے الحاق کے مسودہ پر جبری دستخط کرا لئے جائیں ۔ منصوبہ یہ تھا کہ ہم کو بھیم بر کے ڈاک بنگلہ میں اس وقت گرفتار کر لیا جائے جب کہ ہم وہاں لنچ کھا رہے ہوں ۔ بھیم بر بالکل پاکستان کی سرحد پر ہے اور کشمیر کو جانے والی مشہور مغل روڈ پر واقع ہے ۔ اس روڈ کے ایک طرف کشمیر ہے اور دوسری طرف پاکستان ۔ ہم نے طے کیا تھا کہ ہم ۲۰ اکتوبر ۱۹۴۷ کو کٹھوعہ کا دورہ کریں گے اور ۲۱ کو بھیم بر اور میرپور کی طرف جائیں گے ۔ پاکستان کے لوگوں نے ایک ہتھیار بند موٹر تیار کر رکھی تھی جو ۲۱ کو ہماری گرفتاری کے لئے بھیم بر پہنچنے والی تھی ۔ مگر واقعات کی ایک غیر متوقع کروٹ نے ہم کو بچا لیا ۔ ۲۰ اکتوبر کی صبح کو جب ہم کٹھوعہ کے لئے روانہ ہوئے اور ایک چوراستہ پر پہنچے ، جہاں سے ایک سڑک کٹھوعہ کی طرف اور دوسری اکھنور اور بھیم بر کی طرف جاتی تھی ، مہاراجہ نے اچانک جیپ ڈرائیور کو ہدایت کی کہ وہ کٹھوعہ کے بجائے گاڑی کو بھیم بر کی طرف موڑ دے ۔ میں نے عرض کیا ، کٹھوعہ میں سرکاری افسران اور عوام ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے اور بھیم بر کے لئے ہم نے کوئی پروگرام نہیں بھیجا ہے اور اس وقت وہاں کوئی انتظام نہیں ہوگا ۔ مہاراجہ نے میری گزارش کو نظر انداز کر دیا اور کہا کہ وہ کسی پروگرام کے پابند نہیں ہیں ۔ اس لئے ہم اکھنور اور بھیم بر کی طرف روانہ ہوئے اور میرپور نہ پہنچ سکے ۔ ہم نے بھیم بر کے ڈاک بنگلہ میں دن کا کھانا کھایا اور ۱۰ بجے رات کو جموں پہنچے ۔ اس کے بعد جیسا کہ طے تھا ، ۲۱ اکتوبر کو بھیم بر کا ڈاک بنگلہ گھیر لیا گیا ۔ ہم اس سازش کا شکار ہو جاتے ، اگر ہم نے اصل پروگرام کے مطابق سفر کیا ہوتا ۔ مہاراجہ کی بیش اندیشگی نے ہم کو پاکستان کے قبضہ میں جانے سے بچا لیا "

۵ ۔ چین کے سابق وزیر اعظم مسٹر چو این لائی (۱۸۹۸ ۔ ۱۹۷۶) نے اپنی موت سے صرف چند دن پہلے شمالی ویت نام کے ایک کمیونسٹ لیڈر سے اسپتال میں ملاقات کی تھی ۔ دونوں کمیونزم کے بعض فکری پہلوؤں پر بحث کرتے رہے ۔ جب ویت نامی لیڈر جانے لگا تو چاؤ نے ہنس کر کہا : " اب میں اس مسئلہ کو خود کارل مارکس سے سمجھنے کی کوشش کروں گا ۔ کیونکہ چند ہی دن میں میں اس کے پاس جانے والا ہوں " اور فی الواقع اس کے چند دن بعد ۶ جنوری کی شام کو ان کا انتقال ہو گیا ۔

۶ ۔ چنگیز خاں کے پوتے قبلائی خاں (۱۲۱۶ ۔ ۱۲۹۴) نے ۱۲۸۱ میں جاپان پر حملہ کیا ۔ اس نے ایک عظیم جنگی بیڑہ تیار کر کے ان جزائر کو فتح کرنے کے لئے روانہ کیا ۔ اس وقت جاپان ایشیا کے ایک کمزور ملک کی حیثیت رکھتا تھا ۔ قبلائی خاں جیسے فاتح کی فوج سے مقابلہ کرنے کی طاقت ان میں بالکل نہیں تھی ، تاہم ان کو اپنے خداوند (آفتاب) پر بھروسہ تھا جس کی وہ اپنے کو اولاد کہتے ہیں ۔ جیسے ہی خطرہ کا احساس ہوا ، ان کا مذہبی پیشوا اٹھا اور لوگوں سے کہنا شروع کیا کہ سب لوگ دعائیں مانگو ۔ انھوں نے رات دن اپنے دشمن کے مقابلہ میں اپنے خدا کو پکارنا شروع کیا ۔ ابھی قبلائی خاں کی فوج جاپان کے ساحل پر اتری بھی نہ تھی کہ زبردست سمندری طوفان آیا اور تمام بحری بیڑہ سمندر کی ہولناک لہروں میں غرق ہو گیا ۔

حقائق غالب آئے

پاکستان کے لیڈروں کا خیال تھا کہ برصغیر کے مغرب میں جب وہ مسلم حکومت قائم کرلیں گے تو پورا مغربی ایشیا اور خلیج فارس اور بحر احمر کے گرد واقع تمام ممالک جو انھیں کی طرح مذہباً مسلمان ہیں، ان کے ساتھ ہوں گے اور وہ بقیہ بھارت کے مقابلہ میں چھوٹے ہونے کے باوجود اپنے "بھائیوں" سے مل کر بہت بڑی حیثیت حاصل کرلیں گے۔

صدر ایوب کے زمانۂ اقتدار (۱۹۶۹ – ۱۹۵۸) میں یہ امید کسی درجہ میں پوری بھی ہوئی۔ مگر بہت جلد زندگی کے حقائق غالب آ گئے۔ مغربی ایشیا کے مسلم ممالک کے یہاں پٹرول کا خزانہ برآمد ہوا۔ اب انھیں ضرورت ہوئی کہ اس دولت کے ذریعہ اپنے ملکوں میں ترقیاتی اسکیمیں چلائیں۔ ان کے پاس روپیہ با فراط تھا، مگر فنی واقفیت (Technical Know How) کی اسی قدر کمی تھی۔

یہ دوسری چیز انھیں پاکستان نہیں دے سکتا تھا۔ دوسری طرف ہندستان پچھلے سو برس کی کوششوں کے نتیجہ میں اپنے کو اس قابل بنا چکا تھا کہ وہ مسلم ملکوں کی اس ضرورت کو پورا کرسکے۔ چنانچہ ہندستان کے ماہرین کو آج مسلم ممالک میں زبردست استقبال مل رہا ہے اور پاکستان پس پشت چلا گیا ہے۔

اخباری شہنشاہ

یونسکو نے ۲۰۰ قوموں کے ماس میڈیا کے بارہ میں ایک سروے شائع کیا ہے۔ سروے کے مطابق اگرچہ موجودہ زمانہ میں نشر و اشاعت کے ذرائع ترقی کر کے سٹلائٹ کمیونی کیشن کے دور میں پہنچ گئے ہیں۔ مگر عملاً جو صورت حال ہے وہ یہ کہ ٹکنکل اعتبار سے چند ترقی یافتہ قومیں ہی دوسری تمام قوموں کے لئے خبر حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں۔ سروے میں بتایا گیا ہے کہ اگرچہ ۹۰ ملکوں میں قومی نیوز ایجنسیاں ہیں مگر یہ ممالک بھی اپنی ملکی خبروں کو دوسری اقوام تک پہنچانے کے لئے پانچ عالمی نیوز ایجنسیوں کے محتاج ہیں۔ یہ چار عالمی نیوز ایجنسیاں کسی ملک کی جن خبروں کو دوسری اقوام تک پہنچاتی ہیں، وہ عام طور پر اس قوم کے برے پہلو اور ان کی غیر نمائندہ خصوصیات ہی ہوتی ہیں ـــــ گویا پانچ نیوز ایجنسیاں تمام اخباری دنیا کی شہنشاہ ہیں۔

انسان اور کچھوا

ہندستان میں سب سے پہلا چڑیا گھر ۱۸۷۵ میں قائم ہوا۔ یہ کلکتہ کے قریب علی پور میں ہے۔ اس کو لوئی شیویندلر نے قائم کیا تھا۔ ۱۸۷۵ میں یہاں ایک کچھوا تھا جس کی عمر اس وقت ۵۰ سال تھی۔ یہ کچھوا آج بھی علی پور زو میں موجود ہے اور اب اس کی عمر ۱۵۰ سال ہو چکی ہے۔ ایک اخباری تصویر (ایوننگ نیوز ۲۹ ستمبر ۱۹۷۵) میں ایک لڑکے کو کچھوے کے اوپر بیٹھا ہوا دکھایا گیا ہے۔ انسان کچھوے کی طرح ۱۵۰ سال تک زندہ نہیں رہ سکتا۔ مگر انسان کا ایک بچہ کچھوے کی پیٹھ پر سوار ہو سکتا ہے۔

آسٹریلیا

آسٹریلیا کے سیاہ فام قدیم باشندے تقریباً ۲۵ ہزار سال پہلے اس براعظم میں آئے تھے۔ علم الانسان کے ماہرین کا خیال ہے کہ یہ لوگ پیدل چل کر یہاں پہنچے تھے جب کہ آسٹریلیا، نیوگنی اور ایشیا سے ملا ہوا تھا۔ اس کے بعد آسٹریلیا کٹ کر دور چلا گیا۔ یہ قدیم باشندے اب بھی ۴۰۰۰۰ کی تعداد میں موجود ہیں۔ یعنی کل آبادی (۱۳۲۶۸۶۰۰) کا ایک فی صد حصہ۔

REGD. R. N. NO. 28822/76
REGD. NO. D. (DN) 532

ISSUE NO. 62
JANUARY 1982

AL-RISALA MONTHLY

JAMIAT BUILDING QASIMJAN STREET DELHI-110006 (INDIA) PHONE 232231

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

Printed & Published by Sanivaasnain Khan at J.K. Offset Printers Delhi-110006.

سرپرست

مولانا وحیدالدین خان

دو آدمی آپس میں جھگڑیں تو دونوں غلطی پر ہیں

اگر کوئی ایک صحیح ہوتا تو وہ جھگڑے کی جگہ سے ہٹ جاتا

اور پھر جھگڑا اپنے آپ ختم ہو جاتا ——

قیمت فی پرچہ —— تین ۳ روپے

الرسالہ

فروری ۱۹۸۲

شمارہ ۶۳

جمعیۃ بلڈنگ ، قاسم جان اسٹریٹ ، دھلی ٦ (انڈیا)

ایک پکار

اسلام کے صحیح اور مؤثر تعارف کی مہم جو ادارہ الرسالہ نے شروع کی تھی وہ خدا کے فضل سے اس نوبت تک پہنچ گئی ہے کہ اب ہمارے پاس اسلامی کتابوں کا مکمل سیٹ تیار ہوگیا ہے۔ تاہم اس کام کو مزید آگے بڑھانے کے لئے سرمایہ کی شدید ضرورت ہے۔ کئی اردو کتابیں تیار ہوکر طباعت کے لئے رکی ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ اب انگریزی، عربی اور ہندی وغیرہ میں اشاعتی سلسلہ شروع کرنا انتہائی ضروری ہوگیا ہے۔

اس سلسلے میں جو لوگ اعانت یا قرض کے طور پر سرمایہ فراہم کریں وہ اللہ کے یہاں اس کا اجر پائیں گے۔ اس سلسلے میں جو لوگ تعاون کرسکتے ہوں وہ ہم کو مطلع فرمائیں۔

زرتعاون سالانہ ۳۶ روپیہ • خصوصی تعاون سالانہ دو سو روپے • بیرونی ممالک سے ۲۰ ڈالر امریکی

خدا اور انسان

کائنات خدا کا آئینہ ہے۔ یہاں خدا اپنی مخلوقات کے روپ میں نمایاں ہے۔ آدمی کی حساسیت اگر زندہ ہو تو اپنے گرد و پیش وہ خدا کو پائے گا۔ اپنے چاروں طرف وہ خدا کا مشاہدہ کرے گا۔ خدا کی کائنات اس کے لئے خدا کا زندہ ثبوت بن جائے گی۔

دنیا میں زندگی کی سرگرمیاں اس بات کا کھلا ہوا اعلان ہیں کہ اس دنیا کا خالق ایک زندہ ہستی ہے نہ کہ کوئی ایسی ہستی جو زندگی اور حیات سے محروم ہو۔ جب سورج نکلتا ہے اور چھپی ہوئی چیزیں اس کی روشنی میں دکھائی دینے لگتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے خدا نے اپنی آنکھیں کھولی ہوں، جیسے خدا ایک دیکھنے والی ہستی ہو اور اپنی آنکھوں سے سارے عالم کو دیکھ رہا ہو۔ دریاؤں میں جب پانی کا سیلاب رواں ہوتا ہے تو وہ پُرشور اعلان کرتا ہے کہ اس دنیا کا خالق ایک ایسا خالق ہے جو چلتا ہے اور اقدام کرکے آگے بڑھتا ہے۔ جنگل کا شیر جب اپنا پنجہ نکال کر کسی جانور کو اپنی پکڑ میں لیتا ہے تو گویا وہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ اس کو پیدا کرنے والا خدا ایک ایسا خدا ہے جو پکڑنے کی طاقت رکھتا ہے اور چیزوں کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ خلا کی بے پایاں وسعتیں اس حقیقت کا ابدی اظہار ہیں کہ اس کائنات کا خالق ایک لامحدود ہستی ہے، وہ اپنی ذات میں بھی اتھاہ ہے اور اپنی صفات میں بھی۔

خدا کا یہ کائناتی مشاہدہ ایک طرف آدمی کے اندر خدا کا یقین پیدا کرتا ہے دوسری طرف اس کو بہت بڑے سوال سے دوچار کر دیتا ہے۔ اس دنیا کا اگر خدا ہے تو وہ اپنی دنیا میں ظاہر کیوں نہیں ہوتا۔ دنیا میں بے پناہ برائیاں ہیں۔ یہاں ایک انسان دوسرے انسان پر ظلم کرتا ہے۔ ایک شخص موقع پاکر دوسرے شخص کو ذبح کر دیتا ہے۔ یہ سب خدا کی دنیا میں ہر روز ہو رہا ہے مگر خدا ظالموں کا ہاتھ نہیں پکڑتا، وہ مظلوموں کی جانب کھڑا نہیں ہوتا۔

اس سوال کو صرف اس وقت سمجھا جا سکتا ہے جب کہ مخلوقات کے بارہ میں خالق کی اسکیم کو سمجھ لیا جائے۔ موجودہ دنیا خدا کا مستقل بندوبست نہیں، وہ صرف امتحانی بندوبست ہے۔ یہ گویا ایک کھیت ہے جس میں مختلف پودوں کو اگنے کا موقع دے کر یہ دیکھا جا رہا ہے کہ کون اچھا درخت ہے اور کون جھاڑ جھنکاڑ۔ اس کے بعد اچھے درختوں کو ہر قسم کے بہترین مواقع دے کر تمام برے درختوں کو اکھاڑ دیا جائے گا اور پھر خدا کی دنیا خدا کے معیاری انتظام کے تحت حسن اور لذت کی ابدی بہشت بن جائے گی۔

بے قیمت الفاظ

الرسالہ کا پہلا شمارہ اکتوبر ۱۹۷۶ میں نکلا۔ اس سے پہلے ہمارے بہت سے دوست ہم سے کہتے تھے کہ آپ اپنا علیحدہ پرچہ نکالئے، ہم اس میں آپ کے ساتھ تعاون کریں گے۔ پیسہ دیں گے۔ خریدار بنوائیں گے۔ اشتہار دلائیں گے۔ انتظامی خدمات انجام دیں گے۔ مگر عملاً جو صورت پیش آئی وہ صرف دو تھی :

۱۔ بیشتر لوگ وہ تھے جنھوں نے سرے سے کسی قسم کا کوئی تعاون نہیں دیا۔ الرسالہ نکلنے سے پہلے وہ بڑے بڑے الفاظ بولے تھے، انھوں نے ہم سے خوبصورت وعدے کئے تھے۔ مگر جب عمل کرنے کا وقت آیا تو انھوں نے اپنے الفاظ پر عمل نہیں کیا۔ وہ صرف بولنے والے ثابت ہوئے، وہ کرنے والے ثابت نہ ہو سکے۔

۲۔ دوسرے لوگ، نسبتاً کم، وہ تھے جنھوں نے الرسالہ کے ساتھ کچھ تعاون کیا۔ مگر ان کا تعاون بہت جلد ختم ہو گیا۔ ان کا حال یہ ہوا کہ ذرا سی کوئی بات ان کے مزاج کے خلاف ہوئی یا کسی نے ہمارے خلاف کوئی شوشہ ان کے کان میں ڈال دیا تو وہ بدک کر الگ ہو گئے۔ اس کے بعد کوئی بھی دلیل انھیں مطمئن کرنے والی ثابت نہ ہو سکی۔

الرسالہ کا یہ چھ سالہ تجربہ موجودہ سماج کا آئینہ ہے۔ آج حالت یہ ہے کہ ہر آدمی خوبصورت الفاظ کا ایک کارخانہ بنا ہوا ہے۔ ہر آدمی شان دار باتیں کرتا ہے، بڑے بڑے وعدے کر لیتا ہے۔ مگر جب عمل کا وقت آتا ہے تو اپنے وعدوں اور اپنے الفاظ کو وہ اس طرح بھول جاتا ہے جیسے اس نے کچھ کہا ہی نہ تھا۔ اگر اس کو اس کی وعدہ خلافی یاد دلائیے، اس کے قول و عمل کے فرق کو اس پر واضح کیجئے تو اب اس کے پاس نئے الفاظ کا وسیع تر ذخیرہ موجود ہوگا جو اس کی اپنی ذات کو بالکل صحیح ثابت کر رہے ہوں اور آپ کو بالکل غلط۔

اس قسم کے الفاظ کی خدا کے یہاں کوئی قیمت نہیں۔ ایسے بولے ہوئے الفاظ جن پر عمل کے وقت عمل نہ کیا جائے گویا بے کار چیک (Dud Cheque) ہیں جو صرف کاغذ پر لکھ کر دے دیے جائیں مگر آدمی کے کھاتہ میں ان کی ادائگی کے لئے ضروری رقم موجود نہ ہو۔ یہاں ہم موطا امام مالک کی ایک روایت نقل کرتے ہیں۔

امام مالک نے کہا، مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ قاسم بن محمد کہتے تھے کہ میں نے ایسے لوگ (اصحاب رسول) دیکھے ہیں جو قول پر خوش نہیں ہوتے تھے۔ امام مالک نے کہا، اس سے ان کی مراد عمل تھی۔ آدمی کا صرف عمل دیکھا جائے گا، اس کا قول نہیں دیکھا جائے گا (انما ینظر الیٰ عملہ ولا ینظر الیٰ قولہ)

شبہات

۱۹۵۰ کے لگ بھگ کی بات ہے۔ میں اعظم گڑھ کے ریلوے اسٹیشن پر ٹکٹ خرید رہا تھا۔ ٹرین پلیٹ فارم پر کھڑی تھی اور چھوٹنے کے قریب تھی کہ ایک دیہاتی آدمی ٹکٹ لینے کے لئے آگیا۔ اس کو جس مقام تک جانا تھا اس کا کرایہ چند روپیہ ہوتا تھا۔ اس نے اپنی بندھی ہوئی مٹھی کھڑکی کے اندر ڈال کر کھولی تو اس میں سب چھوٹی ریزگاری تھی۔ بابو اس کو دیکھ کر بگڑ گیا اور بولا: روپیہ لے آؤ، اتنی سب ریزگاری ہم کب تک گنتے رہیں گے۔

مجھے غریب دیہاتی پر رحم آیا۔ میں نے فوراً جیب سے نوٹ نکالے اور اس سے کہا کہ تم یہ نوٹ لے لو اور ریزگاری مجھے دے دو۔ مگر دیہاتی نے میری پیش کش قبول نہ کی۔ اس نے وحشت بھری نظروں سے میری طرف دیکھا اور پھر خاموشی سے ایک طرف چلا گیا۔ میں تیزی سے چل کر ٹرین پر سوار ہوگیا۔ تاہم میری نظریں اس دیہاتی کا ناکام تعاقب کرتی رہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ دیہاتی وقت پر ٹکٹ نہ لے سکا اور وہ ٹرین اسے چھوڑ دینی پڑی۔

دیہاتی آدمی نے میری پیش کش کیوں قبول نہ کی۔ اس کی وجہ "شبہ" ہے۔ اس نے سمجھا کہ میں اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھا رہا ہوں اور اپنے خراب سکوں کو اس کی ریزگاری سے بدل لینا چاہتا ہوں۔ یہ شبہ اس کے ذہن پر اتنا چھایا کہ وہ اپنی ریزگاری کو میرے حوالے کرنے پر آمادہ نہ ہوسکا یہاں تک کہ اس کی گاڑی اس سے چھوٹ گئی۔

یہی آج ہمارے سماج کی عام حالت ہے، ہر آدمی دوسرے آدمی کو شبہ کی نظر سے دیکھتا ہے۔ ہر آدمی دوسرے کو بے بھروسہ سمجھ رہا ہے۔ اس کی وجہ سے پورے سماج میں ایک دوسرے کے خلاف بے اعتمادی کی فضا چھائی ہوئی ہے۔ ہر آدمی اپنے آپ کو بہت سے ممکن فائدوں سے محروم کئے ہوئے ہے۔ کیونکہ اکثر کام کرنے کے لئے کئی آدمیوں کا تعاون ضروری ہوتا ہے اور شبہات کی فضا نے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کا امکان ہی ختم کر دیا ہے۔

شبہ سے شبہ جنم لیتا ہے اور اعتماد سے اعتماد پیدا ہوتا ہے۔ اگر آپ کسی کو شبہ کی نظر سے دیکھنے لگیں تو جواب میں اس کے اندر بھی آپ کے خلاف شبہات پیدا ہوں گے اور دونوں کے درمیان فاصلہ بڑھتا چلا جائے گا۔ اس کے برعکس اگر آپ اس کے ساتھ اعتماد کا معاملہ کریں تو اس کے دل میں بھی آپ کے بارے میں اعتماد پیدا ہوگا اور دونوں ایک دوسرے سے قریب ہوتے چلے جائیں گے۔

جو "انسان" ایک جسم کے اندر ہے وہی انسان دوسرے جسم کے اندر بھی ہے۔ مگر آدمی اکثر اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ وہ خود کچھ اور ہے اور دوسرا کچھ اور۔

اندھیرا ختم ہوگا

خدا کی دنیا میں انسان بظاہر ایک تضاد ہے۔ ایک ایسی دنیا جہاں سورج ہر روز ٹھیک اپنے وقت پر طلوع ہوتا ہے وہاں انسان کا حال یہ ہے کہ آج ایک بات کہتا ہے اور کل وہ اس سے پھر جاتا ہے۔ جس دنیا میں سخت پتھروں کے اندر سے بھی پانی نکل پڑتا ہے وہاں ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ بدترین بے دردی کا ثبوت دیتا ہے۔ جس دنیا میں اس کا چاند تمام مخلوقات کے اوپر بلا امتیاز چمکتا ہے وہاں انسان ایک کے ساتھ کچھ سلوک کرتا ہے اور دوسرے ساتھ کچھ۔ جس دنیا کا ضمیر اپنے آپ کو پھولوں کی لطافت کی صورت میں ظاہر کرتا ہے وہاں انسان کانٹوں سے بھی زیادہ برے کردار کا مظاہرہ کرتا ہے۔ جس دنیا میں ہواؤں کے جھونکے ہر طرف بے غرض خادم کی طرح پھر رہے ہیں وہاں انسان اس طرح رہتا ہے جیسے ذاتی غرض پوری کرنے کے سوا اس کا اور کوئی مقصد ہی نہیں۔ جس دنیا میں ایک درخت دوسرے درخت کو دکھ نہیں دیتا وہاں ایک انسان دوسرے انسان کو ستاتا ہے، ایک انسان دوسرے انسان کو برباد کرکے خوشی کے قہقہے لگاتا ہے۔

یہ سب کچھ اس دنیا میں ہر روز ہو رہا ہے مگر خدا یہاں مداخلت نہیں کرتا۔ وہ اس تضاد کو ختم نہیں کرتا۔ مخلوقات کے آفاقی آئینہ میں خدا کتنا حسین معلوم ہوتا ہے مگر انسانی زندگی کے المناک گوشہ میں اس کا چہرہ کتنا مختلف ہے۔ خدا کے سامنے درندگی کے واقعات آتے ہیں مگر اس کے اندر کوئی تڑپ پیدا نہیں ہوتی۔ خدا انسانوں کو ذبح ہوتے ہوئے دیکھتا ہے مگر اسے اس کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔ وہ کائنات کے سب سے زیادہ حساس باسیوں کے ساتھ وحشیانہ سلوک کا مشاہدہ کرتا ہے مگر اس کے خلاف اس کے اندر کوئی بے چینی نہیں ابھرتی۔ کیا خدا پتھر کی مورتی ہے، کیا وہ ایک انتہائی کامیاب اسٹیچو ہے جو سب کچھ دیکھتا ہے مگر اس کے بارہ میں اپنے ردعمل کا اظہار نہیں کرتا۔

اس سوال نے ہر زمانہ کے سوچنے والوں کو سب سے زیادہ پریشان کیا ہے۔ مگر یہ سوال صرف اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ مخلوقات کے بارے میں ہم خالق کی حکمت کو ملحوظ نہیں رکھتے۔ خالق کی اسکیم میں دنیا دار الامتحان ہے مگر ہم اس کو دار الجزا کے روپ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ جو کچھ کل کے دن پیش آنے والا ہے اس کو ہم چاہتے ہیں کہ آج ہی کے دن ہماری آنکھوں کے سامنے آجائے۔

جس طرح ہر روز رات کے اندھیرے کے بعد سورج کی روشنی پھیلتی ہے اسی طرح لازماً یہ بھی ہونے والا ہے کہ زندگی کا اندھیرا ختم ہو۔ ظالم اور مظلوم ایک دوسرے سے الگ کئے جائیں۔ سرکش انسانوں کی گردنیں توڑی جائیں اور سچے انسانوں کو ان کی سچائی کا انعام دیا جائے۔ یہ سب کچھ اپنی کامل ترین صورت میں ہوگا، مگر وہ موت کے بعد ہوگا نہ کہ موت سے پہلے۔

صبر کا بدلہ

قرآن میں صبر کی بے حد تاکید کی گئی ہے۔ ارشاد ہوا ہے کہ اگر کوئی شخص تمھارے اوپر زیادتی کرے اور تم صبر نہ کرسکو تو اس کے ساتھ تم اتنا ہی کر سکتے ہو جتنا اس نے تمھارے ساتھ کیا ہے۔ مگر یہ صرف رخصت کی بات ہے۔ ورنہ اعلیٰ درجہ تو یہ ہے کہ تم معاف کر دو اور انتقام کے بجائے اصلاح کا انداز اختیار کرو۔ اگر تم ایسا کروگے تو تمھارا اجر اللہ کے ذمہ ہو جائے گا اور تم کو کوئی نقصان نہ ہوگا (فمن عفا واصلح فاجرہ علی اللہ، الشوریٰ ۴۰)

دنیا کی زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کو دوسرے شخص سے تکلیف پہنچتی ہے۔ کبھی ایک آدمی دوسرے کو ایک قول دیتا ہے مگر بعد کو وہ اسے پورا نہیں کرتا۔ کبھی کوئی شخص اپنے کو مضبوط پوزیشن میں پاکر کمزور فریق کے ساتھ ناانصافی کرتا ہے۔ کبھی کوئی شکایت پیش آنے کی بنا پر ایک شخص دوسرے شخص کو مٹانے اور برباد کرنے پر تل جاتا ہے۔ کبھی کوئی شخص موقع سے فائدہ اٹھاتا ہے اور اپنے ساتھی کو اس کا ایک جائز حق دینے پر تیار نہیں ہوتا۔ کبھی کسی کی ترقی دیکھ کر آدمی کے اندر حسد پیدا ہوتا ہے اور وہ ناحق اپنے بھائی کی بربادی کے درپے ہو جاتا ہے۔

اب اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جو شخص مظلوم ہے اس کے دل میں ظالم کے خلاف آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ وہ اس کی زیادتیوں کو بھولنے اور اس کو معاف کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اس میں شک نہیں کہ ایسے مواقع پر دل کے زخم کو بھلا دینا انتہائی مشکل کام ہے۔ لیکن اگر آدمی ایسا کرے کہ معاملہ کو اللہ کے اوپر ڈال دے، وہ اللہ کی خاطر اس کو برداشت کرے تو اس کا یہ عمل کبھی رائگاں نہیں جائے گا۔ جو چیز وہ انسانوں سے نہ پاسکا اس کو وہ خدا سے پاکر رہے گا۔

ایک شخص جب کسی کو ایک قول دیتا ہے تو گویا وہ اس کو ایک بینک چیک دے رہا ہے جو عمل کے وقت کیش کیا جا سکے۔ مگر جب عمل کے وقت وہ اپنے قول سے پھر جاتا ہے تو گویا اس نے کاغذی چیک تو لکھ دیا مگر جب کھاتہ سے اس کی رقم لینے کا وقت آیا تو اس نے ادائگی سے انکار کر دیا۔ ایسا تجربہ کسی انسان کے لئے تلخ ترین تجربہ ہے۔ لیکن اگر وہ صبر کرے تو خدا کا وعدہ ہے کہ وہ اپنی طرف سے اس کا بدلہ دے گا۔ جو چیک انسانی بینک میں کیش نہ ہو سکا وہ خدائی بینک میں کیش ہوگا، خواہ دنیا میں ہو یا آخرت میں۔

خدا سے ڈرو

آج کوئی بستی ایسی نہیں ہے جہاں ایک مسلمان دوسرے مسلمان پر ظلم نہ کر رہا ہو۔ آج مسلمان اپنے بھائی کو ستانے کے لئے سب سے زیادہ شیر بنا ہوا ہے۔ مگر لوگ کس آدمی کو ستاتے ہیں۔ اس آدمی کو جو ان کی نظر میں کمزور ہو۔ جو دادا گیری کرنا نہ جانتا ہو، جس نے اپنے آگے پیچھے ساتھیوں کی فوج نہ جمع کر رکھی ہو، جو پولس اور کچہری سے دور رہنا چاہتا ہو۔ لوگ بے زوروں کے لئے بہادر ہیں اور جو شخص لوگوں کو زور آور دکھائی دیتا ہو اس کے لئے کوئی بہادر نہیں۔

مگر یہ اندھے پن کی آنکھ سے دیکھنا ہے۔ اگر ان کے پاس دیکھنے والی آنکھ ہو تو وہ سب سے زیادہ اس سے ڈریں جس کو وہ بے زور سمجھتے ہیں۔ کیونکہ جو شخص بے زور ہے اس کے پیچھے خدا کھڑا ہوا ہے۔

دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ آزمائش کے منصوبہ کے تحت ہو رہا ہے۔ خدا کو جانچ کر ہر شخص کے بارے میں جاننا ہے کہ ان میں سے کون ہے جو اللہ سے ڈرنے والا ہے اور وہ کون ہے جو اللہ سے بے خوف ہے۔ اس کی جانچ کیسے ہو۔ اس کی جانچ ان اشخاص کی سطح پر نہیں ہو سکتی جو اپنی زور آوری کی وجہ سے لوگوں کو مرعوب کئے رہتے ہیں، جن کی طاقت دیکھ کر لوگوں کو ان پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ ان کے خلاف اگر لوگ برائی نہ کریں تو یہ ان کی اپنی طاقت سے ڈرنے کی وجہ سے ہوگا نہ کہ خدا کے ڈر کی وجہ سے۔

مگر ایک شخص ہے جس کے پاس ان چیزوں میں سے کوئی چیز نہیں جو لوگوں کو مرعوب اور خوف زدہ کرتی ہے۔ اس کو ستانے سے اگر کوئی شخص بچتا ہے تو اس کی وجہ یقیناً اخلاقی ہوگی نہ کہ مادی۔ خدا کچھ افراد کو بے زور اور بے حیثیت بنا کر لوگوں کے درمیان رکھتا ہے اور پھر ان کو دیکھتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ جو شخص کمزور آدمی کے ساتھ بے انصافی کرنے سے ڈرا وہ گویا خدا سے ڈرا۔ اس کا ٹھکانا جنت ہوگا۔ جو شخص کمزور آدمی کے ساتھ بے انصافی کرنے سے نہیں ڈرا وہ گویا خدا سے نہیں ڈرا، ایسا شخص جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں دھکیل دیا جائے گا۔

ہر آدمی بری زندگی گزار کر مر جاتا ہے تاکہ موت کے بعد اور زیادہ بری زندگی کی طرف دھکیل دیا جائے!

یہ سونے والے

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے نہیں دیکھا کہ جہنم جیسی چیز سے بھاگنے والا سو گیا ہو اور میں نے نہیں دیکھا کہ جنت جیسی چیز کو چاہنے والا سو گیا ہو (ما رأیت مثل النار نام هاربها و ما رأیت مثل الجنة نام طالبها)

جہنم کا عذاب کتنا ہولناک ہے۔ مگر آدمی اس سے غافل ہے۔ جنت کی نعمتیں کتنی لذیذ ہیں مگر آدمی کو اس کا کوئی شوق نہیں۔ یقیناً یہ زمین پر ہونے والے تمام واقعات میں سب سے زیادہ عجیب ہے۔

لوگ سو رہے ہیں تاکہ اس وقت جاگیں جب کہ جہنمی آگ کے شعلے ان کے لئے سونے کو ناممکن بنا دیں۔ لوگ غافل ہیں تاکہ اس وقت ہوشیار ہوں جب کہ محرومی اور رسوائی ان کے اوپر اس طرح ٹوٹ پڑے کہ ان کے لئے اس سے بھاگنے کا کوئی راستہ نہ ہو۔

آج ہر آدمی بے ہوش نظر آتا ہے۔ ہر آدمی اپنے آپ میں اس طرح گم ہے جیسے اس کے اوپر کوئی اور طاقت نہیں۔ حالاں کہ موت ہر روز بتا رہی ہے کہ آدمی ایک ایسی حقیقت سے دوچار ہے جس کے مقابلہ میں کسی کا کچھ بس نہیں چلتا۔ انسان کتنا زیادہ مجبور ہے مگر وہ اپنے آپ کو کتنا زیادہ با اختیار سمجھتا ہے۔

آدمی وعدہ کرتا ہے مگر اس کے بعد اس کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اس کے اوپر کسی کا ایک حق آتا ہے مگر وہ اس کو ادا نہیں کرتا۔ آدمی کے سامنے ایک سچائی آتی ہے مگر وہ اس کا اعتراف نہیں کرتا۔ وہ دوسرے کے اوپر یک طرفہ الزام لگاتا ہے اور اپنی غلطی ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ وہ چھوٹوں کو نظر انداز کر کے بڑوں کا استقبال کرتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کو اصول کے تابع کرنے کے بجائے خواہشات کے تابع کرتا ہے۔ وہ زور آور سے دبتا ہے اور بے زور کو ستاتا ہے۔ وہ خدا کو مرکز توجہ بنانے کے بجائے خود اپنی ذات کو اپنا مرکز توجہ بناتا ہے۔ وہ جنت کے اشتیاق اور جہنم کے اندیشوں میں جینے کے بجائے دنیا کے اشتیاق اور دنیا کے اندیشوں میں جیتا ہے۔

آدمی یہ سب کچھ کرتا ہے اور بھول جاتا ہے کہ اپنی اس روش سے اپنے آپ کو جہنم کے قریب لے جا رہا ہے اور اپنے آپ کو جنت کے لئے نااہل ثابت کر رہا ہے۔

آہ وہ انسان جس کو اسی چیز کا شوق نہیں جس کا اسے سب سے زیادہ شوق ہونا چاہئے۔ آہ وہ انسان جو اسی چیز سے سب سے زیادہ بے خوف ہے جس سے اس کو سب سے زیادہ خوف کرنا چاہئے۔

کتنا فرق

۱۹۲۸ میں کلکتہ میں ایک ہی زمانہ میں دو اجلاس ہوئے۔ ایک کانگریس کا، دوسرا تحریک خلافت کا۔ اس وقت مہاتما گاندھی کانگریس کے سب سے بڑے لیڈر تھے اور مولانا محمد علی تحریک خلافت کے۔ خان عبد الغفار خاں اپنے کچھ پٹھان ساتھیوں کو لے کر کلکتہ گئے اور دونوں کانفرنسوں میں شریک ہوئے۔ خان عبد الغفار خاں اپنا ایک تاثر اپنی خود نوشت سوانح عمری میں ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"گاندھی جی (کانگریس کے اجلاس میں) تقریر کر رہے تھے۔ ایک نوجوان بار بار کھڑا ہو جاتا تھا اور گاندھی جی پر سخت حملے کرتا تھا۔ گاندھی جی بالکل غصہ نہیں ہوتے تھے۔ وہ منھ کھول کر قہقہہ لگاتے ہوئے ہنس پڑتے تھے۔ اس کا میرے اوپر بڑا اثر ہوا۔ جب میں واپس اپنے کیمپ میں آیا تو میں نے یہ سرگذشت اپنے ساتھیوں کو سنائی اور کہا کہ دیکھو یہ ہندوؤں کا لیڈر ہے۔ اس کے اخلاق کو دیکھو اور اپنے مسلمان لیڈروں کے اخلاق کو دیکھو۔

اس وقت ہم کچھ پٹھان لوگ (خلافت کانفرنس میں) محمد علی کے پاس گئے کہ یہ ہمارا لیڈر ہے، اس کے ساتھ اس بارہ میں چند باتیں کریں۔ محمد علی باہر آئے تو ہم نے ان سے اس طریقہ سے اپنی بات کہنی شروع کی کہ محمد علی صاحب، آپ ہم مسلمانوں کے لیڈر ہیں۔ ہم آپ کی عزت کرتے ہیں۔ کل ہم کانگریس کے اجلاس میں گئے تھے تو وہاں گاندھی جی تقریر کر رہے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ بعض نوجوان اُن کی مخالفت کر رہے تھے۔ لیکن گاندھی جی ان کے سامنے ہنس دیتے۔ ہم نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس کی وجہ سے ان کی تقریر میں کسی قسم کی تیزی یا تندی پیدا نہیں ہوئی۔ پھر میں نے کہا کہ آپ ہمارے رہنما ہیں۔ ہم آپ کی برتری کے خواہاں ہیں۔ اگر آپ اپنے اندر صبر کا مادہ پیدا کر لیں تو یہ بہت ہی اچھا ہوگا۔

محمد علی صاحب ہماری باتیں سنتے ہی بڑے ناراض اور غضب آلود ہوئے اور کہا کہ دیکھو، یہ جنگلی پٹھان ہمیں سمجھانے آئے ہیں اور پھر ہم کو وہیں چھوڑ کر چلے گئے۔ ہم ان کے اس رویہ سے بڑے مایوس ہوئے اور ناراض بھی۔ اور میں تو پھر اس کے بعد خلافت کے ان جلسوں میں بالکل شریک نہیں ہوا اور چلا آیا۔ واپس اپنے گاؤں جاکر میں نے اپنے پختون ساتھیوں سے یہ واقعہ بیان کیا اور کہا کہ کلکتہ میں میں خلافت اور کانگریس دونوں کے جلسوں میں شریک ہوا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ ہمارے مسلمان لیڈروں اور ہندوؤں کے لیڈروں میں کتنا بڑا فرق ہے۔ ایک طرف غصہ کے جذبات بھڑکتے دکھائی دیے اور دوسری طرف محبت اور پریم سے باتیں کی جاتی تھیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ گاندھی جی واقعی ہندوؤں کے ہی لیڈر نہیں رہیں گے بلکہ وہ مسلمانوں کی لیڈری بھی کریں گے۔ ان کا مزاج گرم نہیں۔ بلکہ ان کے جذبات ٹھنڈے ہیں۔ وہ گالیاں کھاکر بھی ہنس دیتے ہیں۔

عہدہ نہ ملنے پر

امام شافعی ۱۹۸ھ میں مصر آئے اور وہاں چار سال قیام کیا۔ اس زمانہ میں جو لوگ ان کے شاگرد ہوئے ان میں یوسف بن یحییٰ بویطی اور ابن عبد الحکم بھی تھے۔ امام شافعی کے انتقال کے بعد یہ سوال ہوا کہ مصر میں ان کے حلقہ درس کا مسند نشین اور ان کا قائم مقام کون ہو۔ امام شافعی اپنے تمام شاگردوں میں یوسف بن یحییٰ بویطی کو زیادہ مانتے تھے۔ بلکہ ان کو اپنی جانشینی کے لئے نامزد بھی کر چکے تھے۔ تاہم امام شافعی کے انتقال کے بعد جب یوسف بن یحییٰ بویطی نے امام شافعی کی مسند پر بیٹھنا چاہا تو ابن عبد الحکم نے دعویٰ کر دیا کہ اس مسند کا زیادہ حق دار میں ہوں۔

اس وقت مصر میں امام شافعی کے مکی شاگرد امام حُمیدی موجود تھے۔ انھوں نے بویطی کے حق میں فیصلہ دیا۔ امام حمیدی نے کہا: امام شافعی نے مجھ سے کہا تھا کہ میری مجلس کا حق دار بویطی سے زیادہ کوئی نہیں اور نہ میرے ساتھیوں میں بویطی سے زیادہ کوئی صاحب علم ہے۔ ابن عبد الحکم نے یہ سن کر امام حمیدی سے کہا کہ تم جھوٹ کہتے ہو۔ امام حمیدی نے جواب دیا: جھوٹ بات تم نے کہی، تمھارے باپ نے کہی، تمھاری ماں نے کہی (کذبت انت وابوك وامك)

ابن عبد الحکم اس بات پر سخت ناراض ہوئے۔ وہ اس سے پہلے اپنے باپ کے مسلک کے مطابق مالکی مسلک رکھتے تھے، پھر شافعی مسلک اختیار کر لیا تھا۔ اس واقعہ کا اثر ان کے اوپر اتنا زیادہ ہوا کہ انھوں نے شافعی مسلک چھوڑ دیا اور دوبارہ مالکی مسلک اختیار کر لیا (طبقات الشافعیۃ الکبری)

ابن عبد الحکم یہ چاہتے تھے کہ شافعی مسلک کی مسند درس پر بیٹھیں۔ مگر جب ان کو درس کی مسند نہ ملی تو انھوں نے خود اپنے لئے بھی اس مسلک کو پسند نہ کیا جس کے لئے وہ دوسروں کے سامنے نمائندہ بننے پر اصرار کر رہے تھے۔

یہی اکثر لوگوں کا حال ہے۔ وہ اسلام یا کسی ادارہ کے حامی بن کر کھڑے ہوتے ہیں۔ مگر حقیقۃً ان کی ساری دل چسپی اس اسلام یا اس اسلامی ادارہ سے ہوتی ہے جو انھیں ایک شان دار اسٹیج پر بیٹھنے کا موقع دے، جو ان کے لئے عوام کے درمیان ایک امتیازی مسند فراہم کر رہا ہو۔ اگر شاندار اسٹیج نہ ملے تو ایسے اسلام کی خدمت کرنے سے انھیں کوئی دلچسپی نہ ہوگی۔ ایک شخص صدارت کی کرسی سے یہ تقریر کرتا ہوا سنائی دے گا کہ اس عظیم مقصد کے لئے چپراسی کی حیثیت سے خدمت کرنا بھی میں اپنے لئے فخر سمجھتا ہوں۔ لیکن اگر وہ اپنے کو صدارت کی کرسی پر بیٹھا ہوا نہ پائے تو اس وقت اس مقصد کے میدان میں اس کے لئے کرنے کا کوئی کام نہ ہوگا۔ اسلام کی صدارت کرنے کے لئے ہر آدمی بے قرار ہے مگر اسلام کی خدمت کرنے کے لئے کوئی تیار نہیں۔

اسلام کا فیضان

محمد اسد صاحب (سابق نام لیوپولڈ) پولینڈ میں ایک یہودی خاندان میں پیدا ہوئے۔ اس کے بعد انھوں نے اسلام قبول کیا۔ اپنے قبول اسلام کی داستان انھوں نے بہت دلچسپ انداز میں اپنی ایک کتاب میں لکھی ہے جس کا نام ہے "روڈ ٹو مکہ"۔ وہ اپنا ایک واقعہ اس طرح بیان کرتے ہیں :

۱۹۲۴ میں میں ایک عربی اخبار کے نمائندہ کی حیثیت سے شرق اوسط کے دورہ پر روانہ ہوا۔ میں مصری علاقہ میں ٹرین میں سفر کر رہا تھا۔ میرے ڈبہ میں میرے علاوہ دو مسافر اور تھے۔ ایک اسکندریہ کا یونانی تاجر، دوسرا ایک مصری کاشتکار۔ گفتگو کے دوران یونانی تاجر نے کہا: اسلامی شریعت عادلانہ شریعت نہیں۔ مسلمان اس کا کیا جواب دے سکتے ہیں کہ اسلام جب مسلمان مردوں کو عیسائی اور یہودی عورتوں سے نکاح کی اجازت دیتا ہے تو وہ مسلمان عورتوں کو اس کی اجازت کیوں نہیں دیتا کہ وہ بھی عیسائی اور یہودی مردوں سے نکاح کر سکیں۔ کیا ایسے قانون کو انصاف کا قانون کہا جا سکتا ہے۔

مصری کاشت کار فوراً بولا: میں آپ کو بتاتا ہوں کہ اسلامی شریعت نے ایسا قانون کیوں بنایا ہے، ہم مسلمان حضرت مسیح کو حضرت ابراہیم اور دوسرے رسولوں کی طرح خدا کا رسول مانتے ہیں۔ ان کی اسی طرح عزت کرتے ہیں جس طرح تمام رسولوں کی کرتے ہیں۔ اگر کوئی یہودی یا عیسائی لڑکی ایک مسلمان سے نکاح کرتی ہے تو اس کو اس بات کا اطمینان رہتا ہے کہ اس کے نئے گھر میں اس کے مقدس بزرگوں کا نام عزت کے ساتھ لیا جائے گا۔ اس کے برعکس اگر کوئی مسلمان لڑکی کسی یہودی یا عیسائی مرد سے شادی کرے تو اس کو بجا طور پر اس کا اندیشہ رہے گا کہ جس ہستی کو وہ خدا کا رسول مانتی ہے، ممکن ہے اس کو اس کی سسرال میں برے ناموں سے یاد کیا جائے۔ ایسی صورت میں کیا آپ اس کو انصاف کہیں گے کہ ایک عورت کو مستقل طور پر ایسے ماحول میں ڈال دیا جائے جہاں وہ مسلسل اہانت اور اذیت برداشت کرنے پر مجبور ہو۔

یہ مصری مسلمان لکھنا پڑھنا نہیں جانتا تھا۔ اس کے باوجود اس نے ایک تعلیم یافتہ شخص کے سوال کا ایسا جواب دیا جس کے بعد وہ بالکل خاموش ہو گیا۔

اسلام دین فطرت ہے۔ وہ زندگی کے تمام تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ اس میں اور دوسری حقیقتوں میں کوئی ٹکراؤ نہیں۔ جب کوئی شخص اسلام کو پاتا ہے تو گویا وہ تمام حقائق کا سرا پا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی ذہن ہر سوال کا ایسا جواب پا لیتا ہے جس کا توڑ کسی کے لئے ممکن نہ ہو۔ اس کو ایسا نظریہ مل جاتا ہے جس پر وہ کسی تضاد کے بغیر عمل کر سکے۔

جواہرات اس کی بھوک نہ مٹا سکے

مستعصم باللہ عباسی دور کا آخری خلیفہ تھا جس نے بغداد میں حکومت کی۔ تاتاریوں کے سردار ہلاکو خاں کے ہاتھوں وہ ۶۵۶ھ میں ذلیل طریقہ سے مارا گیا۔ یہی وہ خلیفہ ہے جس کے زمانہ میں تاتاریوں نے مسلم سلطنت کو برباد کیا۔ انھوں نے اتنے مسلمان قتل کئے کہ دریائے دجلہ کا پانی سرخ ہوگیا۔ اس کے بعد انھوں نے مسلمانوں کے عظیم الشان شاہی کتب خانہ کی کتابیں جمع کیں اور دجلہ میں ڈال دیں تو کہا جاتا ہے کہ دجلہ کا پانی ان کتابوں کی سیاہی سے کالا ہوگیا اور عرصہ تک کالا رہا۔

معتصم باللہ کے پاس زر و جواہر کا زبردست خزانہ تھا مگر اس کو اس نے تہ خانوں میں بند کر رکھا تھا۔ اس نے اپنے شیعہ وزیر علقمی کے مشورہ پر اپنے فوجیوں کی تنخواہیں روک دیں "تاکہ ملکی محاصل میں کمی کو پورا کیا جاسکے"۔ اس کے بعد اس نے فوج کی بہت بڑی تعداد کی چھٹی کردی۔ عربوں کی بہادری اور فوج کی کثرت کی وجہ سے تاتاریوں کو بغداد کی طرف رخ کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ مگر علقمی، جو عباسی اقتدار کو ختم کر کے علوی اقتدار لانے کی خاطر تاتاریوں سے مل گیا تھا، اس نے جب ہلاکو خاں کو فوج کی کمی کی خفیہ خبر دی تو اس کی ہمت ہوگئی اس نے بغداد پر حملہ کیا اور اس کے بعد اتنے ظالمانہ طریقہ پر اس کو ختم کیا کہ اس کی کوئی دوسری مثال شاید انسانی تاریخ میں نہیں ملے گی

بغداد کی تباہی کے بعد خلیفہ مستعصم باللہ جیل خانہ میں بند کر دیا گیا۔ اس کو کھانا پانی بھی نہیں پہنچتا تھا۔ ایک روز بھوک پیاس سے بیتاب ہو کر خلیفہ نے ہلاکو کے پاس پیغام بھیجا کہ وہ اس کے لئے کھانے پینے کا انتظام کردے۔ ہلاکو نے حکم دیا کہ خلیفہ کے محل سے جو بے شمار زر و جواہر حاصل ہوئے ہیں ان کا ایک طشت خلیفہ کے پاس لے جاؤ۔ خلیفہ نے جب زر و جواہر سے بھرا ہوا طشت دیکھا تو اس نے کہا: مجھے کھانے کی ضرورت ہے اور جواہرات کھائے نہیں جاسکتے (ان الجواهر لا توكل) ہلاکو نے جواب دیا: جب زر و جواہر تمھاری بھوک نہیں مٹا سکتے تو تم نے کیوں نہ ایسا کیا کہ یہ جواہرات تم اپنی فوج کو دیتے اور ان کے ذریعہ اپنے ملک کے دفاع کا انتظام کرتے۔ اس کے بعد ہلاکو خاں نے حکم دیا کہ اس کو اسی بھوک پیاس کی حالت میں قتل کر دیا جائے۔ چنانچہ وہ ذلت کے ساتھ مار ڈالا گیا۔

تاریخ میں اس طرح کے کتنے ہی واقعات ہیں جو انسان کو سبق دے رہے ہیں کہ وہ حرص اور حق تلفی کا طریقہ چھوڑ دے اور قناعت اور انصاف پسندی کا طریقہ اختیار کرے۔ مگر تاریخ میں بہت کم ایسی مثالیں ملیں گی جب کہ انسان نے ان واقعات سے اپنے لئے کوئی سبق سیکھا ہو۔

اعتراف

ایک نوجوان کھلاڑی کو ایک فٹ بال ٹیم میں شامل ہوکر میچ کھیلنا پڑا۔ اتفاق سے اس کی ٹیم ہار گئی۔ ہارنے کے بعد نوجوان نے اپنے باپ کو خط لکھا :

ہمارے مخالفوں کو ہماری دفاعی لائن میں ایک زبردست شگاف مل گیا تھا۔
اور وہ شگاف میں ہی تھا۔

یہ اعتراف کسی آدمی کے لئے سب سے بڑی بہادری ہے اور یہی تمام اجتماعی ترقیوں کی جان بھی ہے۔ ہر شکست "دفاعی لائن میں کسی شگاف" ہی کی وجہ سے پیش آتی ہے۔ اور اس کا بہترین علاج اس کا اعتراف ہے۔ اعتراف کے ذریعہ اصل مسئلہ بغیر کسی مزید خرابی کے حل ہوجاتا ہے۔ اعتراف کرنے والا یاتو اپنی کمی کا احساس کرتے ہوئے اپنے آپ کو میدان سے ہٹا دیتا ہے۔ اور اس طرح دوسرے بہتر لوگوں کو کام کرنے کا موقع دیتا ہے۔ یا وہ اپنی ہار کو وقتی معاملہ سمجھ کر مزید تیاریوں میں لگ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ بالآخر کامیاب ہوجاتا ہے۔

زندگی کی سب سے بڑی حقیقت اعتراف ہے۔ ایمان ایک اعتراف ہے۔ کیونکہ ایمان لاکر آدمی اپنے مقابلہ میں خدا کی بڑائی کا اقرار کرتا ہے۔ لوگوں کے حقوق کی ادائگی اعتراف ہے۔ کیونکہ ان پر عمل کرکے ایک شخص بین انسانی ذمہ داریوں کا اقرار کرتا ہے۔ توبہ ایک اعتراف ہے کیونکہ اس کے ذریعہ سے آدمی اس حقیقت کا اقرار کرتا ہے کہ صحیح وہ ہے جو خدا کے نزدیک صحیح ہے اور غلط وہ ہے جو خدا کے نزدیک غلط ہے۔ زندگی کی ہر قسم کی اصلاح کا راز اعتراف میں چھپا ہوا ہے۔ کیونکہ انسان ہمیشہ غلطی کرتا ہے۔ اگر وہ اعتراف نہ کرے تو اس کی غلطیوں کی اصلاح کی دوسری کوئی صورت نہیں۔

اعتراف تمام ترقیوں کا دروازہ ہے۔ مگر بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اپنے آپ کو اعتراف کے لئے آمادہ کرسکے۔ جب بھی ایسا کوئی موقع آتا ہے تو آدمی اس کو اپنی عزت کا سوال بنا لیتا ہے۔ وہ اپنی غلطی ماننے کے بجائے اس پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خرابی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ وقت آجاتا ہے کہ جس غلطی کا صرف زبانی اقرار کر لینے سے کام بن رہا تھا اس غلطی کا اسے اپنی بربادی کی قیمت پر اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

سوق کافی ہے

استاد یوسف دہلوی (م ۱۹۷۷) مشہور خوشنویس تھے۔ ان کو فن خطاطی پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بار جلی خط کا مقابلہ ہوا۔ جمنا کے کنارے ریت کے میدان میں بہت سے خطاط جمع ہوئے۔ استاد یوسف آئے تو ان کے ہاتھ میں بانس کا ایک بڑا ٹکڑا تھا۔ انھوں نے بانس سے ریت کے اوپر لکھنا شروع کیا۔ الف سے ش تک پہنچے تھے کہ تقریباً ایک فرلانگ کا فاصلہ ہو گیا۔ لوگوں نے کہا کہ بس کیجئے۔ استاد یوسف نے کہا: میں نے جو لکھا ہے اس میں رنگ بھر دو اور پھر ہوائی جہاز سے چھوٹے سائز میں ان کا فوٹو لے لو۔ مجھے یقین ہے کہ فوٹو میں وہی خط رہے گا جو میرا اصل خط ہے۔ اس کے بعد کسی اور کو اپنا فن پیش کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔

تقسیم کے بعد وہ پاکستان چلے گئے تھے۔ وہاں شاہ سعود کی آمد پر ان کو ایک محراب کا مضمون لکھنے کے لئے دیا گیا۔ استقبال کی تیاریوں کا بچشم خود معائنہ کرنے کے لئے گورنر جنرل آئے۔ اس دوران انھوں نے استاد یوسف کا لکھا ہوا محراب بھی دیکھا۔ اس کے شان خط کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئے۔ انھوں نے کہا کہ یہ کس خطاط نے لکھا ہے۔ چنانچہ استاد یوسف کو بلایا گیا۔ گورنر جنرل نے ان کے کام کی تعریف کی اور پوچھا کہ اس کو لکھنے میں آپ کا کتنا وقت لگا۔ استاد یوسف نے کہا کہ سات دن۔ گورنر جنرل نے فوراً اپنے سکریٹری کو حکم دیا کہ استاد کو ان کی خدمت کے اعتراف میں سات ہزار روپے پیش کرو۔ چنانچہ اسی وقت ان کو اتنی رقم کا چیک دے دیا گیا۔

استاد یوسف سے ایک شخص نے پوچھا کہ خوش نویسی کا فن آپ نے کس استاد سے سیکھا ہے۔ انھوں نے کہا کہ کسی سے نہیں۔ ان کے والد خود ایک مشہور خوش نویس تھے۔ مگر انھوں نے اپنے والد کی شاگردی بھی نہیں کی۔ پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ میں نے خوش نویسی کا فن لال قلعہ سے سیکھا ہے۔ لال قلعہ میں مغل دور کے استادوں کی وصلیاں (تختیاں) رکھی ہوئی ہیں۔ ان تختیوں میں قطعات لکھے ہوئے ہے جو فن خطاطی کے شاہکار نمونے ہیں۔ استاد یوسف دس سال تک برابر یہ کرتے رہے کہ لال قلعہ جا کر ان تختیوں کو دیکھتے۔ ہر روز ایک قطعہ اپنے ذہن میں بٹھا کر واپس آتے۔ اس کو اپنے قلم سے بار بار لکھتے۔ اور پھر اگلے دن اپنا لکھا ہوا کاغذ لے کر لال قلعہ جاتے۔ وہاں کی محفوظ تختی سے اپنے لکھے ہوئے کو ملاتے اور اس طرح مقابلہ کر کے اپنی غلطیوں کی اصلاح کرتے۔ اس طرح مسلسل دس سال تک ہر روز لال قلعہ کی قطعات کی تختیوں سے وہ خود اپنی اصلاح لیتے رہے اور ان کو دیکھ دیکھ کر مشق کرتے رہے۔ یہی دس سالہ جدوجہد تھی جس نے انھیں استاد یوسف بنا دیا۔

اگر آدمی کے اندر شوق ہو تو نہ پیسہ کی ضرورت ہے اور نہ استاد کی، نہ کسی اور چیز کی۔ اس کا شوق ہی اس کے لئے ہر چیز کا بدل بن جائے گا۔ وہ بغیر کسی چیز کے سب چیز حاصل کرے گا۔

افسوس نہ کیجئے

امریکہ کے ایک نفسیاتی ڈاکٹر نے کہا ہے کہ آدمی سب سے زیادہ جس چیز میں اپنا وقت برباد کرتا ہے وہ افسوس ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ بیشتر لوگ ماضی کی تلخ یادوں میں گھرے رہتے ہیں۔ وہ یہ سوچ سوچ کر کڑھتے رہتے ہیں کہ اگر میں نے ایسا کیا ہوتا تو میرا جو کام بگڑ گیا وہ نہ بگڑتا۔ اگر میں نے یہ تدبیر کی ہوتی تو میں نقصان سے بچ جاتا۔ وغیرہ

اس قسم کے احساسات میں جینا اپنے وقت اور قوتوں کو ضائع کرنا ہے۔ گزرا ہوا موقع دوبارہ واپس نہیں آتا، پھر اس کا افسوس کیوں کیا جائے۔ مذکورہ ڈاکٹر کے الفاظ میں بہترین بات یہ ہے کہ ہر ایسے موقع پر آپ یہ کہیں کہ اگلی بار میں اس کام کو دوسرے ڈھنگ سے کروں گا :

Next time I'll do it differently

جب آپ ایسا کریں گے تو آپ گزرے ہوئے معاملہ کو بھول جائیں گے۔ آپ کی توجہ جو اس سے پہلے ماضی کی بے فائدہ یادوں میں لگی ہوئی تھی، وہ مستقبل کے متعلق غور و فکر اور منصوبہ بندی میں لگ جائے گی (ریڈرز ڈائجسٹ ستمبر ۱۹۸۱)

اس کا نقد فائدہ یہ حاصل ہوگا کہ آپ افسوس اور کڑھن میں اپنی قوتیں ضائع کرنے سے بچ جائیں گے۔ جو چیز اس سے پہلے آپ کے لئے صرف تلخ یاد بنی ہوئی تھی، وہ آپ کے لئے ایک قیمتی تجربہ کی حیثیت اختیار کرلے گی، ایک ایسا تجربہ جس میں مستقبل کے لئے سبق ہے، جس میں آئندہ کے لئے نئی روشنی ہے۔

افسوس یا غم بیشتر حالات میں یا ماضی کے لئے ہوتے ہیں یا مستقبل کے لئے۔ آدمی یا تو کسی گزرے ہوئے نقصان کا افسوس کرتا رہتا ہے یا ایسے واقعہ کا غم جس کے متعلق اسے اندیشہ ہو کہ وہ آئندہ پیش آئے گا۔ مگر یہ دونوں ہی غیر ضروری ہیں۔ جو نقصان ہوچکا وہ ہوچکا۔ اب وہ دوبارہ واپس آنے والا نہیں۔ پھر اس کا غم کرنے سے کیا فائدہ۔ اور جس واقعہ کا اندیشہ ہے وہ بہر حال ایک امکانی چیز ہے اور بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ آدمی جس خطرہ کا اندیشہ کرے وہ عین اس کے اندیشہ کے مطابق پیش آجائے۔

نفرت کی تیزاب

مغرب کے ایک ماہر نفسیات کا قول ہے کہ نفرت کی مثال ایک قسم کے تیزاب کی سی ہے۔ایک عام برتن میں اس کو رکھا جائے تو وہ اپنے برتن کو اس سے زیادہ نقصان پہنچائے گا جتنا اس کو جس پر وہ تیزاب ڈالا جانے والا ہے۔

Hatred is like an acid It can do more damage to the container in which it is stored than to the object on which it is poured

اگر آپ کو کسی کے خلاف بغض اور نفرت ہو جائے اور آپ اس کو نقصان پہنچانے کے درپے ہو جائیں تو جہاں تک آپ کا تعلق ہے، آپ کے سینے میں تو رات دن ہر وقت نفرت کی آگ بھڑکتی رہے گی۔ مگر دوسرے شخص پر اس کا اثر صرف اس وقت پہنچتا ہے جب کہ آپ عملاً اس کو نقصان پہنچانے میں کامیاب ہو گئے ہوں۔ مگر ایسا بہت ہی کم ہوتا ہے کہ آدمی کسی کو وہ نقصان پہنچا سکے جو اس کو وہ پہنچانا چاہتا ہے۔ نفرت کے تحت عمل کرنے والے کا منصوبہ بیشتر حالات میں ناکام رہتا ہے۔

مگر جہاں تک نفرت کرنے والے کا تعلق ہے، اس کے لئے دو میں سے ایک عذاب ہر حال میں مقدر ہے۔ جب تک وہ اپنے انتقامی منصوبہ میں کامیاب نہیں ہوا ہے انتقام کی آگ میں جلتے رہنا اور اگر بالفرض کامیاب ہو جائے تو اس کے بعد ضمیر اس کا پیچھا کرتا ہے۔ وہ اپنے حریف کو قتل کر کے خود بھی اپنے چین کو ہمیشہ کے لئے قتل کر لیتا ہے۔ انتقام کے جنون میں اس کا انسانی احساس دبا رہتا ہے مگر جب حریف پر کامیابی کے نتیجہ میں اس کا انتقامی جوش ٹھنڈا پڑتا ہے تو اس کے بعد اس کا ضمیر جاگ اٹھتا ہے اور ساری عمر اس کو ملامت کرتا رہتا ہے کہ تم نے بہت برا کیا۔

فوجداری کے ایک وکیل نے ایک بار راقم الحروف سے کہا کہ میرا سابقہ زیادہ تر ایسے لوگوں سے پیش آتا ہے جن پر قتل کا الزام ہوتا ہے۔ مگر میں نے اپنی زندگی میں جتنے بھی قاتل دیکھے سب کو میں نے پایا کہ قتل کے بعد وہ اپنے قتل پر پشیمان تھے۔ وقتی جوش میں آکر انھوں نے قتل کر دیا مگر جب جوش ٹھنڈا ہوا تو ان کا دل انھیں ملامت کرنے لگا۔ یہی ہر مجرم کا حال ہے۔ کوئی مجرم اپنے کو احساس جرم سے آزاد نہیں کر پاتا۔ جرم کے بعد ہر مجرم کا سینہ ایک نفسیاتی قید خانہ بن جاتا ہے جس میں وہ مسلسل سزا بھگتتا رہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ منفی کارروائی سب سے پہلے اپنے خلاف کارروائی ہے۔ منفی کارروائی کا نقصان آدمی کی اپنی ذات کو پہنچ کر رہتا ہے خواہ وہ دوسروں کو پہنچے یا نہ پہنچے۔

ایک کے بعد دوسرا

پرل ہاربر امریکہ کی ایک بندرگاہ ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے زمانہ میں یہاں امریکی بحریہ کا زبردست فوجی اڈہ قائم تھا۔ ۷ دسمبر ۱۹۴۱ کو جاپان نے اچانک پرل ہاربر پر بمباری کر کے اس کو تباہ کر دیا۔ امریکہ کا جرم یہ تھا کہ وہ جاپان دشمن طاقتوں کے ہاتھ فوجی ہتھیار فروخت کرتا ہے۔ مگر جاپان کے اس جنگی اقدام نے مسئلہ کو اور زیادہ بڑھا دیا۔ اب امریکہ براہ راست جنگ میں شریک ہو گیا۔ اس کے بعد امریکہ، برطانیہ اور روس نے مل کر وہ فوجی محاذ قائم کیا جو تاریخ میں اتحادی طاقتوں (Allied Powers) کے نام سے مشہور ہے۔ اس فوجی اتحاد کا سب سے زیادہ نقصان جاپانیوں کے حصہ میں آیا۔ امریکہ نے اگست ۱۹۴۵ میں جاپان کے دو صنعتی شہروں (ہیروشیما اور ناگاساکی) پر تاریخ کے پہلے ایٹم بم گرائے۔ جاپان کے دونوں صنعتی مراکز بالکل برباد ہو گئے اور اسی کے ساتھ جاپان کی فوجی طاقت بھی۔

پرل ہاربر پر بمباری کرنا بلاشبہ جاپان کی عظیم الشان فوجی غلطی تھی۔ اس اقدام نے غیر ضروری طور پر امریکہ کو جاپان کا دشمن بنا کر براہ راست اس کے خلاف کھڑا کر دیا۔ مگر جاپان ایک زندہ قوم تھی۔ اس نے ایک غلطی کے بعد دوسری غلطی نہیں کی۔ اس نے نئے حالات کو تسلیم کرتے ہوئے اس سے لڑنے کے بجائے اس کے ساتھ ہم آہنگی کا طریقہ اختیار کر لیا۔

جاپان کی اس عقلمندی نے اس کے لئے ایک نیا عظیم تر امکان کھول دیا۔ جنگی میدان میں اقدام کے مواقع نہ پا کر اس نے تعلیم اور صنعت کے میدان میں اپنی جدوجہد شروع کر دی۔ سیاسی اور فوجی اعتبار سے اس نے امریکہ کی بالادستی تسلیم کر لی اور دوسرے پرامن میدانوں میں اپنے آپ کو موڑ دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۳۰ سال میں جاپان نے پہلے سے بھی زیادہ طاقتور حیثیت حاصل کر لی۔ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے ایک مبصر نے لکھا ہے:

> That is a queer culmination of Pearl Harbour, but history has many contrived corridors and perhaps Pearl Harbour was one of them.

یہ پرل ہاربر کے واقعہ کا بڑا عجیب اختتام ہے۔ مگر تاریخ میں اس طرح سے راستہ نکال لینے کی بہت سی مثالیں ہیں اور شاید پرل ہاربر ان میں سے ایک ہے (ہندستان ٹائمس ۳۰ نومبر ۱۹۸۱)

ہر ناکامی کے بعد ایک نئی کامیابی کا امکان آدمی کے لئے موجود رہتا ہے، بشرطیکہ وہ نہ جھوٹی اکڑ دکھائے اور نہ بے فائدہ ماتم میں اپنا وقت ضائع کرے۔ بلکہ حالات کے مطابق از سرنو اپنی جدوجہد شروع کر دے۔

اپنا احتساب

کھیت میں جب فصل بوئی جاتی ہے تو فصل کے ساتھ طرح طرح کے گھاس پھوس بھی اگتے ہیں۔ گیہوں کے ہر پودے کے ساتھ ایک خود رو گھاس بھی نکلتی ہے اور سرسوں کے ہر درخت کے ساتھ ایک نکما پودا بھی بڑھنا شروع ہوتا ہے۔ یہ اپنے آپ نکلنے والے گھاس پھوس فصل کو بہت نقصان پہنچاتے ہیں، وہ کھیت کے پانی اور کھاد میں حصہ دار بن جاتے ہیں۔ وہ اصلی فصل کو بھرپور طور پر بڑھنے نہیں دیتے۔

کسان اگر ان خود رو پودوں کو بڑھنے کے لئے چھوڑ دے تو وہ ساری فصل کو خراب کر دیں۔ کھیت میں دانہ ڈال کر کسان نے جو امیدیں قائم کی ہیں وہ کبھی پوری نہ ہوں۔ اس لئے کسان یہ کرتا ہے کہ وہ کھیت میں نلائی (Weeding) کا عمل کرتا ہے۔ وہ ایک ایک خود رو پودے کو نکالتا ہے تاکہ کھیت کو ان سے صاف کر دے اور فصل کو بڑھنے کا پورا موقع ملے۔ ہر کسان جانتا ہے کہ کھیت میں دانہ ڈالنا ہی کافی نہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ فصل کے ساتھ اگنے والی دوسری گھاسوں کو چن چن کر نکال دیا جائے، ورنہ کھیت سے مطلوبہ فصل حاصل نہیں ہو سکتی۔

یہ نلائی کا عمل جو کھیت میں کیا جاتا ہے یہی انسانی زندگی میں بھی مطلوب ہے اور اس کا شرعی نام محاسبہ ہے۔ انسان کا معاملہ بھی یہی ہے کہ اس کو جب کوئی خوبی کی چیز حاصل ہوتی ہے تو اسی کے ساتھ ایک "نکمی گھاس" بھی اس کے اندر سے اگنا شروع ہوتی ہے۔ اس نکمی گھاس کو جاننا اور اس کو اپنے اندر سے نکال پھینکنا انتہائی ضروری ہے۔ ورنہ آدمی کا انجام وہی ہوگا جو بغیر نلائی کئے ہوئے کھیت کا۔

کسی کو اسباب و وسائل ہاتھ آجائیں تو اس کے اندر بے جا خود اعتمادی کا جذبہ ابھرتا ہے۔ اقتدار مل جائے تو گھمنڈ پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح دولت کے ساتھ بخل، علم کے ساتھ فخر، مقبولیت کے ساتھ ریا اور سماجی عزت کے ساتھ نمائش کی نفسیات پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہ تمام چیزیں گویا خود رو گھاس ہیں جو کسی آدمی کی خوبیوں کو کھا جانے والی ہیں۔ ہر آدمی کو چاہئے کہ وہ اس اعتبار سے اپنا نگراں بن جائے اور جب بھی اپنے اندر کوئی "نکمی گھاس" اگتے ہوئے دیکھے تو اس کو اکھاڑ کر پھینک دے۔ جو شخص اپنے اوپر محاسبہ کا عمل نہ کرے گا وہ یقینی طور پر اس دنیا میں برباد ہو جائے گا۔ وہ ایسا کھیت ہوگا جس کی فصل تباہ ہو گئی، وہ ایسا باغ ہوگا جس کی ساری بہار خزاں میں تبدیل ہو گئی۔

اور ان میں وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ مجھے رخصت دے دیجئے اور مجھ کو فتنہ میں نہ ڈالئے۔ سن لو، وہ تو فتنہ میں پڑ چکے۔ اور بے شک جہنم منکروں کو گھیرے ہوئے ہے۔ اگر تمھیں کوئی اچھائی پیش آتی ہے تو ان کو دکھ ہوتا ہے اور اگر تم کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں ہم نے پہلے ہی اپنا بچاؤ کر لیا تھا اور وہ خوش ہو کر لوٹتے ہیں۔ کہو، ہمیں صرف وہی چیز پہنچے گی جو اللہ نے ہمارے لئے لکھ دی ہے۔ وہ ہمارا کارساز ہے اور اہل ایمان کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہئے کہو تم ہمارے لئے صرف دو بھلائیوں میں سے ایک بھلائی کے منتظر ہو۔ مگر ہم تمھارے حق میں اس کے منتظر ہیں کہ اللہ تم پر عذاب بھیجے اپنی طرف سے یا ہمارے ہاتھوں سے۔ پس تم انتظار کرو ہم بھی تمھارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہیں ۴۹ - ۵۲

مدینہ میں ایک شخص جد بن قیس تھا۔ تبوک کے غزوہ میں نکلنے کے لئے اعلان عام ہوا تو اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر کہا کہ مجھے اس غزوہ سے معاف رکھئے۔ یہ رومی علاقہ ہے۔ وہاں رومی عورتوں کو دیکھ کر میں فتنہ میں پڑ جاؤں گا۔ مگر ایسے مواقع پر عذر پیش کرنا بجائے خود فتنہ میں پڑنا ہے۔ کیونکہ نازک مواقع پر آدمی کے اندر دین کی خاطر فدا ہو جانے کا جذبہ بھڑکنا چاہئے نہ کہ عذرات تلاش کرکے پیچھے رہ جانے کا۔ پھر ایسے کسی عذر کو دینی اور اخلاقی رنگ دینا اور بھی زیادہ برا ہے۔ کیونکہ یہ بےعملی پر فریب کاری کا اضافہ ہے۔

اس قسم کا مزاج حقیقۃً آدمی کے اندر اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ وہ اپنی دنیا کو آخرت کے مقابلہ میں عزیز تر رکھتا ہے۔ خطرات کے موقع پر ایسے لوگ دین کی راہ میں آگے بڑھنے سے رکے رہتے ہیں۔ پھر جب سچے حق پرستوں کو ان کی غیر مصلحت اندیشانہ دینداری کی وجہ سے کبھی کوئی نقصان پہنچ جاتا ہے تو یہ لوگ خوش ہوتے ہیں کہ بہت اچھا ہوا کہ ہم نے اپنے لئے حفاظتی پہلو اختیار کر لیا تھا۔ اس کے برعکس اگر ایسا ہو کہ سچے حق پرست خطرات کا مقابلہ کریں اور اس میں انھیں کامیابی ہو تو ان لوگوں کے دل تنگ ہوتے ہیں۔ کیونکہ ایسا کوئی واقعہ یہ ثابت کرتا ہے کہ انھوں نے جو پالیسی اختیار کی وہ درست نہ تھی۔

سچے اہل ایمان کے لئے اس دنیا میں ناکامی کا سوال نہیں۔ ان کی کامیابی یہ ہے کہ خدا ان سے راضی ہو اور یہ ہر حال میں انھیں حاصل ہوتا ہے۔ مومن پر اگر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ اس کے دل کی انابت کو بڑھاتی ہے۔ اگر اس کو کوئی سکھ ملتا ہے تو اس کے اندر احسان مندی کا جذبہ ابھرتا ہے اور وہ شکر کرکے خدا کی مزید عنایتوں کا مستحق بنتا ہے۔

"تم انتظار کرو ہم بھی انتظار کر رہے ہیں" بظاہر مومنین کا کلمہ ہے۔ مگر حقیقۃً یہ خدا کی طرف سے ہے۔ خدا ان لوگوں سے تہدیدی انداز میں کہہ رہا ہے کہ تم لوگ اہل حق کی بربادی کے منتظر ہو، حالانکہ خدا کے تقدیری نظام کے مطابق انھیں ابدی کامیابی ملنے والی ہے۔ اور تمھارے ساتھ جو ہونا ہے وہ یہ کہ تمھارے جرم کو آخری حد تک ثابت کرکے تم کو دائمی طور پر رسوائی اور عذاب کے حوالے کر دیا جائے۔

کہو تم خوشی سے خرچ کرو یا ناخوشی سے، تم سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔ بے شک تم نافرمان لوگ ہو۔ اور وہ اپنے خرچ کی قبولیت سے صرف اس لئے محروم ہوئے کہ انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کا انکار کیا اور یہ لوگ نماز کے لئے آتے ہیں تو کاہلی کے ساتھ آتے ہیں اور خرچ کرتے ہیں تو ناگواری کے ساتھ۔ تم ان کے مال اور اولاد کو کچھ وقعت نہ دو۔ اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ ان کے ذریعہ سے انھیں دنیا کی زندگی میں عذاب دے اور ان کی جانیں اس حالت میں نکلیں کہ وہ کافر ہوں۔ وہ خدا کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ وہ تم میں سے ہیں حالاں کہ وہ تم میں سے نہیں۔ بلکہ وہ ایسے لوگ ہیں جو تم سے ڈرتے ہیں۔ اگر وہ کوئی پناہ کی جگہ پائیں یا کوئی کھوہ یا گھس بیٹھنے کی جگہ تو وہ بھاگ کر اس میں جا چھپیں

۵۳-۵۷

مدینہ میں یہ صورت پیش آئی کہ عمومی طور پر لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔ ان میں اکثریت مخلص اہل ایمان کی تھی تاہم ایک تعداد وہ تھی جس نے وقت کی فضا کا ساتھ دیتے ہوئے اگرچہ اسلام قبول کر لیا تھا لیکن اس کے اندر وہ سپردگی پیدا نہیں ہوئی تھی جو حقیقی ایمان اور سچے تعلق باللہ کا تقاضا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو منافقین کہا جاتا ہے۔

یہ منافقین زیادہ تر مدینہ کے مالدار لوگ تھے اور یہی مالداری ان کے نفاق کا اصل سبب تھی۔ جس کے پاس کھونے کے لئے کچھ نہ ہو وہ زیادہ آسانی کے ساتھ اس اسلام کو اختیار کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے جس میں اپنا سب کچھ کھو دینا پڑے۔ مگر جن لوگوں کے پاس کھونے کے لئے ہو وہ عام طور پر مصلحت اندیشی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اسلام کے بے ضرر احکام کی تعمیل تو وہ کسی نہ کسی طرح کر لیتے ہیں۔ مگر اسلام کے جن تقاضوں کو اختیار کرنے میں جان و مال کی محرومی دکھائی دے رہی ہو، جس میں قربانی کی سطح پر مومن بننے کا سوال ہو ان کی طرف بڑھنے کے لئے وہ اپنے کو آمادہ نہیں کر پاتے۔

مگر قربانی والے اسلام سے پیچھے رہنا ان کے "نماز روزہ" کو بھی بے قیمت کر دیتا ہے۔ مسجد کی عبادت کا بہت گہرا تعلق مسجد کے باہر کی عبادت سے ہے۔ اگر مسجد سے باہر آدمی کی زندگی حقیقی دین سے خالی ہو تو مسجد کے اندر بھی اس کی زندگی حقیقی دین سے خالی ہوگی اور ظاہر ہے کہ بے روح عمل کی خدا کے نزدیک کوئی قیمت نہیں۔ خدا سچے عمل کو قبول کرتا ہے نہ کہ جھوٹے عمل کو۔

کسی آدمی کے پاس دولت کی رونقیں ہوں اور آدمیوں کا جتھا اس کے گرد پیش دکھائی دیتا ہو تو عام لوگ اس کو رشک کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایسے لوگ سب سے زیادہ بدقسمت لوگ ہیں۔ عام طور پر ان کا جو حال ہوتا ہے وہ یہ کہ مال و جاہ ان کے لئے ایسے بندھن بن جاتے ہیں کہ وہ خدا کے دین کی طرف بھرپور طور پر نہ بڑھ سکیں، وہ خدا کو بھول کر ان میں مشغول رہیں یہاں تک کہ موت آجائے اور بے رحمی کے ساتھ ان کو ان کے مال و جاہ سے جدا کر دے۔

اوران میں ایسے بھی ہیں جو تم پر صدقات کے بارے میں عیب لگاتے ہیں۔ اگر اس میں سے انھیں دے دیا جائے تو راضی رہتے ہیں اور اگر نہ دیا جائے تو ناراض ہو جاتے ہیں۔ کیا اچھا ہوتا کہ اللہ اور رسول نے جو کچھ انھیں دیا تھا اس پر وہ راضی رہتے اور کہتے کہ اللہ ہمارے لئے کافی ہے۔ اللہ اپنے فضل سے ہم کو اور بھی دے گا اور اس کا رسول بھی، ہم کو تو اللہ ہی چاہئے۔ صدقات (زکوٰۃ) تو دراصل فقیروں اور مسکینوں کے لئے ہیں اور ان کارکنوں کے لئے جو صدقات کے کام پر مقرر ہیں۔ اور ان کے لئے جن کی تالیف قلب مطلوب ہے۔ نیز گردنوں کے چھڑانے میں اور جو تاوان بھریں اور اللہ کے راستہ میں اور مسافر کی امداد میں۔ یہ ایک فریضہ ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ علم والا حکمت والا ہے ۵۸ — ۶۰

یہاں زکوٰۃ کے مصارف بتائے گئے ہیں۔ یہ مصارف قرآن کی تصریح کے مطابق آٹھ ہیں :

فقراء	جن کے پاس کچھ نہ ہو
مساکین	جن کو بقدر حاجت میسر نہ ہو
عاملین	جو اسلامی حکومت کی طرف سے صدقات کی وصولی اور اس کے حساب کتاب پر مامور ہوں
مولفۃ القلوب	جن کو اسلام کی طرف راغب کرنا مقصود ہو یا جو اسلام میں کمزور ہوں
رقاب	غلاموں کو آزادی دلانے کے لئے یا اسیروں کا فدیہ دے کر انھیں رہا کرنے کے لئے
غارمین	جو مقروض ہو گئے ہوں یا جن کے اوپر ضمانت کا بار ہو
سبیل اللہ	دعوت دین اور جہاد فی سبیل اللہ کی مد میں
ابن السبیل	مسافر جو حالت سفر میں ضرورت مند ہو جائے خواہ اپنے مکان پر مستغنی ہو

اجتماعی نظم کے تحت جب زکوٰۃ و صدقات کی تقسیم کی جائے تو ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ کچھ لوگوں کو حق تلفی یا غیر منصفانہ تقسیم کی شکایت ہو جاتی ہے۔ مگر ایسی شکایت اکثر خود شکایت کرنے والے کی کمزوری کو ظاہر کرتی ہے۔ تقسیم کا ذمہ دار خواہ کتنا ہی پاکباز ہو، لوگوں کی حرص اور ان کا محدود طرز فکر بہر حال اس قسم کی شکایتیں نکال لے گا۔

مزید یہ کہ اس قسم کی شکایت سب سے زیادہ آدمی کے اپنے خلاف پڑتی ہے، وہ آدمی کے فکری امکانات کو بروئے کار لانے میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ آدمی اگر شکایتی مزاج کو چھوڑ کر ایسا کرے کہ اس کو جو کچھ ملا ہے اس پر وہ راضی ہو جائے اور اپنی سوچ کا رخ اللہ کی طرف کرے تو اس کے بعد یہ ہوگا کہ اس کے اندر نئی ہمت پیدا ہوگی۔ اس کے اندر چھپی ہوئی ایجابی صلاحیتیں جاگ اٹھیں گی۔ وہ ملی ہوئی رقم کو زیادہ کارآمد مصرف میں لگائے گا۔ عطیات پر انحصار کرنے کے بجائے اس کے اندر اپنے آپ پر اعتماد کرنے کا ذہن ابھرے گا۔ وہ خدا کے بھروسہ پر نئے اقتصادی مواقع کی تلاش کرنے لگے گا۔ دوسروں سے بیزاری کے بجائے دوسروں کو ساتھی بنا کر کام کرنے کا جذبہ اس کے اندر پیدا ہوگا، وغیرہ۔

اور ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو نبی کو دکھ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ شخص تو کان ہے۔ کہو کہ وہ تمھاری بھلائی کے لئے کان ہے۔ وہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور اہل ایمان پر اعتماد کرتا ہے اور وہ رحمت ہے ان کے لئے جو تم میں اہل ایمان ہیں۔ اور جو لوگ اللہ کے رسول کو دکھ دیتے ہیں ان کے لئے دردناک سزا ہے۔ وہ تمھارے سامنے اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں تاکہ تم کو راضی کریں۔ حالانکہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ حق دار ہیں کہ وہ اس کو راضی کریں اگر وہ مومن ہیں۔ کیا ان کو معلوم نہیں کہ جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرے اس کے لئے جہنم کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ یہ بہت بڑی رسوائی ہے ۶۱ — ۶۳

مدینہ کے منافقین اپنی نجی مجلسوں میں اسلامی شخصیتوں کا مذاق اڑاتے۔ مگر جب وہ مسلمانوں کے سامنے آتے تو قسم کھا کر یقین دلاتے کہ وہ اسلام کے وفادار ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمان مدینہ میں طاقت ور تھے۔ وہ منافقین کو نقصان پہنچانے کی حیثیت میں تھے۔ اس لئے منافقین مسلمانوں سے ڈرتے تھے۔

اس سے منافق کے کردار کا اصل پہلو سامنے آتا ہے۔ منافق کی دینداری انسان کے ڈر سے ہوتی ہے نہ کہ خدا کے ڈر سے۔ وہ ایسے مواقع پر اخلاق و انصاف والا بن جاتا ہے جہاں انسان کا دباؤ ہو یا عوام کی طرف سے اندیشہ لاحق ہو۔ مگر جہاں اس قسم کا خطرہ نہ ہو اور صرف خدا کا ڈر ہی وہ چیز ہو جو آدمی کی زبان کو بند کرے اور اس کے ہاتھ پاؤں کو روکے تو وہاں وہ بالکل دوسرا انسان ہوتا ہے۔ اب وہ ایک ایسا شخص ہوتا ہے جس کو نہ با اخلاق بننے سے کوئی دل چسپی ہو اور نہ انصاف کا رویہ اختیار کرنے کی کوئی ضرورت۔

جو لوگ مصلحتوں میں گرفتار ہوتے ہیں اور اس بنا پر تحفظات سے اوپر اٹھ کر خدا کے دین کا ساتھ نہیں دے پاتے وہ عام طور پر معاشرہ کے صاحب حیثیت لوگ ہوتے ہیں۔ اپنی حیثیت کو باقی رکھنے کے لئے وہ ان لوگوں کی تصویر بگاڑنے کی کوشش کرتے ہیں جو سچے اسلام کو لے کر اٹھے ہیں۔ وہ ان کے خلاف جھوٹے پروپگنڈے کی مہم چلاتے ہیں۔ ان کو طرح طرح سے بدنام کرنے کی تدبیریں کرتے ہیں۔ ان کی باتوں میں بے بنیاد قسم کے اعتراضات نکالتے ہیں۔

ایسے لوگ بھول جاتے ہیں کہ یہ بے حد سنگین بات ہے۔ یہ اہل ایمان کی مخالفت نہیں بلکہ خود خدا کی مخالفت ہے۔ یہ خدا کا حریف بن کر کھڑا ہونا ہے۔ ایسے لوگ اگر اپنی معصومیت ثابت کرنے کے بجائے اپنی غلطی کا اقرار کرتے اور کم از کم دل سے اسلام کے داعیوں کے خیر خواہ ہوتے تو شاید وہ قابل معافی ٹھہرتے۔ مگر ضد اور مخالفت کا طریقہ اختیار کرکے انھوں نے اپنے کو خدا کے دشمنوں کی فہرست میں شامل کر لیا۔ اب رسوائی اور عذاب کے سوا ان کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔

اللہ کا ڈر آدمی کے دل کو نرم کر دیتا ہے۔ وہ لوگوں کی بے بنیاد باتوں کو بھی خاموشی کے ساتھ سن لیتا ہے، یہاں تک کہ نادان لوگ کہنے لگیں کہ یہ تو سادہ لوح ہیں، باتوں کی گہرائی کو سمجھتے ہی نہیں۔

منافقین ڈرتے ہیں کہ کہیں مسلمانوں پر ایسی سورہ نازل نہ ہو جائے جو ان کو ان کے دلوں کے بھیدوں سے آگاہ کر دے۔ کہو کہ تم مذاق اڑا لو۔ اللہ یقیناً اس کو ظاہر کر دے گا جس سے تم ڈرتے ہو۔ اور اگر تم ان سے پوچھو تو وہ کہیں گے کہ ہم تو ہنسی اور دل لگی کر رہے تھے۔ کہو، کیا تم اللہ سے اور اس کی آیات سے اور اس کے رسول سے ہنسی دل لگی کر رہے تھے۔ بہانے مت بناؤ، تم نے ایمان لانے کے بعد کفر کیا ہے۔ اگر ہم تم میں سے ایک گروہ کو معاف کر دیں تو دوسرے گروہ کو تو ضرور سزا دیں گے کیونکہ وہ مجرم ہیں ۶۴—۶۶

غزوۂ تبوک کے موقع پر مدینہ میں یہ فضا تھی کہ جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے وہ ارباب عزیمت شمار ہو رہے تھے اور جو لوگ اپنے گھروں میں بیٹھ رہے تھے وہ منافق اور پست ہمت سمجھے جاتے تھے۔ بیٹھ رہنے والے منافقین نے رسول اور اصحاب رسول کے عمل کو کمتر ظاہر کرنے کے لئے ان کا مذاق اڑانا شروع کیا۔ کسی نے کہا: یہ قرآن پڑھنے والے ہیں تو اس کے سوا کچھ اور نظر نہیں آتے کہ وہ ہم میں سب سے زیادہ بھوکے ہیں، ہم میں سب سے زیادہ جھوٹے ہیں اور ہم میں سب سے زیادہ بزدل ہیں (ما اری قراءنا ھؤلاء الا ارغبنا بطونا واکذبنا السنة واجبننا عند اللقاء) کسی نے کہا: کیا تم سمجھتے ہو کہ رومیوں سے لڑنا بھی ویسا ہی ہے جیسا عربوں کا آپس میں لڑنا۔ خدا کی قسم کل یہ سب لوگ رسیوں میں بندھے ہوئے نظر آئیں گے (اتحسبون جلاد بنی الاصفر کقتال العرب بعضھم بعضا واللہ لکانا بکم غداً مقرنین فی الحبال) کسی نے کہا: یہ صاحب سمجھتے ہیں کہ وہ روم کے محل اور ان کے قلعے فتح کرنے جا رہے ہیں۔ ان کی حالت پر افسوس ہے (یظن ھذا ان یفتح قصور الروم وحصونہا، ھیہات ھیہات، تفسیر ابن کثیر)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو آپ نے ان لوگوں کو بلا کر پوچھا۔ وہ کہنے لگے: ہم تو صرف ہنسی کھیل کی باتیں کر رہے تھے (انما کنا نخوض ونلعب) اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کیا اللہ اور اس کے احکام اور اس کے رسول کے معاملہ میں تم ہنسی کھیل کر رہے تھے۔

اللہ اور رسول کی بات ہمیشہ کسی آدمی کی زبان سے بلند ہوتی ہے۔ یہ آدمی اگر دیکھنے والوں کی نظر میں بظاہر معمولی ہو تو وہ اس کا استہزاء کرنے لگتے ہیں۔ مگر یہ استہزاء اس آدمی کا نہیں ہے خود خدا کا ہے۔ جو لوگ ایسا کریں وہ صرف یہ ثابت کرتے ہیں کہ وہ خدا کے دین کے بارے میں سنجیدہ نہیں ہیں۔ ایسے لوگ خدا کی نظر میں سخت مجرم ہیں، ان کی جھوٹی تاویلیں ان کی حقیقت کو چھپانے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتیں۔

نفاق اور ارتداد دونوں ایک ہی حقیقت کی دو صورتیں ہیں۔ آدمی اگر اسلام اختیار کرنے کے بعد کھلم کھلا منکر ہو جائے تو یہ ارتداد ہے۔ اور اگر ایسا ہو کہ ذہن اور قلب کے اعتبار سے وہ اسلام سے دور ہو مگر لوگوں کے سامنے وہ اپنے کو مسلمان ظاہر کرے تو یہ نفاق ہے، ایسے منافقین کا انجام خدا کے یہاں وہی ہے جو مرتدین کا ہے، الا یہ کہ وہ مرنے سے پہلے اپنی غلطیوں کا اقرار کر کے اپنی اصلاح کر لیں۔

منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک ہی طرح کے ہیں۔ وہ برائی کا حکم دیتے ہیں اور بھلائی سے منع کرتے ہیں۔ اور اپنے ہاتھوں کو بند رکھتے ہیں۔ انھوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے بھی ان کو بھلا دیا۔ بے شک منافقین بہت نافرمان ہیں۔ منافق مردوں اور منافق عورتوں اور کافروں سے اللہ نے جہنم کی آگ کا وعدہ کر رکھا ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہی ان کے لئے بس ہے۔ ان پر اللہ کی لعنت ہے اور ان کے لئے قائم رہنے والا عذاب ہے۔ جس طرح تم سے اگلے لوگ، وہ تم سے زور میں زیادہ تھے اور مال و اولاد کی کثرت میں تم سے بڑھے ہوئے تھے تو انھوں نے اپنے حصہ سے فائدہ اٹھایا اور تم نے بھی اپنے حصہ سے فائدہ اٹھایا، جیساکہ تمھارے اگلوں نے اپنے حصہ سے فائدہ اٹھایا تھا۔ اور تم نے بھی وہی بحثیں کیں جیسی بحثیں انھوں نے کی تھیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا و آخرت میں ضائع ہوگئے اور یہی لوگ گھاٹے میں پڑنے والے ہیں۔ کیا انھیں ان لوگوں کی خبر نہیں پہنچی جو ان سے پہلے گزرے ــــــــ قوم نوح اور عاد اور ثمود اور قوم ابراہیم اور اصحاب مدین اور الٹی ہوئی بستیوں کی۔ ان کے پاس ان کے رسول دلیلوں کے ساتھ آئے۔ تو ایسا نہ تھا کہ اللہ ان پر ظلم کرتا مگر وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے رہے　۶۷ - ۷۰

پہلے لوگوں کو خدا نے جاہ و مال دیا تو انھوں نے اس سے فخر اور گھمنڈ اور بےحسی کی غذا لی۔ تاہم بعد والوں نے ان کے انجام سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ انھوں نے بھی دنیا کے ساز و سامان سے اپنے لئے وہی حصہ پسند کیا جس کو ان کے پچھلوں نے پسند کیا تھا۔ یہی ہر دور میں عام آدمی کا حال رہا ہے۔ وہ حق کے تقاضوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ مال و اولاد کے تقاضے ہی اس کے نزدیک سب سے بڑی چیز ہوتے ہیں۔

منافق کا حال بھی باعتبار حقیقت یہی ہوتا ہے۔ وہ ظاہری طور پر تو مسلمانوں جیسا نظر آتا ہے۔ مگر اس کے جینے کی سطح وہی ہوتی ہے جو عام دنیا داروں کی سطح ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعض نمائشی اعمال کو چھوڑ کر حقیقی زندگی میں وہ ویسا ہی ہوتا ہے جیسے عام دنیا دار ہوتے ہیں۔ منافق کی قلبی دلچسپیاں دیندار کے مقابلہ میں دنیا داروں سے زیادہ وابستہ ہوتی ہیں۔ آخرت کی مد میں خرچ کرنے سے اس کا دل تنگ ہوتا ہے مگر بے فائدہ دنیوی مشغلوں میں خرچ کرنا ہو تو وہ بڑھ چڑھ کر اس میں حصہ لیتا ہے۔ حق کا فروغ اس کو پسند نہیں آتا البتہ ناحق کا فروغ ہو تو اس کو وہ شوق سے گوارا کرتا ہے۔ ظاہری دین داری کے باوجود وہ خدا اور آخرت کو اس طرح بھولا رہتا ہے جیسے اس کے نزدیک خدا اور آخرت کی کوئی حقیقت نہیں۔

ایسے لوگ اپنے ظاہری اسلام کی بنا پر خدا کی پکڑ سے بچ نہیں سکتے۔ دنیا میں ان کے لئے لعنت ہے اور آخرت میں ان کے لئے عذاب۔ دنیا میں بھی وہ خدا کی رحمتوں سے محروم رہیں گے اور آخرت میں بھی۔

خدا کے ساتھ کامل وابستگی ہی وہ چیز ہے جو آدمی کے عمل میں قیمت پیدا کرتی ہے۔ کامل وابستگی کے بغیر جو عمل کیا جائے، خواہ وہ بظاہر دینی عمل کیوں نہ ہو، وہ آخرت میں اسی طرح بے قیمت قرار پائے گا جیسے روح کے بغیر کوئی جسم، جو جسم سے ظاہری مشابہت کے باوجود عملاً بے قیمت ہوتا ہے۔

اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔ وہ بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر اللہ رحم کرے گا۔ بے شک اللہ زبردست ہے حکمت والا ہے۔ مومن مردوں اور مومن عورتوں سے اللہ کا وعدہ ہے باغوں کا کہ ان کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اور وعدہ ہے ستھرے مکانوں کا ہمیشگی کے باغوں میں، اور اللہ کی رضامندی جو سب سے بڑھ کر ہے۔ یہی بڑی کامیابی ہے ۷۲-۷۱

منافقانہ طور پر اسلام سے وابستہ رہنے والے لوگوں میں جو خصوصیات ہوتی ہیں وہ ہیں آخرت سے غفلت، دنیوی ضرورتوں سے دل چسپی، بھلائی کے ساتھ تعاون سے دوری اور نمائشی کاموں کی طرف رغبت۔ ان مشترک خصوصیات کی وجہ سے وہ ایک دوسرے سے خوب ملے جلے رہتے ہیں۔ یہ چیزیں ان کو مشترک دل چسپی کا موضوع گفتگو دیتی ہیں۔ اس سے انھیں ایک دوسرے کی مدد کرنے کا میدان حاصل ہوتا ہے۔ یہ ان کے لئے باہمی تعلقات کا ذریعہ بنتا ہے۔

یہی معاملہ ایک اور شکل میں سچے اہل ایمان کا ہوتا ہے، ان کے دل میں خدا کی لگن لگی ہوئی ہوتی ہے۔ ان کو سب سے زیادہ آخرت کی فکر ہوتی ہے۔ وہ دنیا کی چیزوں سے بطور ضرورت تعلق رکھتے ہیں نہ کہ بطور مقصد۔ خدا کی پسند کا کام ہو رہا ہو تو ان کا دل فوراً اس کی طرف کھنچ اٹھتا ہے۔ برائی کا کام ہو تو اس سے ان کی طبیعت ابا کرتی ہے۔ ان کی زندگی اور ان کا اثاثہ سب سے زیادہ خدا کے لئے ہوتا ہے نہ کہ اپنے لئے۔ وہ خدا کی یاد کرنے والے اور خدا کی راہ میں خرچ کرنے والے ہوتے ہیں۔

اہل ایمان کے یہ مشترک اوصاف انھیں ایک دوسرے سے قریب کر دیتے ہیں۔ سب کی دوڑ خدا کی طرف ہوتی ہے۔ سب کی اطاعت کا مرکز خدا کا رسول ہوتا ہے۔ جب وہ ملتے ہیں تو یہی وہ باہمی دلچسپی کی چیزیں ہوتی ہیں جن پر وہ بات کریں۔ انھیں اوصاف کے ذریعہ وہ ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں۔ اسی کی بنیاد پر ان کے آپس کے تعلقات قائم ہوتے ہیں۔ اسی سے انھیں وہ مقصد ہاتھ آتا ہے جس کے لئے وہ متحدہ کوشش کریں۔ اسی سے ان کو وہ نشانہ ملتا ہے جس کی طرف سب مل کر آگے بڑھیں۔

دنیا میں اہل ایمان کی زندگی ان کی آخرت کی زندگی کی تمثیل ہے۔ دنیا میں اہل ایمان اس طرح جیتے ہیں جیسے ایک باغ میں بہت سے شاداب درخت کھڑے ہوں۔ ہر ایک دوسرے کے حسن میں اضافہ کر رہا ہو۔ ان درختوں کو فیضان خداوندی سے نکلنے والے آنسو سیراب کر رہے ہوں۔ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا اس طرح خیر خواہ اور ساتھی ہو کہ پورا ماحول امن وسکون کا گہوارہ بن جائے۔ یہی ربانی زندگی آخرت میں جنتی زندگی میں تبدیل ہو جائے گی۔ وہاں آدمی نہ صرف اپنی بوئی ہوئی فصل کاٹے گا بلکہ خدا کی خصوصی رحمت سے ایسے انعامات پائے گا جن کا اس سے پہلے اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

اے نبی کافروں اور منافقوں سے جہاد کرو اور ان پر کڑے بن جاؤ۔ اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔ وہ خدا کی قسم کھاتے ہیں کہ انھوں نے نہیں کہا۔ حالاں کہ انھوں نے کفر کی بات کہی اور وہ اسلام کے بعد کافر ہوگئے اور انھوں نے وہ چاہا جو انھیں حاصل نہ ہوسکی۔ اور یہ صرف اس کا بدلہ تھا کہ ان کو اللہ اور رسول نے اپنے فضل سے غنی کر دیا۔ اگر وہ توبہ کریں تو ان کے حق میں بہتر ہے اور اگر وہ اعراض کریں تو خدا ان کو دردناک عذاب دے گا دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اور زمین میں ان کا نہ کوئی حمایتی ہوگا اور نہ مددگار ۷۳-۷۴

ایک روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تقریباً ۸۰ منافقین مدینہ میں موجود تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ منافقین سے جس جہاد کا حکم دیا گیا ہے وہ جنگ کے معنی میں نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو آپ ان منافقین کا خاتمہ کرا دیتے۔ اس سے مراد دراصل وہ جہاد ہے جو زبان اور برتاؤ اور شدت احتساب کے ذریعہ کیا جاتا ہے (امر بالجہاد مع المنافقین باللسان وشدۃ الزجر والتغلیظ۔ قرطبی عن ابن عباس) چنانچہ جمہور امت کے نزدیک منافقین کے مقابلہ میں جہاد بالسیف مشروع نہیں ہے

منافقت یہ ہے کہ آدمی اسلام کو اس طرح اختیار کرے کہ وہ اس کو مفادات اور مصلحتوں کے تابع کئے ہوئے ہو۔ اس قسم کے لوگ جب دیکھتے ہیں کہ کچھ خدا کے بندے غیر مصلحت پرستانہ انداز میں اسلام کو اختیار کئے ہوئے ہیں اور اس کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے ہیں تو ایسا اسلام انھیں اپنے اسلام کو بے وقعت ثابت کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ایسے داعیوں سے انھیں سخت نفرت ہو جاتی ہے۔ وہ ان کو اکھاڑنے کے درپے ہو جاتے ہیں جس اسلام کے نام پر وہ اپنی تجارتیں قائم کرتے ہیں اسی اسلام کے داعیوں کے وہ دشمن بن جاتے ہیں۔

منافقین کی یہ دشمنی سازش اور استہزار کے انداز میں ظاہر ہوتی ہے۔ اگر وہ کسی کو دیکھتے ہیں کہ اس کے اندر کسی وجہ سے سچے اسلام کے داعیوں کے بارے میں مخالفانہ جذبات ہیں تو وہ اس کو ابھارتے ہیں تاکہ وہ ان سے لڑ جائے۔ وہ مخلص اہل ایمان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ وہ ایسی باتیں کہتے ہیں جس سے ان کی قربانیاں بے حقیقت معلوم ہونے لگیں۔ وہ ان کی معمولی باتوں کو اس طرح بگاڑ کر پیش کرتے ہیں کہ عوام میں ان کی تصویر خراب ہو جائے۔ تبوک کے سفر میں ایک بار ایسا ہوا کہ ایک پڑاؤ کے مقام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی گم ہوگئی۔ کچھ مسلمان اس کو تلاش کرنے کے لئے نکلے۔ یہ بات منافقوں کو معلوم ہوئی تو انھوں نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا: یہ صاحب ہم کو آسمان کی خبریں بتاتے ہیں۔ مگر ان کو اپنی اونٹنی کی خبر نہیں کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔

منافق مسلمان سچے اسلام کے داعیوں کو ناکام کرنے کے لئے شیطان کے آلۂ کار بنتے ہیں۔ مگر سچے اسلام کے داعیوں کا مددگار ہمیشہ خدا ہوتا ہے۔ وہ منافقوں کی تمام سازشوں کے باوجود ان کو بچا لیتا ہے۔ اور منافقین کا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنا جرم ثابت کرکے اس کے مستحق بنتے ہیں کہ ان کو دنیا میں بھی عذاب دیا جائے اور آخرت میں بھی۔

اور ان میں وہ بھی ہیں جنھوں نے اللہ سے عہد کیا کہ اگر اس نے ہم کو اپنے فضل سے عطا کیا تو ہم ضرور صدقہ کریں گے اور ہم صالح بن کر رہیں گے۔ پھر جب اللہ نے ان کو اپنے فضل سے عطا کیا تو وہ بخل کرنے لگے اور برگشتہ ہوکر منھ پھیر لیا۔ پس اللہ نے ان کے دلوں میں نفاق بٹھا دیا اس دن تک کے لئے جب کہ وہ اس سے ملیں گے اس سبب سے کہ انھوں نے اللہ سے کئے ہوئے وعدہ کی خلاف ورزی کی اور اس سبب سے کہ وہ جھوٹ بولتے رہے۔ کیا انھیں خبر نہیں کہ اللہ ان کے راز اور ان کی سرگوشی کو جانتا ہے اور اللہ تمام چھپی ہوئی باتوں کو جاننے والا ہے۔ وہ لوگ جو طعن کرتے ہیں ان مسلمانوں پر جو دل کھول کر صدقات دیتے ہیں اور جو صرف اپنی محنت مزدوری سے انفاق کرتے ہیں ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اللہ ان مذاق اڑانے والوں کا مذاق اڑاتا ہے اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ تم ان کے لئے معافی کی درخواست کرو یا نہ کرو، اگر تم ستر مرتبہ انھیں معاف کرنے کی درخواست کروگے تو اللہ ان کو معاف کرنے والا نہیں۔ یہ اس لئے کہ انھوں نے اللہ اور رسول کا انکار کیا اور اللہ نافرمانوں کو راہ نہیں دکھاتا ۷۵ — ۸۰

ثعلبہ بن حاطب انصاری نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ میرے لئے دعا کیجئے کہ خدا مجھے مال دیدے۔ آپ نے فرمایا: تھوڑے مال پر شکر گزار رہنا اس سے بہتر ہے کہ تم کو زیادہ مال ملے اور تم شکر ادا نہ کر سکو۔ مگر ثعلبہ نے بار بار درخواست کی چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی کہ خدایا ثعلبہ کو مال دے دے۔ اس کے بعد ثعلبہ نے بکریاں پالیں۔ اس کی نسل اتنی بڑھی کہ مدینہ کی زمین ان کی بکریوں کے لئے تنگ ہوگئی۔ ثعلبہ نے مدینہ کے باہر ایک وادی میں رہنا شروع کیا۔ اب ثعلبہ کے اسلام میں کمزوری آنا شروع ہوئی۔ پہلے ان کی جماعت کی نماز چھوٹی۔ پھر جمعہ چھوٹ گیا۔ حتی کہ یہ نوبت آئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عامل ثعلبہ کے پاس زکوٰۃ لینے کے لئے گیا تو ثعلبہ نے زکوٰۃ نہیں دی اور کہا کہ زکوٰۃ تو جزیہ کی بہن معلوم ہوتی ہے (ما ھذہ الاجزیۃ . ما ھذہ الا اخت الجزیۃ)

وہ شخص خدا کی نظر میں منافق ہے جس کا حال یہ ہو کہ وہ مال کے لئے خدا سے دعائیں کرے اور جب خدا اس کو مال والا بنا دے تو وہ اپنے مال میں خدا کا حق نکالنا بھول جائے۔ آدمی کے پاس مال نہیں ہوتا تو وہ مال والوں کو برا کہتا ہے کہ یہ لوگ مال کو غلط کاموں میں برباد کرتے ہیں۔ اگر خدا مجھ کو مال دے تو میں اس کو خیر کے کاموں میں خرچ کروں۔ مگر جب اس کے پاس مال آتا ہے تو اس کی نفسیات بدل جاتی ہے۔ وہ بھول جاتا ہے کہ پہلے اس نے کیا کہا تھا اور کن جذبات کا اظہار کیا تھا۔ اب وہ مال کو اپنی محنت اور لیاقت کا نتیجہ سمجھ کر تنہا اس کا مالک بن جاتا ہے۔ خدا کا حق ادا کرنا اسے یاد نہیں رہتا۔

اس قسم کے لوگ اپنی کمزوریوں کو چھپانے کے لئے مزید سرکشی یہ کرتے ہیں کہ وہ ان لوگوں کا مذاق اڑاتے ہیں جو خدا کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔ کسی نے زیادہ دیا تو اس کو ریاکار کہہ کر گراتے ہیں۔ اور کسی نے اپنی حیثیت کی بنا پر کم دیا تو کہتے ہیں کہ خدا کو اس آدمی کے صدقہ کی کیا ضرورت تھی۔ جو لوگ اتنا زیادہ اپنے آپ میں گم ہوں انھیں اپنے آپ سے باہر کی اعلیٰ تر حقیقتیں کبھی دکھائی نہیں دیتیں۔

پیچھے رہ جانے والے اللہ کے رسول سے پیچھے بیٹھ رہنے پر بہت خوش ہوئے اور ان کو گراں گزرا کہ وہ اپنے مال اور جان سے اللہ کی راہ میں جہاد کریں۔ اور انھوں نے کہا کہ گرمی میں نہ نکلو۔ کہہ دو کہ دوزخ کی آگ اس سے زیادہ گرم ہے، کاش انھیں سمجھ ہوتی۔ پس وہ ہنسیں کم اور روئیں زیادہ، اس کے بدلے میں جو وہ کرتے تھے۔ پس اگر اللہ تم کو ان میں سے کسی گروہ کی طرف واپس لائے اور وہ تم سے جہاد کے لئے نکلنے کی اجازت مانگیں تو کہہ دینا کہ تم میرے ساتھ کبھی نہیں چلوگے اور نہ میرے ساتھ ہو کر کسی دشمن سے لڑوگے۔ تم نے پہلی بار بھی بیٹھ رہنے کو پسند کیا تھا پس پیچھے رہنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو۔ اور ان میں سے جو کوئی مر جائے اس پر تم کبھی نماز نہ پڑھو اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہو۔ بے شک انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کا انکار کیا اور وہ اس حال میں مرے کہ وہ نافرمان تھے ۸۴ — ۸۱

غزوۂ تبوک سخت گرمی کے موسم میں ہوا۔ مدینہ سے چل کر شام کی سرحد تک تین سو میل جانا تھا۔ منافق مسلمانوں نے کہا کہ ایسی تیز گرمی میں اتنا لمبا سفر نہ کرو۔ یہ کہتے ہوئے وہ بھول گئے کہ خدا کی پکار سننے کے بعد کسی خطرہ کی بنا پر نہ نکلنا اپنے آپ کو شدید تر خطرہ میں مبتلا کرنا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے دھوپ سے بھاگ کر آگ کے شعلوں کی پناہ لی جائے۔

جو لوگ خدا کے مقابلہ میں اپنے کو اور اپنے مال کو زیادہ محبوب رکھتے ہیں وہ جب اپنی خوبصورت تدبیروں سے اس میں کامیاب ہو جاتے ہیں کہ وہ مسلمان بھی بنے رہیں اور اسی کے ساتھ ان کی زندگی اور ان کے مال کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہو تو وہ بہت خوش ہوتے ہیں۔ وہ اپنے کو عقل مند سمجھتے ہیں اور ان لوگوں کو بیوقوف کہتے ہیں جنھوں نے خدا کی رضا کی خاطر اپنے کو ہلکان کر رکھا ہو۔

مگر یہ سراسر نادانی ہے۔ یہ ایسا ہنسنا ہے جس کا انجام رونے پر ختم ہونے والا ہے۔ کیونکہ موت کے بعد آنے والی دنیا میں اس قسم کی "ہوشیاری" سب سے بڑی نادانی ثابت ہوگی۔ اس وقت آدمی افسوس کرے گا کہ وہ جنت کا طلب گار تھا مگر اس نے اپنے اثاثہ کی وہی چیز اس کے لئے نہ دی جو دراصل جنت کی واحد قیمت تھی۔

اس قسم کے منافق ہمیشہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنی تحفظاتی پالیسی کی وجہ سے اپنے گرد مال و جاہ کے اسباب جمع کر لیتے ہیں اس بنا پر عام مسلمان ان سے مرعوب ہو جاتے ہیں۔ ان کی شان دار زندگیاں اور ان کی خوبصورت باتیں لوگوں کی نظر میں ان کو عظیم بنا دیتی ہیں۔ یہ کسی اسلامی معاشرہ کے لئے ایک سخت امتحان ہوتا ہے۔ کیونکہ ایک حقیقی اسلامی معاشرہ میں ایسے لوگوں کو نظر انداز کیا جانا چاہئے، نہ یہ کہ ان کو عزت کا مقام دیا جانے لگے۔

جن لوگوں کے بارے میں پوری طرح معلوم ہو جائے کہ وہ بظاہر مسلمان بنے ہوئے ہیں مگر حقیقۃً وہ اپنے مفادات اور اپنی دنیوی مصلحتوں کے وفادار ہیں ان کو حقیقی اسلامی معاشرہ کبھی عزت کے مقام پر بٹھانے کے لئے راضی نہیں ہو سکتا۔ ایسے لوگوں کا انجام یہ ہے کہ وہ اسلامی تقریبات میں صرف پیچھے کی صفوں میں جگہ پائیں۔ مسلمانوں کے اجتماعی معاملات میں ان کا کوئی دخل نہ ہو۔ دینی مناصب کے لئے وہ نااہل قرار پائیں۔ جس معاشرہ میں ایسے لوگوں کو عزت کا مقام ملا ہوا ہو وہ کبھی خدا کا پسندیدہ معاشرہ نہیں ہو سکتا۔

اور ان کے مال اور ان کی اولاد تم کو تعجب میں نہ ڈالیں۔ اللہ تو بس یہ چاہتا ہے کہ ان کے ذریعہ سے ان کو دنیا میں عذاب دے اور ان کی جانیں اس حال میں نکلیں کہ وہ منکر ہوں۔ اور جب کوئی سورہ اترتی ہے کہ اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول کے ساتھ جہاد کرو تو ان کے مقدور والے تم سے رخصت مانگنے لگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم کو چھوڑ دیجئے کہ ہم یہاں ٹھہرنے والوں کے ساتھ رہ جائیں۔ انھوں نے اس کو پسند کیا کہ پیچھے رہنے والی عورتوں کے ساتھ رہ جائیں۔ اور ان کے دلوں پر مہر کر دی گئی پس وہ کچھ نہیں سمجھتے۔ لیکن رسول اور جو لوگ اس کے ساتھ ایمان لائے ہیں انھوں نے اپنے مال اور جان سے جہاد کیا اور انھیں کے لئے ہیں خوبیاں اور وہی فلاح پانے والے ہیں۔ ان کے لئے اللہ نے ایسے باغ تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہی بڑی کامیابی ہے ۸۹ — ۸۵

منافق اپنے دنیا پرستانہ طریقوں کی وجہ سے اپنے آس پاس دنیا کا ساز و سامان جمع کر لیتا ہے۔ اس کے ساتھ مددگاروں کی بھیڑ دکھائی دیتی ہے۔ یہ چیزیں سطحی قسم کے لوگوں کے لئے مرعوب کن بن جاتی ہیں۔ لیکن گہری نظر سے دیکھنے والوں کے لئے اس کی ظاہری چمک دمک قابل رشک نہیں بلکہ قابل عبرت ہے۔ کیونکہ یہ چیزیں جن لوگوں کے پاس جمع ہوں وہ ان کے لئے خدا کی طرف بڑھنے میں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ خدا کا محبوب بندہ وہ ہے جو کسی تحفظ اور کسی مصلحت کے بغیر خدا کی طرف بڑھے۔ مگر جو لوگ دنیا کی رونقوں میں گھرے ہوئے ہوں وہ ان سے اوپر نہیں اٹھ پاتے۔ جب بھی وہ خدا کی طرف بڑھنا چاہتے ہیں ان کو ایسا نظر آتا ہے کہ وہ اپنا سب کچھ کھو دیں گے۔ وہ اس قربانی کی ہمت نہیں کر پاتے، اس لئے وہ خدا کے وفادار بھی نہیں ہوتے۔ ان کی دنیوی ترقیاں ان کو اس بربادی کی قیمت پر ملتی ہیں کہ آخرت میں وہ بالکل محروم ہو کر حاضر ہوں۔

ایسے لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ جب خدا کا دین کہتا ہے کہ اپنی انا کو دفن کرکے خدا کو پکڑو تو وہ اپنی بڑھی ہوئی انا کو دفن نہیں کر پاتے۔ جب خدا کا دین ان سے شہرت اور مقبولیت سے خالی راستوں پر چلنے کے لئے کہتا ہے تو وہ اپنی شہرت و مقبولیت کو سنبھالنے کی فکر میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔ جب خدا کے دین کی جدوجہد زندگی اور مال کی قربانی مانگتی ہے تو ان کو اپنی زندگی اور مال اتنے قیمتی نظر آتے ہیں کہ وہ اس کو غیر دنیوی مقصد کے لئے قربان نہ کر سکیں۔

یہ کیفیت بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ ان کے دل کی حساسیت ختم ہو جاتی ہے۔ وہ بے حسی کا شکار ہو کر اس تڑپ کو کھو دیتے ہیں جو آدمی کو خدا کی طرف کھینچے اور غیر خدا پر راضی نہ ہونے دے۔

اس کے برعکس جو سچے اہل ایمان ہیں وہ سب سے بڑا مقام خدا کو دئے ہوتے ہیں اس لئے دوسری ہر چیز انھیں خدا کے مقابلہ میں ہیچ نظر آتی ہے۔ وہ ہر قربانی دے کر خدا کی طرف بڑھنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے خدا کی رحمتیں اور نعمتیں ہیں۔ ان کے اور خدا کی ابدی جنت کے درمیان موت کے سوا کوئی چیز حائل نہیں۔

بدوی عربوں میں سے بھی بہانہ کرنے والے آئے کہ انھیں اجازت مل جائے اور جو اللہ اور اس کے رسول سے جھوٹ بولے وہ بیٹھ رہے۔ ان میں سے جنھوں نے انکار کیا ان کو ایک دردناک عذاب پکڑے گا۔ کوئی گناہ کمزوروں پر نہیں ہے اور نہ بیماروں پر اور نہ ان پر جو خرچ کرنے کو کچھ نہیں پاتے جب کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ خیر خواہی کریں۔ نیک کاروں پر کوئی الزام نہیں اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اور نہ ان لوگوں پر کوئی الزام ہے کہ جب تمھارے پاس آئے کہ تم ان کو سواری دو۔ تم نے کہا کہ میرے پاس کوئی چیز نہیں کہ تم کو اس پر سوار کردوں تو وہ اس حال میں واپس ہوئے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اس غم میں کہ انھیں کچھ میسر نہیں جو وہ خرچ کریں۔ الزام تو بس ان لوگوں پر ہے جو تم سے اجازت مانگتے ہیں حالانکہ وہ مال دار ہیں۔ وہ اس پر راضی ہو گئے کہ پیچھے رہنے والی عورتوں کے ساتھ رہ جائیں اور اللہ نے ان کے دلوں پر مہر کردی، پس وہ نہیں جانتے ۹۰ — ۹۳

دعوت دین کی جدوجہد جب لوگوں سے ان کی زندگی اور ان کے مال کا تقاضا کررہی ہو اس وقت صاحب استطاعت ہونے کے باوجود عذر کرکے بیٹھ رہنا بدترین جرم ہے۔ یہ دینی پکار کے معاملہ میں بے حسی کا ثبوت ہے۔ ایک مسلمان کے لئے اس قسم کا رویہ خدا و رسول سے غداری کرنے کے ہم معنی ہے۔ ایسے لوگ خدا کی رحمتوں میں کوئی حصہ پانے کے حقدار نہیں ہیں۔ ان کے پاس جو کچھ تھا اس کو جب انھوں نے خدا کے لئے پیش نہیں کیا تو خدا کے پاس جو کچھ ہے وہ کس لئے انھیں دیدے گا۔ قیمت ادا کئے بغیر کوئی چیز کسی کو نہیں مل سکتی۔

تاہم معذورین کے لئے خدا کے یہاں معافی ہے۔ جو شخص بیمار ہو، جس کے پاس خرچ کرنے کے لئے کچھ نہ ہو، جو اسباب سفر نہ رکھتا ہو، ایسے لوگوں سے خدا درگزر فرمائے گا۔ یہی نہیں بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ نہ کرنے کے باوجود سب کچھ ان کے خانہ میں لکھ دیا جائے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ غزوہ تبوک سے واپس ہوتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا: مدینہ میں کچھ ایسے لوگ ہیں کہ تم کوئی راستہ نہیں چلے اور تم نے کوئی وادی طے نہیں کی مگر وہ برابر تمھارے ساتھ رہے (ان بالمدینۃ اقواماً ما قطعتم وادیاً ولا سرتم سیراً الا وھم معکم)

یہ خوش قسمت لوگ کون ہیں جو نہ کرنے کے باوجود کرنے کا انعام پاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو معذور ہونے کے ساتھ تین باتوں کا ثبوت دیں ـــــ نصح، یعنی عملی شرکت نہ کرتے ہوئے بھی قلبی شرکت۔ احسان، یعنی عدم شرکت کے باوجود کم از کم زبان سے ان کے بس میں جو کچھ ہے اس کو پوری طرح کرتے رہنا۔ حزن، یعنی اپنی کوتاہی پر اتنا شدید رنج جو آنسو کی صورت میں بہہ پڑے۔

کوئی آدمی جب اپنی عملی زندگی میں ایک چیز کو غیر اہم درجہ میں رکھے اور بار بار ایسا کرتا رہے تو اس کے بعد ایسا ہوتا ہے کہ اس چیز کی اہمیت کا احساس اس کے دل سے نکل جاتا ہے۔ اس چیز کے تقاضے اس کے سامنے آتے ہیں مگر دل کے اندر اس کے بارے میں تڑپ نہ ہونے کی وجہ سے وہ اس کی طرف بڑھ نہیں پاتا۔ یہ وہی چیز ہے جس کو بے حسی کہا جاتا ہے اور اسی کو قرآن میں دلوں پر مہر کرنے سے تعبیر کیا گیا ہے۔

یہ ایمان ہے

خدا کو پانا ایسا ہی ہے جیسے کسی مردہ انسان کو زندگی مل جائے	انعام	۱۲۲
ایمانی شعور آدمی کے جینے کی سطح بلند کر دیتا ہے	انفال	۲
ایمان ساری کائنات کو آدمی کی غذا بنا دیتا ہے	آل عمران	۱۹۱
ایمان کے ساتھ آدمی بینا ہے اور ایمان کے بغیر اندھا	غافر	۵۸
ایمان آدمی کے دل کو اللہ کے خوف سے پگھلا دیتا ہے	حدید	۱۶
ایمان سے آدمی کے اندر حق اور ناحق کی گہری پہچان پیدا ہوتی ہے	انفال	۲۹
ایمان والی روح کو صرف اللہ کی یاد سے تسکین حاصل ہوتی ہے	رعد	۲۸
ایمان آدمی کو خدا کی دنیا میں پوری طرح جما دیتا ہے	ابراہیم	۲۷
ایمانی شعور کے بعد آدمی کے اوپر شیطان کا بس نہیں چلتا	نحل	۹۹
ایمان سے عالی ظرفی اور فکری بلندی پیدا ہوتی ہے	نور	۱۲
ایمان والی زبان سے وہی بات نکلتی ہے جو درست ہو	احزاب	۷۰
ایمان کے بعد آدمی کی ساری محبت صرف اللہ کے لئے ہو جاتی ہے	بقرہ	۱۶۵
ایمان وہ ہے جو آدمی کو حق کی حمایت کے لئے مجبور کر دے	اعراف	۱۵۷
ایمان آدمی کو سچوں کے گروہ کے ساتھ جوڑ دیتا ہے	توبہ	۱۱۹
ایمان آدمی کو اللہ کی خاطر متواضع بنا دیتا ہے	ہود	۲۳
ایمان اس سے بلند کر دیتا ہے کہ آدمی لوگوں کو دکھانے کے لئے عمل کرے	نساء	۳۸
ایمان والا آدمی اللہ کے فیصلہ پر راضی ہو جاتا ہے	نساء	۶۵
ایمان آدمی کے دل میں دوسرے بھائیوں کے لئے نرم گوشہ پیدا کر دیتا ہے	توبہ	۷۱
ایمان آدمی کو خدا کے ساتھ عہد میں باندھ دیتا ہے	احزاب	۲۳
ایمان زندگی کے ہر معاملہ میں جنتی راستہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے	یونس	۹
ایمان آدمی کو اس سے اوپر اٹھا دیتا ہے کہ وہ کسی چیز کو عزت کا سوال بنائے	مجادلہ	۱۱
ایمان والا دل بغض و حسد سے بالکل خالی ہوتا ہے	حشر	۱۰
ایمان آدمی کے اندر قول و عمل کے فرق کو ختم کر دیتا ہے	صف	۲
ایمان کے بعد خدا کی کشش ہر دوسری کشش پر غالب آ جاتی ہے	منافقون	۹
ایمان آدمی کو خدا کے بارے میں بے حد حساس بنا دیتا ہے	توبہ	۱۳

دھوکے بازی

برطانیہ کا ایک آرٹسٹ ہے جس کا نام اسٹیفن پریسیٹ لی (Stephen Priestley) ہے۔ چیسٹر (انگلینڈ) میں ایک نیلام میں اس کی چار تصویریں رکھی گئیں۔ اس کی تصویروں کی قیمت صرف ایک پونڈ لگی۔ چنانچہ اسٹیفن پریسیٹ لی (پیدائش ۱۹۵۴) کو ایک پونڈ کا چک دے دیا گیا۔

برطانوی آرٹسٹ ایک پونڈ کا چک پاکر بہت خفا ہوا۔ اس کے نزدیک اس کی ان چار تصویروں کی قیمت اس سے بہت زیادہ تھی جتنی قیمت خریدار کی طرف سے اس کو ملی۔ اس نے اپنے چک پر ایک پونڈ کی رقم کو ۱۰۰۱ پونڈ بنا دیا۔ وقتی طور پر اس نے بنک سے ۱۰۰۱ پونڈ کی رقم حاصل کرلی۔ مگر بہت جلد بنک والوں کو معلوم ہوگیا کہ اس نے بنک کے سامنے جو چک پیش کیا اس کی رقم جعلی تھی۔ اسٹیفن پریسیٹ لی کو پولس کے حوالے کر دیا گیا۔ اب وہ جیل میں دھوکے بازی کے جرم میں سزا بھگت رہا ہے (ہندستان ٹائمس ۲ اکتوبر ۱۹۸۱)

اس واقعہ کا تعلق دنیا کے معاملہ سے ہے۔ مگر اسی میں آخرت کے معاملہ کی تصویر بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ بہت سے لوگ ہیں جن کے پاس صرف ایک پونڈ کا "عمل" ہے مگر وہ اس کو ایک ہزار ایک پونڈ دکھا کر کیش کرانا چاہتے ہیں ——— کوئی دین کا ایک جزئی کام کر رہا ہے اور اسی کو وہ کل کام بتاتا ہے، کوئی ذاتی شہرت کے لئے سرگرم ہے اور اس کو خدمت دین کا عنوان دئے ہوئے ہے۔ کوئی قومی عصبیت کے تحت متحرک ہے اور اس کو اسلامی تحریک قرار دینا چاہتا ہے۔ کوئی اپنے سیاسی ذوق کی تسکین کر رہا ہے اور کہتا یہ ہے کہ وہ اسلامی نظام قائم کرنے کے لئے اٹھا ہے۔ کوئی دولت وعزت کی خاطر کسی کے پیچھے دوڑتا ہے اور اس کو اسلامی اخوت کے پُرفخر لفظ سے یاد کرتا ہے۔ کوئی بحثوں اور مناظروں میں مصروف ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ احیاء اسلام کا مجاہد ہے۔ کوئی معمولی اصلاح کا کام کر رہا ہے اور اس کو دعوت وتبلیغ کا شاندار نام دئے ہوئے ہے۔

ان میں سے ہر شخص موجودہ دنیا میں بھرپور طور پر اپنی قیمت وصول کر رہا ہے۔ وہ اپنے معمولی عمل کو بہت بڑا عمل ثابت کرکے خوش ہے۔ مگر موت ان ساری خوش فہمیوں کو باطل کر دے گی۔ موت کے بعد آنے والی عدالت میں ایسے تمام لوگ دھوکے بازی کے مجرم قرار پائیں گے، خواہ آج کی دنیا میں وہ اپنے ایک پونڈ کے چک سے ایک ہزار ایک پونڈ کی رقم کیش کرانے میں کامیاب ہو گئے ہوں۔

اخلاقی شعور

روسی ناول نگار دستوفسکی (۱۸۸۱ ــ ۱۸۲۱) کا ایک ناول ہے جس کا نام ہے جرم و سزا۔ اس کا ہیرو ایک بدخو، بدمزاج، کریہہ المنظر، لاولد اور بوڑھی عورت کو اس لئے قتل کر دیتا ہے کہ اس کی روز افزوں مگر بے کار دولت کو اپنی اعلیٰ تعلیم کے حصول کا ذریعہ بنائے۔ جب یہ واقعہ ہوتا ہے تو نہ صرف ناول کے قاری بلکہ ناول کے سارے کردار اسے مجرم قرار دیتے ہیں۔

بڑھیا کی دولت اس شخص کے لئے اتنی ہی مفید تھی جتنا کسی شیر کے لئے ہرن کا گوشت۔ شیر ایک ہرن کو مار کر اس کا خون پی جائے تو کسی کو یہ بات عجیب نہیں معلوم ہوتی اور نہ اس کے لئے کوئی تعزیری قانون بنانے کی ضرورت محسوس ہوتی۔ مگر اسی قسم کا فعل ایک انسان کرتا ہے تو ساری انسانیت چیخ اٹھتی ہے اور چاہتی ہے کہ اس کو اس کے فعل کی پوری سزا دی جائے۔ صحیح اور غلط کی یہ تقسیم صرف انسان کی نفسیات میں پائی جاتی ہے۔ دوسری تمام موجودات قانون فطرت یا جبلت کے تحت عمل کرتی ہیں، وہ اس قسم کے کسی فرق سے خالی ہیں۔

اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ انسان ایک اخلاقی وجود ہے، وہ ہر فعل کو صحیح اور غلط کی ترازو پر تولتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اخلاقی حدود کے اندر زندگی گزارے۔ جب کہ جانور اس قسم کا کوئی شعور نہیں رکھتے۔ جانوروں کے یہاں صرف مفید اور مضر کی تقسیم ہے نہ کہ صحیح اور غلط کی۔

اس سے معلوم ہوا کہ انسان کے لئے ایک ایسے ضابطہ کی ضرورت ہے جس میں اس کے اخلاقی شعور کے مطابق صحیح اور غلط کو متعین کیا گیا ہو۔ جانوروں کو جو ضابطہ درکار ہے وہ ابتدا سے ان کی جبلت میں موجود ہوتا ہے۔ انسان اپنے ساتھ اپنا ضابطہ نہیں رکھتا۔ یہ خلا بتاتا ہے کہ انسان کے لئے ضرورت ہے کہ باہر سے اس کو ایک ضابطۂ اخلاق فراہم کیا جائے۔ "قانون" یہی ضابطۂ اخلاق فراہم کرنے کی ایک کوشش ہے۔ مگر اس کا یہ حال ہے کہ پانچ ہزار برس کی بہترین کوششوں کے باوجود انسانی دماغ ابھی تک اپنے لئے قانون کی کوئی متفقہ بنیاد دریافت نہ کر سکا۔

کچھ لوگ اس ناکامی کو یہ حیثیت دیتے ہیں کہ ابھی انسان اپنی تلاش کے مرحلہ میں ہے۔ وہ اپنی منزل تک نہ پہنچ سکا۔ ٹاکویلی (Tocqueville) کے یہ الفاظ اسی قسم کے لوگوں کی ترجمانی کر رہے ہیں:

A new science of politics is indispencible to a new world

(نئی دنیا کے لئے ایک نیا علم سیاست ضروری ہے) مگر حقیقت یہ ہے کہ انسان کی ناکامی تلاش کی ناکامی نہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک ایسی چیز کی تلاش میں ہے جہاں وہ اپنی کوششوں سے پہنچ ہی نہیں سکتا۔

انسان کے اندر اخلاقی شعور ہونا مگر انسان کا خود سے اخلاقی قانون وضع نہ کر سکنا، نظام فطرت کا ایک خلا ہے۔ یہ خلا وحی کی ضرورت ثابت کرتا ہے۔ اگر ایک بار اس اصول کو تسلیم کر لیا جائے تو اس کے بعد اسلام تک پہنچنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

آپریشن

فونکس (امریکہ) کے اسپتال میں ایک شخص نے داخلہ لیا۔ اس کے پیٹ میں نہایت سخت تکلیف تھی۔ ڈاکٹروں نے اس کو آپریشن کا کیس قرار دیا۔ چنانچہ اس کے پیٹ کا آپریشن کیا گیا۔ ڈاکٹروں نے حیرت انگیز طور پر پایا کہ اس کے پیٹ میں ایک ہیرا اٹکا ہوا ہے۔ یہی ہیرا اس کے ناقابل برداشت درد کا سبب تھا۔ ہیرا اس کے پیٹ سے نکال کر الگ کیا گیا۔ اس ہیرے کے ساتھ اب بھی قیمت کا پرچہ لگا ہوا تھا۔ اس پرچہ پر لکھا ہوا تھا ———
۶۵۰۰ ڈالر۔

فوراً پولیس طلب کی گئی۔ پوچھ گچھ کے دوران مریض نے بتایا کہ اس کو انعام میں یہ ہیرا ملا تھا اور غلطی سے وہ اس کے پیٹ میں چلا گیا۔ تاہم بہت جلد معلوم ہو گیا کہ اصل حقیقت کچھ اور ہے۔ یہ شخص ایک بار ہیرے کی ایک دکان میں داخل ہوا اور وہاں ایک ہیرا چرا لیا۔ مگر جب وہ نکلنے کی کوشش کر رہا تھا تو دکان دار کو شبہ ہوا۔ اس نے آدمی کا پیچھا کیا۔ جب آدمی نے دیکھا کہ وہ پکڑا جانے والا ہے تو اس نے ہیرے کو جلدی سے منھ میں ڈالا اور نگل لیا۔ پولیس اس کی تلاش میں تھی مگر وہ ابھی تک پولیس کے ہاتھ نہیں آیا تھا۔ اس کے بعد فوراً اس کو گرفتار کر لیا گیا (ہندستان ٹائمس ۵ نومبر ۱۹۸۱ء)

ناجائز طور پر حاصل کیا ہوا ہیرا آدمی کے پیٹ میں ہضم نہ ہو سکا۔ وہ مجبور ہو گیا کہ چھپائے ہوئے ہیرے کو نکال کر باہر لائے اور خود اپنے جرم کا زندہ ثبوت بن جائے۔ یہی معاملہ شدید تر صورت میں لوگوں کے ساتھ آخرت میں ہوگا۔

دنیا میں آدمی ایک شخص کا حق دبا تا ہے۔ وہ کسی کو وہ کلمۂ اعتراف دینے کے لئے تیار نہیں ہوتا جو از روئے واقعہ اسے دینا چاہئے۔ یہ سب کر کے بھی آدمی موجودہ دنیا میں کامیاب رہتا ہے۔ زور اور ہوشیاری کے ذریعہ وہ اپنے جرم کو چھپا لیتا ہے۔ مگر یہ صرف اس وقت تک ہے جب تک آدمی موت سے دوچار نہیں ہوتا۔ موت ہر آدمی کے لئے گویا قدرت کا آپریشن ہے جو اس کے اندر کو باہر کر دیتا ہے اور اس کے چھپے کو کھلا بنا دیتا ہے۔ جس طرح ہیرا آدمی کے پیٹ میں ہضم نہیں ہوتا۔ اسی طرح ظلم اور بے انصافی کو بھی خدا کی یہ کائنات کبھی قبول نہیں کرتی۔

آدمی پر وہ وقت آنے والا ہے جب کہ خدائی آپریشن اس کی حقیقت کو کھول دے اور اس کے لئے اپنے جرائم کے اقرار کے سوا کوئی چارہ نہ رہے۔

ثواب

جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے پیسہ دیا ہے وہ عام طور پر ایسا کرتے ہیں کہ اپنے ملازموں اور ماتحت کارکنوں کو تو صرف واجبی تنخواہ یا اجرت دیتے ہیں۔ دوسری طرف کانفرنس یا ریلیف فنڈ یا مشہور اداروں کو بڑی بڑی رقمیں دے کر خوش ہوتے ہیں۔ اگر ان سے پوچھئے کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں تو وہ کہیں گے کہ ملازم یا کارکن کو جو رقم دی جاتی ہے وہ تو ان کے کام کی اجرت ہوتی ہے۔ اس پر ہم کو ثواب نہیں ملے گا۔ انھوں نے ہماری خدمت کی اور ہم نے ان کو معاوضہ دے دیا۔ اس پر ثواب کیسا۔ یہ تو دونوں طرف سے معاملہ برابر ہوگیا۔ اس کے برعکس اداروں اور ملی کاموں میں جو رقم دی جاتی ہے ان کے متعلق یقینی ہے کہ ان پر ثواب ملے گا۔

مگر اس کی تہ میں اصل بات کچھ اور ہے اور یہ جواب محض اصل بات پر پردہ ڈالنے کی ایک کوشش ہے۔

اصل یہ ہے کہ ہر آدمی کے دل میں یہ چھپی ہوئی خواہش موجود ہے کہ وہ جو کچھ دے اس کا معاوضہ اس کو اسی دنیا میں ملے۔ غریب آدمی یہ معاوضہ پیسہ کی صورت میں چاہتا ہے۔ مگر جن لوگوں کے پاس کافی پیسہ آجاتا ہے ان کو جس معاوضہ کی تمنا ہوتی ہے وہ سماجی حیثیت (سوشل اسٹیٹس) ہے۔ یہی وہ چھپی ہوئی خواہش ہے جو اس قسم کے لوگوں کے انفاق کا رخ بڑی بڑی قابل ذکر مدوں کی طرف کر دیتی ہے۔

ظاہر ہے کہ غریب ملازم یا کارکن یہ معاوضہ دینے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اس کے پاس نہ اخبار ہوتا ہے نہ اسٹیج۔ اس کے پاس نہ اونچی بلڈنگوں والے ادارے ہیں اور نہ استقبال کرنے والا حلقہ۔ مگر ایک شخص جب کسی مشہور ادارہ یا کسی "عظیم الشان" ملی مہم میں رقم دیتا ہے تو اس کو امید رہتی ہے کہ اس کو شاندار معاوضہ ملے گا ——— جلسوں کی صدارت، عوامی مواقع پر نمایاں نشست، اداروں میں پر زور استقبال، سماجی حیثیت میں اضافہ، اخباروں میں نام چھپنا اور بڑے بڑے لوگوں کی صف میں جگہ ملنا، وغیرہ

ثواب کا تعلق نیت سے ہے نہ کہ قابل تذکرہ مدوں سے۔ ثواب حقیقۃً اس عمل میں ہے جو صرف اللہ کی رضا کے لئے کیا گیا ہو۔ ثواب یہ ہے کہ اللہ کی خاطر ایسی مدوں میں دیا جائے جو لوگوں کو دکھائی نہیں دیتیں۔ ان مواقع پر خرچ کیا جائے جہاں ہر قسم کے دوسرے محرکات حذف ہو جاتے ہیں۔ جس انفاق کا فائدہ اسی دنیا میں وصول کر لیا گیا ہو اس کا فائدہ کسی کو آخرت میں ملے گا تو کیوں ملے گا۔

لوگ دکھائی دینے والے مقامات پر انفاق کر رہے ہیں حالاں کہ خدا ان کے انفاق کو قبول کرنے کے لئے اس مقام پر کھڑا ہوا ہے جو ظاہر پرست انسانوں کو دکھائی نہیں دیتا۔

جھوٹا استدلال

جنگ جمل میں حضرت زبیر بن العوام بھی شامل تھے۔ وہ حضرت علی کے خلاف تھے اور ان کے مخالف گروہ کے ساتھ شامل ہو کر حضرت علی سے لڑنے کے لئے آئے تھے۔ میدان جنگ میں ان کی گفتگو حضرت علی سے ہوئی۔ اس کے بعد وہ واپس لوٹ گئے اور لڑائی میں شریک نہ ہوئے۔ ان کے لڑکے عبد اللہ نے پوچھا کہ آپ نے کیوں ایسا کیا۔ انھوں نے جواب دیا: میں نے علی کے لشکر میں عمار بن یاسر کو دیکھا ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا کہ عمار کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا" جنگ جمل میں حضرت عمار بچ گئے البتہ اس کے بعد جنگ صفین میں مارے گئے۔ اس واقعہ کے بعد واضح طور پر ثابت ہو گیا کہ حضرت علی کے مخالفین غلطی پر تھے۔ اس کھلی ہوئی دلیل کے باوجود مخالفین نے اپنی غلطی تسلیم نہ کی۔ ان میں سے ایک شخص نے کہا: عمار کو اس نے قتل کیا ہے جو ان کو میدان جنگ میں لایا تھا (انما قتلہ من جاء بہ الی الحرب) یہ توجیہہ تیزی سے تمام مخالفین میں پھیل گئی اور سب نے اس کو درست سمجھ کر قبول کر لیا۔

آدمی اگر نہ ماننا چاہے تو وہ کھلے ہوئے دلائل کے انکار کے لئے بھی کچھ نہ کچھ الفاظ پالے گا۔ تاہم ایک سچی دلیل ہوتی ہے اور ایک جھوٹی دلیل۔ دنیا میں انسان کو آزادی ملی ہوئی ہے اس لئے یہاں وہ جھوٹی دلیل چلا سکتا ہے۔ مگر جب آخرت آئے گی تو وہاں تمام جھوٹے دلائل بالکل بے معنی ہو جائیں گے۔ وہاں اسی دلیل میں وزن ہو گا جو خدا کے نزدیک دلیل ہو، جس کا دلیل ہونا خدا کے محکم قوانین سے ثابت ہوتا ہو۔

یہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں آدمی کو ہر قسم کی آزادی ملی ہوئی ہے۔ یہاں کا ایک برتن دودھ کو جس طرح قبول کرتا ہے اسی طرح وہ شراب کو بھی قبول کر لیتا ہے۔ ہر آدمی آزاد ہے کہ وہ اپنے برتن کو چاہے دودھ سے بھرے چاہے شراب سے۔ یہی حال انسانی الفاظ کا ہے۔ انسانی الفاظ میں بڑی لچک ہے۔ ایک باطل بات بھی الفاظ میں اسی طرح ڈھل جاتی ہے جس طرح ایک حق بات۔

یہ صورت حال آدمی کو دھوکا دیتی ہے۔ وہ اپنی جھوٹی خواہشوں اور بے بنیاد خیالات کو الفاظ کی صورت دے کر یہ سمجھتا ہے کہ اس نے اپنا برسر حق ہونا ثابت کر دیا۔ حالاں کہ یہ دھوکے کے سوا اور کچھ نہیں۔ بہت جلد یہ حالات ختم ہو جائیں گے۔ خدا امتحان کی دنیا کو توڑ کر انجام کی دنیا بنائے گا۔ اس وقت وہ آزادی چھن جائے گی جو آج امتحانی مصلحت کی بنا پر ہر ایک کو ملی ہوئی ہے۔ اس وقت اس کو معلوم ہو گا کہ جس چیز کو اس نے دلیل سمجھ رکھا تھا وہ محض ایک دھاندلی تھی، وہ لفظی بازیگری تھی نہ کہ حقیقت بیانی۔ اس وقت وہ جان لے گا کہ اس نے بے معنی الفاظ کو با معنی الفاظ سمجھ لیا تھا، اگرچہ اس وقت کا جاننا کسی کے کچھ کام نہ آئے گا۔

سب سے بڑا اندیشہ

وہ کون سا ڈر ہے جس کا اندیشہ سب کو ہو۔ اس کا ایک ہی جواب ہو سکتا ہے، اور وہ موت ہے، صرف موت ہی اس دنیا میں ایک ایسی چیز ہے جس کے اندیشے سے کوئی بھی شخص خالی نہیں ۔

ایک غریب مزدور جو روز کماتا ہو اور روز کھاتا ہو اس کو اندیشہ ہوتا ہے کہ کسی دن مزدوری نہ ملی تو بھوکا رہنا ہوگا۔ مگر امیر آدمی کو اس کا کوئی اندیشہ نہیں۔ ایک کمزور آدمی کو اندیشہ ہوتا ہے کہ کوئی معاملہ پڑ جائے تو مضبوط آدمی اس کو دبا لے گا، مگر جو طاقت ور ہو اس کو اس قسم کا کوئی اندیشہ نہیں۔ ایک شخص قانون نہ جانتا ہو تو اس کو اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں اس کی جائداد پر کوئی شخص غلط طریقہ سے قبضہ نہ کرلے۔ مگر جو قاعدے قانون سے واقف ہو اس کو اس کا کوئی اندیشہ نہیں۔ ایک شخص جس کی ملازمت ابھی عارضی ہو اس کو اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں اس کا افسر خفا ہو جائے اور اس کو برخاست نہ کردے، مگر جو مستقل ہو چکا ہو اس کو اس کا کوئی اندیشہ نہیں۔ ایک شخص کی آمدنی کم ہو تو اس کو اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر خرچ کی کوئی مد زیادہ نکل آئی تو کیسے کام چلے گا۔ مگر جس کی آمدنی زیادہ ہو اسے اس کا کوئی اندیشہ نہیں۔ ایک چھوٹے دوکان دار کو اندیشہ ہوتا ہے کہ بازار کا بھاؤ خراب ہو گیا تو اس کا نقصان ہو جائے گا مگر بڑے بڑے تاجر جو بازار بھاؤ پر حکومت کرتے ہیں ان کو اس قسم کا کوئی اندیشہ نہیں۔ ایک غریب شخص مقدمہ میں پھنس جائے تو اس کو اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں مقدمہ ہار نہ جائے۔ مگر جو سرکار رس ہو اور جو بڑے بڑے وکیلوں کی فیس ادا کرنے کی قدرت رکھتا ہو اس کو اس قسم کا کوئی اندیشہ نہیں۔ کسی ملک میں جو شخص اقلیتی فرقہ سے تعلق رکھتا ہو اس کو اندیشہ ہوتا ہے کہ اس کی حق تلفی نہ کی جائے مگر اکثریتی فرقہ کے ایک فرد کے لئے اس قسم کا کوئی اندیشہ نہیں ۔

غرض کوئی ایسا خطرہ اور اندیشہ نہیں ہے جو سب کے لئے یکساں ہو۔ ہر اندیشہ ایک کو ہوتا ہے تو دوسرے کو نہیں ہوتا۔ صرف موت اس دنیا میں ایک ایسی چیز ہے جس کے اندیشے سے کوئی بھی شخص خالی نہیں۔ موت کے آگے سارے لوگ بے بس ہیں۔ موت ایک ایسی تلخ حقیقت ہے جو ہر ایک کو بہرحال تسلیم کرنی ہوتی ہے۔ موت ان لوگوں کو بھی آتی ہے جن کو نہ علاج کی سکت ہے اور نہ کوئی ان کی تیمار داری کرنے والا ہے، اور ان لوگوں کو بھی آتی ہے جن کی دیکھ بھال اور علاج کے لئے ڈاکٹروں اور نرسوں کی فوج لگی ہوتی ہے، اور جن کے لئے ہر وقت ہوائی جہاز کھڑے رہتے ہیں کہ کوئی بات ہو تو فوراً انھیں اڑا کر بہترین اسپتال اور بہترین صحت بخش مقام پر پہنچا دیں۔ موت کمزور کو بھی آتی ہے اور مضبوط کو بھی، مریض کو بھی اور تندرست کو بھی، بچہ کو بھی اور بوڑھے کو بھی، عورت کو بھی اور مرد کو بھی، رعایا کو بھی اور بادشاہ کو بھی، جاہل کو بھی اور سائنس داں کو بھی کسی بھی شخص کو کوئی ایسی تدبیر نہیں

معلوم جس کے ذریعہ وہ موت سے بچ سکے۔ یا ایک دن کے لئے بھی موت کو ٹال سکے۔ وہ ہر حال میں، ہر جگہ اور ہر شخص کو آلیتی ہے اور مجبور کرتی ہے کہ آدمی اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دے۔

ہر اندیشہ سے آدمی بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ کسی کے پاس ذریعہ آمدنی نہ ہو یا کم ہو اور اندیشہ ہو کہ اس کا کام نہیں چلے گا تو وہ اپنی آمدنی کو بڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔ کوئی کمزور ہو تو وہ کوشش کرتا ہے کہ ایسے لوگوں کا ساتھ حاصل کرے جو ضرورت کے وقت اس کی مدد کر سکتے ہوں۔ غرض ہر اندیشہ سے بچنے کا طریقہ ہے اور اس طریقہ کو اختیار کرکے آدمی بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ پھر کیا موت کے اندیشے سے بچنے کا بھی کوئی طریقہ ہے۔

لوگوں نے طرح طرح سے موت کے اندیشہ سے بچنے کی کوشش کی ہے۔ امریکہ کے ایک شخص سینفرڈ بینٹ (Sanford Bannet) کو خیال ہوا کہ بڑھاپا موت کا اصل سبب ہے۔ اس لئے بڑھاپے کو روکو۔ اس نے اس موضوع پر زبردست مطالعہ کیا۔ مطالعہ سے معلوم ہوا کہ بڑھاپے کا اصل سبب یہ ہے کہ عمر کے بڑھنے کے ساتھ ہماری شریانوں اور وریدوں میں ایک فاسد مادہ جمع ہونے لگتا ہے جس کو کولسٹرول (Cholestrol) کہتے ہیں۔ اس کی وجہ سے ہماری خون کی نالیوں کی قدرتی لچک ختم ہو کر ان میں سختی آجاتی ہے۔ اسی صورت حال کا دوسرا نام بڑھاپا ہے۔ چنانچہ یہ امریکی محقق اس نتیجہ پر پہنچا کہ اگر جسم کے عضلات پر تناؤ اور ڈھیل کا عمل کرکے شریانوں اور وریدوں میں جمع شدہ مادّے کو نکال دیا جائے تو دوبارہ شباب کی واپسی ممکن ہے۔

اب اس نے اس مقصد کے لئے ورزش شروع کی۔ بلکہ ورزشیں ایجاد کیں اور ۲۵ سال تک وہ اپنے قبل از وقت بڑھاپے کو دوبارہ جوانی کی طرف لوٹانے کے لئے مسلسل کوشش کرتا رہا۔ اس کوشش کے شاندار نتائج کو اس نے اپنی ایک کتاب میں لکھا ہے جس کا نام ہے "بڑھاپا اور اس کا سدباب"۔ اس کتاب میں مصنف کی دو تصویریں ہیں۔ ایک پچاس سال کی اور دوسری پچھتر سال کی۔ پچاس سالہ عمر کی تصویر ایک ایسے شخص کا منظر پیش کرتی ہے جس کے چہرے پر افسردگی طاری ہے اور ہڈیاں نکلی ہوئی ہیں۔ وہ دیکھنے میں ایک بوڑھا شخص معلوم ہوتا ہے۔ اس کے برعکس پچھتر سال کی عمر کی جو تصویر ہے اس میں اس شخص کی صورت اس طرح بدل گئی ہے کہ بالکل دوسرا تر و تازہ نوجوان بیٹھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ مگر وہ شخص جس نے چوتھائی صدی کی طویل جدوجہد کے بعد اپنے کو بڑھاپے سے نکال کر دوبارہ جوان بنا لیا تھا، عین اس "جوانی" کے عالم میں ایک روز اس طرح مر گیا کہ وہ سوچ بھی نہ سکا کہ اب اس سے بچنے کے لئے اسے کیا کرنا چاہئے۔

اسی طرح بہت سے ایسے بڑے بڑے لوگ جن کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں تھی، انھوں نے موت کے اندیشے سے بچنے کی تمام ممکن کوششیں کی ہیں۔ کسی نے سمجھا کہ اونچے محل میں رہ کر وہ موت سے بچ سکتا ہے،

چنانچہ اس نے پہاڑ کی چوٹی پر شاندار محل کھڑا کر دیا اور اس میں زندگی گزارنے لگا۔ کسی نے سمجھا کہ دوا علاج میں موت سے بچنے کا راز ہے تو اس نے بہترین ڈاکٹروں اور طبیبوں کی فوج اپنے ساتھ لگا دی۔ کسی کا خیال ہوا کہ وہ موت کا انکار کر کے موت کو ٹال سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے ارادہ اور شعور کی پوری قوت کے ساتھ موت کا انکار کر دیا۔ کسی کا خیال ہوا کہ بہترین غذا میں ابدی زندگی کا راز چھپا ہوا ہے چنانچہ اس نے دنیا بھر کی قیمتی غذائیں اپنے دسترخوان پر جمع کر دیں۔ کسی نے سمجھا کہ بیماروں سے دور رہ کر وہ موت سے بچ سکتا ہے تو اس نے سارے بیماروں کو اپنے سے اتنا دور کر دیا کہ قیاساً ان کی سانس سے نکلی ہوئی ہوا کا کوئی جزء اس کو چھونے نہ پائے۔ کسی نے سمجھا کہ سگریٹ اور شراب کو چھوڑ کر وہ موت سے بچ سکتا ہے تو اس نے سگریٹ اور شراب ہمیشہ کے لئے چھوڑ دی۔ کسی کی سمجھ میں آیا کہ وہ شادی نہ کر کے ہمیشہ زندہ رہ سکتا ہے تو اس نے تمام عمر شادی نہ کی اور عورتوں سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں رکھا۔

مگر کسی کی تدبیر نے کوئی کام نہ کیا اور موت اپنے وقت پر آ کر رہی۔ اب تک کی تاریخ کا آخری فیصلہ یہ ہے کہ موت پر انسان کو کوئی اختیار نہیں۔ موت انسانی زندگی کا ایک ایسا المیہ ہے جس کے مقابلے میں انسان بالکل بے بس ہے۔ موت نہ اپنا وقت بتاتی نہ ہم سے کچھ دریافت کرتی، وہ بالکل اچانک آتی ہے۔ اور جب آتی ہے تو کسی کے لئے ممکن نہیں ہوتا کہ اس کے چنگل سے اپنے کو نکال سکے۔ کوئی بھی علم، کوئی بھی طاقت، کوئی بھی ذریعہ ایسا نہیں ہے جو موت کے مقابلہ میں ذرّہ برابر انسان کی کوئی مدد کر سکے۔ اس معاملہ میں فیصلہ کا سارا اختیار ایک فریق کو ہے دوسرے فریق کو کوئی اختیار نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ موت کی آمد کو روکنے کی ساری باتیں احمقانہ ہیں۔ اصل بات سوچنے کی یہ نہیں ہے کہ موت کو کیسے روکیں۔ بلکہ اصل بات سوچنے کی یہ ہے کہ موت کے بعد پیش آنے والے خطرہ سے کیسے اپنے آپ کو بچائیں۔ جب زلزلہ پیما آلہ خبر دے کہ زلزلہ آ رہا ہے تو کوئی یہ سوچنے میں وقت ضائع نہیں کرتا کہ زلزلہ کو کیسے روکا جائے۔ بلکہ ہر شخص یہ سوچتا ہے کہ زلزلہ کے ممکن نتائج سے کس طرح اپنے کو محفوظ رکھے۔ کیونکہ زلزلہ جب آ رہا ہے تو وہ بہر حال آ کر رہے گا ہم اس کی آمد کو روک نہیں سکتے، ہمارے بس میں جو چیز ہے وہ صرف یہ کہ اپنے کو اس کے خطرات سے بچانے کی فکر کریں، اسی طرح ہزاروں برس کے تجربات نے بتایا ہے کہ موت بہر حال آتی ہے اور ہر شخص کے لئے آتی ہے۔ اب ہم جو چیز کر سکتے ہیں وہ صرف یہ کہ موت کا اس طرح استقبال کریں کہ وہ ہمارے لئے کسی نئی مصیبت میں پڑنے کا سبب نہ بن جائے۔

یہاں "موت کے بعد کیا ہے" کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ بلا شبہ موت کے اس پار دیکھنا ہمارے لئے ممکن نہیں ہے۔ مگر موت ہی ایک ایسا واقعہ نہیں ہے جس کے اس پار داخل ہونے سے پہلے آدمی نہ دیکھ سکتا ہو،

دوسری اسی نوعیت کی بہت سی صورتیں ہیں جو ہماری زندگی میں پیش آتی ہیں اور ہم ان میں ایک احتیاطی رویہ اختیار کرتے ہیں۔ وہی ہم کو موت کے معاملہ میں بھی کرنا چاہئے۔

کسی اجنبی سڑک پر آپ تیزی سے چلے جا رہے ہوں اور یکایک ایک موڑ پر بڑے بڑے سرخ حرفوں میں لکھا ہوا نظر آئے ——— خبردار (Caution) ایسے موقع پر آپ کیا کریں گے۔ یقیناً ایک شخص کے دل میں یہ خیال گزر سکتا ہے کہ موڑ کے اس پار تو مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔ اس لئے میں کیسے مانوں کہ اس کی کوئی حقیقت ہے۔ کیوں نہ میں سمجھوں کہ کسی نے یوں ہی تماشے کے لئے یہ لفظ لکھ دیا ہے۔ مگر عقلمند آدمی ہمیشہ ایسے مقام پر سوچے گا:

"اگر یہ انتباہ صحیح ہوا تو ...."

اس دوسرے امکان کا اندیشہ اس کو مجبور کرے گا کہ وہ ٹھہر کر حقیقتِ حال دریافت کرے، اور پھر اگر اس کی واقعیت پر مطمئن ہو جائے تو اپنے سفر کو اس کے مطابق بنائے۔ موت بھی ایک قسم کا انتباہ ـــ سب سے بڑا انتباہ ہے۔ وہ ہم کو ٹھہر کر سوچنے کی دعوت دے رہا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ قرائن اگر کسی احتیاطی روش کا تقاضا کرتے ہوں تو ہم پہلی فرصت میں اس کو اختیار کر لیں۔ جس طرح سڑک پر چلنے والا آدمی "انتباہ" کا بورڈ دیکھ کر صرف قرائن کی بنیاد پر اس کے صحیح ہونے کو مان لیتا ہے۔ اور اصل خطرے کو دیکھے بغیر اس کی ہدایات کے مطابق اپنی گاڑی چلانے لگتا ہے۔ اسی طرح اس معاملے میں بھی یہ کوئی عقلی روش نہیں ہوگی کہ ہم موت کے دروازے میں داخل ہونے سے پہلے موت کے اُس پار دیکھنے پر اصرار کریں۔ ہم صرف قرائن کی بنیاد پر فیصلہ کر سکتے ہیں اور یہی ہمیں کرنا چاہئے۔

قرائن کا فیصلہ کیا ہے۔ قرائن کا فیصلہ یہ ہے کہ انسان موت کے بعد بھی باقی رہے۔ مادہ اگر مٹ کر توانائی میں تبدیل ہو جاتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ جسمانی انسان فنا ہونے کے بعد کسی نئی زیادہ پائدار شکل میں باقی نہ رہے۔ مزید یہ کہ موت صرف انسانی جسم پر وارد ہوتی ہے۔ بظاہر اس کا کوئی قرینہ نہیں کہ انسانی شعور بھی انسانی جسم کے مرنے کے ساتھ مر جاتا ہو۔

دوسری بات یہ کہ انسان، تمام دوسری چیزوں کے برعکس ایک اخلاقی وجود ہے۔ وہ خیر و شر کا احساس رکھتا ہے۔ انسان کی یہ خصوصیت تقاضا کرتی ہے کہ اخلاقی تقاضوں کے مطابق اس کا فیصلہ ہو۔ اس کے عمل خیر کا بدلہ اس کو خیر کی صورت میں ملے اور اس کے عمل شر کا بدلہ اس کو شر کی صورت میں دیا جائے ——— ان دونوں قرائن کا لحاظ کیا جائے تو موت کے بعد زندگی اور اسی کے ساتھ جنت و جہنم دونوں ثابت ہو جاتے ہیں (رمضان ۱۳۸۶ھ)

تخریبی سیاست کا انجام

عباسی خلیفہ مستنصر باللہ ۶۴۱ھ میں فوت ہوا۔ یہ بہت نازک زمانہ تھا۔ چنگیز خاں کی قیادت میں تاتاریوں نے ماوراءالنہر سے لے کر بحر روم اور بحر اسود تک کے تمام ملکوں کو تاراج کر ڈالا تھا۔ تاہم عراق پر اب بھی عباسی خلیفہ کا قبضہ تھا اور تاتاریوں کے اوپر خلیفہ بغداد کا رعب اتنا زیادہ تھا کہ وہ عراق کی طرف رخ کرنے کی ہمت نہیں کرتے تھے۔ حتیٰ کہ تاتاریوں کے مفتوحہ ممالک میں بدستور خلیفہ بغداد کا خطبہ مسجدوں میں پڑھا جاتا تھا۔

مستنصر باللہ کا ایک بھائی خفاجی نامی تھا جو بہت بہادر اور اولوالعزم تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اگر مجھ کو خلیفہ بنایا جائے تو میں دریائے جیحون کے پار تک ان تاتاریوں کا نام و نشان مٹا دوں۔ مگر سلطنت کے درباری اتنے طاقتور خلیفہ کو اپنے لئے مسئلہ سمجھتے تھے، ان کا خیال تھا کہ اگر خفاجی کو تخت پر بٹھایا گیا تو وہ ہماری بات چلنے نہ دے گا۔ چنانچہ ۶۴۱ھ میں مستنصر باللہ کا انتقال ہوا تو ارکان سلطنت نے خفاجی کو تخت پر بیٹھنے نہ دیا۔ انھوں نے مستنصر باللہ کے لڑکے ابو احمد عبداللہ کو خلافت کے لئے پسند کیا۔ کیونکہ وہ بہت نرم اور سادہ لوح قسم کا آدمی تھا۔ اس کو نہایت آسانی سے اپنے موافق بنایا جا سکتا تھا۔ مستنصر باللہ کے بعد اس کا یہی بیٹا تخت پر بیٹھا اور اس کو مستعصم باللہ کے نام سے پکارا گیا۔

اسی خلیفہ کے زمانہ میں تاتاریوں کی تباہی اپنی تکمیل تک پہنچی۔ وہ ذاتی طور پر اگرچہ دیندار اور متبع سنت تھا مگر وہ انسانوں کو پہچاننے کی صلاحیت نہ رکھتا تھا۔ اس نے پہلی بنیادی غلطی یہ کی کہ موید الدین علقمی کو اپنا وزیر بنا دیا۔ علقمی ایک غالی شیعہ آدمی تھا۔ اس کے سینہ میں یہ آگ بھڑک رہی تھی کہ علویوں کے حق خلافت کو غصب کرنے والے عباسیوں کا خاتمہ کر دے۔ اور ان کی جگہ پر دوبارہ علوی خلافت قائم کرے۔ عباسیوں سے اس کا نفرت اور بغض اس کو اس انتہا تک لے گیا کہ وہ در پردہ تاتاریوں کا دوست بن گیا۔ عباسی سلطنت کو ختم کرنے کا کام وہ خود اپنی طاقت سے نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے منصوبہ بنایا کہ تاتاریوں کا سہارا لے کر پہلے اپنے "دشمن" کو ختم کرے اور اس کے بعد اپنی منشا کے مطابق علوی خاندان کے کسی فرد کو بغداد کے تخت پر بٹھائے۔

علقمی نے وزارت پانے کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ شیعوں کو آگے بڑھانا شروع کیا۔ حکومت کے تمام شعبوں میں شیعوں کو کلیدی مقامات پر بٹھا دیا۔ یہاں تک کہ حکومت پوری طرح علقمی کے ہاتھ میں آگئی۔ اب اس نے سوچی سمجھی اسکیم کے تحت یہ کوشش شروع کر دی کہ عباسیوں کا نام و نشان مٹا دے اور بغداد میں علویوں کی حکومت قائم

کر دے۔ خلیفہ محل کی مصنوعی دنیا میں رہتا تھا۔ نیز علقمی خلیفہ کے سامنے حد درجہ نیازمند اور وفاداری کرتا تھا۔ اس لئے خلیفہ اس کی اندرونی سازشوں سے واقف نہ ہو سکا۔ تاہم شہر کے بعض لوگ اس کے منصوبوں سے پوری طرح آگاہ تھے۔ انھوں نے خلیفہ سے مل کر اس کو مطلع کیا۔ مگر خلیفہ علقمی کی ظاہری وفاداریوں کی وجہ سے اس کے بارے میں اتنا خوش فہم تھا کہ اس نے ان لوگوں کی باتوں کو خود علقمی سے بیان کر دیا۔ اب علقمی نے اور بھی زیادہ اپنی وفاداری اور فرماں برداری ظاہر کر کے خلیفہ کو یقین دلا دیا کہ جن لوگوں نے خلیفہ سے اس قسم کی باتیں کہی ہیں وہ فتنہ پرور اور غدار ہیں۔ چنانچہ ان لوگوں کی دار وگیر شروع ہوگئی اور ان کے انجام کو دیکھ کر بقیہ لوگوں نے بھی اپنی زبانیں بند کر لیں۔

اب علقمی نے چنگیز خاں کے پوتے ہلاکو خاں سے خفیہ خط وکتابت شروع کی جس کی سلطنت خراسان تک پہنچ چکی تھی، علقمی کے ذہن میں نقشہ یہ تھا کہ ہلاکو خاں کے ساتھ "متحدہ محاذ" بنا کر عباسی خلافت کا خاتمہ کر دے اور اس کے بعد علوی خلافت کے قیام کے بارے میں اپنے منصوبہ کی تکمیل کرے۔ تاہم تاتاری حکمراں پر عباسی خلیفہ کا اتنا دبدبہ تھا کہ وہ بغداد پر فوج کشی کرنے کے لئے راضی نہ ہوا۔ علقمی نے اصرار کیا تو اس نے کہا کہ جب تک میرے پاس کافی ضمانت نہ ہوگی میں بغداد پر اقدام نہیں کر سکتا۔ علقمی کے تخریبی ذہن نے ضمانت کی ایک تدبیر سوچ لی۔ اس نے خلیفہ کو یقین دلایا کہ ہمارے پاس فوج ضرورت سے زیادہ ہے۔ ملکی محاصل کا بڑا حصہ اس کے اوپر خرچ ہو جاتا ہے۔ اس لئے خرچ کو کم کرنے کی صورت یہ ہے کہ فوج کی تعداد گھٹا دی جائے۔ خلیفہ کی رضامندی لے کر علقمی نے فوج کے ایک بڑے حصہ کی چھٹی کر دی۔ کچھ فوجیوں کو بغداد سے دور دوسرے مقامات پر بھیج دیا اور خلیفہ سے یہ کہہ دیا کہ ان کو تاتاریوں کی روک تھام کے لئے سرحد پر بھیجا گیا ہے۔

علقمی کا ایک ساتھی خود ہلاکو خاں کے دربار میں موجود تھا۔ یہ نصیر الدین طوسی تھا۔ طوسی بھی علقمی کی طرح غالی شیعہ تھا اور علقمی کے منصوبہ میں پوری طرح شریک تھا۔ طوسی کی معرفت علقمی نے ہلاکو خاں کو پیغام بھیجا کہ بغداد کو میں نے فوجوں سے خالی کر دیا ہے۔ حربی سامان کا بھی بڑا حصہ باہر بھیج دیا ہے۔ یہ واقعہ ہلاکو خاں کی ضمانت طلبی کے لئے کافی ہونا چاہئے۔ اُدھر طوسی نے ہلاکو خاں کو یقین دلایا کہ علم نجوم سے معلوم ہوتا ہے کہ بغداد کے اوپر آپ کا قبضہ بہت جلد ہونے والا ہے۔ ان یقین دہانیوں کے بعد ہلاکو خاں نے بغداد کا رخ کیا۔ پچاس دن تک بغداد کا محاصرہ جاری رہا۔ اس دوران دونوں طرف کی فوجوں میں کئی بار لڑائیاں ہوئیں۔ مگر علقمی شہر کی تمام خبریں خفیہ طور پر ہلاکو خاں کو پہنچا دیتا تھا۔ اور اس طرح بغداد والوں کی ہر اس دفاعی کوشش کو ناکام بنا دیتا تھا جو وہ تاتاریوں کے خلاف کرنا چاہتے تھے

جب محاصرہ بڑھا تو علقمی نے ایک فرضی کارروائی کرکے خلیفہ سے کہا کہ ہلاکو خاں آپ کو امان دینے پر راضی ہوگیا ہے بشرطیکہ آپ اس سے ملیں اور آئندہ کے لئے کوئی باعزت سمجھوتہ کرلیں۔ خلیفہ علقمی کے کہنے میں آگیا اور علقمی کے ساتھ اپنے محل سے نکل کر ہلاکو خاں کے یہاں پہنچا۔ وہاں پہنچتے ہی ہلاکو خاں نے اس کو گرفتار کرکے بند کردیا اور بغداد کے قتل عام کا حکم دے دیا۔ بغداد کی مکمل تباہی کے بعد ۹ صفر ۶۵۶ھ کو ہلاکو خاں خلیفہ معتصم کو لے کر بغداد میں داخل ہوا۔ خلیفہ سے پوچھ پوچھ کر محل کے تمام خفیہ خزانے نکلوائے۔ اس کے بعد حکم دیا کہ خلیفہ کو قتل کردیا جائے۔ علقمی نے ہلاکو خاں سے کہا مسلمانوں کے خلیفہ کے خون سے اپنی تلوار کو آلودہ نہ کرو۔ بلکہ اس کو کچلوا کر مارو۔ چنانچہ طوسی اور علقمی نے خلیفہ کو نمدے میں لپیٹ کر اس کو ایک ستون میں باندھ دیا۔ اس کے بعد اس پر اتنی لاتیں لگوائیں کہ خلیفہ کا دم نکل گیا۔

عباسی خلیفہ کو ختم کرنے کے بعد علقمی نے حسب قرارداد ہلاکو سے کہا کہ بغداد میں کسی علوی کو حاکم مقرر کردے اور اس کو خلیفہ کا خطاب دے دے۔ ہلاکو خاں نے ابتداءً اس قسم کے مبہم وعدے کرلئے تھے جس کی وجہ سے علقمی کو یقین تھا کہ ہلاکو خاں کسی علوی کو خلیفہ بنا کر مجھ کو اس کا نائب سلطنت بنا دے گا۔ مگر ہلاکو خاں نے علقمی کو ڈانٹ دیا۔ اور بغداد پر اپنی قوم کا ایک حاکم مقرر کیا۔ علقمی اس ذلت اور ناکامی کو برداشت نہ کرسکا اور اس کے بہت جلد بعد گھٹ گھٹ کر مر گیا۔

یہ وہی سیاست ہے جس کا خوبصورت نام موجودہ زمانہ میں متحدہ محاذ رکھا گیا ہے۔ اس قسم کی تخریبی سیاست ہر زمانہ میں رائج رہی ہے ——— کچھ سیاسی حوصلہ مندوں نے بنو امیہ کے ساتھ مل کر ہاشمی خلافت کو ختم کیا۔ اس کے بعد کچھ دوسرے سیاست داں اٹھے اور انھوں نے بنو عباس کے محاذ میں شامل ہوکر بنو امیہ کو ختم کیا۔ پھر ایک اور سیاسی گروہ اٹھا اور اس نے تاتاریوں کا ساتھ دے کر بنو عباس کا خاتمہ کیا۔ ان میں سے ہر ایک کا مقصد یہ تھا کہ وہ اپنے مفروضہ سیاسی حریف کو مشترکہ قوت سے ہٹا دے اور اس کے بعد اپنے آپ کو اوپر لائے۔ مگر ہر ایک کا ایک ہی انجام ہوا۔ وہ وقت کے قابض گروہ کو ہٹانے میں تو ضرور کامیاب ہوگیا مگر اپنے آپ کو اوپر لانے میں مکمل طور پر ناکام رہا۔

تاریخ کا یہ تجربہ کافی تھا کہ موجودہ زمانہ میں اس کو نہ دہرایا جائے۔ مگر عجیب بات ہے کہ ہمارے موجودہ زمانہ کے قائدین آج بھی مسلسل اس کو دہرا رہے ہیں۔ نہ تاریخ کی مثالیں ان کو سبق دینے کے لئے کافی ثابت ہوئیں اور نہ خود اپنا ناکام تجربہ۔ سیاسی تقلید کی یہ انوکھی مثال اس امت کے رہنما دہرا رہے ہیں جس کے رسولؐ نے فرمایا تھا کہ اللہ پر ایمان لانے والا آدمی کبھی ایک بل سے دو بار نہیں ڈسا جاتا (المومن لایلدغ من جحر مرتین)

معبود کی طلب

روس کے خلائی مسافر اندرن نکولائیف اگست ۱۹۶۲ میں جب ایک خلائی پرواز سے واپس ہوئے تو ۲۱ اگست کو ماسکو کی ایک پریس کانفرنس میں انھوں نے کہا :

جب میں زمین پر اترا تو میرا جی چاہتا تھا کہ میں زمین کو چوم لوں

انسان جیسی ایک مخلوق کے لئے زمین پر جو بے حساب موافق سامان جمع ہیں وہ معلوم کائنات میں کہیں بھی نہیں۔ روسی خلاباز جب زمین سے دور خلا میں گیا تو اس نے پایا کہ وسیع خلا میں انسان کے لئے صرف حیرانی اور سرگشتگی ہے۔ وہاں انسان کے سکون اور حاجت برآری کا کوئی سامان نہیں۔ اس تجربہ کے بعد جب وہ زمین پر اترا تو اس کو زمین کی قیمت کا احساس ہوا، ٹھیک ویسے ہی جیسے شدید پیاس کے بعد آدمی کو پانی کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ زمین اپنے تمام موافق امکانات کے ساتھ اس کو اتنی محبوب معلوم ہوئی کہ اس کا جی چاہا کہ اس سے لپٹ جائے اور اپنے جذبات محبت کو اس کے لئے نثار کر دے۔

یہی وہ چیز ہے جس کو شریعت میں الٰہ بنانا کہا گیا ہے۔ آدمی خالق کو نہیں دیکھتا، اس لئے وہ مخلوق کو اپنا الٰہ بنا لیتا ہے۔ مومن وہ ہے جو ظاہر سے گزر کر باطن تک پہنچ جائے، جو اس حقیقت کو جان لے کہ یہ جو کچھ نظر آ رہا ہے یہ کسی کا دیا ہوا ہے۔ زمین میں جو کچھ ہے وہ سب کسی برتر ہستی کا پیدا کیا ہوا ہے۔ وہ مخلوق کو دیکھ کر اس کے خالق کو پالے اور خالق کو اپنا سب کچھ بنالے۔ وہ اپنے تمام بہترین جذبات کو خدا کے لئے نثار کر دے۔

روسی خلاباز پر جو کیفیت زمین کو پاکر گزری وہی کیفیت مزید اضافہ کے ساتھ آدمی پر خدا کو پاکر گزرنا چاہئے۔ مومن وہ ہے جو سورج کو دیکھے تو اس کی روشنی میں خدا کے نور کو پالے۔ وہ آسمان کی وسعتوں میں خدا کی لامحدودیت کا مشاہدہ کرنے لگے۔ وہ پھول کی خوشبو میں خدا کی مہک کو پائے اور پانی کی روانی میں خدا کی بخشش کو دیکھے۔ مومن اور غیر مومن کا فرق یہ ہے کہ غیر مومن کی نگاہ مخلوقات میں اٹک کر رہ جاتی ہے اور مومن مخلوقات سے گزر کر خالق تک پہنچ جاتا ہے۔ غیر مومن مخلوقات کے حسن کو خود مخلوقات کا حسن سمجھ کر انھیں میں محو ہو جاتا ہے۔ مومن مخلوقات کے حسن میں خالق کا حسن دیکھتا ہے اور اپنے آپ کو خالق کے آگے ڈال دیتا ہے۔ غیر مومن کا سجدہ چیزوں کے لئے ہوتا ہے اور مومن کا سجدہ چیزوں کے خالق کے لئے۔

جنت صبر کے اُس پار ہے

صالح سماج بنانے کا سارا دارو مدار اس چھوٹی سی بات پر ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ ہے کہ دونوں اپنے آپ کو قابو میں رکھے ہوئے ہوں۔

جس چیز کو اسلامی نظام کہا جاتا ہے وہ کسی قسم کے سیاسی اکھیڑ پچھاڑ سے وجود میں نہیں آتا۔ اور نہ پھانسی کی منطق سے اس کو برپا کیا جا سکتا ہے۔ جو لوگ اس قسم کی کارروائیوں سے اسلامی نظام قائم ا اعلان کرتے ہیں وہ یقینی طور پر یا تو غیر سنجیدہ ہیں یا مجنون ہیں۔

اسلامی نظام یا اسلامی سماج اس وقت وجود میں آتا ہے جب کسی انسانی مجموعہ کی قابل لحاظ تعداد ج پیدا ہو جائے کہ وہ اپنے آپ کو قابو میں رکھ کر زندگی گزارنے لگے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو شکایتوں اور سے اوپر اٹھ کر جینا جانتے ہوں۔ جو اپنے خلاف مزاج باتوں کو نظر انداز کر دینے کی طاقت رکھتے ہوں۔ ں کو فوراً محسوس کر لیں اور اس کا اعتراف کرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ جو دوسروں کو الزام دینے ، خود ذمہ داری قبول کر لیں۔ جو غلط فہمی کے مواقع پر خوش فہمی سے کام لینے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ جو کسی ،اس کے "آج" کے بجائے اس کے "کل" کے لحاظ سے دیکھ سکیں۔

یہ سب کچھ ٹھنڈے طریقہ سے نہیں ہوتا۔ اس کے لئے آدمی کو برداشت کی تلخیاں جھیلنی پڑتی ہیں۔ اس ضرورت ہوتی ہے کہ الفاظ رکھتے ہوئے آدمی نہ بولے۔ وہ ہر وار کو اپنے اوپر سہے۔ وہ اپنے سینہ کو ے جذبات کا قبرستان بنا دے۔ مختصر یہ کہ اپنے تمام حقوق کو وہ آخرت کے خانہ میں ڈال دے اور ذمہ داریوں کو دنیا کے خانہ میں۔

حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ جہنم کو لذتوں سے ڈھانک دیا گیا ہے اور جنت کو ناخوش گواریوں سے دیا گیا ہے (حجبت النار بالشہوات وحجبت الجنۃ بالمکارہ) جو آدمی اپنے جی کی راہ پر ٹوک چلے وہ سیدھا جہنم میں پہنچ جاتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص جنت میں اپنی جگہ لینا چاہے ، خواہشات پر روک لگانا ہوگا۔ اپنے جی میں اٹھنے والے محرکات کو دبانا ہوگا۔ ناپسندیدہ باتوں کو ۔ کرنا ہوگا۔ اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنا ہوگا، خواہ ان کا پورا کرنا اس کے لئے کتنا ہی تلخ ہو۔ یہ ہے کہ جنت صبر کے اُس پار ہے، اگرچہ لوگ اپنی نادانی سے اس کو بے صبری کے اُس پار سمجھ

ایجنسی : ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دل چسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ بیک وقت سال بھر کا زرتعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور منفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے۔ یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت —— الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کرکے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا۔ بشرطیکہ پرچے خراب نہ ہوئے ہوں۔

دوسری صورت —— **الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے** ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ **اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول** فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں **پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ ۱۳۵ روپے یا ماہانہ ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔**

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ سے شائع کیا

آیئے ایک منصفانہ معاشرتی نظام کے لئے
مل جل کر کام کریں۔ یہ صرف مشترکہ نصب العین،
باہمی تعاون اور سخت محنت سے ہی
حاصل ہو سکتا ہے۔
ایک
ملک
ایک قوم
davp 81/278

REGD. R. N. NO. 28822/76
REGD. NO. D. (DN) 532

ISSUE NO. 63
FEBRUARY 1982

AL-RISALA MONTHLY
JAMIAT BUILDING QASIMJAN STREET DELHI-110006 (INDIA) PHONE 232231

الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خان

آدمی کے بے عیب ہونے کی سب سے بڑی
پہچان یہ ہے کہ ——————
وہ دوسروں کے اندر عیب نہ تلاش کرتا ہو

قیمت فی پرچہ —— تین ۳ روپے

2-3-82

الرسالہ

مارچ ۱۹۸۲
شمارہ ۶۴

جمعیۃ بلڈنگ ، قاسم جان اسٹریٹ ، دہلی ۶ (انڈیا)

اجتماع

سابقہ اعلان کے مطابق الرسالہ کے مشن سے اتفاق رکھنے والوں کا دو روزہ اجتماع انشاء اللہ بھوپال میں ۱۷ ـ ۱۸ اپریل ۱۹۸۲ کو ہوگا۔ کارروائی سنیچر کی صبح کو شروع ہوکر اتوار کی شام کو ختم ہوگی۔ اجتماع سے متعلق مزید تفصیلات الرسالہ کے اگلے شمارہ میں ملاحظہ فرمائیں۔ شریک ہونے والوں کی طرف سے پیشگی اطلاع آنا ضروری ہے۔ اطلاع کے بغیر آنے والوں کے قیام وطعام کی ذمہ داری منتظمین اجتماع پر نہ ہوگی۔ اجتماع میں شریک ہونے والے حضرات میں جو لوگ واپسی کے لئے ٹرین کا رزرویشن چاہتے ہوں وہ فوراً کرایہ کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ فرمائیں۔ اجتماع سے متعلق جملہ خط وکتابت کا پتہ یہ ہے

بنارسی کلاتھ اسٹور ـ ابراہیم پورہ ـ بھوپال

Banarsi Cloth Store - Ibrahimpura - Bhopal 462001

Telephone 75894

زرتعاون سالانہ ۳۶ روپیہ • خصوصی تعاون سالانہ دوسو روپے • بیرونی ممالک سے ۲۰ ڈالر امریکی

آہ یہ انسان

ہر آدمی کے خاندانی حالات اور اس کے تعلقات کے اعتبار سے اس کا ایک حلقہ بن جاتا ہے۔ یہ حلقہ دنیا میں زندہ رہنے کے لئے انتہائی ضروری ہے۔ ہر آدمی اپنے بنائے ہوئے حلقہ کے سہارے جیتا ہے۔ پیدائش سے لے کر موت تک یہ حلقہ آدمی کا ساتھ دیتا ہے، وہ ہر موڑ پر اس کا مددگار بنتا ہے۔ وہ ہر موقع پر اس کی طرف سے کھڑا ہو جاتا ہے۔

یہ حلقہ یا ڈھانچہ ہر دور میں انسان کے لئے حق کی طرف بڑھنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوا ہے۔ جب بھی کوئی حق آدمی کے سامنے آتا ہے تو شعوری یا غیر شعوری طور پر آدمی کے سامنے یہ سوال اٹھ کھڑا ہوتا ہے کہ اگر میں نے اس کا ساتھ دیا تو میرا بنا بنایا ڈھانچہ ٹوٹ جائے گا۔ میرے ساتھی مجھ سے بچھڑ جائیں گے۔ میرے مفادات کا تانا بانا بالکل منتشر ہو جائے گا۔ میں لوگوں کے درمیان اکیلا بن کر رہ جاؤں گا۔ یہ اندیشہ آدمی کے ذہن پر اتنا غالب آتا ہے کہ وہ جانتے بوجھتے حق کا انکار کر دیتا ہے۔ وہ اپنے لئے اس دو عملی کو پسند کر لیتا ہے کہ اس کا ذہن ایک راستہ کے برحق ہونے کی گواہی دے مگر عملاً وہ اس کے سوا دوسرے راستہ پر چلتا رہے۔

مگر یہ سب سے بڑی بھول ہے۔ حق کا ظہور بربادی کے لئے نہیں ہوتا بلکہ آبادی کے لئے ہوتا ہے۔ حق اس لئے آتا ہے کہ جو آدمی انسانوں کے سہارے کھڑا ہوا تھا اس کو وہ خدا کے سہارے کھڑا کر دے۔ جو شخص بے اصولی کے اندھیروں میں بھٹک رہا تھا اس کو اصولی زندگی کی روشنی میں لے آئے۔ جو آدمی عارضی فائدوں میں کھویا ہوا تھا اس کو ابدی اور حقیقی فائدوں کی دنیا میں داخل کرے۔ مگر انسان اتنا غافل ہے کہ وہ کسی چیز سے نصیحت نہیں پکڑتا۔ اس کے سامنے جنت کے دروازے کھولے جاتے ہیں مگر وہ ان سے منھ پھیر کر جہنم کے شعلوں میں کود پڑتا ہے۔ خدا اس کے لئے اپنا آغوش پھیلاتا ہے مگر وہ خدا کو چھوڑ کر انسانوں کے آغوش میں رہنے پر راضی ہو جاتا ہے۔

آدمی اپنے جس دنیوی ڈھانچہ کی حفاظت کر رہا ہے اسی ڈھانچہ کے کھنڈر پر اس کے لئے آخرت کا محل تعمیر ہونے والا ہے۔ مگر کیسی عجیب بات ہے کہ آدمی اپنے کھنڈر پر مطمئن ہو جاتا ہے۔ وہ اس کو ٹوٹنے نہیں دیتا تاکہ خدا کے فرشتے آئیں اور اس کی خالی زمین پر اس کے لئے ایک نیا محل اٹھا کر کھڑا کر دیں جس میں وہ ابدی طور پر عیش کرتا رہے۔

جو آدمی اپنی غلطی کو جان لے اس نے سچائی کا آدھا راستہ طے کر لیا

انصاف والا حقیقت میں وہ ہے جو شکایت کے وقت بھی انصاف پر قائم رہے

ہر آدمی اصول کی زبان میں بات کرتا ہے حالانکہ بے اصولی کے سوا کسی کا کوئی مذہب نہیں

گولی کی چوٹ سہنے والے بہادر بہت ہیں مگر لفظ کی چوٹ سہنے والا بہادر کوئی نہیں

آدمی ایک ایسی مخلوق ہے جو قول کے معاملہ میں سب سے زیادہ فیاض ہے اور عمل کے معاملہ میں سب سے زیادہ بخیل

اپنے حقوق کو جاننے کا ماہر ہر شخص ہے مگر دوسروں کے حقوق کو کوئی نہیں جانتا

اخلاق کا آخری درجہ یہ ہے کہ آدمی دوسرے کو تکلیف نہ دے مگر بہت کم اخلاق والے ہیں جو اس معیار پر پورے اتریں

آدمی کیا ہے، اس کا اندازہ غیر معمولی حالات میں ہوتا ہے نہ کہ معمول کے حالات میں

بہت سے جواب صرف اس بات کا ثبوت ہوتے ہیں کہ آدمی کے پاس کوئی جواب ہی نہیں

آدمی دوسرے کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے حالانکہ اکثر حالات میں وہ خود غلطی پر ہوتا ہے

لوگوں کی اغراض ایک دوسرے سے وابستہ نہ ہوں تو دنیا میں کوئی کسی کا دوست نظر نہ آئے

آدمی بظاہر ایک دلیل دیتا ہے حالانکہ وہ بے معنی الفاظ کے مجموعہ کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا

میرا دشمن مجھ کو سیدھی چھری سے ذبح کر رہا تھا، میرے دوست نے مجھ کو الٹی چھری سے ذبح کر دیا

آپ کا عمل آپ کی قسمت ہے

ایک ڈینش کہاوت ہے "خوش قسمتی دروازہ کھٹکھٹاتی ہے اور پوچھتی ہے کہ کیا سمجھ داری گھر کے اندر موجود ہے" اس کا مطلب یہ ہے کہ خوش قسمتی سمجھ دار آدمی کے حصہ میں آتی ہے نہ کہ بے سمجھ آدمی کے حصہ میں۔ خوش قسمتی دراصل اس نتیجہ کا نام ہے جو سمجھ داری کے ساتھ عمل کرنے کے بعد پیدا ہوتا ہے۔

ہر شخص کی زندگی میں وہ مواقع ضرور آتے ہیں جب کہ وہ بر وقت صحیح عمل کرکے اپنے مقدر کو اچھا بنا سکے۔ ہر شخص پر وہ لمحات گزرتے ہیں جو اس کی دانش مندی اور اس کی قوت عمل کا امتحان ہوتے ہیں۔ مگر یہ مواقع ہمیشہ اچانک آتے ہیں۔ آدمی کو بس چند لمحات کے اندر انھیں پہچاننا پڑتا ہے۔ جو شخص ایسے مواقع پر سمجھ داری اور قوت فیصلہ کا ثبوت دے وہ کامیاب رہتا ہے اور جو شخص سمجھ داری اور قوت فیصلہ کا ثبوت نہ دے سکے وہ ناکام رہتا ہے۔

نقصان یا ناکامی کسی کا مقدر نہیں، وہ اپنی کوتاہی کی قیمت ہے۔ اگر آپ نے موقع کو پہچاننے میں غفلت کی ہے تو آپ کو ضرور اس کی قیمت چکانی پڑے گی۔ اپنی غفلت کے لئے کسی دوسرے کو ذمہ دار ٹھہرا کر آپ اپنی غفلت کی قیمت ادا کرنے سے بچ نہیں سکتے۔ بھرتری ہری نے سچ کہا ہے "نقصان کیا ہے وقت پر چوک جانا" اگر آپ وقت پر چوک گئے تو دوسرے کسی کو اس کا ذمہ دار ٹھہرا کر اس کی تلافی کرنا ممکن نہیں۔

آپ بہت سے لوگوں کو زمانہ کی شکایت کرتے ہوئے پائیں گے۔ وہ کہیں گے "کیا کریں ہماری قسمت ہی بری ہے" یا یہ کہ "مقدر نے میرا ساتھ نہ دیا ورنہ میری کامیابی یقینی تھی" اس قسم کے جملے اگرچہ قواعد زبان کے اعتبار سے درست ہیں مگر وہ حقیقت کے اعتبار سے بالکل بے معنی ہیں۔ کیونکہ زمانہ کسی کا دوست یا کسی کا دشمن نہیں ہوتا۔ وہ ایک کے لئے بھی ویسا ہی ہے جیسا کہ دوسرے کے لئے۔

پال شرر نے کتنی عمدہ بات کہی کہ "آج کی محنت ہی کل کی قسمت ہے" آدمی جس چیز کو قسمت کا فیصلہ کہتا ہے وہ دراصل اس کی اپنی محنت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ قسمت کے ترازو پر ہر آدمی کا انجام تل رہا ہے۔ مگر انجام کے پلہ میں کسی آدمی کو اتنا ہی حصہ ملتا ہے جتنا عمل کے پلہ میں اس نے رکھا ہے۔ دنیا کے بازار میں عمل ہی ہر سودے کی قیمت ہے۔ یہاں جو شخص جتنا عمل کرے گا اتنا ہی سودا اس کے حصہ میں آئے گا۔

ایک پرانی کہاوت ہے کہ "کوئی موقع تمہارا دروازہ صرف ایک بار کھٹکھٹاتا ہے" اگر آپ کسی موقع کو استعمال کرنے میں ناکام رہیں تو اس کے بعد مزید یہ غلطی نہ کیجئے کہ کسی دوسرے کو اس کا ذمہ دار ٹھہرا کر اس کے خلاف شکایت کرنے بیٹھ جائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دوسری بار جب کوئی موقع آپ کا دروازہ کھٹکھٹائے گا تو آپ اس کی آواز

نہیں سن سکیں گے اور دوبارہ ناکام رہیں گے۔ جو آدمی فریاد و ماتم میں مشغول ہو اس کے کان اپنی ہی آوازوں سے بھرے ہوتے ہیں، پھر اس کو باہر کی آواز کس طرح سنائی دے گی۔

اتھروید میں کہا گیا ہے "میرے داہنے ہاتھ میں عمل ہے اور میرے بائیں ہاتھ میں فتح"۔ حقیقت یہ ہے کہ عمل اور کامیابی دونوں باہم اس طرح جڑے ہوئے ہیں کہ ان کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ دونوں میں وہی رشتہ ہے جو بیج اور درخت میں ہوتا ہے، درخت اسی کے حصہ میں آتا ہے جس نے درخت کے لئے بیج ڈالا ہو۔ اسی طرح کامیابی کا مالک صرف وہ شخص بنتا ہے جس نے اس کے لئے ضروری عمل کیا ہو۔ بیج کو صحیح حالات ملنا اس بات کی ضمانت ہے کہ وہ ضرور درخت بنے۔ اسی طرح درست عمل اس بات کی ضمانت ہے کہ وہ مطلوبہ نتیجہ تک پہنچ کر رہے۔

یاد رکھئے، امیدوں کا محل اپنی کسی کمزوری کی وجہ سے ٹوٹتا ہے۔ اگر آپ خود چوکس ہوں تو کوئی آپ کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ کتنی بامعنی ہے یہ چینی کہاوت ——— "بدبختی ہمیشہ اس دروازہ سے داخل ہوتی ہے جو ہم خود اس کے لئے کھلا چھوڑ دیتے ہیں۔"

غصہ سے بچئے

ارسطو کا قول ہے "غصہ ہمیشہ حماقت سے شروع ہوتا ہے اور شرمندگی پر ختم ہوتا ہے" اس کی وجہ یہ ہے کہ غصہ ایک نفسیاتی ہیجان کی حالت ہے اور ہیجان کی حالت میں جو کارروائی کی جائے اس میں کبھی اعتدال نہیں ہو سکتا۔ غیر معتدل حالت میں آدمی جب کوئی کارروائی کرتا ہے تو اعتدال پر آنے کے بعد اکثر اسے اس احساس سے دوچار ہونا پڑتا ہے کہ کاش میں نے ایسا نہ کیا ہوتا۔

امریکہ میں پولس قانون کے نفاذ میں بہت مستعد رہتی ہے۔ مثلاً کوئی شخص ٹرافک اصول کی خلاف ورزی کرے یا سڑک پر گندگی ڈالے تو فوراً اس پر جرمانہ کیا جاتا ہے۔ ایک لطیفہ ہے کہ ایک بار کسی سڑک پر ایک کار تیزی سے گزری۔ ڈرائیور مقررہ رفتار (۵۵ میل فی گھنٹہ) سے زیادہ تیز اپنی گاڑی چلا رہا تھا۔ امریکی پولس نے اس کا پیچھا کیا۔ کافی دور جا کر اس نے اس کو پکڑا۔ پولس نے بتایا کہ وہ اتنے فاصلہ سے اس کا پیچھا کرتی آرہی ہے۔ چونکہ وہ مقررہ رفتار سے زیادہ تیز گاڑی چلا رہا تھا اس لئے اس کو چاہئے کہ وہ قانون کے مطابق تیس ڈالر جرمانہ ادا کرے۔

یہ سن کر موٹر سوار پر جھنجھلاہٹ طاری ہوگئی۔ اس وقت اس کے ہاتھ میں جلتا ہوا سگرٹ تھا۔ اس نے اظہار بیزاری میں سگرٹ سڑک پر پھینک دیا۔ پولس کے آدمی نے فوراً کہا: جناب عالی، اب آپ مزید پچاس ڈالر اس کوڑا ڈالنے (Littering) کے بھی ادا کیجئے ——— آدمی نے فوراً جرمانہ ادا کیا ہوتا تو وہ ۳۰ ڈالر میں چھوٹ جاتا۔ مگر اس کے غصہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ جرمانہ کی رقم بڑھ کر ۸۰ ڈالر ہوگئی۔

"غلطی کے بعد بہترین صحیح بات یہ ہے کہ آدمی اپنی غلطی کا اعتراف کرے" کسی کا یہ قول بہت بامعنی ہے۔ آدمی فوراً اپنی غلطی کو مان لے تو وہ سستا چھوٹ جاتا ہے۔ لیکن اگر اس نے غلطی کو ماننے میں دیر کی یا غصہ میں آ کر اور غلطی کر ڈالی تو یہ صرف اس کے جرم میں اضافہ کے ہم معنی ہوگا اور اس کے اوپر لگنے والی "جرمانہ" کی رقم بڑھتی چلی جائے گی۔

جرم اگر بالکل کھلا ہوا ہو تو اس کا اعتراف نہ کرنا ڈھٹائی بن جاتا ہے، اور ڈھٹائی تمام جرموں میں سب سے بڑا جرم ہے۔ اور اگر آدمی ایسا کرے کہ جرم کی نشان دہی کرنے والے سے لڑنے لگے تو وہ اپنے بچاؤ کے آخری موقع کو بھی کھو دے گا۔ اس کی طرف سے قصور کا اعتراف نہ کرنا فریق ثانی کے اندر مزید ردعمل پیدا کرے گا اور وہ قصوروار کو اس سے زیادہ سخت سزا دینے پر اتر آئے گا جو ابتداءً وہ اس کو دینا چاہتا تھا۔ کسی نے سچ کہا ہے "صابن کپڑے کے میل کو صاف کرتا ہے اور اعتراف اخلاق کے میل کو"

اپنی غلطی کا اعتراف مسئلہ کو فوری طور پر ختم کرنے کی سب سے آسان تدبیر ہے۔ ایک فریق جب نرمی سے اپنی غلطی کو مان لے تو دوسرا فریق بھی فوراً نرم پڑ جاتا ہے۔ غلطی کا اعتراف دوسرے شخص کے غصہ پر ٹھنڈا پانی ڈالنے کے ہم معنی بن جاتا ہے۔

ایک دکاندار نے محلہ کے ایک نوجوان شخص پر چوری کا الزام لگایا۔ یہ الزام غلط تھا۔ نوجوان کو سخت غصہ آیا۔ اس نے دکاندار کا گریبان کھینچا اور اس کو پکڑ کر مارنا شروع کیا۔ اس کے بعد بات بڑھی۔ محلہ میں کافی شور و غل ہوا۔ دونوں ایک دوسرے کو دھمکی دیتے اور زور دکھاتے رہے۔ نوجوان کے آدمیوں نے اس سے کہا کہ تم معافی مانگ لو۔ مگر وہ کسی طرح معافی مانگنے پر تیار نہ ہوا۔ اگلے روز دوبارہ لوگ جمع ہوئے اور یہی بات شروع ہوئی۔ نوجوان کسی حال میں معافی مانگنے کے لئے تیار نہ تھا۔ آخر دکاندار اٹھا۔ وہ عمر میں کافی زیادہ تھا۔ اس نے بڑھ کر نوجوان کو اپنے سینہ سے لگالیا۔ اس نے کہا "اگر تم معافی مانگنے کے لئے تیار نہیں ہو تو چلو میں ہی تم سے معافی مانگتا ہوں، اس غصہ کو ختم کرو"

اس کے بعد نوجوان ڈھ پڑا۔ دکاندار نے خود جھک کر نوجوان کو بھی جھکا دیا۔ نوجوان اچانک دکاندار کے قدموں میں گر پڑا۔ اس نے کہا "آپ معافی مانگ کر مجھے شرمندہ نہ کریں۔ آپ میرے لئے باپ کے برابر ہیں۔ اصلی قصور میرا ہے۔ آپ مجھے معاف کر دیجئے"

بہت کم لوگ ہیں جو غصہ آنے کے بعد غصہ کے انجام سے بچتے ہوں۔ حالاں کہ غصہ کے انجام سے اپنے آپ کو بچانا آسان بھی ہے اور ممکن بھی۔ غصہ کوئی مستقل حالت نہیں۔ وہ خارجی اسباب کے تحت وقتی طور پر آدمی کے اوپر طاری ہوتا ہے۔ اور جو چیز وقتی اور خارجی نوعیت کی ہو اس کو دور کرنا اتنا ہی آسان

ہے جتنا کپڑے پر میل لگنے کے بعد کپڑے کو دھو کر پاک کرنا۔

غصہ آنے کے بعد غصہ کے انجام سے بچنے کے لئے صرف ایک چیز درکار ہے۔ اپنے آپ کو تھوڑی دیر کے لئے سنبھالنے کی طاقت۔ غصہ آنے کے بعد اگر ایک لمحہ کے لئے بھی آپ اپنے کو اس کے زیر اثر آنے سے روک لیں تو یقینی طور پر آپ اپنے کو غصہ کے انجام سے بچا سکتے ہیں۔

جیفرسن کا قول ہے "اگر تم غصہ میں ہو تو بولنے سے پہلے ایک سے دس تک گنو۔ اگر بہت زیادہ غصہ میں ہو تو سو تک" یہ غصہ کو ٹھنڈا کرنے کی نہایت آسان تدبیر ہے۔ غصہ کی حالت میں سو تک گنتی گننا دراصل اپنے ذہن کو غصہ سے پھیرنا ہے۔ آدمی اگر تھوڑی دیر کے لئے بھی اپنے ذہن کو کسی دوسری طرف موڑ سکے تو اس کے غصہ کی آگ اپنے آپ ٹھنڈی ہو جائے گی۔

شکایت نہیں

ٹامس کارلائل کا قول ہے "کیا تم نے اس آدمی کے بارے میں نہیں سنا جو سورج کو اس لئے کوستا تھا کہ وہ اس کی سگرٹ نہیں جلاتا" کارلائل نے جو بات تمثیلی انداز میں کہی ہے وہ ہم میں سے اکثر لوگوں پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ آپ کو بے شمار لوگ کسی نہ کسی کی شکایت کرتے ہوئے ملیں گے ـــــ حکومت کی شکایت، پڑوسیوں کی شکایت، رشتہ داروں کی شکایت، دوستوں کی شکایت۔ اور اسی طرح دوسری شکایت۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ اکثر شکایتیں بالکل بے بنیاد ہوتی ہیں۔ وہ اپنی کوتاہی کے لئے دوسرے کو ذمہ دار ٹھہرانے کے ہم معنی ہوتی ہیں۔ وہ ایسی ہی ہیں جیسے کوئی سگرٹ پینے والا اپنا سگرٹ سورج کی طرف کرکے یہ چاہے کہ سورج کی گرمی سے اس کا سگرٹ جل جائے۔ اور سورج جب اس طرح اس کے سگرٹ کو نہ جلائے تو وہ سورج کو کوسنے لگے۔ حالانکہ ایسے آدمی کو اپنی بے عقلی اور اپنی بے ہمتی کا شاکی ہونا چاہئے نہ کہ آسمان کے سورج کا۔

کسی نے بالکل بجا طور پر کہا ہے کہ "جتنی زیادہ امید اتنی ہی زیادہ مایوسی" جب بھی آپ کو کسی شخص سے شکایت پیدا ہو تو سمجھ لیجئے کہ آپ نے اس شخص سے اس سے زیادہ کی امید کر لی تھی جو امید فی الواقع آپ کو اس سے کرنی چاہئے تھی۔ اگر آپ ایک لکڑی سے یہ امید قائم کر لیں کہ وہ آپ کے لئے لوہے کا کام دے گی تو اس کے بعد مایوسی کے سوا اور کیا چیز آپ کے حصہ میں آئے گی۔

ایک شخص، جس کے پاس آپ کے لئے صرف زبانی ہمدردی تھی اس سے آپ نے عملی ہمدردی کی امید قائم کر لی۔ ایک شخص جس کو آپ سے صرف اتنا تعلق تھا کہ وہ ملاقات کے وقت آپ کو چائے پلادے اس سے آپ نے یہ امید کر لی کہ وہ آپ کے لئے پیسہ خرچ کرے گا اور آپ کی خاطر جان لڑائے گا۔ ایک شخص جو آپ کا صرف رسمی دوست تھا اس کے بارے میں آپ نے یقین کر لیا کہ وہ آپ کا جگری دوست ثابت ہوگا۔ ایک شخص جو صرف اچھے حالات میں آپ کا

ساتھ دے سکتا تھا اس کے متعلق آپ نے یہ امید باندھ لی کہ وہ برے حالات میں آپ کا ساتھی بنے گا۔ ایک شخص جو صرف بناؤ کے وقت شریف رہ سکتا تھا اس سے آپ نے یہ توقع کر لی کہ وہ بگاڑ کے وقت بھی شریف بنا رہے گا۔ یہ سب چیزیں حقیقت واقعہ کے خلاف ہیں اور موجودہ دنیا میں حقیقت واقعہ کے خلاف چیزوں کا کوئی وجود نہیں۔

اس قسم کی امیدیں کبھی پوری نہیں ہو سکتیں۔ اس لئے وہ آپ کے حق میں بھی پوری نہیں ہوئیں۔ زندگی کا راز یہ ہے کہ کسی دوسرے شخص سے بس اس کی طاقت کے بقدر چاہا جائے، اس سے زیادہ نہیں۔ اگر آپ ایسا کریں کہ دوسروں سے اتنی ہی امید کریں جتنی امید ان سے کرنی چاہئے تو آپ کو کبھی کسی سے شکایت نہ ہوگی۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ "مطمئن زندگی کا سب سے بڑا راز حقیقت پسندی ہے۔"

آپ صرف ایک سادہ سی بات کو پکڑ لیجئے اور اس کے بعد آپ کو کبھی کسی سے شکایت نہ ہوگی۔ "اپنے آپ کو بھی اسی پیمانہ سے ناپئے جس پیمانہ سے آپ دوسروں کو ناپنا چاہتے ہیں"۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کسی معاملہ میں ایک شخص سے بگڑ جاتا ہے کہ اس نے ایسا کیا اور ایسا کیا۔ حالاں کہ اگر وہ اس طرح سوچے کہ میں اس شخص کی جگہ ہوتا تو ایسے حالات میں کیا کرتا تو یقیناً وہ اس رائے پر پہنچے گا کہ ایسے حالات میں خود وہ بھی دوسروں کے ساتھ وہی کچھ کرتا جو دوسروں نے اس کے ساتھ کیا ہے۔ آپ دوسرے کو کبھی وہ نہیں دے پاتے جس کی امید وہ آپ سے قائم کئے ہوئے ہے۔ پھر دوسرے سے اگر آپ کو یہی تجربہ ہو تو آپ کو دوسرے سے شکایت کرنے کا کیا حق۔

جو آدمی شکایتی مزاج کا ہو اس کے حصہ میں مزید یہ نقصان آتا ہے کہ وہ ہر ایک سے بیزار ہو جاتا ہے۔ وہ کسی کے اوپر اعتماد نہیں کر پاتا۔ اگر آپ سورج سے یہ چاہیں کہ وہ آپ کے راستہ کو روشن کر دے تو سورج آپ کو بہت بڑی نعمت نظر آئے گا۔ اس کے برعکس اگر آپ یہ چاہنے لگیں کہ آپ اپنا سگرٹ سورج کی طرف کریں اور وہ آپ کی سگرٹ سلگا دے تو سورج آپ کو بے کار سی چیز معلوم ہونے لگے گا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر آدمی آپ کو کچھ نہ کچھ دے سکتا ہے۔ مگر آدمی آپ کو وہی چیز دیتا ہے جو وہ خود آپ کو دینا چاہتا ہے نہ کہ وہ چیز جو آپ اس سے اپنے لئے لینا چاہتے ہیں۔

جو آدمی دوسروں کے بارے میں ضرورت سے زیادہ امید باندھ لے اس کو ہر آدمی ناقص معلوم ہوگا، وہ کسی کو اپنا نہیں سمجھے گا۔ وہ بھرے ہوئے ماحول میں اجنبی بن کر رہ جائے گا۔ یہی بات ایک ترکی کہاوت میں اس طرح کہی گئی ہے "جس کو ایسے دوست کی تلاش ہے جس میں کوئی کمی نہ ہو اس کو کبھی کوئی دوست نہیں ملے گا۔"

نوٹ: یہ تقریر ۱۵ - ۱۷ دسمبر ۱۹۸۱ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئی

امتحان کی قیمت

تین عورتیں انسانی تاریخ کی معیاری عورتیں ہیں ——— آسیہ، مریم اور خدیجہ۔ یہ وہ نیک بندیاں ہیں جنھوں نے کبھی کوئی برائی نہیں کی۔ ان کی ذات سے کبھی کسی کو تکلیف نہیں پہنچی۔ مگر عجیب بات ہے کہ تینوں کو دنیا میں بے پناہ دکھ جھیلنا پڑا۔ حضرت آسیہ کا یہ انجام ہوا کہ مصر کے فرعون نے مخالف سمتوں سے ان کا ایک ہاتھ اور ایک پاؤں کٹوایا اور اس کے بعد انھیں سولی پر چڑھا دیا۔ حضرت مریم کو فلسطین کے یہودیوں نے ذلیل کیا اور ان پر زنا کا الزام لگایا۔ حضرت خدیجہ کو مجبور کیا گیا کہ وہ تین سال تک عرب کے گرم پتھروں کے درمیان اس طرح رہیں کہ ان کا رنگ کالا پڑ جائے۔ درخت کی جڑیں اور پتیاں کھانے کی وجہ سے جانوروں کی طرح مینگنیاں کریں اور آخر کار شدید تکلیف میں اس دنیا سے چلی جائیں۔

یقیناً خدا کے علم میں تھا کہ یہ تینوں خواتین جنتی ہیں۔ وہ ان کو اچھے حالات میں رکھ سکتا تھا جس طرح وہ انھیں آخرت میں اچھے حالات میں رکھے گا۔ اس کے باوجود خدا نے گوارا کیا کہ یہ پاکیزہ ترین نسوانی روحیں انسانی بھیڑیوں کے قبضہ میں آئیں اور وہ ان کے ساتھ وہ وحشیانہ سلوک کریں جو انھوں نے کیا۔ اس کی واحد وجہ خدا کی سنتِ امتحان ہے۔ خدا کو یہ مطلوب ہے کہ وہ ظالموں کا ظالم ہونا ثابت کرے اور ان کے معاشرہ کو اس بات کا مجرم ٹھہرائے کہ انھوں نے کھلے ہوئے فساد کو دیکھا پھر بھی فسادیوں کو روکنے کے لئے نہیں اٹھے۔ انھوں نے بے گناہ زندگیوں پر گنہ گاروں کو شیطانی قہقہے لگاتے ہوئے پایا مگر وہ خاموش رہے۔

ایسا واقعہ کسی بے داغ انسان ہی کے ذریعہ ظہور میں آسکتا ہے۔ جس طرح چیزوں کو ہمیشہ صحیح ترین باٹ سے تولا جاتا ہے، اسی طرح لوگوں کے ظلم و فساد کو ایسے انسانوں ہی کے ذریعہ ثابت کیا جاسکتا ہے جو خود بے داغ ہوں۔ جو انتہائی بے ضرر ہوں اس کے باوجود لوگ ان کے ساتھ شیطانی حرکتیں کریں جن کی ذات سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے پھر بھی لوگ ان کو اپنی بد باطنی کا نشانہ بنائیں۔

زیادہ تر لوگوں کا حال یہ ہے کہ ان کا معاملہ ملا جلا ہوتا ہے۔ وہ مظلوم ہوتے ہیں تو اسی کے ساتھ وہ ظالم بھی ہوتے ہیں۔ انھیں کسی سے برائی پہنچی ہے تو انھوں نے خود بھی اس کو برائی پہنچائی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے لوگ خدا کی ترازو نہیں بنائے جاسکتے۔ اگر آپ دوسرے کے ساتھ اشتعال انگیز کارروائی کریں اور اس کے نتیجہ میں دوسرا شخص آپ کے خلاف فساد کرنے لگے تو آپ کا واقعہ دوسرے شخص کے ظلم کو ناپنے کا پیمانہ نہیں بنایا جاسکتا۔ اگر آپ کسی سے چھین جھپٹ کریں اور اس کے بعد وہ آپ سے مار پیٹ کرنے پر اتر آئے تو آپ کبھی وہ آدمی نہیں بن سکتے جس کے ذریعہ خدا دوسرے شخص کے ظلم کو ناپے اور اس کو اس کی بدکرداری کی سزا دے۔

ترازو یک طرفہ طور پر اپنے آپ کو درست بناتا ہے۔اس کے بعد ہی وہ اس قابل ٹھہرتا ہے کہ وہ نادرست چیزوں کو ناپے اور تولے۔ اگر ترازو میں بھی کچھ فرق ہو جیسے دوسری چیزوں میں فرق ہوتا ہے تو ایسا ترازو ترازو بننے کے لائق نہیں۔ یہی معاملہ انسان کی اخلاقی پیمائش کا بھی ہے۔ انسانوں کی اخلاقی حالت کو ناپنے کے لئے ایسے انسان درکار ہیں جو یک طرفہ طور پر اپنے کو دوسروں کے لئے بے ضرر بنالیں۔ جو اپنے صابرانہ انداز کی وجہ سے اس بات کو ناممکن بنا دیں کہ کوئی شخص ردعمل کی بنیاد پر ان کے خلاف کوئی کارروائی کرے۔ ان کی زندگی اتنی بے داغ ہو کہ ان کے خلاف کیا ہوا ہر ظلم سراسر یک طرفہ ہو، ان کے خلاف برپا ہوا ہر فساد محض ایک فریق کی شرارت کا نتیجہ ہو۔

فرعون کے ظلم اور گھمنڈ کو ثابت شدہ بنانے کے لئے ضرورت تھی کہ حضرت آسیہ جیسی معصوم خاتون اس کے عقد نکاح میں دی جائیں۔ وہ ان کی معصومیت کو پوری طرح دیکھے، اس کے باوجود بالکل بے بنیاد طور پر وہ ان کو اپنے ظلم کا نشانہ بنائے۔ یہودیوں کی شیطنت کو ثابت کرنے کے لئے حضرت مریم جیسی پاکیزہ روح درکار تھی جس کا معاملہ یہودیوں کے حوالے کیا جائے اور وہ اس کو ناحق ذلیل کریں اور اس پر زنا کا الزام لگائیں۔ ابوجہل اور اس کے ساتھیوں کی سرکشی کو درجۂ ثبوت تک پہنچانے کے لئے ضرورت تھی کہ حضرت خدیجہ جیسی بے داغ سیرت کی خاتون ان کے قبضہ میں دی جائیں اور وہ ان پر بلا سبب وحشیانہ سلوک کر کے انھیں موت کے کنارے پہنچادیں۔

یہ مصیبت جو خدا کے کچھ بندوں کو جھیلنی پڑتی ہے یہ اس عمل کی تکمیل کے لئے ضروری ہے۔ ترازو اسی وقت ترازو بنتا ہے جب کہ وہ تول کا بوجھ اٹھائے۔ یہی معاملہ انسانوں کے درمیان اخلاقی ترازو بننے کا بھی ہے۔ یہاں بھی آدمی کو "بوجھ" اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان خدا کی ترازو بن سکے۔ ظالم کے ظلم کو تولنے کے لئے ایک آدمی کو مظلومیت کا دا رسہنا پڑتا ہے۔ مفسد کا مفسد ہونا اس وقت معلوم ہوتا ہے جب کہ کوئی شخص اس کے فساد کا شکار ہو۔ دھوکا دینے والے کے لئے کوئی آدمی درکار ہوتا ہے جو دھوکا کھا کر اس کی دھوکہ بازی کو ثابت شدہ بنائے۔ مزید یہ کہ ایسے ہر واقعہ میں قصور تمام تر ایک طرف ہو اور بے قصوری تمام تر دوسری طرف۔

بے داغ انسانوں کے ساتھ ظلم کیا جانا دراصل خدا کی سنت امتحان کی قیمت ہے۔ بے داغ انسان گویا خدا کے صحیح ترین ترازو ہیں جن پر لوگوں کی بدکرداریوں کو تولا جاتا ہے۔ لوگوں کے ایمان و اخلاق کو تولنے کی یہی واحد صورت ہے۔ یقیناً یہ بڑا اندوہناک معاملہ ہے۔ مگر ان ستائی ہوئی پاکیزہ روحوں کو خدا کل کے دن اتنا زیادہ اجر دے گا کہ وہ آج کی تمام تکلیفوں کو بھول جائیں گے۔ وہ کہہ اٹھیں گے کہ خدایا، تیرا احسان ہے کہ تو نے ہم سے ایک بہت چھوٹی قیمت لے کر ہم کو ایک بہت بڑے انعام کا مستحق بنا دیا۔

ذہنی بیداری

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ بستیوں کے لوگ اگر ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکتیں کھول دیتے۔ مگر انھوں نے جھٹلایا (الاعراف ۹۶) یہی بات یہود کے بارے میں کہی گئی ہے کہ انھوں نے نبی آخرالزماں کو جھٹلادیا، اگر وہ ان پر ایمان لاتے تو وہ اپنے اوپر سے بھی کھاتے اور اپنے قدموں کے نیچے سے بھی اپنا رزق حاصل کرتے (المائدہ ۶۶)

ایک رسول کا اقرار کرنے پر اتنی زیادہ برکتوں کی خوش خبری کیوں دی گئی — بہت سے لوگ اس کی وجہ یہ سمجھتے ہیں کہ کلمۂ ایمان میں طلسماتی اوصاف چھپے ہوئے ہیں اور زبان سے اس کا تلفظ کرتے ہی اسی طرح تمام خزانوں کے دروازے کھل جاتے ہیں جس طرح قدیم افسانوی کہانی میں "سم سم" کہنے سے ایک شخص کے لئے خزانوں کا محل کھل گیا تھا۔ مگر اس قسم کا خیال سراسر بے بنیاد ہے۔ اگر ان برکتوں کا تعلق کلمۂ ایمان کی لفظی ادائگی سے ہوتا تو آج مسلمانوں کی زندگیوں میں ہر زمانہ سے زیادہ اس کا ظہور ہوسکا ہوتا۔ کیونکہ کلمۂ ایمان کا تلفظ کرنے والے آج ہر زمانہ سے زیادہ عظیم مسلم امت (ایک ارب) کی صورت میں زمین کے اوپر موجود ہیں۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ ایمان کے مدعیوں کی بے پناہ کثرت کے باوجود آج ان کے لئے نہ آسمانی برکتوں کے دروازے کھل رہے ہیں اور نہ زمینی برکتوں کے۔

حقیقت یہ ہے کہ ان آیات میں ایمان کا لفظ فکری انقلاب کے ہم معنی ہے۔ اس وقت جو لوگ آپ پر ایمان لائے ان کے لئے ایمان کا مطلب واضح طور پر، ایک ذہنی فیصلہ تھا۔ اس حقیقت کو بآسانی اس وقت سمجھا جاسکتا ہے اگر یہ دیکھا جائے کہ جب یہ آیتیں اتریں اس وقت یہود کے لئے یا عرب کے لوگوں کے لئے ایمان لانے کا مطلب عملاً کیا تھا۔

آج جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لیتے ہیں تو یہ لفظ بولتے ہی ہمارے ذہن میں وہ مسلّمہ شخصیت آجاتی ہے جس کے ساتھ ڈیڑھ ہزار برس کی تاریخی عظمتیں وابستہ ہو چکی ہیں۔ مگر بعثت کے وقت لوگوں کی نظر میں آپ صرف "محمد بن عبداللہ" تھے۔ اس وقت یہ ساری تاریخ ابھی مستقبل کے پردہ میں چھپی ہوئی تھی۔ لوگوں کو آپ عام انسانوں کی طرح بس ایک معمولی انسان نظر آتے تھے۔ مگر یہود کا اور مشرکین عرب کا معاملہ اس سے بالکل مختلف تھا۔ یہود کو ایک ایسے دین کا حامل ہونے کا فخر حاصل تھا جس کی حیثیت معروف مسلّم تھی۔ ان کے دین کے ساتھ موسیٰ اور داؤد اور سلیمان علیہم السلام جیسے کتنے سابق پیغمبروں کے نام شامل تھے جو لمبی تاریخ کے نتیجہ میں لوگوں کے ذہنوں پر اپنی عظمت قائم کر چکے تھے۔ یہی حال عرب کے مشرکین کا تھا۔

وہ اپنے سلسلہ کو ابراہیمؑ و اسماعیلؑ جیسے قدیم پیغمبروں سے جوڑے ہوئے تھے۔ وہ اپنے کو کعبہ کا وارث اور ملت ابراہیمی کا حامل سمجھتے تھے، اور یہ وہ چیزیں تھیں جن کی تاریخی اہمیت سیکڑوں برس کی روایات کے نتیجہ میں تسلیم شدہ بن چکی تھی۔ بالفاظ دیگر، پیغمبر اسلام اپنی تاریخ کے آغاز پر تھے اور یہود اور قبائل عرب اپنی تاریخ کے اختتام پہ۔

ایسی حالت میں چودہ سو سال پہلے والے پیغمبر اسلام کو ماننا اور آپ کا ساتھ دینا ان لوگوں کے لئے کوئی سادہ واقعہ نہ تھا۔ یہ قائم شدہ دین سے نکل کر ایک ایسے دین کو اختیار کرنا تھا جو ابھی قائم نہیں ہوا تھا۔ یہ مفادات سے وابستہ سچائی کو چھوڑ کر مجرد سچائی کو اختیار کرنا تھا۔ یہ مادی عظمتوں سے اوپر اٹھ کر غیر مادی عظمتوں کا ادراک کرنا تھا۔ یہ حال کے پردہ میں مستقبل کا مشاہدہ کرنا تھا۔ یہ محسوس خداؤں سے گزر کر چھپے ہوئے خدا کو پالینا تھا۔

اس قسم کا واقعہ کسی انسان کی زندگی میں اس طرح پیش نہیں آتا جیسے وہ ایک کرہ سے نکل کر دوسرے کرہ میں چلا گیا ہو۔ اس قسم کا واقعہ آدمی کی زندگی میں ہمیشہ بھونچال بن کر داخل ہوتا ہے۔ یہ ایک شعوری انقلاب ہوتا ہے جب کہ آدمی سوچے سمجھے ارادہ کے تحت ایک چیز کو چھوڑتا ہے اور سوچے سمجھے ارادہ کے تحت دوسری چیز کو لے لیتا ہے۔ اس میں آدمی کی قوت فیصلہ متحرک ہوتی ہے۔ اس کے جذبات میں عظیم ہلچل پیدا ہوتی ہے۔ اس کو قربانیوں کے پل کو پار کر کے ایک طرف سے دوسری طرف جانا پڑتا ہے جس کے نتیجہ میں اس کی پوری زندگی اس طرح ہل جاتی ہے جیسے کوئی طوفان کسی درخت کو ہلا دے۔ جب کچھ لوگ اس طرح انقلابی انداز میں ایک نظریہ کو اختیار کریں تو اس کے بعد عین قانون قدرت کے تحت ایسا ہوتا ہے کہ زمین پر بالکل نئے قسم کے انسان وجود میں آتے ہیں۔ اور ان کے ملنے سے وہ سماج بنتا ہے جس سے ایسے حیرت ناک نتائج برآمد ہوں جو اس سے پہلے آسمان نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی مرتبہ جب عرب میں اسلام کی آواز بلند کی تو اس وقت دوسرے ادیان کا حال یہ تھا کہ وہ پہلے سے چلے آرہے تھے اور اس بنا پر وہ جمے ہوئے مفادات کی بنیاد پر قائم ہو چلے تھے۔ اسلام ابھی ایک مجرد نظریہ تھا، جبکہ دوسرے ادیان نے منظم ادارہ (Institution) کی صورت اختیار کر لی تھی۔ ایسی حالت میں اسلام کو اپنا دین بنانا ماحول کے اندر بے قیمت ہو جانے کے ہم معنی تھا۔ دوسرے ادیان سے وابستہ ہو کر آدمی کے تمام مفادات محفوظ رہتے تھے۔ وہ سماج کا معزز رکن شمار ہوتا تھا۔ مگر اسلام کو اختیار کرتے ہی وہ ایک ایسے دین کا فرد بن جاتا تھا جس نے سماج کے اندر اپنی حیثیت مسلّم نہیں کی تھی۔ جس کے ساتھ ابھی تک مفادات وابستہ نہیں ہوئے تھے۔ وہ پُر فخر روایات والے

گروہ سے چھوٹ کر ایک ایسے گروہ کا جزء بن جاتا تھا جس کے ساتھ ابھی پُر فخر روایات وابستہ نہ ہوئی ہوں۔
ایسی حالت میں جن لوگوں نے اسلام قبول کیا ان کے لئے اسلام محض ایک کلمہ کا تلفظ نہ تھا بلکہ ایک انقلابی فیصلہ کے ہم معنی تھا۔ اسلام کی آواز نے ان کے خیالات کی دنیا میں ایک زبردست ہلچل پیدا کی۔ ان کی تمام فکری قوتیں جاگ اٹھیں۔ ان کے اندر شدت سے یہ ذہن ابھرا کہ اپنے آپ پر نظر ثانی کریں۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ انھوں نے بے پناہ ارادہ کے تحت ایک چیز کو چھوڑا اور بے پناہ ارادہ کے تحت دوسری چیز کو اختیار کر لیا۔

ایسا کرتے ہوئے انھوں نے تعصبات کے پردہ کو چاک کیا۔ مفادات اور مصلحتوں کو نظر انداز کیا۔ یہ خطرہ مول لیا کہ اپنے خاندان، اپنے قبیلہ اور اپنے سماج سے کٹ کر وہ دنیا میں اکیلے رہ جائیں۔ انھوں نے ایک شعوری فیصلہ کے تحت اپنے آپ کو تقلیدی زمین سے کھینچ کر ہٹایا اور شعوری فیصلہ کے تحت ایک زندہ عقیدہ کی زمین پر اپنے کو کھڑا کیا ——— دور اول کے مسلمانوں کے لئے ایمان ایک فکری انقلاب کے ہم معنی تھا اس لئے اس ایمان سے جو لوگ پیدا ہوئے وہ بھی انقلابی انسان تھے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے لئے ایمان ایک بے روح عقیدہ ہے اس لئے اس ایمان سے جو افراد تیار ہوتے ہیں وہ بھی بے روح انسان ہیں، ان میں نہ فکر کے اعتبار سے کوئی جان ہوتی ہے اور نہ کردار کے اعتبار سے۔

کتاب رخی دین اور سماج رخی دین

حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ اسلام اجنبی حالت میں شروع ہوا اور پھر وہ پہلے کی طرح اجنبی ہو جائے گا۔ پس مبارکی ہے اجنبیوں کے لئے (بدأ الاسلام غریبا وسیعود کما بدأ فطوبیٰ للغرباء) اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دور اول میں جس طرح اجنبی بننے کی قیمت پر لوگوں کو اسلام ملا تھا اسی طرح بعد کے دور میں بھی جس کو اسلام ملے گا اجنبی بننے کی قیمت پر ملے گا۔

غور سے دیکھئے تو آج تاریخ دوبارہ وہیں لوٹ آئی ہے جہاں سے وہ شروع ہوئی تھی۔ آج ایک دین وہ ہے جو قرآن میں محفوظ ہے، دوسرا دین وہ ہے جو مسلمانوں کے درمیان پایا جاتا ہے۔ پہلے دین کو کتاب رخی دین کہہ سکتے ہیں اور دوسرے دین کو سماج رخی دین۔ کتاب رخی دین وہ ہے جو قرآن وسنت میں محفوظ ہے۔ یہ دین گویا آج پیغمبر کا نمائندہ ہے۔ مگر یہ دین آج ماحول کے اندر اسی طرح اجنبی بن گیا ہے جس طرح وہ چودہ سو سال پہلے اجنبی تھا۔ دوسری طرف سماج رخی دین اسی طرح مکمل طور پر ایک منظم ادارہ بنا ہوا ہے جس طرح قدیم زمانہ میں یہودیت تھی۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی تمام بڑی بڑی تحریکیں اسی دوسرے اسلام کی زمین پر چل رہی ہیں۔ بظاہر کوئی کلی اسلام کا جھنڈا اٹھائے ہوئے ہے اور کوئی جزئی اسلام کا۔ مگر یہ تمام تحریکیں حقیقۃً سماج رخی دین کی سطح پر ابھری ہیں نہ کہ کتاب رخی دین کی سطح پر۔

صورت حال یہ ہے کہ آج اسلام میں اسی طرح گدیاں بن چکی ہیں جس طرح وہ پہلے یہودیت میں پائی جاتی تھیں۔ اسلام اب ایک ایسا نام بن گیا ہے جس کے اوپر چندے اور عہدے ملیں۔ جس کے نعرے پر عوام کی بھیڑ جمع کی جاسکے۔ جس کی بنیاد پر شخصیتیں بنیں اور قیادتیں ابھریں۔ اسلام آج ایک ایسا عنوان ہے جس کے سہارے ادارے قائم ہوں اور خطابات حاصل ہوں۔ اسلام آج ہر اعتبار سے ایک عظیم ترین مارکٹ ہے جس سے وہ تمام مادی فائدے حاصل کئے جاسکتے ہیں جو دنیا کے عام بازاروں سے کسی کو حاصل ہوتے ہیں۔

دوسری طرف کتاب ربانی دین عملاً بے جگہ ہو چکا ہے۔ وہ محض ایک ذہنی تخیل کے طور پر فضا میں باقی ہے۔ کوئی شخص اگر اس کتاب والے دین کو اپنائے تو فوراً وہ محسوس کرے گا کہ وہ اپنے ماحول کے درمیان اجنبی ہو گیا ہے۔ ایسے آدمی کو اپنے اسلام کی یہ قیمت دینی پڑے گی کہ وہ لوگوں کو نئے دین کا حامل معلوم ہو۔ وہ بڑی بڑی دینی مجالس میں شرکت کے لئے نااہل قرار پائے۔ اونچی گدیوں میں سے کوئی گدی اس کو نہ ملے۔ قرآن سے گہرا تعلق رکھنے کے باوجود اس کو قرآنی جشن کی صدارت کے لئے نہیں بلایا جائے گا۔ حدیث کا عالم ہونے کے باوجود وہ کسی دینی مدرسہ کا شیخ الحدیث نہ بن سکے گا۔ مخلص اور متقی ہونے کے باوجود اس کا شمار بزرگوں میں نہیں ہوگا۔ دین کا گہرا فہم رکھنے کے باوجود دینی مسائل میں اس سے رجوع نہیں کیا جائے گا۔ خدا اور رسول کی خاطر اپنی زندگی وقف کر دینے کے باوجود اس کو کسی دینی خطاب کا اہل نہیں سمجھا جائے گا۔ اور ان سب کی وجہ یہ ہوگی کہ ایسا آدمی جس دین پر قائم ہے وہ کتاب وسنت والا دین ہے اور منظم مذہب (Institutionalized Religion) کو ماننے والوں کے درمیان خالص کتاب و سنت والا دین اجنبی بن چکا ہے۔ لوگ دین کے نام سے جس چیز سے واقف ہیں وہ کچھ خارجی نقشے ہیں نہ کہ گہری ربانی حقیقتیں۔ وہ واقعات انسانی سے اپنا دین لے رہے ہیں نہ کہ واقعات خداوندی سے

شاہ ضرب

کیرم ایک گھریلو کھیل ہے۔ یہ کھیل ایک تختہ (بورڈ) پر کھیلا جاتا ہے۔ ایک بڑے چوکور تختہ کے بیچ میں ردپیہ جیسی ۱۹ گوٹیں مرتب مجموعہ کی صورت میں سمیٹ دی جاتی ہیں۔ اس کے بعد کھیل کا آغاز کرنے والا ایک خاص گوٹ (اسٹرائکر) لے کر تختہ کے ایک کونہ سے گوٹوں کے درمیانی مجموعہ پر نشانہ لگا کر پوری قوت سے مارتا ہے۔ اس کی مار اگرچہ مجموعہ کے صرف ایک نقطہ پر پڑتی ہے۔ لیکن مار اگر کامیاب ہے تو وہ گوٹوں کے پورے مجموعہ کو متاثر کر دیتی ہے۔ اب ایک ایک گوٹ اپنی جگہ سے ہٹ کر کھلاڑی کی زد میں آجاتی ہے۔ ایسی کامیاب مار کو کیرم بورڈ کی اصطلاح میں شاہ ضرب (Master Stroke) کہتے ہیں۔

خدا کے دین کو از سر نو زندہ کرنے کے لئے بھی اسی قسم کے ایک شاہ ضرب کی ضرورت ہے۔ یہ شاہ

ضرب وہ ہے جو تنظیمی مذہب یا سماج روپی دین پر جمے ہوئے لوگوں کو اپنی جگہ سے ہلا دے اور ان کو ذہنی اعتبار سے اس مقام پر لائے جہاں وہ کتاب وسنت والے دین کے مخاطب بن سکیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہی واقعہ پیش آیا تھا۔ اب اسی واقعہ کو دوبارہ ظہور میں لانے کی کوشش کا نام تجدید دین ہے۔ آج تجدید دین کا مطلب اسی کارنبوت کو دہرانا ہے۔ نبی نے اپنے زمانہ میں سابقہ ادیان کی بنیاد پر قائم شدہ ڈھانچہ کے مقابلہ میں خدا کے دین کو زندہ کیا تھا۔ آج خود اسلام کی بنیاد پر قائم شدہ ڈھانچہ کے مقابلہ میں خدا کے خالص دین کو از سرنو زندہ کرنا ہے۔

اس عمل کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ لوگوں کا دینی جمود ٹوٹے۔ شخصیتوں اور اداروں میں اٹکے ہوئے لوگ براہ راست خدا کو اپنا مرکز توجہ بنائیں۔ جزئی مسائل کو دین سمجھنے والے اساسی امور کو دین سمجھیں اور طلسماتی فضائل پر بھروسہ کرنے والے لوگ حقائق کی بنیاد پر اپنے دین کی تعمیر کریں۔ جن لوگوں نے بے روح عملیات کو دین کے ہم معنی سمجھ لیا ہے وہ زندہ دین کی لذتوں سے آشنا ہوں۔ جن کے یہاں دین ابھی تک جھنگلیا کی مانند ایک ضمیمہ بنا ہوا ہے وہ ان کی زندگیوں میں اس طرح داخل ہو کہ وہ ان کے کردار کے لئے قوت محرکہ بن جائے۔ جو لوگ کچھ مصنوعی اعمال کو دین داری سمجھے ہوئے ہیں وہ حقیقی دین داری کی فضا میں داخل ہوں۔

پھر اسی میں دور جدید کی اس سب سے بڑی خرابی کا حل بھی ہے جس نے اسلام کو تمام دنیا میں مسلمانوں کی قومی تحریکوں کا ضمیمہ بنا دیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے ساتھ یہ المیہ پیش آیا کہ وہ ساری دنیا میں غیر مسلم اقوام کی زد میں آگئے۔ اس کے بعد قدرتی طور پر یہ ہوا کہ مسلمانوں کو دوسری قومیں ظالموں اور غاصبوں کے روپ میں دکھائی دینے لگیں۔ ان کے اندر ہر جگہ مقابلہ آرائی کا ذہن ابھر آیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو اب وہی باتیں اپیل کرتی ہیں جن میں ان کی دفاعی نفسیات کو تسکین ملتی ہو۔ مثلاً اسلام کی عسکری تعبیر، انبیاء کے مشن کو حکومت وسیاست کی اصطلاحوں میں بیان کرنا، دوسری قوموں کو ظالم قرار دے کر ان کے خلاف ہنگامہ آرائی، مصالحت (Adjustment) کے بجائے ٹکراؤ اور لڑائی کی باتیں، وغیرہ۔ یہ نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ اب اگر خاموش تعمیر اور دعوت آخرت کی بات کی جائے تو اس کو لوگ اس نظر سے دیکھتے ہیں جیسے یہ کوئی سازش ہے جو ان کو اپنے دشمنوں کے محاذ سے ہٹا کر غیر متعلق چیزوں میں مصروف کرنے کے لئے کی گئی ہے۔ دین کو اگر قومی نقشوں میں بننے والے ڈھانچہ سے الگ کر کے ابدی حقیقتوں کی بنیاد پر کھڑا کر دیا جائے تو اس قسم کے تمام خیالات اپنے آپ بے زمین ہو جائیں گے۔ اسلام کی قومی تشریحات کسی آدمی کو اسی وقت تک اپیل کرتی ہیں جب کہ اس کا فکر قومی حالات کے نقشہ میں اٹکا ہوا ہو۔ اگر وہ قومی حالات سے اوپر اٹھ کر خدا کی ابدی کائنات میں جینے لگے تو اس قسم کی تشریحات وتعبیرات خود بخود اس کے لئے

بے کشش ہو کر رہ جائیں گی۔

یہ ذہنی بیداری یا فکری انقلاب ہی آج ملت اسلامی کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ کسی حقیقی کام کا واحد آغاز یہ ہے کہ ملت کے افراد جو سماج رد پی اسلام کی زمین پر ٹھہرے ہوتے ہیں، ان کو اس سے ہٹا کر دوبارہ کتاب ردپی اسلام کی زمین پر کھڑا کیا جائے۔ اس کام کے قابل لحاظ حد تک انجام پانے کے بعد ہی ان کے اندر ربانی شعور اور الٰہی کردار پیدا ہو سکتا ہے۔ یہ ابتدائی مقصود جب تک حاصل نہ ہو، کوئی بڑا اقدام کرنا یا تو غیر سنجیدہ انسان کا کام ہو سکتا ہے یا اس شخص کا جس کی عقل جاتی رہی ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ دوسری وہ تمام چیزیں جن کو ہم چاہتے ہیں وہ سب اسی فکری انقلاب کا ضمنی حاصل (By-product) ہیں۔ وہ سارے اہم ترین نتائج جن کے ہم منتظر ہیں وہ اسی ذہنی انقلاب کے بطن سے ظہور میں آتے ہیں۔ یہ فکری انقلاب توہمات کی زنجیروں کو توڑتا ہے جس سے علمی ترقیاں وجود میں آتی ہیں۔ یہ فکری انقلاب افراد کے اندر حوصلہ مندی پیدا کرتا ہے جس کے بعد وہ مختلف میدانوں میں بڑے بڑے کارنامے انجام دینے لگتے ہیں۔ یہ فکری انقلاب لوگوں کے اندر آفاقیت پیدا کرتا ہے جس کے نتیجے میں وہ غیر مفتوح کردار کے مالک بن جاتے ہیں۔ یہ فکری انقلاب اپنے متاثر افراد کے اندر ربانی شعور ابھارتا ہے جس کے بعد وہ ایسی بے پناہ منصوبہ بندی کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں جس کا توڑ کسی کے لئے ممکن نہ ہو۔ ذہنی انقلاب قوموں اور آبادیوں کو مسخر کرتا ہے جس کی وجہ سے اس کے ماننے والوں کا دبدبہ زمین پر قائم ہوتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ یہ ذہنی انقلاب جہاں برپا ہوتا ہے وہاں بالکل قدرتی طور پر ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں کے قدموں کے نیچے سے بھی رزق ابلتا ہے اور ان کے سروں کے اوپر بھی رزق برستا ہے۔ خدا اپنی دنیا بھی ان کے لئے لکھ دیتا ہے اور اپنی آخرت بھی۔

شریعتوں میں فرق کی حکمت

مذہبی جمود کو توڑنا اللہ تعالیٰ کو اتنا زیادہ مطلوب ہے کہ اس کے لئے اس نے ایک پیغمبر اور دوسرے پیغمبر کی شریعت میں فرق رکھا۔ مختلف پیغمبروں کا دین اگرچہ ایک تھا مگر ان کی شریعتوں میں باہم فرق رکھا گیا۔ اس فرق کی خاص حکمت یہی تھی۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے ایک شریعت اور ایک طریق عمل مقرر کیا۔ اور اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک امت بنا دیتا۔ مگر اس نے ایسا اس لئے کیا کہ جو کچھ اس نے تم لوگوں کو دیا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے۔ پس تم بھلائیوں کی طرف سبقت کرو (المائدہ ۴۸) ہر امت کے لئے ہم نے ایک طریق عبادت مقرر کیا ہے جس کے وہ پیرو ہیں۔ پس وہ اس امر میں تم سے جھگڑا نہ کریں اور تم اپنے رب کی طرف

دعوت دو، یقیناً تم سیدھے راستہ پر ہو (الحج ۶۸) یہی بات تحویل قبلہ کے ذیل میں اس طرح فرمائی گئی ہے:
اور ہر ایک کے لئے ایک رخ ہے جس کی طرف وہ مڑتا ہے۔ پس تم بھلائیوں کی طرف سبقت کرو (البقرہ ۱۴۸)
اس سلسلہ میں مزید ارشاد ہوا ہے کہ جس قبلہ پر تم اب تک تھے اس کو ہم نے صرف یہ دیکھنے کے لئے مقرر کیا تھا تاکہ ہم جان لیں کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون الٹا پھر جاتا ہے (البقرہ ۱۴۳)

شریعتوں میں فرق کی توجیہہ عام طور پر ارتقار کی اصطلاحوں میں کی جاتی ہے۔ یعنی خدا کی شریعت سادہ اور غیر کامل صورت سے ترقی کرکے کامل صورت تک پہنچی ہے اور شریعتوں کا باہمی فرق اسی سبب سے ہے۔ مگر یہ توجیہہ سراسر بے بنیاد ہے۔ قرآن میں واضح طور پر تبدیلیٔ شریعت کا سبب ابتلار بتایا گیا ہے نہ کہ ارتقار۔

شریعت اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے دینی عقائد کا زندہ اظہار ہے۔ مگر ایک طریقہ پر نسل در نسل عمل کرتے کرتے ایسا ہوتا ہے کہ شریعت سے اس کی روح نکل جاتی ہے۔ وہ ایک ایسا خشک ڈھانچہ بن جاتی ہے جس سے آدمی کا نفسیاتی رشتہ ٹوٹ چکا ہو۔ اس وقت خدا شریعت کے قدیم ڈھانچہ کو بدل دیتا ہے تاکہ تقلیدی عمل کا خاتمہ ہو اور لوگ زندہ احساس اور تازہ فیصلہ کے تحت نئی شریعت کو اپنی زندگیوں میں اختیار کریں۔ اس وقت کھل جاتا ہے کہ کون شعور کے تحت خدا کی عبادت کر رہا تھا اور کون جمود اور تقلید کے تحت۔ بیت المقدس کے بجائے کعبہ کو قبلہ قرار دینا تبدیلیٔ شریعت کی ایک مثال ہے۔ اور اس کی وجہ قرآن میں یہ بتائی گئی ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ کون رسول کا متبع ہے اور کون الٹے پاؤں پھر جاتا ہے۔ یعنی اس بات کا امتحان کہ کون حقیقت کا پیرو ہے اور کون تقلیدی روایات کا۔ تقلیدی روایات کا پیرو اپنی مانوس عصبیتوں سے چمٹا رہے گا اور جو حقیقت کا پیرو ہے وہ تقلیدی عمل کو چھوڑ دے گا اور فوراً اصلی حکم پر قائم ہو جائے گا۔

پروگرام کا سوال

اکثر لوگ احیار اسلام کی مہم کو اس کے "پروگرام" میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ اس کو اسی وقت سمجھ پاتے ہیں جب کہ انھیں ایک متعین پروگرام بتا دیا جائے۔ مگر پروگرام کو تحریک کا بدل سمجھنا تحریک کی وسعتوں کی تصغیر (Underestimation) ہے۔ پروگرام ایک محدود نقشۂ کار کا نام ہے اور انسانی زندگی اس سے زیادہ وسیع ہے کہ وہ کسی محدود نقشہ کار کے دائرہ میں سما سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ سب سے بڑا پروگرام خود افراد کو پروگرام ساز بنانا ہے نہ کہ افراد کے ہاتھوں میں کوئی لگا بندھا پروگرام دینا۔

اسلامی دعوت یہی کام کرتی ہے۔ حقیقی اسلامی دعوت افراد کے ذہن کو اس طرح جگا دیتی ہے کہ وہ خود پروگرام ساز بن جاتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں صرف توحید کی دعوت پیش کی تھی۔ آپ نے اس قسم کی کوئی چیز لوگوں کو نہیں دی جس کو موجودہ زمانہ میں "پروگرام" کہا جاتا ہے۔ اس کے باوجود

ہر وہ شخص جو آپ کی دعوت سے متاثر ہوتا اس کو اپنے لئے مکمل پروگرام مل جاتا تھا۔ وہ آپ سے توحید کا شعور لینے کے بعد خود ہی سارا کام کرنے لگتا تھا۔ مسلمانوں میں سے جو لوگ مکہ چھوڑ کر حبش میں گئے ان کو آپ نے معروف معنوں میں کوئی پروگرام نہیں بتایا تھا۔ مگر انھوں نے حبش میں اسلام کی اتنی کامیاب نمائندگی کی کہ اسلام بین اقوامی دعوت کے مرحلہ میں داخل ہوگیا۔ آپ کی ہجرت سے پہلے جو مسلمان مدینہ گئے ان کو آپ نے قرآن کی سورتوں کے سوا اور کچھ نہیں دیا تھا۔ مگر انھوں نے مدینہ میں اسلامی دعوت کی مہم اس طرح چلائی کہ صرف چند سالوں میں مدینہ اس قابل ہوگیا کہ وہ دار الہجرت (اسلام کا مرکز) بن سکے۔

تقلیدی مذہب سے ہٹا کر شعوری مذہب پر لانے کی مہم سب سے بڑی انقلابی مہم ہے۔ وہ ایسے افراد وجود میں لاتی ہے جو اپنی ذات میں مکمل پروگرام ہوتے ہیں۔ ایسی مہم کی زد انسان کے پورے وجود پر پڑتی ہے۔ وہ انسانی فطرت کو اس طرح جگاتی ہے کہ اس کے اندر ربانی حکمت کا چشمہ ابل پڑے۔ اب ایسے انسان وجود میں آتے ہیں جو خدا کے پاؤں سے چلیں، جو خدا کے ہاتھ سے پکڑیں، جو خدا کی آنکھ سے دیکھیں اور خدا کے کان سے سنیں۔ وہ حدیث کے الفاظ میں، وہ بے پناہ انسان بن جائیں جس کی ہوش مندی ہر دوسری چیز سے بلند تر ثابت ہوتی ہے (اتقوا فراسة المومن فانه ینظر بنور الله) ایسا آدمی خود ہر چیز کا بدل بن جاتا ہے۔ اس کے پاس ہر سوال کا صحیح ترین جواب ہوتا ہے۔ وہ ہر موقع پر اپنے لئے کامیاب ترین راہ عمل تلاش کر لیتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب میں یہی حکمت ربانی جگا دی تھی، اس کے بعد انھیں کسی اور چیز کی ضرورت نہ رہی۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا نے انسان کی فطرت میں وہ سب کچھ بھر دیا ہے جس کی اسے اپنی زندگی میں ضرورت ہے۔ عام حالات میں یہ فطرت ڈھکی ہوئی رہتی ہے۔ اسی انسانی فطرت سے جمود اور تعصب اور بے شعوری کے پردوں کو ہٹانا اسلامی دعوت کا اصل کام ہے۔ ان پردوں کے ہٹتے ہی انسانی فطرت اس آفاقی روشنی میں آجاتی ہے جس سے تمام زمین و آسمان جگمگا رہے ہیں۔ اس کے بعد ہر چیز اس کو اپنے واقعی روپ میں دکھائی دینے لگتی ہے۔ اور جو آدمی چیزوں کو ان کے واقعی روپ میں دیکھ لے اس کے لئے پروگرام کا مسئلہ اتنا ہی آسان ہو جاتا ہے جتنا آنکھ والے ایک شخص کے لئے سیڑھی کے زینوں پر قدم رکھتے ہوئے کسی عمارت کے اوپر چڑھنا۔

تم جب ان کی طرف پلٹو گے تو وہ تمھارے سامنے عذرات پیش کریں گے۔ کہہ دو کہ بہانے نہ بناؤ۔ ہم ہرگز تمھاری بات نہ مانیں گے۔ بے شک اللہ نے ہم کو تمھارے حالات بتا دئے ہیں۔ اب اللہ اور رسول تمھارے عمل کو دیکھیں گے۔ پھر تم اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے جو کھلے اور چھپے کا جاننے والا ہے، وہ تم کو بتا دے گا جو کچھ تم کر رہے تھے۔ یہ لوگ تمھاری واپسی پر تمھارے سامنے اللہ کی قسمیں کھائیں گے تاکہ تم ان سے درگزر کرو۔ پس تم ان سے درگزر کرو۔ بے شک وہ ناپاک ہیں اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے بدلہ میں اس کے جو وہ کرتے رہے۔ وہ تمھارے سامنے قسمیں کھائیں گے کہ تم ان سے راضی ہو جاؤ۔ اگر تم ان سے راضی بھی ہو جاؤ تو اللہ نافرمان لوگوں سے راضی ہونے والا نہیں۔ ۹۴ — ۹۶

"تمھارے حالات ہم کو اللہ نے بتا دئے ہیں" کا فقرہ ظاہر کر رہا ہے کہ یہاں جن منافقین کا ذکر ہے اس سے مراد زمانہ نزول قرآن کے منافقین ہیں۔ کیونکہ براہ راست وحی خداوندی کے ذریعہ آگاہ ہونے کا معاملہ صرف زمانۂ رسالت میں ہوا یا ہو سکتا تھا۔ بعد کے زمانہ میں ایسا ہونا ممکن نہیں۔ طبقات ابن سعد کی روایت کے مطابق یہ کل بیاسی افراد تھے جن کے نفاق کے بارے میں اللہ نے بذریعہ وحی مطلع فرمایا تھا۔

تاہم اس علم کے باوجود صحابہ کرام کو ان کے ساتھ جس سلوک کی اجازت دی گئی، وہ تغافل اور اعراض تھا نہ کہ ان کو ہلاک کرنا۔ ان کو سزا یا عذاب دینے کا معاملہ پھر بھی خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا۔ مدینہ کے منافقین کے ساتھ اگرچہ اتنی سختی کی گئی کہ انھوں نے عذرات پیش کئے تو ان کے عذرات قبول نہیں کئے گئے۔ حتیٰ کہ ثعلبہ بن حاطب انصاری نے منافقانہ روش اختیار کرنے کے بعد زکوٰۃ پیش کی تو ان کی زکوٰۃ لینے سے انکار کر دیا گیا۔ تاہم ان میں سے کسی کو بھی آپ نے قتل نہیں کرایا۔ عبداللہ بن ابی کے لڑکے عبداللہ نے اپنے باپ کی منافقانہ حرکت پر سخت کارروائی کرنی چاہی تو آپ نے روک دیا اور فرمایا: انھیں چھوڑ دو، بخدا جب تک وہ ہمارے درمیان ہیں ہم ان کے ساتھ اچھا ہی سلوک کریں گے (دعه فلعمری لنحسنن صحبته مادام بین اظهرنا، طبقات ابن سعد)

بعد کے زمانہ کے منافقین کے بارے میں بھی یہی حکم ہے۔ تاہم دونوں کے درمیان ایک فرق ہے۔ دور اول کے منافقین سے ان کی حالت قلبی کی بنیاد پر معاملہ کیا گیا، مگر بعد کے منافقین سے ان کی حالت ظاہری کی بنیاد پر معاملہ کیا جائے گا۔ ان سے اعراض و تغافل کا سلوک صرف اس وقت جائز ہوگا جب کہ ان کے عمل سے ان کی منافقت کا خارجی ثبوت مل رہا ہو۔ ان کی نیت یا ان کی قلبی حالت کی بنا پر ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جائے گی۔ بعد کے لوگ عذر پیش کریں تو ان کا عذر بھی قبول کیا جائے گا اور اس کے ساتھ ان کے صدقات وغیرہ بھی۔ ان کے انجام کو اللہ کے حوالے کرتے ہوئے ان کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے گا جو ظاہری قانون کے مطابق کسی کے ساتھ کیا جانا چاہئے۔

جنت کسی کو ذاتی عمل کی بنیاد پر ملتی ہے نہ کہ مسلمانوں کی جماعت یا گروہ میں شامل ہونے کی بنیاد پر۔ منافقین سب کے سب مسلمانوں کی جماعت میں شامل تھے وہ ان کے ساتھ نماز روزہ کرتے تھے مگر اس کے باوجود ان کے جہنمی ہونے کا اعلان کیا گیا۔

دیہات والے کفر و نفاق میں زیادہ سخت ہیں اور اسی لائق ہیں کہ اللہ نے اپنے رسول پر جو کچھ اتارا ہے اس کے حدود سے بے خبر رہیں۔ اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے۔ اور دیہاتیوں میں ایسے بھی ہیں جو خدا کی راہ میں خرچ کو ایک تاوان سمجھتے ہیں اور تمھارے لئے زمانہ کی گردشوں کے منتظر ہیں۔ بری گردش خود انھیں پر ہے اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ اور دیہاتیوں میں وہ بھی ہیں جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں اس کو اللہ کے یہاں قرب کا اور رسول کے لئے دعائیں لینے کا ذریعہ بناتے ہیں۔ ہاں بے شک وہ ان کے لئے قرب کا ذریعہ ہے۔ اللہ ان کو اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔ یقیناً اللہ بخشنے والا مہربان ہے ۹۷ - ۹۹

حدیث میں آیا ہے کہ جس نے دیہات میں سکونت اختیار کی وہ سخت مزاج ہو جائے گا (من سکن البادیۃ جفا) شہر کے اندر علمی ماحول ہوتا ہے، تعلیمی ادارے قائم ہوتے ہیں۔ وہاں علم و فن کا چرچا رہتا ہے۔ جب کہ دیہات میں لوگوں کو اس کے مواقع حاصل نہیں ہوتے۔ اسی کے ساتھ دیہات کے لوگوں کے رہن سہن کے طریقے اور ان کے معاشی ذرائع بھی نسبتاً معمولی ہوتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دیہات کے لوگوں کے اندر زیادہ گہرا شعور پیدا نہیں ہوتا۔ ان کی طبیعت میں سختی اور ان کے سوچنے کے انداز میں سطحیت پائی جاتی ہے۔ ان کے لئے مشکل ہوتا ہے کہ وہ دین کی نزاکتوں کو سمجھیں اور ان کو اپنے اندر اتاریں۔

اللہ ہر بات کو جانتا ہے اور اسی کے ساتھ وہ حکیم اور رحیم بھی ہے۔ وہ دیہات کے لوگوں، بالفاظ دیگر عوام، کی اس کمزوری سے باخبر ہے اور اپنی حکمت و رحمت کی بنا پر انھیں اس کی پوری رعایت دیتا ہے۔ چنانچہ ایسے لوگوں سے خدا کا مطالبہ یہ نہیں ہے کہ وہ گہری معرفت اور اعلیٰ دین داری کا ثبوت دیں۔ وہ اگر نیک نیت ہوں تو خدا ان سے سادہ دین داری پر راضی ہو جائے گا۔

عوام کی دین داری یہ ہے کہ وہ سچے دل سے خدا کا اقرار کریں۔ اپنے اندر اس احساس کو تازہ رکھیں کہ آخرت کا ایک دن آنے والا ہے۔ وہ اپنی کمائی کا ایک حصہ خدا کی راہ میں دیں اور یہ سمجھیں کہ اس کے ذریعہ سے انھیں خدا کی قربت اور برکت حاصل ہوگی۔ وہ خدا کی نمائندگی کرنے والے پیغمبر کو خوش کر کے اس کی دعائیں لینے کے طالب ہوں۔ یہ دین داری کی عوامی سطح ہے، اور اگر آدمی کی نیت میں بگاڑ نہ ہو تو اس کا خدا اس سے اسی سادہ دین داری کو قبول کرے گا۔

لیکن اگر عوام ایسا کریں کہ وہ خدا اور اس کے احکام سے بالکل غافل ہو جائیں۔ ان کو دین سے اتنی بے تعلقی ہو کہ دین کی راہ میں کچھ خرچ کرنا ان کو جرمانہ معلوم ہونے لگے۔ اسلام کی ترقی سے انھیں وحشت ہوتی ہو، تو بلاشبہ وہ ناقابل معافی ہیں۔ عوام کی کم فہمی کی بنا پر ان کو یہ رعایت تو ضرور دی جاسکتی ہے کہ ان سے گہری دین داری کا مطالبہ نہ کیا جائے۔ لیکن ان کی کم فہمی اگر سرکشی اور اسلام کے ساتھ بے وفائی کی صورت اختیار کرے تو وہ کسی حال میں بخشے نہیں جاسکتے۔

اور مہاجرین و انصار میں جو لوگ سابق اور مقدم ہیں اور جنھوں نے خوبی کے ساتھ ان کی پیروی کی، اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اس سے راضی ہوئے۔ اور اللہ نے ان کے لئے ایسے باغ تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہی ہے بڑی کامیابی۔ اور تمھارے گردوپیش جو دیہاتی ہیں ان میں منافق ہیں اور مدینہ والوں میں بھی منافق ہیں۔ وہ نفاق پر جم گئے ہیں۔ تم ان کو نہیں جانتے، ہم ان کو جانتے ہیں۔ ہم ان کو دہرا عذاب دیں گے۔ پھر وہ ایک عذاب عظیم کی طرف بھیجے جائیں گے ۱۰۰ — ۱۰۱

خدا کے دین کی دعوت جب بھی شروع کی جائے تو دو میں سے کوئی ایک صورت پیش آتی ہے۔ یا تو ماحول اس کا دشمن ہو جاتا ہے۔ ایسے ماحول میں دین کے لئے پکارنے والے اجنبی بن جاتے ہیں۔ وہ اپنی جگہ کے اندر بے جگہ کر دئے جاتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو مہاجر (چھوڑنے والا) کہا جاتا ہے۔ دوسری صورت وہ ہے جب کہ ماحول خدا کے دین کی دعوت کے لئے سازگار ثابت ہو۔ ایسے ماحول میں جو لوگ دین کے داعی بنتے ہیں ان کے ساتھ یہ حادثہ پیش نہیں آتا کہ ان کا سب کچھ ان سے چھن جائے۔ یہ دوسری قسم کے لوگ اگر ایسا کریں کہ وہ پہلے لوگوں کا سہارا بن کر کھڑے ہو جائیں تو یہی انصار (مدد کرنے والے) قرار پاتے ہیں۔ دور اول میں مکہ کے حالات نے وہاں کے مسلمانوں کو مہاجر بنا دیا اور مدینہ کے حالات نے وہاں کے مسلمانوں کو انصار کی حیثیت دے دی۔

خدا کی رضامندی اور اس کی جنت کسی آدمی کو یا تو مہاجر بننے کی قیمت پر ملتی ہے یا انصار بننے کی قیمت پر۔ یا تو وہ خدا کے لئے اتنا یکسو ہو کہ دنیا کے سرے اس سے چھوٹ جائیں۔ یا اگر وہ اپنے کو صاحب وسائل پاتا ہے تو اپنے وسائل کے ذریعہ وہ اول الذکر گروہ کی محرومی کا بدل بن جائے۔ دور اول کے مسلمان (صحابہ کرام) اس ہجرت و نصرت کا کامل نمونہ تھے۔ بعد کے مسلمانوں میں جو لوگ اس ہجرت و نصرت کے معاملہ میں اپنے پیش رووں کی تقلید کریں گے وہ بالتبع اس مقدس خدائی گروہ میں شامل ہوتے چلے جائیں گے۔ خدا کچھ لوگوں کو محروم کرتا ہے تاکہ ان کے اندر انابت کا جذبہ ابھرے۔ اسی طرح خدا کچھ لوگوں کو محرومی سے بچاتا ہے تاکہ وہ محروموں کی مدد کر کے خدا کے لئے خرچ کرنے والے بنیں۔ یہ خدا کا منصوبہ ہے۔ جو لوگ اس کا ثبوت نہ دیں۔ وہ ایسے لوگ ہیں جو خدا کے منصوبہ پر راضی نہ ہوئے اس لئے خدا بھی آخرت کے دن ان سے راضی نہ ہوگا۔

"وہ اللہ سے راضی ہو گئے" یعنی جس کو اللہ نے ایسے حالات میں اٹھایا کہ اس کو سب کچھ چھوڑنے کی قیمت پر دین کو اختیار کرنا پڑا تو وہ اس میں ثابت قدم رہا۔ اسی طرح جس کے حالات کا تقاضا یہ ہوا کہ وہ اپنے اثاثہ میں ایسے دینی بھائیوں کو شریک کرے جن سے اس کا تعلق صرف مقصد کا ہے نہ کہ رشتہ داری کا تو وہ بھی اس پر راضی ہو گیا۔ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے اللہ کی خوشی حاصل کی اور یہی وہ لوگ ہیں جو جنت کے ابدی باغوں میں داخل کئے جائیں گے۔

منافق وہ ہے جو مسلمان ہونے کا دعویٰ کرے مگر جب ہجرت اور نصرت کی قیمت پر دین دار بننے کا سوال ہو تو اس کے لئے اپنے کو راضی نہ کر سکے۔

کچھ اور لوگ ہیں جنھوں نے اپنے قصوروں کا اعتراف کرلیا ہے۔ انھوں نے ملے جلے عمل کیے تھے، کچھ بھلے اور کچھ برے۔ امید ہے کہ اللہ ان پر توجہ کرے۔ بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ تم ان کے مالوں میں سے صدقہ لو، اس سے تم ان کو پاک کروگے اور ان کا تزکیہ کروگے۔ اور تم ان کے لیے دعا کرو۔ بے شک تمھاری دعا ان کے لیے وجہ تسکین ہوگی۔ اللہ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔ کیا وہ نہیں جانتے کہ اللہ ہی اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے۔ اور وہی صدقات کو قبول کرتا ہے۔ اور اللہ توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔ کہو کہ عمل کرو، اللہ اور اس کا رسول اور اہلِ ایمان تمھارے عمل کو دیکھیں گے اور تم جلد اس کے پاس لوٹائے جاؤگے جو تمام کھلے اور چھپے کو جانتا ہے۔ وہ تم کو بتادے گا جو کچھ تم کررہے تھے۔ کچھ دوسرے لوگ ہیں جن کا معاملہ ابھی خدا کا حکم آنے تک ٹھیرا ہوا ہے، یا وہ ان کو سزا دے گا یا ان کی توبہ قبول کرے گا، اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے ۱۰۲ — ۱۰۶

کچھ ایسے لوگ ہیں جن کی طبیعتوں میں اگرچہ شر نہیں ہوتا۔ وہ معمول والے دینی اعمال بھی کرتے رہتے ہیں۔ مگر جب دین کا کوئی ایسا تقاضا سامنے آتا ہے جس میں اپنے بنے ہوئے نقشہ کو توڑ کر دین دار بننے کی ضرورت ہو تو وہ اپنی زندگی اور مال کو اس طرح دین کے لیے نہیں دے پاتے جس طرح انھیں دینا چاہئے۔ قوت فیصلہ کی کمزوری یا دنیا میں ان کی مشغولیت ان کے لئے دین کی راہ میں اپنا حصہ ادا کرنے میں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ ایسے لوگ اگرچہ قصوروار ہوتے ہیں۔ تاہم ان کا قصور اس وقت معاف کردیا جاتا ہے جب کہ یاد دہانی کے بعد وہ اپنی غلطی کا اعتراف کرلیں اور شرمندگی کے احساس کے ساتھ دوبارہ دین کی طرف لوٹ آئیں۔

اعتراف اور شرمندگی کا ثبوت یہ ہے کہ ان کے اندر از سر نو دینی خدمت کا جذبہ پیدا ہو۔ وہ اپنے احساس گناہ کو دھونے کے لئے اپنے محبوب مال کا ایک حصہ خدا کی راہ میں پیش کریں۔ جب ان کی طرف سے ایسا ردعمل ظاہر ہو تو پیغمبر کو تلقین کی گئی کہ اب انھیں ملامت نہ کرو بلکہ ان کو نفسیاتی سہارا دینے کی کوشش کرو۔ ان کو دعائیں دو تاکہ ان کے دل کا بوجھ دوبارہ ایمانی عزم و اعتماد میں تبدیل ہوجائے۔

خدا کے نزدیک اصل برائی غلطی کرنا نہیں ہے بلکہ غلطی پر قائم رہنا ہے۔ جو آدمی غلطی کرنے کے بعد اس کی تاویلیں ڈھونڈنے لگے وہ برباد ہوگیا اور جو شخص غلطی کا اعتراف کرکے اپنی اصلاح کرلے وہ خدا کے نزدیک قابل معافی ٹھیرا۔

غلطی کرنے کے بعد آدمی ہمیشہ دو امکانات کے درمیان ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ اپنی غلطی کا اعتراف کرلے۔ دوسرا یہ کہ وہ ڈھٹائی کرنے لگے، جو شخص اپنی غلطی کا اعتراف کرلے اس کے اندر تواضع پیدا ہوتی ہے۔ وہ دوبارہ خدا کی رحمتوں کا مستحق بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص ڈھٹائی کا طریقہ اختیار کرے وہ گویا خدا کے غضب کے راستہ پر چل پڑا۔ وہ اپنے کو بے خطا ثابت کرنے کے لئے جھوٹی تاویلیں کرے گا۔ ایک غلطی کو نبھانے کے لئے وہ دوسری بہت سی غلطیاں کرتا چلا جائے گا۔ پہلے شخص کے لئے خدا کی رحمت ہے اور دوسرے شخص کے لئے خدا کی سزا۔

اور ان میں ایسے بھی ہیں جنھوں نے ایک مسجد بنائی نقصان پہنچانے کے لئے اور کفر کے لئے اور اہل ایمان میں پھوٹ ڈالنے کے لئے اور اس لئے تاکہ کمین گاہ فراہم کریں اس شخص کے لئے جو پہلے سے اللہ اور اس کے رسول سے لڑ رہا ہے۔ اور یہ لوگ قسمیں کھائیں گے کہ ہم نے تو صرف بھلائی چاہی تھی اور اللہ گواہ ہے کہ وہ جھوٹے ہیں تم اس عمارت میں کبھی کھڑے نہ ہونا۔ البتہ جس مسجد کی بنیاد اول دن سے تقویٰ پر پڑی ہے وہ اس لائق ہے کہ تم اس میں کھڑے ہو۔ اس میں ایسے لوگ ہیں جو پاک رہنے کو پسند کرتے ہیں اور اللہ پاک رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ کیا وہ شخص بہتر ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد ایک کھائی کے کنارے پر رکھی جو گرنے کو ہے۔ پھر وہ عمارت اس کو لے کر جہنم کی آگ میں گر پڑی۔ اور اللہ ظالم لوگوں کو راہ نہیں دکھاتا۔ اور یہ عمارت جو انھوں نے بنائی ہمیشہ ان کے دلوں میں شک کی بنیاد بنی رہے گی بجز اس کے کہ ان کے دل ہی ٹکڑے ہو جائیں۔ اور اللہ علیم وحکیم ہے ۱۰۷ ـــ ۱۱۰

زندگی کی تعمیر کی دو بنیادیں ہیں۔ ایک تقویٰ، دوسرے ظلم۔ پہلی صورت یہ ہے کہ خدا کے ڈر کی بنیاد پر زندگی کی عمارت اٹھائی جائے۔ آدمی کی تمام سرگرمیاں جس فکر کے ماتحت چل رہی ہوں وہ فکر یہ ہو کہ اس کو اپنے تمام قول وفعل کا حساب ایک ایسی ہستی کو دینا ہے جو کھلے اور چھپے سے باخبر ہے اور ہر ایک کو اس کے حقیقی کارناموں کے مطابق جزا یا سزا دینے والا ہے۔ ایسا شخص گویا مضبوط چٹان پر اپنی عمارت کھڑی کر رہا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی اس قسم کے اندیشہ سے خالی ہو۔ وہ دنیا میں بالکل بے قید زندگی گزارے۔ وہ کسی پابندی کو قبول کئے بغیر جو چاہے بولے اور جو چاہے کرے۔ ایسے شخص کی زندگی کی مثال اس عمارت کی سی ہے جو ایسی کھائی کے کنارے اٹھا دی گئی ہو جو بس گرنے ہی والی ہو اور اچانک ایک روز اس کا مکان اپنے مکینوں سمیت گہرے کھڈ میں گر پڑے۔

جو لوگ ظلم کی بنیاد پر اپنی زندگی کی عمارت اٹھاتے ہیں ان کے جرائم میں سب سے زیادہ سخت جرم وہ ہے جس کی مثال مدینہ میں مسجد ضرار کی صورت میں سامنے آئی۔ اس وقت مدینہ میں دو مسجدیں تھیں۔ ایک آبادی کے اندر مسجد نبوی۔ دوسری مضافات میں مسجد قبا۔ منافق مسلمانوں نے اس کے توڑ پر ایک تیسری مسجد تعمیر کر لی۔ اس قسم کی کارروائی بظاہر اگرچہ دین کے نام پر ہوتی ہے مگر حقیقۃً اس کا مقصد ہوتا ہے اپنی قیادت اور پیشوائی کو قائم رکھنے کی خاطر دعوتِ حق کا مخالف بن جانا۔ جو لوگ اپنی خود پرستی کی وجہ سے دعوت حق کو قبول نہیں کر پاتے وہ اس کے خلاف محاذ بناتے ہیں، اس کے خلاف تخریبی کارروائیاں کرتے ہیں۔ ان کی منفی سرگرمیاں مسلمانوں کو دو گروہوں میں بانٹ دیتی ہیں۔ ایسے لوگ اپنے تخریبی عمل کو دین کے نام پر کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ مسلّمہ دینی شخصیتوں کو اپنے اسٹیج پر لانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ لوگوں کی نظر میں انھیں اعتماد حاصل ہو جائے۔

یہ لوگ اپنی اندھی دشمنی میں بھول جاتے ہیں کہ حق کی مخالفت دراصل خدا کی مخالفت ہے جو خدا کی دنیا میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ایسے لوگوں کے لئے جو چیز مقدر ہے وہ صرف یہ کہ وہ حسرت وافسوس کے ساتھ مریں اور اللہ کی رحمتوں سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو جائیں۔

شبہ اللہ نے مومنوں سے ان کے جان اور ان کے مال کو خرید لیا ہے جنت کے بدلے۔ وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں۔ پھر
تے ہیں اور مارے جاتے ہیں۔ یہ اللہ کے ذمہ ایک سچا وعدہ ہے، تورات میں اور انجیل میں اور قرآن میں۔ اور اللہ سے
ھ کر اپنے وعدہ کو پورا کرنے والا کون ہے۔ پس تم خوشیاں کرو اس معاملہ پر جو تم نے اللہ سے کیا ہے۔ اور یہی ہے سب
بڑی کامیابی۔ وہ توبہ کرنے والے ہیں۔ عبادت کرنے والے ہیں۔ حمد کرنے والے ہیں۔ خدا کی راہ میں پھرنے والے ہیں۔
لوع کرنے والے ہیں۔ سجدہ کرنے والے ہیں۔ بھلائی کا حکم کرنے والے ہیں۔ برائی سے روکنے والے ہیں۔ اللہ کی حدوں کا
ال رکھنے والے ہیں۔ اور مومنوں کو خوش خبری دے دو ۱۱۲ — ۱۱۱

اللہ کا مومن بننا اللہ کے ہاتھ اپنے آپ کو بیچ دینا ہے۔ بندہ اپنا مال اور اپنی زندگی اللہ کو دیتا ہے تاکہ اللہ
ں کے بدلے میں اپنی جنت اسے دے دے۔ یہ دراصل حوالگی اور سپردگی کی تعبیر ہے۔ کسی بھی چیز سے حقیقی تعلق ہمیشہ حوالگی
ر سپردگی کی سطح پر ہوتا ہے۔ تعلق کا یہی درجہ اللہ کے معاملہ میں بھی مطلوب ہے۔ جنت کی ابدی نعمتیں کسی کو کامل حوالگی
ے بغیر نہیں مل سکتیں۔

جب آدمی خدا کے دین کو اس طرح اختیار کرتا ہے تو دین کا معاملہ اس کے لئے کوئی علیحدہ معاملہ نہیں رہتا۔
لہ وہ اس کا ذاتی معاملہ بن جاتا ہے۔ اب وہی اس کی دلچسپیوں اور اس کے اندیشوں کا مرکز ہوتا ہے۔ دین اگر مال کا
قاضا کرے تو وہ اپنا مال اس کے لئے حاضر کر دیتا ہے۔ دین کے لئے اپنے وقت اور اپنی صلاحیت کو وقف کرنا پڑے
، وہ اپنے وقت اور اپنی صلاحیت کو اس کے لئے پیش کر دیتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر وہ مرحلہ آجائے جب کہ اپنے وجود کو مٹا کر
مال سے بے مال ہونے کا خطرہ مول لے کر دین میں اپنا حصہ ادا کرنا ہو تو اس سے بھی وہ دریغ نہیں کرتا۔

جو لوگ اس طرح اپنے کو اللہ کے حوالے کریں ان کے اندر کس قسم کے انفرادی اوصاف پیدا ہوتے ہیں۔
ن کی حساسیت اتنی بیدار ہو جاتی ہے کہ غلطی ہوتے ہی وہ اس کو جان لیتے ہیں اور فوراً اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتے
یں۔ وہ اللہ کے لئے بچھ جانے والے ہوتے ہیں۔ وہ خدا کی عظمتوں کو اس طرح پا لیتے ہیں کہ ان کے قلب اور زبان
سے بے اختیار اس کا اظہار ہونے لگتا ہے۔ وہ سائح ہو جاتے ہیں، یعنی انسانی دنیا سے نکل کر خدائی دنیا میں جانا
ن کے لئے زیادہ سکون کا باعث ہوتا ہے۔ خدا کے آگے جھکنا ان کے لئے محبوب چیز بن جاتا ہے۔ جو بھی ان کے ربط
ں آتا ہے اس کو بھلائی کے راستہ پر ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اپنے سامنے کسی کو برائی کرتے دیکھتے ہیں تو
ں کو روکنے کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ خدا کی حد بندیوں کے معاملہ میں حد درجہ چوکنا ہو جاتے ہیں، وہ
دود اللہ کے اس طرح نگہبان بن جاتے ہیں جس طرح باغبان اپنے باغ کا ——— یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے
خدائی انعامات کی خوش خبری ہے۔

خدا کی جنت تمام قیمتی چیزوں سے زیادہ قیمتی ہے۔ مگر خدا کی جنت ایک موعود انعام ہے، وہ نقد انعام نہیں۔
نت کی اسی موجل نوعیت کا یہ نتیجہ ہے کہ لوگ جنت کو چھوڑ کر حقیر فائدوں کی طرف بھاگے جا رہے ہیں۔

نبی کو اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں روا نہیں کہ مشرکوں کے لئے مغفرت کی دعا کریں، چاہے وہ ان کے رشتہ دار ہی ہوں جب کہ ان پر کھل چکا کہ یہ جہنم میں جانے والے لوگ ہیں۔ اور ابراہیم کا اپنے باپ کے لئے مغفرت کی دعا مانگنا صرف اس وعدہ کے سبب سے تھا جو اس نے اس سے کر لیا تھا۔ پھر جب اس پر کھل گیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو وہ اس سے بے تعلق ہو گیا۔ بے شک ابراہیم بڑا نرم دل اور بردبار تھا۔ اور اللہ کسی قوم کو، اس کو ہدایت دینے کے بعد گمراہ نہیں کرتا جب تک ان کو صاف صاف وہ چیزیں بتا نہ دے جن سے انھیں بچنا ہے، بے شک اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ اللہ ہی کی سلطنت ہے آسمانوں میں اور زمین میں، وہ جلاتا ہے اور وہی مارتا ہے۔ اور اللہ کے سوا نہ تمھارا کوئی دوست ہے اور نہ مددگار ۱۱۶ — ۱۱۳

ایک شخص کا فرد مشرک ہو اور اس کے سامنے اتمام حجت کی حد تک دین کی دعوت آجائے، اس کے باوجود وہ ایمان نہ لائے تو خدا کے قانون کے مطابق وہ جہنمی ہو جاتا ہے۔ ایسے شخص کے لئے اس کے بعد نجات کی دعا کرنا گویا ایمان کو بے وقعت بنانا اور خدائی انصاف کی تردید کرنا ہے، یہی وجہ ہے کہ ایسی دعا سے منع کر دیا گیا۔

تاہم آیت میں مِن بَعدِ مَا تَبَیَّنَ کا لفظ بتاتا ہے کہ اس حکم کا تعلق زمانہ رسالت کے مشرکین سے ہے جن کے بارے وحی کے ذریعہ بتا دیا گیا تھا کہ وہ جہنمی ہیں۔ ان آیات کا پس منظر یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ آپ منافقین کی نماز جنازہ نہ پڑھیں اور ان کے حق میں مغفرت کی دعا نہ کریں (التوبہ ۸۴) یہ بات مدینہ کے منافقوں کو بہت ناگوار ہوئی۔ انھوں نے اس کو لے کر آپ کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ وہ کہتے کہ یہ نبی تو نبی رحمت ہیں اور اپنے کو ابراہیم کا پیرو بتاتے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنے بھائیوں اور اپنے رشتہ داروں کے لئے استغفار سے روکتے ہیں۔ حالاں کہ ابراہیم کا حال یہ تھا کہ اپنے مشرک باپ کے لئے بھی انھوں نے مغفرت کی دعا کی۔

جواب دیا گیا کہ ابراہیم بڑے دردمند اور انسانیت کے غم میں گھلنے والے تھے۔ اپنے اس جذبہ کے تحت انھوں نے عہد کر لیا کہ وہ اپنے مشرک باپ کے حق میں خدا سے دعا کریں گے۔ مگر جب وحی نے تنبیہ کی تو اس کے بعد وہ فوراً اس سے باز آگئے۔

اللہ نے ہر آدمی کے اندر برائی کی فطری تمیز رکھی ہے۔ جب آدمی کے سامنے ایک ایسا پیغام آتا ہے جو اس کو برائی سے روکتا ہے تو اس کا وجود اندر سے اس کی تصدیق کرتا ہے۔ اس کے دل کے اندر ایک خاموش کھٹک پیدا ہوتی ہے۔ آدمی اگر اس کھٹک کو نظر انداز کر دے، وہ فطرت کی گواہی کے باوجود بچنے والی چیز سے نہ بچے تو اس کی فطری حساسیت کمزور پڑ جاتی ہے، یہاں تک کہ دھیرے دھیرے بالکل مردہ ہو جاتی ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو گمراہ کرنے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ "ہدایت دینے کے بعد گمراہ کرنا" کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ اس کا خطرہ مسلمانوں کے لئے بھی اسی طرح ہے جس طرح غیر مسلموں کے لئے۔

اللہ نے نبی پر اور مہاجرین و انصار پر توجہ فرمائی جنھوں نے تنگی کے وقت میں نبی کا ساتھ دیا، بعد اس کے کہ ان میں سے کچھ لوگوں کے دل کجی کی طرف مائل ہو چکے تھے۔ پھر اللہ نے ان پر توجہ فرمائی۔ بے شک اللہ ان پر مہربان ہے رحم کرنے والا ہے۔ اور ان تینوں پر بھی اس نے توجہ فرمائی جن کا معاملہ اٹھا رکھا گیا تھا۔ یہاں تک کہ جب زمین اپنی وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہوگئی اور وہ خود اپنی جانوں سے تنگ آگئے اور انھوں نے سمجھ لیا کہ اللہ سے بچنے کے لئے خود اللہ کے سوا کوئی جائے پناہ نہیں۔ پھر اللہ ان کی طرف پلٹا تاکہ وہ اس کی طرف پلٹ آئیں۔ بے شک اللہ توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔ ۱۱۷ - ۱۸

غزوۂ تبوک کے موقع پر ایک گروہ وہ نکلا جس نے اپنا بہترین اثاثہ اسلام کے حوالے کر دیا۔ ان کی فصل کٹنے کے لئے تیار تھی مگر وہ اس کو چھوڑ کر ایک ایسے سفر پر روانہ ہو گئے جس میں سخت گرمی کے تین سو میل طے کر کے وقت کی سب سے بڑی طاقت و رسلطنت کا مقابلہ کرنا تھا۔ سامان کی کمی کا یہ حال تھا کہ ایک ایک اونٹ پر کئی کئی آدمیوں کی باری لگی ہوئی تھی۔ کھانے کے لئے بعض اوقات صرف ایک کھجور ایک آدمی کے حصہ میں آتی تھی۔ تاہم یہ انتہائی سخت مرحلہ صرف ارادوں کے امتحان کے لئے سامنے لایا گیا تھا۔ جب ارادہ کرنے والوں نے ارادہ کا ثبوت دے دیا تو خدا نے دشمن کے اوپر رعب طاری کر دیا۔ وہ مقابلہ کے میدان سے ہٹ گئے اور مسلمان خون بہائے بغیر کامیاب و کامراں ہو کر واپس آگئے۔

دوسرا طبقہ معترفین (التوبہ ۱۰۲) کا تھا۔ یہ لوگ اپنے دنیوی مشاغل کی وجہ سے سفر پر روانہ نہ ہو سکے۔ تاہم فوراً ہی بعد ان کو محسوس ہوگیا کہ انھوں نے غلطی کی ہے۔ ان کے اندر اعتراف اور شرمندگی کی آگ بھڑک اٹھی۔ ان کے آنسوؤں کی کثرت نے ان کے عمل کی کمی کی تلافی کر دی۔ خدا نے ان کو بھی اپنی رحمتوں کے سایہ میں جگہ دے دی۔ کیونکہ انھوں نے عاجزانہ طور پر اپنی غلطی کو مان لیا تھا۔

تیسرا گروہ مخلفین (۱۱۸) کا تھا۔ یہ تین نوجوان کعب بن مالک، مرارۃ بن ربیع، ہلال بن امیۃ تھے۔ وہ اگرچہ سفر پر نہ نکلنے کو اپنی کوتاہی سمجھتے تھے مگر ان کے اندر توبہ و انابت کا اتنا شدید احساس پہلے مرحلہ میں نہیں ابھرا تھا جو مطلوبہ معیار کے مطابق ہو۔ چنانچہ ان کے ساتھ معاشرتی بائیکاٹ کا معاملہ کیا گیا۔ یہ لوگ اس مقاطعہ کے باوجود مطمئن رہ سکتے تھے۔ وہ اپنے گھر اور اپنے باغوں میں مشغول ہو جاتے۔ وہ بر ہمی اور ناوفاداری کے راستوں پر چلنا شروع کر دیتے۔ وہ ناراض عناصر کے ساتھ مل کر اپنی علیحدہ جمعیت بنا لیتے۔ وہ عام مسلمانوں سے الگ اپنا ایک جزیرہ بنا کر اس کے اندر اپنی خوشیوں کی دنیا بسا سکتے تھے۔ مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ خدا اور رسول سے دوری کے احساس نے ان کو اس قدر پریشان کر دیا کہ نہ باہر ان کے لئے سکون کی کوئی جگہ نظر آئی اور نہ اپنے دل کے اندر ان کے لئے سکون کا کوئی گوشہ باقی رہا۔ بالفاظ دیگر ان کی پریشانی اختیارانہ تھی نہ کہ مجبورانہ۔ ان کی اس روش کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا دل پگھل اٹھا۔ ۵۰ دن میں وہ توبہ و انابت کے مطلوبہ معیار پر پہنچ گئے۔ اس کے بعد انھیں بھی معاف کر دیا گیا۔

اے ایمان والو، اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کے ساتھ رہو۔ مدینہ والوں اور اطراف کے بدویوں کے لئے زیبا نہ تھا کہ وہ اللہ کے رسول کو چھوڑ کر پیچھے بیٹھ رہیں اور نہ یہ کہ اپنی جان کو اس کی جان سے عزیز رکھیں۔ یہ اس لئے کہ جو پیاس اور تھکان اور بھوک بھی ان کو خدا کی راہ میں لاحق ہوتی ہے اور جو قدم بھی وہ کافروں کو رنج پہنچانے والا اٹھاتے ہیں اور جو چیز بھی وہ دشمن سے چھینتے ہیں ان کے بدلے میں ان کے لئے ایک نیکی لکھ دی جاتی ہے۔ اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔ اور جو چھوٹا یا بڑا خرچ انھوں نے کیا اور جو میدان انھوں نے طے کئے وہ سب ان کے لئے لکھا گیا تاکہ اللہ ان کے عمل کا اچھے سے اچھا بدلہ دے ۱۱۹ - ۲۱

انسانی زندگی اجتماعی زندگی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر آدمی کا اپنے ذوق اور رجحان کے اعتبار سے ایک حلقہ بن جاتا ہے جس میں وہ اپنے روز و شب گزارتا ہے۔ جو لوگ اللہ سے ڈرنے والے ہوں اور ایمان کے راستہ پر چلنا چاہیں ان کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنی صحبتوں اور ملاقاتوں کے لئے ان لوگوں کو چنیں جو سچے لوگ ہوں۔ یعنی جن کے دل کا خوفِ خدا ان کی زندگی کی روش بن گیا ہو۔ جن کے قول اور عمل کے درمیان مطابقت پائی جاتی ہو۔ سچوں کے ساتھ رہ کر آدمی سچا بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ جھوٹوں کا ساتھ پکڑے تو بالآخر وہ خود بھی جھوٹا بن جائے گا۔

آدمی کے سامنے ایسے مواقع آتے ہیں جب کہ جان کو خطرہ میں ڈال کر اسلام کی خدمت کرنے کا سوال ہو۔ جب بھوک پیاس کا مقابلہ کرکے اسلام کے لئے اپنا حصہ ادا کرنا ہو۔ جب اپنے کو تھکا کر خدا کی راہ میں آگے بڑھنا ہو۔ جب دشمنوں کا خطرہ مول لے کر اپنے کو اسلام کی صف میں شامل کرنا ہو۔ جب اپنی پرسکون زندگی کو برہم کرکے خدا اور رسول کا ساتھ دینا ہو۔ ایسے مواقع پر آدمی احتیاط اور بچاؤ کا طریقہ اختیار کرکے پیچھے بیٹھ جانے کو پسند کرتا ہے۔ وہ بھول جاتا ہے کہ یہی تو وہ مواقع ہیں جب کہ وہ خدا کے ساتھ اپنے تعلق کا عملی ثبوت پیش کرسکتا ہے۔ جب کہ وہ جنت کے لئے اپنی امیدواری کو خدا کی نظر میں قابلِ قبول ثابت کرسکتا ہے۔

غزوۂ تبوک کے موقع پر پیچھے رہنے والوں میں ایک ابوخیثمہ انصاری بھی تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روانگی کے بعد وہ اپنے باغ میں گئے۔ وہاں خوش گوار سایہ تھا، بیوی نے پانی چھڑک کر زمین کو ٹھنڈا کیا، چٹائی کا فرش بچھایا، تازہ کھجور کے خوشے لاکر سامنے رکھے اور ٹھنڈا پانی پینے کے لئے پیش کیا۔ ابوخیثمہ دنیوی آسانیوں ہی کی خاطر تبوک کے سفر پر نہ جاسکے تھے۔ مگر جب جانے والے اور رہنے والے کے درمیان فرق اس انتہائی نوبت کو پہنچ گیا جو اب ان کے سامنے تھا تو ابوخیثمہ اس کو برداشت نہ کرسکے۔ انھوں نے کہا "میں یہاں باغ کے سایہ میں ہوں اور خدا کے بندے لو اور گرمی میں کوہ و بیابان طے کر رہے ہیں" انھوں نے تلوار سنبھالی اور تیز رفتار اونٹنی پر سوار ہوکر اسی وقت روانہ ہوگئے۔ یہاں تک کہ گرد و غبار میں اٹے ہوئے قافلۂ تبوک سے جا ملے۔

اور یہ ممکن نہ تھا کہ اہل ایمان سب کے سب نکل کھڑے ہوں۔ تو ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کے ہر گروہ میں سے ایک حصہ نکل کر آتا تاکہ وہ دین میں سمجھ پیدا کرتا اور واپس جاکر اپنی قوم کے لوگوں کو آگاہ کرتا تاکہ وہ بھی پرہیز کرنے والے بنتے ۱۲۲

قرآن کی یہ آیت ایک اعتبار سے زیر بحث صورت حال سے متعلق ہے اور دوسرے اعتبار سے وہ ایک کلی حکم کو بتا رہی ہے۔ ایک طرف وہ بتاتی ہے کہ مدینہ کے اطراف میں بسنے والے دیہاتیوں کی تعلیم و تربیت کس طرح کی جائے۔ دوسری طرف اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا تعلیمی نظام اور نئی نسلوں کے لئے اس کا تربیتی ڈھانچہ کن اصولی بنیادوں پر قائم ہونا چاہئے۔

تعلیم ایک ایسا کام ہے جس میں آدمی کو دوسری مشغولیتوں سے فارغ ہوکر شامل ہونا پڑتا ہے۔ اب اگر سارے لوگ بیک وقت تعلیمی کام میں لگ جائیں تو زندگی کی دوسری سرگرمیاں، مثلاً حصول معاش کی کوششیں، متاثر ہوجائیں گی۔ اسلام کا یہ طریقہ نہیں کہ ایک کام کو بگاڑ کر دوسرا کام انجام دیا جائے، اس لئے حکم دیا گیا کہ باری باری کا اصول مقرر کرو۔ کچھ لوگ تعلیم کے مرکز میں آئیں تو کچھ اور لوگ دوسری سرگرمیوں کو انجام دینے میں لگے رہیں۔ اس طرح دونوں کام بیک وقت انجام پاتے رہیں گے۔

اس آیت میں اسلامی تعلیم کے لئے تفقہ فی الدین کا لفظ آیا ہے۔ اس سے مراد معروف فقہی تعلیم نہیں ہے جو شکل دین (بمقابلہ روح دین) کے تفصیلی علم کا نام ہے اور جس کے نتیجہ میں دین کا علم مسائل کے علم کے ہم معنی بن گیا ہے۔ یہاں تفقہ فی الدین کا مطلب خدا کے اتارے ہوئے اساسی دین کو جاننا اور اس میں سمجھ حاصل کرنا ہے۔ اس سے مراد وہ علم ہے جو حق شناسی پیدا کرے، جو بنیادی حقیقتوں سے آدمی کو باخبر کرے اور آخرت کی بنیادوں پر زندگی کی تعمیر کرنا سکھائے۔

آیت میں تفقہ فی الدین (تعلیم دین) کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ آدمی قوم کے اوپر انذار کا کام کرنے کے قابل ہوسکے۔ انذار کے معنی ہیں ڈرانا۔ قرآن میں یہ لفظ آخرت کے مسئلہ سے ڈرانے اور ہوشیار کرنے کے لئے آیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی تعلیم سے ایسے افراد تیار ہوں جو قوموں کے اوپر خدا کی طرف سے منذر بن کر کھڑے ہوسکیں۔ تاکہ لوگ خدا سے ڈریں اور دنیا کی زندگی میں اس روش سے بچیں جو انھیں آخرت کے ابدی عذاب کی طرف لے جانے والی ہو۔ اسلامی تعلیم دعوت الی اللہ کی تعلیم کا نام ہے نہ کہ معروف معنوں میں صرف مسائل فقہ یا جزئیات شرع کی تعلیم کا۔

اس اعتبار سے اسلامی تعلیم کا نصاب دو خاص چیزوں پر مشتمل ہونا چاہئے:

۱۔ قرآن و سنت

۲۔ وہ علوم جو مدعو کی نسبت سے ضروری ہوں۔ مثلاً مخاطب کی زبان، اس کے طرز فکر اور اس کی نفسیات، وغیرہ

اے ایمان والو، ان کافروں سے جنگ کرو جو تمھارے آس پاس ہیں اور چاہئے کہ وہ تمھارے اندر سختی پائیں اور جان لو کہ اللہ ڈرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اور جب کوئی سورہ اترتی ہے تو ان میں سے بعض کہتے ہیں کہ اس نے تم میں سے کس کا ایمان زیادہ کردیا۔ پس جو ایمان والے ہیں ان کا اس نے ایمان زیادہ کردیا اور وہ خوش ہو رہے ہیں۔ اور جن لوگوں کے دلوں میں روگ ہے تو اس نے بڑھا دی ان کی گندگی پر گندگی۔ اور وہ مرنے تک کافر ہی رہے۔ کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں کہ وہ ہر سال ایک بار یا دو بار آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں، پھر بھی نہ توبہ کرتے ہیں اور نہ سبق حاصل کرتے ہیں۔ اور جب کوئی سورہ اتاری جاتی ہے تو یہ لوگ ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں کہ کوئی دیکھتا تو نہیں، پھر چل دیتے ہیں۔ اللہ نے ان کے دلوں کو پھیر دیا اس وجہ سے کہ یہ سمجھ سے کام لینے والے لوگ نہیں ہیں ۱۲۳-۲۷

"قریب کے منکروں سے جنگ کرو" کے الفاظ بتاتے ہیں کہ اسلامی جد و جہد کوئی بے منصوبہ جد و جہد نہیں ہے بلکہ اس میں ترتیب کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ پہلے قریب کی رکاوٹوں پر قابو پانے کی کوشش کی جائے گی اور اس کے بعد دور کی رکاوٹوں سے نپٹا جائے گا۔ اسی سے یہ بات بھی نکلی کہ سب سے پہلا مجاہدہ خود اپنے نفس سے کیا جانا چاہئے۔ کیونکہ آدمی کے سب سے قریب اس کا اپنا نفس ہوتا ہے۔ باہر کے دشمنوں کی باری اس کے بعد آتی ہے۔ پھر اسلام دشمنوں سے بھی اولاً جو چیز مطلوب ہے وہ سختی (غلظہ) ہے یعنی وہ مضبوطی جو دشمنوں کے لئے رعب کا باعث بن جائے (اذ کان ذلک یوقع المهابة لنا فی صدورھم والرعب فی قلوبھم (تفسیر جصاص)

اسی کے ساتھ ضروری ہے کہ دشمنوں سے مقابلہ کی ساری کارروائی تقویٰ کی بنیاد پر کی جائے۔ تقویٰ (خوف خدا) کی روش ہی مسلمانوں کے لئے نصرت خداوندی کی ضامن ہے۔ تقویٰ سے ہٹتے ہی وہ خدا کی مدد سے محروم ہو جائیں گے۔

قرآن نے اپنی یہ خصوصیت بیان کی ہے کہ اس کی آیتوں کو سن کر مومنین کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔ مگر اضافہ ایمان کا تعلق آدمی کی اپنی قلبی صلاحیت پر ہے نہ کہ صرف آیتوں کے سن لینے پر۔ ڈیڑھ ہزار سال پہلے جب قرآن اترا تو اس کے الفاظ ابھی صرف الفاظ تھے، وہ تاریخی واقعہ نہیں بنے تھے۔ اس وقت قرآن کی اہمیت کو صرف وہی لوگ سمجھ سکتے تھے جو حقیقت کو اس کی مجرد صورت میں دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ ظاہر پرست منافقین کے اندر یہ صلاحیت نہ تھی۔ ان کو قرآن کے الفاظ صرف الفاظ معلوم ہوتے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ چند الفاظ کا مجموعہ کسی کے یقین و اعتماد میں اضافہ کا سبب کیسے بن جائے گا۔ چنانچہ جب کوئی نئی آیت اترتی تو وہ یہ کہہ کر مذاق اڑاتے کہ عربی کے ان الفاظ نے تم میں سے کس کے ایمان میں اضافہ کیا۔

خدا ایسے لوگوں کو بار بار مختلف قسم کے جھٹکے دیتا ہے تاکہ ان کے دل کی حساسیت بڑھے اور وہ باتوں کو زیادہ گہرائی کے ساتھ پکڑنے کے قابل ہو جائیں۔ مگر جب آدمی خود نصیحت نہ لینا چاہے تو کوئی خارجی چیز اس کی نصیحت کے لئے کافی نہیں ہو سکتی۔ نصیحت لینے والی کوئی بات سامنے آئے اور آدمی اس کو نظر انداز کر دے تو اس کا یہ عمل اس کو نصیحت کے معاملہ میں بے حس بنا دیتا ہے۔

تمھارے پاس ایک رسول آیا ہے جو خود تم میں سے ہے۔ تمھارا نقصان میں پڑنا اس پر شاق ہے۔ وہ تمھاری بھلائی کا حریص ہے۔ ایمان والوں پر نہایت شفیق اور مہربان ہے۔ پھر بھی اگر وہ منھ پھیریں تو کہہ دو کہ اللہ میرے لئے کافی ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اسی پر میں نے بھروسہ کیا۔ اور وہی مالک ہے عرش عظیم کا ۱۲۸ — ۱۲۹

اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تصویر بتائی گئی ہے کہ اسلام کی جدوجہد میں ان کا سارا اعتماد صرف ایک اللہ پر ہے۔ وہ لوگوں کو جس خدا کی طرف بلانے کے لئے اٹھے ہیں وہ ایسا خدا ہے جو سارے اقتدار کا مالک ہے۔ تمام خزانوں کی کنجیاں اس کے پاس ہیں۔ رسول اسی ایمان ویقین کی زمین پر کھڑا ہوا ہے۔ اس لئے بالکل فطری ہے کہ اس کا سارا بھروسہ صرف ایک خدا پر ہو۔ وہ ہر قسم کی مصلحتوں اور اندیشوں سے بے پروا ہو کر حق کی خدمت میں لگا رہے۔

پھر یہ بتایا کہ خدا کا رسول لوگوں کے حق میں حد درجہ شفیق اور مہربان ہے۔ وہ دوسروں کی تکلیفوں پر اس طرح کڑھتا ہے جیسے کہ وہ تکلیف خود اس کے اوپر پڑی ہو۔ وہ حرص کی حد تک لوگوں کی ہدایت کا طالب ہے۔ دعوتِ حق کی جدوجہد کے لئے اس کو جس چیز نے متحرک کیا ہے وہ سراسر خیر خواہی کا جذبہ ہے نہ کہ کوئی شخصی حوصلہ یا قومی مسئلہ۔
امام احمد نے عبداللہ بن مسعود سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: لوگ پروانوں کی طرح آگ میں گر رہے ہیں اور میں ان کی کمر پکڑ کر ان کو آگ میں گرنے سے روک رہا ہوں (الا وانی آخذ بحجزکم ان تهافتوا فی النار کتهافت الفراش والذباب)

رسول کی اس تصویر کی شکل میں حق کے داعی کی تصویر ہمیشہ کے لئے بتا دی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے داعی کے اندر دو خاص صفات نمایاں طور پر ہونی چاہئیں۔ ایک یہ کہ اس کا بھروسہ صرف ایک اللہ پر ہو۔ دوسرے یہ کہ مدعو کے لئے اس کے دل میں صرف محبت اور خیر خواہی کا جذبہ ہو، اس کے سوا اور کچھ نہ ہو۔ اگرچہ مدعو کی طرف سے طرح طرح کی شکایتیں پیش آتی ہیں۔ اس کے اور داعی کے درمیان قومی اور مادی جھگڑے بھی ہو سکتے ہیں۔ ان سب کے باوجود یہ مطلوب ہے کہ داعی ان تمام چیزوں کو نظر انداز کرے اور مدعو کے لئے رحمت و رأفت کے سوا کوئی اور جذبہ اپنے اندر پیدا نہ ہونے دے۔

ابتداء اسلام میں جن لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیا ان کے لئے آپ کا ساتھ دینا اپنی بنی بنائی زندگی کو اجاڑ دینے کے ہم معنی بن گیا۔ اس سے کچھ لوگوں کے اندر یہ خیال پیدا ہوا کہ رسول ہمارے لئے مصیبت بن کر آیا ہے۔ مگر یہ وہی بات ہے جو عین مطلوب ہے۔ حق کی دعوت اسی لئے اٹھتی ہے کہ لوگوں کو بتایا جائے کہ ان کی قوتوں اور صلاحیتوں کا مصرف آخرت کی دنیا ہے نہ کہ موجودہ دنیا۔ اس لئے اگر رسول کا لایا ہوا دین اختیار کرنے میں دنیوی نقشہ بگڑتا ہوا نظر آئے تو اس پر آدمی کو مطمئن رہنا چاہئے۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی متاع کو خدا نے آخرت کے لئے قبول کر لیا۔

غلبۂ اسلام

اسلام کی نشأۃ ثانیہ کا سوال آج ساری دنیا کے مسلمانوں میں سب سے زیادہ ابھرا ہوا سوال ہے۔ مگر اس سلسلے میں ان کی کوششوں کو دیکھتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض اسباب سے ان کے اندر عظمت ماضی کو دوبارہ واپس لانے کی ایک مجہول خواہش تو ضرور پیدا ہوگئی ہے مگر ماضی کی تاریخ کو حال کا واقعہ بنانے کے لئے جو ضروری عمل درکار ہے اس کا واضح شعور انھیں حاصل نہیں۔

ایک طبقہ یہ سمجھتا ہے کہ مسلمانوں کو فضائل اسلام کی طلسماتی کہانیاں سنا کر مسجدوں کی آبادی میں اضافہ کرو، اور اس کے بعد ساری دنیا اپنے آپ تمھاری ہو جائے گی۔ مگر یہ حل ایسا ہی ہے جیسے ٹونے ٹوٹکے کے ذریعہ ہمالیہ پہاڑ کو اپنی جگہ سے کھسکانے کی امید قائم کرلی جائے۔ دوسرا طبقہ پر جوش تقریریں کرنے اور شاعرانہ الفاظ بولنے کو مسئلہ کا حل سمجھتا ہے۔ وہ بھول گیا ہے کہ خدا کی دنیا محکم قوانین کی دنیا ہے۔ یہاں لفظوں کا کمال دکھا کر کسی واقعہ کو ظہور میں نہیں لایا جا سکتا۔ ایک اور طبقہ اس انقلابی غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ اپنے کسی بادشاہ کو تخت سے اتار کر یا اپنے کسی حکمراں کو پھانسی پر چڑھا کر وہ اسلام کی عظمت رفتہ کو واپس لانے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ اس کو معلوم نہیں کہ یہ مسئلہ عالمی طاقتوں کو زیر کرنے کا مسئلہ ہے نہ کہ قوم کے کچھ افراد کو اسلام دشمنی کی "علامت" ٹھہرا کر ان کو کسی نہ کسی تدبیر سے ہلاک کر دینے کا۔

تبدیلی اقتدار کا قانون

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ حکومت کا مالک اللہ ہے۔ وہی جس کو چاہتا ہے حکومت عطا کرتا ہے (آل عمران ۲۶) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں کسی گروہ کا غلبہ واقتدار حاصل کرنا کوئی سادہ واقعہ نہیں ہے۔ یہ براہ راست خدا کے فیصلہ کے تحت ہوتا ہے۔ ایک گروہ کا غلبہ ہمیشہ دوسرے گروہ کی مغلوبیت کی قیمت پر ہوتا ہے۔ ایسے ایک واقعہ کے ظہور کے لئے خارجی دنیا میں ایسی وسیع تر تبدیلیوں کا پیش آنا ضروری ہے جو ایک گروہ کے حق میں حالات کو موافق کر دیں اور دوسرے گروہ کے حق میں اس کو مخالف بنا دیں۔

اجتماعی زندگی میں اس قسم کا غیر معمولی تغیر ہمیشہ مافوق اسباب کے تحت ہوتا ہے۔ انقلاب خواہ اسلامی ہو یا غیر اسلامی، ہمیشہ ان اسباب کے زیر اثر آتا ہے جو کبھی کسی شخص یا جماعت کے اپنے اختیار میں نہیں ہوتے۔ روس کا اشتراکی انقلاب (۱۹۱۷) پہلی جنگ عظیم کے پیدا کردہ ہنگامی حالات کے بطن سے نکلا۔ موجودہ صدی کے وسط میں ایشیا اور افریقہ کے ملکوں کی مغربی استعمار سے آزادی دوسری جنگ

عظیم کے پیدا کیے ہوئے ہنگامی حالات کے اندر سے برآمد ہوئی۔ جب کہ اس قسم کی عالمی جنگ کو برپا کرنا نہ اشتراکی تحریک کے اختیار میں تھا اور نہ وطنی آزادی کی تحریک کے اختیار میں۔ اسی طرح دور اول میں مسلمانوں کی تیز فتوحات کا خاص سبب یہ تھا کہ ایران و روم کی سلطنتیں عین اسی زمانہ میں لمبی لڑائیاں لڑ کر بالکل کمزور ہو چکی تھیں۔ اور ظاہر ہے کہ وقت کی دو سب سے بڑی طاقتوں کے درمیان اس قسم کی تباہ کن جنگ چھیڑنا صرف خدا کے اختیار میں تھا نہ کہ کسی انسان کے اختیار میں۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ عام قوموں کے درمیان سیاسی تبدیلیاں خدا کے قانون دفع (البقرہ ۲۵۱) کے تحت ظہور میں آتی ہیں۔ یعنی ایک ظالم اور مفسد کی سیاسی اجارہ داری کو ختم کرنے کے لئے اس کی جگہ کسی دوسرے کو لے آنا۔ ایک گروہ کے ذریعہ کسی دوسرے گروہ کو ہٹا دینا۔ بالفاظ دیگر، عام سیاسی تبدیلیاں زیادہ تر سلبی مقصد کے تحت ہوتی ہیں۔ مگر جہاں تک اسلامی انقلاب کا تعلق ہے وہ ایجابی مقصد کے تحت وقوع میں آتا ہے۔ اسلامی انقلاب اس لئے برپا کیا جاتا ہے کہ اللہ اپنے ان خاص بندوں پر احسان کرے جنھوں نے خدا کے مطلوبہ معیار کے مطابق اپنے شعور اور اپنے کردار میں صالحیت کا ثبوت دے دیا ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا (النور ۵۵)

تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کئے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ ان کو زمین میں حکومت عطا کرے گا جیسا کہ ان لوگوں کو حکومت دی جو ان سے پہلے گزرے۔ اور ان کے دین کو جما دے گا جس کو ان کے لئے پسند کیا ہے اور ان کی خوف کی حالت کو امن سے بدل دے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی نشأۃ ثانیہ کا مسئلہ اس سے کہیں زیادہ بڑا ہے کہ وہ عام طرز کی سیاسی یا غیر سیاسی تدبیروں سے وقوع میں آجائے۔ یہ کفر و شرک کی عالمی بالادستی کو ختم کرنے کا مسئلہ ہے۔ یہ غالب تہذیب کو مغلوب کرنے اور مغلوب تہذیب کو دوبارہ غلبہ کا مقام دینے کا مسئلہ ہے۔ یہ ایک تاریخی دور کو ختم کر کے دوسرا تاریخی دور واپس لانے کا مسئلہ ہے۔ مختصر الفاظ میں، یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے حل کے لئے خدائی طاقتوں کی کارفرمائی درکار ہے۔

اس کے لئے ضرورت ہے کہ ایک طوفان نوح برپا ہو جس میں شیطان کی تمام نسل غرق ہو کر رہ جائے۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ معجزۂ موسوی ظاہر ہو جو فرعون اور اس کے ساتھیوں کو سمندر کی موجوں کے حوالے کر دے۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ خدا کے فرشتے آسمان سے اتریں اور "بدر" کے میدان میں وقت کے تمام بڑوں کو جمع کر کے انھیں مسلمانوں کے قبضہ میں دے دیں۔ یہ واقعہ خدائی مدد سے ظہور میں آنے والا واقعہ ہے۔

مسلمان صرف اپنی محدود کوششوں سے اس کو بروئے کار نہیں لاسکتے۔

اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کا قافلہ اپنے ہی قدموں پر چل کر آگے بڑھے گا مگر اس میں بھی شک نہیں کہ اس کے لئے زینہ خدا کی طرف سے فراہم ہوگا جس سے چھلانگ لگا کر وہ اپنی منزل تک پہنچ جائیں۔ حالات میں اس قسم کی غیر معمولی تبدیلی کسی انسان کے بس میں نہیں ہے۔ اس کا اہتمام ہمیشہ کائنات کے رب کی طرف سے ہوتا ہے۔

آج مسلمان جس مغلوبیت کی حالت میں ہیں اس سے نکلنے کی سبیل محض معمول کی تحریکی کوششوں میں نہیں ہے بلکہ غیر معمولی حالات کے ظہور میں ہے۔ ہمارے حوصلوں کی کامیابی کا امکان صرف اس وقت ہوسکتا ہے جب کہ خدائی مداخلت ہماری جد وجہد کو ہمارے لئے سازگار بنا دے۔ جب زمین و آسمان کا مالک اپنی مافوق قوتوں سے سیاسی اور تمدنی چٹانوں میں ایسے درے پیدا کر دے جن سے نفوذ کر کے ہم آگے جاسکتے ہوں۔ وہ ایسی موافق آندھیاں چلائے جس سے ایک طرف مخالف کیمپ کی طنابیں اکھڑیں اور دوسری طرف ملت اسلامیہ کی راہ ہموار ہوتی ہو۔ وہ ایسی بارش برسائے جو ایک کے لئے کیچڑ اور دلدل بنے اور دوسرے کے لئے سیرابی اور تازگی کا سامان پیدا کرے۔ وہ ایسا زلزلہ برپا کرے جس سے بلندیاں پست ہوجائیں اور پستیاں ابھر کر اوپر آجائیں۔ وہ مقابلہ کے وقت ایک فریق کے اوپر رعب اور دوسرے فریق کے اوپر اَمَنَۃً نازل کرے۔ جب تک اس قسم کی غیر معمولی آسمانی مدد ہمارا ساتھ نہ دے، محض سیاسی کارروائیاں یا جلسہ جلوس ہم کو کامیابی کی منزل تک نہیں پہنچا سکتے۔ دور اول کا اسلامی قافلہ بھی اسی قسم کی خداوندی نصرت سے کامیاب ہوا تھا اور آج بھی وہ کامیاب ہوگا تو اسی قسم کی نصرتوں سے کامیاب ہوگا

غلبہ کا ذریعہ دعوت الی اللہ

خدا کی اس برتر نصرت کا مستحق بننے کے لئے کسی مومن گروہ کو جس اہلیت کا ثبوت دینا ہے وہ ذاتی اصلاح کے بعد دعوت ہے۔ مومنین کے گروہ کے لئے خدا نے جس اجتماعی نصرت کا وعدہ کیا ہے وہ تمام تر اس پر موقوف ہے کہ وہ حقیقی معنوں میں صاحب ایمان ہو، اور پھر داعی الی اللہ ہونے کا ثبوت دے۔ موجودہ دنیا میں اہل ایمان کی اصل ذمہ داری شہادت علی الناس (حج) ہے۔ اہل ایمان دنیا کی قوموں کے اوپر خدا کی طرف سے حق کے گواہ ہیں (انتم شھداء اللہ فی الارض، حدیث) اس لئے بالکل فطری ہے کہ اسی اصل حیثیت کے تحقق پر ان کو خدا کا وہ عظیم انعام ملے جس کو غلبہ وسرفرازی کہا جاتا ہے۔

مسلمان دوسری قوموں کے ساتھ ایک ایسی دنیا میں رہتے ہیں جہاں ایک گروہ دوسرے گروہ کو لوٹتا ہے، جہاں ایک طبقہ دوسرے طبقہ پر غالب آنے کے لئے سرگرمیاں دکھاتا ہے۔ اس بنا پر مسلمانوں کے لئے دوسری

قوموں کی طرف سے بار بار مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ وہ بار بار دوسرے گروہ کی زد میں آجاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے اندر دوسری قوموں کے خلاف جذبات ابھرتے ہیں۔ وہ دوسری قوموں کی طرف سے اپنے کو خطرہ میں پاکر ان کے خلاف "جہاد" کرنا چاہتے ہیں۔ مگر اس مسئلہ کو قرآن کی روشنی میں دیکھئے تو اس کا جواب اس سے بالکل مختلف ملے گا جو ایک عام قومی لیڈر ایسے حالات میں سوچتا ہے۔ قرآنی جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ مسئلہ خواہ جان و مال کے نقصان کی سطح پر پیدا ہو مگر اس کا حل تمھارے لئے ابدی طور پر دعوتی عمل میں رکھ دیا گیا ہے۔ مسلمانوں کے لئے ہر حال میں جدوجہد کا مقام دعوت الی اللہ ہے نہ کہ وہ دنیوی محاذ جہاں بظاہر ان کا حریف انھیں خطرہ بنا ہوا نظر آتا ہے۔ قرآن کی اس آیت میں پیغمبر کے واسطہ سے امت کو یہی سبق دیا گیا ہے :

یا ایھا الرسول بلّغ ما اُنزِلَ الیک من ربّک وَاِن لم تفعل فما بلّغتَ رسالتہ واللہ یعصمک من النّاس (مائدہ ۶۷)	اے رسول جو کچھ تم پر تمھارے رب کی طرف سے اترا ہے اسے پہنچا دو اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے اللہ کا پیغام نہ پہنچایا اور اللہ تم کو لوگوں سے بچائے گا

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ عصمت من الناس کا راز دعوت الی اللہ میں چھپا ہوا ہے۔ جب بھی اہل ایمان کے لئے دوسروں کی طرف سے عدم تحفظ کا خطرہ ہو یا مغلوبیت کا سوال پیدا ہو تو ان کو دعوت الی اللہ کے کام کی طرف دوڑنا چاہئے۔ اسی کام میں لگنے سے خدا کا قانون ان کے حق میں متحرک ہوگا اور وہ غیر معمولی اسباب پیدا ہوں گے جو بالآخر ان کے لئے نجات اور کامیابی کا زینہ بن جائیں۔

دعوت دین کے کام کی ایک خاص فوقیت (Advantage) یہ ہے کہ فطرت کو ابدی طور پر اس کا ہم نوا بنا دیا گیا ہے۔ تعصب کی سطح پر کوئی آدمی خواہ کتنا ہی مخالف ہو مگر فطرت کی سطح پر حق کی آواز تمام انسانوں کے لئے اپنے دل کی آواز ہے۔ حق کی پکار ایک ایسی پکار ہے جس کا ایک مثنیٰ ہر آدمی کے دل میں موجود ہوتا ہے۔ خدا کا دین اور انسان کی فطرت دونوں ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں ہیں۔ ہر آدمی پیدائشی طور پر اپنے خالق کا تصور لئے ہوئے ہے۔ ہر آدمی کا باطن اس کی اپنی بناوٹ کے اعتبار سے ہر لمحہ زور کر رہا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اپنے خالق و مالک کے آگے ڈال دے۔ گویا دین حق ایک ایسا سودا ہے جس کا ہر آدمی پہلے سے خریدار بنا ہوا ہے۔

اس فطری مساعدت کے ساتھ اسلام کو ایک تاریخی مساعدت بھی حاصل ہے۔ وہ یہ کہ دوسرے تمام مذاہب اپنے ماننے والوں کی تحریفات کے نتیجہ میں اپنا اصلی حسن کھو چکے ہیں۔ وہ اتنا بدل چکے ہیں کہ ان میں اور فطرت انسانی میں وہ مطابقت باقی نہیں رہی جو فی الواقع دونوں کے خالق نے دونوں کے درمیان رکھی تھی۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج دنیا میں جتنے لوگ کسی دوسرے مذہب کو مانتے ہیں وہ صرف روایت پرستی کی بنا پر اس کو مانتے

ہیں۔ وہ تعصب کی زمین پر کھڑے ہوئے ہیں نہ کہ فی الواقع فطری تصدیق کی زمین پر۔ کیونکہ فطری تصدیق وہاں سرے سے موجود ہی نہیں۔ اگر ہم کسی طرح تعصب کا پردہ ہٹا دیں تو تمام دوسرے مذاہب بے زمین ہو جائیں گے اور لوگوں کو اس کے سوا کوئی راستہ دکھائی نہ دے گا کہ وہ اسلام کے سایہ میں پناہ لیں۔

دعوتی تسخیر کی مثالیں

دعوت میں ہمارے لئے زندگی کا راز چھپا ہوا ہے، یہ کوئی قیاسی بات نہیں۔ اسلام کی تاریخ اس نظریہ کے حق میں واضح تائید پیش کرتی ہے۔

ا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں اپنے پیغمبرانہ کام کا آغاز فرمایا۔ مگر مکہ کی زمین آپ کے لئے انتہائی سخت ثابت ہوئی۔ نبوت کے بارھویں سال بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسلام کی تاریخ مکہ سے شروع ہو کر مکہ ہی میں ختم ہو جائے گی۔ مگر اس کے بعد حیرت انگیز طور پر یثرب (مدینہ) میں یہ مواقع پیدا ہو گئے کہ آپ ہجرت کر کے وہاں جائیں اور وہاں اسلام کا مرکز قائم کریں۔ مدینہ میں یہ نیا امکان کیونکر پیدا ہوا۔ اس کا ایک ہی جواب ہے، اور وہ یہ کہ دعوت وتبلیغ کے ذریعہ۔ مدینہ میں چند لوگوں کی دعوتی جدوجہد کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہاں گھر گھر اسلام پھیل گیا (حتیٰ لم تبق دار من دور الانصار الا وفیہا رجال ونساء مسلمون، سیرۃ ابن ہشام جلد اول) اس طرح انتہائی مشکل اور مایوس کن حالات میں اسلام کی اشاعت کے ذریعہ مدینہ میں مسلمانوں کے لئے زندگی کے مواقع کھلے۔

۲۔ ہجرت نے اگرچہ مسلمانوں کے لئے اپنا ایک علاقہ مہیا کر دیا تھا۔ مگر مخالفین اسلام نے باقاعدہ جنگ چھیڑ کر دوبارہ اسلام کے لئے شدید حالات پیدا کر دئے۔ اسلام ایسی مشکلات میں گھر گیا کہ ہر وقت یہ اندیشہ تھا کہ اسلام کے دشمن شاید اسلام کا وجود مٹا دیں گے۔ اس وقت پھر دعوت ہی تھی جس نے دوبارہ اسلام کے لئے نئے حالات کا دروازہ کھولا۔ حدیبیہ کی صلح کی صورت میں ہر ممکن قیمت دے کر جنگ وجدال کا ماحول ختم کر دیا گیا اور پرامن حالات میں از سر نو دعوتی عمل جاری کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دو سال میں مسلمانوں کی تعداد چو گنے سے بھی زیادہ ہو گئی۔ بالآخر قریش کے سردار اتنا مرعوب ہوئے کہ لڑے بھڑے بغیر ہتھیار ڈال دئے۔

۳۔ فتح مکہ کے بعد پھر ایک بہت بڑا مسئلہ قبیلہ ثقیف کی صورت میں پیدا ہوا۔ وہ بے حد سرکش تھے اور دیواری شہر کے مالک ہونے کی وجہ سے ان پر فوجی کارروائی کرنا مسلمانوں کے لئے اپنے حالات کے لحاظ سے بظاہر ناممکن تھا۔ اس وقت قبیلہ ثقیف کو جس چیز نے زیر کیا وہ دعوت ہی تھی۔ قبیلہ ہوازن (۶ ہزار) کے ساتھ تالیف قلب کا طریقہ اختیار کر کے انھیں اسلام میں داخل کر دیا گیا۔ قبیلہ ہوازن طائف کے قبیلہ ثقیف کا

حلیف تھا۔ چنانچہ ان کے عمومی طور پر اسلام قبول کرتے ہی قبیلہ ثقیف کو محسوس ہوا کہ ان کا بازو ٹوٹ چکا ہے اور اب ان کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ وہ مدینہ جاکر اسلام قبول کرلیں اور مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہوجائیں ——— طائف کا دروازہ فوجی مہم کے لئے بند تھا، مگر دعوتی مہم کے لئے وہ کھلا ہوا نظر آیا۔

۴۔ اس کے بعد اسلامی تاریخ مختلف مراحل طے کرتی ہوئی آٹھویں صدی ہجری میں پہنچتی ہے۔ تاتاری قبائل ملکوں اور شہروں کو زیر وزبر کرتے ہوئے اسلامی دنیا میں داخل ہوجاتے ہیں اور بغداد کی عظیم مسلم سلطنت کو تاراج کرکے رکھ دیتے ہیں۔ چنگیز خاں وسط ایشیا سے ۱۲۱۶ء میں ساٹھ ہزار وحشی انسانوں کو لے کر نکلا۔ یہ لوگ گھوڑوں پر سوار ہوکر اور تیر اور تلوار لئے ہوئے آبادیوں پر ٹوٹ پڑے اور تمام تمدنی نشانات کو برباد کرڈالا۔ عراق، ایران، ترکستان ان کے قدموں کے نیچے زیروزبر ہوگئے جہاں اس وقت کی طاقت ور ترین سلطنت قائم تھی۔ سارے عالم اسلام پر دہشت کا سناٹا چھاگیا۔ ۱۲۵۳ء میں چنگیز خاں کے پوتے ہلاکو کی سرکردگی میں یہ طوفان دوبارہ اٹھا اور ان چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو بھی تہس نہس کرڈالا جو عظیم مسلم خلافت کی بربادی کے بعد ابھرنے کی کوشش کررہی تھیں۔ ہم عصر مورخ ابن اثیر (م ۶۳۸ھ) کے الفاظ میں "اگر کوئی شخص کہے کہ آدم سے لے کر اب تک ایسا کوئی حادثہ دنیا میں پیش نہیں آیا تو اس کا کہنا غلط نہ ہوگا" ایک مغربی مورخ کے نزدیک یہ واقعہ اتنا ہولناک تھا کہ اس کے قلم سے یہ الفاظ نکلے۔ "آسمان نے زمین پر گر کر تمام چیزوں کو مٹا دیا۔"

Jenghiz Khan, by Harold Lamb, P. 266

اس نازک وقت میں اسلام کی دعوتی طاقت ہی تھی جس نے تاتاریوں کے نہ رکنے والے سیلاب سے اسلام کو بچایا۔ تاتاری اپنی مفتوح رعایا کے ذریعہ اسلام سے متعارف ہونا شروع ہوئے۔ یہاں تک کہ اسلام نے انھیں جیت لیا اور ان کی اکثریت نے اسلام قبول کرلیا۔ اسلام کے دشمن اسلام کے پاسبان بن گئے۔ یہ کام کن مسلمانوں کے ذریعہ انجام پایا۔ اس سلسلہ میں وقت کی قابل ذکر شخصیتوں کا نام تاریخ کی کتابوں میں نہیں ملتا۔ غالباً یہ واقعہ بھی اسی طرح ظہور میں آیا جس طرح موجودہ زمانہ میں قبول اسلام کے واقعات ظہور میں آرہے ہیں۔ آج مختلف ملکوں میں لوگ کثرت سے اسلام قبول کررہے ہیں۔ مگر ان نومسلموں تک اسلام کو پہنچانے کا کام اکابر کے ذریعہ نہیں ہورہا ہے۔ یہ دراصل کچھ غیر معروف اصاغر ہیں جو خاموشی کے ساتھ دعوت دین کا کام کررہے ہیں۔ اسی طرح آٹھویں صدی ہجری میں تاتاریوں میں تبلیغ اسلام کا کام بھی غالباً کچھ غیر مشہور مسلمانوں کے ذریعہ انجام پایا۔ تاتاریوں کے سلسلے میں اسلام کی دعوتی قوت کا اعتراف عام طور پر مورخین نے کیا ہے۔ یہاں ہم دو غیر مسلم محققین کے اقتباسات نقل کرتے ہیں:

Although in after years this great empire was split up and the political power of Islam diminished, still its spiritual conquests went on uninterruptedly. When the Mongols hordes sacked Baghdad (AD 1258) and drowned in blood the faded glory of the Abbasid dynasty, Islam had just gained a footing in the island of Sumatra and was just about to commence its triumphant progress through the island of the Malay Archipelago. In the hours of its political degradation, Islam has achieved some of its most brilliant spiritual conquests: on two great historical occasions, infidel barbarians have set their feet on the necks of the followers of the Prophet the Saljuq Turks in the eleventh and the Mongols in the thirteenth century and in each case the conquerers have accepted the religion of the conquered.

T.W. Arnold, The Preaching of Islam (1896) P. 2

بعد کے سالوں میں اگرچہ یہ عظیم سلطنت ٹوٹ گئی اور اسلام کی سیاسی قوت کم ہو گئی۔ مگر اس کی روحانی فتوحات بغیر وقفہ کے برابر جاری رہیں۔ مغل قبائل نے جب ۱۲۵۸ء میں بغداد کو تباہ کیا اور عباسی خلافت کی شان و شوکت کو خون میں غرق کر دیا، اس وقت اسلام جزیرہ سماترا میں اپنی جگہ بنا چکا تھا اور جزائر ملایا میں اپنا فاتحانہ سفر شروع کر رہا تھا۔ اپنے سیاسی زوال کے زمانہ میں اسلام نے اپنی بعض انتہائی نمایاں روحانی فتوحات حاصل کی ہیں۔ دو بڑے مواقع پر کافر قبائل نے اپنے پاؤں محمد کے پیروؤں کی گردن پر رکھ دیے تھے۔ گیارھویں صدی عیسوی میں سلجوق ترکوں نے اور تیرھویں صدی عیسوی میں مغلوں نے، مگر ہر بار فاتح نے اپنے مفتوح کے مذہب کو قبول کر لیا۔

Hard pressed between the mounted archers of the wild Mongols in the East and the mailed knights of the Crusaders on the West, Islam in the early part of the 13th century seemed for ever lost. How different was the situation in the last part of the same century, The last crusader had by that time been driven into the sea. The seventh of the Il-Khans, many of whom had been flirting with Christianity, had finally recognised Islam as the state religion - A Dazzling victory for the faith of Mohammad. Just as in the case of the Seljuqs, the religion of the Muslims had conquered where their arms had failed. Less than half a century after Hulagu's merciless attempt at the destruction of Islamic culture, his great-grandson Ghazan, as a devout Muslim, was consecrating much time and energy to the revivification of the same culture.

History of the Arabs, The Macmillan press Ltd., London, 1968, P.488

مشرق میں وحشی منگولوں کے تیر اندازوں کی یلغار اور مغرب میں زرہ پوش صلیبی سرداروں کے درمیان تیرھویں صدی عیسوی کے ابتدائی حصہ میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسلام ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔ مگر اسی صدی کے آخری حصہ میں صورت حال کتنی مختلف ہو چکی تھی۔ آخری صلیبی اس وقت سمندر میں دھکیلا جا چکا تھا۔ گیارہ تاتاری خانوں میں سے ساتویں خان نے، جن میں سے اکثر (کے یہاں عیسائی بیویاں تھیں اور) وہ عیسائیت کی طرف مائل تھے، بالآخر اسلام کو سرکاری مذہب کے طور پر تسلیم کر لیا۔ محمد کے مذہب کی یہ کیسی شاندار فتح تھی۔ بالکل سلجوقوں کے معاملہ کی طرح، مسلمانوں کے مذہب نے وہاں کامیابی حاصل کر لی جہاں ان کے ہتھیار ناکام ہو چکے تھے۔ ہلاکو کے ہاتھوں اسلامی تہذیب کی بے رحمانہ تباہی کے بعد نصف صدی سے بھی کم مدت میں اس کا پوتا غازان مسلمان ہو کر اسی تہذیب کو دوبارہ زندہ کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ وقت اور قوت خرچ کر رہا تھا۔

ایک تاریخی سبق

تاتاریوں کا یہ قیامت خیز واقعہ امام تقی الدین ابن تیمیہ (۷۲۸ - ۶۶۱ھ) کے زمانہ میں ہوا۔ اسلام کی عظمت کو مٹتا ہوا دیکھ کر انھیں جوش آیا۔ امام ابن تیمیہ مجاہدانہ جذبہ کے تحت اٹھ کھڑے ہوئے۔ انھوں نے شام و مصر کے مسلمانوں کو یہ نعرہ دیا کہ جنگ کا علاج جنگ ہے (الحرب انفی للحرب[1]) و ۷۰۲ھ میں مصر کے سلطان الناصر کے ساتھ تاتاریوں سے جنگ کے لئے نکلے۔ ابتدائی طور پر انھیں تاتاریوں کے ایک دستہ کے مقابلہ میں کچھ فوجی کامیابی حاصل ہوئی۔ مگر بالآخر تاتاری غالب رہے اور امام ابن تیمیہ کچھ دن دمشق کے قلعہ میں اور کچھ دن تدریس و تصنیف میں زندگی گزار کر اس دنیا سے چلے گئے۔

امام ابن تیمیہ تاتاریوں کے مسئلہ کو فوجی قوت سے ختم کرنا چاہتے تھے مگر وہ اس کو ختم نہ کر سکے۔ عین اس وقت اسلام کی دعوتی قوت ظاہر ہوئی اور اس نے تاتاریوں کے مسئلہ کو نہ صرف ختم کیا بلکہ ان کو اسی اسلام کا خادم بنا دیا جس کی جڑوں کو اکھاڑنے کے لئے وہ قسمیں کھا چکے تھے ——— آٹھویں صدی ہجری کا یہ تجربہ مسلمانوں کو ہمیشہ کے لئے سبق دے رہا تھا کہ اسلام کی حفاظت اور اس کی سربلندی کے لئے انھیں کیا کرنا چاہئے۔ مگر عجیب بات ہے کہ مسلمانوں نے اس عظیم تاریخی واقعہ سے کوئی سبق نہیں لیا۔ موجودہ زمانہ میں دور جدید کے "تاتاریوں" کی طرف سے اسلام کے لئے مسائل پیدا ہوئے تو دوبارہ مسلمانوں کی پوری قیادت حملہ آوروں کے خلاف سیاسی جہاد میں مصروف ہوگئی۔ اس پوری مدت میں کوئی قابل ذکر شخص نظر نہیں آتا جو دعوتی جہاد کو جہاد سمجھے اور اس کے لئے سرگرم ہو۔

اسلام جدید دور میں

نپولین نے ۱۷۹۸ء میں مصر و شام پر حملہ کیا۔ اس سے دو سو سال پہلے سولھویں صدی عیسوی میں پرتگالی تاجر ہندستان اور دوسرے ایشیائی ملکوں میں داخل ہو چکے تھے۔ اس کے بعد دوسری مغربی قومیں آئیں۔ اس طرح پچھلی چند صدیوں میں پرتگال، ہالینڈ، فرانس اور برطانیہ نے پوری مسلم دنیا پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔ اولاً برصغیر ہند کی مغل سلطنت اور اس کے بعد ترکی کی عظیم عثمانی خلافت ختم ہوگئی۔ موجودہ صدی میں اگرچہ سیاسی استعمار ختم ہو چکا ہے مگر تکنیکی استعمار کی صورت میں مغرب اب بھی پوری طرح مسلم دنیا پر چھایا ہوا ہے۔ دفاعی ہتھیاروں کی خریداری سے لے کر قرآن مقدس کی طباعت و اشاعت تک تمام کاموں کے لئے مسلمان انھیں مغربی قوموں کے دست نگر ہیں۔

---

[1] محمود مہدی الاستانبولی، ابن تیمیہ بطل الاصلاح الدینی، مکتبہ دار المعرفۃ، دمشق، ۱۳۹۷ھ، صفحہ ۳۶

مغربی تسلط کا مسئلہ پیدا ہوتے ہی پوری مسلم دنیا میں اس کے خلاف تحریکیں اٹھ کھڑی ہوئیں اور اب بھی بدستور جاری ہیں۔ پچھلی صدیوں میں مسلمانوں کے درمیان جتنی بھی تحریکیں اٹھی ہیں سب کے پیچھے اصل قوت محرکہ یہی اجنبی تسلط کا مسئلہ نظر آتا ہے۔ یہ تحریکیں بظاہر ایک دوسرے سے کافی مختلف ہیں۔ مگر ایک چیز سب میں مشترک ہے۔ سب کا طرز فکر بنیادی طور پر سیاسی ہے۔ ان سب کو ایک عنوان کے تحت جمع کرنا ہو تو کہا جا سکتا ہے کہ ان کا مقصد اجنبی اقوام کے پیدا کردہ مسائل کا سیاسی حل تلاش کرنا تھا۔

یہ تحریکیں تقریباً بلا استثنا صد فی صد ناکام رہیں۔ جان و مال کی بے پناہ قربانیوں کے باوجود ان کا کوئی حقیقی حاصل مسلمانوں کے حصہ میں نہیں آیا ——— مسلمانوں کے عالمی سیاسی اتحاد کے لئے اتحاد اسلامی (پان اسلام ازم) کی تحریک چلائی گئی۔ مگر اس کا نتیجہ صرف یہ ہوا کہ عثمانی خلافت اور مغل سلطنت دونوں ٹوٹ گئیں اور ان کے زیر حکومت علاقے درجنوں الگ الگ مسلم خطے میں بٹ گئے۔ مسلمانوں نے مغرب کے سیاسی استعمار سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے بے شمار جانیں قربان کیں اور بے حساب مال لٹا دیا مگر عملاً صرف یہ ہوا کہ سیاسی استعمار ختم ہو کر سائنسی اور تکنکی استعمار ان کے اوپر مسلط ہو گیا۔ مسلمانوں نے اجنبی محکومی سے نجات پانے کے لئے اپنی ساری طاقت لگا دی مگر جب اجنبی محکومی ختم ہوئی تو خود اپنے ملک کے ملحدوں اور باغیوں کی محکومی ان کے اوپر قائم ہو چکی تھی۔ مسلمانوں نے ایک اسلامستان بنانے کے لئے تاریخ کی سب سے بڑی قربانی دی۔ مگر جب وہ بنا تو صرف یہ ہوا کہ ایک واحد ملک کے مسلمان کئی چھوٹے چھوٹے ملکوں میں تقسیم ہو گئے ——— فلسطین میں یہودی ریاست کے قیام کے سوال پر ساری مسلم دنیا ایک ہو گئی اور اس کے لئے وہ سب کچھ کر ڈالا جو ان کے بس میں تھا۔ مگر اسرائیل کا حال یہ ہے کہ اس کی طاقت اور رقبہ میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے جس جس میدان میں بھی کوشش کی ہے ہر میدان میں انھوں نے صرف کھویا ہے، انھوں نے کچھ بھی حاصل نہیں کیا ہے۔ بائبل کے نبی حجیؔ کے الفاظ میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "مزدور اپنی مزدوری سوراخ دار تھیلی میں جمع کر رہا ہے"۔ مگر اس عمومی محرومی کی فضا میں حیرت انگیز طور پر ایک ایسا میدان موجود ہے جہاں اسلام اپنے آپ پیش قدمی کر رہا ہے۔ جب کہ بقیہ میدانوں میں بے شمار کوششیں اور قربانیاں بھی کوئی نتیجہ پیدا کرنے میں ناکام ہیں، یہاں کسی قابل ذکر کوشش کے بغیر اپنے آپ مفید نتیجہ ظاہر ہوتا چلا جا رہا ہے۔

یہ میدان اسلام کی اشاعت کا میدان ہے۔ مسلمانوں نے موجودہ زمانہ میں اسلام کو غیر مسلموں تک پہنچانے کے لئے کچھ بھی نہیں کیا ہے۔ مگر حیرت انگیز بات ہے کہ تقریباً ساری دنیا میں اسلام اپنے آپ غیر مسلم

قوموں میں پھیلتا جا رہا ہے — ہندستان میں ہریجن عمومی پیمانہ پر اسلام قبول کر رہے ہیں۔ جاپان میں سنجیدہ طبقہ بہت تیزی سے اسلام کی طرف مائل ہو رہا ہے۔ امریکہ میں کالی نسل کے لوگ کثرت سے اسلام قبول کر رہے ہیں۔ افریقہ کے پس ماندہ قبائل ہر دن ہزاروں کی تعداد میں اسلام کے دائرہ میں داخل ہو رہے ہیں، وغیرہ۔ اسلام کی یہ لہر صرف نچلے طبقات تک محدود نہیں ہے۔ موجودہ زمانہ میں تقریباً ہر ملک میں اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اونچی حیثیت کے لوگوں نے بھی اسلام قبول کیا ہے، اور یہ سب کچھ مسلمانوں کی کسی کوشش کے بغیر اپنے آپ ہو رہا ہے۔

مواقع انتظار کرتے رہے

۱۹ویں صدی کے نصف ثانی اور ۲۰ ویں صدی کے نصف اول میں جب کہ مسلم قائدین انتہائی بے فائدہ طور پر سیاست کی چٹان سے اپنا سر ٹکرا رہے تھے، متعدد ایسے نمایاں واقعات ظہور میں آئے جو کھلا ہوا اشارہ دے رہے تھے کہ کرنے کا کام دعوت و تبلیغ ہے نہ کہ حکمرانوں سے سیاسی تصادم۔ نمونہ کے طور پر ایک واقعہ ملاحظہ ہو۔

کان میکادو الیابان قد ارسل فی زمن وجود السید بالاستانه (۱۸۹۱) کتابا الی السلطان عبد الحمید یخطب فیه مودته ویقول: ان کلا منا ملک شرقی، ومن مصلحتنا ومصلحة شعوبنا ان نتعارف ونتزاور وتکون الصلات بیننا قویة تجاه الدول والشعوب الغربیة التی تنظر الینا بعین واحدة۔ اننی اری شعوب الانس یرسلون الی بلادنا دعاة الیٰ دینهم لحریة الدین عندنا ولا اراکم تفعلون ذلک، فانا احب ان ترسلوا الینا دعاة یدعون الیٰ دینکم (الاسلام) ویمکن ان یکون هولاء صلة معنویة بیننا وبینکم (صفحہ ۳۲)

محمود ابوریہ، جمال الدین افغانی، لجنة التعریف بالاسلام، القاہرہ، ۱۳۸۶ھ

۱۸۹۱ میں جب کہ سید جمال الدین افغانی آستانہ (ترکی) میں تھے، جاپان کے شہنشاہ میجی (۱۹۱۲ — ۱۸۶۸) نے سلطان عبد الحمید ثانی کے پاس ایک خط بھیجا۔ اس خط میں اس نے دوستی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا: ہم دونوں مشرقی بادشاہ ہیں۔ ہماری مصلحت اور ہماری قوم کی مصلحت یہ ہے کہ ہم باہم متعارف ہوں اور ملیں جلیں۔ اور ہمارے درمیان مضبوط رشتہ ہو تاکہ ہم مغربی قوموں اور سلطنتوں کا مقابلہ کر سکیں جو ہم سب کو ایک نظر سے دیکھتی ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ مغربی قومیں ہمارے ملک میں اپنے دینی مبلغ بھیج رہی ہیں کیونکہ ہمارے ملک میں مذہبی آزادی ہے۔ مگر میں نہیں دیکھتا کہ آپ بھی ایسا کرتے ہوں۔ میں اس کو پسند کرتا ہوں کہ آپ بھی جاپان میں ایسے لوگ بھیجیں جو یہاں آپ کے دین اسلام کی تبلیغ کریں۔ ہو سکتا ہے کہ اس طرح ہمارے اور آپ کے درمیان مضبوط معنوی رشتہ قائم ہو جائے۔

شہنشاہ جاپان کا یہ خط جب ترکی کے دار السلطنت پہنچا، اس وقت سید جمال الدین افغانی اور دوسرے بڑے بڑے علماء اور اکابر وہاں موجود تھے۔ سلطان عبد الحمید ثانی نے ان لوگوں کو جمع کر کے شہنشاہ جاپان کا

خط دکھایا مگر کسی نے اس میں کوئی خاص دل چسپی نہ لی۔ جاپان کا سرکاری قاصد رسمی شکریہ کا جواب لے کر واپس چلا گیا۔

قریبی ماضی میں اس طرح کے عظیم واقع کو استعمال نہ کرنے کی وجہ صرف ایک تھی، دعوتی کام کی اہمیت سے مسلمانوں کا غافل ہونا۔ لوگ بطور خود جن سیاسی یا غیر سیاسی سرگرمیوں میں مصروف تھے بس اسی کو وہ کام سمجھتے رہے۔ اور غیر مسلموں میں تبلیغ و دعوت کے کام کو غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ حتی کہ اس وقت بھی جب کہ غیر مسلموں کا قافلہ خود ان کے یہاں آکر ان کا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔

خدائی فیصلہ

انیسویں صدی عیسوی کے نصف ثانی میں برطانیہ کے شاہی خاندان کے ایک فرد لارڈ ہیڈلے فاروق نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ بیسویں صدی عیسوی کے نصف ثانی میں گابون (افریقہ) کے صدر مملکت محمد عمر بانگو نے اسلام کو اپنا دین بنانے کا اعلان کیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں اسی طرح غیر مسلم اقوام کے لاکھوں لوگ اپنے آبائی دین کو چھوڑ کر اسلام کے دائرہ میں داخل ہوتے رہے ہیں۔ ان میں نہ صرف عوام ہیں بلکہ تاجر، ڈاکٹر، انجینئر، اہل علم اور سرکاری عہدہ دار جیسے لوگ بھی کثیر تعداد میں شامل ہیں۔ ہندستان میں مسلمانوں کی انتہائی نادان سیاست کے نتیجہ میں اسلام اور مسلمان سخت مغلوبیت کی حالت میں پہنچ گئے تھے، اچانک اسلام کی دعوتی قوت نے اپنا کرشمہ دکھایا اور یہاں کے پس ماندہ طبقات نے عمومی پیمانہ پر اسلام قبول کرنا شروع کر دیا۔ یہ واقعہ کتنا عظیم ہے۔ اس کا اندازہ ایک اقتباس سے ہوگا۔ مسٹر کرشنا دھن سردار (رامیشور پور۔ مغربی بنگال) اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ ہندو دوسرے جنم میں عقیدہ رکھتے ہیں۔ اور ہندوازم کا نیا جنم عمومی طور پر اسلام قبول کرنے کی صورت میں فروری کے وسط میں تامل ناڈو میں شروع ہو گیا ہے:

> Hindus believe in re-birth and the re-birth of Hinduism has taken place in Meenakshipuram (Tamil Nadu) in the middle of February (1981) in the form of mass conversion to Islam.
>
> Radiance Weekly, August 9, 1981

اس قسم کے واقعات جو دنیا بھر میں ہو رہے ہیں وہ مسلمانوں کی تمام موجودہ تحریکوں کو خدا کی نظر میں بے اعتبار (Discredit) ٹھہرانے کے ہم معنی ہیں۔ مسلمان جن میدانوں میں جان و مال کی قربانی دے کر اپنا مستقبل تلاش کرتے رہے وہاں سے کسی بھی درجہ میں مطلوبہ نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ ان میدانوں میں ان کی کوششیں حبط اعمال کا مصداق بنتی رہیں۔ دوسری طرف وہ میدان جہاں جدید مسلم قیادت نے دنیا بھر میں کہیں سرے سے کوئی کوشش ہی نہ کی تھی وہاں اپنے آپ لہلہاتی ہوئی فصل نکلی چلی آ رہی ہے۔ اس طرح خدا بتا رہا ہے کہ تم جن مقامات پر میری مدد تلاش کر رہے ہو وہاں مجھے مدد دینا مطلوب ہی نہیں ہے۔ یہ زمین

وہ زمین ہی نہیں جہاں میرے انعامات کی فصل اگتی ہو۔ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ میری وہ مد دنمھیں حاصل ہو جس سے بند دروازے کھلتے ہیں اور چٹانیں اپنی جگہ سے کھسکنے لگتی ہیں تو تم دعوت کی زمین میں اپنی کوششیں صرف کرو جس کو میں نے اتنا زرخیز بنایا ہے کہ کسی عمل کے بغیر ہی اس کے اندر سے شان دار فصل نکل چلی آرہی ہے۔

خدا ہم کو دعوت وتبلیغ کے میدان میں سرگرم ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہے۔ اگر مسلمان قدرت کے اس اشارہ کو سمجھیں اور اپنی کوششوں کو غیرمسلموں کے درمیان دعوت الی اللہ کے کام میں لگادیں تو موجودہ نتائج کی رفتار کئی گنا بڑھ جائے گی اور ہوسکتا ہے کہ موجودہ نسل ہی میں غلبۂ اسلام کا وہ خواب پورا ہوجائے جس کی تعبیر ہم صدیوں سے دوسرے میدانوں میں تلاش کررہے ہیں مگر وہ کسی طرح پورا نہیں ہوتا۔

عبرتناک منظر

مغرب کے مشہور مفکر جارج برنارڈ شا (۱۹۵۰ - ۱۸۵۶) نے کہا تھا کہ اگر کوئی مذہب ہے جو اگلے سو سال میں انگلستان پر حکومت کرے، نہیں بلکہ سارے یورپ پر حکومت کرے تو وہ صرف اسلام ہوگا۔ میں نے محمد کے مذہب کو ہمیشہ بڑی قدر کی نظر سے دیکھا ہے۔ کیونکہ اس کے اندر حیرت انگیز طاقت ہے۔ یہ واحد مذہب ہے جس کے متعلق میرا خیال ہے کہ اس کے اندر یہ صلاحیت ہے کہ وہ بدلتی ہوئی دنیا کو اپنے اندر جذب کرسکے، جس کے اندر ہر دور کے لئے اپیل ہے:

> If any religion has the chance of ruling over England, nay Europe, within the next hundred years, it can only be Islam. I have always held the religion of Muhammad in high estimation because of its wonderful vitality. It is the only religion which appears to me to possess the assimilating capability to the changing face of existance, which can make its apeal to every age.

ہندستان کے مشہور ہندو مفکر سوامی ویویکانند (۱۹۰۲ - ۱۸۶۳) نے لکھا تھا کہ ادویتا واد مذہب اور فکر کی دنیا میں آخری لفظ ہے اور واحد پوزیشن ہے جہاں سے ایک شخص تمام مذاہب اور فرقوں کو محبت کی نظر سے دیکھ سکتا ہے۔ تاہم عملی ادویتا واد جو تمام انسانیت کو خود اپنی طرح دیکھتی ہے اور اپنوں کا سا سلوک کرتی ہے، کبھی ہندوؤں میں پیدا نہ ہوسکی۔ دوسری طرف میرا تجربہ یہ ہے کہ اگر کبھی کوئی مذہب قابل لحاظ حد تک اس مساوات کو پہنچا ہے تو وہ اسلام اور صرف اسلام ہے۔ اسی لئے میں قطعی طور پر یہ خیال رکھتا ہوں کہ عملی اسلام کی مدد کے بغیر ویدانت کے نظریات بالکل ہی بے قیمت ہیں۔ ہمارے مادر وطن (ہندستان) کے لئے جو دو عظیم نظامات، ہندوازم اور اسلام کا مقام اتحاد ہے، ویدانت کا دماغ اور اسلام کا جسم ہی واحد امید ہے۔ میں اپنے تصور کی نگاہ سے دیکھ رہا ہوں کہ مستقبل کا معیاری ہندستان موجودہ انتشار اور اختلاف سے نکل کر شان دار اور غیر مفتوح بن رہا ہے، اور یہ ویدانت کے دماغ اور

اسلام کے جسم کے ذریعہ ہو رہا ہے :

I see in my mind's eye the future perfect India rising out of this chaos and strive, glorious and invincible, with Vedanta brain and Islam body.

Letters of Swami Vivikanand (1970) P.453

کیسی عجیب بات ہے۔ جدید انسان کو جہاں اپنی زندگی کی کہانی اسلام کے بغیر نامکمل دکھائی دیتی ہے، وہاں ہمیں کرنے کا کوئی کام نظر نہیں آتا۔ اور جہاں جدید انسان یہ سمجھتا ہے کہ اسلام کے بغیر اس کی کہانی آخری حد تک مکمل ہے، وہاں ہم اس کی پتھریلی دیوار سے اپنا سر ٹکرا رہے ہیں۔ اس سے زیادہ عبرتناک منظر شاید آسمان نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام ہی واحد امید ہے، دنیا کی بھی اور خود مسلمانوں کی بھی۔ دنیا، اپنی تمام ترقیوں کے باوجود، اس لئے بےچین ہے کہ اس کو مالک کائنات کی سچی رہنمائی حاصل نہیں۔ مسلمان اس لئے برباد ہیں کہ ان کے ذمہ خدا کی سچائی کو دوسروں تک پہنچانے کا کام سپرد کیا گیا تھا اور اس کو انھوں نے چھوڑ دیا۔ بقیہ دنیا حق سے محرومی کی سزا بھگت رہی ہے اور مسلمان حق سے غفلت کی۔ یہ صورت حال اس وقت تک باقی رہے گی جب تک مسلمان حق کے داعی بن کر کھڑے نہ ہوں۔ دوسرے کاموں میں مشغول ہونا یا دوسرے کاموں کو دعوت و تبلیغ کا نام دینا صرف ان کے جرم میں اضافہ کرتا ہے، نہ کہ وہ انھیں خدا کی رحمتوں کا مستحق بنائے —— مسلمان اگر دعوت الی اللہ کا کام کریں تو ان کے لئے اس دنیا میں سب کچھ ہے۔ اور اگر وہ اس مطلوبہ کام کے لئے نہ اٹھیں تو خدا کی اس دنیا میں ان کے لئے کچھ نہیں۔

آسٹریلیا کی ایک مسیحی خاتون نے اپنی کتاب میں اسلام کا تعارف کرتے ہوئے بجا طور پر لکھا ہے :

This is the passing glimpse of Islam. And it has much to offer to our restless world. But it seems to be an abandoned treasure, abandoned by those who bear its name. No wonder their lives are so different from the glory I described. And unless they return back to it again, they will remain in bewilderment in the rear of humanity's procession. For it is remedy, light and guidance from God, for them and for the world. (P.44)

Dr Cheris Wady, The Muslim Mind, Macmillan Co. Ltd. Bombay

یہ اسلام کا ایک سرسری خاکہ ہے۔ اور اس میں ہماری بےچین دنیا کے لئے بہت کچھ ہے۔ مگر یہ بظاہر ایک چھوڑا ہوا خزانہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کو ان لوگوں نے چھوڑ رکھا ہے جو اس کا نام لیتے ہیں۔ یہ تعجب کی بات نہیں کہ ان کی زندگیاں اس عظمت سے بہت مختلف ہیں جو میں نے بیان کیا۔ اور جب تک وہ دوبارہ اس اسلام کی طرف واپس نہ ہوں وہ حیران و پریشان انسانیت کے قافلہ سے بچھڑے ہی رہیں گے۔ کیونکہ خدا کی طرف سے یہی ایک علاج اور روشنی اور رہنمائی ہے ان کے لئے بھی اور ساری دنیا کے لئے بھی۔

اوپر ہم نے قرآن کے اس ارشاد کا تاریخی مطالعہ کیا ہے کہ عصمت من الناس کا راز تبلیغ ما انزل اللہ میں ہے (مائدہ ۶۷) یہ بات جب پہلی بار پیغمبر کی زبان پر جاری کی گئی تو وہ واقعات سامنے نہیں آئے تھے جن کا اوپر ذکر ہوا۔ یہ تاریخ ابھی مستقبل کے پردہ میں چھپی ہوئی تھی۔ ایسے وقت میں ان الفاظ پر یقین لانا اور اس کی راہ میں اپنے جان و مال کو وقف کرنا بلاشبہ مشکل ترین کام تھا۔ تاریخ کو اس کے اختتام پر دیکھنا جتنا آسان ہے، تاریخ کو اس کے آغاز پر دیکھنا اتنا ہی زیادہ مشکل ہے۔ دور اول کے مسلمانوں نے تاریخ کے مشکل ترین کام کو انجام دیا۔ انھوں نے واقعہ کے ظہور میں آنے سے پہلے واقعہ کو دیکھا اور اس کی خاطر مطلوبہ عمل کیا۔ اس کے مقابلہ میں ہمارے حصہ میں تاریخ کا آسان ترین کام آیا تھا۔ ایک اصول کے تاریخی واقعہ بن جانے کے بعد ہمیں اپنی زندگیوں میں اسے دہرانا تھا۔ مگر عجیب بات ہے کہ ہمارے پیش رو تو مشکل ترین امتحان میں پورے اترے اور ہم آسان ترین امتحان میں بھی ناکام ہو گئے۔

بے شک اللہ انکار کرنے والوں کو راستہ نہیں دکھاتا (مائدہ ۶۷) اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ مسلمان اگر خدا کے بتائے ہوئے اصول پر دعوت الی اللہ کا کام کریں تو خدا ان کے مخالفین کو ایسا اندھا کر دے گا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف کوئی مؤثر منصوبہ بندی نہ کر سکیں اور ان کو برباد کرنے میں کبھی کامیاب نہ ہوں۔ تاہم دوسرے پہلو کے اعتبار سے اس کا تعلق خود داعی سے بھی ہے، اس لحاظ سے آیت کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی طرف سے مسئلہ کی وضاحت کے بعد اگر مسلمان اس کو نہ مانیں اور اس طریقہ کو چھوڑ کر وہ اپنے تحفظ اور احیاء کے لئے دوسرے راستوں میں محنت کریں تو خدا ان کی محنتوں کو بار آور ہونے نہ دے گا۔ وہ ان کو کامیابی کے رخ پر نہیں چلائے گا۔ ان کی بڑی بڑی کوششیں بھی عملاً بے نتیجہ ہو کر رہ جائیں گی۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ آج مسلمانوں کی کوششوں کے ساتھ یہی کچھ پیش آیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے اپنے احیاء کے لئے جان و مال کی بے حساب قربانیاں دیں مگر ان کی تمام قربانیاں بالکل لاحاصل ہو کر رہ گئیں۔ حضرت مسیح سے پہلے نبی حجی نے جو کچھ یہود کے بارے میں کہا تھا وہ آج پوری طرح مسلمانوں کے اوپر چسپاں ہو رہا ہے —— تم نے بہت سا بویا پر تھوڑا کاٹا۔ تم کھاتے ہو پر آسودہ نہیں ہوتے۔ تم پیتے ہو پر پیاس نہیں بجھتی۔ اور مزدور اپنی مزدوری سوراخ دار تھیلی میں جمع کرتا ہے۔ تم نے بہت کی امید رکھی اور تم کو تھوڑا ملا اور جب تم اپنے گھر میں لائے تو میں نے اسے اڑا دیا۔

مسلمانوں نے موجودہ زمانہ میں بڑی بڑی تحریکیں اٹھائیں۔ مگر خدا نے ان کے "کھلیان" کو ہوا میں اڑا دیا۔ یہ خدائی تنبیہ اگر مسلمانوں کے لئے کافی نہیں تو اس کے بعد ان کی بیداری کے لئے صور اسرافیل کا انتظار کرنا چاہئے۔

فارم IV

دیکھو رول نمبر ۸

ماہنامہ الرسالہ ۔ جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ ۔ دہلی

مقام اشاعت جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶

وقفہ اشاعت ماہانہ

نام پرنٹر (طابع) ثانی اثنین خاں

قومیت ہندوستانی

پتہ جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶

نام پبلشر (ناشر) ثانی اثنین خاں

قومیت ہندوستانی

پتہ جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶

نام ایڈیٹر (مدیر مسئول) ثانی اثنین خاں

قومیت ہندوستانی

پتہ جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ ۔ دہلی ۶

نام اور پتہ مالک رسالہ ثانی اثنین خاں

جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی ۶

میں ثانی اثنین خاں تصدیق کرتا ہوں کہ جو تفصیلات دی گئی ہیں، میرے علم و یقین کے مطابق صحیح ہیں۔

ثانی اثنین خاں

یکم مارچ ۱۹۸۲ء

ملی تعمیر کا کام

سب سے پہلے

ملت کے افراد میں

شعور پیدا کرنے کا کام ہے

اس کی

بہترین صورت یہ ہے کہ

الرسالہ کو

ایک ایک بستی اور

ایک ایک گھر میں

پہنچایا جائے۔

حضرت مولانا وحید الدین خاں صاحب

بمبئی میں

حضرت مولانا وحید الدین خاں صاحب اپریل ۱۹۸۲ کے آخری ہفتہ میں بمبئی کا دورہ فرمائیں گے۔ اس سلسلے میں پروگرام کی تفصیلات انشاء اللہ ماہ اپریل ۱۹۸۲ کے الرسالہ میں شائع کردی جائیں گی۔

مقامی حضرات اس سلسلے میں ذیل کے پتہ پر معلومات حاصل کرسکتے ہیں :

۱۔ ہارون ٹریڈنگ کمپنی۔ ۱۱ بھاجی پالا لین ۔ بمبئی ۳

۲۔ نورالدین آزاد صاحب۔ ۱۰۴ کامبیکر اسٹریٹ ۔ بمبئی ۳

Telephone : 335423, 861057, 866233

ایجنسی : ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیار اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دلچسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ بیک وقت سال بھر کا زر تعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت ——— الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کرکے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا۔ بشرطیکہ پرچے خراب نہ ہوئے ہوں۔

دوسری صورت ——— الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ ۱۳۵ روپے یا ماہانہ ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی سے شائع کیا

REGD. NO. D. (DN) 532 MARCH 1982

AL-RISALA MONTHLY

JAMIAT BUILDING QASIMJAN STREET DELHI-110006 (INDIA) PHONE 232231

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

کتاب	قیمت
۱- الاسلام	۱۵—۰
۲- مذہب اور جدید چیلنج	۱۵—۰
۳- ظہورِ اسلام	۱۵—۰
۴- دین کیا ہے ؟	۲—۰
۵- قرآن کا مطلوب انسان	۵—
۶- تجدیدِ دین	۳—۰
۷- اسلام دینِ فطرت	۳—۰
۸- تعمیرِ ملت	۳—۰
۹- تاریخ کا سبق	۳—۰
۱۰- مذہب اور سائنس	۵—۰
۱۱- عقلیاتِ اسلام	۳—۰
۱۲- فسادات کا مسئلہ	۲—۰
۱۳- انسان اپنے آپ کو پہچان	۱—۰
۱۴- تعارفِ اسلام	۲—۵۰
۱۵- اسلام پندرھویں صدی میں	۲—۰
۱۶- راہیں بند نہیں	۳—۰
۱۷- دینی تعلیم	۳—۰
۱۸- ایمانی طاقت	۳—۰
۱۹- اتحادِ ملت	۳—۰
۲۰- سبق آموز واقعات	زیرِ طبع
۲۱- اسلامی تاریخ سے	"
۲۲- قال اللہ	"
۲۳- اسلامی دعوت	۳—۰
۲۴- زلزلۂ قیامت	۴—۰
۲۵- سچا راستہ	۱—۰

الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

آج کا ڈوبا ہوا سورج ـــــــــــ
اگلے دن ضرور طلوع ہوتا ہے مگر اکثر لوگ
آنے والے دن تک اس کا انتظار نہیں کرتے

قیمت فی پرچہ ـــــ تین ۳ روپے

الرسالہ کے مشن سے اتفاق رکھنے والوں کا

اجتماع

سابقہ اعلان کے مطابق حلقۂ الرسالہ کا ایک اجتماع ان شاء اللہ بھوپال میں ہوگا۔ یہ ایک تربیتی اور دعوتی اجتماع ہوگا جس میں متفق اور ہمدرد افراد شرکت کریں گے۔

تاریخ ۱۷-۱۸ اپریل ۱۹۸۲ بروز سنیچر اور اتوار

مقام مسجد صوفیہ۔ محلہ احمد آباد۔ بھوپال

کارروائی سنیچر کی صبح کو شروع ہو کر اتوار کی شام کو ختم ہوگی۔

اجتماع میں شریک ہونے والوں کو اپنا سفر خرچ خود برداشت کرنا ہوگا۔ اجتماع گاہ میں دو دن کے لئے کھانے اور قیام وغیرہ کا انتظام ہوگا۔ شرکت کرنے والے حضرات ذیل کے پتہ پر اپنی آمد سے مطلع فرمائیں۔ کوئی صاحب پیشگی اطلاع کے بغیر اجتماع میں تشریف نہ لائیں۔ جو صاحب اطلاع کے بغیر آئیں گے وہ اپنے قیام وطعام کے خود ذمہ دار ہوں گے۔ ذیل کا پتہ صرف آمد کی اطلاع اور زرکرایہ بھیجنے کے لئے ہے۔

بھوپال اسٹیشن سے مسجد صوفیہ کا فاصلہ تقریباً تین میل ہے۔ دیگر سواریوں کے علاوہ بس بھی ہر وقت ملتی ہے۔ جو لوگ ریلوے اسٹیشن سے بذریعہ بس آئیں وہ ٹی بی اسپتال کے بس اسٹاپ پر اتریں۔ وہاں سے مسجد صوفیہ بہت قریب ہے۔ جو لوگ واپسی کے لئے ٹرین کا رزرویشن چاہتے ہوں وہ فوراً کرایہ کی رقم بذریعہ منی آرڈر بھیج کر تفصیلات سے مطلع کریں۔

آمد کی اطلاع اور زرکرایہ بھیجنے کا پتہ:

بنارسی کلاتھ اسٹور۔ ابراہیم پورہ۔ بھوپال

Banarsi Cloth Store - Ibrahimpura - Bhopal 462001 (Telephone 75894)

فہرست

سال اشاعت ۱۹۸۲ — قیمت تین روپیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

زندگی میں سب سے زیادہ طاقت ور جذبہ خوف کا جذبہ ہے۔ خوف کا جذبہ آدمی کے فکر و عمل کی صلاحیتوں کو جتنا جگاتا ہے کوئی دوسری چیز اس کو اتنا نہیں جگاتی۔

دنیا کی تمام سرگرمیاں کسی نہ کسی خوف کا نتیجہ ہوتی ہیں ـــــ معاشی بدحالی کا خوف، بے عزت ہونے کا خوف، برتر طاقت کا خوف، قوی دشمن کا خوف، یا اور کوئی خوف۔ ہر آدمی کسی دیکھے یا ان دیکھے خوف کے تحت عمل کرتا ہے، خواہ وہ اس کو شعوری طور پر جانتا ہو یا نہ جانتا ہو۔

مگر یہ تمام جھوٹے خوف ہیں۔ اصلی خوف جس کے تحت آدمی کو متحرک ہونا چاہئے وہ صرف ایک خدا کا خوف ہے۔ خدا ہی اس قابل ہے کہ اس سے ڈرا جائے اور اس سے تمام اندیشے وابستہ کئے جائیں۔ وہ تمام سرگرمیاں باطل ہیں جو کسی دوسرے خوف کی بنیاد پر ابھری ہوں۔ اور صرف وہی سرگرمی سچی سرگرمی ہے جو اللہ کے خوف کی بنیاد پر قائم ہو۔

خدا نے تمام چیزوں کو پیدا کیا ہے۔ وہی ہر چیز کا مالک ہے۔ اسی کے پاس ہر قسم کے اختیارات ہیں۔ یہ واقعہ کافی ہے کہ آدمی صرف ایک خدا سے ڈرے۔ مگر بات صرف اتنی ہی نہیں ہے اس سے زیادہ سخت بات یہ ہے کہ خدا نے انسان کو صرف پیدا کر کے چھوڑ نہیں دیا ہے۔ وہ ہر شخص کو بالآخر اپنے پاس بلائے گا۔ اس دن وہ ہر ایک سے اس کے قول و عمل کا حساب لے گا اور ہر ایک کو اس کے کارنامۂ زندگی کے مطابق اچھا یا برا بدلہ دے گا۔

واقعہ کا یہ پہلو زندگی کے معاملہ کو بے حد سنگین بنا دیتا ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ آدمی اپنے آپ کو خدا کی ماتحتی میں دے دے۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو وہ سخت ترین سزا سے کسی طرح بچ نہیں سکتا۔

کرنے کا کام کیا ہے، اس سوال کا صرف ایک ہی جواب ہے اور وہ یہ کہ اپنے آپ کو اور دوسرے بندگان خدا کو آگ کے عذاب سے بچانے کی کوشش کی جائے۔ خدا کے پیغمبروں نے زندگی کی جو حقیقت بتائی ہے اس کے مطابق زندگی کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ آدمی آخرت میں خدا کی پکڑ سے بچ سکے۔ اس آنے والے دن کی سختیوں سے اپنے آپ کو بچانا اور دوسرے انسانوں کو اس سے بچنے کی تلقین کرنا یہی موجودہ دنیا میں مسلمانوں کا اصل کام ہے۔ اس کے سوا جو مطلوب چیزیں ہیں وہ سب اسی کام کے نتیجہ میں حاصل ہوتی ہیں۔

وحیدالدین

زندگی کی حقیقت

اس کائنات کا ایک خدا ہے۔ اسی نے تمام چیزوں کو بنایا ہے۔ وہ موت کے بعد تمام انسانوں کو جمع کرکے ان سے حساب لے گا اور پھر ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق یا تو ابدی جنت میں داخل کرے گا یا ابدی جہنم میں۔ یہ انجام ہر ایک کے سامنے آنے والا ہے خواہ وہ کمزور ہو یا طاقتور۔

یہ سنگین حقیقت کسی کے دل میں اتر جائے تو اس کی زندگی کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے۔ وہ ان تمام چیزوں کے بارے میں بے حد حساس ہو جاتا ہے جو آدمی کو جہنم کی آگ میں پہنچانے والی ہیں۔ اور ان تمام چیزوں کا بے حد مشتاق ہو جاتا ہے جو آدمی کو جنت کے باغوں کا مستحق بنانے والی ہیں۔ وہ ہر چیز سے زیادہ اللہ سے ڈرنے لگتا ہے اور ہر چیز سے زیادہ اللہ سے محبت کرنے لگتا ہے۔

خدا اور آخرت کے بارے میں اس کی بڑھی ہوئی حساسیت اس کو بندوں کے بارے میں بھی انتہائی محتاط اور ذمہ دار بنا دیتی ہے۔ ایک انسان سے برائی کرتے ہوئے اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا وہ اپنے آپ کو جہنم کے غار میں گرا رہا ہے۔ بندوں کے ساتھ سرکشی کا سلوک کرتے ہوئے وہ اس طرح ڈرنے لگتا ہے جیسے کہ ہر آدمی اپنے ساتھ جہنم کے فرشتوں کی فوج لئے ہوئے ہے۔ اپنے صاحب معاملہ افراد سے بے انصافی کرنا اس کو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اس نے اپنے آپ کو آگ کے گڑھے میں دھکیل دیا ہے۔ اب کوئی انسان اس کی نظر میں صرف ایک انسان نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ ایک ایسا وجود ہوتا ہے جس کے پیچھے خود خدا اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ کھڑا ہوا ہو۔

ایمانی انقلاب

خدا سب سے بڑی طاقت ہے۔ اس کی پکڑ بہت بڑی ہے اور اس کی سزا بھی بہت بڑی۔ ایسے خدا پر ایمان لانا کوئی سادہ واقعہ نہیں۔ خدا پر ایمان جب کسی کی زندگی میں داخل ہوتا ہے تو اس کی پوری شخصیت کو ہلا دیتا ہے۔

آدمی شیر کو کھلا ہوا دیکھتا ہے تو اس کی شخصیت ہل جاتی ہے۔ اس سے کہیں زیادہ ہلچل آدمی کے اندر اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ وہ خدا کو پالے۔ خدا پر ایمان لانا خدا کو پانے کا اقرار کرنا ہے۔ جب کوئی شخص حقیقی معنوں میں خدا کو پاتا ہے تو خدا اس کے لئے وہ حقیقت بن جاتا ہے جس پر وہ سب سے زیادہ یقین کرے، خدا اس کے لئے وہ طاقت بن جاتا ہے جس سے وہ سب سے زیادہ ڈرے۔

ایمان وہ ہے جو آدمی کی زندگی میں بھونچال بن کر داخل ہو۔ جو قیامت کے زلزلہ سے پہلے آدمی کے لئے زلزلہ بن جائے۔

اس قسم کا ایمان جب کسی کو ملتا ہے تو اس کے پورے وجود پر خدا کا ڈر چھا جاتا ہے۔ اس کے لئے ہر معاملہ خدا کا معاملہ بن جاتا ہے۔ کسی چھوٹے کو بے عزت کرنے سے وہ اس طرح کانپتا ہے گویا وہ مالک کائنات کے سفیر کو بے عزت کر رہا ہے۔ کسی بڑے کی خوشامد کرتے ہوئے اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا وہ خدا کی غیرت کو چیلنج کر رہا ہے۔ حق واضح ہونے کے بعد اس کو نظرانداز کرنا اس کے نزدیک ایسا بن جاتا ہے جیسے کوئی شخص جنت اور جہنم کو اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھے، پھر بھی جنت کے باغوں کو چھوڑ کر جہنم کی آگ میں کود پڑے۔

آزمائش

آدمی کا معاملہ جب کسی سے پڑتا ہے تو اس کو وہ بس ایک انسان کا معاملہ سمجھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ فوراً سرکشی اور بے انصافی پر اتر آتا ہے۔ اگر وہ جانے کہ ہر معاملہ خدا کا معاملہ ہے تو وہ کبھی سرکش نہ بنے، وہ کبھی بے انصافی کا طریقہ اختیار نہ کرے۔

دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب خدا کی اجازت اور اس کے منصوبہ کے تحت ہو رہا ہے۔ اس کے پیچھے خدا کی حکمتِ امتحان کام کر رہی ہے۔ ہر واقعہ جو پیش آتا ہے وہ اس لئے پیش آتا ہے کہ اس کے ذریعہ سے متعلق افراد کو آزمایا جائے۔ حالات میں ڈال کر ہر ایک کو دیکھا جائے کہ کون کیا تھا اور کون کیا نہیں تھا۔

کسی واقعہ کے دوران یہ دیکھنا مقصود ہوتا ہے کہ آدمی اپنے پڑوسی اور اپنے صاحب معاملہ کو ستاتا ہے یا انصاف کے مطابق اس کا حق ادا کرتا ہے۔ کوئی واقعہ اس لئے پیش آتا ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ لوگ اپنے کو جس ترازو سے تولتے ہیں اسی سے دوسرے کو بھی تول رہے ہیں یا اپنے اور دوسرے کے لئے انھوں نے الگ الگ باٹ بنا رکھے ہیں۔ کسی واقعہ کا مقصد یہ جانچنا ہوتا ہے کہ کون آدمی مفاد اور مصلحت کو اہمیت دیتا ہے اور وہ کون ہے جو مفاد اور مصلحت کو نظر انداز کرکے سچائی کی طرف دوڑ پڑتا ہے۔

یہی وہ مواقع ہیں جو آدمی کے ابدی مستقبل کا فیصلہ کرتے ہیں۔ ان مواقع پر درست رویہ اختیار کرکے ایک شخص جنت کا مستحق بن جاتا ہے اور دوسرا شخص غلط رویہ اختیار کرکے اپنے کو جہنم میں گرا لیتا ہے۔

جاننے کی بات

موجودہ دنیا میں آدمی اپنے کو آزاد سمجھ رہا ہے۔ وہ نڈر ہوکر جو چاہے بولتا ہے اور جو چاہے کرتا ہے ۔ اگر کسی کو کچھ مال ہاتھ آگیا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ میرا مستقبل محفوظ ہے ۔ کسی کو کوئی اقتدار حاصل ہے تو وہ اپنے اقتدار کو اس طرح استعمال کرتا ہے جیسے اس کا اقتدار کبھی چھننے والا نہیں ۔ ہر آدمی پُر اعتماد چہرہ لئے ہوئے ہے ۔ ہر آدمی ہنستے ہوئے اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا ہے ۔ یہاں تک کہ اچانک موت کا بگل بج جاتا ہے ۔ خدا کے فرشتے آتے ہیں اور اس کو موجودہ دنیا سے نکال کر ایک مجبور انسان کی طرح اگلی دنیا میں پہنچا دیتے ہیں ۔

یہی ہر آدمی کا معاملہ ہے ۔ جب یہ بھیانک لمحہ آتا ہے تو آدمی اپنے اندازہ کے بالکل خلاف صورت حال کو دیکھ کر دہشت زدہ ہو جاتا ہے ۔ اچانک اس کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ سب کچھ محض دھوکا تھا جس کو اس نے اپنی غفلت سے سب سے بڑی حقیقت سمجھ لیا تھا ۔

وہ کہہ اٹھتا ہے کہ میں نے اپنے کو آزاد سمجھا تھا مگر میں تو بالکل بے اختیار نکلا ۔ میں اپنے کو مال و جائداد والا پا رہا تھا مگر میں تو بالکل خالی ہاتھ تھا ۔ میرا خیال تھا کہ میرے پاس طاقت ہے مگر میں تو خدا کی اس دنیا میں مکھی اور مچھر سے بھی زیادہ بے زور تھا ۔ میں سمجھتا تھا کہ میرے ساتھ بہت سے لوگ ہیں مگر یہاں تو کوئی ایک بھی میرا ساتھی اور مددگار نہیں ۔

آہ وہ انسان جو اسی بات کو نہیں جانتا جس کو اسے سب سے زیادہ جاننا چاہئے ۔

اُس دن

آج کی دنیا میں آدمی کھاتا پیتا ہے۔ گھر بناتا ہے۔ عہدے اور ترقیاں حاصل کرتا ہے۔ وہ جس بات کو چاہتا ہے اسے مانتا ہے اور جس بات کو چاہتا ہے اسے رد کر دیتا ہے۔ وہ آزاد ہے کہ جو چاہے بولے، وہ آزاد ہے کہ جو چاہے کرے اور جس رخ پر چاہے اپنی زندگی کا سفر شروع کر دے۔

یہ صورت حال آدمی کو دھوکے میں ڈالے ہوئے ہے۔ وہ اپنی موجودہ حیثیت کو مستقل حیثیت سمجھ بیٹھا ہے۔ حالانکہ اس کی اصل حیثیت یہ ہے کہ وہ حالت امتحان میں ہے اور یہاں جو کچھ اسے ملا ہوا ہے وہ صرف وقتی طور پر ملا ہوا ہے۔ بہت جلد وہ دن آنے والا ہے جب یہ تمام حیثیتیں اور سامان اس سے چھن جائے گا۔ حتیٰ کہ لباس بھی اتار لیا جائے گا جو آدمی کے اثاثہ کی آخری چیز ہوتا ہے۔ وہ اچانک اپنے آپ کو اس حال میں پائے گا کہ وہ ایک بے زور مجرم کی طرح مالک کائنات کے سامنے کھڑا ہوا ہے۔

اس دن ساری اونچ نیچ مٹ جائے گی۔ خوف و دہشت سے لوگوں کی زبانیں بند ہو چکی ہوں گی۔ آدمی کے اپنے وجود کے سوا ہر چیز اس کا ساتھ چھوڑ دے گی۔ کسی کے لئے یہ موقع نہ ہوگا کہ بے انصافی کر کے بھی کامیاب ہو اور حق کو نظر انداز کر کے بھی حق کا ٹھیکیدار بنا رہے۔

اس آنے والے دن کو جو شخص آج دیکھ لے وہی کامیاب ہے۔ جو شخص اسے کل دیکھے گا اُس کے لئے اس کے سوا کوئی انجام نہیں کہ وہ ہمیشہ کے لئے رسوا ہو کر آگ کا عذاب سہتا رہے۔

صرف کریڈٹ

اس دنیا میں کسی آدمی کو کوئی ذاتی طاقت حاصل نہیں۔ کوئی شخص نہ کسی کو کچھ دیتا، نہ کوئی شخص کسی سے کچھ چھینتا۔ ہر واقعہ جو اس زمین پر ہوتا ہے وہ خدا کی اجازت سے ہوتا ہے۔ انسان کی ساری حیثیت یہ ہے کہ وہ اس دنیا میں امتحان کے لئے ہے۔ اور یہ امتحان بھی صرف ارادہ کی حد تک ہے۔ ارادہ کے سوا انسان کے بس میں اور کچھ نہیں۔

بظاہر سب کچھ اسباب کے اعتبار سے ہو رہا ہے۔ مگر اسباب کی حیثیت ظاہری پردہ سے زیادہ نہیں۔ اس دنیا میں کسی واقعہ کو ظہور میں لانے کے لئے اسباب وعلل کی اتنی زیادہ کڑیاں درکار ہیں جن کی فراہمی کسی انسان کے بس میں نہیں۔ یہ حقیقۃً خدا ہے جو اپنے فرشتوں کے ذریعہ یہ تمام کڑیاں فراہم کرتا ہے۔

جو واقعات ہوتے ہیں وہ اس لئے آدمی کے سامنے لائے جاتے ہیں کہ اس کی جانچ ہو، تاکہ اس کا خدا یہ دیکھے کہ اس کا بندہ مختلف رویوں میں سے کس رویہ کا اپنے لئے انتخاب کرتا ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک صورت حال میں ڈال کر دیکھا جاتا ہے کہ آدمی نے اپنی زبان حق کے لئے کھولی یا ناحق کے لئے۔ کبھی ایک واقعہ کے درمیان یہ دیکھنا مقصود ہوتا ہے کہ آدمی انصاف کا رویہ اختیار کرتا ہے یا بے انصافی کا۔ کبھی ایک واقعہ کے ذریعہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ آدمی اپنے عہد پر قائم رہتا ہے یا عہد سے پھر جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ واقعات کا اہتمام خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ انسان تو صرف اچھا یا برا کریڈٹ لے رہا ہے۔

کل کو جانو

یہ دنیا امتحان کی جگہ ہے۔ اس دنیا میں ہر آدمی کو کسی نہ کسی دائرہ میں اختیار و اقتدار دیا جاتا ہے۔ کسی کے اختیار کا دائرہ بڑا ہے اور کسی کے اختیار کا دائرہ چھوٹا۔ مگر عجیب بات ہے کہ ہر آدمی اپنے دائرۂ اختیار میں وہی کچھ بن جاتا ہے جو دوسرا شخص اپنے دائرۂ اختیار میں بنا ہوا ہے۔ ظاہر کے اعتبار سے لوگوں میں خواہ کتنا ہی فرق ہو، حقیقت کے اعتبار سے ان میں کوئی فرق نہیں۔

ہر آدمی کا یہ حال ہے کہ وہ دوسرے کی کاٹ میں لگا ہوا ہے۔ ہر شخص دوسرے کی نفی پر اپنا اثبات کرنا چاہتا ہے۔ ہر شخص اپنی حیثیت کا غلط اندازہ کرکے یہ سمجھتا ہے کہ اگر اس نے دوسرے کو اس کے مقام سے ہٹا دیا تو اس کا خالی مقام اسے مل جائے گا۔ وہ بھول جاتا ہے کہ جو چیز اس کا انتظار کر رہی ہے وہ کسی کا خالی مقام نہیں بلکہ خود اس کی اپنی قبر ہے۔ دوسرے شخص کو قبر میں پہنچانے والا خود اپنی قبر میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ دوسرے کی بربادی کا خواب دیکھنے والا بالآخر اپنے آپ کو خود اپنی بربادی کے کنارے کھڑا ہوا پاتا ہے۔

ہر آدمی جو آج اپنے کو کامیاب سمجھتا ہے وہ کل اپنے کو ناکام دیکھنے پر مجبور ہوتا ہے۔ یہ واقعہ ہر روز ہو رہا ہے۔ مگر کوئی شخص آج کے بعد آنے والے کل کو نہیں دیکھتا۔ ہر شخص اپنے آج کو جاننے کا ماہر ہے، کسی کو اپنے آنے والے کل کی خبر نہیں۔

اپنے آج کو جاننے والو، اپنے کل کو جانو۔ کیونکہ آخر کار تم جس چیز سے دوچار ہونے والے ہو وہ تمہارا کل ہے نہ کہ تمہارا آج۔

وقت سے پہلے

یہ دنیا امتحان کی جگہ ہے۔ یہاں ہر آدمی اپنا اپنا امتحان دے رہا ہے، وہ چاہے تو درست عمل کر کے امتحان میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ اور اگر وہ غافل رہے تو ناکامی کے انجام سے دوچار ہونے کے لئے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ناکامی کا انجام اپنے آپ ہر آدمی کی طرف دوڑا چلا آرہا ہے، خواہ وہ اس کو کتنا ہی زیادہ ناپسند کرتا ہو۔

اس معاملہ میں آدمی کی مثال برف بیچنے والے دکان دار کی سی ہے۔ برف ہر آن پگھلتا رہتا ہے۔ اس لئے برف کے دکان دار کی کامیابی اس میں ہے کہ وہ برف کے پگھلنے سے پہلے اپنی برف کو قیمت میں تبدیل کرے۔ اگر اس نے دیر کی تو آخر کار اس کے پاس کچھ نہ ہوگا جس سے وہ اپنی تجارت کر سکے۔ وہ اپنا اصل بھی کھو چکا ہوگا اور اسی کے ساتھ اپنا نفع بھی۔

یہی معاملہ انسانی زندگی کا بھی ہے۔ انسان عمر گزرنے کے ساتھ تیزی سے ایک سخت انجام کی طرف چلا جا رہا ہے۔ اس انجام کا آنا یقینی ہے۔ اس سے بچنے کی صورت صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ ــــــ اس وقت کے آنے سے پہلے اپنی زندگی کا صحیح استعمال تلاش کر لیا جائے۔

برف کا کامیاب تاجر وہ ہے جو برف کے پگھلنے سے پہلے اپنی برف کو بیچ ڈالے۔ اسی طرح کامیاب انسان وہ ہے جو اپنی عمر کے تمام ہونے سے پہلے اپنی عمر کو صحیح کاموں میں استعمال کر لے۔ جو آخرت کا مرحلہ سامنے آنے سے پہلے آخرت کے لئے تیاری کر لے۔

آدمی اگر جانے

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ اس دنیا میں جس طرح ہدایت کے مواقع رکھے گئے ہیں اسی طرح گمراہی کے راستے بھی کھلے ہوئے ہیں۔ ہر آدمی آزاد ہے کہ وہ جس رخ پر چاہے چلے۔ وہ مواقع کو جس طرح چاہے استعمال کرے۔ اپنی قوتوں کو جس کام میں چاہے لگائے۔ مگر یہ سب محض وقتی ہے نہ کہ مستقل۔

یہاں جو شخص حق کی آواز کو رد کرنا چاہے اس کو بآسانی ایسے خوبصورت الفاظ مل جاتے ہیں جن کو بول کر وہ اپنے آپ کو جھوٹے یقین میں مبتلا کرلے۔ یہاں دین کی سچی دعوت کو نظرانداز کرکے بھی آدمی ایسے در و دیوار پالیتا ہے جس کے سایہ میں وہ پناہ لے سکے۔ یہاں خدا کی پکار کی طرف سے اپنے کانوں کو بند کرکے بھی ایسی چٹانیں مل جاتی ہیں جو کسی کو یہ تسکین دے سکیں کہ اس نے اپنے لئے ایک مضبوط سہارا دریافت کرلیا۔ مگر جب پردہ ہٹے گا تو یہ چیزیں اتنی بے معنی ثابت ہوں گی جیسے ان کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔

جب قیامت کی چنگھاڑ بلند ہوگی اور کائنات کا مالک اپنے جلال کے ساتھ ظاہر ہوگا تو آدمی اتنا بے بس ہوگا کہ اس کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا کہ ان تمام باتوں کو مان لے جن کو ماننے کے لئے وہ پہلے تیار نہ ہوتا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ آدمی اگر آنے والے دن کی ہولناکی کو جانے تو اس کی چلتی ہوئی زبان بند ہوجائے جس کے الفاظ کا ذخیرہ آج کسی طرح ختم ہونے والا نظر نہیں آتا۔ اس کے اٹھے ہوئے ہاتھ رک جائیں جس کو اخلاق اور انسانیت کا ہر وعظ روکنے میں ناکام ثابت ہو رہا ہے۔

آہ یہ انسان

آج ہر آدمی بے ہوش نظر آتا ہے۔ ہر آدمی اپنے آپ میں اس طرح گم ہے جیسے اس کے اوپر کوئی اور طاقت نہیں۔ حالانکہ موت ہر روز بتا رہی ہے کہ آدمی ایک ایسی حقیقت سے دوچار ہے جس کے مقابلہ میں کسی کا کچھ بس نہیں چلتا۔ انسان کتنا زیادہ مجبور ہے مگر وہ اپنے آپ کو کتنا زیادہ با اختیار سمجھتا ہے۔

آدمی وعدہ کرتا ہے مگر اس کے بعد اس کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اس کے اوپر کسی کا ایک حق آتا ہے مگر وہ اس کو ادا نہیں کرتا۔ آدمی کے سامنے ایک سچائی آتی ہے مگر وہ اس کا اعتراف نہیں کرتا۔ وہ دوسرے کے اوپر یک طرفہ الزام لگاتا ہے اور اپنی غلطی ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ وہ چھوٹوں کو نظر انداز کر کے بڑوں کا استقبال کرتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کو اصول کے تابع کرنے کے بجائے خواہشات کے تابع کرتا ہے۔ وہ زور آور سے دبتا ہے اور بے زور کو ستاتا ہے۔ وہ خدا کو مرکز توجہ بنانے کے بجائے خود اپنی ذات کو مرکز توجہ بناتا ہے۔ وہ جنت کے اشتیاق اور جہنم کے اندیشہ میں جینے کے بجائے دنیا کے اشتیاق اور دنیا کے اندیشوں میں جیتا ہے۔

آدمی یہ سب کچھ کرتا ہے اور بھول جاتا ہے کہ اپنی اس روش سے وہ اپنے آپ کو جہنم کے قریب لے جا رہا ہے اور اپنے آپ کو جنت کے لئے نااہل ثابت کر رہا ہے۔ آہ وہ انسان جس کو اسی چیز کا شوق نہیں جس کا اسے سب سے زیادہ شوق کرنا چاہئے۔ آہ وہ انسان جو اسی چیز سے سب سے زیادہ بے خوف ہے جس سے اسے سب سے زیادہ خوف کرنے کی ضرورت ہے۔

بے ٹھکانا

کسی آدمی کے جہنمی ہونے کے لئے یہ بات کافی ہے کہ وہ حق کے سامنے نہ دبے اور طاقت کے سامنے دب جائے۔ شرافت اور معقولیت اس کو متاثر نہ کر سکے مگر جب ڈنڈے کا خطرہ ہو تو فوراً اپنا سر جھکا دے۔

خدا آخرت میں اپنی ذات کمال کے ساتھ ظاہر ہو گا۔ مگر دنیا میں وہ دلیل کے روپ میں لوگوں کے سامنے آتا ہے۔ دنیا میں جب ایک شخص سچی دلیل کے آگے جھکتا ہے تو دراصل وہ خدا کے آگے جھکتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے لئے آخرت میں جنت کے باغات ہیں۔ اس کے برعکس جب ایک شخص سچی دلیل کے آگے نہیں جھکتا تو وہ دراصل خدا کے آگے نہیں جھکتا۔ یہی وہ لوگ ہیں جو باغی اور سرکش قرار دے کر جہنم کی آگ میں ڈالے جائیں گے۔

کمزور آدمی کی زبان سے سچی بات سن کر جب ایک شخص اس کو نہیں مانتا تو وہ مطمئن رہتا ہے کہ میرا اس سے کچھ بگڑنے والا نہیں۔ وہ بھول جاتا ہے کہ اس نے کسی کمزور کی بات کا انکار نہیں کیا ہے بلکہ خدا کی بات کا انکار کیا ہے، یہ خود خدا کو نظر انداز کرنا ہے اور جو شخص خدا کو نظر انداز کر دے اس کو ساری کائنات نظر انداز کر دیتی ہے۔ اس کے بعد اس زمین و آسمان کے اندر اس کا کوئی ٹھکانا نہیں۔

وہ دن آنے والا ہے جب دلیل والے بے دلیل ہو جائیں گے۔ جب ٹھکانا رکھنے والے بالکل بے ٹھکانا نظر آئیں گے۔ جب مضبوط سہارے والے لوگ ایک تنکا بھی نہ پائیں گے جس کے سہارے وہ اپنے آپ کو کھڑا کر سکیں

خوش فہمیاں

آدمی دوسروں کو دکھ پہنچا کر اپنی خوشیوں کا محل تعمیر کرنے میں لگا ہوا ہے۔ وہ اپنے پڑوسیوں کو ستاتا ہے اور دور کے لوگوں میں خوش نام ہونے کی تدبیریں کر رہا ہے۔ وہ اپنے ذاتی معاملات میں بے انصافی کرکے باہر کی دنیا میں انصاف کا علم بردار بنا ہوا ہے۔ وہ اپنے خلاف ایک لفظ سننے کے لئے تیار نہیں مگر دوسروں کے خلاف سب کچھ کہنے اور کرنے کے لئے وہ اپنے آپ کو خدائی فوجدار سمجھتا ہے۔ اسے اپنی غلطیوں کی خبر نہیں مگر وہ دوسروں کی غلطیاں جاننے کا ماہر بنا ہوا ہے۔

مگر خدا کا انعام ان لوگوں کو ملتا ہے جو اپنے متعلقین کے حقوق ادا کریں۔ جو اپنے پڑوسیوں کو اپنے شر سے بچائیں۔ جو اپنے اہل معاملہ کے ساتھ انصاف کریں۔ جو خود پسندی کے بجائے خدا پسندی کو اپنی زندگی کا طریقہ بنائیں۔ جو لوگوں سے حق اور عدل کی بنیاد پر معاملہ کریں نہ کہ اکڑ اور خود غرضی کی بنیاد پر۔ جو حق کے آگے جھک جائیں چاہے وہ ان کے خلاف ہو۔ جو اپنی انا کو خدا کے حوالے کر دیں اور خدا کی دنیا میں بے انا بن کر رہنے پر راضی ہو جائیں۔

لوگ جہنمی انگاروں میں کودتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ خوبصورت پھولوں سے کھیل رہے ہیں۔ وہ دوزخ کے راستوں میں دوڑ رہے ہیں اور خوش ہیں کہ بہت جلد وہ جنت کے باغوں میں پہنچنے والے ہیں۔ آہ وہ قافلہ جس کے پاس جھوٹی خوش فہمیوں کے سوا اور کوئی سرمایہ نہیں۔ آہ وہ لوگ جو خدا کی دنیا میں اپنے لئے ایک ایسی دنیا بنانا چاہتے ہیں جس کی خدا نے اجازت نہیں دی۔

فرشتہ یا شیطان

خدا کے وفادار بندوں کے مشیر فرشتے ہوتے ہیں اور خدا کے باغی بندوں کے مشیر شیطان۔ اپنی بول چال میں اور زندگی کے معاملات میں کوئی آدمی جو انداز اختیار کرتا ہے اسی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کون آدمی کس کو اپنا مشیر بنائے ہوئے ہے۔

جو آدمی اختلاف کے وقت تواضع اختیار کرے اور جب کوئی حق اس کے سامنے پیش کیا جائے تو حق کے سامنے جھک جائے وہ فرشتوں کا ساتھی ہے۔ ایسا آدمی اپنے عمل سے اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ اس کو یہ توفیق ملی ہے کہ خدا کے فرشتے اس کے مشیر بنیں۔ کیونکہ یہ فرشتوں کی صفت ہے کہ وہ گھمنڈ نہیں کرتے۔ وہ کسی جھجھک کے بغیر حق کا فوراً اعتراف کر لیتے ہیں۔

اس کے برعکس وہ لوگ جو اختلاف کے وقت ظلم اور بے انصافی پر اتر آئیں اور متکبرانہ طریقہ اختیار کریں وہ اپنے عمل سے یہ ثابت کر رہے ہیں کہ وہ شیطان کے ساتھی ہیں۔ انھوں نے شیطان کو اپنا مشیر بنا رکھا ہے۔ کیوں کہ قرآن میں گھمنڈ اور سرکشی کو شیطان کی صفت بتایا گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ موت اور آخرت کے معاملات سے بے خبری ہے جس نے لوگوں کو سرکشی اور بے انصافی کے لئے جری بنا دیا ہے۔ اگر لوگوں کو معلوم ہو کہ کیسا ہیبت ناک دن ان کی طرف دوڑا چلا آرہا ہے تو ان کے چلتے ہوئے قدم رک جائیں اور ان کے پاس بولنے کے لئے الفاظ نہ رہیں۔ جھوٹی تاویلیں کرنے کے بجائے وہ فوراً اپنی غلطی کا اعتراف کریں۔

جب خدا ظاہر ہوگا

خدا کو جب ایک شخص پاتا ہے تو ٹھیک اسی وقت وہ اس حقیقت کو بھی پالیتا ہے کہ خدا نے اس کو اور اس کائنات کو عبث نہیں بنایا ہے۔ جس کائنات کا بنانے اور چلانے والا ایک طاقت ور اور باخبر خدا ہو وہاں یہ ناممکن ہے کہ اتنا بڑا کائناتی کارخانہ یوں ہی خاموش کھڑا رہے اور کبھی اس کی معنویت ظاہر نہ ہو۔

اس طرح آدمی کا ایمان اس کو اس یقین تک پہنچاتا ہے کہ ضرور ہے کہ ایک دن ایسا آئے جب کہ وہ خدا لوگوں کے سامنے ظاہر ہوجائے جو کائنات کے تمام واقعات کے پیچھے کام کر رہا ہے۔ پھر یہی یقین اس کو یہ بھی بتاتا ہے کہ کائنات کے خالق و مالک کا ظہور اس طرح کا غیر متعلق ظہور نہیں ہوگا جیسے تاریک رات کے بعد روشن سورج نکلتا ہے۔ یہ ایک باشعور اور طاقت ور مالک کا ظہور ہوگا۔ خداوند کائنات کا ظہور کائنات کے لئے عدالت کے ہم معنی بن جائے گا۔ خدا کے ظاہر ہوتے ہی اس کے تمام سرکش اور خود پرست بندے خدا کی دنیا میں بالکل بے قیمت ہوجائیں گے۔ وہ اس دن مکھی اور مچھر سے بھی زیادہ حقیر دکھائی دیں گے۔ دوسری طرف اس کے خدا پرست اور وفادار بندے اچانک سرفرازی کا مقام حاصل کریں گے۔

خدا کا غیب میں ہونا خدا کے سرکش بندوں کو اچھل کود کے مواقع دئے ہوئے ہے۔ خدا کا ظاہر ہونا خدا کے وفادار بندوں کے لئے سرفرازی کا دن بن جائے گا۔ اس کے بعد ایک نئی، زیادہ بہتر اور مکمل دنیا شروع ہوگی جہاں سرکش لوگ ابدی طور پر جہنم میں ڈال دئے جائیں گے اور وفادار لوگ ابدی طور پر خوشیوں اور لذتوں کی جنت میں زندگی گزاریں گے۔

موت کا سبق

آدمی زندگی چاہتا ہے مگر بہت جلد اس کو معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں صرف موت اس کا استقبال کرنے کے لئے کھڑی ہوئی ہے۔ عین اس وقت جب کہ وہ اپنی ترقی کے عروج پر پہنچ چکا ہوتا ہے، موت اس کے اور اس کی کامیابیوں کے درمیان حائل ہو جاتی ہے۔ آدمی مجبور ہوتا ہے کہ ایک ایسی دنیا میں داخل ہو جائے جس کے لئے اس نے کوئی تیاری نہیں کی تھی۔

انسان اپنی عظمت کا محل تعمیر کرتا ہے مگر موت کا طوفان اس کو تنکوں کی طرح اڑا کر یہ سبق دیتا ہے کہ انسان کو اس دنیا میں کوئی قدرت حاصل نہیں۔ انسان کہتا ہے کہ میں اپنا مالک ہوں مگر تقدیر اس کو کچل کر اسے بتاتی ہے کہ تیرا مالک کوئی اور ہے۔ انسان موجودہ دنیا میں اپنی آرزوؤں کا باغ اگانا چاہتا ہے مگر موت اس کے منصوبہ کو برباد کر کے یہ سبق دیتی ہے کہ اپنے لئے دوسری دنیا تلاش کرو کیونکہ موجودہ دنیا میں تمھاری آرزوؤں کی تکمیل ممکن نہیں۔

موت ہماری زندگی کی سب سے بڑی معلم ہے۔ موت ہر آدمی کو ایک ایسے سوال کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے جس کے جواب میں زندگی کا تمام راز چھپا ہوا ہے۔ موت ہم کو بتاتی ہے کہ ہم اپنے مالک آپ نہیں ہیں۔ موت ہم کو بتاتی ہے کہ موجودہ دنیا میں ہماری زندگی محض عارضی زندگی ہے۔ موت ہم کو بتاتی ہے کہ موجودہ دنیا وہ مقام نہیں جہاں ہم اپنی تمناؤں کو حاصل کر سکیں۔ موت ہم کو جینا سکھاتی ہے۔ موت ہم کو بتاتی ہے کہ حقیقی کامیابی کو حاصل کرنے کے لئے ہمیں کیا کرنا چاہئے۔

جھوٹی بڑائی

کسی شخص نے اپنی دنیا کی زندگی کو کامیاب بنالیا ہو تو اکثر وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ اس کی آخرت بھی ضرور کامیاب ہوگی۔ حالانکہ دونوں میں کوئی لازمی تعلق نہیں۔

دنیا کی بڑائی بڑائی نہیں۔ وہ صرف امتحان کی غرض سے ہے۔ کسی کو اچھے حالات ملیں یا کسی کو برے حالات، دونوں امتحان کے لئے ہیں۔ یہ آدمی کی جانچ کے پرچے ہیں نہ کہ اس کے عمل کا انجام۔

دوسروں کے مقابلہ میں آپ کو کوئی بڑائی مل جائے۔ یا عزت حاصل ہو جائے تو اپنے مقابلہ میں دوسروں کو حقیر نہ سمجھئے۔ کیوں کہ بڑے اور چھوٹے دونوں آخرکار برابر ہو جانے والے ہیں۔ موت دونوں کو بالکل ایک سطح پر پہنچا دے گی۔ اس کے بعد بڑائی اس کے لئے ہوگی جس کو خدا بڑا بنائے، اور چھوٹا وہ ہوگا جو خدا کے نزدیک چھوٹا قرار پائے۔

دنیا امتحان کی جگہ ہے۔ یہاں آدمی حق کا جھوٹا لبادہ اوڑھ کر اپنے کو اونچے مقام پر بٹھا لیتا ہے۔ مگر بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے جب کہ پردہ ہٹے اور ہر آدمی اپنی اصل صورت میں سامنے آجائے۔ اس وقت کتنے عزت والے ذلت کے گڑھے میں پڑے ہوئے دکھائی دیں گے۔ کتنے انصاف اور انسانیت کا نعرہ لگانے والے انصاف اور انسانیت کے قاتل قرار دئے جائیں گے۔ کتنے بہادری کا ٹائٹل لینے والے بزدلی کی کالک سے روسیاہ ہو رہے ہوں گے۔ کتنے سچائی پر فدا ہونے والے اس حال میں نظر آئیں گے گویا سچائی سے ان کا کوئی تعلق ہی نہ تھا۔

سب سے بڑی مجبوری

غریب آدمی کو یہ حسرت ہوتی ہے کہ اس کے پاس عمدہ مکان نہیں۔ مگر دوسری طرف ان لوگوں کا حال بھی بہت زیادہ مختلف نہیں جن کو ایک غریب آدمی رشک کی نظروں سے دیکھتا ہے۔ دولت مند آدمی کے لئے پیسہ ہونا اس سے زیادہ بڑے مسئلے پیدا کرتا ہے جو غریب آدمی کو پیسہ نہ ہونے کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ ایک بڑا آدمی جس کے گرد انسانوں کی بھیڑ لگی ہوئی ہو، اندر سے اتنا بےچین ہوتا ہے کہ رات کو گولی کھائے بغیر اسے نیند نہیں آتی۔ اس دنیا میں ہر آدمی دکھی ہے، کوئی ایک صورت میں اور کوئی دوسری صورت میں۔

بالفرض کوئی آدمی خوشیوں کا خزانہ اپنے پاس جمع کرے تو وہ بھی بس صبح سے شام تک کے لئے ہوگا۔ اس کے بعد اچانک موت کا بے رحم فرشتہ آئے گا اور اس کو اس طرح پکڑے گا کہ نہ اس کی دولت اس کو بچا سکے گی اور نہ اس کی فوج۔ ہوائی جہاز کے مسافر پر بھی موت اسی طرح قابو پا لیتی ہے جس طرح ایک پیدل چلنے والے پر۔ وہ عالی شان محلوں میں بھی اسی طرح فاتحانہ داخل ہو جاتی ہے جس طرح ایک معمولی مکان میں۔ موت آدمی کی سب سے بڑی مجبوری ہے۔

موت آدمی کو یاد دلاتی ہے کہ وہ آج سے اوپر اٹھ کر سوچے۔ وہ کامیابی کو زندگی کے اُس پار تلاش کرے۔ کامیاب وہ ہے جو موت سے یہ سبق لے لے۔ جو شخص یہ سبق لینے سے محروم رہے اس کی خوشیوں کے چراغ بہت جلد بجھ جائیں گے۔ وہ اپنے کو ایک ایسے بھیانک اندھیرے میں پائے گا جہاں وہ ہمیشہ ٹھوکریں کھاتا رہے اور کبھی اس سے نکل نہ سکے۔

زندگی کا سفر

ہرآدمی امیدوں اور تمناؤں کی ایک دنیا اپنے ذہن میں لئے ہوئے ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں اپنی امیدوں کی دنیا کی طرف بڑھ رہا ہوں۔ میں اپنے خوابوں والے محل کی طرف چلا جا رہا ہوں۔ مگر اس کی موت اسے آکر بتاتی ہے کہ وہ اپنی تمناؤں والی دنیا کی طرف نہیں بلکہ خدا کی دنیا کی طرف بڑھ رہا تھا، وہ دنیا کی منزل کے بجائے آخرت کی منزل کی طرف چلا جا رہا تھا۔ آدمی کہاں جا رہا ہے اور کہاں پہنچ رہا ہے۔ مگر کسی کو اس کی خبر نہیں۔

آدمی اپنے بچوں کے مستقبل کی خاطر اپنا سب کچھ لگا دیتا ہے مگر اس سے پہلے کہ وہ اپنے بچوں کے مستقبل کو دیکھ کر خوش ہو وہ خود اپنے اس مستقبل کی طرف ہانک دیا جاتا ہے جس کے لئے اس نے کوئی تیاری نہیں کی تھی۔ آدمی اپنے آرام کے لئے ایک مکان کھڑا کرتا ہے مگر ابھی وہ وقت نہیں آتا کہ وہ اپنے پسندیدہ مکان میں چین کے ساتھ رہے کہ موت اس کے اور اس کے مکان کے درمیان حائل ہو جاتی ہے۔ آدمی کماتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ میں عزت و ترقی کی بلندیوں پر اپنے کو بٹھانے جا رہا ہوں مگر بہت جلد اس کو معلوم ہوتا ہے کہ آنے والا دن اس کے لئے جس چیز کا انتظار کر رہا تھا وہ ایک سنسان قبر تھی نہ کہ عزت و ترقی کی رونقیں۔

آدمی اپنے وقتی عیش کو کھونا نہیں چاہتا اس لئے وہ کھلی کھلی حقیقتوں کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ اگر وہ جانے کہ اس کا وقتی عیش بالآخر ابدی عذاب میں تبدیل ہونے والا ہے۔ تو اچانک اس کی زندگی کچھ سے کچھ ہو جائے۔

عجیب محرومی

لوگوں کی دوڑ دھوپ آج کس چیز کے لئے ہے ــــــ کھانا، کپڑا، مکان، عزت، دولت اور خوشیوں کی زندگی کے لئے۔ ہر شخص اپنی ساری طاقت بس انھیں چیزوں کے پانے میں لگائے ہوئے ہے۔ سب کی توجہ انھیں چیزوں کی طرف ہے۔ انھیں کے ملنے سے لوگ خوش ہوتے ہیں اور انھیں کے نہ ملنے سے ناخوش۔

مگر موت کا واقعہ بتاتا ہے کہ یہ خوشیاں موجودہ دنیا میں آدمی کے لئے مقدر نہیں۔ یہاں اگر کوئی شخص ان تمام چیزوں کو پالے تب بھی وہ بے حد عارضی مدت کے لئے انھیں پاتا ہے۔ پچاس سال کی جدوجہد کے بعد جب آدمی اپنی ترقیوں کے کنارے پہنچتا ہے تو عین اس وقت موت آجاتی ہے اور اچانک اس کی تمام ترقیوں کو باطل کر دیتی ہے۔

یہ صورت حال بتاتی ہے کہ موجودہ دنیا ان چیزوں کے پانے کی اصل جگہ نہیں۔ ان کو پانے کی جگہ حقیقۃً موت کے بعد آنے والی دنیا ہے جہاں آدمی کو ہمیشہ رہنا ہے۔ لوگ اپنی ساری قوتوں کو دنیا کے مستقبل کو بنانے میں لگائے ہوئے ہیں، آخرت کے مستقبل کو بنانے کی کسی کو فکر نہیں۔ موجودہ عارضی دنیا میں لوگ سب سے زیادہ جس چیز کے طالب ہیں اسی سے وہ زندگی کے اگلے طویل تر مرحلہ میں سب سے زیادہ غافل ہو گئے ہیں۔

آدمی اسی چیز کو کھو رہا ہے جس کو وہ سب سے زیادہ پانا چاہتا ہے۔ محرومی کی یہ قسم بھی کیسی عجیب ہے۔

خدا کا سایہ

وہ وقت کیسا عجیب ہوگا جب لوگوں کو معلوم ہوگا کہ عمل کے نام پر دنیا میں وہ جو کچھ کرتے رہے وہ بے عملی کی بدترین شکل تھی۔ لوگ اپنے آپ کو اوپر اٹھا کر فخر کرتے رہے حالانکہ ان کے لئے فخر کی بات یہ تھی کہ وہ خدا کی اس دنیا میں اپنے آپ کو جھکا دیں۔ وہ اپنی غلطیوں کی تاویل کو کامیابی سمجھتے رہے حالانکہ ان کی کامیابی یہ تھی کہ وہ اپنی غلطیوں کا اعتراف کریں۔ ان کو زبان اس لئے دی گئی تھی کہ اس کو اللہ کی تعریف میں استعمال کریں مگر وہ اپنی زبان کو انسانوں کی تعریف میں استعمال کرتے رہے۔ ان کے اندر خوف ومحبت کے جذبات اس لئے رکھے گئے تھے کہ وہ ان کو اپنے رب کے لئے وقف کر دیں۔ مگر وہ دوسری چیزوں کو اپنے خوف ومحبت کے جذبات کا مرکز بنائے رہے۔ انھوں نے مال جمع کرنے کو سب سے بڑی چیز سمجھا حالانکہ ان کے لئے سب سے بڑی چیز یہ تھی کہ وہ اپنے مال کو اللہ کی راہ میں دے کر بے مال ہو جائیں۔ ان کا اصلی کمال یہ تھا کہ وہ کمزوروں کا لحاظ کریں مگر وہ کمزوروں کو نظر انداز کر کے طاقت وروں کا استقبال کرتے رہے۔ ان کے لئے زیادہ بہتر یہ تھا کہ معانی کے خاموش سمندر میں غوطہ لگائیں مگر وہ شور وغل کے ہنگامے کھڑے کرنے میں مشغول رہے۔ ان کی ترقی کا راز یہ تھا کہ وہ اپنی ذات کا احتساب کرنے والے بنیں مگر وہ دوسروں کا احتساب کرنے میں لگے رہے۔

ہر آدمی نے اپنی خوش خیالیوں کی ایک دنیا بنا رکھی ہے اور اپنے آپ کو اس کے اندر پاکر مطمئن ہے۔ مگر قیامت ایسے تمام گھروندوں کو توڑ دے گی۔ اس وقت صرف وہ شخص محفوظ ہوگا جو خدا کے گھر میں پناہ پکڑے ہوئے تھا، جس نے اپنے لئے خدا کا سایہ حاصل کر لیا تھا۔

قبر کا دروازہ

قبر دوسری زندگی کا دروازہ ہے۔ اس دروازہ کے ذریعہ آدمی آج کی دنیا سے نکل کر کل کی دنیا میں داخل ہو جاتا ہے۔ ہم میں سے ہر شخص جو آج قبر کے اِس پار ہے وہ کل اپنے آپ کو قبر کے اُس پار پائے گا۔ ہر شخص جو زندہ ہے وہ موت کے مقابلے میں اس طرح شکست کھانے والا ہے کہ کوئی نہ ہوگا جو اس کو بچا سکے۔ مگر اس سب سے بڑی حقیقت کو انسان سب سے زیادہ بھولا ہوا ہے۔

ہم میں سے ہر ایک نے یہ منظر دیکھا ہے کہ کسی شخص کے لئے یہ دروازہ کھلا اور پھر ہمیشہ کے لئے اس کے اوپر بند ہو گیا۔ مگر ہم میں سے بہت کم لوگ ہیں جو یہ جانتے ہوں کہ خود ان کے لئے بھی یہ دروازہ ایک دن کھولا جائے گا اور پھر اسی طرح ان کے اوپر بند کیا جائے گا جس طرح وہ دوسروں کے اوپر ہمیشہ کے لئے بند ہو چکا ہے۔

آدمی کی یہ نفسیات بھی کیسی عجیب ہے کہ دوسروں کو وہ ہر روز مرتے ہوئے دیکھتا ہے مگر خود اس طرح زندگی گزارتا ہے گویا اس کو ہمیشہ اسی دنیا میں رہنا ہے۔ اس کے اپنے لئے موت کا وقت کبھی آنے والا نہیں۔ وہ دیکھتا ہے کہ لوگ ایک ایک کرکے روزانہ خدا کے یہاں پیشی کے لئے بلائے جا رہے ہیں۔ مگر خود اپنے کو اس طرح الگ کر لیتا ہے گویا عدالت الٰہی میں حاضری کا یہ دن اس کے اپنے لئے کبھی نہیں آئے گا۔

ہم میں سے ہر شخص زندگی کے مقابلہ میں موت سے زیادہ قریب ہے۔ یہ احساس اگر زندہ ہو تو آدمی ہر موت کو اپنی موت سمجھے۔ وہ دوسرے کا جنازہ دیکھے تو اس کو ایسا معلوم ہو گویا خود اس کی لاش اٹھا کر قبر کی طرف لے جائی جا رہی ہے۔

بولنا بند ہوجائے گا

ہرآدمی جو زندہ ہے وہ ایک روز مرے گا۔ ہرآدمی جو دیکھتا ہے اور بولتا ہے. یقیناً ایک دن اس کی آنکھ بے نور ہوگی اور اس کا بولنا بند ہوجائے گا۔ ہرآدمی پر وہ وقت آنا ہے جب کہ وہ موت کے دروازے پر کھڑا کر دیا جائے۔ اس وقت اس کے پیچھے دنیا ہوگی اور اس کے آگے آخرت۔ وہ ایک ایسی دنیا کو چھوڑ رہا ہوگا جہاں وہ دوبارہ کبھی نہیں آئے گا اور ایک ایسی دنیا میں داخل ہو رہا ہوگا جس سے اس کو کبھی نکلنا نصیب نہ ہوگا۔ وہ اپنے عمل کے مقام سے ہٹا کر وہاں ڈال دیا جائے گا جہاں وہ اپنے عمل کا ابدی انجام بھگتتا رہے۔

ہم زندگی کے مقابلہ میں موت سے زیادہ قریب ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ زندہ ہیں۔ حالانکہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ وہ مرے ہوئے ہیں۔ وہ موت جس کا کوئی وقت مقرر نہ ہو، وہ گویا ہر وقت آرہی ہے۔ ایسی موت کے لئے یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ وہ آچکی ہے، بجائے اس کے کہ یہ کہا جائے کہ وہ آنے والی ہے۔

ہرآدمی زندگی سے موت کی طرف سفر کر رہا ہے۔ کسی کا سفر دنیا کی خاطر ہے اور کسی کا آخرت کی خاطر۔ کوئی سامنے کی چیزوں میں جی رہا ہے اور کوئی چھپی ہوئی چیزوں میں۔ موجودہ دنیا میں دونوں بظاہر یکساں نظر آتے ہیں۔ مگر موت کے بعد آنے والی منزل کے اعتبار سے دونوں کا حال یکساں نہیں۔ جو شخص خدا اور آخرت میں جی رہا ہے وہ اپنے کو بچا رہا ہے اور جو دنیا کی دلچسپیوں اور اپنے نفس کی خواہشوں میں جی رہا ہے وہی وہ شخص ہے جو ہلاک ہوا۔

آخری وقت

ہر آدمی کا ایک آخری وقت مقرر ہے۔ کسی پر سوتے ہوئے وہ وقت آجاتا ہے، کوئی راہ چلتے پکڑ لیا جاتا ہے اور کوئی بستر پر بیمار ہو کر مرتا ہے۔ یہ وقت بہرحال ہر ایک پر آنا ہے، خواہ وہ ایک صورت میں آئے یا دوسری صورت میں۔

موت کا یہ واقعہ بھی کیسا عجیب ہے۔ ایک جیتی جاگتی زندگی اچانک بجھ جاتی ہے۔ ایک ہنستا ہوا چہرہ لمحہ بھر میں اس طرح ختم ہو جاتا ہے جیسے کہ وہ مٹی سے بھی زیادہ بے قیمت تھا۔ حوصلوں اور تمناؤں سے بھری ہوئی ایک روح دفعتاً اس طرح منظر عام سے ہٹا دی جاتی ہے جیسے اس کے حوصلوں اور تمناؤں کی کوئی حقیقت ہی نہ تھی۔

زندگی کس قدر بامعنی ہے، مگر اس کا انجام اس کو کس قدر بے معنی بنا دیتا ہے۔ آدمی بظاہر کتنا آزاد ہے، مگر موت کے سامنے وہ کتنا مجبور نظر آتا ہے۔ انسان اپنی خواہشوں اور تمناؤں کو کتنا زیادہ عزیز رکھتا ہے، مگر قدرت کا فیصلہ اس کی خواہشوں اور تمناؤں کو کتنی بے رحمی کے ساتھ کچل دیتا ہے۔

آدمی اگر صرف اپنی موت کو یاد رکھے تو وہ کبھی سرکشی نہ کرے۔ بہتر زندگی کا واحد راز یہ ہے کہ ہر آدمی اپنی حد کے اندر رہنے پر راضی ہو جائے، اور موت بلاشبہ اس حقیقت کی سب سے بڑی معلم ہے۔

موت آدمی کو بتاتی ہے کہ وہ کسی کو حقیر نہ سمجھے۔ کیونکہ وہ وقت آنے والا ہے جب کہ وہ خود سب سے زیادہ حقیر ہوگا۔ موت آدمی کو یاد دلاتی ہے کہ وہ کسی کو نہ دبائے۔ کیونکہ بہت جلد وہ خود ہزاروں من مٹی کے نیچے دبا ہوا ہوگا۔

آنے والا دن

موت ایک قسم کی گرفتاری ہے۔ موت وہ دن ہے جب کہ فرشتے کسی آدمی کو پکڑ کر اس کے مالک کے پاس پہنچا دیتے ہیں۔

گرفتاری کا یہ دن ہر شخص کی طرف تیزی سے دوڑا چلا آرہا ہے۔ مگر لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ دوسروں کی گرفتاری کو تو خوب جانتے ہیں مگر خود اپنی گرفتاری کی انھیں خبر نہیں۔ وہ دوسروں کے پکڑے جانے کا بہت چرچا کرتے ہیں۔ مگر اپنے لئے آنے والے اس دن کو یاد نہیں کرتے جب کہ خدا کے فرشتے بے رحمی کے ساتھ انھیں پکڑ کر مالک کائنات کی عدالت میں پہنچا دیں گے۔

آدمی دوسروں کی کمیوں کو جاننے کا ماہر بنا ہوا ہے، حالانکہ جاننے والا وہ ہے جو اپنی کمیوں کو جانتا ہو۔ آدمی لفظی جواب دے کر اپنے کو محفوظ سمجھ لیتا ہے، حالانکہ محفوظ وہ ہے جو اپنی غلطیوں کا اعتراف کرے۔

خدا کی گرفتاری کا دن تمام ہولناک دنوں سے زیادہ ہولناک ہے۔ اس کا اگر واقعی احساس ہو جائے تو آدمی کی پوری زندگی بدل جائے۔ وہ اس دنیا میں رہتے ہوئے آخرت کے عالم میں پہنچ جائے۔ وہ خدائی انصاف کے اس ترازو پر آج ہی اپنے کو کھڑا کرے جس پر دوسرے لوگ مرنے کے بعد کھڑے کئے جانے والے ہیں۔

آدمی اگر خدا کی پکڑ سے ڈرتا ہو تو ہر گرفتاری کو وہ اپنی گرفتاری سمجھے۔ دوسرے کے ہاتھ میں ہتھکڑی لگتی ہوئی دیکھے تو اس کو ایسا محسوس ہو گویا خود اس کو باندھ کر کائنات کی عدالت میں لے جایا جا رہا ہے۔

موت کی یاد

آج لوگوں کے پاس الفاظ ہیں جن کو وہ بے تکان دہرا رہے ہیں ۔ مگر ایک وقت آنے والا ہے جب کہ ان کے الفاظ چھن چکے ہوں گے ۔ وہاں کوئی سننے والا نہ ہوگا جو اُن کی باتوں کو سنے ، کوئی پریس نہ ہوگا جو ان کی چیزوں کو چھاپے ، کوئی لاؤڈ اسپیکر نہ ہوگا جو ان کے الفاظ کو فضا میں بکھیرے ۔ ان کی خوش خیالیوں کا محل گر چکا ہوگا ۔ وہ حسرت اور مایوسی کے عالم میں چاروں طرف دیکھیں گے اور کچھ نہ کر سکیں گے ۔

آدمی اگر صرف موت کو یاد کرے تو اس کے لئے وہ تمام چیزیں بالکل بے حقیقت ہو جائیں جن کی خاطر وہ ظلم اور بے انصافی کرتا ہے اور اپنے لئے جہنم کی آگ میں جلنے کا خطرہ مول لیتا ہے ۔ جس مال کو آدمی اپنا سب کچھ سمجھتا ہے وہ اس کو برت نہیں پاتا کہ موت آجاتی ہے اور اس کو اس کے کمائے ہوئے مال سے جدا کر دیتی ہے ۔ اگر آدمی اس حقیقت کو یاد رکھے تو وہ مال کے پیچھے اپنے کو دیوانہ نہ بنائے ۔ آدمی کو کسی سے شکایت ہوتی ہے ، وہ اس کو مٹانے میں لگ جاتا ہے ۔ مگر ابھی وہ اپنے تخریبی منصوبہ کو پورا نہیں کر پاتا کہ موت اس کے اور اس کے دشمن کے درمیان حائل ہو جاتی ہے ۔ اگر یہ حقیقت آدمی کے ذہن میں تازہ ہو تو وہ کبھی کسی کے خلاف کوئی کارروائی نہ کرے ۔ کبھی کسی کو بے عزت کرنے کا منصوبہ نہ بنائے ۔

ایسا گھر جو کل کے دن جل جانے والا ہو اس کو کوئی نہیں خریدتا ۔ ایسا شہر جو اگلے لمحہ بھونچال کی زد میں آنے والا ہو اس میں کوئی آباد نہیں ہوتا ۔ مگر عجیب بات ہے کہ موت کے عظیم تر بھونچال کے معاملہ میں ہر آدمی یہی غلطی کر رہا ہے ۔

کیسی عجیب غفلت

آدمی جب بوڑھا ہوتا ہے تو وہ بالکل نئے تجربہ سے دوچار ہوتا ہے۔ زندگی اب اس کے لئے اپنی تمام معنویت کھو دیتی ہے۔ اس کو نظر آتا ہے کہ جلد ہی وہ ایک نامعلوم دنیا کی طرف چھلانگ لگانے والا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ کوئی ہو جو اس فیصلہ کن لمحہ میں اس کو امید کی کرن دے سکے۔ مگر موت اچانک اس کو اس طرح اپنے قبضہ میں کر لیتی ہے کہ اس کے لئے اس نے کوئی تیاری نہیں کی تھی۔ آدمی ہر قسم کی آزادی سے محروم کر کے مجبوری اور بے بسی کی دنیا میں ڈال دیا جاتا ہے۔

یہ موت ہر آدمی کا پیچھا کر رہی ہے۔ بچپن اور جوانی میں آدمی اسے بھولا رہتا ہے۔ مگر آخر کار تقدیر کا فیصلہ غالب آتا ہے۔ بڑھاپے میں جب کہ وہ کسی کام کے قابل نہیں ہوتا اس کی موت اچانک اس کو ایک ایسی دنیا میں پہنچا دیتی ہے جہاں اس کے لئے اندھیروں میں بھٹکنے کے سوا اور کچھ نہیں۔

آدمی دن کی روشنی میں یہ سمجھ کر اپنا نظام بناتا ہے کہ کچھ دیر کے بعد رات کا اندھیرا چھا جانے والا ہے اور رات کو اس یقین کے ساتھ سوتا ہے کہ چند گھنٹوں کے بعد دوبارہ صبح کی روشنی چاروں طرف پھیل جائے گی۔ مگر آخرت کی دنیا کا کسی کو ہوش نہیں۔ کوئی نہیں جو آنے والی موت کو اس طرح دیکھے جس طرح دن کا ایک مسافر شام کو دیکھتا ہے۔ اور ایسے لوگ تو شاید معدوم کے درجہ میں ہیں جو موت کے دوسری طرف جہنم کو بھڑکتا ہوا دیکھ رہے ہوں۔ ہر آدمی اس طرح زندگی گزار رہا ہے جیسے موت بھی دوسروں کے لئے ہے اور جہنم بھی دوسروں کے لئے۔

آدمی اکیلا ہے

موت یہ ثابت کرتی ہے کہ ہر آدمی اکیلا ہے۔ دنیا میں آدمی دوسروں کے ساتھ ہوتا ہے۔ ہر آدمی ایک خاندان میں شامل ہوتا ہے۔ ہر آدمی اپنے کو کسی نہ کسی مجموعہ سے وابستہ کئے رہتا ہے۔

مگر موت انتہائی بے رحمی کے ساتھ آدمی کو ہر چیز سے الگ کر دیتی ہے۔ موت آدمی کو اس کے ساتھیوں سے جدا کر کے اس کو تنہا کھڑا کر دیتی ہے۔ موت اس حقیقت کو یاد دلاتی ہے کہ آدمی اکیلا ہے۔ کوئی اس کا ساتھی اور مددگار نہیں۔

یہ تجربہ ہر روز اور ہر مقام پر ہوتا ہے۔ آدمی اپنے سامنے دیکھتا ہے کہ ایک آدمی اپنے خاندان اور اپنے گروہ میں جی رہا تھا۔ اس کے بعد موت آئی اور اس نے اس کو کھینچ کر ایک ایسے گڑھے میں پہنچا دیا جہاں نہ کوئی اس کے دائیں ہوتا اور نہ کوئی اس کے بائیں۔ کیسا عجیب اور کیسا شدید ہے یہ تجربہ۔ مگر کوئی نہیں جو اس تجربہ کو دیکھ کر سبق لے۔

دنیا کی زندگی میں ہر موقع پر بہت سے ساتھی اس کی مدد کے لئے کھڑے ہونے والے تھے۔ مگر موت کے بعد کی زندگی میں وہ تنہا اپنی قبر کو بساتا ہے۔ وہ فرشتوں سے مقابلہ کے لئے اکیلا ہوتا ہے۔ وہ خدا کے سامنے اس طرح پہنچتا ہے کہ اس کے آگے پیچھے کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔

انسان اپنے کو بہت کچھ سمجھتا ہے، مگر انسان بے کچھ ہے۔ موت اس لئے آتی ہے کہ وہ آدمی کو اس کی اس حقیقت سے آخری حد تک باخبر کر دے۔

آخرت کا طوفان

ہماری موجودہ دنیا اور آخرت کی دنیا کے درمیان موت کی غیر یقینی دیوار حائل ہے۔ ہر آن یہ اندیشہ ہے کہ موت اس دیوار کو توڑ دے اور اس کے بعد آخرت کے سنگین حقائق ایک بے پناہ سیلاب کی طرح ہمارے اوپر پھٹ پڑیں۔ اس وقت کوئی زور اور کوئی لفظی بازیگری کام نہ آئے گی۔ آدمی بالکل بے سہارا ہوکر اپنے مالک کے سامنے کھڑا ہوگا۔ وہ تمام لوگ تباہی کے دائمی جہنم میں ڈال دئے جائیں گے جو دنیا کی خوش نمائیوں میں اس طرح گم تھے کہ کوئی نصیحت کی بات سننے کے لئے تیار ہی نہ ہوتے تھے۔ صرف وہ شخص بچے گا جس نے مالک کائنات کے سامنے حساب کے لئے پیش ہونے سے پہلے خود اپنا حساب کرلیا ہوگا۔

سب سے زیادہ غافل وہ ہے جو آنے والے دن سے غافل ہے، اس کی غفلت اس کو بچانے والی ثابت نہ ہوگی۔ سب سے زیادہ بے سہارا وہ ہے جو دنیوی اسباب کو اپنا سہارا سمجھے ہوئے ہے حالاں کہ یہ سہارے آخرت میں مکڑی کے جالے سے بھی زیادہ کمزور ثابت ہوں گے۔

بہت سے دیوار اٹھانے والے اپنی دیوار کو گرا رہے ہیں۔ بہت سے لوگ جو اپنے کو دوسروں سے بڑا سمجھ رہے ہیں وہ دوسروں کے پیروں تلے روندے جائیں گے۔ یہ اس دن ہوگا جب آخرت کا طوفان تمام عالم کو زیر وزبر کردے گا۔ اس وقت خدا اپنے فرشتوں کے ساتھ ظاہر ہوگا۔ اس وقت سارے آدمیوں سے پوچھا جائے گا کہ انھوں نے اپنے پیچھے کیا چھوڑا اور اپنے آگے کے لئے کیا روانہ کیا۔

یہ بے خبری

آج لوگوں کے لئے سب سے آسان کام بولنا ہے اور سب سے مشکل کام چپ رہنا۔ مگر بہت جلد وہ دن آنے والا ہے جب کہ بولنا اتنا سنگین کام معلوم ہوگا کہ لوگ سوچیں گے کہ کاش وہ ساری عمر اپنی زبان کو بند رکھتے، کاش انھوں نے اپنے ہونٹوں کو سی لیا ہوتا۔ کاش وہ الفاظ رکھنے کے باوجود بے الفاظ ہو جاتے۔

آدمی کے وجود میں زبان سب سے زیادہ فتنہ کی چیز ہے مگر آدمی اپنی زبان ہی کا سب سے زیادہ غلط استعمال کرتا ہے۔ زبان حق کے اعتراف کے لئے ہے مگر آدمی اپنی زبان کو حق کے انکار کے لئے استعمال کرتا ہے۔ زبان اس لئے ہے کہ آدمی اس سے بھلائی کے الفاظ بولے مگر وہ اپنی زبان سے برائی کے الفاظ نکالتا ہے۔ جب کسی سے معاملہ پڑتا ہے تو آدمی ایک جواب دے کر مطمئن ہو جاتا ہے۔ اگر اس کو احساس ہو کہ آخری جواب کسی انسان کو نہیں بلکہ خدا کو دینا ہے تو وہ بولنے کے بجائے چپ رہنا پسند کرے۔ وقار کو بچانے کے بجائے وقار کو کھو دینا اس کی نظر میں زیادہ محبوب ہو جائے۔

اس قسم کی تمام باتوں کی وجہ یہ ہے کہ آدمی نے غلط طور پر اپنے آپ کو اپنا مالک سمجھ لیا ہے، اس کو یاد نہیں کہ بہت جلد اس کا خالق و مالک ظاہر ہوگا اور اس کو گرفتار کر کے بے بسی کے گڑھے میں پھینک دے گا۔

اگر لوگوں کو معلوم ہو کہ کل ان کا کیا انجام ہونے والا ہے تو ان کا آج ان کے لئے بے لذت ہو جائے۔ ان کی ڈھٹائی اچانک عاجزی میں تبدیل ہو جائے۔ یہ صرف آنے والے کل سے بے خبری ہے جس نے لوگوں کے آج کو ان کے لئے لذیذ بنا رکھا ہے۔

قیامت کی چنگھاڑ

جو لوگ واقعی معنوں میں اپنے رب کو پالیں وہ ایک اور ہی انسان بن جاتے ہیں ۔ بظاہر وہ عام آدمیوں کی طرح ہوتے ہیں مگر ان کا اندرونی انسان بالکل دوسرا انسان ہوجاتا ہے۔ ان کی جینے کی سطح عام انسانوں سے مختلف ہوجاتی ہے۔

ایسے لوگ موجودہ دنیا میں رہتے ہوئے بھی آخرت کی فضاؤں میں پہنچ جاتے ہیں۔ دنیا کی ہر چیز ان کے لئے آخرت کا آئینہ بن جاتی ہے۔ آج کی رونقوں میں انھیں جنت کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ آج کی تلخیاں ان کو جہنم کی یاد دلانے والی بن جاتی ہیں۔ وہ دنیا میں آخرت کو دیکھ لیتے ہیں، وہ زندگی میں موت کا پیغام سن لیتے ہیں۔

مومن حقیقت میں وہی ہے جو دنیا میں آخرت کے عالم کو دیکھ لے۔ جو حالت غیب میں رہتے ہوئے حالت شہود میں پہنچ جائے۔ غیر مومن پر بھی وہ دن آئے گا جب کہ وہ آخرت کی دنیا کو اپنی آنکھوں سے دیکھے گا۔ مگر یہ دیکھنا اس وقت ہوگا جب کہ قیامت کی چنگھاڑ ظاہری پردوں کو پھاڑ دے گی۔ جب غیب اور شہود کا فرق مٹ جائے گا۔ مگر اس وقت کا دیکھنا کسی کے کچھ کام نہ آئے گا۔ کیوں کہ وہ بدلہ پانے کا وقت ہوگا نہ کہ ایمان ویقین کا ثبوت دینے کا۔

قیامت کا فرشتہ صور لئے کھڑا ہے کہ کب حکم ہو اور پھونک مار کر سارے عالم کو تہ وبالا کر دے۔ یہ بے حد ہولناک وقت ہوگا۔ اس وقت آدمی بولنا چاہے گا مگر وہ بول نہ سکے گا۔ وہ چلنا چاہے گا مگر اس کے پاؤں چلنے کی طاقت کھو چکے ہوں گے۔

فیصلہ کا دن

وہ دن آنے والا ہے جب تمام اگلے پچھلے پیدا ہونے والے خدا کے پاس اس حال میں جمع کئے جائیں گے کہ ایک مالک کائنات کے سوا سب کی آوازیں پست ہوں گی ۔ اس دن صرف سچائی میں وزن ہوگا ، اس کے سوا تمام چیزیں اپنا وزن کھو چکی ہوں گی ۔ یہ فیصلہ کا دن ہوگا۔

ہمارے اور اس دن کے درمیان صرف موت کا فاصلہ ہے۔ ہم میں سے ہر شخص ایک ایسے انجام کی طرف چلا جا رہا ہے جہاں اس کے لئے یا تو دائمی عیش ہے یا دائمی عذاب ۔ ہر لمحہ جو گزرتا ہے وہ ہم کو اس آخری انجام سے قریب تر کر دیتا ہے جو ہم میں سے ہر ایک کے لئے مقدر ہے۔ ہر بار جب سورج ڈوبتا ہے تو وہ ہماری عمر میں ایک دن اور کم کر دیتا ہے ، اس عمر میں جس کے سوا آنے والے ہولناک دن کی تیاری کا اور کوئی موقع نہیں۔ ہم کو زندگی کے صرف چند دن حاصل ہیں ، ایسے چند دن جن کا انجام لامحدود مدت تک بھگتنا پڑے گا۔ جس کا آرام بے حد خوش گوار ہے اور جس کی تکلیف بے حد دردناک ۔

قبل اس کے کہ موت آکر ہم کو اس عالم سے جدا کر دے جہاں صرف کرنا ہے اور اس عالم میں پہنچا دے جہاں کرنا نہیں صرف پانا ہے ، ہمارے لئے ضروری ہے ہم اپنی زندگی کا احتساب کر لیں۔ ہم سب کو ایک روز مالک کائنات کے سامنے کھڑا ہونا ہے۔ کیسے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جن کو خدا اپنے وفادار بندوں میں شمار کرے۔ کیوں کہ وہی لوگ اس دن عزت والے ہوں گے۔ کیسے بدبخت ہیں وہ لوگ جن کو خدا رد کر دے۔ کیوں کہ اس کے بعد ان کے لئے رسوائی اور عذاب کے سوا اور کچھ نہیں ۔

ایک ہی موقع

انسان ایک ابدی مخلوق ہے۔ اس کی عمر کا تھوڑا سا حصہ موجودہ دنیا میں گزرتا ہے اور بقیہ تمام حصہ آخرت کی دنیا میں جو مرنے کے بعد سامنے آنے والی ہے۔ موجودہ دنیا عمل کرنے کی جگہ ہے اور اگلی دنیا اپنے عمل کا انجام پانے کی جگہ۔

آخرت کی دنیا کے لئے کوئی شخص جو کچھ کرسکتا ہے اسی موجودہ دنیا میں کرسکتا ہے۔ اس کے بعد کرنا نہیں، صرف بھگتنا ہے۔ موجودہ زندگی کا عرصہ بہت کم ہے۔ کتنے لوگ ہیں جن کو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا مگر آج وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ اسی طرح جو لوگ آج ہم کو دیکھ رہے ہیں، ایک وقت آئے گا کہ ہم ان کے دیکھنے کے لئے اس دنیا میں موجود نہ ہوں گے۔ ہم اپنی عمر پوری کرکے اپنے رب کے پاس جا چکے ہوں گے۔

موجودہ زندگی وہ پہلا اور آخری لمحہ ہے جب کہ انسان اپنے ابدی مستقبل کی تعمیر کے لئے کچھ کرسکتا ہے۔ نہ اس سے پہلے ایسا کوئی موقع انسان کو ملا تھا اور نہ اس کے بعد ایسا کوئی موقع انسان کو ملے گا۔ ہم ایک ایسے امتحان سے گزر رہے ہیں جس کا ایک لازمی نتیجہ سامنے آنے والا ہے۔ اور بہت جلد ہم ایک ایسے لازمی نتیجہ سے دوچار ہوں گے جس سے بچنے کی ہمارے پاس کوئی سبیل نہیں۔

یاد رکھئے، زندگی کا ہر لمحہ جو آپ صرف کر رہے ہیں آخری طور پر صرف کر رہے ہیں۔ کیونکہ وہ دوبارہ آپ کے لئے واپس آنے والا نہیں۔ ہمارے لئے صرف ایک ہی موقع ہے، ہم خواہ اس کو استعمال کریں یا اس کو ضائع کردیں۔ یہ دنیا ہم کو صرف ایک بار دی گئی ہے، خواہ یہاں ہم اپنے لئے جنت کی فصل اگائیں یا جہنم کی۔

اصلی ہارجیت

دنیا میں کوئی کامیاب نظر آتا ہے اور کوئی ناکام ۔ اس بنا پر لوگ اسی دنیا کو ہارجیت کی جگہ سمجھنے لگتے ہیں۔ ان کا ذہن یہ ہوجاتا ہے کہ اسی دنیا کی جنّت جنت ہے اور اسی دنیا کی دوزخ دوزخ۔

مگر یہ محض دھوکا ہے۔ ہارجیت تو دراصل وہ ہے جو اگلی زندگی میں سامنے آنے والی ہے۔ وہ لوگ جو دنیا میں اپنے کو کامیاب سمجھتے ہیں جب پردہ ہٹے گا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے کہ اصل حقیقت تو کچھ اور تھی ۔ اس وقت معلوم ہوگا کہ کون گھاٹے میں رہا اور کون نفع کما لے گیا۔ کس نے دھوکا کھایا اور کون ہوشیار نکلا۔ کون مقابلہ کی دوڑ میں پیچھے رہ گیا اور کون آگے بڑھنے والا ثابت ہوا۔ کس نے اپنی صلاحیتوں کو نتیجہ خیز کام میں لگایا اور کون تھا جس نے اپنی قوتوں کو وقتی تماشوں میں ضائع کر دیا۔ کس نے عزت پائی اور کون رسوا اور ذلیل ہو کر رہ گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ ہار اس کی ہے جو آخرت میں ہارا۔ اور جیت اس کی ہے جو آخرت کے دن جیتا۔ وہ لوگ جو مصلحت پرستی اور موقع شناسی کی مہارت دکھا کر آج کی دنیا میں عزت اور ترقی حاصل کر رہے ہیں، کل کی دنیا میں ان کی یہ مہارتیں بالکل بے کار ثابت ہوں گی ۔ مرنے کے بعد جب وہ آخرت کے عالم میں پہنچیں گے تو وہاں کے حالات میں عزت کی جگہ لینے کے لئے وہ اسی طرح اپنے آپ کو نااہل پائیں گے جس طرح ایک قدیم طرز کا دستکار آدمی روایتی ماحول میں باکمال نظر آتا ہے۔ لیکن اگر وہ جدید طرز کے ٹیکنکل معاشرہ میں پہنچ جائے تو وہاں وہ بالکل بے قیمت ہو جائے گا۔

سب سے بڑا بھونچال

بھونچال خدا کی ایک نشانی ہے۔ بھونچال جب آتا ہے تو وہ تمام دنیوی بھروسوں کو باطل ثابت کر دیتا ہے۔ بھونچال کے لئے پکے محل اور کچی جھونپڑیوں میں کوئی فرق نہیں ۔ طاقت ور اور کمزور دونوں اس کے نزدیک یکساں ہیں۔ وہ بے سہارا لوگوں کو بھی اسی طرح تہس نہس کر دیتا ہے جس طرح ان لوگوں کو جو مضبوط سہارا پکڑے ہوئے ہیں۔

بھونچال پیشگی طور پر یہ بتاتا ہے کہ اس دنیا میں بالآخر ہر ایک کے لئے کیا ہونے والا ہے۔ بھونچال ایک قسم کی چھوٹی قیامت ہے جو بڑی قیامت کا پتہ دیتی ہے۔ جب ہولناک گڑگڑاہٹ لوگوں کے اوسان خطا کر دیتی ہے۔ جب مکانات تاش کے پتوں کی طرح گرنے لگتے ہیں۔ جب زمین کا نچلا حصہ اوپر آجاتا ہے اور جو اوپر تھا وہ نیچے دفن ہو جاتا ہے ۔ اس وقت انسان جان لیتا ہے کہ وہ قدرت کی طاقتوں کے آگے بالکل بے بس ہے ۔ اس کے لئے صرف یہ مقدر ہے کہ وہ اپنی آنکھوں سے اپنی بربادی کا تماشہ دیکھے اور اس کو روکنے کے لئے کچھ نہ کر سکے۔

قیامت کا بھونچال موجودہ بھونچال سے بےحساب گنا زیادہ ہوگا۔ اس وقت سارے سہارے ٹوٹ جائیں گے۔ ہر آدمی اپنی ہوشیاری بھول جائے گا۔ عظمت کے تمام منارے اس طرح گر چکے ہوں گے کہ ان کا کہیں وجود نہ ہوگا۔ اس دن وہی سہارے والا ہوگا جس نے موجودہ چیزوں کو بے سہارا سمجھا تھا۔ اس دن وہی کامیاب ہوگا جس نے اس وقت خدا کو اپنایا تھا جب سارے لوگ خدا کو بھول کر دوسری دوسری چھتریوں کے نیچے پناہ لئے ہوئے تھے۔

موت کے کنارے

ہر آدمی چل رہا ہے۔ ہر آدمی کا چلنا موت پر ختم ہوتا ہے۔ موت کسی کے لئے جنت کا دروازہ ہے اور کسی کے لئے جہنم کا دروازہ۔ وہ آدمی بڑا خوش قسمت ہے جس کی موت اس حال میں آئے کہ وہ اپنے کو جنت کے دروازے پر کھڑا ہوا پائے۔ کیونکہ اس کے بعد وہ ایسی دنیا میں ہوگا جہاں ابدی خوشیاں ہیں۔ اس کے بعد اس کے لئے نہ کوئی رنج ہے اور نہ کوئی ڈر۔ اس کے برعکس جس آدمی کی موت اس کو جہنم کے دروازہ پر پہنچائے اس کی بدبختی کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ کیونکہ اس کے بعد وہ اپنے آپ کو ایک ایسی دنیا میں گھرا ہوا پائے گا جہاں کھرب ہا کھرب سال سے بھی زیادہ مدت تک اس کو اس طرح رہنا ہوگا کہ وہاں اس کے لئے آگ اور دھوئیں کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

کل کی جنت میں اس آدمی کو داخلہ ملے گا جو آج خدا کی بڑائی کو مان کر اس کے آگے جھک جائے۔ جو آج حق پسند اور خیر خواہ بن کر دوسرے انسانوں کے درمیان رہے۔

جہنم ان بدنصیب انسانوں کا قید خانہ ہے جو دنیا میں خدا کی بڑائی کو نہ مانیں۔ جو اپنے معاملات میں بے انصافی کو چھوڑنا گوارا نہ کریں۔ جن سے خدا کے بندوں کو ظلم اور گھمنڈ کا تجربہ ہو نہ کہ تواضع اور انصاف کا۔

جنت اس شخص کے لئے ہے جو آج کی دنیا میں جنتی انسانوں کی طرح رہے۔ اور جہنم اس کے لئے ہے جو آج کی دنیا میں جنتی انسان بن کر رہنے پر راضی نہ ہو۔

بہت جلد

دولت، عزت، اولاد اور اقتدار وہ چیزیں ہیں جن کو آدمی سب سے زیادہ چاہتا ہے۔ وہ ان کو حاصل کرنے کے لئے اپنا سب کچھ لگا دیتا ہے۔ مگر موت کا واقعہ بتاتا ہے کہ اس دنیا میں کسی کے لئے اپنی خواہشوں کی تکمیل ممکن نہیں۔ اس دنیا میں آدمی ان چیزوں کو نہیں پا سکتا جن کو وہ سب سے زیادہ پانا چاہتا ہے۔

آدمی اگر یہ سوچے کہ کسی چیز کو پانے کا کیا فائدہ جب کہ چند ہی روز بعد اس کو چھوڑ کر چلا جانا ہے تو اس کے اندر قناعت آجائے اور دنیا کی تمام لوٹ کھسوٹ ختم ہو جائے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ یہاں پانے اور نہ پانے میں بہت زیادہ فرق نہیں۔ جو پانا اگلے دن کھونا بننے والا ہو اس پانے کی کیا قیمت ہے۔ آدمی اپنی ساری کوشش خرچ کرکے جو چیز حاصل کرتا ہے وہ صرف اس لئے ہوتی ہے کہ اگلے لمحہ وہ اسے کھو دے۔ ہر زندگی بالآخر موت سے دوچار ہونے والی ہے۔ ہر وہ محبوب چیز جس کو آدمی اپنے گرد و پیش جمع کرتا ہے اس کو چھوڑ کر وہ دنیا سے اس طرح چلا جاتا ہے کہ پھر کبھی اس کی طرف نہیں لوٹتا۔

آدمی آج میں جیتا ہے، وہ کل کو بھولا ہوا ہے۔ آدمی دوسرے کا گھر اجاڑ کر اپنا گھر بناتا ہے حالاں کہ اگلے دن وہ قبر میں داخل ہونے والا ہے۔ آدمی دوسرے کے اوپر جھوٹے مقدمے چلا کر اس کو انسانی عدالت میں لے جاتا ہے حالانکہ فرشتے خود اس کو خدا کی عدالت میں لے جانے کے لئے اس کے پاس کھڑے ہوئے ہیں۔ آدمی دوسرے کو نظر انداز کرکے اپنی عظمت کے گنبد میں خوش ہوتا ہے حالانکہ بہت جلد اس کا گنبد اس طرح ڈھ جانے والا ہے کہ اس کی ایک اینٹ بھی دیکھنے کے لئے باقی نہ رہے۔

خدا کی ترازو

امتحان کی اس دنیا میں ہر ایک کے لئے آزادی ہے۔ یہاں یہ ممکن ہے کہ ایک شخص اپنے پڑوسی کو ستائے اس کے باوجود اس کو دینداری کے اسٹیج پر بیٹھنے کے لئے نمایاں جگہ ملی ہوئی ہو۔ ایک شخص اپنی لیڈری کے لئے سرگرم ہو پھر بھی وہ مجاہد حق کے نام سے شہرت پائے۔ ایک شخص اپنے اہل معاملہ سے بے انصافی کا طریقہ اختیار کرے اس کے باوجود امن وانصاف کے نام پر ہونے والے اجلاس میں اس کو صدارت کے لئے بلایا جائے۔ ایک شخص کی تنہائیاں اللہ کی یاد سے خالی ہوں مگر عوامی مقامات پر وہ اللہ کا جھنڈا اٹھانے والا سمجھا جاتا ہو۔ ایک شخص کے اندر مظلوم کی حمایت کا کوئی جذبہ نہ ہو پھر بھی اخبارات کی سرخیوں میں اس کو مظلوموں کے حامی کی حیثیت سے نمایاں کیا جارہا ہو۔ ایک شخص صرف قول کا کارنامہ دکھا رہا ہو، پھر بھی کریڈٹ دینے والے اس کو عمل کا کریڈٹ دے رہے ہوں۔

ہر آدمی کی اصل حقیقت خدا کے علم میں ہے مگر دنیا میں وہ لوگوں کی حقیقت کو چھپائے ہوئے ہے۔ آخرت میں وہ ہر ایک کی حقیقت کھول دے گا۔ وہ وقت آنے والا ہے جب کہ خدا کی ترازو کھڑی ہو اور ہر آدمی کو تول کر دیکھا جائے کہ کون کیا تھا اور کون کیا نہیں تھا۔ اس وقت کا آنا مقدر ہے۔ کوئی شخص نہ اس کو ٹال سکتا اور نہ کوئی شخص اپنے آپ کو اس سے بچا سکتا۔ کامیاب صرف وہ ہے جو آج ہی اپنے کو خدا کی ترازو میں کھڑا کرے۔ کیونکہ جو شخص کل خدا کی ترازو میں کھڑا کیا جائے اس کے لئے بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔

موت کے بعد

ر شخص کے اوپر وہ دن آنے والا ہے جب کہ وہ اپنے آپ کو موت کے دروازہ پر
پائے گا۔ اس کے پیچھے وہ دنیا ہوگی جس کو وہ چھوڑ چکا، جس میں اب وہ واپس
سکتا۔ اور سامنے وہ عالم ہوگا جس میں اب اسے داخل ہونا ہے، جس میں داخلہ
اپنے آپ کو روک نہیں سکتا۔

یصلہ کا یہ دن ہر آدمی کی طرف دوڑا چلا آرہا ہے۔ اس دن ہر آدمی اپنی اصلی
میں ظاہر ہو جائے گا خواہ اس نے اپنے اوپر کتنے ہی زیادہ پردے ڈال رکھے ہوں،
ں نے اپنے آپ کو کیسے ہی خوبصورت الفاظ میں چھپا رکھا ہو۔

وجودہ دنیا میں یہ ممکن ہے کہ ایک خود پرست آدمی اپنے آپ کو خدا پرست کے
ں ظاہر کرے۔ ایک شخص کو اپنے جاہ و مرتبہ سے دلچسپی ہو مگر لوگوں کے
ہ اپنے کو اس انداز میں پیش کرے گویا وہ حق کا سب سے بڑا علم بردار ہے۔ ایک
ا یہ حال ہو کہ ذاتی مصلحتیں اور ذاتی مفادات اس کی سرگرمیوں کا مرکز و محور ہوں
تقریر و تحریر سے وہ لوگوں پر ایسا جادو کرے کہ لوگ اس کو حق کا سب سے بڑا
مجھنے لگیں۔

لر موت انسانی زندگی کا وہ واقعہ ہے جو اس قسم کی تمام چیزوں کو باطل کر دینے
۔ موت کے بعد آدمی جس دنیا میں پہنچتا ہے وہاں اچانک اس قسم کے تمام لبادے
اوپر سے اتر جاتے ہیں۔ وہ اپنی اصلی اور حقیقی صورت میں سامنے آجاتا ہے، اپنے
، اور دوسرے انسانوں کے لئے بھی۔

عدالت میں پیشی

موت ہماری زندگی کا خاتمہ نہیں، وہ ہماری اصل زندگی کا آغاز ہے۔ موت دراصل کسی انسان کا وہ وقت ہے جب وہ مالک کائنات کی عدالت میں آخری فیصلہ کے لئے پیش کر دیا جاتا ہے۔

موت سے پہلے آدمی کو بہت سے کام نظر آتے ہیں۔ مگر موت کے بعد آدمی کے سامنے صرف ایک ہی کام ہوگا ــــــ یہ کہ خدا کے غضب سے وہ کس طرح بچے۔ جب آدمی کے پاس بہت زیادہ وقت ہو تو وہ بہت سے کام چھیڑ دیتا ہے۔ مگر جس شخص کو وقت کے صرف چند لمحے حاصل ہوں وہ صرف وہی کام کرتا ہے جو انتہائی ضروری ہے۔ فیصلہ کن لمحات میں کوئی شخص غیر متعلق یا غیر اہم کام میں مصروف ہونے کی حماقت نہیں کرتا۔

موت کے معاملہ کی نزاکت اس وقت بہت بڑھ جاتی ہے جب یہ دیکھا جائے کہ موت کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ وہ کسی بھی وقت کسی بھی شخص کے لئے آسکتی ہے۔ ایسی حالت میں ایک بتانے والے کے پاس سب سے پہلی اور سب سے بڑی بات جو لوگوں کو بتانے کے لئے ہونی چاہئے وہ یہ ہے کہ وہ لوگوں کو موت کے خطرے سے آگاہ کرے۔ وہ کل سے پہلے لوگوں کو کل کے بارے میں خبر دار کر دے۔

اسلام کی دعوت کیا ہے، آخرت کی چیتاونی۔ یہ قبر کے اُس پار کے معاملات سے قبر کے اِس پار والوں کو باخبر کرنا ہے۔ اسلام کا داعی موت اور زندگی کے درمیان کھڑا ہوتا ہے۔ اس کو موت سے پہلے مرجانا پڑتا ہے تاکہ وہ دوسری طرف کی دنیا کو دیکھے اور مُردوں کے احوال سے زندوں کو باخبر کر سکے۔

سب سے بڑا حادثہ

ہماری دنیا میں جو سب سے بڑا حادثہ پیش آرہا ہے وہ یہ کہ یہاں بسنے والے
ں میں سے تقریباً دس لاکھ آدمی ہر روز مر جاتے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ موت کے
ں کے لئے جن دس لاکھ آدمیوں کی فہرست تیار کر رہے ہیں اس میں اس زمین پر
وں میں سے کس کس کا نام ہو۔ ہم میں سے ہر شخص کو موت آنی ہے۔ مگر ہم میں
شخص نہیں جانتا کہ اس کی موت کب آئے گی اور جن لوگوں کے درمیان ہم زندگی
ہے ہیں ان کے متعلق بھی کچھ نہیں معلوم کہ ان میں سے کون کل اٹھا لیا جائے گا اور کون
بعد سننے اور دیکھنے کے لئے باقی رہے گا۔

یہ آنے والا وقت ہم میں سے ہر شخص کی طرف دوڑا چلا آرہا ہے۔ ہر زندہ انسان
وہ میں مبتلا ہے کہ کل اس کی موت آجائے اور اس کے بعد نہ اس کے لئے سننے کا
ا رہے اور نہ ہمارے لئے سنانے کا۔

یہ صورت حال بتا رہی ہے کہ کرنے کا اصل کام کیا ہے۔ کرنے کا اصل کام یہ ہے
ں سے ہر شخص آخرت کی فکر کرے اور دوسرے انسانوں کو زندگی کے اس حقیقی
سے آگاہ کرے۔ دنیا کی آبادی اگر چار ارب ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم کو
ب کام کرنے ہیں۔ کیوں کہ آج کا ہر آدمی حقیقت سے غافل ہے، ہر آدمی اس کا
ہے کہ اس کو حقیقت کا علم پہنچایا جائے۔ کوئی بڑا طوفان ٹوٹنے والا ہو تو چھوٹی باتیں
تی ہیں۔ موت بلا شبہ سب سے بڑا طوفان ہے۔ اگر آدمی کو اس کا احساس ہو تو وہ
ے زیادہ موت کے بارے میں سوچے اور سب سے زیادہ موت کے بارے میں چرچا کرے۔

آخرت کا اعلان

مسلمان خدا کی طرف سے اس ذمہ داری پر مقرر کئے گئے ہیں کہ وہ دنیا کی تمام قوموں کو بتا دیں کہ قیامت کا ایک دن آنے والا ہے جب کہ ان کا رب ان سے ان کا حساب لے گا اور پھر ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق انعام یا سزا دے گا۔ اس تقرر نے ان کے حال اور مستقبل کو تمام تر اس کام کے ساتھ باندھ دیا ہے۔ ان کی قیمت صرف اس وقت ہے جب کہ وہ خدائی پیغام رسانی کی اس خدمت کو انجام دیں۔ اگر وہ اس کے لئے نہ اٹھیں تو خدا کے نزدیک وہ اپنی قیمت کھو دیں گے۔

اس کام کو چھوڑنے کے بعد کوئی بھی دوسری چیز ان سے قبول نہ کی جائے گی خواہ بظاہر وہ دین و ملت ہی کا کوئی کام کیوں نہ ہو۔ اس ذمہ داری سے غافل ہونے کے بعد خدا ان کو ان کے دشمنوں کے حوالے کر دے گا۔ ان کے اوپر دوسری قومیں غلبہ حاصل کریں گی۔ حتی کہ دوسری بنیادوں پر اٹھائی ہوئی ان کی اسلامی سرگرمیوں پر بھی رولر چلا دیا جائے گا۔ خود ساختہ خیالات کے تحت اگرچہ وہ خوش فہمیوں میں مبتلا رہیں گے۔ مگر حالات کی بے رحم زبان چیخ کر کہہ رہی ہوگی کہ ان کا خدا ان کو چھوڑ چکا ہے۔

دنیا کی قوموں کے سامنے آخرت کا اعلان کرنے کے لئے اگر مسلمان نہیں اٹھتے تو ان کی کوئی قیمت خدا کے نزدیک نہیں ہے، نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں۔ یہود کی تاریخ اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے کافی ہے۔ آدمی کی قیمت اس ذمہ داری کے اعتبار سے ہوتی ہے جس کی ادائگی پر اس کو مامور کیا گیا ہے۔ پھر مسلمان جب اپنی ذمہ داری ہی کو ادا نہ کریں تو اس کے بعد ان کی قیمت ان کے مالک کے نزدیک کیا ہوگی۔

دعوتی ذمہ داری

نیا کا سیلاب اس لئے آتا ہے کہ وہ ہم کو قیامت کے زیادہ بڑے سیلاب کا نقشہ
حقیقت یہ ہے کہ قیامت اسی طرح کا ایک بہت بڑا سیلاب ہے جیسا سیلاب
ماری زمین پر آتا ہے اور بستیوں اور آبادیوں کو تہس نہس کر دیتا ہے۔ یہ آنے والا
جب آئے گا تو ہمارے تمام حفاظتی بند ٹوٹ جائیں گے۔ وہ ہم کو اس طرح گھیرے
ڑ کی چوٹیاں بھی اس کے مقابلہ میں ہم کو پناہ دینے سے عاجز رہیں گی۔

نیا کے سیلاب میں وہی شخص بچتا ہے جس نے اس کے آنے سے پہلے اپنے لئے
بنالی ہوں، اسی طرح آخرت کے سیلاب میں صرف وہ شخص بچے گا جس نے اپنے
دا کے حوالے کر دیا ہو، جو خدا کی کشتی میں سوار ہو گیا ہو۔

ج دنیا کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ قیامت کے آنے والے اس سیلاب سے لوگوں
یا جائے۔ خدا نے اپنے پیغمبر اسی لئے بھیجے تاکہ وہ دنیا والوں کو اس آنے والے
سے خبردار کریں۔ تاکہ موت کے بعد جب خدا لوگوں کو پکڑے تو کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ ہو
ب ایسے معاملہ کے لئے پکڑا جا رہا ہے جس کے بارے میں ہمیں اس سے پہلے کچھ
گیا تھا۔

ب کوئی نبی آنے والا نہیں مگر یہ کام بدستور اپنی جگہ باقی ہے۔ ختم نبوت کے بعد
ہ اسی خاص کام پر مامور ہے۔ اس کی لازمی ذمہ داری ہے کہ وہ تمام قوموں کو اس
رے، قبل اس کے کہ خدا کا وہ سیلاب پھٹ پڑے اور پھر نہ کسی کے لئے خبردار
وقع ہو اور نہ کسی کے لئے خبردار ہونے کا۔

اس وقت کیا ہوگا

وہ وقت کیسا عجیب ہوگا جب خدا کی عدالت قائم ہوگی۔ کسی کے لئے ڈھٹائی اور انکار کا موقع نہ ہوگا۔ وہ شخص جس کو دنیا میں لوگوں نے بے قیمت سمجھ کر نظرانداز کردیا تھا وہی خدا کی نظر میں سب سے زیادہ قیمت والا قرار پائے گا۔ جس کو لوگوں نے اپنے درمیان سب سے کمزور سمجھ لیا تھا وہی اس وقت خدا کے حکم سے وہ شخص ہوگا جس کی گواہی پر لوگوں کے لئے جنت اور جہنم کا فیصلہ کیا جائے۔

اس وقت ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جو دنیا میں بہت بولنے والے تھے مگر وہاں اپنے آپ کو گونگا پائیں گے۔ جو دنیا میں عزت اور طاقت والے سمجھے جاتے تھے مگر وہاں اپنے آپ کو بالکل بے زور دیکھنے پر مجبور ہوں گے۔ جب ان کا ظاہری پردہ اتارا جائے گا اور پھر دیکھنے والے دیکھیں گے کہ دین کا لبادہ پہننے والے دین سے کس قدر خالی تھے۔ جب کتنی سفیدیاں کالی نظر آئیں گی اور کتنی رونقیں بے رونق ہو چکی ہوں گی۔

موجودہ دنیا میں لوگ مصنوعی غلافوں میں چھپے ہوئے ہیں۔ کسی کے لئے خوبصورت الفاظ اس کی اندرونی حالت کا پردہ بنے ہوئے ہیں اور کسی کو اس کی مادی رونقیں اپنے جلو میں چھپائے ہوئے ہیں۔ مگر آخرت میں لوگوں کے الفاظ بھی ان سے چھن جائیں گے اور ان کی مادی رونقیں بھی۔ اس وقت ہر آدمی اپنی اصلی صورت میں سامنے آجائے گا۔ کیسا سخت ہوگا وہ دن۔ اگر آج لوگوں کو اس کا اندازہ ہوجائے تو ان کے الفاظ کا ذخیرہ ختم ہوجائے۔ کسی چیز میں ان کے لئے لذت باقی نہ رہے۔ دنیا کی عزت بھی ان کو اتنی ہی بے معنی معلوم ہو جتنی دنیا کی بے عزتی۔

اسلام کی روح

مومن کون ہے۔ مومن وہ ہے جو اس واقعہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے کہ اسرافیل صور لئے کھڑے ہیں اور اس بات کے منتظر ہیں کہ کب خدا کا حکم ہو اور پھونک مار کر سارے عالم کو تہ و بالا کر دیں۔ کافر اور مومن کا فرق حقیقۃً اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ کافر دنیا کی سطح پر جیتا ہے اور مومن آخرت کی سطح پر۔ ایک ظاہر حیات میں گم رہتا ہے۔ دوسرا آخرِ حیات میں اپنے لئے زندگی کا راز پا لیتا ہے۔

اسلام کا مطلب یہ ہے کہ زندگی خدا اور آخرت کی یاد میں ڈھل جائے۔ یہاں بندہ اپنے رب سے روحانی سطح پر ملاقات کرتا ہے۔ مگر جب اسلام کے ماننے والوں کو زوال ہوتا ہے تو اسلام کی روح غائب ہو جاتی ہے اور صرف اس کے ظاہری پہلو باقی رہ جاتے ہیں۔ اسلام اپنی سطح سے اتر کر ماننے والوں کی سطح پر آ جاتا ہے۔

اب نظر نہ آنے والے خدا سے تعلق کمزور ہو جاتا ہے البتہ نظر آنے والے خداؤں کا چرچا خوب شروع ہو جاتا ہے۔ خدا کے لئے تنہائیوں میں رونا باقی نہیں رہتا البتہ اسلام کے نام پر ہنگامے خوب ترقی کرتے ہیں۔ نماز لوگوں کی روح کو پُر رونق نہیں بناتی البتہ مسجدوں کی رونقیں بہت بڑھ جاتی ہیں۔ روزہ سے پرہیزگاری کا جذبہ نکل جاتا ہے البتہ افطار و سحر کی رسوم خوب دکھائی دیتی ہے۔ عید میں عبدیت کی روح نہیں ہوتی البتہ تماشے کی چیزیں خوب رونق پکڑتی ہیں۔ رسول لوگوں کے لئے زندگی کا رہنما نہیں ہوتا، البتہ رسول کے نام پر جشن اور جلسہ جلوس کی بہاریں شباب پر نظر آتی ہیں۔

خلاصہ یہ کہ خدا کے دین کو اپنی دنیا دارانہ زندگی میں ڈھال لیا جاتا ہے۔

بھیڑ کے درمیان سناٹا

دین جب قومی روایت بن جائے تو ایک نیا عجیب و غریب منظر سامنے آتا ہے۔ دین کے نام پر طرح طرح کی ظاہری دھوم بہت بڑھ جاتی ہے مگر اصل دین اتنا نایاب ہوتا ہے کہ ڈھونڈنے سے بھی کہیں نہیں ملتا۔

یہی حال آج ملت کا ہو رہا ہے۔ نمازیوں کی تعداد بڑھ رہی ہے مگر اللہ کے ڈر سے جھکنے والے نظر نہیں آتے۔ دین کی خاطر بولنے والے بہت ہیں مگر دین کی خاطر چپ ہو جانے والا کوئی نہیں۔ ملت کو بربادی سے بچانے کے لئے ہر شخص مجاہد بنا ہوا ہے مگر فرد کو بربادی سے بچانے کے لئے کوئی بے قرار نہیں ہوتا۔ اپنی حق پرستی کو جاننے کا ماہر ہر ایک ہے مگر دوسرے کی حق پرستی کو جاننے کی ضرورت کسی کو محسوس نہیں ہوتی۔ چوک پر خدا پرستی کا مظاہرہ کرنے والوں کی ہر طرف بھیڑ لگی ہوئی ہے مگر تنہائیوں میں خدا پرست بننے سے کسی کو دلچسپی نہیں۔ خدا کے دین کو ساری دنیا میں غالب کرنے کا چیمپین ہر آدمی بنا ہوا ہے مگر خدا کے دین کو اپنی زندگی میں غالب کرنے کی فرصت کسی کو نہیں۔ اچھے الفاظ کا بھنڈار ہر ایک کے پاس موجود ہے۔ مگر اچھے عمل کا خزانہ کسی کے پاس نہیں۔ جنت کی کنجیوں کے گچھے ہر ایک کے پاس ہیں مگر جہنم کے اندیشے سے تڑپنے کی ضرورت کوئی محسوس نہیں کرتا۔ دنیوی رونقوں والے اسلام کی طرف ہر شخص دوڑ رہا ہے مگر اس اسلام سے کسی کو دلچسپی نہیں جو زندگی میں آخرت کا زلزلہ پیدا کر دے۔

انسانوں کی بھیڑ کے درمیان سناٹے کا یہ عالم شاید آسمان نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا ہوگا۔

REGD. R. N. NO. 28822/76
REGD. NO. D. (DN) 532

ISSUE NO. 65
APRIL 1982

AL-RISALA MONTHLY

JAMIAT BUILDING QASIMJAN STREET DELHI-110006 (INDIA) PHONE 232231

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

۱۔ الاسلام	۱۵-۰۰
۲۔ مذہب اور جدید چیلنج	۱۵-۰۰
۳۔ ظہور اسلام	۱۵-۰۰
۴۔ دین کیا ہے؟	۲-۰۰
۵۔ قرآن کا مطلوب انسان	۵-
۶۔ تجدید دین	۳-۰۰
۷۔ اسلام دین فطرت	۳-۰۰
۸۔ تعمیر ملت	۳-۰۰
۹۔ تاریخ کا سبق	۳-۰۰
۱۰۔ مذہب اور سائنس	۵-۰۰
۱۱۔ عقلیات اسلام	۳-۰۰
۱۲۔ فسادات کا مسئلہ	۲-۰۰
۱۳۔ انسان اپنے آپ کو پہچان	۱-۰۰
۱۴۔ تعارف اسلام	۲-۵۰
۱۵۔ اسلام پندرھویں صدی میں	۲-۰۰
۱۶۔ راہیں بند نہیں	۳-۰۰
۱۷۔ دینی تعلیم	۳-۰۰
۱۸۔ ایمانی طاقت	۳-۰۰
۱۹۔ اتحاد ملت	۳-۰۰
۲۰۔ سبق آموز واقعات	زیر طبع
۲۱۔ اسلامی تاریخ سے	
۲۲۔ قال اللہ	
۲۳۔ اسلامی دعوت	۳-۰۰
۲۴۔ زلزلۂ قیامت	۴-۰۰
۲۵۔ سچا راستہ	۱-۰۰

مکتبہ الرسالہ ۔ دہلی ۶

Printed & Published by Saniyasnain Khan at J.K. Offset Printers Delhi-110006.

راستہ صرف اس آدمی کے لئے بند ہے جس کو
راستہ چلنا نہ آتا ہو ——————
ہوا کے لطیف جھونکے ہر روز یہ پیغام دے رہے ہیں

قیمت فی پرچہ —— تین ۳ روپے

راہیں بند نہیں
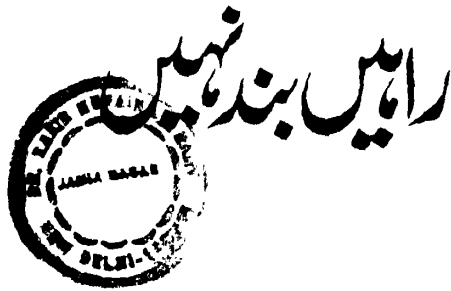
مولانا وحید الدین خاں

مکتبہ الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

فہرست

اشاعت اول ۱۹۸۲

قیمت تین روپیہ

امکان کبھی ختم نہیں ہوتا

مغرب کی طرف پھیلی ہوئی پہاڑیوں کے اوپر سورج ڈوب رہا تھا۔ آفتابی گولے کا آدھا حصہ پہاڑ کی چوٹی کے نیچے جاچکا تھا اور آدھا حصہ اوپر دکھائی دیتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد پورا سورج ابھری ہوئی پہاڑیوں کے پیچھے ڈوب گیا۔

اب چاروں طرف اندھیرا چھانے لگا۔ سورج دھیرے دھیرے اپنا اجالا سمیٹتا جا رہا تھا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارا ماحول گہری تاریکی میں ڈوب جائے گا۔ مگر عین اس وقت جب کہ یہ عمل ہو رہا تھا، آسمان پر دوسری طرف ایک اور روشنی ظاہر ہونا شروع ہوئی۔ یہ بارھویں کا چاند تھا جو سورج کے چھپنے کے بعد اس کی مخالف سمت سے چمکنے لگا۔ اور کچھ دیر کے بعد پوری طرح روشن ہو گیا۔ سورج کی روشنی کے جانے پر زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ ایک نئی روشنی نے ماحول پر قبضہ کر لیا۔

"یہ قدرت کا اشارہ ہے" میں نے اپنے دل میں سوچا "کہ ایک امکان جب ختم ہوتا ہے تو اسی وقت دوسرے امکان کا آغاز ہو جاتا ہے۔ سورج غروب ہوا تو دنیا نے چاند سے اپنی بزم روشن کر لی۔

اسی طرح افراد اور قوموں کے لئے بھی ابھرنے کے امکانات کبھی ختم نہیں ہوتے۔ زمانہ اگر ایک بار کسی کو گرا دے تو خدا کی اس دنیا میں اس کے لئے مایوس ہونے کا کوئی سوال نہیں۔ وہ نئے مواقع کو استعمال کر کے دوبارہ اپنے ابھرنے کا سامان کر سکتا ہے۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ آدمی دانش مندی کا ثبوت دے اور مسلسل جدوجہد سے کبھی نہ اکتائے۔

یہ دنیا خدا نے عجیب امکانات کے ساتھ بنائی ہے۔ یہاں مادہ فنا ہوتا ہے تو وہ توانائی بن جاتا ہے۔ تاریکی آتی ہے تو اس کے بطن سے ایک نئی روشنی برآمد ہو جاتی ہے۔ ایک مکان گرتا ہے تو وہ دوسرے مکان کی تعمیر کے لئے زمین خالی کر دیتا ہے۔ یہی معاملہ انسانی زندگی کے واقعات کا ہے۔ یہاں ہر ناکامی کے اندر سے ایک نئی کامیابی کا امکان ابھر آتا ہے۔ دو قوموں کے مقابلہ میں ایک قوم آگے بڑھ جائے اور دوسری قوم پیچھے رہ جائے تو بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ اس کے بعد ایک اور عمل شروع ہوتا ہے۔ بڑھی ہوئی قوم کے اندر عیش پرستی اور سہولت پسندی آجاتی ہے۔ دوسری طرف پچھڑی ہوئی قوم میں محنت اور جدوجہد کا نیا جذبہ جاگ اٹھتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی اس دنیا میں کسی کے لئے پست ہمت یا مایوس ہونے کا سوال نہیں۔ حالات خواہ بظاہر کتنے ہی ناموافق دکھائی دیتے ہوں، اس کے آس پاس آدمی کے لئے ایک نئی کامیابی کا امکان موجود ہوگا۔ آدمی کو چاہئے کہ اس نئے امکان کو جانے اور اس کو استعمال کر کے اپنی کھوئی بازی کو دوبارہ جیت لے۔

کوئی چیز مشکل نہیں

ہیرا ہماری تمام معلوم دھاتوں میں سب سے زیادہ سخت ہے۔ دنیا کی کوئی چیز ہیرے سے زیادہ سخت نہیں ہوتی۔ شیشہ کا فریم بنانے والے کو آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہ "قلم" کی صورت کی ایک چیز شیشہ کے تختہ پر گزارتا ہے اور شیشہ کٹ کر دو ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ اس قلم میں ہیرے کا ٹکڑا لگا ہوتا ہے۔ ایسا اس لئے ممکن ہوتا ہے کہ ہیرا انتہائی سخت چیز ہے، خواہ وہ قدرتی ہو یا مصنوعی۔

تمام دوسری معدنیات کے برعکس ہیرے پر کسی قسم کا ایسڈ (تیزاب) اثر نہیں کرتا۔ آپ ہیرے کو خواہ کسی بھی تیزاب میں ڈالیں وہ ویسا کا ویسا باقی رہے گا۔ مگر اسی سخت ترین ہیرے کو اگر ہوا کی موجودگی میں خوب گرم کیا جائے تو وہ ایک بے رنگ گیس بن کر اڑ جائے گا۔ اور یہ گیس کاربن ڈائی آکسائڈ ہوگی۔

اسی طرح ہر چیز کا ایک "توڑ" ہوتا ہے۔ اگر آپ کسی مشکل کا مقابلہ وہاں کریں جہاں وہ اپنی سخت ترین حیثیت رکھتی ہے تو ممکن ہے کہ آپ کی کوشش کامیاب نہ ہو۔ مگر کسی دوسرے مقام سے آپ کی یہی کوشش انتہائی حد تک نتیجہ خیز ہو سکتی ہے۔

جب بھی آپ کا مقابلہ کسی مشکل سے پیش آئے تو سب سے پہلے یہ معلوم کیجئے کہ اس کا کمزور مقام کون سا ہے۔ اور جو اس کا کمزور مقام ہو وہیں سے اپنی جدوجہد شروع کر دیجئے۔ ایک چیز کسی اعتبار سے ناقابل شکست ہو سکتی ہے۔ مگر وہی چیز دوسرے اعتبار سے آپ کے لئے موم ثابت ہوگی۔

ایک شخص جس کو آپ کڑوے بول سے اپنا موافق نہ بنا سکے اس کو آپ میٹھے بول سے اپنا موافق بنا سکتے ہیں۔ اپنے جس حریف کو آپ لڑائی کے ذریعہ دبانے میں کامیاب نہ ہو سکے اس کو آپ اخلاق اور شرافت کے ذریعہ دبانے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ ایک ماحول جہاں آپ مطالبہ اور احتجاج کے ذریعہ اپنا مقام حاصل نہ کر سکے وہاں آپ محنت اور لیاقت کے ذریعہ اپنا مقام حاصل کر سکتے ہیں۔

ہیرا تیزاب کے لئے سخت ہے مگر وہ آنچ کے لئے نرم ہو جاتا ہے۔ یہی معاملہ انسان کا بھی ہے۔ ایک آدمی اگر ایک اعتبار سے سخت نظر آئے تو اس کو ہمیشہ کے لئے سخت نہ سمجھ لیجئے۔ اگر وہ ایک اعتبار سے سخت ہے تو دوسرے اعتبار سے نرم بھی ہو سکتا ہے۔

ہر چیز کا یہ حال ہے کہ وہ کسی اعتبار سے سخت ہے اور کسی اعتبار سے نرم۔ ایک شخص ایک انداز سے معاملہ کرنے میں بے لچک نظر آتا ہے مگر وہی دوسرے انداز سے معاملہ کرنے میں ہر شرط پر راضی ہو جاتا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو جاننے میں زندگی کی تمام کامیابیوں کا راز چھپا ہوا ہے۔

تنگی میں وسعت

ایک آدمی نے شہر میں عینک کی دکان کھولی۔ عینک بیچنے والوں کو اپنے گاہکوں کی سہولت کے لئے آنکھ کے ٹسٹ کا انتظام بھی کرنا ہوتا ہے۔ تاکہ آدمی ایک ہی جگہ اپنی آنکھوں کی جانچ کرائے اور وہیں سے عینک بھی لے لے۔ مگر اس آدمی کی دکان ٹسٹ کی ضرورت کے لئے چھوٹی تھی۔ آنکھ کے ٹسٹ میں دور کی نگاہ جانچنے کے لئے اصولاً ۱۸ فٹ کے فاصلہ سے پڑھوایا جاتا ہے، جب کہ اس دکان میں صرف اس کے نصف کے بقدر گنجائش تھی۔ یعنی گاہک کو بٹھانے کی جگہ سے لے کر دیوار تک کا فاصلہ بمشکل ۹ فٹ بنتا تھا۔

"نو فٹ کو شیشہ لگا کر اٹھارہ فٹ کرلیں گے" دکان دار نے اپنے دوست کے سوال کے جواب میں کہا۔ دوست نے اس سے پوچھا تھا کہ تم اتنی چھوٹی دکان میں آنکھوں کے ٹسٹ کا انتظام کیسے کروگے۔ دکان دار نے بتایا کہ پڑھانے والے حروف کا چارٹ جس دیوار پر ٹنگا ہو، اس کے بالکل سامنے دوسری دیوار پر اگر آئینہ لگا دیا جائے اور ٹسٹ کرانے والے کو اصل چارٹ کے بجائے آئینہ کے عکس میں پڑھوایا جائے تو پڑھنے والے شخص اور پڑھی جانے والی چیز کے درمیان کا فاصلہ خود بخود دگنا ہو جاتا ہے۔ آدمی کی نگاہ پہلے ۹ فٹ کا فاصلہ طے کرکے آئینہ کو دیکھتی ہے۔ پھر آئینہ کی مدد سے اس کی نگاہ مزید ۹ فٹ کا فاصلہ طے کرکے چارٹ تک پہنچتی ہے۔ اس طرح کل اٹھارہ فٹ ہو جاتے ہیں۔ دکان دار نے ایسا ہی کیا۔ چھوٹی دکان کے باوجود اس کے یہاں آنکھوں کے ٹسٹ کا ویسا ہی انتظام ہو گیا جیسا بڑی دکانوں میں ہوتا ہے۔

یہی اصول زندگی کے ہر معاملہ میں چسپاں ہوتا ہے۔ آپ کے مواقع اگر کم ہوں، آپ کے لئے پھیلنے کا دائرہ تنگ ہو تو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ اپنی عقل کو استعمال کرکے اپنے "نو فٹ" کو "اٹھارہ فٹ" بنا سکتے ہیں۔ آپ کا مکان چھوٹا ہو تو دو منزلہ بنا کر اس کو وسیع کرسکتے ہیں۔ آپ کے پاس سرمایہ کم ہو تو دیانت داری کا ثبوت دے کر اس کی تلافی کرسکتے ہیں۔ آپ کی ڈگری چھوٹی ہو تو خوش اخلاقی کے ذریعہ اس کو زیادہ کارآمد بنا سکتے ہیں۔ لڑکر آپ کے لئے جیتنے کے مواقع نہیں ہیں تو حکمت کا طریقہ اختیار کرکے اپنے حریف کو قابو میں لا سکتے ہیں۔ سیاسی اقتدار میں آپ کو کم حصہ ملا ہے تو اقتصادی میدان میں ترقی کرکے اپنے آپ کو آگے لے جاسکتے ہیں۔ تعداد کے اعتبار سے اگر آپ اقلیت میں ہیں تو اتحاد اور تنظیم میں اضافہ کرکے آپ اکثریت کی برابری کرسکتے ہیں۔

ہر چھوٹی "دکان"، بڑی دکان بن سکتی ہے۔ کوئی دکان اسی وقت تک چھوٹی ہے جب تک دکان دار نے اس کو بڑھانے والی حکمت کو استعمال نہ کیا ہو۔ بڑھانے والی حکمت کو استعمال کرنے کے بعد اس دنیا میں کوئی دکان چھوٹی دکان نہیں۔

کچھ اور کرنا ہے

اٹھارویں صدی میں جن انگریزوں کی سرفروشی نے ہندستان کو برطانیہ کی نوآبادی بنایا ان میں لارڈ رابرٹ کلائو (۱۷۷۴ ـ ۱۷۲۵) کا نام سرفہرست ہے۔ ۱۷۴۳ میں جبکہ اس کی عمر ۱۸ سال تھی، وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک کلرک کی حیثیت سے مدراس آیا۔ اس وقت اس کی تنخواہ صرف پانچ پونڈ سالانہ تھی۔ یہ رقم اس کے خرچ کے لئے بہت ناکافی تھی۔ چنانچہ وہ قرضوں کے بوجھ کے نیچے دبا رہتا اور مایوسانہ جھنجلاہٹ کے تحت اپنے ساتھیوں اور افسروں سے لڑتا جھگڑتا رہتا۔

اس کے بعد ایک حادثہ ہوا جس نے اس کی زندگی کے رخ کو بدل دیا۔ اس نے اپنی ناکام زندگی کو ختم کرنے کے لئے ایک روز بھرا ہوا پستول لیا اور اپنے سر کے اوپر رکھ کر اس کی لبلبی دبا دی۔ مگر اس کو سخت حیرت ہوئی جب اس نے دیکھا کہ اس کا پستول نہیں چلا ہے۔ اس نے پستول کھول کر دیکھا تو وہ گولیوں سے بھرا ہوا تھا۔ اپنے ارادہ کی حد تک اپنے کو ہلاک کر لینے کے باوجود وہ بدستور زندہ حالت میں موجود تھا۔

یہ بڑا عجیب واقعہ تھا۔ رابرٹ کلائیو اس کو دیکھ کر چلا اٹھا: خدا نے یقیناً تم کو کسی اہم کام کے لئے محفوظ رکھا ہے،، اب اس نے کلرکی چھوڑ دی اور انگریزی فوج میں بھرتی ہو گیا۔ اس زمانہ میں انگریز اور فرانسیسی دونوں بیک وقت ہندستان میں اپنا قدم جمانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں دونوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ اس جنگ میں رابرٹ کلائیو نے غیر معمولی صلاحیت اور بہادری کا ثبوت دیا۔ اس کے بعد اس نے ترقی کی انتہا۔ اس کو انگریزی فوج میں کمانڈر انچیف کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ جس کلائیو نے مایوس ہو کر خود اپنے ہاتھ سے اپنے اوپر پستول چلا لیا تھا، اسی کو اس کے بعد یہ مقام ملا کہ برطانیہ کی تاریخ میں اس کو ہندستان کے اولین فاتح کی حیثیت سے لکھا جائے۔

ہم میں سے ہر شخص کے ساتھ یہ واقعہ پیش آتا ہے کہ وہ کسی شدید خطرہ میں پڑنے کے باوجود معجزاتی طور پر اس سے بچ جاتا ہے۔ تاہم بہت کم لوگ ہیں جو رابرٹ کلائیو کی طرح اس سے سبق لیتے ہوں۔ جو اس طرح کے واقعات میں قدرت کا یہ اشارہ پڑھ لیتے ہوں کہ ــــــــ ابھی تمھارا وقت نہیں آیا، ابھی دنیا میں تم کو اپنے حصہ کا کام کرنا باقی ہے۔

ہر آدمی کو دنیا میں کام کرنے کی ایک مدت اور کچھ مواقع دئے گئے ہیں۔ یہ مدت اور مواقع اس سے اس وقت تک نہیں چھنتے جب تک خدا کا لکھا پورا نہ ہو جائے۔ اگر رات کے بعد خدا آپ کے اوپر صبح طلوع کرے تو سمجھ لیجئے کہ خدا کے نزدیک ابھی آپ کے عمل کے کچھ دن باقی ہیں۔ اگر آپ حادثات کی اس دنیا میں اپنی زندگی کو بچانے میں کامیاب ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے منصوبہ کے مطابق آپ کو کچھ اور کرنا ہے جو ابھی آپ نے نہیں کیا۔

ایک کے بعد دوسرا

مسافر اسٹیشن پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ اس کی ٹرین جاچکی ہے۔ اس کی گھڑی صحیح نہ تھی اس لئے وہ دس منٹ لیٹ ہوگیا۔ اتنی دیر میں ٹرین آکر چلی گئی۔ "بابوجی، فکر نہ کیجئے" قلی نے کہا "دو گھنٹے بعد ایک اور گاڑی آرہی ہے، اس سے آپ چلے جائیں۔ اتنی دیر پلیٹ فارم پر آرام کرلیجئے"۔ مسافر نے قلی کا مشورہ مان لیا اور دو گھنٹہ انتظار کے بعد اگلی ٹرین پر سوار ہوکر اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگیا۔

ہر مسافر جانتا ہے کہ ایک ٹرین چھوٹ جائے تو جلد ہی بعد دوسری ٹرین مل جاتی ہے جس سے وہ اپنا سفر جاری رکھ سکے۔ یہ پلیٹ فارم کا سبق ہے۔ مگر اکثر لوگ اس معلوم سبق کو اس وقت بھول جاتے ہیں جب کہ زندگی کی دوڑ میں ایک موقع ان کے ہاتھ سے نکل گیا ہو۔ پہلی بار ناکامی سے دوچار ہونے کے بعد وہ مایوس ہوجاتے ہیں یا احتجاج و فریاد کے مشغلہ میں لگ جاتے ہیں۔ حالاں کہ صحیح بات یہ ہے کہ وہ اپنے مقصد کے لئے نیا منصوبہ بنائیں، وہ "اگلی ٹرین" سے چل کر اپنی منزل پر پہنچ جائیں۔

ایک شخص جس سے آپ کی مخالفت ہوگئی ہو اور ٹکراؤ کا طریقہ جس کو "درست" کرنے میں ناکام ثابت ہوا ہو، آپ اس کے بارے میں اپنا رویہ بدل دیجئے۔ اس کو نرمی کے طریقہ سے متاثر کرنے کی کوشش کیجئے۔ عین ممکن ہے کہ پرانے طریقے نے جس کو آپ کا دشمن بنا رکھا تھا، نئے طریقہ کے بعد وہ آپ کا ایک کارآمد دوست ثابت ہو۔ آپ کہیں ملازم ہیں اور وہاں آپ کی ملازمت ختم کردی جاتی ہے۔ آپ اس کے پیچھے نہ پڑئے بلکہ دوسرے کسی میدان میں اپنے لئے ذریعہ معاش تلاش کرنے کی کوشش کیجئے۔ ہوسکتا ہے کہ نیا کام آپ کے لئے پہلے سے زیادہ نفع بخش ثابت ہو۔ کوئی آپ کا حق نہیں دیتا۔ اس سے آپ کی لڑائی شروع ہوجاتی ہے۔ سالوں گزر جاتے ہیں اور آپ اپنے حقوق کو حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے۔ آپ اس کا خیال چھوڑ دیجئے اور اپنی محنت پر بھروسہ کیجئے۔ بہت ممکن ہے کہ اپنی محنت کو کام میں لاکر آپ خود وہ چیز حاصل کرلیں جس کو آپ دوسروں سے مانگ کر پانا چاہتے تھے۔

زندگی کے بیشتر مسائل تنگ نظری کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر آدمی اپنے ذہن میں وسعت پیدا کرے تو اس کو معلوم ہو کہ یہاں سفر کے لئے ایک سے زیادہ "گاڑیاں" موجود ہیں ـــــ جو چیز وہ مقابلہ آرائی کے ذریعہ حاصل نہ کرسکا اس کو وہ باہمی جوڑ کے ذریعہ حاصل کرسکتا تھا۔ جہاں حقوق طلبی کا طریقہ مقصد تک پہنچانے میں ناکام رہا وہاں وہ محنت کا طریقہ اختیار کرکے اپنی منزل تک پہنچ سکتا تھا۔ جن لوگوں کی باتوں پر مشتعل ہوکر وہ ان پر قابو نہ پاسکا، وہ ان کی باتوں پر صبر کرکے انھیں جیت سکتا تھا۔

استحقاق پیدا کیجئے

ایم اے خان ہائر سکنڈری کے امتحان میں اچھے نمبر سے پاس ہوئے تھے۔ مگر کسی وجہ سے وہ بروقت آگے داخلہ نہ لے سکے۔ یہاں تک کہ اکتوبر کا مہینہ آگیا۔ اب بظاہر کہیں داخلہ ملنے کی صورت نہ تھی۔ تاہم تعلیم کا شوق ان کو ہندو سائنس کالج کے پرنسپل کے دفتر میں لے گیا۔

"جناب، میں بی ایس سی میں داخلہ لینا چاہتا ہوں" انھوں نے ہندو پرنسپل سے کہا۔

"یہ اکتوبر کا مہینہ ہے، داخلے بند ہو چکے ہیں۔ اب کیسے تمھارا داخلہ ہوگا"

"بڑی مہربانی ہوگی اگر آپ داخلہ لے لیں۔ ورنہ میرا پورا سال بیکار ہو جائے گا"

"ہمارے یہاں تمام سیٹیں بھر چکی ہیں۔ اب مزید داخلہ کی کوئی گنجائش نہیں"

پرنسپل اتنی بے رخی برت رہا تھا کہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہرگز داخلہ نہیں لے گا اور اگلا جملہ طالب علم کو شاید یہ سننا پڑے گا کہ "کمرہ سے نکل جاؤ"۔ مگر طالب علم کے اصرار پر اس نے بددلی سے پوچھا "تمھارے مارکس کتنے ہیں"۔ پرنسپل کا خیال تھا کہ اس کے نمبر یقیناً بہت کم ہوں گے۔ اسی لئے اس کو کہیں داخلہ نہیں ملا۔ چنانچہ طالب علم جب اپنے خراب نتیجہ کو بتائے گا تو اس کی درخواست کو رد کرنے کے لئے معقول وجہ ہاتھ آجائے گی۔ مگر طالب علم کا جواب اس کی امید کے خلاف تھا۔ اس نے کہا جناب ۸۵ فی صد :

Sir, eighty five per cent

اس جملہ نے پرنسپل پر جادو کا کام کیا۔ فوراً اس کا موڈ بدل گیا۔ اس نے کہا "بیٹھو بیٹھو" اس کے بعد اس نے طالب علم کے کاغذات دیکھے اور جب کاغذات نے تصدیق کر دی کہ واقعی وہ پچاسی فی صد نمبروں سے پاس ہوا ہے تو اسی وقت اس نے پچھلی تاریخ میں درخواست لکھوائی۔ اس نے ایم اے خان کو نہ صرف تاخیر کے باوجود اپنے کالج میں داخل کر لیا بلکہ کوشش کر کے ان کو ایک وظیفہ بھی دلوایا۔

یہی طالب علم اگر اس حالت میں پرنسپل کے پاس جاتا کہ وہ تھرڈ کلاس پاس ہوتا اور پرنسپل اس کا داخلہ نہ لیتا تو طالب علم کا تاثر کیا ہوتا۔ وہ اس طرح لوٹتا کہ اس کے دل میں نفرت اور شکایت بھری ہوتی۔ وہ لوگوں سے کہتا کہ یہ سب تعصب کی وجہ سے ہوا ہے۔ ورنہ میرا داخلہ ضرور ہونا چاہئے تھا۔ داخلہ نہ ملنے کی وجہ اس کا خراب نتیجہ ہوتا مگر اس کا ذمہ دار وہ ہندو کالج کو قرار دیتا۔ ماحول کا ردعمل اکثر خود ہماری حالت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ مگر ہم اس کو ماحول کی طرف منسوب کر دیتے ہیں تاکہ اپنے آپ کو بری الذمہ ثابت کر سکیں۔

اگر آدمی نے خود اپنی طرف سے کوتاہی نہ کی ہو، اگر زندگی میں وہ ان تیاریوں کے ساتھ داخل ہوا ہو جو زمانہ نے مقرر کی ہیں تو دنیا اس کو جگہ دینے پر مجبور ہوگی۔ وہ ہر ماحول میں اپنا مقام پیدا کرلے گا، وہ ہر بازار سے اپنی پوری قیمت وصول کرے گا۔ مزید یہ کہ ایسی حالت میں اس کے اندر اعلیٰ اخلاقیات کی پرورش ہوگی۔ وہ اپنے

تجربات سے جرأت، اعتماد، عالی حوصلگی، شرافت، دوسروں کا اعتراف، حقیقت پسندی، ہر ایک سے صحیح انسانی تعلق کا سبق سیکھے گا۔ وہ شکایت کی نفسیات سے بلند ہو کر سوچے گا۔ ماحول اس کو تسلیم کرے گا۔ اس لئے وہ خود بھی ماحول کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوگا۔

اس کے برعکس اگر اس نے اپنے کو اہل ثابت کرنے میں کوتاہی کی ہو۔ اگر وہ وقت کے معیار پہ پورا نہ اترتا ہو۔ اگر وہ کم تر لیاقت کے ساتھ زندگی کے میدان میں داخل ہوا ہو تو لازماً وہ دنیا کے اندر اپنی جگہ بنانے میں ناکام رہے گا۔ اور اس کے نتیجہ میں اس کے اندر جو اخلاقیات پیدا ہوں گی وہ بلاشبہ پست اخلاقیات ہوں گی۔ وہ شکایت، جھنجلاہٹ، غصہ، حتیٰ کہ مجرمانہ ذہنیت کا شکار ہو کر رہ جائے گا۔ جب آدمی ناکام ہوتا ہے تو اس کے اندر غلط قسم کی نفسیات ابھرتی ہیں۔ اگرچہ آدمی کی ناکامی کی وجہ ہمیشہ اپنی کمزوری ہوتی ہے۔ مگر ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو قصوروار ٹھہرائے۔ وہ ہمیشہ اپنی ناکامیوں کے لئے دوسروں کو مجرم ٹھہراتا ہے۔ وہ صورت حال کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ کمتر تیاری آدمی کو بیک وقت دو قسم کے نقصانات کا تحفہ دیتی ہے ——— اپنے لئے بے جا طور پر ناکامی اور دوسروں کے بارے میں بے جا طور پر شکایت۔

پتھر ہر ایک کے لئے سخت ہے۔ البتہ وہ اس آدمی کے لئے نرم ہو جاتا ہے جو اس کو توڑنے کا اوزار رکھتا ہو۔ یہی صورت ہر معاملہ میں پیش آتی ہے۔ اگر آپ لیاقت اور اہلیت کے ساتھ زندگی کے میدان میں داخل ہوئے ہوں تو آپ اپنی واقعی حیثیت سے بھی زیادہ حق اپنے لئے وصول کر سکتے ہیں۔ "وقت" گزرنے کے بعد بھی ایک اجنبی کالج میں آپ کا داخلہ ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر لیاقت اور اہلیت کے بغیر آپ نے زندگی کے میدان میں قدم رکھا ہے تو آپ کو اپنا واقعی حق بھی نہیں مل سکتا۔

گیس نیچے نہیں سماتی تو اوپر اٹھ کر اپنے لئے جگہ حاصل کرتی ہے۔ پانی کو اونچائی آگے بڑھنے نہیں دیتی تو وہ نشیب کی طرف سے اپنا راستہ بنا لیتا ہے۔ درخت سطح کے اوپر قائم نہیں ہو سکتا تو وہ زمین پھاڑ کر اس سے اپنے لئے زندگی کا حق وصول کر لیتا ہے۔ یہ طریقہ جو غیر انسانی دنیا میں خدا نے اپنے براہ راست انتظام کے تحت قائم کر رکھا ہے وہی انسان کو بھی اپنے حالات کے اعتبار سے اختیار کرنا ہے۔

ہر آدمی جو دنیا میں اپنے آپ کو کامیاب دیکھنا چاہتا ہو اس کو سب سے پہلے اپنے اندر کامیابی کا استحقاق پیدا کرنا چاہئے۔ اس کو چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو جانے اور پھر اپنے حالات کو سمجھے۔ اپنی قوتوں کو صحیح ڈھنگ سے منظم کرے۔ جب وہ ماحول کے اندر داخل ہو تو اس طرح داخل ہو کہ اس کے مقابلہ میں اپنی اہلیت ثابت کرنے کے لئے وہ اپنے آپ کو پوری طرح مسلح کر چکا ہو۔ اس نے حالات سے اپنی اہمیت منوانے کے لئے ضروری سامان کر لیا ہو۔ اگر یہ سب ہو جائے تو اس کے بعد آپ کے عمل کا جو دوسرا لازمی نتیجہ سامنے آئے گا وہ وہی ہوگا جس کا نام ہماری زبان میں کامیابی ہے۔ (۴ نومبر ۱۹۶۷)

دنیا ٹائپ رائٹر نہیں

ایک شخص میز پر بیٹھا ہوا ہے۔ اس کے سامنے کھلا ہوا ٹائپ رائٹر ہے۔ اس کے ذہن میں کچھ خیالات آئے۔ اس نے ٹائپ رائٹر میں کاغذ لگایا اور اپنے ذہن کے مطابق تختۂ حروف (کی بورڈ) پر انگلیاں مارنی شروع کیں۔ اچانک اس کا ذہنی خیال واقعہ بننے لگا۔ سامنے کے کاغذ پر مطلوبہ الفاظ چھپ چھپ کر ابھرنے لگے۔ یہاں تک کہ اس کے تمام جملے کاغذ پر ٹائپ ہو کر سامنے آ گئے۔ چند جملے یہ تھے:

میں حق پر ہوں ، میرے سوا جو لوگ ہیں سب باطل پر ہیں
میرا کوئی قصور نہیں ، ہر معاملہ میں قصور صرف دوسروں کا ہے
میں سب سے بڑا ہوں ، دوسرے تمام لوگ میرے مقابلہ میں چھوٹے ہیں
میں خدا کا محبوب ہوں ، دنیا بھی میری ہے اور آخرت بھی میری

آدمی خوش تھا کہ اس نے جو کچھ چاہا وہ کاغذ پر موجود ہو گیا۔ مگر آدمی کی بدقسمتی یہ تھی کہ وہ جس دنیا میں تھا وہ کوئی ٹائپ رائٹر نہیں تھی۔ ٹائپ رائٹر کے ایک کاغذ پر جس طرح اس نے اپنے خیال کو واقعہ بنا لیا اسی طرح وہ حقیقت کی دنیا میں اپنے خیال کو واقعہ نہیں بنا سکتا تھا۔ کاغذ پر اپنی پسند کے الفاظ چھاپنے کے لئے تو صرف کی بورڈ پر انگلیاں مارنا کافی تھا۔ مگر حقیقت کی دنیا میں کسی خیال کو واقعہ بنانے کے لئے ایک لمبی اور سوچی سمجھی جدوجہد کی ضرورت ہے نہ کہ ٹائپسٹ کی طرح محض انگلیوں کو متحرک کرنے کی۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ ٹائپ رائٹر کا آدمی عمل کی دنیا میں اس وقت بھی مکمل طور پر محروم تھا جب کہ الفاظ کی دنیا میں بظاہر وہ سب کچھ حاصل کر چکا تھا۔

یہ بات خواہ ہمارے لئے کتنی ہی ناگوار ہو، مگر یہ ایک واقعہ ہے کہ دنیا ہمارے لئے کوئی ٹائپ رائٹر نہیں اور ہم اس کے کوئی ٹائپسٹ نہیں کہ محض "انگلیوں" کی حرکت سے ہم جو چاہیں دنیا کی سطح پر نقش کرتے چلے جائیں۔ یہ سنگین حقیقتوں کی دنیا ہے اور حقیقتوں سے موافقت کر کے ہی یہاں ہم اپنے لئے کچھ پا سکتے ہیں۔ آدمی کے پاس زبان اور قلم ہے۔ وہ جو چاہے لکھے اور جو چاہے بولے۔ مگر آدمی کو یاد رکھنا چاہئے کہ اس کی زبان و قلم صرف الفاظ کی لکیریں بناتے ہیں نہ کہ زندگی کی حقیقتیں۔ الفاظ کاغذ پر نشان بن کر رہ جاتے ہیں۔ آواز ہوا میں غیر مرئی لہروں کی صورت میں گم ہو جاتی ہے۔ اور بالآخر آدمی کے پاس جو چیز باقی رہتی ہے وہ صرف ایک جھوٹا انتظار ہے۔ اور حقائق کی اس دنیا میں کسی کا جھوٹا انتظار کبھی پورا نہیں ہوتا۔

خوش خیالی حقیقت کا بدل نہیں

سڑک پر مجمع ۲۱ نمبر کی بس کا انتظار کر رہا تھا۔ اتنے میں ایک بس آتی دکھائی دی اور سارے لوگ اس کی طرف دوڑ پڑے۔" اوہ! یہ تو ۱۲ نمبر کی بس ہے"۔ بورڈ دیکھ کر ایک شخص بولا۔ "۱۲ کو ۲۱ کر لو اور چلے جاؤ" دوسرے نے کہا۔

ظاہر ہے کہ یہ صرف مذاق تھا۔ کوئی شخص ایسا نہیں کرے گا کہ کھریا مٹی لے کر بس پر اپنا مطلوبہ نمبر لکھے اور اس پر بیٹھ کر سمجھے کہ اب وہ اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا ہے۔ یہ ہندسہ کا فرق نہیں، حقیقت کا فرق تھا۔ اور حقیقت کے فرق کو ہندسہ کے فرق سے بدلا نہیں جا سکتا ——— یہ بات اپنی ذاتی زندگی کے معاملات میں ہر شخص جانتا ہے، مگر عجیب بات ہے کہ ملت کے رہنما جب ملت کا مسئلہ حل کرنے کے لئے اٹھتے ہیں تو وہاں وہ اس انتہائی معلوم حقیقت کو بھول جاتے ہیں۔ شاید اس لئے کہ وہ چاہتے ہیں کہ ہندسہ کو بدل کر وہ اُس کام کا کریڈٹ حاصل کر لیں جو اسباب کی اس دنیا میں صرف حقیقت کو بدلنے کے نتیجہ میں کسی کو ملتا ہے۔

ایک ایسا سماج جہاں امتیاز اور لیاقت کی بنیاد پر لوگوں کو درجات ملتے ہیں، ہم مراعات اور تحفظات کے عنوان پر کانفرنس کر رہے ہیں۔ ایک ایسا نظام جہاں علمی اور اقتصادی طاقت کے بل پر قوموں کے فیصلے ہوتے ہیں، ہم احتجاج ور مطالبات کے پوسٹر دیواروں پر چپکا رہے ہیں۔ ایک ایسی دنیا جہاں زبان وبیان نے بالکل نیا انداز اختیار کر لیا ہے، ہم اپنے روایتی کتب خانہ کے بورڈ پر "دور جدید" کا لفظ لکھنے کے لئے آرٹسٹ کی خدمات حاصل کر رہے ہیں۔ ایک یسا زمانہ جہاں عالمی ذہن نے سیاست کو سیکولر بنیادوں پر قائم کرنے کا فیصلہ کر رکھا ہے، ہم عوام کا ذہن بدلے بغیر بیلٹ بکس سے اسلامی نظام برآمد کرنے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ ایک ایسی آبادی جہاں اختلاف اور شکایت کے گہرے مادی اسباب موجود ہیں، ہم لفظی تقریروں کے کرشمے دکھا کر حالات کو درست کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ ایک ایسے معاشرہ میں جہاں ہم تعلیم، اقتصادیات، باہمی اتحاد ہر لحاظ سے تمام گروہوں میں سب سے پیچھے ہیں، ہم جلسوں اور کنونشنوں کے ذریعہ ملک کی قسمت بدلنے کا نعرہ لگا رہے ہیں۔ ایک ایسا جغرافیہ جہاں ہمارے پاس اپنے تحفظ کی بھی طاقت نہیں، ہم "حریف کو نقصان پہنچاؤ" کا طریق کار اختیار کر کے باعزت زندگی حاصل کرنے کی تجویزیں پیش کر رہے ہیں۔ اس قسم کی تمام باتیں اسی طرح بے معنی ہیں جس طرح ۱۲ نمبر کی بس پر ۲۱ نمبر لکھ کر اپنی منزل کی طرف سفر شروع کرنا۔

موجودہ دنیا میں ہر چیز ممکن بھی ہے اور ناممکن بھی۔ کسی چیز کو اگر اس کے فطری طریقہ سے حاصل کرنے کی کوشش کی جائے اور اس کے لئے ضروری اسباب فراہم کر دئے جائیں تو اس کا حصول اسی طرح ممکن ہو جاتا ہے جیسے رات پوری ہونے کے بعد سورج کا نکلنا۔ لیکن اگر فطرت کے مقررہ طریقہ سے انحراف کیا جائے اور مطلوبہ چیز کے مطابق ضروری اسباب جمع نہ کئے جائیں تو اس کے بعد ناکامی اتنی ہی یقینی ہو جاتی ہے جتنی پہلی صورت میں کامیابی۔ عالم فطرت پر یہ انسان کا حق ہے کہ وہ اس کو کامیاب کرے۔ مگر وہ کامیاب اس کو کرتا ہے جو اس کے مقررہ شرائط کو پورا کرنے کے لئے تیار ہو۔

کامیابی کا راز یہاں ہے

یہ مدراس کا واقعہ ہے۔ سمندر کے ساحل پر دو نوجوان نہا رہے تھے۔ دونوں دوست تھے اور تیراکی اچھی جانتے تھے۔ وہ پانی کے اوپر اوپر بھی تیرتے تھے اور ڈبکی لگا کر پانی کے اندر اندر بھی دور تک نکل جاتے تھے۔ دونوں تیرتے ہوئے دور تک چلے گئے۔ اس کے بعد موجوں کا ایک تھپیڑا آیا۔ دونوں اس کی زد میں آگئے۔ ایک نوجوان زیادہ ماہر تھا ــ "میں موجوں سے لڑکر پار ہو جاؤں گا" اس نے کہا اور موجوں کے مقابلہ میں اپنی تیراکی کا کمال دکھانے لگا۔ مگر موجوں کا زور زیادہ تھا، وہ اپنے طاقت ور بازوؤں کے باوجود ان سے نکلنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اور ڈوب کر مر گیا۔

دوسرا نوجوان بھی طوفان کی زد میں آیا۔ تھوڑی دیر اس نے اپنے ساتھی کی پیروی کی۔ اس کے بعد اس نے محسوس کر لیا کہ موجوں کی شدت اس سے زیادہ ہے کہ میرے بازو اس کا مقابلہ کرکے نکلنے میں کامیاب ہو سکیں۔ اچانک اس کو ایک بات یاد آئی۔ اس نے سنا تھا کہ موجیں خواہ کتنی ہی شدید ہوں ان کا زور اوپر اوپر رہتا ہے۔ پانی کی نیچے کی سطح پھر بھی ساکن رہتی ہے۔ اس کے بعد اس نے اپنا طریق عمل بدل دیا۔ اوپر کی موجوں سے لڑنے کے بجائے اس نے نیچے کی طرف ڈبکی لگائی اور پانی کی نچلی سطح پر پہنچ گیا۔ یہاں پانی نسبتاً ٹھہرا ہوا تھا اور اس کے لیے ممکن تھا کہ وہ اپنے تیرنے کے فن کو کامیابی کے ساتھ استعمال کر سکے۔ اس نے ساحل کی طرف تیرنا شروع کر دیا۔ اگرچہ وہ کافی تھک چکا تھا۔ تاہم ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے بالآخر وہ سمندر کے کنارے پہنچ گیا۔ کنارے پہنچتے پہنچتے وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ سمندر کے کنارے چند ملاح اپنی کشتیاں لئے ہوئے موجود تھے۔ انھوں نے فوراً اس کو دیکھ کر اٹھایا اور خشکی پر لے گئے۔ اس کے بعد اس کو اسپتال پہنچایا گیا۔ وہاں چند دن زیر علاج رہ کر وہ اچھا ہو گیا ــــــ جس نے موجوں سے لڑنے کو تیراکی سمجھا تھا وہ ہلاک ہو گیا اور جس نے موجوں سے کترا کر نکلنے کا طریقہ اختیار کیا وہ کامیاب رہا۔

یہی معاملہ پوری زندگی کا ہے۔ زندگی میں طرح طرح کے طوفان آتے ہیں۔ مگر عقل مندی یہ نہیں ہے کہ جو تھپیڑا سامنے آئے بس آدمی اس سے لڑنا شروع کر دے۔ عقل مندی یہ ہے کہ آدمی جائزہ لے کر دیکھے کہ کامیابی کے ساتھ ساحل تک پہنچنے کا زیادہ قابل عمل راستہ کون سا ہے۔ اور جو راستہ قابل عمل ہو اسی کو اختیار کرے خواہ وہ موجوں کی سطح سے اتر کر نیچے نیچے اپنا راستہ بنانا کیوں نہ ہو۔ یہ قدرت کا انتظام ہے کہ دریاؤں اور سمندروں میں جو تیز و تند موجیں اٹھتی ہیں وہ پانی کے اوپر اوپر رہتی ہیں۔ پانی کے نیچے کی سطح ساکن رہتی ہے۔ چنانچہ بھنور کے وقت مچھلیاں نچلی سطح پر چلی جاتی ہیں۔ یہ قدرت کا سبق ہے۔ اس طرح قدرت ہم کو بتاتی ہے کہ طوفانی موجوں کے وقت ہم کو کیا طریق عمل اختیار کرنا چاہئے۔ زندگی میں کبھی طوفان سے لڑنا بھی پڑتا ہے۔ مگر اکثر اوقات کامیابی کا راز یہ ہوتا ہے کہ آدمی طوفانی سیلاب سے کترا کر نکل جائے۔ وہ طوفان کی زد سے بچتا ہوا اپنا راستہ بنائے۔

حقیقت پسندی

امریکہ نے اگست ۱۹۴۵ میں اپنے دو ایٹم بم جاپان پر گرائے۔ اس کے نتیجہ میں جاپان تہس نہس ہوکر رہ گیا۔ مگر جاپانیوں کو اس پر غصہ نہیں۔ کیونکہ امریکیوں کی کارروائی یک طرفہ نہیں تھی۔ بلکہ وہ جاپان کی متشددانہ کارروائی کے جواب میں کی گئی ———— جاپانیوں کا یہی حقیقت پسندانہ مزاج ہے جس نے انھیں موجودہ زمانہ میں غیر معمولی ترقی کے مقام تک پہنچایا ہے۔

امریکہ نے جاپان کے دو بڑے صنعتی شہروں، ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرائے۔ چند منٹ کے اندر دونوں آباد شہر عظیم الشان کھنڈر بن گئے۔ ان میں سے ہر ایک شہر۔ امیل سے زیادہ بڑے رقبہ میں بسا ہوا تھا۔ مگر جب ان پر ایٹم بم گرا تو یہ حال ہوا کہ انسان، حیوان، درخت سب جل بھن کر رہ گئے۔ ڈیڑھ لاکھ آدمی مرگئے۔ دس ہزار آدمی ایسے تھے جو حادثہ کے بعد فوراً بخارات میں تبدیل ہوگئے۔ آج یہ دونوں شہر شاندار طور پر دوبارہ آباد ہو چکے ہیں۔ چوڑی سڑکیں، کشادہ مکانات، جگہ جگہ پارک اور باغ نے شہر کو بالکل نیا منظر عطا کیا ہے۔ اب شہر میں صرف ایک ٹوٹی ہوئی عمارت باقی ہے جو دیکھنے والوں کو یاد دلاتی ہے کہ دوسری جنگ عظیم میں اس شہر پر کیسی قیامت آئی تھی۔

ہندستان ٹائمس (نئی دہلی) کے ایڈیٹر مسٹر خوشونت سنگھ جاپان گئے تھے۔ اپنے سفر کی روداد بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ میں نے جاپان میں ایک بے حد عجیب بات دیکھی۔ جب کہ بقیہ دنیا نے ہیروشیما اور ناگاساکی کے واقعات کو بہت بڑے پیمانہ پر امریکہ کے خلاف پروپگنڈے کے لئے استعمال کیا ہے، خود جاپانی ان واقعات کو امریکہ کے خلاف نہیں لیتے۔ خوشونت سنگھ نے اپنے جاپانی رفیق سے اس کی بابت سوال کیا تو خلاف توقع اس نے نرم لہجہ میں کہا:

We hit them first at Pearl Harbour. We killed a lot of them. They warned us of what they were going to do but we thought they were only bluffing. They beat us fair and square. We were quits. And now we are friends.

پہلے ہم نے ان کے پرل ہاربر پر حملہ کیا۔ ہم نے ان کے بہت سے لوگوں کو مار ڈالا۔ اس کے جواب میں وہ جو کچھ کرنے والے تھے اس سے انھوں نے ہمیں آگاہی دی۔ مگر ہم نے سمجھا کہ یہ محض دھونس ہے۔ انھوں نے ہمیں کسی دھوکے کے بغیر کھلے طور پر مارا۔ پہلے ہم ایک دوسرے سے دور تھے۔ اب ہم ایک دوسرے کے دوست ہیں (ہندستان ٹائمس ۴ اپریل ۱۹۸۱)

ایٹمی حملہ سے مرنے والوں کی یادگار ہیروشیما میں قائم کی گئی ہے۔ امن میوزیم (Peace Museum)

میں جنگی تباہ کاریوں کی تصویریں بھی لگی ہوئی ہیں۔ ان چیزوں کو دیکھنے کے لئے ہر سال تقریباً ۷ لاکھ جاپانی ہیروشیما آتے ہیں۔ گفتگو سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عام جاپانی کے دل میں امریکہ کے خلاف نفرت چھپی ہوئی موجود ہے۔ تاہم وہ اپنے عملی رویہ میں اس کا اظہار ہونے نہیں دیتے۔ انھوں نے اپنے مخالفانہ جذبات پر حقیقت پسندی کا پردہ ڈال رکھا ہے۔ جاپانیوں کے اسی مزاج کا یہ نتیجہ ہے کہ جنگ کے بعد بہت تھوڑی مدت میں انھوں نے دوبارہ غیر معمولی ترقی کر لی۔ ان کے یہاں نہ تیل نکلتا ہے اور نہ ان کے پاس معدنیات کی کانیں ہیں۔ ان کو بیشتر خام مال باہر سے حاصل کرنا پڑتا ہے۔ اس کے باوجود جاپان آج اپنے اعلیٰ سامانوں کی بدولت دنیا کی مارکٹ پر چھایا ہوا ہے۔

مسٹر خوشونت سنگھ نے جاپان میں وکیلوں کی بابت معلوم کیا۔ انھیں بتایا گیا کہ یہاں وکالت کے پیشہ کا حال اچھا نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں کے درمیان جب کوئی نزاع پیدا ہوتی ہے تو وہ عدالت میں جانے کے بجائے باہمی گفتگو سے اس کو طے کر لیتے ہیں۔ جب آدمی اپنی غلطی ماننے کے لئے تیار ہو تو جھگڑا کبھی آگے نہیں بڑھتا۔ جھگڑا ختم نہ ہونے کی وجہ اکثر حالات میں یہ ہوتی ہے کہ ایک آدمی یک طرفہ طور پر دوسرے کو الزام دیتا ہے۔ اس کی وجہ سے دوسرے کے اندر بھی ضد پیدا ہو جاتی ہے۔ اور مسئلہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ جب ایک فریق اپنی جانب کی غلطی مان لے تو دوسرے کے اندر بھی جھکاؤ پیدا ہوگا اور مسئلہ وہیں کا وہیں ختم ہو جائے گا۔

اس حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر کا جاپان کو یہ بہت بڑا فائدہ ملا ہے کہ ایک جاپانی دوسرے جاپانی پر اعتماد کرتا ہے۔ ہندستان جیسے ملکوں میں تجارتی معاہدے اور تجارتی خط وکتابت عام طور پر ایسے ماہرین انجام دیتے ہیں جو بہت بندھے ہوئے الفاظ اور قانونی پہلوؤں کی کامل رعایت کرنے والی زبان لکھنا جانتے ہیں۔ مگر جاپانی اپنا وقت اس قسم کے تحریری مسودات تیار کرنے میں ضائع نہیں کرتے۔ امریکہ میں قانون دانوں کی تعداد ۵۰ ہزار ہے جب کہ جاپان میں قانون دانوں کی تعداد صرف ۱۱ ہزار ہے۔ جاپان میں ایسے لفظی ماہرین کا زیادہ کام ہی نہیں۔

جاپان کے اکثر تجارتی ادارے زبانی معاہدوں پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اولاً اس کا رواج جاپانیوں کے باہمی تعلقات میں ہوا مگر اب باہر کے تاجر بھی یہ سمجھنے لگے ہیں کہ وہ جاپانی کے منہ سے بولے ہوئے لفظ پر بھروسہ کر سکتے ہیں۔ قانونی بندشوں سے آزادی کا یہ فائدہ ہے کہ کام تیزی سے ہوتا ہے اور غیر ضروری لفظی پابندیاں کارکردگی میں حارج نہیں بنتیں۔

جاپان کے اس مزاج نے اس کو باہمی اتحاد کا تحفہ دیا ہے۔ اور اتحاد بلاشبہ سب سے بڑی طاقت ہے۔ جاپان کی ترقی کا راز جاپانیات کے ایک ماہر نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے۔

Never quarrelling amongst themselves, always making everything together

آپس میں کبھی نہ جھگڑنا، ہر کام ہمیشہ مل جل کر کرنا (ہندستان ٹائمس ۴ اپریل ۱۹۸۱)

ٹاپ کی جگہ خالی ہے

کچھ مسلم نوجوان بیٹھے ہوئے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ہر ایک ماحول کی شکایت کر رہا تھا ——
نہیں ہوتے، ملازمت نہیں ملتی۔ کام نہیں ملتا وغیرہ۔ ایک زیادہ عمر کا تجربہ کار آدمی بھی مجلس میں بیٹھا ہوا
ہ خاموشی سے سب کی باتیں سن رہا تھا۔ آخر میں اس نے کہا: آپ لوگوں کی شکایتیں بالکل بے جا ہیں۔
یاں جگہ ڈھونڈ رہے ہیں جہاں جگہیں بھری ہوئی ہیں۔ اور جہاں جگہ خالی ہے وہاں پہنچنے کی کوشش نہیں
۔ آپ لوگ اونچی لیاقت پیدا کیجئے۔ پھر آپ کے لئے مایوسی کا کوئی سوال نہ ہوگا۔ کیونکہ عام جگہیں اگرچہ بھری
ں۔ مگر ٹاپ کی جگہ ہر طرف خالی ہے۔

امتیاز کامیابی کا راز ہے۔ آپ طالب علم ہوں یا تاجر، آپ وکیل ہوں یا ڈاکٹر، آپ خواہ جس میدان
، ہوں، اپنے اندر امتیاز پیدا کرنے کی کوشش کیجئے اور یقیناً آپ کامیاب رہیں گے۔ اگر آپ چوہا پکڑنے
پنجرہ ہی بنانا جانتے ہوں تو لوگ خود آکر آپ کا دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیں گے۔ لوگوں کی غلطی یہ ہے
سم کے "پنجرے" بازار میں بھرے ہوئے ہیں اسی قسم کا ایک اور "پنجرہ" بنا کر بازار میں بیٹھ جاتے ہیں اور
یت کرتے ہیں کہ ہمارا پنجرہ فروخت نہیں ہوتا۔ اگر آپ محنت کریں اور اپنے دماغ کو استعمال کر کے امتیازی
نائیں تو یقیناً لوگ اس کو خریدنے کے لئے ٹوٹ پڑیں گے۔

ہر ماحول میں ہمیشہ تعصب اور تنگ نظری موجود ہوتی ہے۔ یہ بالکل فطری ہے۔ مگر تعصب اور تنگ
کے عمل کی ایک حد ہے۔ اگر آپ اس حد کو پار کر جائیں تو تعصب اور تنگ نظری ہو کر بھی آپ کو کوئی نقصان
پہنچے گا۔ آپ کے نمبر ۵۰ فی صد ہیں اور آپ کے حریف کے ۶۰ فی صد، تو عین ممکن ہے کہ تعصب آپ
میں حائل ہو جائے اور آپ کو نہ لیا جائے۔ لیکن اگر ایسا ہو کہ حریف کے نمبر ۶۰ فی صد ہیں اور آپ کے نمبر ۸۰
ر تو تعصب اور تنگ نظری کی تمام دیواریں گر جائیں گی اور یقینی طور پر آپ اپنے حریف کے مقابلہ میں
ب رہیں گے۔

معمولی جگہیں بھری ہوئی ہیں مگر ٹاپ کی جگہ خالی ہے۔ پھر آپ کیوں نہ اس خالی جگہ پر پہنچنے کی کوشش
جو اب بھی آپ کا انتظار کر رہی ہے۔ اگر آپ دوسروں سے زیادہ محنت کریں۔ اگر آپ عام معیار سے اونچا
پیش کریں۔ اگر آپ زیادہ بڑھی ہوئی صلاحیت کے ساتھ زندگی کے میدان میں داخل ہوں تو آپ کے لئے
. یا بے روزگار ہونے کا کوئی سوال نہیں۔ ہر جگہ آپ کی جگہ ہے، کیونکہ وہ اب تک کسی آنے والے کے
رہیں خالی پڑی ہوئی ہے۔

سب سے بڑی ضمانت

لارڈ ولیم وینٹنک انیسویں صدی کے ربع ثانی (۱۸۳۵ - ۱۸۲۸) میں ہندوستان کے گورنر جنرل تھے۔ انھوں نے ایک بار حکم دے دیا تھا کہ تاج محل کو گرا دیا جائے مگر عملاً وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اس کا انکشاف ۲ فروری ۱۹۰۰ کو اس وقت کے وائسرائے لارڈ کرزن نے کیا تھا۔ لارڈ کرزن نے کلکتہ کے ایک جلسہ عام میں کہا کہ ان دنوں ایسٹ انڈیا کمپنی کی اقتصادی حالت خراب ہو گئی تھی۔ کمپنی کو اقتصادی بحران سے نکالنے کے لئے سابق برطانوی گورنر جنرل (لارڈ وینٹنک) نے چاہا کہ تاج محل کے سنگ مرمر کو فروخت کر دیں۔ اس سے ان کو اس زمانہ میں ایک لاکھ روپیہ حاصل ہونے کی امید تھی۔ جب یہ خبر پھیلی تو لوگوں نے اس کی مخالفت کی۔ اب لارڈ وینٹنک بگڑ گئے اور انھوں نے غصہ میں آکر یہ حکم دیا کہ تاج محل کو گرا کر زمین کے برابر کر دیا جائے۔ ان کے اس حکم کے بعد عوام کی مخالفت اور زیادہ بڑھ گئی۔ ہندو اور مسلمان دونوں نے مل کر شدید احتجاج کیا۔ حتیٰ کہ یہ اندیشہ پیدا ہو گیا کہ اگر تاج محل کو گرایا گیا تو عوامی بغاوت پیدا ہو جائے گی۔ لارڈ وینٹنک کے مشیروں نے ان کو صورت حال کی نزاکت بتائی۔ چنانچہ انھوں نے اپنا حکم واپس لے لیا (نوبھارت ٹائمز ۱۸ جون ۱۹۶۹)

"تاج محل کو عوام نے نہیں بچایا" اس خبر کو پڑھ کر ایک شخص نے کہا "بلکہ تاج محل کو اس کے اپنے حسن نے بچایا۔ تاج اگر اتنا حسین نہ ہوتا تو برطانوی اقتدار کے مقابلہ میں اس کو ہندوؤں اور مسلمانوں کی اتنی بڑی حمایت حاصل نہیں ہو سکتی تھی"۔

عمارت کا یہی انجام اس کے معماروں کے لئے بھی مقدر تھا۔ مگر افسوس کہ معمار اپنے اندر وہ "حسن" پیدا نہ کر سکے جو انھوں نے سنگ مرمر کے خاموش مجموعہ میں اپنی مہارت سے پیدا کر دیا تھا۔

آدمی کے اندر کوئی خوبی ہو تو یہ خوبی ہی اس کی زندگی کی سب سے بڑی ضمانت ہوتی ہے۔ وہ دشمنوں میں بھی اپنے دوست پا لیتا ہے۔ اغیار کی صفوں میں بھی اس کو اپنے قدرداں مل جاتے ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ کسی کے اندر کوئی واقعی خوبی ہو، اس کے باوجود دنیا میں اس کا اعتراف نہ کیا جائے۔

تاہم اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ آدمی کا یہ حسن سانپ کا حسن نہ ہو۔ ایک سانپ خواہ وہ کتنا ہی حسین ہو آدمی اس سے محبت نہیں کر سکتا۔ اسی طرح جس آدمی کا حال یہ ہو کہ اس کے اندر ایک خوبی تو ہو مگر اسی کے ساتھ اس کی زبان میں "ڈنک" ہو، وہ لوگوں کے سیاسی اور معاشی مفادات کو چیلنج کرنے لگے، وہ لوگوں کے ساتھ تعلقات میں بار بار جارحیت پر اتر آتا ہو، وہ اپنی جذباتی کارروائیوں سے لوگوں کو اپنا مخالف بنالے۔ ایسا آدمی خواہ وہ کتنا ہی زیادہ خوبیوں والا ہو، لوگوں کا محبوب نہیں بن سکتا۔

تاج محل لوگوں کا محبوب اسی وقت بنتا ہے جب کہ وہ خاموش حسن میں ڈھل جائے۔ اگر وہ جارح حسن کا نمونہ ہو تو ایسے تاج محل کو کوئی نہیں بخشے گا۔

ایک کے بجائے دو

ولیم دوم (۱۹۴۱ - ۱۸۵۹) جرمنی کا بادشاہ تھا۔ اپنے باپ شہنشاہ فریڈرک کے بعد ۱۸۸۸ میں تخت پر بیٹھا۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا۔ اس نے جرمنی کو فوجی اعتبار سے ترقی دینے میں کافی دل چسپی لی۔ مگر اس کا فوجی استحکام اس کی شہنشاہیت کو بچانے میں کامیاب نہ ہوا۔ ملکی حالات کے تحت اس کو تخت چھوڑنا پڑا۔ نومبر ۱۹۱۸ میں وہ حکومت چھوڑ کر ہالینڈ چلا گیا اور وہاں خاموشی کے ساتھ زندگی گزار کر مر گیا۔ اس کی جلاوطنی کی موت گویا اس بات کا ایک واقعاتی ثبوت تھی کہ فوجی قوت کے مقابلہ میں حالات کی قوت زیادہ اہم ہے

جنگ عظیم اول سے کچھ پہلے کا واقعہ ہے۔ جرمنی کا مذکورہ بادشاہ ولیم دوم سوئزرلینڈ گیا ہوا تھا وہ وہاں کی منظم فوج کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اس نے مزاحیہ انداز میں سوئزرلینڈ کے ایک فوجی سے پوچھا: اگر جرمنی کی فوج جس کی تعداد تمھاری فوج سے دگنی ہو، تمھارے ملک پر حملہ کر دے تو تم اس وقت کیا کرو گے۔ اعلیٰ تربیت یافتہ فوجی نے سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا:

سر، ہم کو بس ایک کے بجائے دو فائر کرنے پڑیں گے

اس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی میں اصل اہمیت تعداد کی نہیں بلکہ محنت اور کارکردگی کی ہے۔ آپ کا حریف اگر تعداد میں زیادہ ہو تو آپ کو گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ آپ اپنی محنت اور کارکردگی میں اضافہ کر کے کم تعداد کے باوجود زیادہ تعداد پر غالب آسکتے ہیں۔

دنیا میں اپنی جگہ بنانے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ جس آسامی کے لئے بی اے کی قابلیت کی شرط ہو اور بی اے والوں نے درخواستیں دے رکھی ہوں، وہاں آپ بھی بی اے کی ڈگری لے کر پہنچ جائیں اور جب آپ کو نہ لیا جائے تو شکایت کریں کہ کیوں آپ کے مقابلہ میں دوسرے امیدوار کو ترجیح دی گئی، جب کہ دونوں یکساں طور پر گریجویٹ تھے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ جہاں لوگ بی اے کی ڈگریاں پیش کر رہے ہوں وہاں آپ ماسٹر ڈگری لے کر پہنچیں، جہاں لوگ مطابق شرائط قابلیت کی بنیاد پر اپنا حق مانگ رہے ہوں وہاں آپ برتر از شرائط قابلیت دکھا کر اپنا حق تسلیم کرائیں۔

یہی دوسرا طریقہ زندگی کا اصلی طریقہ ہے۔ تمام بڑی بڑی ترقیاں اور کامیابیاں انھیں لوگوں کے لئے مقدر ہیں جو برتر قابلیت لے کر زندگی کے میدان میں داخل ہوں۔ جن لوگوں کے پاس صرف کمتر لیاقت یا برابر کی لیاقت کا سرمایہ ہو ان کے لئے صرف ایک ہی انجام مقدر ہے ——— مقابلہ کی اس دنیا میں دوسروں سے پچھڑ جانا اور اس کے بعد بے فائدہ احتجاج میں اپنا وقت ضائع کرتے رہنا۔

تعمیر کی فتح

صبح کو وہ سو کر اٹھا تو کمرہ میں چڑیا کا انڈا ٹوٹا ہوا پڑا تھا۔ یہ گوریا کا انڈا تھا جس نے چھت کی لکڑی میں ایک گوشہ پا کر وہاں اپنا گھونسلا بنا رکھا تھا۔ اس گھونسلے کی وجہ سے کمرہ میں ہر وقت چڑیوں کا شور رہتا۔ تنکے گرتے رہتے۔ آدمی نے فرش پر ٹوٹا ہوا انڈا دیکھا تو اس نے گھونسلا اجاڑ کر پھینک دیا۔

اگلے دن پھر وہی "چوں چوں" کا شور تھا۔ چڑیاں دوبارہ چھت کی لکڑی میں تنکے جمع کر رہی تھیں۔ شاید اجڑے ہوئے گھونسلے کو دوبارہ بنا بنایا دیکھنے کے جذبہ نے ان کے اندر عمل کا شوق بڑھا دیا تھا۔ دوسرا گھونسلا انھوں نے اس سے کم مدت میں بنا لیا جتنی مدت میں انھوں نے پہلا گھونسلا بنایا تھا۔ چڑیوں کی اس جسارت پر اس کو غصہ آیا اور اس نے دوبارہ ان کا گھونسلا اجاڑ کر پھینک دیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس نے چڑیوں کے اوپر آخری طور پر فتح پالی ہے۔ مگر اگلے دن پھر گھونسلے کا مسئلہ اس کے سر پر موجود تھا۔ چڑیوں نے جب دیکھا کہ ان کا بنا بنایا گھونسلا اجاڑ دیا گیا ہے اور انڈے توڑے جا چکے ہیں تو انھوں نے رونے میں یا فریاد کرنے میں وقت ضائع نہیں کیا۔ انھوں نے ایسا بھی نہیں کیا کہ باہر جا کر دوسری ہم جنس چڑیوں کو ڈھونڈیں اور ان کے ساتھ متحدہ محاذ بنا کر گھر پر حملہ کریں۔ اس کے برعکس وہ خاموشی سے باہر نکل گئیں اور ایک ایک تنکا لا کر دوبارہ گھونسلا بنانا شروع کر دیا۔

اب یہی روزانہ کا قصہ ہو گیا۔ چڑیاں روزانہ گھونسلا بنانا شروع کرتیں اور آدمی روزانہ اس کو اجاڑ دیتا۔ اسی طرح ایک مہینہ گزر گیا۔ اس دوران میں کتنی ہی بار چڑیوں کی محنت ضائع ہوئی۔ ان کے چنے ہوئے تنکے بیکار ہو گئے۔ مگر چڑیاں ان چیزوں سے بے پروا ہو کر اپنا کام کئے جا رہی تھیں۔ آدمی کی نفرت کا جواب چڑیوں کے پاس صرف خاموش عمل تھا۔ آدمی کی تخریب کا مقابلہ ہر بار وہ نئی تعمیر سے کرتی تھیں۔ چڑیوں کا دشمن طاقت ور تھا مگر طاقت ور دشمن کا توڑ انھوں نے اپنے لگاتار عمل میں ڈھونڈھ لیا تھا۔

آخر نفرت پر خاموش عمل غالب آیا۔ چڑیوں کی مسلسل تعمیر نے آدمی کی مسلسل تخریب پر فتح پائی۔ ایک مہینہ کے ناکام مقابلہ کے بعد آدمی تھک چکا تھا۔ اس نے چڑیوں کا گھونسلا اجاڑنا چھوڑ دیا۔ اب گوریا نے اپنے گھونسلے کو مکمل کر کے پھر اس میں انڈے دے دئے ہیں۔ وہ ان کو سینے میں مشغول ہے تاکہ وہ اپنی اگلی نسل پیدا کرے اور پھر اپنا کام کر کے اڑ جائے۔ جب یہ چڑیاں اپنے گھونسلے میں جمع ہوتی ہیں تو ان کا "چوں چوں" کا شور اب بھی کمرہ میں گونجتا ہے۔ مگر اب آدمی کو یہ شور برا نہیں لگتا۔ کیونکہ "چوں چوں" کی آواز میں اس کو یہ قیمتی پیغام سنائی دیتا ہے ——— اپنے دشمن سے نفرت نہ کرو۔ ہر حال میں اپنی تعمیری جدوجہد میں لگے رہو۔ تم کامیاب ہو گے۔

یہ وقت کا سوال ہے نہ کہ قیمت کا

آکسفورڈ یونیورسٹی ۱۱۶۳ء میں قائم ہوئی۔ اس کے ہرے ہرے لان ساری دنیا میں مشہور ہیں۔ ایک امریکن کروڑپتی نے اس کے لان دیکھے تو وہ ان کو بہت پسند آ گئے۔ انھوں نے چاہا کہ ایسا ہی لان ان کی کوٹھی میں بھی ہو۔

"ایسا لان کتنے ڈالر میں تیار ہو جائے گا" انھوں نے آکسفورڈ کے مالی سے پوچھا۔

"مفت میں" مالی نے سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا

"وہ کیسے"

"اس طرح کہ آپ اپنی زمین کو ہموار کر کے اس پر گھاس جما دیجئے۔ جب گھاس بڑھے تو اس کو کاٹ کر اوپر سے رولر پھیر دیجئے۔ اسی طرح پانچ سو برس تک کرتے رہئے۔ جب پانچ سو سال پورے ہوں گے تو ایسا ہی لان آپ کے یہاں تیار ہو جائے گا۔ یہ وقت کا سوال ہے نہ کہ قیمت کا۔"

شام کے وقت سورج آپ کے اوپر غروب ہو جائے اور آپ دوبارہ صبح کا منظر دیکھنا چاہیں تو آپ کو پوری رات تک انتظار کرنا ہوگا۔ رات کا وقفہ گزارے بغیر آپ دوبارہ صبح کے ماحول میں آنکھ نہیں کھول سکتے۔ آپ کے پاس ایک بیج ہے اور آپ اس کو درخت کی صورت میں دیکھنا چاہتے ہیں تو آپ کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ ۲۵ سال تک انتظار کریں۔ اس سے پہلے آپ کا بیج ایک سرسبز و شاداب درخت کی صورت میں کھڑا نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح قدرت کے تمام واقعات کے ظہور کے لئے ایک "وقت" مقرر ہے۔ کوئی واقعہ اپنے مقررہ وقت سے پہلے ظہور میں نہیں آتا۔

وقت سے مراد وہ مدت ہے جس میں ایک طریق عمل جاری ہو کر اپنی تکمیل کو پہنچتا ہے۔ قدرت کے پورے نظام میں یہی اصول کارفرما ہے۔ انسان کے سوا بقیہ کائنات میں یہ اصول براہ راست خدائی انتظام کے تحت قائم ہے اور انسان کو اپنے ارادہ کے تحت اس کو اپنی زندگی میں اختیار کرنا ہے۔ کائنات اپنے پورے نظام کے ساتھ انسان کو یہ عملی سبق دے رہی ہے کہ واقعات کے ظہور کے لئے وہ کون سی حقیقی تدبیر ہے جس کو اختیار کر کے آدمی اس دنیا میں کامیاب ہو سکتا ہے۔

شخصی زندگی کی تعمیر کا معاملہ ہو یا قومی زندگی کی تعمیر کا، دونوں معاملات میں انسان کے لئے واحد صورت یہ ہے کہ وہ "آغاز" سے اپنا سفر جاری کرے اور مطلوبہ مدت سے پہلے نتیجہ دیکھنے کی تمنا نہ کرے۔ ورنہ اس کا انجام اس مسافر کا ہوگا جو ایک دوڑتی ہوئی ٹرین میں بیٹھا ہو اور اسٹیشن کے آنے سے پہلے اسٹیشن پر اترنا چاہے۔ ایسا مسافر اگر وقت سے پہلے اپنے ڈبہ کا دروازہ کھول کر اتر پڑے تو اس کے بعد وہ جہاں پہنچے گا وہ قبر ہوگی نہ کہ اس کی مطلوبہ منزل —— ہر کامیابی سب سے زیادہ جو چیز مانگتی ہے وہ وقت ہے۔ مگر کامیابی کی یہی وہ قیمت ہے جو آدمی دینے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔

پتھر کا سبق

راجستھان کا ایک طالب علم ہائی اسکول میں فیل ہو گیا۔ دوسرے سال اس نے پھر امتحان دیا۔ مگر وہ دوبارہ فیل ہو گیا۔ اس کے بعد جب اس کا تیسرے سال کا نتیجہ آیا اور اس نے دیکھا کہ وہ اب بھی فیل ہے تو اس کو سخت دھکا لگا۔ وہ اتنا بیزار ہوا کہ گھر سے بھاگ نکلا۔

چلتے چلتے وہ ایک گاؤں کے کنارے پہنچا۔ اس کو پیاس لگ رہی تھی۔ اس نے دیکھا کہ ایک کنواں ہے جس پر کچھ عورتیں اور بچے پانی بھر رہے ہیں۔ وہ کنویں کے پاس پہنچا تاکہ اپنی پیاس بجھا سکے۔ مگر وہاں اس نے ایک منظر دیکھا۔ منظر بظاہر چھوٹا سا تھا مگر وہ اس سے اتنا متاثر ہوا کہ اپنی پیاس بھول گیا۔ اس کو اچانک محسوس ہوا کہ اس نے پانی سے زیادہ بڑی ایک چیز پالی ہے۔

اس نے دیکھا کہ گاؤں کے لوگ جو پانی بھرنے کے لئے کنویں پر آتے ہیں، عام طور پر ان کے ساتھ دو عدد مٹی کے گھڑے ہوتے ہیں۔ ایک گھڑے کو وہ کنویں کے قریب ایک پتھر پر رکھ دیتے ہیں اور دوسرے گھڑے کو کنویں میں ڈال کر پانی نکالتے ہیں۔ اس نے دیکھا کہ جس پتھر پر گھڑا رکھا جاتا ہے وہ گھڑا رکھتے رکھتے گھس گیا ہے۔

"گھڑا مٹی کی چیز ہے،" اس نے سوچا "مگر جب وہ بار بار بہت دنوں تک ایک جگہ رکھا گیا تو اس کی رگڑ سے پتھر گھس گیا۔ استقلال کے ذریعہ مٹی نے پتھر کے اوپر فتح حاصل کر لی۔ مسلسل عمل نے کمزور کو طاقت ور کے اوپر غالب کر دیا۔ پھر اگر میں برابر محنت کروں تو کیا میں امتحان میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ کیا کوشش کے اضافہ سے میں اپنی کمی پر قابو نہیں پا سکتا۔"

یہ سوچ کر بھاگے ہوئے طالب علم کے قدم رک گئے۔ وہ لوٹ کر اپنے گھر واپس آ گیا اور دوبارہ تعلیم میں اپنی محنت شروع کر دی۔ اگلے سال وہ چوتھی بار ہائی اسکول کے امتحان میں بیٹھا۔ اس بار نتیجہ حیرت انگیز طور پر مختلف تھا۔ اس کے پرچے اتنے اچھے ہوئے کہ وہ اول درجہ میں پاس ہو گیا۔ تین بار ناکام ہونے والے نے چوتھی کوشش میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ پتھر کا یہ سبق نوجوان کی زندگی کے لئے اتنا اہم ثابت ہوا کہ اس کی زندگی کا رخ بدل گیا۔ جو طالب علم ہائی اسکول میں مسلسل ناکام ہو کر بھاگا تھا وہ اس کے بعد مسلسل فرسٹ آنے لگا۔ یہاں تک کہ ایم اے میں اس نے ٹاپ کیا۔ اس کے بعد وہ ایک اسکالرشپ پر اعلیٰ تعلیم کے لئے بیرونی ملک میں گیا۔ اور وہاں سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

یہ کوئی انوکھا واقعہ نہیں جو صرف ایک گاؤں میں پیش آیا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر جگہ ایسے "پتھر" موجود ہیں جو آدمی کو زندگی کا سبق دے رہے ہیں جو ناکامیوں میں سے کامیاب بن کر نکلنے کا اشارہ دیتے ہیں۔ اگر آدمی کے اندر نصیحت لینے کا مزاج ہو تو وہ اپنے قریب ہی ایسا ایک "پتھر" پائے گا جو خاموش زبان میں اس کو وہی پیغام دے رہا ہو جو مذکورہ نوجوان کو اپنے پتھر سے ملا تھا۔

مشکلیں ہیرو بنا دیتی ہیں

اوہایو اسٹیٹ یونیورسٹی (امریکہ) میں ایک ادارہ ہے جس کا نام ہے آفات وحوادث کی تحقیق کا مرکز (Disaster Research Centre) یہ ادارہ ۱۹۶۳ میں قائم ہوا۔ اب تک اس نے ایک سو سے زیادہ تعداد میں مختلف قسم کی بڑی بڑی انسانی آفتوں کا مطالعہ کیا ہے۔ اس نے پایا کہ غیر معمولی مشکل مواقع پر انسان کے اندر غیر معمولی طور پر نئی قوتیں ابھر آتی ہیں جو اس کو حوادث کا شکار ہونے سے بچاتی ہیں۔ مثلاً ۱۹۶۱ میں ٹکساس میں زبردست قسم کا سمندری طوفان آیا مگر اس طوفان میں اس علاقہ کے صرف آدھے ملین لوگوں نے اپنا مکان چھوڑا۔ ۵۰ فی صد سے زیادہ لوگ اپنے مکانوں میں جمے رہے۔ جب کہ اس طوفان کے آنے کی اطلاع چار دن پہلے دی جا چکی تھی۔ ۱۹۷۱ میں کیلیفورنیا کے زلزلہ میں ایک بہت بڑا ڈیم کمزور ہو گیا جس سے ۷۰ ہزار آبادی کے لئے سنگین خطرہ لاحق ہو گیا۔ مگر ایسے نازک وقت میں اپنے گھروں کو چھوڑ کر جانے والوں کی تعداد صرف ۷ فی صد تھی۔

تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ حادثات کا شکار ہو جانے کے بعد بھی اکثر لوگ پر اُمید رہتے ہیں۔ ٹیکساس کے شہروں میں ہولناک طوفان سے تباہ ہونے والے لوگوں سے ان کے مستقبل کے بارے میں پوچھا گیا۔ ۱۰ فی صد سے بھی کم لوگوں نے مستقبل کے بارے میں کسی اندیشہ کا اظہار کیا بقیہ تمام لوگ تباہی کے باوجود اپنے مستقبل کے بارے میں پر امید تھے۔ حوادث کے بارے میں اپنی لمبی تحقیق کا خلاصہ مذکورہ ادارہ کی رپورٹ میں ان الفاظ میں دیا گیا ہے: واقعات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان مصیبتوں کے مقابلہ میں حیرت انگیز طور پر قابو یافتہ اور لچکدار ثابت ہوئے ہیں۔ مصائب کے وقت انسان جس رویہ کا مظاہرہ کرتے ہیں، اس کو دہشت اور گھبراہٹ کے بجائے ہیروازم کے لفظ سے تعبیر کرنا زیادہ صحیح ہوگا۔

In conclusion, the reality of events suggests that human beings are amazin[gly] controlled and resilient in the face of adversity. Perhaps heroism — not panic [or] shock — is the right word to describe their most common behaviour in time [of] disaster.

انسان کو اس کے بنانے والے نے حیرت انگیز طور پر بے شمار صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں۔ انہی میں سے ایک صلاحیت یہ ہے کہ عین بربادی کے کھنڈر میں کھڑا ہو کر بھی وہ ختم نہیں ہوتا بلکہ اپنی نئی تعمیر کا منصوبہ سوچتا ہے اور بہت جلد اپنے نقصانات کی تلافی کر لیتا ہے۔ انسان کے اندر یہ فطری امکان ہم کو بہت بڑا سبق دے رہا ہے۔ کوئی فرد یا قوم اگر کسی حادثہ کا شکار ہو جائے تو اس کو ماتم اور شکایت میں ایک لمحہ ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ بلکہ خدا کی دی ہوئی صلاحیت کو بروئے کار لا کر اپنے کو دوبارہ اٹھانے کی کوشش میں لگ جانا چاہئے۔ عین ممکن ہے کہ حالات نے جہاں آپ کی کہانی ختم کر دینی چاہی تھی وہیں سے آپ کی زندگی کے ایک نئے شاندار باب کا آغاز ہو جائے۔

کامیابی پندرہ سال میں

ایک صاحب ایک بیڑی کے کارخانہ میں معمولی ملازم تھے۔ وہاں انھوں نے بیڑی کے کاروبار کے تمام "گر" سیکھ لئے اور اس کے بعد اپنا الگ کام کرلیا۔ انھوں نے پانچ ہزار روپے سے اپنا کام شروع کیا تھا۔ مسلسل محنت کے تقریباً پندرہ سال گزارنے کے بعد ان کا بہت بڑا کارخانہ ہوگیا۔ ایک روز اپنے دوستوں سے اپنی کہانی بتاتے ہوئے انھوں نے کہا ــــــ جس طرح بچہ پندرہ سال میں جوان ہوتا ہے اسی طرح بزنس بھی پندرہ سال میں جوان ہوتا ہے۔ میں اپنی موجودہ حالت تک ایک دن میں نہیں پہنچ گیا۔ یہاں تک پہنچنے میں مجھ کو پندرہ سال لگ گئے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر کام "پندرہ سال" ہی میں پورا ہوتا ہے۔ خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی۔ خواہ وہ کوئی کاروبار ہو یا ملّی خدمت ہو۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ایسا بھی کوئی نسخہ ہو سکتا ہے کہ جو فوراً کامیاب کردے وہ خوش خیالیوں کی دنیا میں رہتے ہیں۔ "ایک چھلانگ لگاؤ اور منزل تک پہنچ جاؤ" قواعد کے لحاظ سے ایک صحیح جملہ ہے۔ مگر زندگی کی حقیقتوں کے اعتبار سے یہ بے معنی الفاظ کا ایک مجموعہ ہے جس کی واقعات کی دنیا میں کوئی قیمت نہیں۔ گلاین کننگھم (Gleun Cunningham) وہ شخص ہے جو ایک میل کی دوڑ کا چیمپئن بنا۔ وہ جس اسکول میں پڑھ رہا تھا اس میں آگ لگ گئی۔ وہ آگ کی لپیٹ میں آگیا۔ اس کا پاؤں اس طرح جھلس اٹھا کہ وہ چلنے پھرنے سے معذور ہوگیا۔ ڈاکٹروں کا اتفاق تھا کہ اس کو دوبارہ چلنے اور دوڑنے کے قابل بنانے کے لئے ایک معجزہ کی ضرورت ہے۔ مگر گلاین کننگھم کی معذوری نے اس کے اندر چلنے اور دوڑنے کا ایک نیا شوق ابھار دیا۔ اس کے دل و دماغ کی ساری توجہ اس پر لگ گئی کہ وہ دوبارہ اپنے آپ کو چلنے کے قابل بنائے۔ اس نے طرح طرح کی مشقیں شروع کردیں۔ بالآخر اس کی سمجھ میں ایک تدبیر آئی۔ اس نے چلتے ہوئے ہل کے دستہ سے لٹک کر گھسٹنے کی مشق شروع کردی۔ تدبیر کامیاب رہی۔ جب اس کے پاؤں زمین پر ٹکنے کے قابل ہوگئے تو اس کی ہمت بندھی۔ اب اس نے اپنی مشق اور تیز کردی۔ بالآخر وہ معجزہ رونما ہو کر رہا جس کی ڈاکٹروں نے پیش گوئی کی تھی۔ وہ باقاعدہ چلنے اور دوڑنے کے قابل ہوگیا۔ اس کے بعد اس نے ایک مقابلہ میں حصہ لیا اور ایک میل کی دوڑ کے پچھلے تمام ریکارڈ توڑ کر اس کا چیمپئن بن گیا ــــ مگر گلاین کننگھم کو یہ کامیابی چند دن میں حاصل نہیں ہوئی۔ اس منزل تک پہنچنے میں اس کے "پندرہ سال" لگ گئے۔ پندرہ سالہ جدوجہد کے بعد ہی یہ ممکن ہو سکا کہ وہ دوڑ کا چیمپئن بنے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں "پندرہ سال" کے بغیر کوئی کامیابی ممکن نہیں۔ فی الفور نتائج نکالنے پر جو ہستی سب سے زیادہ قادر ہے وہ اللہ ہے۔ مگر اللہ نے اپنی دنیا کا نظام فی الفور نتائج کی بنیاد پر نہیں بنایا۔ صرف اس لئے تاکہ انسان کو عبرت ہو اور وہ لاحاصل کوششوں میں اپنا وقت ضائع نہ کرے۔ خدا کی دنیا میں رات دن بے شمار واقعات ہو رہے ہیں۔ مگر سب کچھ حد درجہ محکم قوانین کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ یہاں ایک گھاس بھی ایسی نہیں جو خوش فہمی کی زمین پر کھڑی ہو اور ایک چیونٹی بھی نہیں جو حقائق کو نظر انداز کرکے زندہ ہو۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان کے لئے خدا کا قانون بدل جائے۔ کامیابی کی واحد شرط "سعی" ہے۔ یعنی وہ کوشش کرنا جو مطلوبہ مقصد کے لئے قانون الٰہی کے تحت مقدر ہے۔ یہی اصول دنیا کی کامیابی کے لئے ہے اور یہی آخرت کی کامیابی کے لئے۔

ملت کا درخت اگانے کے لئے

سابق صدر امریکہ جان ایف کنیڈی نے ایک بار لاد ٹے (Lyautay) کا حوالہ دیتے ہوئے اس کا اپنا ایک قصہ نقل کیا تھا۔ اس کے الفاظ یہ تھے :

> (I) once asked (my) gardener to plant a tree. The gardener objected that the tree was slow growing and would not reach the maturity for a hundred years. (I) replied : "In case there is no time to loose, plant it in the afternoon ...."
>
> Chartered Accountant (Supplement)
> New Delhi, June 1979

میں نے ایک بار اپنے باغبان سے ایک درخت کا پودا لگانے کے لئے کہا۔ باغبان نے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ یہ درخت بہت دھیرے دھیرے بڑھتا ہے اور اس کو پورا درخت بننے میں ایک سو سال لگ جائیں گے۔ میں نے جواب دیا: ایسی حالت میں تو ہم کو بالکل وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ تم آج ہی دوپہر بعد اس کا پودا لگا دو۔

ملت کی تعمیر و ترقی ایک طویل المدت منصوبہ ہے۔ فرد اور اجتماع کی سطح پر بے شمار اسباب فراہم کرنے کے بعد وہ وقت آتا ہے جب کہ ملت اپنی پوری شان کے ساتھ زندہ ہو اور وہ ایک طاقتور قوم کی حیثیت سے زمین پر اپنی جگہ حاصل کرے۔ مگر جب اس قسم کا منصوبہ پیش کیا جاتا ہے تو کہنے والے فوراً کہہ دیتے ہیں: یہ تو بڑا لمبا منصوبہ ہے۔ اس کو پورا ہونے میں سو سال لگ جائیں گے۔ ایسے لوگوں کو ہمارا جواب صرف ایک ہے: جب ایسا ہے تو ہمیں ایک لمحہ کے لئے بھی اپنا وقت کھونا نہیں چاہئے۔ ہم کو چاہئے کہ ہم آج ہی پہلی فرصت میں اپنا "درخت" نصب کر دیں۔

ایک طاقتور درخت ہمیشہ "سو سال" ہی میں تیار ہوتا ہے۔ اس لئے جو شخص طاقتور درخت کا مالک بننا چاہتا ہو اس کے لئے سو سالہ باغبانی کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اگر وہ ایسا کرنے کے بجائے سڑکوں پر نکل کر "درخت ستیہ گرہ" شروع کر دے۔ یا کسی میدان میں جمع ہو کر "باغ ملت زندہ باد" کے نعرے لگانے لگے تو یہ ایک احمقانہ حرکت ہوگی جس سے نہ کوئی درخت اگے گا اور نہ وہ باغ والا بنے گا۔ اس کا واحد انجام صرف یہ ہے کہ وہ اس وقت کو مزید ضائع کر دے جو درخت اگانے کے لئے اس کو قدرت کی طرف سے حاصل تھا۔ آپ کے پاس مکان نہ ہو اور آپ سڑک پر کھڑے ہو کر پھلجھڑی چھوڑنے لگیں تو اس سے آپ شہر میں ایک مکان کے مالک نہیں بن جائیں گے۔ اسی طرح ملت کا نام لے کر کچھ لوگ سیاسی شعبدہ بازی کرنے لگیں تو اس قسم کے شعبدوں سے ایسا نہیں ہو سکتا کہ زمین پر ملت کا قلعہ کھڑا ہو جائے۔ اشعار کی دنیا میں صرف تک بندیوں کے ذریعہ بڑے بڑے انقلاب لائے جا سکتے ہیں۔ ایک خطیب اپنے پرجوش الفاظ کے ذریعہ آناً فاناً ایک پنڈال کو شاندار کامیابیوں کے آسمان پر پہنچا سکتا ہے۔ مگر ایک حقیقی واقعہ کو ظہور میں لانا ایسا صبر آزما کام ہے جو طویل منصوبہ بندی اور مسلسل جد و جہد کے بغیر ممکن نہیں۔

سیڑھی نہ کہ لفٹ

"موجودہ منزل تک میں سیڑھی سے پہنچا ہوں نہ کہ لفٹ سے" ایک ٹیلر ماسٹر نے کہا "ایک اچھا کوٹ تیار کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ کوٹ تیار کرنے کا پورا عمل اتنا پیچیدہ ہے کہ کوئی شخص کافی معلومات اور تجربہ کے بغیر اس کو بخوبی طور پر انجام نہیں دے سکتا۔ میں نے اس راہ میں ایک عمر صرف کی ہے۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہو سکا ہے کہ میں شہر میں سلائی کی ایک دکان کامیابی کے ساتھ چلا سکوں"

ٹیلر ماسٹر نے اپنی کہانی بتاتے ہوئے کہا کہ اولاً میں نے ایک ٹیلر ماسٹر کی شاگردی کی۔ اس کے یہاں پانچ سال تک کوٹ کی سلائی اور کٹائی کا کام سیکھتا رہا۔ پانچ سال کی مسلسل محنت کے بعد میں اس قابل ہو گیا کہ میں ایک عام کوٹ سی سکتا تھا۔ مگر جب میں نے اپنی دکان کھول کر کام شروع کیا تو معلوم ہوا کہ ابھی بہت سے مسائل ہیں جن کو حل کرنا باقی ہے۔ ہر آدمی کا جسمانی ڈھانچہ الگ الگ ہوتا ہے اور کسی کوٹ کو پہننے والے شخص کے اپنے ڈھانچہ کے مطابق ہونا چاہئے۔ چنانچہ جو کوٹ میں تیار کرتا اکثر اس میں شکایت ہو جاتی۔ کیوں کہ اس میں گاہک کے اپنے جسمانی ڈھانچہ کے لحاظ سے کچھ فرق ہو جاتا اور کوٹ صحیح نہ آتا۔ اس تجربہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ انسانی جسم کی بناوٹ (اناٹومی) کے اچھے مطالعہ کے بغیر یہ ناممکن ہے کہ میں ایک معیاری کوٹ تیار کر سکوں۔ میں ایک گریجویٹ تھا۔ میں نے باقاعدہ اناٹومی کا مطالعہ شروع کر دیا اور انسانی جسم کی اوپری ساخت کے بارے میں پوری معلومات حاصل کیں۔ اس مطالعہ میں مجھ کو مزید پانچ سال لگ گئے۔ اس طرح دس سال کی محنت کے بعد یہ ممکن ہوا کہ میں ہر شخص کے جسم سے ٹھیک ٹھیک مطابقت رکھنے والا کوٹ تیار کر سکوں۔ حتیٰ کہ ان لوگوں کا بھی جن میں کبڑاپن یا اور کوئی جسمانی فرق ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کا کوٹ بھی میں اس طرح تیار کر سکتا ہوں کہ کہیں کوئی شکن نہ ہو۔ ہر لحاظ سے ایک موزوں کوٹ تیار کرنے کے لئے بہت سی باتیں بطور خود جاننی پڑتی ہیں۔ کیوں کہ ہر چیز کا ناپ نہیں لیا جا سکتا۔ ایک ٹیلر ماسٹر جسم کے جن حصوں کا ناپ لیتا ہے اگر اس کا علم اتنا ہی ہو تو وہ کبھی ایک معیاری کوٹ تیار کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

ٹیلر ماسٹر نے اپنے فن کے بارے میں اس طرح کی اور بھی کئی باتیں بتائیں اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں "تعمیر ملت" کے موضوع پر ایک تجربہ کار آدمی کا لکچر سن رہا ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ ہمارے جو معاشی اور سماجی مسائل ہیں ان میں وہی طریقہ کارآمد ہے جس سے مذکورہ ٹیلر ماسٹر نے کامیابی حاصل کی۔ یعنی لفٹ کے بجائے سیڑھی سے چڑھنا۔ زندگی میں کوئی چھلانگ نہیں۔ یہاں ایسا کوئی بٹن نہیں ہے کہ آپ اس کو دبائیں اور اچانک ایک لفٹ متحرک ہو کر آپ کو اوپر پہنچا دے۔ یہاں تو زینہ بزینہ ہی سفر طے کیا جا سکتا ہے۔ آپ "سیڑھی" کے ذریعہ اپنی زندگی کو کامیاب بنا کر ایک لفٹ خرید سکتے ہیں مگر "لفٹ" کے ذریعہ اپنی زندگی کو کامیاب نہیں بنا سکتے۔

الٹا اہرام

دہلی کی سب سے اونچی عمارت وکاس مینار ہے۔ جب یہ عمارت بنی اور اخبار میں اس کی خبر چھپی
دخبر کا پہلا لفظ یہ تھا: "شہر کی ۲۱ منزلہ عمارت تیار ہوگئی" ظاہر ہے کہ عمارت اس طرح نہیں بنی کہ اس کی
اوپی منزل سب سے پہلے بن کر کھڑی ہوگئی ہو۔ عمارت کی تعمیر کا کام اس کی بنیاد سے شروع ہوا۔ پھر ہوتے
دتے کئی سال میں اوپری منزل تک پہنچا۔ مگر خبر کی ترتیب میں "۲۱ منزل" کا لفظ سب سے پہلے تھا۔

اخباروں میں خبر مرتب کرنے کا یہی طریقہ رائج ہے۔ اس طریقہ کو صحافتی اصطلاح میں مثلث معکوس
یا الٹا اہرام (Inverted Pyramid) کہتے ہیں۔ یعنی خبر کو اس کی اصلی ترتیب کے ساتھ بیان کرنے کے
بجائے الٹی ترتیب کے ساتھ بیان کرنا۔ کوئی واقعہ جو ہماری زندگی میں پیش آتا ہے وہ ایک فطری ترتیب سے
پیش آتا ہے۔ اس کی ایک ابتدا ہوتی ہے۔ پھر درمیانی اجزار سامنے آتے ہیں۔ اس کے بعد اس کا آخری اور
نہائی جزر وقوع میں آتا ہے۔ یہ واقعہ کی فطری ترتیب ہے۔ مگر اخباری رپورٹر کو معاملہ کی واقعاتی ترتیب
سے دلچسپی نہیں ہوتی۔ اس کے پیش نظر صرف یہ ہوتا ہے کہ فوراً کوئی بڑی سی بات کہہ کر قارئین کی توجہ اپنی
طرف مائل کرے۔ اسی لئے جب وہ خبر کو مرتب کرتا ہے تو وہ اس کی ترتیب کو الٹ دیتا ہے۔ اصل واقعہ کا
جو جزر بالکل آخر میں پیش آیا تھا اس کو وہ آغاز میں رکھ دیتا ہے اور اس کے بعد پوری خبر بیان کرتا ہے۔
گویا کہ "اہرام" کے بننے کی ترتیب خبر کی صورت اختیار کرتے وقت الٹ جاتی ہے۔ اخباری رپورٹر ایسا اس
لئے کرتا ہے تاکہ وہ پہلے ہی مرحلہ میں ناظرین کی توجہ اپنی طرف کھینچ سکے۔

"الٹا اہرام" اخبار کے صفحات میں بن سکتا ہے مگر وہ زمین پر نہیں بن سکتا۔ اسی طرح ملت کے مستقبل
کا قلعہ بھی الٹی سمت سے صرف الفاظ کی دنیا میں کھڑا کیا جا سکتا ہے وہ حقیقت کی دنیا میں وجود میں نہیں آسکتا۔
اگر آپ کو تعمیر ملت کی لفظی مہم چلانا ہے تو وہ ایک "عہد آفریں" اعلان یا ایک "تاریخ ساز" اجلاس کے ذریعہ
آخری منزل سے بھی شروع ہو سکتی ہے۔ مگر کوئی واقعی تعمیر اس کے بغیر ممکن نہیں کہ ابتدائی مقام سے اپنے
کام کا آغاز کیا جائے۔

الفاظ بولنے والا اپنے پہلے ہی جملہ میں آخری منزل پر چھلانگ لگا کر یہ کہہ سکتا ہے "شہر کی بیس منزلہ
عمارت تیار ہوگئی" لفظ بولنے والے کے لئے موقع ہے کہ وہ اپنے "عمل" کو آخری مرحلہ سے شروع کرے۔ مگر
جو شخص ایک حقیقی واقعہ کو ظہور میں لانا چاہتا ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ اپنے عمل کو ابتدار سے شروع
کرے، وہ آخری منزل سے اپنے سفر کا آغاز نہیں کر سکتا۔

سنبھل کر چلئے

چھوٹے جانوروں کو ندی پار کرنا ہو تو وہ پانی میں تیزی سے چل کر نکل جاتے ہیں۔ مگر ہاتھی جب کسی ندی کو پار کرتا ہے تو وہ تیزی سے چلنے کے بجائے ہر قدم پر رک رک کر چلتا ہے۔ وہ ہر قدم نہایت احتیاط سے رکھتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ چھوٹے جانوروں کے لئے کوئی خطرہ نہیں۔ پانی کے نیچے کی مٹی نرم ہو یا سخت، ان کا ہلکا پھلکا جسم بآسانی اس سے گزر جاتا ہے۔ مگر ہاتھی غیر معمولی طور پر بڑا جانور ہے۔ بھاری جسم کی وجہ سے اس کے لئے یہ خطرہ ہے کہ نیچے کی مٹی اگر نرم ہو اور اس کا پاؤں اس میں دھنس جائے تو اس کے لئے اس سے نکلنا سخت مشکل ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ہاتھی جب تک یہ نہ دیکھ لے کہ نیچے کی سطح مضبوط ہے وہ قدم آگے نہیں بڑھاتا۔ ہر بار جب وہ قدم رکھتا ہے تو اس پر اپنا پورا بوجھ نہیں ڈالتا۔ وہ ہلکا قدم رکھ کر پہلے اس کی نرمی اور سختی کو آزماتا ہے۔ اور جب اندازہ کر لیتا ہے کہ زمین سخت ہے اسی وقت اس پر اپنا پورا بوجھ رکھ کر آگے بڑھتا ہے۔

یہ طریقہ ہاتھی کو کس نے سکھایا۔ جواب یہ ہے کہ خدا نے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہاتھی کے اس طریق عمل کو خدائی تصدیق حاصل ہے۔ گویا زندگی کے لئے خدا کا بتایا ہوا سبق یہ ہے کہ جب راستہ میں کسی خطرہ کا اندیشہ ہو تو اس طرح نہ چلا جائے جس طرح بے خطر راستہ پر چلا جاتا ہے بلکہ ہر قدم سنبھل سنبھل کر رکھا جائے، ''زمین'' کی قوت کا اندازہ کرتے ہوئے آگے بڑھا جائے۔

انسان کو خدا نے ہاتھی سے زیادہ عقل دی ہے۔ جہاں بارود کے ذخیرے ہوں وہاں آدمی دیا سلائی نہیں جلاتا۔ جس ٹرین میں پٹرول کے ڈبے لگے ہوئے ہوں، اس کا ڈرائیور بے احتیاطی کے ساتھ اس کی شنٹنگ نہیں کرتا۔ مگر اسی اصول کو اکثر لوگ سماجی زندگی میں بھول جاتے ہیں۔ ہر سماج میں طرح طرح کے انسان ہوتے ہیں اور وہ طرح طرح کے حالات پیدا کئے رہتے ہیں۔ سماج میں کہیں ''دلدل'' ہوتا ہے اور کہیں ''پٹرول''۔ کہیں ''کانٹا'' ہوتا ہے اور کہیں ''گڑھا''۔ عقلمند وہ ہے جو اس قسم کے سماجی مواقع سے بچ کر نکل جائے نہ کہ اس سے الجھ کر اپنے راستہ کو کھوٹا کرے۔

جس آدمی کے سامنے کوئی مقصد ہو وہ راستہ کی ناخوش گواریوں سے کبھی نہیں الجھے گا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ان سے الجھنا اپنے آپ کو اپنے مقصد سے دور کر لینا ہے۔ بامقصد آدمی کی توجہ آگے کی طرف ہوتی ہے نہ کہ دائیں بائیں کی طرف۔ وہ مستقل نتائج پر نظر رکھتا ہے نہ کہ وقتی کارروائیوں پر۔ وہ حقیقت کی نسبت سے چیزوں کو دیکھتا ہے نہ کہ ذاتی خواہشات کی نسبت سے۔

ایک طریقہ یہ بھی ہے

نپولین (۱۸۲۱ - ۱۷۶۹) جب پہلی قید کے بعد جزیرہ البا (Elba) سے بھاگا تو اس کے ساتھ اس کے وفادار سپاہیوں کی صرف ایک مختصر جماعت تھی۔ اس معزول تاجدار کے عزائم یہ تھے کہ وہ فرانس کے تخت پر دوبارہ قبضہ کرے۔ مگر پہلے ہی معرکہ میں اس کو فرانس کے ۲۰ ہزار جوانوں کا سامنا کرنا پڑا۔

نپولین دنیا کے انتہائی بہادر انسانوں میں سے ایک ہے۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا کہ اپنی فوجی کمی کا لحاظ نہ کرتے ہوئے حریف سے ٹکرا جائے۔ جب دونوں فریق آمنے سامنے ہوئے تو وہ اکیلا بالکل غیر مسلح حالت میں اپنی جماعت سے نکلا اور نہایت اطمینان کے ساتھ فریق مخالف کی صفوں کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے کوٹ کے بٹن کھولے اور اپنے سینہ کو ننگا کر دیا۔ اس کے بعد جذباتی انداز میں اپنے مخالف سپاہیوں سے، جن میں سے اکثر اس کے ماتحت رہ چکے تھے، خطاب کر کے بولا:

"تم میں سے کون وہ سپاہی ہے جو اپنے باپ کے ننگے سینہ پر فائر کرنے کو تیار ہو"

اس کا اثر یہ ہوا کہ ہر طرف سے "کوئی نہیں، کوئی نہیں" کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ تمام سپاہی مخالف جماعت کو چھوڑ کر نپولین کے جھنڈے کے نیچے آ گئے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ نپولین اپنی بے سروسامانی کے باوجود فاتح ہوا۔ اس نے ملک فرانس کے تخت پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ حالاں کہ اس وقت وہ جس بے سروسامانی کی حالت میں تھا، اس کے ساتھ اگر وہ فرانس کی فوجوں سے لڑ جاتا تو میدان جنگ میں شاید اس کی لاش تڑپتی ہوئی نظر آتی۔

آدمی کے پاس کتنا ہی ساز و سامان ہو لیکن خطرہ پیش آنے کی صورت میں اگر وہ گھبرا اٹھے تو اس کے اعصاب جواب دے جائیں گے وہ اس قابل نہیں رہے گا کہ صورت حال کے بارے میں سوچے اور مقابلہ کے لئے اپنا منصوبہ بنائے۔ اس کے برعکس اگر وہ خطرہ کے وقت اپنے ذہن کو حاضر رکھے تو بہت جلد ایسا ہو گا کہ وہ خطرہ کی اصل نوعیت کو سمجھ لے اور اپنے ممکن ذرائع کو بر وقت استعمال کر کے کامیاب رہے۔

تاریخ میں بار بار کم تعداد اور کم طاقت والوں نے زیادہ تعداد اور زیادہ طاقت والوں پر کامیابی حاصل کی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ دشمن ہمیشہ اس سے بہت کم طاقت ور ہوتا ہے جتنا کہ وہ بظاہر دکھائی دیتا ہے۔ اس دنیا کا نظام کچھ اس ڈھنگ پر بنا ہے کہ کوئی شخص یا گروہ خواہ کتنا ہی طاقت ور ہو جائے اس کے اندر کوئی نہ کوئی کمزوری موجود رہتی ہے۔ اسی کمزوری کو استعمال کرنے کا نام دشمن پر فتح حاصل کرنا ہے۔ کسی شخص کی واحد طاقت اس کے فریق کی کمزوری ہے، اور یہ طاقت ہمیشہ ہر ایک کو حاصل رہتی ہے۔ بشرطیکہ وہ اس ہوشیاری کا ثبوت دے سکے کہ وہ اپنے حریف کی کمزوری کو استعمال کرنا جانتا ہے۔

غلطی مان لینے سے

ایک پریس نے ایک مرتبہ ایک بڑے ادارہ کی کتاب چھاپی۔ کتاب کی تعداد پانچ ہزار تھی۔ کتاب جب چھپ کراور مکمل ہوکرادارہ میں پہنچی تو اس کے بعد ادارہ کے منیجر کا ٹیلی فون آیا۔ وہ کہہ رہا تھا " آپ فوراً یہاں آکر مجھ سے ملیے۔" پریس کا مالک پہنچا تو ادارہ کا منیجر اس کے اوپر برس پڑا۔ اس نے مطبوعہ کتاب کے چند نسخے دکھاتے ہوئے کہا " یہ دیکھیے اس کی کٹنگ کتنی غلط ہوئی ہے"۔ پریس کے مالک نے دیکھا تو واقعی کٹنگ ترچھی ہوگئی تھی جس کی وجہ سے ایک طرف کا کو زیادہ نکلا ہوا تھا۔ پریس کے مالک نے دیکھا اور خاموش رہا۔ دوسری طرف ادارہ کا منیجر مسلسل بگڑے چلا جارہا تھا آخر جب وہ اپنے تمام الفاظ ختم کرچکا تو پریس کے مالک نے سنجیدگی کے ساتھ کہا:

"آپ کیوں اس قدر پریشان ہیں نقصان تو ہمارا ہوا ہے، ہم کو پریشان ہونا چاہیے"۔

"کیا مطلب، آپ کا نقصان کیسا"

" ظاہر ہے کہ اس حالت میں میں آپ کو کتاب نہیں دے سکتا۔ اس کو تو میں واپس لے جاؤں گا اور دوبارہ آپ کو دوسری کتاب چھاپ کر دوں گا۔ یہ میری ذمہ داری ہے۔ خواہ مجھے کتنا ہی نقصان ہو مگر مجھے آپ کو صحیح کام دینا ہے"

پریس کے مالک کی زبان سے ان الفاظ کا نکلنا تھا کہ ادارہ کے منیجر کا لہجہ یکایک بدل گیا۔ وہی شخص جو بگڑے ہوئے انداز میں بول رہا تھا اب اس کا رویہ ہمدردانہ ہوگیا۔ کیونکہ پریس والے نے اپنی غلطی تسلیم کرلی تھی۔ ادارے کے منیجر کو عام رواج کے مطابق اس کی امید نہیں تھی۔ مگر جب اس نے دیکھا کہ وہ نہ صرف اپنی غلطی مان رہا ہے بلکہ اس کی پوری تلافی کرنے کے لئے تیار ہے تو اس کا متاثر ہونا بالکل فطری تھا۔

"نہیں آپ اتنا نقصان کیوں برداشت کریں" اس نے اپنا انداز بدلتے ہوئے کہا۔ جب پریس کے مالک نے دیکھا کہ منیجر کا دل نرم پڑچکا ہے تو اس نے منیجر سے کہا: ایک شکل مجھ میں آتی ہے۔ آپ مجھے چند کتابیں دے دیجئے۔ میں کوشش کرتا ہوں۔ اگر کامیابی ہوگئی تو دوبارہ چھپوانے کی ضرورت نہ ہوگی۔ منیجر نے کہا: بڑے شوق سے، آپ ضرور کوشش کیجئے۔ اس کے بعد پریس کا مالک کتاب کے دس نسخے لے کر واپس آگیا۔ اس نے اچھی مشین میں احتیاط سے کتاب کے چاروں کونے دوبارہ صحیح کرائے۔ اب پریس کا مالک اس کو لے کر ادارہ کے منیجر کے پاس گیا۔ منیجر اس کو دیکھ کر خوش ہوگیا۔ اس نے کہا، بالکل ٹھیک ہے، اسی طرح آپ سب کتابیں درست کرا دیجئے۔

"گاہک کی نظر میں جو غلطی ایک انچ کی ہوتی ہے اس کو میں ایک فٹ کے برابر ماننے کے لئے تیار رہتا ہوں" پریس کے مالک نے کہا" یہ درحقیقت کسی کاروبار میں کامیابی کے لئے بے حد اہم ہے۔ گاہک کو مطمئن کرکے آپ گاہک کو ہر چیز پر راضی کرسکتے ہیں"۔ "بلکہ میرا تو یہ حال ہے"، پریس کے مالک نے مزید کہا " کہ اگر میرے کام میں غلطی ہوگئی اور وہ میری نظر میں آجاتی ہے تو میں خود ہی گاہک کو بتادیتا ہوں کہ مجھ سے فلاں غلطی ہوگئی ہے۔ اب تلافی کی جو شکل بتائیے اس کے لئے تیار رہوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گاہک کو ہمدردی ہوجاتی ہے۔ اور بغیر کسی ناخوش گواری کے معاملہ ختم ہوجاتا

شیر کا سبق

جم کاربٹ (Jim Corbett) شیر کے مطالعہ کا ماہر سمجھا جاتا ہے۔ اس کے نام پر ہندوستان میں حیوانات کا ایک پارک بنا ہوا ہے۔ جم کاربٹ نے لکھا ہے کہ کوئی شیر کسی آدمی پر اس وقت تک حملہ نہیں کرتا جب تک کہ اس کو اپنی طرف سے کوئی کارروائی کرکے بھڑکا نہ دیا جائے:

No tiger attacks a human being unless provoked

جو لوگ جنگل کے علاقوں میں رہتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اگر کبھی ان کا سابقہ شیر سے پڑ جائے تو اس میں خطرہ کی کوئی بات نہیں ہے۔ کیونکہ شیر اپنا راستہ چلتا ہوا گزر جائے گا بشرطیکہ اس کو چھیڑا نہ جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ شیر اپنی فطرت کے اعتبار سے انسان دشمن جانور نہیں۔ شیر کے لئے "مردم خور" کا لفظ صرف اتفاقی معنی میں صحیح ہے۔ شیر پیدائشی طور پر مردم خور نہیں ہوتا۔ بلکہ بعض نادان انسانوں کی کارروائیاں کسی شیر کو مردم خور بنا دیتی ہیں۔ کسی شیر کو مردم خور بنانے والے اکثر وہ غیر ماہر شکاری ہوتے ہیں جو کافی تیقن کے بغیر شیر کے اوپر اپنا کارتوس خالی کر دیتے ہیں۔ وہ شیر مارنے کے شوق میں شیر پر گولی چلاتے ہیں۔ مگر کافی مہارت نہ ہونے کی وجہ سے ان کی گولی صحیح نشانہ پر نہیں پڑتی اور اچٹتی ہوئی نکل جاتی ہے۔ شیر معمولی طور پر زخمی ہو جاتا ہے مگر وہ مرتا نہیں۔ اس قسم کا زخم خوردہ شیر انسان کا دشمن ہو جاتا ہے۔ وہ جہاں کہیں بھی انسانی صورت کو دیکھتا ہے اس کو اپنا دشمن سمجھ لیتا ہے اور اس پر حملہ کرکے اسے ختم کر دیتا ہے۔ یہی حال اکثر درندہ جانوروں کا ہے۔

اس مثال میں ہمارے لئے دو بہت بڑے سبق ہیں۔ ایک یہ کہ کسی کو پیشگی طور پر اپنا "دشمن" سمجھ لینا درست نہیں۔ حتیٰ کہ ایک درندہ صفت انسان کو بھی نہیں۔ کوئی شخص اسی سے دشمنانہ معاملہ کرتا ہے جس کو وہ اپنا دشمن سمجھ لے۔ اگر ہم اپنے کو دشمن ظاہر نہ کریں تو دوسرا بھی ہم سے دشمن کا سلوک نہیں کرے گا۔

دوسرا سبق یہ ہے کہ ناکافی تیاری کے بغیر کبھی کسی کے خلاف کارروائی نہیں کرنا چاہئے۔ اگر آپ اپنے حریف پر ایسے اقدامات کریں جو کافی تیاری کے بغیر کئے گئے ہوں اور اس بنا پر وہ فیصلہ کن نہ بن سکیں تو ایسا اقدام آپ کے حریف کو پہلے سے زیادہ مشتعل کرکے آپ کے مسئلہ کو اور زیادہ سنگین بنا دے گا۔

ہر شخص خود اپنے اندرونی تقاضے کے تحت اپنی ضرورتوں کی تکمیل میں مشغول رہتا ہے اور اگر ضرورتیں پوری ہو جائیں تو ہوس کی تکمیل میں۔ یہ ایک قدرتی انتظام ہے جو لوگوں کو ایک دوسرے سے روکے رہتا ہے۔ آپ دوسرے کو نہ چھیڑئے اور آپ دوسرے کے ظلم سے محفوظ رہیں گے۔ کیوں کہ یہاں ہر ایک اپنے آپ میں اتنا مشغول ہے کہ اس کو دوسرے کے خلاف سوچنے کی فرصت نہیں۔

اندر اور باہر کا فرق

اپالو ۸ کے تین خلائی مسافر ۲۷ دسمبر ۱۹۶۸ کو بحرالکاہل میں اترے تھے۔ زمین سے چاند تک کا سفر کرنے میں ان امریکی خلابازوں کو چھ دن تین گھنٹے لگے اور انھوں نے تقریباً پانچ لاکھ ۷۴ ہزار میل کا سفر طے کیا۔ اس سفر کا سب سے زیادہ نازک لمحہ وہ تھا جب کہ ان کا چھ ٹن وزنی جہاز ساٹھ میل کے فاصلہ سے چاند کا چکر لگا کر دوبارہ زمین کے قریب واپس پہنچا۔

امریکی راکٹ جب زمین کی بیرونی فضا میں داخل ہوا تو زمین کی کشش کی وجہ سے اس کی رفتار غیر معمولی طور پر بڑھ کر ۳۹ ہزار کیلومیٹر فی گھنٹہ ہو گئی۔ چاند کے مقابلہ میں اس کو سات گنا زیادہ قوت کشش کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھنا تھا۔ اس غیر معمولی رفتار کی وجہ سے خلائی جہاز انتہائی خوفناک قسم کی گرمی سے دوچار ہوا۔ کرۂ فضا میں داخل ہوتے ہی خلائی جہاز ہوا کی رگڑ سے گرم ہونا شروع ہوا۔ یہاں تک کہ وہ آگ کے انگارے کی طرح سرخ ہو گیا۔ اس وقت خلائی جہاز کے بیرونی حصہ کی تپش تین ہزار تین سو سنٹی گریڈ (۶ ہزار ڈگری فارن ہائٹ) تھی، جب کہ صرف سو ڈگری کی حرارت پر پانی ابلنے لگتا ہے۔

تین ہزار تین سو ڈگری سنٹی گریڈ کی حرارت میں کوئی جاندار زندہ نہیں رہ سکتا۔ پھر اس غیر معمولی تپش میں تینوں خلائی مسافر کس طرح زندہ سلامت رہ کر واپس آ گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جس خلائی جہاز کے اندر وہ بند تھے، وہ خاص طور پر اس ڈھنگ سے بنایا گیا تھا کہ وہ باہر کی شدت کو اندر نہ پہنچنے دے۔ چنانچہ سخت ترین گرمی کے باوجود اس کے اندر کا درجہ حرارت ۲۱ ڈگری سنٹی گریڈ سے آگے نہیں بڑھا۔ باہر کا درجۂ حرارت تین ہزار تین سو اور اندر کا درجۂ حرارت صرف ۲۱۔

خلائی سفر کا یہ واقعہ اپنے اندر بڑا سبق رکھتا ہے۔ انسانی زندگی میں بھی بار بار ایسے سخت مرحلے آتے ہیں جب بیرونی ماحول انتہائی طور پر آپ کے خلاف ہو جاتا ہے۔ اس وقت حالات کی شدت سے بچنے کی صرف ایک سبیل ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ آپ اپنے اندرونی جذبات کو دبائیں اور اپنے احساسات پر قابو رکھتے ہوئے اس کو معتدل حالت پر قائم رکھیں۔ اگر ایسا ہو کہ آپ کے "اندر" بھی شدت کا وہی حال ہو جائے جو آپ کے "باہر" کا ہے تو آپ اپنے کو تباہ کر لیں گے۔ اس کے برعکس اگر اندر کی شدت باہر سے غیر متاثر رہ کر اعتدال کی حالت پر قائم رہے تو آپ باہر کی "آگ" سے محفوظ رہیں گے اور بالآخر سلامتی کے ساتھ کامیابی کی منزل پر پہنچ جائیں گے۔

زندگی کا راز یہ ہے کہ آپ کے باہر اگر آپ کے خلاف نفرت اور بغض پایا جاتا ہو تو آپ اس نفرت اور بغض کو اندر داخل نہ کریں۔ بلکہ اپنے کو قابو میں رکھ کر اپنے اندر محبت اور درگزر کے جذبات کی پرورش کریں۔ باہر کی دنیا آپ کے ساتھ برائی کا معاملہ کرے تو آپ بھلائی کی صورت میں اس کا جواب دیں۔ یہی طریقہ زندگی اور کامیابی کا طریقہ ہے۔ اگر آپ بھی ویسے ہی ہو گئے جیسا ماحول تھا تو یقیناً آپ مقابلہ کی اس دنیا میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

معمولی تدبیر سے

ایک ڈاکٹر نے مطب شروع کیا اور تھوڑے ہی دنوں میں کامیاب ہوگیا۔ انھوں نے یہ
صوصیت دکھائی کہ وہ ہر آنے والے مریض کو سلام میں پہل کرتے۔ عام طور پر ڈاکٹر لوگ اس کے
ظر رہتے ہیں کہ مریض ان کو سلام کرے۔ یہاں ڈاکٹر نے خود مریض کو سلام کرنا شروع کردیا۔ یہ طریقہ
میاب رہا اور جلد ہی ان کا مطب خوب چلنے لگا۔ حالانکہ وہ باقاعدہ سند یافتہ نہیں تھے صرف
ار۔ ایم۔ پی" تھے۔

ایک دکان دار نے دیکھا کہ گاہک کے پاس اگر کئی نوٹ ہیں تو عام طور پر وہ میلے اور پھٹے
ے نوٹ دکان دار کو دیتا ہے اور اچھے اور صاف نوٹوں کو بچا کر جیب میں رکھتا ہے۔ اس سے
ان دار نے سمجھا کہ گاہک صاف نوٹ کو پسند کرتا ہے۔ اس نے گاہک کی اس نفسیات کو استعمال
نے کا فیصلہ کیا۔ اس نے یہ اصول بنایا کہ جب کوئی گاہک اس سے سامان خریدے گا اور قیمت
اکرنے کے لئے بڑا نوٹ دے گا تو وہ حساب کرتے وقت ہمیشہ گاہک کو نئے اور صاف نوٹ
ائے گا۔

دکان دار کے بکس میں ہر طرح کے نوٹ ہوتے۔ مگر جب وہ گاہک کو دینے کے لئے
ا بکس کھولتا تو پرانے اور پھٹے ہوئے نوٹوں کو الگ کرتا جاتا اور نئے نوٹ چھانٹ کر گاہک کو دیتا۔
ے نوٹ حاصل کرنے کے لئے اس نے یہ کیا کہ اپنے تمام پرانے نوٹ جمع کر کے اپنے بینک کو دے
یا اور اس کے بدلے بینک سے چھوٹے نئے نوٹ حاصل کرلیتا۔ وہ نئے نوٹوں کو اپنے بکس کے پرانے
وں میں ملا دیتا تاکہ گاہک کے سامنے دونوں قسم کے نوٹ ہوں اور وہ دیکھے کہ اس کا دکان دار بکس
ے خراب نوٹوں کو الگ کرتا جارہا ہے اور صاف نوٹوں کو چھانٹ چھانٹ کر اسے دے رہا ہے۔

دکان دار کی یہ تدبیر بظاہر معمولی اور بے قیمت تھی۔ مگر اس نے گاہکوں کو بے حد متاثر کیا۔ وہ
سمجھے کہ ان کا دکان دار ان کا بہت خیال کرتا ہے۔ دھیرے دھیرے اس نے اس معمولی تدبیر سے گاہکوں کے
ا جیت لئے۔ اس کی دکان اتنی کامیاب ہوگئی کہ ہر وقت اس کے یہاں بھیڑ لگی رہتی۔

کامیابی کا راز یہ ہے کہ آپ اپنے اندر کوئی امتیازی خصوصیت پیدا کریں، آپ یہ ثابت کریں
، آپ لوگوں کے ہمدرد ہیں۔ یہ کام کسی معمولی تدبیر سے بھی ہوسکتا ہے، حتی کہ محض چند الفاظ بولنے یا
رانے نوٹ کے بدلے نیا نوٹ دینے سے بھی۔

کامیابی کا سادہ اصول

ایک صاحب نے تالے کی مارکٹ میں دکان کھولی۔ وہ روزانہ دیکھتے تھے کہ بے شمار آدمی سڑک پر آرہے ہیں اور جا رہے ہیں۔ مگر ان کی اکثریت ان کی دکان کو دیکھتی ہوئی گزر جاتی تھی۔ ایک روز ان کے ساتھ ایک واقعہ گزرا جس نے ان کو دکان داری کا راز بتا دیا۔ وہ کپڑا خریدنے کے لئے کپڑے کی مارکٹ میں گئے۔ وہاں مسلسل بہت سی دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ وہ ایک کے بعد ایک دکان سے گزر رہے تھے مگر ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس دکان میں داخل ہوں۔ اتنے میں ایک دکان دار نے ان کو اپنی دکان کے سامنے دیکھ کر کہا : "آیئے جناب اندر آکر دیکھئے" یہ سن کر وہ دکان کے اندر داخل ہو گئے۔

اپنے اس تجربہ سے ان کی سمجھ میں آیا کہ مارکٹ میں جو گاہک آتے ہیں ان کی اکثریت یا تو نئی ہوتی ہے یا کسی خاص دکان سے بندھی ہوئی نہیں ہوتی۔ ایسے لوگ دکانوں کی لائن سے گزرتے ہیں تو ایک قسم کے تذبذب کا شکار رہتے ہیں۔ وہ فیصلہ نہیں کر پاتے کہ کس دکان میں داخل ہوں۔ ایسے وقت میں ایک شخص ہمدردانہ انداز میں اگر ان سے کہے کہ اندر تشریف لائیے تو گویا اس نے ان کے تذبذب کو ختم کیا۔ اس نے ان کو فیصلہ کرنے میں مدد دی۔ ایسا آدمی بیشتر حالات میں چلنے والے آدمی کو اپنی دکان کے اندر بلانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ بیشتر لوگوں کے ذہن میں پہلے سے کوئی طے شدہ چیز موجود نہیں ہوتی۔ اگر آپ اس راز کو جان لیں تو معمولی دانش مندی سے بہت سے لوگوں کو اپنا ہم نوا بنا سکتے ہیں۔

اس اصول کو انھوں نے اپنی دکان میں استعمال کرنا شروع کیا۔ وہ اپنی دکان کے بیرونی حصہ میں بیٹھ جاتے اور ہر آنے جانے والے کے چہرے کو پڑھتے۔ یہاں تک کہ ان کی نظر اتنی پکی ہوگئی کہ وہ کسی آدمی کو دیکھ کر فوراً پہچان لیتے کہ یہ تالے کا گاہک ہے یا کسی اور مقصد سے سڑک پر چل رہا ہے۔ جس کے متعلق وہ اندازہ کرتے کہ وہ تالے کی لائن کی چیز خریدنا چاہتا ہے، اس کو فوراً اپنی آواز سے متوجہ کرتے اور اس کو اپنی دکان کے اندر بلاتے۔ اس طرح ان کی دکان داری اچانک کافی بڑھ گئی۔ یہاں تک کہ وہ بازار میں سب سے زیادہ فروخت کرنے والے دکان دار بن گئے۔

ترقی کا راز ہمیشہ سادہ اصولوں میں ہوتا ہے۔ مگر انسان اکثر ترقی کو ایسی چیز سمجھ لیتا ہے جو کسی بہت بڑی چیز کے ذریعہ حاصل ہوتی ہو۔ آپ چند میٹھے بول سے، اپنے ہاتھ پاؤں کی محنت سے، اپنے محدود وسائل کو استعمال کرنے سے اور ایک کام کو مسلسل پکڑے رہنے سے کامیابی کے اعلیٰ مقامات تک پہنچ سکتے ہیں۔ حالانکہ ان میں سے کوئی چیز نہیں جو بہت بڑی ہو اور ایک عام آدمی اس کو حاصل نہ کر سکتا ہو۔

ایک تجارتی راز

محلہ میں کئی مسلم ہوٹل ہیں۔ میں دس سال سے ان کو دیکھ رہا ہوں۔ مگر ان میں صرف ایک ہوٹل ایسا ہے جو اس مدت میں مسلسل ترقی کرتا رہا ہے۔ باقی تمام ہوٹل جہاں دس سال پہلے تھے وہیں آج بھی پڑے ہوئے ہیں۔ ترقی کرنے والے ہوٹل کے مالک سے میں نے ایک روز پوچھا کہ آپ کی ترقی کا راز کیا ہے۔ "بالکل سادہ" انھوں نے جواب دیا "جو چیز دوسرے ہوٹل والے کیلو میں خریدتے ہیں اس کو ہم بوروں میں خریدتے ہیں۔ ہر خریداری کے وقت ہم پورے بازار کو دیکھتے ہیں اور جو چیز جہاں کفایت سے ملتی ہے اس کو وہاں سے لیتے ہیں۔ زیادہ مقدار اور نقد خریداری کی وجہ سے چیز ہم کو اور بھی سستی پڑجاتی ہے" اس کے بعد انھوں نے ہنس کر کہا "گاہک سے نہیں کمایا جاتا، بازار سے کمایا جاتا ہے"

عام طور پر دوکان داروں کا یہ حال ہے کہ جو گاہک سامنے آجائے بس اس کی جیب سے زیادہ سے زیادہ پیسے نکال لینے کو دکان داری سمجھتے ہیں۔ یہ دکان داری نہیں لوٹ ہے اور جس دکان دار کے بارے میں مشہور ہو جائے کہ وہ "لوٹتا ہے" اس کے یہاں کون خریداری کے لئے جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کے دکان دار زیادہ ترقی نہیں کر پاتے۔ دکان داری کا زیادہ اعلیٰ طریقہ یہ ہے کہ مال کی خریداری کے وقت آپ کوشش کریں کہ آپ کو کم قیمت میں مال ملے تاکہ عام نرخ سے گاہک کو دینے کے بعد بھی آپ کو زیادہ فائدہ حاصل ہو۔

یہ اصول ہر قسم کے کاروبار کے لئے صحیح ہے۔ ہر کاروبار میں ایسا ہوتا ہے کہ دکان دار اپنے گاہک کے ہاتھ جو چیز بیچتا ہے اس کو وہ خود کہیں سے خرید کر لاتا ہے۔ یہ خریداری خواہ ایک مرحلہ میں ہو یا کئی مرحلوں میں، اس کی ہمیشہ کئی صورتیں ہیں۔ اکثر دکان دار مشقت اور دوڑ بھاگ سے بچنے کے لئے کسی آسان یا قریبی ذریعہ سے اپنی ضرورت کا سامان حاصل کر لیتے ہیں۔ لیکن اگر دوڑ بھاگ کی جائے اور محنت سے کام لیا جائے تو وہی چیز نسبتاً کم قیمت میں حاصل کی جاسکتی ہے جس کو دوسرا شخص محنت سے بچنے کی خاطر زیادہ قیمت میں حاصل کر رہا ہے۔

عام دکان دار ہمیشہ اپنی محنت کی کمی کو گاہک کی جیب سے زیادہ وصول کر کے پورا کرنا چاہتے ہیں۔ مگر اس قسم کی تجارت کبھی آدمی کو بڑی ترقی تک نہیں پہنچاتی۔ بہترین تجارتی گر یہ ہے کہ گاہک کو ممکن حد تک مناسب نرخ پر چیزیں فراہم کی جائیں اور گاہک کے ہاتھ تک پہنچنے سے پہلے کا جو مرحلہ ہے اس میں زیادہ سے زیادہ کمانے کی کوشش کی جائے۔ زیادہ کمائی بازار سے کی جائے نہ کہ گاہک سے (۱۷ اگست ۱۹۸۰)

آسانی ہمیشہ مشکلوں کے بعد آتی ہے

گرمیوں کے موسم میں گرد و غبار سے بھری ہوئی آندھی جب اٹھتی ہے تو بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مصیبت کے سوا اور کچھ نہیں۔ مگر روس کے ماہرین موسمیات نے قراقرم کے ریگستانوں میں تحقیقات کے بعد بتایا ہے کہ گرد بھری ہوئی آندھیاں زمین پر موسم کی سختی کو کنٹرول کرنے کا ایک قدرتی ذریعہ ہیں۔ جب آندھیاں چلتی ہیں تو ان کی وجہ سے گرد اٹھ کر اوپر چھا جاتی ہے اور فضا میں ایک غلاف کی صورت بنا لیتی ہے۔ اس طرح یہ آندھیاں زمین کی سطح کو گرمی کی تپش سے محفوظ رکھتی ہیں۔ روسی سائنس دانوں نے مختلف آلات اور جہازوں کا استعمال کرکے آندھیوں کی خصوصیات کا مطالعہ کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ سخت گرمی کے دنوں میں بھی ریگستان کی تپتی ہوئی سطح اس وقت ٹھنڈی ہو جاتی ہے جب گرد سے بھری ہوئی آندھیاں چلنا شروع ہوتی ہیں۔ گرد کے یہ سایہ دار بادل محدود فضا میں بھی چھا سکتے ہیں اور کافی دور تک بھی، جیسے عرب سے جنوبی امریکا تک اور وسط ایشیا سے بحر آرکٹک تک۔

قدرت کا نظام کچھ اس طرح بنا ہے کہ ہر مفید واقعہ کسی پُرمشقت عمل کے بعد ظہور میں آتا ہے۔ یہ ایک سبق ہے جو بتاتا ہے کہ ہم جب اپنی زندگی کے بارے میں کوئی منصوبہ بنائیں تو اس حقیقت کو بھی ضرور سامنے رکھیں کہ مطلوبہ نتیجہ کو حاصل کرنے کے لئے ہم کو جدوجہد کے پُرمشقت دور سے گزرنا ہوگا۔ موجودہ دنیا کو اس کے بنانے والے نے اسی ڈھنگ پر بنایا ہے۔ اور اس سے مطابقت کرکے ہی ہم کوئی مفید نتیجہ برآمد کر سکتے ہیں۔ اگر ہم یہ چاہیں کہ ہم کو "آندھی" کی تکلیف نہ اٹھانی پڑے اور اس کے بغیر ہی ہمارے سروں پر ٹھنڈا بادل سایہ کرے تو ایسے نتیجہ کو پانے کے لئے ہمیں دوسری کائنات بنانی پڑے گی۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اکثر حالات میں ناکامی کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ آدمی فوراً کامیابی چاہتا ہے۔ "مختصر راستہ" کا لفظ سڑکوں اور پگڈنڈیوں کی دنیا کے لئے صحیح ہے مگر زندگی کی جدوجہد میں "مختصر راستہ" کی قسم کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔ سورت میں ہیرے کی ایک دکان ہے جو دوسری منزل پر ہے۔ ایک نوجوان اس دکان میں داخل ہوا۔ اس نے ایک ہیرا چرا لیا اور اس کو لے کر باہر نکل جانا چاہا۔ مگر دکان کے آدمیوں کو شبہ ہو گیا۔ انھوں نے فوراً سیڑھی کا دروازہ بند کر دیا اور نوجوان سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔ نوجوان نے دیکھا کہ سیڑھی کے راستہ سے بھاگنا اس کے لئے ممکن نہیں ہے۔ وہ تیزی سے قریب کی کھڑکی میں داخل ہوا اور وہاں سے نیچے کی طرف چھلانگ لگا دی۔ بظاہر اس نے بھاگ نکلنے کے لئے چھلانگ لگائی تھی۔ مگر دوسری منزل سے جب وہ سڑک پر گرا تو اس کو اتنی سخت چوٹ آئی کہ وہ وہیں سڑک پر مر گیا (ٹائمس آف انڈیا ۲۱ جنوری ۱۹۸۰) ـــــ "سیڑھی" کا راستہ اگر کسی کو بند نظر آئے تو وہ "کھڑکی" سے چھلانگ لگا کر سڑک پر نہیں پہنچ سکتا۔ ایسی چھلانگ اس کو جہاں پہنچائے گی وہ قبر ہے نہ کہ سڑک ـــــ بظاہر یہ ایک احمق نوجوان کا قصہ معلوم ہوتا ہے۔ مگر بہت سے عقل مند لوگ بھی ٹھیک اسی طریقہ کو اپنی زندگی میں دہراتے ہیں اور بالآخر اسی انجام سے دوچار ہوتے ہیں جس سے مذکورہ نوجوان دوچار ہوا۔

ایک وراثت یہ بھی ہے

کریم بخش سیدھے سادے دین دار آدمی تھے۔ گاؤں کی معمولی آمدنی پر گزر کر لیتے۔ ۶۵ سال کی عمر میں وہ چار بچے چھوڑ کر مرے تو ان کے لئے انھوں نے کوئی قابل ذکر جائداد نہیں چھوڑی تھی۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے بڑے صاحب زادے رحیم بخش شہر چلے آئے تاکہ اپنے لئے کمائی کی کوئی صورت کر سکیں۔ شہر میں انھوں نے مختصر سرمایہ کے ساتھ ایک کاروبار شروع کر دیا۔

رحیم بخش کے والد نے ان کے لئے کوئی مادی وراثت نہیں چھوڑی تھی۔ مگر قناعت اور سادگی اور کسی سے لڑے بھڑے بغیر اپنا کام کرنے کی وراثت چھوڑی تھی۔ یہ وراثت رحیم بخش کے لئے بے حد مفید ثابت ہوئی۔ ان کی سادگی اور قناعت کا نتیجہ یہ ہوا کہ معمولی آمدنی کے باوجود وہ مسلسل ترقی کرنے لگے۔ ان کا لڑائی بھڑائی سے بچنے کا مزاج ان کے لئے مزید معاون ثابت ہوا۔ ہر ایک ان سے خوش تھا۔ ہر ایک سے ان کو تعاون مل رہا تھا۔ ان کی ترقی کی رفتار اگرچہ سست تھی مگر وہ ایک دن رکے بغیر جاری رہی۔

رحیم بخش کا کاروبار اگرچہ معمولی تھا مگر ان کی شرافت، ان کی بے غرضی اور ان کی ایمان داری نے ان کو اپنے ماحول میں اتنی عزت دے رکھی تھی جیسے کہ وہ کوئی بڑی حیثیت کے آدمی ہوں۔ ان کے پاس سرمایہ بہت کم تھا مگر لین دین میں صفائی اور وعدہ کا پکا ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ بازار میں بڑے بڑے تھوک بیوپاری ان سے کہتے کہ "میاں جی، جتنا چاہے مال لے جاؤ۔ پیسہ کی پروانہ کرو۔ پیسے بعد کو آجائیں گے"۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ کسی سے جھگڑے کی نوبت آگئی۔ مگر انھوں نے خود ہی اپنے کو چپ کر لیا۔ وہ شریر آدمی کے خلاف کوئی جوابی کارروائی نہ کرتے بلکہ خاموشی سے اپنے کاروبار میں لگ جاتے اور اس کے حق میں دعا کرتے رہتے۔ جب بھی ان کے دل میں شیطان کوئی بدمعاملگی کا جذبہ ڈالتا تو ان کے والد کا معصوم چہرہ ان کے سامنے آکر کھڑا ہو جاتا۔ ان کو ایسا محسوس ہوتا کہ اگر میں نے کوئی غلط معاملہ کیا یا کسی سے جھگڑا فساد کیا تو میرے باپ کی روح قبر میں تڑپ اٹھے گی۔ یہ خیال فوراً ان کے جذبات کو دبا دیتا۔ وہ دوبارہ اسی تعمیری راستہ پر چل پڑتے جس میں انھیں ان کے باپ نے چھوڑا تھا۔

ان کا کاروبار بڑھا تو ان کو مزید معاون کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اب انھوں نے اپنے بھائیوں کو بلانا شروع کیا۔ یہاں تک کہ چاروں بھائی شہر میں منتقل ہو گئے۔ دھیرے دھیرے ان کے کاروبار کے چار مستقل شعبے ہو گئے۔ ہر شعبہ ایک ایک بھائی کے سپرد تھا۔ چاروں بھائی ایک ساتھ مل کر رہتے اور ساتھ کھاتے پیتے۔ مگر کاروباری اعتبار سے ہر بھائی اپنے اپنے شعبہ کو آزادانہ طور پر انجام دیتا تھا۔

کچھ دنوں کے بعد رحیم بخش کو محسوس ہوا کہ بڑے بھائی ہونے کی حیثیت سے چونکہ وہی کاروبار کے مالک ہیں اس لئے بقیہ بھائی اپنے کام کو اس دل چسپی سے نہیں کرتے جیسا کہ کوئی آدمی اس وقت کرتا ہے جب کہ وہ کام کو اپنا ذاتی کام سمجھتا ہو۔ اب رحیم بخش کے لئے دو صورتوں میں سے کسی ایک کو انتخاب کرنے کا سوال تھا۔ یا تو کاروبار کو اپنے قبضہ میں لے کر بقیہ تینوں بھائیوں کو اس سے الگ کردیں اور اس کے نتیجہ میں ہمیشہ کے لئے بھائیوں کی دشمنی خریدیں۔ دوسرے یہ کہ معاملات کو اسی طرح چلنے دیں۔ یہاں تک کہ بالآخر وہی ہو جو عام طور پر مشترک کاروبار میں ہوتا ہے۔ یعنی باہمی شکایت اور اس کے بعد تلخ یادوں کے ساتھ کاروبار کی تقسیم۔

رحیم بخش نے چند دن سوچا اور اس کے بعد سب بھائیوں کو جمع کرکے ساری بات صاف صاف ان کے سامنے رکھ دی۔ انھوں نے کہا کہ خدا کے فضل سے ابھی کوئی بات بگڑی نہیں ہے۔ بہترین بات یہ ہے کہ چاروں بھائی ایک ایک کاروبار کو لے لیں اور ہر ایک ذاتی طور پر اپنا کاروبار چلائے۔ اس طرح ہمارے والد کی روح کو سکون پہنچے گا اور مجھے یقین ہے کہ اس میں ہر ایک کے لئے زیادہ برکت ہوگی۔ تینوں بھائیوں نے کہا کہ ہم تو سراپا آپ کے احسان مند ہیں۔ اس لئے آپ جو بھی فیصلہ کردیں وہ ہم کو منظور ہے۔ مختصر گفتگو کے بعد یہ طے ہوا کہ قرعہ اندازی کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ چنانچہ اسی وقت قرعہ کے ذریعہ ہر بھائی کو ایک ایک کاروبار دے دیا گیا۔

اب چاروں بھائی اپنے اپنے کاروبار میں لگے ہوئے ہیں۔ ہر ایک اپنے بچوں کو لے کر اپنے اپنے کام میں صبح سے شام تک محنت کرتا ہے۔ چاروں کے درمیان پہلے سے بھی زیادہ اچھے تعلقات ہیں۔ ہر ایک دوسرے کی مدد کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہے۔ چاروں نے الگ الگ اپنے مکانات بنالئے ہیں۔ مگر رحیم بخش اب بھی اسی طرح سب کے "بڑے بھائی" ہیں جیسے وہ پہلے بڑے بھائی تھے۔ ایک بھائی جو بات کہہ دے اس کو دوسرا بھائی کبھی نہیں ٹالتا۔ ایک گھر میں کوئی ضرورت پیش آجائے تو چاروں گھروں کی عورتیں اور بچے مل کر اس کو اس طرح کرتے ہیں جیسے وہ ہر ایک کا اپنا کام ہو۔

اکثر باپ یہ سمجھتے ہیں کہ اپنی اولاد کے لئے سب سے بڑی وراثت یہ ہے کہ وہ ان کے لئے مال اور جائداد چھوڑ کر اس دنیا سے جائیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ سب سے زیادہ خوش نصیب اولاد وہ ہے جس کے باپ نے اس کے لئے با اصول زندگی کی وراثت چھوڑی ہو۔ وہ اپنی اولاد کو یہ سبق دے کر دنیا سے گیا ہو کہ اپنی محنت پر بھروسہ کرو، لوگوں سے الجھے بغیر اپنا کام کرو۔ اپنے واجبی حق پر قناعت کرو۔ حال کے فائدوں سے زیادہ مستقبل کے امکانات پر نظر رکھو۔ خوش خیالیوں میں گم ہونے کے بجائے حقیقت پسندی کا طریقہ اختیار کرو —— مادی وراثت سے زیادہ بڑی چیز اخلاقی وراثت ہے۔ مگر بہت کم باپ ہیں جو اس حقیقت کو جانتے ہوں۔

اتنی عقل جانور کو بھی ہوتی ہے

قرآن میں آدم کے دو بیٹوں کا ایک واقعہ بیان ہوا ہے۔ ایک بھائی نے غصہ میں آکر دوسرے بھائی کو قتل کر دیا۔ یہ کسی انسان کے قتل کا پہلا واقعہ تھا۔ قاتل کی سمجھ میں نہ آیا کہ اپنے بھائی کی لاش کو کیا کرے۔ اس وقت اللہ نے ایک کوا بھیجا۔ اس نے مرے ہوئے کوے کو اس کے سامنے "دفن" کیا۔ اس نے اپنی چونچ اور پنجے سے زمین کھودی اور مردہ کوے کو اس کے اندر رکھ کر اوپر سے مٹی ڈال دی۔ یہ دیکھ کر قاتل بولا: افسوس ہے مجھ پر۔ میں اس کوے جیسا بھی نہ ہو سکا کہ اپنے بھائی کی لاش کو زمین میں چھپانے کی تدبیر کرتا (مائدہ) یہ نسل انسانی کے ابتدائی زمانہ کا واقعہ ہے۔ اس وقت سے اب تک برابر خدا یہ کر رہا ہے کہ وہ حیوانات میں سے کسی حیوان کو "بھیج کر" ہم کو ہماری زندگی کے بارہ میں سبق دیتا ہے۔ مگر انسان مشکل ہی سے ایسا کرتا ہے کہ وہ اس قسم کے واقعات سے اپنے لئے سبق لے۔ یہاں ایک پرندے کا واقعہ نقل کیا جاتا ہے جس میں ہمارے آج کے لئے بہت بڑا سبق ہے۔

ابابیل نے چھت کی لکڑی میں گھونسلا بنایا۔ گھونسلا مٹی کا تھا۔ نر اور مادہ دونوں تھوڑی تھوڑی گیلی مٹی اپنی چونچ میں لاتیں اور اس سے گھونسلے کی تعمیر کرتیں۔ لگاتار محنت کے بعد چند دن میں گھونسلا تیار ہو گیا۔ اب ابابیل نے اس کے اندر انڈا دے دیا۔ ایک روز ابابیل کا جوڑا گھونسلے پر بیٹھا ہوا تھا، چار انڈے اور دو ابابیلوں کا بوجھ گھونسلے کے لئے ناقابل برداشت ثابت ہوا اور وہ لکڑی سے چھوٹ کر نیچے گر پڑا۔ انڈے ٹوٹ کر برباد ہو گئے۔

اس کے بعد دیکھنے والوں نے دیکھا کہ دونوں ابابیلیں پوری چھت میں چاروں طرف اڑ رہی ہیں۔ وہ چھت کی لکڑیوں میں اپنے اگلے گھونسلے کے لئے زیادہ محفوظ جگہ تلاش کر رہی تھیں۔ بالآخر انھوں نے اپنے لئے ایک ایسی جگہ پالی جو غیر ہموار ہونے کی وجہ سے گھونسلے کو زیادہ سنبھال سکتی تھی۔

پہلی بار ابابیلوں نے خالی مٹی کا گھونسلا بنایا تھا۔ اب دوسری بار انھوں نے جو مٹی لانی شروع کی اس میں گھاس ملی ہوئی تھی۔ پہلے تجربہ کے بعد انھوں نے صاف گارے کو ناکافی پایا تو انھوں نے گھاس ملے ہوئے گارے سے گھونسلا بنانا شروع کیا۔ گویا پہلے اگر خالی مٹی تھی تو اب آہن بستہ (Reinforced) مٹی گھونسلے کے لئے منتخب کی گئی۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ دوسرا گھونسلا زیادہ مضبوط اور جما ہوا تھا۔ وہ اپنی جگہ پر قائم ہو گیا اور اس میں جو انڈے دئے گئے وہ محفوظ رہے یہاں تک کہ ان میں بچے نکل آئے۔ بچے اپنی ماں کے ساتھ اڑ کر فضا میں غائب ہو گئے۔ یہ واقعہ خورشید احمد بسمل صاحب (پیدائش ۱۹۴۷) کے اپنے مکان کا ہے جو تھنہ منڈی (راجوری) کے رہنے والے ہیں۔ انھوں نے ۱۹ ستمبر ۱۹۷۹ کو اپنا مذکورہ کمرہ دکھایا اور مجھ سے یہ واقعہ بیان کیا ——— جانور کی کوشش اگر پہلی بار ناکام ہو جائے تو دوسری کوشش سے پہلے وہ یہ معلوم کرتا ہے کہ اس کے عمل میں کون سی کمی تھی جس نے اس کے منصوبہ کو ناکام بنا دیا۔ اور پھر زیادہ کامل منصوبہ کے تحت دوسری تعمیر کرتا ہے۔ مگر ہمارا "آشیانہ" گرتا رہتا ہے اور کبھی ہم کو احساس نہیں ہوتا کہ اپنی کمی کو معلوم کر کے زیادہ مستحکم تعمیر کا منصوبہ بنائیں

جھگڑے سے بچ کر

دو کسانوں کے کھیت ملے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان ایک مینڈ کا جھگڑا ہو گیا۔ ہر ایک کہتا تھا کہ مینڈ میری ہے۔ دونوں کھیت کی مینڈ پر لڑ گئے۔ یہ جھگڑا پہلے "مینڈ" کا تھا پھر وہ "ساکھ" کا مسئلہ بن گیا۔ ہر ایک کو دکھائی دینے لگا کہ مینڈ سے ہٹنا لوگوں کی نظر میں اپنے آپ کو بے عزت کرنا ہے۔ چنانچہ جھگڑا بڑھتا رہا۔ وہ یہاں تک بڑھا کہ دونوں طرف قتل ہوئے، کھیت کاٹے گئے۔ دونوں نے ایک دوسرے کی چیزیں جلائیں۔ اس کے بعد معاملہ اور بڑھا۔ وہ پولس اور عدالت کا معاملہ بن گیا۔ مقدمہ بازی کا لمبا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ مقدمات ۲۰ سال بعد صرف اس وقت ختم ہوئے جب کہ ان کے کھیت، باغ، زیورات سب بک گئے۔ ایک معمولی مینڈ کو پانے کے لئے دونوں نے اپنا سب کچھ کھو دیا۔

یہی مینڈ کا جھگڑا ایک اور کسان کے ساتھ پیدا ہوا۔ مگر اس نے فوری اشتعال کے تحت کارروائی کرنے کے بجائے اس پر غور کیا۔ سمجھ دار لوگوں سے مشورے کئے۔ آخر کار اس کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ مینڈ کا جھگڑا مینڈ پر طے نہیں ہوتا۔ جھگڑے کو طے کرنے کی جگہ دوسری ہے۔ یہ سوچ کر اس نے جھگڑے کی مینڈ چھوڑ دی۔

اس نے یہ کیا کہ مسئلہ پر "آج" سے سوچنے کے بجائے "پیچھے" سے سوچنا شروع کیا۔ مینڈ کے واقعہ سے اس کے دل کو بھی چوٹ لگی۔ اس کو بھی اپنے نقصان اور اپنی بے عزتی سے وہی تکلیف ہوئی جو ہر انسان کو ایسے وقت پر ہوتی ہے۔ مگر اس نے اپنے جذبات کو تھاما۔ فوری جوش کے تحت کارروائی کرنے کے بجائے سوچ سمجھ کر اقدام کرنے کا فیصلہ کیا۔

میرے حریف کو میری مینڈ پر قبضہ کرنے کی جرأت ہی کیوں ہوئی، اس سوال پر غور کرتے کرتے وہ اس رائے پر پہنچا کہ اس کی وجہ حریف کے مقابلہ میں میری کمزوری ہے۔ میرا اور حریف کا اصل معاملہ مینڈ کا معاملہ نہیں ہے۔ بلکہ اصل معاملہ یہ ہے کہ میری پوزیشن میرے حریف کے مقابلہ میں اتنی زیادہ نہیں کہ وہ مجھ سے دبے اور میرے حقوق پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ کرے۔ ٹھنڈے ذہن سے سوچنے کے بعد اس کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ اگر وہ اپنی طاقت اور حیثیت کو بڑھالے تو وہ زیادہ بہتر طور پر اپنے حریف کے مقابلہ میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس کے بعد اس کے حریف کو اس کے اوپر دست اندازی کی جرأت ہی نہ ہوگی۔

اب اس نے اپنے کھیتوں پر پہلے سے زیادہ محنت شروع کر دی۔ جو طاقت وہ حریف کو برباد

کرنے کی کوششوں میں لگاتا اسی طاقت کو اس نے خود اپنی تعمیر میں لگانا شروع کر دیا۔ اس نئی فکر نے اس کے اندر نیا حوصلہ جگا دیا۔ وہ نہ صرف اپنے کھیتوں میں زیادہ محنت کرنے لگا بلکہ کھیتی کے ساتھ کچھ اور قریبی کاروبار بھی شروع کر دیا۔ اس کے نئے شعور کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے اپنی زندگی کو ازسرنو منظم کیا۔ وہ خرچ کو کم کرنے اور آمدنی کو بڑھانے کے اصول پر سختی سے عمل کرنے لگا۔ اسی کے ساتھ اپنے بچوں کو تعلیم کی راہ پر لگا دیا۔ اس نے طے کر لیا کہ اپنے ہر بچہ کو اعلیٰ مرحلہ تک تعلیم دلائے گا۔

اس دوسرے شخص کو بھی اپنی کوششوں میں اسی طرح ۲۰ سال لگ گئے جس طرح پہلے شخص کو ۲۰ سال لگے تھے۔ مگر پہلے شخص کے لئے ۲۰ سال بربادی کے ہم معنی تھا، جب کہ دوسرے شخص کے لئے ۲۰ سال آبادی کے ہم معنی بن گیا۔ اس ۲۰ سال میں اس کے بچے پڑھ لکھ کر اچھے عہدوں پر پہنچ چکے تھے۔ اس نے اپنی کھیتی اتنی بڑھا لی تھی کہ اس کے یہاں ہل بیل کے بجائے ٹریکٹر چلنے لگا تھا۔ جس کسان سے اس کا مینڈ کا جھگڑا ہوا تھا اس کا وہ پورا کھیت اس نے مینڈ سمیت خرید لیا۔

جس آدمی نے مینڈ کا جھگڑا مینڈ پر طے کرنے کی کوشش کی وہ تباہ ہو گیا۔ اس کے برعکس جس نے مینڈ کو چھوڑ کر دوسرے میدان میں مقابلہ کی کوشش کی وہ آخر کار نہ صرف مینڈ کا مالک بنا بلکہ حریف کا پورا کھیت اس کے قبضہ میں آ گیا۔

بجلی کا بلب جلتے جلتے بجھ جائے یا پنکھا چلتے چلتے رک جائے تو ہم بلب کو توڑ کر نہیں دیکھتے یا پنکھے سے نہیں الجھتے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ بلب بجھنے اور پنکھا بند ہونے کی وجہ بلب اور پنکھے کے اندر نہیں ان کے باہر ہے۔ اور پھر جہاں سے فرق پڑا ہو وہاں درست کر کے اپنے بلب اور پنکھے کو دوبارہ چلا لیتے ہیں۔ انسانی معاملات بھی اکثر اسی قسم کے ہوتے ہیں۔ مگر عجیب بات ہے کہ بلب اور پنکھے کے معاملہ میں جو بات آدمی کبھی نہیں بھولتا اسی بات کو انسانی معاملہ میں ہمیشہ بھول جاتا ہے۔

آدمی کی یہ عام کمزوری ہے کہ جب بھی اس کی زندگی میں کوئی مسئلہ پیدا ہوتا ہے تو وہ اسی مقام پر بنا سر ٹکرانے لگتا ہے جہاں مسئلہ پیدا ہوا ہے۔ حالانکہ اکثر حالات میں یہ ہوتا ہے کہ مسئلہ کہیں پیدا ہوتا ہے اور اس کی وجہ کہیں ہوتی ہے۔ "حال" کا ایک واقعہ اکثر "ماضی" کے کسی واقعہ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ایک معاملہ میں کسی کی زیادتی اکثر حالات میں کسی اور معاملہ میں پائی جانے والی ایک صورت حال کے سبب سے وقوع میں آتی ہے۔ ایسی حالت میں بہترین عقل مندی یہ ہے کہ آدمی جائے وقوع پر سر نہ ٹکرائے۔ بلکہ اصل سبب کو معلوم کر کے بات کو وہاں بنانے کی کوشش کرے جہاں بات بگڑ جانے کی وجہ سے اس کے ساتھ وہ حادثہ پیش آیا ہے جس میں وہ آج اپنے کو مبتلا پاتا ہے۔

بربادی کے بعد بھی

ایک انگریز عالم مسٹر آئن نیش (Ian Nish) جاپان گئے۔ انھوں نے وہاں گیارہ سال رہ کر جاپانی زبان سیکھی اور گہرائی کے ساتھ جاپانی قوم کا مطالعہ کیا۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے مطالعہ اور تحقیق کے نتائج ۲۴۸ صفحات کی ایک کتاب میں شائع کیا ہے جس کا نام ہے جاپان کی کہانی (The Story of Japan) مصنف لکھتے ہیں :

جاپانی قوم کی زندگی کو جس چیز نے سب سے زیادہ گہرائی کے ساتھ متاثر کیا وہ سیاست نہیں تھی بلکہ کانٹو کا عظیم زلزلہ تھا۔ یکم ستمبر ۱۹۲۳ کو زلزلہ کے زبردست جھٹکوں نے مشرقی جاپان کو تہس نہس کر دیا جو کہ جاپان کا سب سے زیادہ آباد علاقہ تھا۔ دوسرا انسانی ساخت کا زلزلہ ۱۹۴۵ میں جاپان کی شکست تھی۔ جب کہ دو ایٹم بموں نے جاپان کے دو انتہائی بڑے شہروں کو ملبہ کا ڈھیر بنا دیا ——— "زلزلہ" سے اگر تعمیر نو کا ذہن پیدا ہو تو زلزلہ ایک نئی ترقی کا زینہ بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس زلزلہ اگر صرف محرومی اور جھنجلاہٹ کا احساس پیدا کرے تو اس کے بطن سے سیاسی چیخ پکار وجود میں آتا ہے جو نتیجہ کے اعتبار سے اتنا بے معنی ہے کہ اس سے زیادہ بے معنی کوئی چیز نہیں۔

کسی انسان کی زندگی میں سب سے زیادہ اہم چیز عمل کا جذبہ ہے۔ آدمی کے اندر عمل کا جذبہ پیدا ہو جائے تو اس کے اندر کی تمام سوئی ہوئی قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں۔ وہ زیادہ بہتر طور پر سوچتا ہے۔ زیادہ کامیاب منصوبہ بناتا ہے اور زیادہ محنت کے ساتھ اپنے کام کی تکمیل میں لگ جاتا ہے۔ اس کے برعکس جس آدمی کے اندر عمل کا جذبہ نہ ابھرے وہ اس طرح سست پڑا رہتا ہے جیسے کوئی مشین غیر متحرک حالت میں خاموش پڑی ہوئی ہو۔ اور تجربہ بتاتا ہے کہ اطمینان اور آسودگی کے حالات عام طور پر آدمی کی قوتوں کو سلاتے ہیں، وہ اس کے اندر بیداری پیدا نہیں کرتے۔ اس کے برعکس جب آدمی کی زندگی مشکلوں اور رکاوٹوں سے دوچار ہو تو اس کے اندر چھپی ہوئی قوتوں کو جھٹکا لگتا ہے۔ اس کی صلاحیتیں اسی طرح جاگ اٹھتی ہیں جیسے کوئی آدمی بے خبر سو رہا ہو اور اس کے اوپر ایک پتھر گر پڑے۔

تاہم یہ فائدہ کسی کو اپنے آپ نہیں مل جاتا۔ ہر معاملہ میں ایک ابتدائی حصہ آدمی کو خود ادا کرنا پڑتا ہے۔ جب بھی آدمی کی زندگی میں کوئی "بربادی" کا واقعہ پیش آئے تو وہ اس کو دو امکانات کے درمیان کھڑا کر دیتا ہے۔ وہ یا تو اس سے یہ سبق لے کہ اس کو از سر نو متحرک ہو کر اپنی نئی تعمیر کرنی ہے۔ یا اس سے مایوسی اور شکایت کی غذا لے کر سرد آہیں بھرتا رہے۔ ابتدائی مرحلہ میں آدمی دونوں میں سے جس رجحان کو اپناتا ہے اسی رخ پر اس کی پوری زندگی چل پڑتی ہے۔ اسی کے مطابق اس کی اندرونی صلاحیتیں اپنا عمل کرنے لگتی ہیں۔ جب بھی آدمی کی زندگی میں کوئی حادثہ پیش آئے تو اس کو حادثہ کو دیکھنے کے بجائے اپنے آپ کو دیکھنا چاہئے۔ مستقبل کے کسی بھی نتیجہ کا سارا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ آدمی حالات کے مقابلہ میں کس قسم کے ردعمل کا اظہار کرتا ہے۔ تعمیر نو کا جذبہ پیدا ہو تو یہ مثبت ردعمل ہے جو لازماً کامیابی تک پہنچاتا ہے اور اگر احتجاج اور شکایت کا ذہن ابھرے تو یہ منفی ردعمل ہے جس کا آخری انجام مزید بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔

ناموافق حالات ترقی کا زینہ بن گئے

ایک "ملاجی" دہلی کی ایک مسجد میں امام تھے۔ امامت کے علاوہ ان کی ذمہ داری یہ بھی تھی کہ وہ روزانہ قرآن درس دیں۔ ان تمام خدمات کا معاوضہ تھا۔ ماہانہ ۲۵ روپے تنخواہ، مسجد میں ایک حجرہ اور دو وقت کا کھانا۔ جوان ملاجی اس مختصر معاوضہ پر قانع ہونے کے لئے تیار تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ مسجد میرے لئے کم از کم ایک ٹھکانا تو ہے۔ یہاں رہ کر میں اپنے بچہ کی تعلیم پوری کرا لوں گا۔ میں نہیں تو میرا بچہ مستقبل میں بہتر معاشی زندگی حاصل کرے گا۔

مگر مسجد کے لوگوں کا سلوک ان کے ساتھ اچھا نہ تھا۔ ہر نمازی ان کو اپنا ملازم سمجھتا۔ ذرا ذرا سی بات میں آدمی ان کے اوپر برس پڑتا اور ان کو ذلیل کرتا۔ کوئی فرش کے لئے، کوئی جھاڑو کے لئے، کوئی لوٹے کے لئے، کوئی کسی اور چیز کے لئے ان کو بگڑتا رہتا۔ وہ معاشی تنگی برداشت کر سکتے تھے۔ مگر ذلت ان کے لئے برداشت سے باہر تھی۔ بالآخر انھوں نے ایک نیا فیصلہ کیا۔ انھوں نے طے کیا کہ مجھے اپنی زندگی کو مستقل طور پر مسجد سے وابستہ نہیں رکھنا ہے بلکہ اپنے لئے کوئی دوسرا کام پیدا کرنا ہے۔ تاہم فوری طور پر مسجد چھوڑنا بھی برا تھا۔ کیونکہ مسجد کی امامت چھوڑنے کے بعد مسجد کا حجرہ ان سے چھن جاتا۔ اور شہر میں دوسری جگہ حاصل کرنا ان کے لئے ممکن نہ تھا۔

انھوں نے مسجد کی امامت کرتے ہوئے شہر کے طبیہ کالج میں داخلہ لے لیا اور خاموشی کے ساتھ طب کی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ طبی تعلیم کی تکمیل میں ان کو پانچ سال لگ گئے۔ اس دوران میں وہ مسجد کے لوگوں کے برے سلوک کو پہلے سے بھی زیادہ خوش اسلوبی کے ساتھ برداشت کرتے رہے۔ نئے فیصلہ میں کامیاب ہونے کے لئے ضروری تھا کہ وہ صبر کریں۔ ذلت کی زندگی سے نکلنے ہی کی خاطر ذلت کی زندگی کو چند سال اور برداشت کریں۔

بالآخر وہ وقت آیا کہ انھوں نے طبی کالج سے ڈاکٹری کی سند حاصل کر لی۔ اب انھوں نے مسجد والوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے امامت سے استعفا دے دیا اور شہر کے ایک محلہ میں ایک جگہ کرایہ پر لے کر اپنا مطب کھول لیا۔ ان کی زندگی کے تلخ تجربات اور مستقبل کی خاطر ان کی طویل جدوجہد نے ان کو بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ انھوں نے نہایت محنت اور ہوشیاری کے ساتھ اپنا مطب چلایا۔ صرف چھ ماہ بعد ان کی آمدنی اتنی ہو گئی کہ ایک مکان لے کر وہ بچوں کے ساتھ بفراغت رہنے لگے۔ ایک سال کے بعد انھیں مقامی طبی کالج میں لکچرر کی جگہ بھی مل گئی۔ اس طرح ان کی معاشی زندگی میں مزید استحکام پیدا ہو گیا۔ کل کے ملاجی اب ڈاکٹر صاحب بن کر زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کو عزت بھی حاصل ہے اور معاشی فارغ البالی بھی۔

زندگی کے ناموافق حالات زندگی کے نئے زینے ہوتے ہیں جن کو استعمال کر کے آدمی آگے بڑھ سکتا ہے ۔ شرطیکہ وہ ناموافق حالات سے نفرت اور شکایت کا سبق نہ لے۔ بلکہ مثبت ذہن کے تحت اپنے لئے نیا مستقبل بنانے میں لگ جائے۔

موقع صرف ایک بار

کالج کے ایک پرانے استاد کے ایک جملہ نے مجھے بہت متاثر کیا ——— "زندگی صرف ایک بار ملتی ہے" انھوں نے کہا۔ وہ اپنی زندگی پر تبصرہ کر رہے تھے "میں بی ایس سی کر کے ملازمت میں لگ گیا تھا۔ ایم ایس سی نہیں کیا۔ اب کتنے اچھے اچھے چانس میرے سامنے آتے ہیں۔ مگر میں ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ صرف اس لئے کہ میرے پاس ماسٹر ڈگری نہیں۔ اگر آپ کے پاس اعلیٰ لیاقت نہیں ہے تو آپ اعلیٰ مواقع سے فائدہ اٹھانے سے بھی محروم رہیں گے"

یہ تبصرہ ہمارے سماج کے تقریباً ۹۹ فی صد لوگوں پر صادق آتا ہے۔ ابتدائی عمر انسان کے لئے تیاری کی عمر ہے۔ مگر بیشتر افراد اس عمر کو پوری طرح استعمال میں نہیں لاتے۔ وہ اپنے بہترین وقت کو سستے مشاغل میں ضائع کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں اور کام کرنے کا وقت آجاتا ہے۔ اب وہ مجبور ہوتے ہیں کہ کمتر تیاری کے ساتھ عملی زندگی کے میدان میں داخل ہو جائیں۔ وہ چاہنے کے باوجود زیادہ ترقی نہیں کر پاتے۔ ان کو ساری عمر اس طرح گزارنی ہوتی ہے کہ اس دنیا میں ان کی صلاحیتوں کے لئے جو آخری امکان مقدر تھا، اس سے بہت کم امکان تک وہ پہنچ پاتے ہیں۔ وہ محرومی اور ناکامی کے احساس کے تحت زندگی گزارتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ اسی حال میں مر جاتے ہیں۔

اگر آپ کمتر تیاری کے ساتھ زندگی کے میدان میں داخل ہوئے ہیں تو اس دنیا میں آپ اپنا بھرپور حصہ نہیں پا سکتے، اور جو ایک بار محروم رہا وہ گویا ہمیشہ کے لئے محروم رہا۔ کیونکہ ——— زندگی صرف ایک بار ملتی ہے، بار بار نہیں ملتی۔

پتھر ہر ایک کے لئے سخت ہے۔ مگر پتھر اس شخص کے لئے نرم ہو جاتا ہے جس نے اس کو توڑنے کا اوزار فراہم کر لیا ہو۔ یہی صورت ہر معاملہ میں پیش آتی ہے۔ اگر آپ لیاقت اور اہلیت کے ساتھ زندگی کے میدان میں داخل ہوں تو ہر جگہ آپ اپنا حق وصول کر کے رہیں گے۔ اور اگر لیاقت اور اہلیت کے بغیر آپ نے زندگی کے میدان میں قدم رکھا ہے تو آپ کے لئے اس دنیا میں اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اپنی مفروضہ حق تلفی کے خلاف زیادہ احتجاج کرتے رہیں۔

ماحول سے امید نہ رکھئے بلکہ اپنی محنت اور لیاقت پر بھروسہ کیجئے، آپ کو کبھی ماحول سے شکایت نہ ہوگی۔ ماحول کی شکایت دراصل ماحول سے زیادہ خود اپنی نالائقی کا اظہار ہے۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے وہ مطلوبہ تیاری نہیں کی تھی جو ماحول سے اپنا حق وصول کرنے کے لئے ضروری ہے۔

اس کو اسکول سے خارج کر دیا گیا تھا

ٹ آئن سٹائن (۱۹۵۵—۱۸۷۹) نے ۲۰ ویں صدی کی سائنس میں عظیم انقلاب برپا کیا۔ مگر اس کی
نہایت معمولی تھا۔ تین سال کی عمر تک وہ بولنا شروع نہ کر سکا۔ بظاہر وہ ایک معمولی باپ کا معمولی بچہ تھا۔
ں وہ بالکل عام بچہ دکھائی دیتا تھا۔ اسکول کی تعلیم کے زمانہ میں ایک بار وہ اسکول سے خارج کر دیا گیا۔
ے استادوں کا خیال تھا کہ اپنی تعلیمی نا اہلی کی وجہ سے وہ دوسرے طالب علموں پر برا اثر ڈالتا ہے۔ زیورک
میں اس کو پہلی بار داخلہ نہ مل سکا کیوں کہ آزمائشی امتحان میں اس کے نمبر بہت کم تھے۔ چنانچہ اس نے مزید تیاری
ں داخلہ لیا۔ اس کے ایک استاد نے اس کے بارے میں کہا:

Albert was a lazy dog.

ت کرتا تھا۔ ۲۰ سال کی عمر تک البرٹ آئن سٹائن میں کوئی غیر معمولی آثار نظر نہ آتے تھے۔ مگر اس کے بعد اس
اکی تو وہ اس بلندی تک پہنچا جو موجودہ زمانہ میں بمشکل کسی دوسرے سائنس داں کو حاصل ہوئی۔ اسی بنا پر
وانح نگار نے لکھا ہے:

We could take heart that it is not necessary
to be a good student to become Einstein.

ہئے کہ آئن سٹائن بننے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ آدمی طالب علمی کے زمانہ میں ممتاز رہا ہو۔ آئن سٹائن
بنسی کتاب اس وقت شائع کی جب کہ اس کی عمر ۲۶ سال تھی۔ اس کے بعد سے اس کی شہرت بڑھتی ہی چلی گئی۔
زندگی بالکل سادہ تھی۔ وہ نہایت سادہ غذا کھاتا تھا۔ وہ اکثر آدھی رات تک اپنے کام میں مشغول رہتا تھا۔
ں صدارت پیش کی گئی تھی مگر اس نے انکار کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ سیاست انسانیت کا کینسر ہے۔ ۱۹۳۳
لہ کے جرمنی کو چھوڑ دیا تھا۔ ہٹلر کی حکومت نے اعلان کیا کہ جو شخص آئن سٹائن کا سر کاٹ کر لائے گا اس کو
نعام دیا جائے گا۔ اس زمانہ میں یہ رقم بہت زیادہ تھی۔ مگر آئن سٹائن کی عظمت لوگوں کے دلوں پر اتنی قائم
اس انعام کو حاصل کرنے کی جرأت نہ کر سکا (۷ اکتوبر ۱۹۷۹)

یں اس طرح کی بہت مثالیں ہیں جو بتاتی ہیں کہ بڑا انسان بننے کے لئے بڑا بچہ پیدا ہونا ضروری نہیں۔ معمولی
کر کے آدمی بڑی بڑی کامیابیاں حاصل کر سکتا ہے، بشرطیکہ وہ جدوجہد کی شرطوں کو پورا کرے۔ بلکہ وہ لوگ
ت ہیں جن کو مشکل مواقع میں زندگی کا ثبوت دینا پڑے۔ کیونکہ مشکل حالات عمل کا محرک ہوتے ہیں۔ وہ آدمی
صلاحیتوں کو بیدار کرتے ہیں۔ نیز زندگی کے بہترین سبق ہمیشہ مشکل حالات میں ملتے ہیں۔ اعلیٰ انسان
ں بلکہ مشکلوں میں تیار ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کی اس دنیا میں امکانات کی کوئی حد نہیں۔ یہاں کسی کو
معمولی آغاز ملے تو اس کو مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ معمولی حالات زندگی کا سب سے مضبوط زینہ ہیں۔ تاریخ
ں کامیابیاں معمولی حالات کے اندر ہی سے برآمد ہوئی ہیں۔

۲۵ پیسے سے

شام کا وقت تھا۔ بارہ سال کا بچہ اپنے گھر میں داخل ہوا، اس کو بھوک لگ رہی تھی۔ وہ اس امید میں تیز تیز چل کر آرہا تھا کہ گھر پہنچ کر کھانا کھاؤں گا اور پیٹ کی آگ بجھاؤں گا۔ مگر جب اس نے اپنی ماں سے کھانا مانگا تو جواب ملا "اس وقت گھر میں کھانے کے لئے کچھ نہیں ہے"۔ بچہ کا باپ ایک غریب آدمی تھا وہ محنت کر کے معمولی کمائی کرتا تھا۔ روزانہ کمانا اور روزانہ دکان سے سامان لا کر پیٹ بھرنا یہ اس کی زندگی تھی تاہم ایسا بھی ہوتا کہ کسی دن کوئی کمائی نہ ہوتی اور باپ خالی ہاتھ گھر واپس آتا۔ یہ ان کے لئے فاقہ کا دن ہوتا تھا۔ اس خاندان کی معاشیات کا خلاصہ ایک لفظ میں یہ تھا: "کام مل گیا تو روزی، کام نہیں ملا تو روزہ"

ماں کا جواب سن کر بچہ کو بڑا صدمہ ہوا "مجھے بھوک لگ رہی ہے اور میرے گھر میں کھانے کو کچھ نہیں،، وہ چپ ہو کر دیر تک سوچتا رہا۔ اس کے بعد بولا "کیا تمھارے پاس ۲۵ پیسے بھی نہیں ہیں" ماں نے بتایا کہ ۲۵ پیسے اس کے پاس موجود ہیں "اچھا تو لاؤ ۲۵ پیسے مجھے دو" بچہ نے کہا۔ اس نے اپنی ماں سے ۲۵ پیسے لئے۔ اس کے بعد ایک بالٹی میں پانی بھرا۔ دو گلاس لئے۔ ۲۵ پیسے کا برف لے کر بالٹی میں ڈالا اور سیدھا سینما ہاؤس پہنچا۔ یہ گرمی کا زمانہ تھا جب کہ ہر آدمی پانی پینے کے لئے بے تاب رہتا ہے۔ وہاں اس نے آواز لگا کر "ٹھنڈا پانی"، بیچنا شروع کیا۔ اس کا پانی تیزی سے بکنے لگا۔ کئی لوگوں نے بچہ سمجھ کر زیادہ پیسے دئے۔ آخر میں جب وہ خالی بالٹی میں گلاس ڈال کر واپس گھر پہنچا تو اس کے پاس پندرہ روپے ہو چکے تھے۔

اب بچہ روزانہ ایسا ہی کرنے لگا۔ دن کو وہ اسکول میں محنت سے پڑھتا اور شام کو پانی یا اور کوئی چیز بیچ کر کمائی کرتا۔ اسی طرح وہ دس سال تک کرتا رہا، ایک طرف وہ گھر کا ضروری کام چلاتا رہا دوسری طرف اپنی تعلیم کو مکمل کرتا رہا۔ آج یہ حال ہے کہ اس لڑکے نے تعلیم پوری کر کے ملازمت کر لی ہے - اس کو تنخواہ سے ساڑھے سات سو روپے مہینہ مل جاتے ہیں۔ اسی کے ساتھ "شام کا کاروبار" بھی وہ بدستور جاری رکھے ہوئے ہے۔ اپنے چھوٹے سے خاندان کے ساتھ اس کی زندگی بڑی عافیت سے گزر رہی ہے۔ اس کی محنت کی کمائی میں اللہ نے اتنی برکت دی کہ اپنا آبائی ٹوٹا پھوٹا مکان اس نے ازسرنو بنوالیا۔ سارے محلہ والے اس کی عزت کرتے ہیں ماں باپ کی دعائیں ہر وقت اس کو مل رہی ہیں۔

مشکل حالات آدمی کے لئے ترقی کا زینہ بن سکتے ہیں، بشرطیکہ مشکل حالات آدمی کو پست ہمت نہ کریں بلکہ اس کے اندر نیا عزم پیدا کرنے کا ذریعہ بن جائیں۔ زندگی میں اصل اہمیت ہمیشہ صحیح آغاز کی ہوتی ہے۔ اگر آدمی اتنے پیچھے سے اپنا سفر شروع کرنے پر راضی ہو جائے جہاں سے ہر قدم اٹھانا آگے بڑھنا ہو تو کوئی بھی چیز اس کو کامیابی تک پہنچنے سے روک نہیں سکتی۔ "۲۵ پیسہ"، سے سفر شروع کیجئے۔ کیوں کہ "۲۵ پیسے" سے سفر شروع کرنا ہر ایک کے لئے ممکن ہے۔ اور جو سفر "۲۵ پیسے" سے شروع کیا جائے وہ ہمیشہ کامیاب رہتا ہے۔

استاد کے بغیر

ایک خاتون نے انگریزی پڑھی۔ ان کے والد مولوی تھے۔ ان کے گھر پر انگریزی کا ماحول نہ تھا۔ چنانچہ ایم۔ اے (انگلش) انھوں نے مشکل تھرڈ نمبروں سے پاس کیا۔ ان کو شوق تھا کہ ان کو انگریزی لکھنا آجائے۔ یہ کام ایک اچھے استاد کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن ان کے گھر کے حالات اس کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ وہ کوئی استاد رکھیں اور اس کی مدد سے اپنے اندر انگریزی لکھنے کی صلاحیت پیدا کریں۔

مگر جہاں تمام راستے بند ہوتے ہیں وہاں بھی ایک راستہ آدمی کے لئے کھلا ہوتا ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ آدمی کے اندر طلب ہو اور وہ اپنے مقصد کے حصول میں اپنی پوری طاقت لگا دے۔ خاتون نے استاد کے مسئلہ کا ایک نہایت کامیاب حل تلاش کر لیا۔ انھوں نے لندن کی چھپی ہوئی ایک کتاب پڑھی۔ اس میں انگریز مصنف نے بیرونی ملکوں کے انگریزی طالب علموں کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ انگریزی لکھنے کی مشق اس طرح کریں کہ کسی اہل زبان کی لکھی ہوئی کوئی کتاب لے لیں۔ اس کے بعد روزانہ اس سے چند صفحات لے کر پہلے اس کا اپنی زبان میں ترجمہ کریں پھر کتاب بند کر کے الگ رکھ دیں۔ اور اپنے ترجمہ کو بطور خود انگریزی میں منتقل کریں۔ جب ایسا کر لیں تو اس کے بعد دوبارہ کتاب کھولیں اور اس کی چھپی ہوئی عبارت سے اپنے انگریزی ترجمہ کا مقابلہ کریں۔ جہاں نظر آئے کہ انھوں نے کوئی غلطی کی ہے یا طریق اظہار میں کوتاہی ہوئی ہے اس کو اچھی طرح ذہن کی گرفت میں لائیں اور کتاب کی روشنی میں خود ہی اپنے مضمون کی اصلاح کریں۔

خاتون نے اس بات کو پکڑ لیا۔ اب وہ روزانہ اس پر عمل کرنے لگیں۔ انگریزی اخبار یا رسالہ یا کسی کتاب سے انگریزی کا کوئی مضمون لے کر وہ روزانہ اس کو اردو میں ترجمہ کرتیں اور پھر اپنے اردو ترجمہ کو دوبارہ انگریزی میں منتقل کرتیں اور پھر اپنے انگریزی ترجمہ کو اصل انگریزی عبارت سے ملا کر دیکھتیں کہ کہاں کہاں فرق ہے۔ کہاں کہاں ان سے کوئی کمی ہوئی ہے۔ اس طرح وہ روزانہ تقریباً دو سال تک کرتی رہیں۔ اس کے بعد ان کی انگریزی اتنی اچھی ہو گئی کہ وہ انگریزی میں مضامین لکھنے لگیں۔ ان کے مضامین انگریزی جرائد میں چھپنے لگے۔ ان کے بھائی نے اکسپورٹ کا ایک کام شروع کیا جس میں انگریزی خط و کتابت کی کافی ضرورت پڑتی تھی۔ خاتون نے انگریزی خط و کتابت کا پورا کام سنبھال لیا اور اس کو کامیابی کے ساتھ انجام دیا ——— مذکورہ خاتون نے جو تجربہ انگریزی زبان میں کیا وہی تجربہ دوسری زبانوں میں بھی کیا جا سکتا ہے۔

ہماری دنیا کی ایک عجیب خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کسی کامیابی تک پہنچنے کے بہت سے ممکن طریقے ہوتے ہیں۔ کچھ دروازے اگر آدمی کے اوپر بند ہو جائیں تب بھی کچھ دوسرے دروازے کھلے ہوتے ہیں جن میں داخل ہو کر وہ اپنی منزل تک پہنچ سکتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ موجودہ دنیا میں کسی شخص کی ناکامی کا سبب ہمیشہ پست ہمتی ہوتا ہے نہ کہ اس کے لئے مواقع کا نہ ہونا۔

بہتر منصوبہ بندی سے

ایڈمرل ایس۔ این کوہلی (ہندوستانی بحریہ کے سابق چیف) نے نئی دہلی کی ایک تقریر میں کہا کہ کامیابی تمام تر ایک ذہنی چیز ہے۔ اگر آپ کے اندر ارادہ ہے تو آپ اپنے مقصد کی تکمیل کے راستے پالیں گے۔ اور اگر ارادہ نہیں ہے تو آپ یہ کہہ کر بیٹھ جائیں گے کہ "یہ نہیں ہو سکتا" انھوں نے مثال دیتے ہوئے کہا کہ ہند۔ پاک جنگ (دسمبر ۱۹۷۱) میں ہندوستانی بحریہ کے پاس جو جنگی جہاز تھے وہ بنیادی طور پر دفاعی کارکردگی (Defensive Role) کے لئے بنائے گئے تھے۔ مگر انھیں جہازوں کو ہم نے اقدامی کارروائی کے لئے استعمال کیا۔ ہم نے کراچی بندرگاہ پر حملہ کیا اور اس میں اتنی شاندار کامیابی حاصل کی کہ فریق ثانی حیران ہو کر رہ گیا۔ اس کامیابی کی وجہ یہ نہ تھی کہ ہم بہتر سازوسامان سے آراستہ تھے۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ دستیاب سازوسامان کو ہوشیاری کے ساتھ استعمال کیا گیا:

only that the available equipment was intelligently used

ایڈمرل کوہلی نے جو اصول بتایا وہی اصول فرد کے لئے بھی ہے اور وہی قوم کے لئے بھی۔ کامیابی کا راز ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کے اندر اپنے مقصد کے حصول کا پختہ ارادہ ہو اور اس کے بعد وہ یہ کرے کہ اس کے پاس جو وسائل موجود ہیں ان کو پوری احتیاط اور ہوشیاری کے ساتھ اپنے مقصد کو بروئے کار لانے میں لگا دے۔

انسان کی ناکامی کا راز بیشتر حالات میں یہ نہیں ہوتا کہ اس کے پاس وسائل نہ تھے۔ بلکہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے ممکن وسائل کو صحیح طور پر استعمال نہ کر سکا۔ دیہات میں ایک صاحب نے پختہ گھر بنانے کا ارادہ کیا۔ ان کے وسائل محدود تھے۔ مگر انھوں نے اپنے تعمیری منصوبہ میں اس کا لحاظ نہیں کیا۔ انھوں نے پورے مکان کی نہایت گہری بنیاد کھدوائی، اتنی گہری جیسے کہ وہ قلعہ تیار کرنے جا رہے ہوں۔ ایک شخص نے دیکھ کر کہا: مجھے امید نہیں کہ ان کا گھر مکمل ہو سکے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ان کی بیشتر اینٹ اور مسالا بنیادوں میں کھپ گیا اور اوپر کی تعمیر کے لئے ان کے پاس بہت کم سامان رہ گیا۔ بمشکل دیواریں کھڑی ہو سکیں اور ان پر چھت نہ ڈالی جا سکی۔ صرف ایک کمرہ پر کسی طرح چھت ڈال کر انھوں نے اپنے رہنے کا انتظام کیا۔ غیر ضروری طور پر گہری بنیادوں میں اگر وہ اینٹ اور مسالہ ضائع نہ کرتے تو ان کے پاس اتنا سامان تھا کہ مکان پوری طرح مکمل ہو جاتا۔ مگر غلط منصوبہ بندی کی وجہ سے ان کا مکان زمین کے اندر تو پورا بن گیا۔ مگر زمین کے اوپر صرف ادھورا ڈھانچہ کھڑا ہو کر رہ گیا۔

بے کچھ سے سب کچھ تک

جو شخص کم فائدہ پر قناعت کرے گا وہ بڑے فائدہ کا مالک بنے گا ———— یہ ایک ایسا بے خطا اصول ہے جو اپنے اندر ابدی اہمیت رکھتا ہے۔ آپ جس معاملہ میں بھی اس کو آزمائیں گے یقینی طور پر آپ کامیاب رہیں گے۔

ایک شخص نے بازار میں چھوٹی سی دکان کھولی۔ وہ کپڑا دھونے کا صابن اور کچھ اور چیزیں بیچتا تھا۔ اس کی دکان پر بہت جلد بھیڑ لگنے لگی۔ دن کے کسی وقت بھی اس کی دکان گاہکوں سے خالی نہ رہتی۔ اس کا راز یہ تھا کہ وہ دو روپے کا صابن پونے دو روپے میں بیچتا تھا۔ آدمی اگر چار صابن خریدے تو عام نرخ کے لحاظ سے اس کا ایک روپیہ بچ جاتا تھا۔ ایک آدمی نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ پونے دو روپیہ اس صابن کی تھوک قیمت ہے۔ دکان دار کو وہ صابن کارخانہ سے پونے دو روپے میں ملتا تھا اور اسی دام پر وہ اس کو گاہکوں کے ہاتھ فروخت کر دیتا تھا۔

اس آدمی نے دکان دار سے پوچھا کہ تم دام کے دام صابن بیچتے ہو۔ پھر تم کو اس میں کیا فائدہ ملتا ہے۔ دکان دار نے کہا کہ میری دکان پر اتنا صابن بکتا ہے کہ اس کی ۲۵ پیٹیاں دن بھر میں خالی ہو جاتی ہیں۔ میں ان خالی پیٹیوں کو ایک روپیہ فی پیٹی کے حساب سے ۲۵ روپیہ میں بیچ دیتا ہوں، اس طرح ہر روز مجھے ۲۵ روپے بچ جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ جب آدمی میرے یہاں سے صابن لیتا ہے تو اکثر وہ کچھ نہ کچھ دوسری چیزیں بھی خرید لیتا ہے، یہ فائدہ اس کے علاوہ ہے۔

یہ دکان دار دھیرے دھیرے ترقی کرتا رہا۔ اس کا نفع پہلے ۲۵ روپے روز تھا۔ پھر ۵۰ روپے روز ہوا۔ پھر وہ سو روپے اور دو سو روپے روز تک پہنچا۔ آدمی نے پیسہ بچا کر اپنے بغل کی دکان بھی حاصل کر لی اور دونوں کو ملا کر ایک کافی بڑی دکان بنائی۔ اب اس کا کاروبار اور بڑھا۔ یہاں تک کہ دس سال میں وہ شہر کا ایک بڑا دکان دار بن گیا۔

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ موجودہ دنیا میں کامیابی حاصل کرنے کے امکانات کس قدر زیادہ ہیں۔ حتیٰ کہ یہاں یہ بھی ممکن ہے کہ آدمی آج "بے نفع" کی تجارت شروع کرے اور کل وہ زبردست نفع والا تاجر بن جائے۔ آج وہ اپنے آپ کو "بے کچھ" پر راضی کرے اور کل وہی وہ شخص ہو جو "سب کچھ" کا مالک بنا ہوا ہو۔ مگر دنیا کے ان بے حساب امکانات کو اپنے حق میں واقعہ بنانے کی لازمی شرط صبر اور عقل مندی ہے۔ جس کے پاس صرف بے صبری اور نادانی کا سرمایہ ہو اس کے لئے دنیا کے بازار میں کچھ نہیں۔

تم غریب نہیں، دولت مند ہو

"بابا پیسہ دے"، فقیر نے آواز لگائی۔ سننے والے نے دیکھا تو وہ ہاتھ پاؤں کا درست معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے کہا: تم کو پیسہ کیوں دیا جائے۔ فقیر بولا کہ میں غریب ہوں۔ آدمی نے کہا: نہیں تم غریب نہیں ہو۔ تم بہت دولت مند ہو۔ فقیر نے کہا: بابو جی مذاق نہ کیجئے۔ میرے پاس دولت کہاں۔ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں۔ میں تو بالکل غریب ہوں۔ آدمی نے کہا: اچھا تمھارے پاس جو کچھ ہے مجھے دے دو، میں اس کے بدلے تم کو پچاس ہزار روپے دیتا ہوں۔ فقیر نے اپنی جھولی کندھے سے اتاری اور کہا: میرے پاس تو یہی ہے۔ اس کو آپ لے لیجئے۔ آدمی نے کہا: نہیں تمھارے پاس اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ تمھارے پاس دو پاؤں ہیں — ایک پاؤں تم مجھ کو دے دو اور مجھ سے دس ہزار روپے لے لو۔ فقیر نے دینے سے انکار کیا۔ اب آدمی نے کہا: اچھا تمھارے پاس دو ہاتھ ہیں۔ ایک ہاتھ تم مجھ کو دے دو اور مجھ سے ۲۰ ہزار روپے لے لو۔ فقیر نے دوبارہ دینے سے انکار کیا۔ آدمی نے کہا: اچھا تمھارے پاس دو آنکھیں ہیں۔ ایک آنکھ تم مجھ کو دے دو اور مجھ سے ۲۰ ہزار روپے لے لو۔ فقیر نے اب بھی دینے سے انکار کیا۔ آدمی نے کہا: دیکھو تمھارے پاس دو پاؤں، دو ہاتھ اور دو آنکھیں ہیں۔ میں نے صرف ایک ایک کے دام لگائے تو پچاس ہزار روپے ہوگئے۔ اگر دونوں پاؤں، دونوں ہاتھ اور دونوں آنکھوں کا دام لگایا جائے تو ان کی قیمت ایک لاکھ روپے ہو جائے گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ جو تمھارے پاس جسم ہے جس میں بے شمار چیزیں ہیں اس کی صرف تین چیزوں کا دام بھی کم سے کم ایک لاکھ روپیہ ہے۔ پھر تم غریب کیسے ہو۔ تم تو بہت بڑے دولت مند ہو۔ تم بھیک مانگنا چھوڑ دو اور اپنی اس قیمتی دولت کو استعمال کرو۔ تم سے زیادہ کامیاب دنیا میں کوئی نہ ہوگا۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے بڑی عجیب صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ عام حالات میں اس کا اندازہ نہیں ہوتا۔ البتہ کوئی چیز نہ رہے تو اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیسی قیمتی تھی۔ جیمز ٹامس دہلی کا ایک مشین آپریٹر ہے۔ اس کی عمر ۲۴ سال ہے۔ بیماری کی وجہ سے اس کے دونوں گردے خراب ہوگئے۔ اس نے آل انڈیا میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ لیا۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ اس کے لئے زندگی کی صورت صرف یہ ہے کہ وہ کسی شخص سے ایک گردہ بطور عطیہ حاصل کرے، گردہ ایک خالص قدرتی پیداوار ہے۔ کسی انسانی کارخانہ میں کھرب ہا کھرب روپیہ خرچ کر کے بھی گردہ بنایا نہیں جا سکتا۔ تاہم یہ قیمتی گردہ اگر کوئی شخص بطور عطیہ دے دے تو ڈاکٹروں کی فیس اور سرجری کے اخراجات چھوڑنے کے بعد بھی جیمز ٹامس کو ۴۵ ہزار روپے درکار تھے تاکہ یہ گردہ اس کے جسم میں نصب کیا جا سکے (ٹائمس آف انڈیا ۱۰ جنوری ۱۹۸۰) حقیقت یہ ہے کہ آدمی کے پاس کچھ نہ ہو تب بھی اس کے پاس بہت کچھ ہوتا ہے۔ یہ جسم اور یہ دماغ جو ہم کو ملا ہوا ہے، یہ تمام قیمتی چیزوں سے زیادہ قیمتی ہے۔ آدمی اگر اپنے جسم و دماغ کی صلاحیتوں کو بھرپور استعمال کرے تو وہ دنیا کی ہر کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔ کوئی چیز اس کے لئے ناممکن نہیں۔ اگر آپ کے پاس ہاتھ ہے جس سے آپ پکڑیں اور پاؤں ہے جس سے آپ چلیں۔ آپ کے پاس آنکھ ہے جس سے آپ دیکھیں اور زبان ہے جس سے آپ بولیں تو گویا آپ کے پاس سب کچھ ہے۔ کیوں کہ ان کے ذریعہ سے دنیا کی تمام چیزیں حاصل کی جا سکتی ہیں۔ کوئی چیز بھی ان کے دائرہ سے باہر نہیں۔

REGD. R. N. NO. 28822/76
REGD. NO. D. (DN) 532

ISSUE NO. 66
MAY 1982

AL-RISALA MONTHLY

JAMIAT BUILDING QASIMJAN STREET DELHI-110006 (INDIA) PHONE 232231

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

Printed & Published by Saniyasnain Khan at J.K. Offset Printers Delhi-110006

الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

لوگ زندگی کے اندیشوں میں جیتے ہیں، حالانکہ
انھیں موت کے اندیشوں میں جینا چاہئے

قیمت فی پرچہ —— تین ۳ روپے

اسلامی مرکز کا ترجمان

جون ۱۹۸۲
شمارہ ۶۷

جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۱۱۰۰۰۶ (انڈیا)

نئی مطبوعات اسلامی مرکز

تذکیر القرآن جلد اول (سورہ فاتحہ تا سورہ توبہ) قیمت مجلد	۴۵ روپے
محمد دی آئیڈیل کیرکٹر Muhammad The Ideal Character	۳ "
اتحاد ملت	۳ "
راہیں بند نہیں	۳ "
سبق آموز واقعات	۳ "
دین کی سیاسی تعبیر (زیادہ تعداد منگانے پر خصوصی کمیشن)	۲ "
تعارفی سٹ : سچا راستہ	ایک "
دینی تعلیم	۳ "
حیات طیبہ (زیر طبع)	۳ "
باغ جنت	۳ "
نار جہنم	۳ "

مکتبہ الرسالہ

منی آرڈر کوپن پر اپنا پورا پتہ تحریر فرمائیں۔ ہر خط و کتابت کے ساتھ خریداری نمبر یا ایجنسی نمبر کا حوالہ ضرور دیں

مختصر روداد اجتماع بھوپال

حلقۃ الرسالہ کا پہلا کل ہند اجتماع ۷، ۸ اپریل کو بھوپال (صوفیہ مسجد) میں منعقد ہوا۔ اجتماع کا آغاز ۷ اپریل صبح ۱۰ بجے جناب مولانا پیر سعید میاں صاحب مجددی کی تقریر سے ہوا۔ اس سے پہلے جناب قاری عبدالحافظ صاحب نے قرآن کریم کی تلاوت فرمائی اور مولوی صدیق صاحب قاسمی نے جناب پیر سعید میاں صاحب کی ایک عربی نعت سنائی۔ جناب پیر سعید میاں صاحب کی تقریر کے بعد جناب مولانا محسن عثمانی صاحب ندوی نے حضرت مولانا وحیدالدین خاں صاحب کا ایک مقالہ (احیاء اسلام) پڑھ کر سنایا۔ نشست تقریباً ایک بجے ختم ہوئی۔

دوپہر سے تین بجے تک نماز ظہر، طعام اور استراحت کے لئے وقفہ رہا۔ تین بجے کے بعد دوسری نشست شروع ہوئی۔ پہلے مولانا محسن عثمانی ندوی نے حضرت مولانا وحیدالدین خاں صاحب کا دوسرا مقالہ (اصحاب رسول) پڑھ کر سنایا۔ اس کے بعد اظہار خیال کے پروگرام کا آغاز ہوا۔ جس میں ملک کے مختلف علاقوں سے تشریف لائے ہوئے اصحاب نے اظہار خیال فرمایا۔ یہ پروگرام عشاء کی نماز کے بعد تک جاری رہا۔ جناب عبداللہ مصطفیٰ صاحب (امریکہ) جناب جان محمد صاحب (انگلینڈ) جناب احمد مختیار الدین صاحب (مقیم سعودی عرب) مولانا حبیب الرحمٰن صاحب (حیدرآباد) مولانا ہاشم القاسمی صاحب (حیدرآباد) مولانا محسن عثمانی ندوی (دہلی) مولانا عبیداللہ کوٹی ندوی (فتح پور) جناب محمد اسلم جمالی (پھلواری شریف) جناب تجمل حسین صاحب (پٹنہ) ڈاکٹر نوشاد علی ندوی (لکھنؤ) معراج مبین ایم اے (کشمیر) جناب عثمان سعید (ناندیڑ) جناب کشن جیونت راؤ پٹیل (مہاراشٹر) سمیت ۲۱ اصحاب نے اظہار خیال کے پروگرام میں حصہ لیا۔ دوسرے دن بعد نماز فجر مولانا عبیداللہ صاحب کوٹی ندوی نے درس حدیث دیا۔ پھر ناشتہ کے لئے وقفہ کے بعد دس بجے صبح سے پروگرام کا آغاز ہوا ابتدا میں قاری محمد صدیق صاحب قاسمی نے قرآن کریم کی تلاوت کی۔ اس کے بعد حضرت مولانا وحیدالدین خاں صاحب نے خطاب فرمایا۔ جو کہ ایک گھنٹہ سے زیادہ تک جاری رہا۔ (یہ خطاب مکمل رپورٹ کے ساتھ آئندہ الرسالہ میں ملاحظہ فرمائیں) یہ نشست بارہ بجے ختم ہوئی۔

درمیانی وقفہ کے بعد اس دن کی تیسری اور آخری نشست دوپہر تین بجے سے شروع ہوئی۔ جس میں پہلے مولانا حمید اللہ ندوی نے وہ تجاویز پڑھ کر سنائیں جو اس اجتماع کے لئے اظہار خیال کے پروگرام کی روشنی میں ایک کمیٹی نے مرتب کی تھیں۔ اس کے بعد مولانا عبیداللہ صاحب ندوی نے کتاب الاسلام کا باب "اسلامی مرکز" پڑھ کر سنایا۔ اس کے بعد حضرت مولانا وحیدالدین خاں صاحب نے خطاب فرمایا۔ اس کے بعد جناب پیر سعید میاں صاحب نے تقریر فرمائی۔ موصوف ہی کی دعا پر اس آخری نشست کا اختتام ہوا۔ عصر کی نماز کے بعد محفل چائے کے دوران حضرت مولانا وحیدالدین خاں صاحب سے استفادہ کا سلسلہ جاری رہا جو کہ غیر متوقع طور پر ایک

علمی و دینی نشست کی شکل اختیار کر گیا۔ بعد نماز مغرب طعام سے فارغ ہو کر بیرونی مہمانوں کی واپسی شروع ہوئی جس کا سلسلہ ۱۹ر تاریخ کی شام تک چلتا رہا۔

اجتماع میں یو پی، بہار، دہلی، کشمیر، مدھیہ پردیش، مہاراشٹر اور حیدر آباد کے ممتاز اصحاب نے شرکت کی۔

پاس شدہ تجاویز

۱۔ حلقۂ الرسالہ کے فکر کو تنظیمی ڈھانچہ دینے کے لئے مرکز اسلامی کا نام تجویز کیا گیا۔

۲۔ حلقۂ الرسالہ کے داعی، مفکر اور مربی ہونے کی حیثیت سے مولانا وحید الدین خاں صاحب اسلامی مرکز کے سرپرست و صدر ہوں گے۔

۳۔ مرکز اسلامی کی ایک مرکزی کمیٹی ہوگی اور اس کے ماتحت ریاستی کمیٹیاں ہوں گی۔

۴۔ حلقۂ الرسالہ کے کارکنوں سے مشورہ کے بعد مرکز ریاست کے لئے کنوینر مقرر کرے گا اور وہ اپنی ریاستی کمیٹی تشکیل دے گا۔ یہ ریاستی کمیٹی مرکز کے مشورہ سے ریاست میں کام کا طریق کار متعین کرے گی۔

۵۔ ناظم عمومی کے لئے مولانا حمید اللہ ندوی کو مقرر کیا گیا۔

۶۔ صرف صدر کا عہدہ قابل انتخاب ہوگا باقی ذمہ داروں کو صدر نامزد کرے گا۔

۷۔ اسلامی مرکز کے مقاصد وطریق کار کے سلسلے میں ایک کتابچہ شائع کیا جائیگا جس کی ترتیب کا کام مولانا عبید اللہ صاحب ندوی کے سپرد کیا گیا۔

۸۔ ناظم عمومی سرپرست کے مشورہ سے مرکزی کمیٹی تشکیل کریں گے۔

۹۔ اسلامی مرکز کے تصور کو عملی جامہ پہنانے کے لئے مرکزی و ریاستی کمیٹیاں فنڈ کی فراہمی کی مختلف شکلیں اختیار کریں گی۔

۱۰۔ مرکزی و ریاستی کمیٹیاں اس بات کی کوشش کریں گی کہ ملک کے کسی شہر میں ایک مرکزی عمارت ہو اور اسی طرح علاقائی سطح پر عمارتیں ہوں۔

۱۱۔ مرکزی کمیٹی کی طرف سے ریاستی کمیٹیوں کو کام کے سلسلے میں ہدایات و مشورے دئے جاتے رہیں گے۔

۱۲۔ تقریباً ایک سال بعد مرکز اسلامی کا نمائندہ اجتماع کسی مناسب مقام پر منعقد کیا جائے گا۔ جگہ اور تاریخ کا تعین مرکزی کمیٹی کرے گی۔

۱۳۔ اسلامی مرکز کے مشن کو عربی زبان میں پیش کرنے کے لئے "رسالۃ الاسلام" نامی ایک مجلہ کا اجرا عمل میں لایا جائے گا۔ اس عربی مجلہ کی ادارت اور ترتیب کی ذمہ داری مولانا محمد ہاشم القاسمی (حیدر آباد) کے سپرد کی گئی۔

اسلامی مرکز

کے لئے

تعاون کی اپیل

اسلامی مرکز کا مقصد جدید تقاضوں کے مطابق اسلام کی اشاعت اور ملتِ اسلامیہ کی تعمیر ہے۔ اسلامی مرکز کے ساتھ تعاون کرنا اللہ کے راستے میں تعاون کرنا ہے۔

اسلامی مرکز پچھلے دس سال سے خاموش خدمت میں مصروف ہے۔ مگر یہ کام زیادہ تر انفرادی قربانی کے بل پر ہو رہا ہے۔ ابھی تک اس کے پاس اپنی کوئی عمارت نہیں۔ اس کے متعدد اہم شعبے وسائل کی کمی کی وجہ سے شروع نہ کئے جا سکے۔ وغیرہ

الرسالہ اور دوسرے کام جو جاری ہیں وہ تمام تر خسارے پر چلائے جا رہے ہیں۔ ان حالات میں اسلامی مرکز اپنے ہمدردوں کے تعاون کا شدید طور پر منتظر ہے۔ یاد رکھئے اسلامی مرکز کی اعانت وقت کی سب سے اہم دینی مد میں اعانت ہے۔

اس سلسلہ میں عمومی اعانت کے علاوہ زکوٰۃ وغیرہ کی رقمیں بھی بھیجی جا سکتی ہیں۔ رقم بھیجتے ہوئے اس کی مد کی ضرور صراحت فرمائیں۔

وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز
دفتر الرسالہ منتقل۔ جمعیۃ بلڈنگ
قاسم جان اسٹریٹ ۔ دہلی ۶

دونوں طرف ساحل

ایک شخص کشتی پر سوار ہو کر سمندری سفر کے لیے روانہ ہو رہا تھا۔ اس کے مغربی دوست نے اس کو رخصت کرتے ہوئے کہا کہ آج تم ایک صاف سمندر میں اپنا سفر شروع کر رہے ہو۔ مگر کبھی موسم تمہارے لئے اچھا رہے گا اور کبھی خراب۔ تمہارے راستہ میں طوفان آئیں گے اور تمہیں اس کا مقابلہ کر کے آگے بڑھنا ہوگا۔ تم کبھی بے ہمت نہ ہونا۔ محفوظ ساحل تمہارے دونوں طرف تمہارا انتظار کر رہا ہے:

Safe harbour awaits you both in the end

ان چند لفظوں میں زندگی کی بہت گہری حقیقت بیان کر دی گئی ہے۔ آدمی ایک مقصد کی طرف بڑھتا ہے۔ مقصد کو حاصل کرنے میں اسے ناکامی ہوتی ہے۔ وہ ہمت چھوڑ بیٹھتا ہے۔ ایک ناکامی کو وہ ساری ناکامی سمجھ لیتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اب میں ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ وہ بھول جاتا ہے کہ اگر وہ اپنے سابقہ مقام کی طرف لوٹ آئے تب بھی وہ ناکام نہیں۔ یہ اس کی ایک کامیاب حیثیت ہی تھی جس نے سے یہ موقع دیا کہ وہ کشتی پائے اور اس پر سوار ہو کر اس کو چلاتا ہوا آگے بڑھے۔ پھر اگر وہ اپنی اس سابقہ کامیاب حیثیت کی طرف لوٹے اور اس کو دوبارہ پالے تو اس میں ناکامی کا کیا سوال۔

دریا کے دونوں طرف ساحل ہوتے ہیں۔ اگر آدمی آگے نہ بڑھ سکے تو پیچھے لوٹ کر بھی وہ ایک ساحل کو پالے گا۔ یہی معاملہ زندگی کے سفر کا بھی ہے۔ یہاں بھی سفر کے دونوں طرف ساحل ہیں، ایک مقام وہ ہے جدھر آپ بڑھنا چاہتے ہیں۔ دوسرا مقام وہ ہے جس کو چھوڑ کر آپ آگے بڑھے تھے۔ اگر آپ اگلے مقام تک نہ پہنچ سکیں تو پیچھے لوٹ آیئے۔ کیونکہ یہاں بھی ایک مقام آپ کا انتظار کر رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آدمی ہر وقت دو امکانات کے درمیان ہوتا ہے۔ مگر اکثر لوگ یہ غلطی کرتے ہیں کہ ایک امکان کو کھو کر وہ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ دوسرا امکان بھی ان سے کھویا جا چکا ہے۔

کسی کا قول ہے "جو سورج کل صبح کو نکلا تھا وہی آنے والے دن کو دوبارہ چمکنے والا ہے" یہ ایک حقیقت ہے کہ گزرے ہوئے وقت کا ماتم کرنے سے کہیں زیادہ بہتر ہے کہ آنے والے وقت کا استعمال کیا جائے۔ مگر بہت کم لوگ ہیں جو اس حکمت کا لحاظ کرتے ہوں۔

ایک طالب علم دسواں پاس کر چکا تھا۔ اس کے بعد اس نے گیارھویں درجہ کا امتحان دیا۔ وہ اس امتحان میں فیل ہو گیا۔ اس کے بعد اس پر اتنی مایوسی چھائی کہ اس نے خودکشی کر لی۔ اس کو یاد نہ رہا کہ اگر وہ علم کی گیارھویں سیڑھی تک پہنچنے میں ناکام رہا ہے تو اس سے کیا ہوا۔ دسویں سیڑھی پر تو اب بھی اس کے پاؤں جمے ہوئے ہیں۔ اگر وہ

پیچھے لوٹ آتا تو وہ " دسویں پاس " کی حیثیت سے بھی دنیا میں اپنی جگہ بنا سکتا تھا۔ یا دوبارہ محنت کرکے گیارھویں درجہ کے امتحان میں کامیابی حاصل کرسکتا تھا۔ مگر اس کی مایوسی کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ صرف اگلا کنارہ یاد رکھ سکا۔ اس کے پیچھے بھی ایک کنارہ تھا مگر وہ اس کو بھول گیا۔ اگر وہ کچھ اور نہ کرتا، صرف اپنے پیچھے کی طرف لوٹ آتا تو وہ دیکھتا کہ ایک محفوظ ساحل اس کا انتظار کر رہا ہے۔ مگر اس نے صرف اپنے آگے دیکھا، وہ اپنے پیچھے نہ دیکھ سکا، نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے زندگی کے عین کنارے کھڑے ہوکر اپنے کو زندگی سے محروم کرلیا۔

ناکامی کے واقعات ہر آدمی کی زندگی میں پیش آتے ہیں اور یہ بالکل فطری بات ہے کہ آدمی جب ناکام ہو تو اس کے دل کو جھٹکا لگے۔ اپنی غلطیوں کا احساس کرکے اس کو سخت شرمندگی لاحق ہو۔ ناکامی کا یہ احساس اس وقت بہت مبارک ہے جب کہ وہ نئی، زیادہ صحیح جدوجہد کے لئے آدمی کو اکسائے۔ لیکن ناکامی کا احساس اگر صرف افسوس کرنے اور اپنے کو گھلانے کے ہم معنی بن جائے تو یہ ایک ناکامی کے بعد اپنے کو دوسری اور زیادہ بری ناکامی کے حوالے کرنا ہے۔ یاد رکھئے جو ناکام نہ ہو وہ ابھی زندگی میں داخل ہی نہیں ہوا۔ اور جو ناکامی سے صرف کڑھنے لے کر لوٹا اس نے زندگی کو پاکر دوبارہ زندگی کو کھو دیا۔ پامر کا یہ قول نہایت درست ہے کہ ——— " اصلاح کی تدبیر کئے بغیر نادم ہونا ایسا ہی ہے جیسے سوراخ بند کئے بغیر جہاز میں سے پانی نکالنا۔"

وقت کی اہمیت

ایک شخص فوج میں معمولی سپاہی کی حیثیت سے بھرتی ہوا۔ اس کے بعد ترقی کرتے کرتے بڑا فوجی افسر بن گیا۔ اس فوجی افسر نے ایک بار اپنی زندگی کا تجربہ بتاتے ہوئے کہا " فوج میں میری غیر معمولی ترقی کا سبب صرف میری یہ خصوصیت تھی کہ مجھ کو اگر دس بجے ڈیوٹی پر جانا ہوتا تو میں نو بجے تیار رہتا تھا۔"

بظاہر یہ ایک چھوٹی سی بات ہے مگر یہ بہت اہم بات ہے۔ یہ تمام ترقیوں کا راز ہے۔ زندگی کے معاملات میں وقت کی بے حد اہمیت ہے۔ جو شخص وقت کا جتنا زیادہ پابند ہوگا اتنا ہی زیادہ وہ ترقی کے منازل طے کرے گا۔ اکثر ناکامیوں اور مصیبتوں سے بچنے کا واحد راز یہ ہے کہ وقت کو نہ کھویا جائے۔ کسی نے بالکل سچ کہا ہے " وقت سے پہلے اسٹیشن پہنچنے کی کوشش کرو، تمھاری گاڑی کبھی نہیں چھوٹے گی "

آپ کو ایک ٹرین پکڑنی ہے جو دس بج کر ۳۰ منٹ پر چھوٹتی ہے۔ آپ کے گھر سے اسٹیشن تک کا راستہ ۲۰ منٹ کا ہے۔ اب اگر آپ یہ سوچیں کہ وقت سے پہلے جانے کی کیا ضرورت۔ اور گھر سے صرف پانچ منٹ پہلے روانہ ہوں تو عین ممکن ہے کہ راستہ میں کوئی غیر متوقع واقعہ پیش آجائے جو آپ کے سفر کو ۳۰ منٹ کے بجائے ۴۰ منٹ یا ۵۰ منٹ کا بنا دے اور نتیجہ یہ ہو کہ آپ کی گاڑی چھوٹ جائے۔ آپ

اسٹیشن اس حال میں پہنچیں کہ وہاں آپ کو یہ سننے کے لئے ملے کہ آپ کی گاڑی آپ کے آنے کے صرف چند منٹ پہلے روانہ ہوگئی۔ جو شخص وقت سے پہلے اسٹیشن پہنچنے کی کوشش کرتا ہے اس کی ٹرین کبھی نہیں چھوٹتی۔ مگر جو آدمی عین وقت پر اسٹیشن پہنچنا چاہے گا عین ممکن ہے کہ اسٹیشن پہنچ کر اس کو یہ خبر سننی پڑے کہ ٹرین روانہ ہوگئی۔

وقت کی پابندی حقیقۃً تیزروی کا نام ہے نہ کہ سادہ معنوں میں صرف پابندی کا۔ وقت پر کارکردگی کا ثبوت صرف وہ شخص دے پاتا ہے جو وقت کے بارے میں مبالغہ آمیز حد تک حساس ہو۔ جو شخص وقت سے آگے چلنے کی کوشش کرے وہی وقت کے ساتھ چل پائے گا۔ جو شخص وقت سے آگے بڑھنے کا مزاج رکھتا ہو وہی وقت کو پکڑنے میں کامیاب ہوگا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جو شخص وقت سے پہلے تیار رہنے کی کوشش کرے وہی وقت پر تیار ہو کر اپنے کام پر پہنچتا ہے۔ اس کے برعکس جو آدمی عین وقت پر اپنی تیاری شروع کرے وہ ہمیشہ وقت سے پیچھے رہے گا۔ ایسا آدمی کبھی ٹھیک وقت پر اپنے کام پر نہیں پہنچ سکتا۔

آدمی اس دنیا میں اکیلا نہیں ہے۔ اور نہ کسی آدمی کو موجودہ دنیا میں سارا اختیار حاصل ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آدمی کے راستہ میں دوسروں کی طرف سے بار بار مختلف قسم کی رکاوٹیں پیش آتی رہتی ہیں۔ بار بار ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اندازہ کچھ کرتا ہے اور ہو کچھ جاتا ہے۔ اس بنا پر وقت کے مطابق کام کرنے کی صورت صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ ہر کام کے لئے وقت سے کچھ پہلے تیاری شروع کردی جائے۔ جب آپ کوئی پروگرام بنائیں تو اس اتفاقی رکاوٹ کا لحاظ کرکے اپنا پروگرام بنائیں جو غیر متوقع طور پر پیش آکر آپ کے منصوبہ کو بگاڑ دینے والی ہے۔ اگر آپ اپنے پروگراموں میں اس حکمت کو ملحوظ رکھیں تو یقینی طور پر آپ غیر ضروری قسم کی خلل اندازیوں سے بچ سکتے ہیں۔ اور پھر آپ کے اوپر سیموئل نیلر کے یہ الفاظ صادق نہ آئیں گے کہ "مشکل ایسا عذر ہے جس کو تاریخ کبھی قبول نہیں کرتی"

آپ کو ایسے بہت سے لوگ ملیں گے جو ایک ضروری کام نہ کرسکیں گے اور اس کے بعد کہیں گے کہ کیا کریں وقت نہیں ملا۔ یہ وقت نہ ملنے کا واقعہ صرف اس لئے پیش آیا کہ انھوں نے اپنے وقت کو برباد کیا۔ وقت کی کمی ہمیشہ وقت کی بربادی کی قیمت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر برونر نے بالکل صحیح کہا ہے کہ "جو لوگ وقت کا سب سے زیادہ غلط استعمال کرتے ہیں وہی سب سے زیادہ وقت کی کمی کی شکایت کرتے ہیں"

نوٹ: یہ تقریر ۱۱-۱۲ مارچ ۱۹۸۲ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئی

باغ جنت

مولانا وحید الدین خاں

مکتبہ الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

جنت سب سے بڑا عطیہ

زمین و آسمان کی تمام چیزیں خدا کو سجدہ کر رہی ہیں۔ مگر ایک انسان جب سجدہ کرتے ہوئے اپنا سر زمین پر رکھتا ہے تو یہ تمام عالم کائنات کا سب سے زیادہ عجیب واقعہ ہوتا ہے۔ کیونکہ دوسری چیزیں مجبورانہ سجدہ کر رہی ہیں، جب کہ انسان شعور اور ارادہ کے تحت اپنا سر خدا کے آگے جھکا دیتا ہے

انسان کے ذریعہ اس کائنات میں اختیاری محکومی کا واقعہ وجود میں آتا ہے جس سے بڑا کوئی دوسرا واقعہ نہیں۔ یہی انسان کی اصل قیمت ہے۔ انسان وہ نادر مخلوق ہے جو اس کائنات میں شعورِ قدرت کے مقابلہ میں شعورِ عجز کی دوسری انتہا بناتا ہے۔ وہ کائنات کے صفحہ پر "ہے" کے مقابلہ میں "نہیں"، کا مضمون تحریر کرتا ہے۔ وہ خداوندی انا کے مقابلہ میں اپنے بے انا ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔ وہ ہر قسم کا اختیار رکھتے ہوئے اپنے آپ کو خدا کے آگے بے اختیار کر لیتا ہے۔ وہ زبان رکھتے ہوئے خدا کی خاطر اس طرح چپ ہو جاتا ہے جیسے اس کے منھ میں زبان ہی نہیں۔

ایک شخص کا موحد بننا اس آسمان کے نیچے ظاہر ہونے والے تمام واقعات میں سب سے بڑا واقعہ ہے جس کا انعام کوئی سب سے بڑی چیز ہی ہو سکتی ہے۔ اسی سب سے بڑی چیز کا نام جنت ہے۔ جنت کسی کے عمل کی قیمت نہیں، جنت کسی بندے کے لئے خدا کی یہ بخشش ہے کہ اس کے بندے نے اپنے رب کو وہ چیز پیش کر دی جو کائنات میں کسی اور نے پیش نہ کی تھی، اس لئے خدا نے بھی اس کو وہ چیز دے دی جو اس نے کسی دوسری مخلوق کو نہیں دیا تھا۔

جنتی نگاہ

خدا نے جو کچھ پیدا کیا ہے وہ اتنا حیرت ناک ہے کہ اس کو دیکھ کر آدمی خالق کی کاریگری میں کھو جائے۔ تخلیق کے کمالات میں ہر طرف خالق کا چہرہ جھلک رہا ہے۔ مگر ہمارے چاروں طرف جو دنیا ہے اس کو ہم بچپن سے دیکھتے دیکھتے عادی ہو جاتے ہیں۔ اس سے ہم اتنا مانوس ہو جاتے ہیں کہ اس کے انوکھے پن کا ہم کو احساس نہیں ہوتا۔ پانی، درخت، چڑیا، غرض جو کچھ بھی ہماری دنیا میں ہے سب کا سب بے حد عجیب ہے، ہر چیز خالق کا آئینہ ہے۔ مگر عادی ہونے کی وجہ سے ہم اس کے عجوبہ پن کو محسوس نہیں کر پاتے۔

مگر یہی انسان کا امتحان ہے۔ اس کو معمولی چیزوں میں غیر معمولی جھلک دیکھنا ہے۔ اگر آدمی اس دنیا کو استعجاب کی نظر سے دیکھ سکے تو ہر جگہ اس کو خدا کی موجودگی کا تجربہ ہوگا۔ وہ زمین پر اس طرح رہے گا جیسے کہ وہ خدا کے پڑوس میں ہو، جیسے کہ وہ خدا کی نظروں کے سامنے ہو۔

موجودہ دنیا میں انسان کی سب سے بڑی یافت یہ ہے کہ وہ خدا کو دیکھنے لگے، وہ اپنے پاس خدا کی موجودگی کو محسوس کرے۔ اگر آدمی کے اندر جنتی نظر پیدا ہو جائے تو سورج کی کرنوں میں اس کو خدا کا نور جگمگاتا ہوا دکھائی دے گا۔ ہرے بھرے درختوں کے حسین منظر میں وہ خدا کا روپ جھلکتا ہوا پائے گا۔ ہواؤں کے لطیف جھونکے میں اس کو لمس ربانی کا تجربہ ہوگا۔ اپنی ہتھیلی اور پیشانی کو زمین پر رکھتے ہوئے اس کو ایسا محسوس ہوگا گویا اس نے اپنا وجود اپنے رب کے قدموں میں ڈال دیا ہے۔ خدا ہر جگہ موجود ہے مگر اس کو وہی خوش قسمت آدمی دیکھتا ہے جس کے اندر خدا کو دیکھنے والی جنتی نگاہ پیدا ہو جائے۔

عبادت کرنے والے

ایک شخص کو کسی سے محبت ہو تو محبت کرنے والے ہی کے ساتھ یہ واقعہ پیش آئے گا کہ اس کی یاد سے اس کا دل بھر آئے۔ اس کے برعکس جس کو اس آدمی سے کوئی لگاؤ نہ ہو وہ صرف وقتی تدبیر سے اس کی خاطر رونے والا نہیں بن سکتا۔

ایک شخص لوگوں کے درمیان تواضع کا طریقہ اختیار کرتا ہے اور دوسرا شخص ڈھٹائی کا۔ ایک شخص معاملات میں انصاف کرتا ہے اور دوسرا بے انصافی سے پیش آتا ہے۔ ایک عاجزانہ نفسیات کے ساتھ جی رہا ہے اور دوسرا متکبرانہ نفسیات کے ساتھ۔ ایک شخص اعتراف کو اپنا طریقہ بنائے ہوئے ہے اور دوسرا ہٹ دھرمی کو۔ تو ایسی حالت میں یہ ناممکن ہے کہ دونوں کی عبادت یکساں ہو۔ ان میں صرف پہلا شخص ہے جس کی عبادت خشوع کی عبادت بنے گی۔ دوسرا شخص خواہ کتنا ہی چاہے یہ ناممکن ہے کہ وقتی طور پر عبادتی صورت بنا کر وہ اپنی عبادت کو خشوع کی عبادت بنائے۔ خشوع کی عبادت دراصل خاشعانہ زندگی کا ایک نتیجہ ہے۔ جو شخص اپنی زندگی میں خاشع نہ بنا ہو وہ کبھی خشوع کی عبادت نہیں کر سکتا۔

خدا کی عبادت کرنے والے خدا کی جنتوں میں جائیں گے۔ مگر اس عبادت کی توفیق اس کو ملتی ہے جو عبادت کے مخصوص اوقات کے علاوہ بھی خدا کا عابد بنا ہوا ہو نہ کہ وہ جو صرف وقتی طور پر عبادت کی صورت بنا لے۔ جنت ایک حقیقی جگہ ہے جو خصوصی اہتمام کے ساتھ حقیقی عبادت گزاروں کے لئے بنائی گئی ہے۔ حقیقی جنت ان لوگوں کو نہیں مل سکتی جو صرف جھوٹی عبادت کا سرمایہ لے کر خدا کے یہاں پہنچے ہوں۔

کامل دنیا

دنیا انتہائی لذیذ ہے مگر اس کی لذتیں چند لمحے سے زیادہ باقی نہیں رہتیں۔ دنیا بے پناہ حد تک حسین ہے مگر اس کو دیکھنے والی آنکھ بہت جلد بے نور ہو جاتی ہے۔ دنیا میں عزت اور خوشی حاصل کرنا انسان کو کتنا زیادہ مرغوب ہے مگر دنیا کی عزت اور خوشی آدمی ابھی پوری طرح حاصل نہیں کر پاتا کہ اس پر زوال کا قانون جاری ہو جاتا ہے۔ دنیا میں وہ سب کچھ ہے جس کو انسان چاہتا ہے مگر اس سب کچھ کو حاصل کرنا انسان کے لئے ممکن نہیں، حتّٰی کہ اس خوش قسمت انسان کے لئے بھی نہیں جو بظاہر سب کچھ حاصل کر چکا ہو۔ ہر آدمی کچھ ایسی محدودیتوں میں گھرا ہوا ہے کہ وہ پا کر بھی نہیں پاتا۔ کامیاب ہونے کے بعد بھی خوشیوں کا چمن اس کے لئے نہیں اگتا۔

انسان ایک کامل وجود ہے مگر اس کا المیہ یہ ہے کہ اس کو کامل دنیا حاصل نہیں۔ انسان کی زندگی اس وقت تک بے معنی ہے جب تک اس کو ایک ایسی دنیا نہ ملے جو ہر قسم کی محدودیت اور ناموافق حالات سے پاک ہو۔

خدا نے یہ کامل دنیا جنت کی صورت میں بنائی ہے۔ مگر یہ دنیا کسی کو اپنے آپ نہیں مل سکتی۔ اس آنے والی مکمل دنیا کی قیمت موجودہ نامکمل دنیا ہے۔ جو شخص اپنی موجودہ دنیا کو آنے والی دنیا کے لئے قربان کر سکے وہی آنے والی جنتی دنیا کو پائے گا۔ جو شخص اس قربانی کے لئے تیار نہ ہو وہ بھی اگرچہ موت کے بعد ابدی دنیا میں داخل ہوگا، مگر اس کے لئے یہ ابدی دنیا حسرتوں اور مایوسیوں کی دنیا ہوگی نہ کہ خوشیوں اور لذتوں کی دنیا۔

اندھیرے کے بعد اجالا

ہر رات کے بعد صبح آتی ہے۔ جو چیزیں اندھیرے میں چھپی ہوئی تھیں وہ دن کی روشنی میں لوگوں کے سامنے آجاتی ہیں۔ یہ آج کی ایک مثال ہے جو کل کے بارے میں لوگوں کو بتا رہی ہے۔

جب آخرت کا سورج طلوع ہوگا تو وہ تاریکی کے ان پردوں کو پھاڑ دے گا جو آج لوگوں کی اصل حیثیت کو چھپائے ہوئے ہیں۔ اس وقت ہر آدمی اپنی اصل صورت میں دکھائی دینے لگے گا۔ اس وقت صاف نظر آئے گا کہ کون شخص اندر سے جانور تھا اور بظاہر انسانی صورت میں چل رہا تھا۔ کون شخص ناحق پر تھا اگرچہ وہ خوبصورت الفاظ بول کر اپنے کو حق پرست ثابت کئے ہوئے تھا۔ کون شخص اللہ کے سوا دوسروں کی پرستش میں مبتلا تھا اگرچہ زبان سے وہ اللہ کا نام لیتے ہوئے نہیں تھکتا تھا۔

اس کے بعد کچھ اور اشخاص ہوں گے جن کی حقیقت آخرت کے دن کھل کر سامنے آئے گی۔ لوگ دیکھیں گے کہ ایک شخص جس کو انھوں نے اس کے معمولی حالات کی بنا پر غیر اہم سمجھ لیا تھا وہ اپنے اندر اہمیت کا پہاڑ لئے ہوئے تھا۔ ایک شخص جس کو دنیا کی پر رونق مجلسوں میں عزت کی جگہ نہیں ملتی تھی وہ فرشتوں کی زیادہ باعزت مجالس میں اپنے صبح و شام گزار رہا تھا۔ ایک شخص جس کو وقت کے بڑوں نے اپنے نزدیک رد کر دیا تھا وہی وہ شخص تھا جس کو خدا کی طرف سے مقبولیت کی سند ملی ہوئی تھی۔ ایک شخص جس کو دنیا کے لوگ بے دین قرار دے کر حقارت کے خانہ میں ڈالے ہوئے تھے اس کا نام خدا کے یہاں دین داروں کی فہرست میں سب سے اوپر لکھا ہوا تھا۔

تاریکی ختم ہوگی

کائنات ایک انتہائی بامعنی کارخانہ ہے۔ کائنات کسی ایسی چیز کو قبول نہیں کرتی جو اس کے مزاج کے خلاف ہو، جو اس کی تخلیقی اسکیم کے مطابق نہ ہو۔ مگر کائنات کے سب سے زیادہ سرسبز اور قیمتی حصہ پر انسان ظلم و فساد جاری کئے ہوئے ہے۔ حق کے نام پر حق کو قتل کیا جارہا ہے اور کائنات اپنی تمام معنویت کے باوجود خاموش کھڑی ہوئی ہے۔ وہ زمین پر سب کچھ ہوتے ہوئے دیکھتی ہے مگر اس کے بارے میں اپنا کوئی بیان نہیں دیتی۔ وہ سچ کو سچ نہیں کہتی اور جھوٹ کے جھوٹ ہونے کا اعلان نہیں کرتی۔

کیا کائنات کے اندر تضاد ہے۔ کیا یہ ایک گونگی کائنات ہے۔ جس کائنات کے پاس سریلے نغمے بکھیرنے والی چڑیاں ہوں کیا اس کے پاس حق کا اعلان کرنے والی زبان نہیں۔ جواب یہ ہے کہ یقیناً ہے۔ مگر خدا نے اس کو قیامت تک خاموش رہنے کا حکم دے رکھا ہے۔ جیسے ہی صور پھونکا جائے گا تمام زبانوں کی مہریں ٹوٹ جائیں گی۔ اس وقت ساری کائنات ایک عظیم ریکارڈ بن جائے گی اور پھر خدا کے گواہ کی حیثیت سے وہ سب کچھ بتائے گی جو حق اور عدل کے مطابق اسے بتانا چاہئے۔ اس وقت لوگوں کو معلوم ہوگا کہ جس کائنات کے پاس رات کو دن بنانے والا سورج موجود تھا اس کے پاس یہ بھی انتظام تھا کہ تاریکی میں چھپے ہوئے اعمال کو اجالے میں لاسکے۔

اس دن خدا کے سرکش بندے اپنی سرکشی کی ابدی سزا بھگتنے کے لئے جہنم کی آگ میں ڈال دئے جائیں گے اور خدا کے نیک بندے خدا کی رحمتوں کے سایہ میں جنت میں داخل کئے جائیں گے جہاں وہ عزت اور آرام کی ابدی زندگی کا لطف اٹھاتے رہیں گے۔

تمناؤں کی دنیا

خدا نے انسان کو ایک ایسی مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا جس کے اندر بہت سی خواہشیں اور لذتیں چھپی ہوئی ہیں۔ دنیا میں ان خواہشوں اور لذتوں کی تکمیل کا سامان بھی موجود ہے۔ مگر انسان جب انھیں پورا کرنا چاہتا ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ انھیں پورا نہیں کرسکتا۔ کہیں انسان کی عمر اس کی خواہشوں اور لذتوں کی راہ میں حائل ہو جاتی ہے اور کہیں اس کی محدودیت۔ کہیں اس کی کوئی کمزوری رکاوٹ بن جاتی ہے اور کہیں کوئی ناخوش گوار اتفاق۔

کیا انسان کا مقدر صرف یہ ہے کہ وہ طرح طرح کی خواہشیں لے کر دنیا میں آئے اور پھر یہ حسرت لے کر دنیا سے چلا جائے کہ وہ اپنی خواہشوں کو حاصل نہ کرسکا۔ نہیں، بلکہ خدا نے جنت کی صورت میں اس کی خواہشوں اور لذتوں کی تکمیل کا ابدی سامان مہیا کر رکھا ہے۔ موت کے بعد آدمی ایک اور زیادہ کامل زندگی پالیتا ہے، وہ ایک ایسی دنیا میں دوبارہ آنکھ کھولتا ہے جو ہر قسم کی کمیوں سے پاک ہے۔ یہاں وہ سب کچھ بے حساب مقدار میں موجود ہے جس کو انسان نے موجودہ دنیا میں چاہا مگر وہ ان کو اپنے لئے حاصل نہ کرسکا۔

موت کے بعد کی یہ جنت ان خوش نصیب لوگوں کے لئے ہے جو موت سے پہلے جنتی عمل کا ثبوت دیں جو اپنے اونچے کردار سے اس کا استحقاق ثابت کریں۔ تمناؤں کی زندگی جس کو آدمی موجودہ دنیا میں نہ پاسکا اس کو وہ آخرت کی دنیا میں پائے گا۔ مگر یہ زندگی اسی کو ملے گی جو موجودہ دنیا میں اس کی قیمت ادا کرچکا ہو۔

کھونے والا پاتا ہے

خوشیوں سے بھری ہوئی زندگی انسان کا سب سے بڑا خواب ہے۔ ہر آدمی اس تمنا کو لے کر پیدا ہوتا ہے مگر ہر آدمی اس تمنا کو پورا کئے بغیر مر جاتا ہے۔ اس ناکامی کی وجہ یہ ہے کہ تمام لوگ اپنے خواب کی تعبیر اسی موجودہ دنیا میں چاہتے ہیں۔ مگر موجودہ دنیا اس آرزو کی تکمیل کے لئے کافی نہیں۔

ہم اپنی زندگی کو کامیاب بنانے کی طرف ابھی سفر کر رہے ہوتے ہیں کہ ہم کو موت آجاتی ہے۔ ہم مشینی ترقیاں وجود میں لاتے ہیں مگر نئے نئے مسائل پیدا ہو کر ساری ترقی کو بے معنی بنا دیتے ہیں۔ ہم اپنی پسند کے مطابق اپنا ایک گھر بناتے ہیں مگر دوسرے انسانوں کا بغض، حسد، گھمنڈ، ظلم اور انتقام ظاہر ہو کر ہم کو الجھا دیتے ہیں اور ہم اپنے آشیانہ کو خود اپنی آنکھوں سے بکھرتا ہوا دیکھ کر اس دنیا سے چلے جاتے ہیں۔

آدمی کی تمنائیں بجا ہیں مگر ان کے پورے ہونے کی جگہ موت کے بعد آنے والی دنیا ہے نہ کہ موت سے پہلے کی دنیا۔ یہی وہ عقیدہ ہے جو ہماری موجودہ زندگی کو بامعنی بناتا ہے۔ اس کے بعد موجودہ دنیا جدوجہد کی دنیا بن جاتی ہے اور اگلی دنیا جدوجہد کا انعام پانے کی دنیا۔ موجودہ دنیا کو منزل سمجھنے کی صورت میں آدمی مایوسی کے سوا اور کہیں نہیں پہنچتا۔ جب کہ آخرت کی دنیا کو منزل سمجھنے کا عقیدہ اس کے سامنے ابدی سکون کا دروازہ کھول دیتا ہے۔

ایک ایسی دنیا جہاں کھونے کے سوا اور کچھ نہ ہو وہاں وہی نظریہ صحیح ہو سکتا ہے جو کھونے میں پانے کا راز بتاتا ہو۔

حادثہ سے بچئے

آدمی بے شمار کوششوں کے بعد ایک قابل اعتماد معاشی زندگی حاصل کرتا ہے۔ وہ اپنے حوصلوں کو ایک دل پسند مکان کی صورت میں بنا کر خوش ہوتا ہے۔ وہ اپنے لئے کامیابی اور ترقی کا مینار کھڑا کرتا ہے۔ مگر عین اس وقت اس کی موت آجاتی ہے۔ وہ اپنے گھر کو سونا چھوڑ کر قبر میں لیٹ جاتا ہے۔ اس کا چکنا جسم مٹی اور کیڑے کی نذر ہوجاتا ہے۔ اس کی کوششوں کا حاصل اس سے اس طرح جدا ہوجاتا ہے جیسے آدمی اور اس کے درمیان کبھی کوئی تعلق ہی نہ تھا۔

کوٹھی کا خواب دیکھنے والا مجبور کر دیا جاتا ہے کہ وہ قبر میں داخل ہو، وہ قبر کے راستہ سے گزر کر حشر کے میدان میں پہنچ جائے۔ یہ دوسری دنیا اس کی آرزوؤں کی دنیا سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ یہاں وہ اتنا مفلس ہوتا ہے کہ اس کے پاس کپڑا بھی نہیں ہوتا جس سے وہ اپنے جسم کو چھپالے۔ اس کی ساری کمائی اس سے جدا ہوجاتی ہے۔ اس کے ساتھی اس سے بچھڑ جاتے ہیں۔ اس کا زور اس سے رخصت ہوجاتا ہے۔ ان چیزوں میں سے کوئی چیز وہاں اس کا ساتھ دینے کے لئے موجود نہیں ہوتی جن کے بل پر وہ دنیا میں گھمنڈ کر رہا تھا۔

آہ وہ سفر بھی کیسا عجیب ہے جو عین منزل کے قریب پہنچ کر حادثہ کا شکار ہوجائے۔ وہ مسافر بھی کیسا عجیب مسافر ہے جو یہ سمجھ کر آگے بڑھ رہا ہو کہ وہ منزل کی طرف جا رہا ہے مگر جب منزل آئے تو اس کو معلوم ہو کہ وہ صرف بھٹک رہا تھا، وہ الٹی سمت میں اپنی بھاگ دوڑ جاری کئے ہوئے تھا نہ کہ صحیح سمت میں۔

آفاقی دین

کائنات کا دین اللہ کی اطاعت ہے۔ یہاں کی ہر چیز اللہ کے مقرر کئے ہوئے ضابطہ پر چل رہی ہے۔ درخت اوپر کھڑا ہوتا ہے مگر وہ اپنا سایہ نیچے زمین پر بچھا دیتا ہے۔ ہوائیں چلتی ہیں مگر وہ کسی سے ٹکراؤ نہیں کرتیں۔ سورج اپنی روشنی بکھیرتا ہے مگر وہ چھوٹے بڑے میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ بادل بارش برساتے ہیں مگر وہ اپنے اور غیر میں تمیز نہیں کرتے۔ چڑیاں اور چیونٹیاں اپنے اپنے رزق کی تلاش میں مصروف ہوتی ہیں مگر وہ ایک دوسرے کا حصہ نہیں چھینتیں۔

یہ کائنات کے لئے خدا کا دین ہے اور اسی دین پر انسان کو بھی رہنا ہے۔ اللہ کے محبوب بندے وہ ہیں جو دنیا میں درخت کے سایہ کی طرح متواضع بن کر رہیں۔ جو دوسروں کے درمیان سے اس طرح گزریں جیسے ہوا کے لطیف جھونکے لوگوں کے بیچ سے گزر جاتے ہیں۔ جن کا فیض اور جن کی مہربانیاں بارش کی طرح ہر ایک کے لئے عام ہوں۔ جو دریا کے پانی کی طرح دوسروں کے لئے سیرابی بن جائیں۔ جنھوں نے سورج کی شعاعوں کی طرح ہر ایک کو اجالے کا تحفہ دیا۔ جنھوں نے اپنی سرگرمیوں کے دوران اس بات کی پوری احتیاط کی کہ ان سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔

جنت ایسی ہی پاک روحوں کی آبادی ہے۔ جنت وہ نفیس مقام ہے جہاں آدمی اپنے پڑوسی سے پھولوں کی خوشبو جیسے سلوک کا تجربہ کرے گا اور چڑیوں کے چہچے جیسے میٹھے بول سنے گا۔ جہاں ایک کا دوسرے سے ملنا لطیف ہواؤں سے ملنے کی طرح ہو گا — ں عجیب ہوگی جنت اور کیسا عجیب ہو گا جنت کا پڑوس۔

اسلامی زندگی

اسلامی زندگی کا وجود میں آنا ایسا ہی ہے جیسے کسی درخت کا وجود میں آنا۔ ایک ہرا بھرا درخت زمین پر اس وقت کھڑا ہوتا ہے جب کہ اس نے اپنے آپ کو زمین و آسمان کے نظام کے ساتھ ہم آہنگ کر لیا ہو، اسی طرح اسلامی انسان اس وقت بنتا ہے جب کہ وہ خدا کی پوری کائنات کو اپنی غذا بنا چکا ہو۔

اسلامی زندگی نہ عملیاتی ورزشوں سے وجود میں آتی ہے اور نہ انقلابی نعروں سے۔ ایک بندہ اس وقت مومن ومسلم بنتا ہے جب کہ وہ تجلیات الٰہی کا مہبط بن جائے۔ خدا نے جس طرح مادی سطح پر درختوں کے لئے ایک عالمی دسترخوان پھیلا رکھا ہے، اسی طرح روحانی سطح پر انسان کے لئے ہر وقت اس کے فیضان کی بارش ہو رہی ہے۔ مادی کائنات سے اپنے آپ کو جوڑنے کے نتیجہ میں درخت وجود میں آتا ہے۔ اسی طرح الٰہی تجلیات کے سمندر میں نہانے سے وہ چیز وجود میں آتی ہے جس کو اسلامی زندگی کہتے ہیں۔ درخت ہو یا انسان، دونوں ہی ایک وسیع تر نظام غذا سے اپنے کو ہم آہنگ کر کے اپنی ہستی کو کمال کے مقام پر پہنچاتے ہیں۔ اسلامی انسان بھی ایسا ہی ایک واقعہ ہے جیسا ایک درخت۔ فرق یہ ہے کہ درخت فطری جبر کے تحت وجود میں آتا ہے اور انسان خود اپنے آزادانہ عمل سے۔

جو شخص آج اللہ کے رزق پر جی رہا ہے وہ آخرت میں نہایت شاداب اور تندرست حالت میں اٹھے گا۔ اور جو لوگ اللہ کے رزق سے محروم ہیں ان کا حال وہی ہوگا جو آج خراب غذاؤں پر پلنے والے غریبوں کا نظر آتا ہے۔ وہ وہاں بدحال صورتوں کے ساتھ اٹھیں گے خواہ آج وہ کتنے ہی پُر رونق نظر آتے ہوں۔

مومن خدا کی انڈسٹری ہے

ہر آدمی ایک انڈسٹری ہے۔ ایک شخص وہ ہے جس کی انڈسٹری سے صرف زہر اور انگارے برآمد ہوئے۔ اس کو جب موقع ملا تو اس نے اپنی بڑائی کا جھنڈا بلند کیا۔ اس کے پاس دولت آئی تو اس نے اس کو نمائشی کاموں میں خرچ کیا۔ اس نے کسی کے اوپر غلبہ پایا تو اس کی بربادی کے منصوبے بنائے۔ اس کو کسی سے اختلاف ہوا تو اس نے اسے کڑوی بات اور شیطانی عمل کا مزہ چکھایا۔ اس سے جب کسی کا معاملہ پڑا تو اس کو اس سے خود غرضی، بے انصافی اور دھاندلی کا تجربہ ہوا۔

ایسا آدمی اپنے اندر جہنم کی انڈسٹری قائم کئے ہوئے ہے۔ جو چیز بھی اس کے اندر داخل ہوتی ہے وہ زہر اور آگ اور بدبو بن کر باہر آتی ہے۔ موت کے بعد اس کی یہ پیداوار اسے گھیرے گی۔ وہ اپنے آپ کو خود اپنے بنائے ہوئے جہنم میں پھنسا ہوا پائے گا۔

دوسرا انسان وہ ہے جس کو خدا نے بڑائی دی تو اس نے تواضع کی صورت میں اس کا ردعمل پیش کیا۔ اس کا احتساب کیا گیا تو اس نے عجز کی نفسیات کے ساتھ اس کو قبول کیا۔ اس کے پاس دولت آئی تو اس نے خدا کے راستہ میں اس کا استعمال ڈھونڈ نکالا۔ اس کو اپنے آپ کو نمایاں کرنے کے مواقع ملے مگر وہ اپنے آپ کو خدا کی خاطر دفن کرنے پر راضی ہو گیا۔ اس نے لوگوں کے اوپر قابو پایا تو وہ ان کے لئے انصاف اور خیر خواہی کا پیکر بن گیا۔

یہ وہ شخص ہے جس نے اپنے اندر خدا کی انڈسٹری قائم کی۔ جو چیز بھی اس کے اندر داخل ہوئی وہ ربانی پیکر میں ڈھل کر باہر نکلی۔ اس نے موجودہ دنیا میں پھول اور خوشبو کی فصل اگائی تھی، آخرت میں وہ ہمیشہ کے لئے پھول اور خوشبو والے باغوں میں رہے گا۔

عمل یا اعتراف

ایمان وہ ہے جو آدمی کے اندر اس طرح داخل ہو کہ وہ اس کی نفسیات کا جزء بن جائے۔ وہ اس کے دل و دماغ پر پوری طرح چھا جائے۔ آدمی کا سوچنا اور چاہنا، اس کا یقین و اعتماد، اس کی دلچسپیاں اور وفاداریاں، اس کا خوف اور اس کی محبت، سب اس کے ایمان کے تابع ہو جائیں۔ یہ ایمان کا اعلیٰ درجہ ہے۔ ایسے لوگ اسی دنیا میں خدا کی پناہ میں آجاتے ہیں، اور جو شخص دنیا ہی میں خدا کی پناہ میں آچکا ہو اس کے متعلق کون شبہ کر سکتا ہے کہ وہ آخرت میں خدا کی پناہ سے محروم ہو گا۔

دوسرے اہل ایمان وہ ہیں جن سے نیکی کے ساتھ برائیاں بھی ہوئیں مگر انھوں نے اپنی برائیوں کا اعتراف کر لیا۔ امید ہے کہ اللہ انھیں بھی معاف کر دے گا۔ کیونکہ وہ معاف کرنے والا مہربان ہے۔

مضبوط ایمان والا وہ ہے جس کے یہاں ایمان اور عمل دونوں ایک چیز بن جائیں۔ مگر کمزور ارادہ کے لوگ اپنے ایمان اور عمل کے درمیان اتنی یکسانی پیدا نہیں کر پاتے۔ تاہم وہ بھی اللہ کی رحمتوں میں حصہ دار ہوں گے، بشرطیکہ انھوں نے ڈھٹائی کے بجائے شرمندگی کا ثبوت دیا ہو۔ انھوں نے تاویلوں کا سہارا لینے کے بجائے کھلے طور پر اعتراف کر لیا ہو۔ وہ بحث کرنے کے بجائے چپ ہو گئے ہوں۔ ان کی کوتاہیوں کی نشان دہی کی جائے تو وہ بپھرنے کے بجائے اپنا سر جھکا لیں۔ اگر وہ اپنے رب کے سامنے عمل کا تحفہ نہ پیش کر سکے ہوں تو انھوں نے اپنے رب کے سامنے عجز کے آنسو پیش کئے ہوں۔ جو لوگ یہ آخری چیز بھی پیش نہ کر سکیں ان کو خدا بخشے گا تو کس بہانے بخشے گا۔

صبر کا سفر

خدا کا محبوب بندہ وہ ہے جو اپنی خود پسندی کو خدا پسندی میں گم کر دے۔ جو اپنی بات کے مقابلہ میں حق کی بات کو اختیار کرلے۔ جو دنیا کی عزت کے مقابلہ میں آخرت کی عزت کو اہمیت دینے لگے۔ لوگوں کی طرف سے خواہ کتنی ہی تلخیاں پیش آئیں مگر وہ اپنی طرف سے جوابی کارروائی نہ کرے۔ اسی کا نام صبر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بے حد مشکل راستہ ہے مگر اس میں بھی شک نہیں کہ یہی وہ راستہ ہے جو کسی کو جنت کی طرف لے جانے والا ہے۔ جنت صبر کرنے والوں کو ملتی ہے اور صبر کرنے والا وہ ہے جو اللہ کی خاطر اپنے آپ کو ہر محرومی پر راضی کرلے۔

امتحان کی اس دنیا میں تلخیوں اور ناخوش گواریوں کے بغیر چارہ نہیں۔ جو شخص جنت کا مسافر بننا چاہے اس کو جان لینا چاہئے کہ وہ ایک ایسے راستہ پر چلنے کا ارادہ کر رہا ہے جس میں لوگوں کی طرف سے کڑوی باتیں پیش آئیں گی۔ جس میں لمبے انتظار کی مشقت برداشت کرنی ہوگی۔ جس میں مخالفین کی طرف سے طرح طرح کی دل آزاریاں ہوں گی۔ ان مواقع پر حق کا مسافر اگر صبر کو کھو دے، اگر وہ بے برداشت ہو جائے تو وہ درمیان ہی میں اپنے راستہ کو کھوٹا کرے گا، وہ جنت کی منزل تک نہ پہنچ سکے گا۔

جنت کا سفر تمام کا تمام صبر کا سفر ہے۔ جنت میں وہی شخص پہنچے گا جو صبر کی تلخیوں کو سہنے کے لئے تیار ہو، جو جذبات کی پامالی پر بھی بے ہمت ہونا نہ جانے، جو نفس کی ہر چوٹ کو اپنے سینہ کی ویرانیوں میں چھپالے۔

خدا کا درخت

درخت کیا ہے، ایک بیج کی اس صلاحیت کا ظہور کہ وہ مٹی اور پانی سے اپنا رزق لے کر اپنے آپ کو تنہ اور شاخ اور پتی اور پھول کے اس مجموعہ کی صورت دے سکے جس سے زیادہ خوش منظر مجموعہ اس دنیا میں اور کوئی نہیں۔

انسان کی مثال بھی کچھ اسی قسم کی ہے۔ وہ اس دنیا میں ایک بیج کی مانند ڈالا گیا ہے۔ اس کو اپنی کوششوں سے درخت بننا ہے۔ خدا کی اس دنیا میں اس کے لئے رزق کے بے پناہ ربانی مواقع رکھ دئے گئے ہیں۔ وہ اس دنیا سے اپنا رزق لے کر اپنے لئے ایک ابدی مستقبل کی تعمیر کر سکتا ہے جو اگلی زندگی میں جنت کے ہرے بھرے باغوں کی شکل میں اس کی طرف لوٹے اور اس کے لئے لازوال خوشی کا باعث ہو۔

اس کے برعکس جو لوگ ان مواقع سے اپنا ربانی حصہ پانے میں ناکام رہیں ان کی مثال اس بیج کی سی ہے جو کسی پتھر پر پڑ گیا ہو یا جس نے کسی ناموافق زمین پر جگہ پائی ہو۔ ایسا بیج کبھی لہلہاتے ہوئے درخت کی صورت اختیار نہیں کرتا۔ موجودہ دنیا میں جس نے اپنی تعمیر کے امکانات سے فائدہ نہیں اٹھایا وہ گویا ایک ایسا بیج ہے جس کی کوتاہیوں نے اس کو درخت نہیں بنایا۔ ایسا شخص اگلی طویل تر زندگی میں ابدی ناکامی سے دوچار ہوگا۔ وہ آخرت کی دنیا میں ایک ایسی زندگی کا وارث ہوگا جو ہر قسم کی شادابی سے مکمل طور پر محروم ہو۔

جنتی انسان گویا ایک بہترین درخت ہے جو دنیا میں اگتا ہے اور پھر آخرت میں لے جا کر خدا کے ہرے بھرے باغ میں لگا دیا جاتا ہے۔

جنت کی وراثت

زمین پر انسان کو آزادی حاصل ہے مگر یہ مستقل آزادی نہیں ہے۔ یہ صرف وقتی آزادی ہے اور خاص منصوبہ کے تحت دی گئی ہے۔ یہ دراصل امتحان کی آزادی ہے۔ کائنات کا مالک یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ ان میں سے کون ہے جو آزادی پاکر بھی آزادی کا غلط استعمال نہیں کرتا۔ اس کے بعد خدا ایسے لوگوں کو اپنے انعامات سے نوازے گا اور ان لوگوں کو تباہی کے گڑھے میں ڈال دے گا جو آزادی پاکر بگڑ گئے۔

دنیا کا موجودہ نظام صرف اس وقت تک ہے جب تک جانچ کا یہ عمل پورا نہیں ہو جاتا۔ اس مدت کے پورا ہونے کے بعد زمین کا مالک زمین کا انتظام براہ راست اپنے ہاتھ میں لے لے گا جس طرح وہ بقیہ کائنات کا انتظام اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے ہے۔ اس وقت اچھے اور برے ایک دوسرے سے الگ کر دئے جائیں گے۔ اچھے لوگوں کو ابدی طور پر جنتی زندگی حاصل ہوگی اور برے لوگ ابدی طور پر جہنمی حالات میں دھکیل دئے جائیں گے۔

موجودہ دنیا وہ مقام ہے جہاں آنے والی جنتی دنیا کے شہری چنے جا رہے ہیں۔ جو لوگ آزاد ہونے کے بعد بھی اپنے آپ کو اللہ کا حکم بردار بنائیں گے۔ جو مجبور نہ ہوتے ہوئے بھی اللہ کی مرضی کو اپنے اوپر طاری کریں گے وہی اللہ کے نزدیک اس قابل ٹھہریں گے کہ وہ اللہ کی جنتی دنیا کے باسی بن سکیں۔ آج امتحان کے وقفہ میں ہر طرح کے لوگ زمین پر بسے ہوئے ہیں مگر امتحان کی مدت ختم ہونے کے بعد صرف صالح لوگ خدا کی اس ہری بھری دنیا کے وارث قرار پائیں گے اور بقیہ لوگوں کو اس سے بے دخل کرکے دور پھینک دیا جائے گا جہاں وہ ابدی طور پر حسرتوں اور مایوسیوں کا مزا چکھتے رہیں۔

جنتیوں کا انتخاب

موجودہ امتحان کی دنیا میں انسانوں کو آزادی ملی ہوئی ہے۔ مگر انسان اپنی آزادی
غلط استعمال کرتا ہے۔ اس نے خدا کی زمین کو ظلم و فساد سے بھر رکھا ہے۔ پھر خدا نے اتنی
ی برائی کو کیوں گوارا کیا۔ صرف اس لئے کہ اس کے بغیر اس اعلیٰ نوع کا انتخاب نہیں کیا
ا سکتا جو جنت میں بسائے جانے کے قابل ہو۔ اختیار اور آزادی کے ماحول ہی میں وہ
سان چنے جا سکتے ہیں جن کے متعلق خدا کے نگراں فرشتے یہ گواہی دیں کہ یہ وہ روحیں ہیں
نھوں نے مکمل اختیار رکھتے ہوئے اپنے کو خدا کے لئے بے اختیار کر لیا تھا۔ دنیا کی
بے پناہ برائیاں دراصل ایک بے پناہ بھلائی کی قیمت ہیں۔ یہ بھلائی کہ انسانوں کے جنگل
سے وہ سعید روحیں چھان کر نکالی جائیں جو پورے شعور اور مکمل ارادہ کے ساتھ اپنے کو
دا کا تابعدار بنالیں جو محض حقیقت پسندی کی بنا پر خدا کی محکومی اختیار کریں نہ کہ مجبوری
ی بنا پر۔

یہ وہ انوکھی ہستیاں ہیں جن کو یہ موقع تھا کہ وہ حق کو جھٹلا دیں مگر انھوں نے حق کو
نہیں جھٹلایا۔ جن کو یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ اپنی انا کا جھنڈا بلند کریں مگر وہ اپنے کو
پچھلی سیٹ پر بٹھا کر خدا کو صدر نشین بنانے پر راضی ہو گئے۔ جن کو یہ آزادی ملی ہوئی تھی
ر وہ اپنی قیادت کا گنبد کھڑا کریں مگر انھوں نے اپنے گنبد کو خود اپنے ہاتھوں سے ڈھا دیا
ر صرف حق کو اونچا کرنے میں انھوں نے خوشی حاصل کی۔ اس قسم کی روحیں اس کے بغیر چنی
نہیں جا سکتیں کہ ان کو مکمل آزادی کے ماحول میں رکھا جائے اور آزادی کا حقیقی ماحول
قائم کرنے کی ہر قیمت کو برداشت کیا جائے۔

دو قسم کی روحیں

انسانوں میں دو قسم کے انسان ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو گندے جذبات میں جیتے ہیں۔ دوسرے وہ جو ستھرے جذبات پر پرورش پاتے ہیں۔

ایک انسان وہ ہے جو نفرت اور عداوت میں جی رہا ہے۔ جو ذاتی نمائش اور شخصی مصلحت کی ہواؤں میں سانس لیتا ہے۔ جس کی روح کو اس سے غذا ملتی ہے کہ وہ حق کا اعتراف نہ کرے۔ جس کے قلب ودماغ کو انانیت، خود پرستی، اظہار برتری سے خوراک ملتی ہے۔ وہ کسی کو تکلیف پہنچا کر خوش ہوتا ہے۔ کسی کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اس پر وار کرتا ہے اور پھر کامیابی کے قہقہے لگاتا ہے۔ ایسے لوگ جہنمی غذاؤں پر جی رہے ہیں اور آخرت میں ان کا ٹھکانا صرف جہنم کی آگ ہوگا۔

دوسرا انسان وہ ہے جو ستھرے قلب کے ساتھ جی رہا ہے۔ اس کی روح دوسروں کی کامیابی سے خوش ہوتی ہے۔ وہ دوسروں پر قابو یافتہ ہو کر بھی اس کو چھوڑ دینے میں راحت محسوس کرتا ہے۔ اس کا دل دوسروں کے لئے محبت اور خیر خواہی کے جذبات سے بھرا ہوتا ہے۔ اس کی ہستی کو عجز اور تواضع میں لذت ملتی ہے۔ وہ خدا اور آخرت کی فضاؤں میں سانس لیتا ہے۔ اختلاف کے وقت اپنے کو جھکا لینے میں اس کو سکون ملتا ہے۔ جب کوئی اس کی غلطی کی نشان دہی کرتا ہے تو اپنی غلطی کو مان لینے میں اس کا دل ٹھنڈک پاتا ہے۔ کسی کا حق اس کے ذمہ ہو تو جب تک وہ اس کا حق ادا نہ کرلے اس کو راتوں کو نیند نہیں آتی۔ یہ وہ لوگ ہیں جو جنتی غذاؤں پر جی رہے ہیں۔ آخرت میں وہ جنت کے سدا بہار باغوں میں بسائے جائیں گے۔

شکر کا جذبہ

آدمی ملے ہوئے پر مطمئن نہیں ہوتا اور جو کچھ نہیں ملا ہے اس کے پیچھے دوڑتا ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ ہر آدمی غیر مطمئن زندگی گزارتا ہے۔ ہر شخص کو خدا نے کوئی نہ کوئی نعمت دی ہے۔ مگر آدمی کا حال یہ ہے کہ جو نعمت نہیں ملی اس کی طرف متوجہ رہتا ہے اور جو نعمت ملی ہوئی ہے اس کو حقیر سمجھتا ہے۔ ایسے آدمی کے اندر اپنے خدا کے لئے شکر کا جذبہ نہیں ابھرتا۔ وہ اس قیمتی کیفیت سے محروم رہ جاتا ہے جو جنت کا مستحق بننے کے لئے سب سے زیادہ ضروری ہے۔

موجودہ دنیا کو خدا نے اس طرح بنایا ہے کہ یہاں مکمل راحت کسی کے لئے نہیں۔ اگر سرد علاقہ کے مسائل ہیں تو گرم علاقہ کے بھی مسائل ہیں۔ اگر کم آمدنی والے کی زحمتیں ہیں تو زیادہ آمدنی والے کی بھی زحمتیں ہیں۔ اگر بے زور کچھ مشکلوں سے دوچار رہے تو ان کی بھی مشکلیں ہیں جن کو زور وقوت حاصل ہے۔ امتحان کی اس دنیا میں آدمی کو مسائل سے فرصت نہیں۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ جن مسائل کے درمیان ہے ان کو گوارا کرتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھے۔ اس کی توجہات کا مرکز خدا کی رضا ہو نہ کہ مشکلات سے خالی زندگی حاصل کرنا، کیونکہ وہ تو آخرت سے پہلے ممکن نہیں۔

جو شخص آخرت کی جنت کا مالک بننا چاہتا ہو اس کو سب سے بڑا تحفہ جو اپنے رب کی خدمت میں پیش کرنا ہے وہ شکر ہے، اور شکر کا جذبہ اس کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتا کہ آدمی مشکلات ومسائل سے اوپر اٹھ کر سوچنے کی نظر پیدا کرے۔ جنت کی قیمت شکر ہے اور جنت اسی کو ملے گی جو اس کی قیمت ادا کرے۔

اللہ والے

اکثر لوگوں کا حال یہ ہے کہ عام حالات میں وہ خدا پرست نظر آتے ہیں۔ مگر جب کوئی غیر معمولی حالت پیش آئے تو اچانک وہ دوسری قسم کے انسان بن جاتے ہیں۔ کبھی محبت یا نفرت کا جذبہ، کبھی عزت و وقار کا سوال ان کے اوپر اس طرح چھا جاتا ہے کہ ان کی خدا پرستی اس کے نیچے دب کر رہ جاتی ہے۔ معمول کے حالات میں دینی زندگی گزارنے والا آدمی غیر معمولی حالات میں وہی سب کچھ کر گزرتا ہے جو غافل اور بے دین لوگ عام حالات میں کرتے ہیں۔

مگر حقیقی خدا پرست وہ ہے جو نہ صرف عام حالات میں اللہ سے ڈرے بلکہ غیر معمولی حالات میں بھی وہ اللہ سے ڈرتا ہو۔ کسی کی محبت اس کو حد سے نکلنے پر اکسائے تو وہ حد سے نکلنے پر تیار نہ ہو۔ کسی کے خلاف نفرت اس کو بے انصافی کے راستہ پر لے جانا چاہے تو وہ اس کے لئے راضی نہ ہو۔ ذاتی عزت و وقار کا سوال اس کو حق کے اعتراف سے روکے تو وہ اس کو روکنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

سچا خدا پرست آدمی اپنی تمام خامیوں سے آگاہ ہو کر اپنی اصلاح کرتا رہتا ہے۔ اس کا مسلسل احتساب اس کو ایسے مقام پر پہنچا دیتا ہے جہاں وہ اپنے آپ کو بے لاگ انداز سے دیکھ سکے۔ وہ اپنے آپ کو اس حقیقی نظر سے دیکھے جس نظر سے اس کا خدا اس کو دیکھ رہا ہے۔

یہی وہ لوگ ہیں جو فیصلہ کے دن خدا کی ان جنتوں میں داخل کئے جائیں گے جہاں نہ کوئی تکلیف ہے اور نہ کسی قسم کا اندیشہ۔

مانگنے والا پاتا ہے

لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ جنت کا نام لیتے ہیں مگر جہنمی اعمال میں مشغول ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے خدا سے اس کی جنت مانگی ہی نہیں۔ اگر وہ خدا سے جنت مانگتے تو یہ ممکن نہ تھا کہ وہ لوگوں کو ایسے راستوں میں چلنے دے جو انھیں جہنم کی طرف لے جانے والے ہیں۔

یہ ممکن نہیں کہ آپ خدا سے جنت مانگیں اور وہ آپ کو جہنم دیدے۔ آپ خدا سے خشیت مانگیں اور وہ آپ کو قساوت دے دے۔ آپ خدا کی یاد مانگیں اور وہ آپ کو غفلت میں مبتلا کر دے۔ آپ آخرت کی تڑپ مانگیں اور وہ آپ کو دنیا کی محبت میں ڈال دے۔ آپ کیفیت سے بھری ہوئی دینداری مانگیں اور وہ آپ کو بے روح دین داری میں پڑا رہنے دے۔ آپ حق پرستی مانگیں اور وہ آپ کو شخصیت پرستی کی کوٹھری میں بند کر دے۔

اگر آپ کی زندگی میں مطلوب چیز نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے نہ مانگا تھا ورنہ آپ کو ملا۔ جو مانگے وہ کبھی محروم نہیں رہ سکتا۔ یہ مالک کائنات کی غیرت کے خلاف ہے کہ وہ کسی بندے کو اس حال میں رہنے دے کہ قیامت میں جب خدا سے اس کا سامنا ہو تو وہ اپنے رب کو حسرت کی نظر سے دیکھے۔ وہ کہے کہ خدایا میں نے تجھ سے جنت مانگی تھی اور تو نے جہنم میرے حوالے کر دی۔ بخدا یہ ناممکن ہے، یہ ناممکن ہے، یہ ناممکن ہے۔ کائنات کا مالک تو صبح و شام اپنے سارے خزانوں کے ساتھ آپ کے قریب آکر آواز دیتا ہے کہ کون ہے جو مجھ سے مانگے تاکہ میں اسے دوں۔ مگر جن کو لینا ہے وہ خود منھ پھیرے ہوئے ہوں تو اس میں دینے والے کا کیا قصور۔

جنت کے شہری

جنت کا ماحول وہ ماحول ہوگا جہاں ہر طرف خدا کی حمد ہو رہی ہوگی، خدا کی بڑائی کے سوا کسی اور کی بڑائی کا وہاں چرچا نہ ہوگا، اس لئے وہی لوگ جنت کی دنیا میں رہنے کے قابل شہری گے جو آج کی دنیا میں خدا کی حمد اور اس کی بڑائی سے سرشار رہے ہوں، اپنی یا کسی دوسرے کی بڑائی کے احساس سے جن کا سینہ خالی رہا ہو۔ جنت کی دنیا میں قول و عمل کا فرق نہ ہوگا۔ وہاں کوئی کسی کو دھوکا نہ دے گا۔ وہاں کوئی کسی کا استحصال کرنا نہ چاہے گا۔ وہاں کوئی کسی کو آزار نہ پہنچائے گا۔ اس لئے جنت کا باشندہ وہی شخص ہو سکتا ہے جس نے آج کی زندگی میں اپنے عمل سے دکھا دیا ہو کہ وہ شہریت کے ان اعلیٰ معیاروں پر پورا اترتا ہے۔

جنت مکمل طور پر مثبت سرگرمیوں کی دنیا ہوگی، اس لئے وہاں کی آبادیوں میں بسنے کا اجازت نامہ صرف انھیں لوگوں کو ملے گا جنھوں نے آج کی دنیا میں یہ ثبوت دیا ہو کہ وہ خالص مثبت مزاج رکھنے والے لوگ ہیں اور منفی اور تخریبی کارروائیوں سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔

جنت کی دنیا ایک ایسی دنیا ہے جہاں آدمی دوسروں کی شرارتوں سے محفوظ ہوگا، اس لئے جنت کی بستیوں میں رہنے کے قابل وہی شخص ہے جس نے دنیا میں یہ ثبوت دیا ہو کہ وہ ایک ایسا شخص ہے جو دوسروں کو اپنے حسد اور اپنی شرارت سے محفوظ رکھنے والا ہے۔

جنت کا ماحول گندگیوں اور بے ہودگیوں سے پاک ہوگا اس لئے جنت کی کالونیوں میں بسانے کے لئے انھیں لوگوں کا انتخاب کیا جائے گا جو ہر قسم کی بے ہودگیوں سے دور رہنے والے ثابت ہوئے ہوں۔

عبدیت کا مقام

بندہ جب تواضع کی حالت میں ہوتا ہے تو وہ خدا کے قریب ترین ہوتا ہے۔ کیونکہ خدا کے دربار میں کسی بندہ کے لئے جو سب سے قریبی نشست ہے وہ تواضع ہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تواضع اگر نمائشی نہ ہو بلکہ حقیقی ہو تو وہ آدمی کے لئے سب سے لذیذ چیز ہوتی ہے، کیونکہ خدا کی اس دنیا میں وہ اپنی اصل حیثیت کا اعتراف ہوتا ہے، وہ خدا کے سب سے قریب پہنچ جانے کے ہم معنی ہے۔

جس آدمی کو عبدیت کے مقام کی خبر نہ ہو، عبدیت اس کے لئے لذیذ چیز نہیں بن سکتی۔ جو شخص امتیاز میں جیتا ہو وہ مساوات کی لذت کو کس طرح پائے گا۔ جو اپنی انا میں گم ہو وہ خدا کی کبریائی کے اعتراف کا مزہ کیسے چکھے گا۔ جو دوسروں کو غلط ثابت کرکے خوش ہو رہا ہو اس کو اپنی غلطی جاننے اور ماننے کی خوشی کیسے حاصل ہوگی۔ جو اپنے کو ایک پیمانہ سے ناپے اور دوسروں کو دوسرے پیمانہ سے ناپے وہ کیوں کر جانے گا کہ اپنے لئے اور دوسروں کے لئے ایک پیمانہ رکھنا اتنی بڑی دولت ہے کہ دنیا کی تمام دولتیں اس پر قربان کی جاسکتی ہیں۔

جنتی انسان وہ ہے جس کے لئے جنتی عمل دنیا میں سب سے بڑی لذت بن جائے، عبادت میں بھی اور دوسرے معاملات میں بھی۔ حسد کے جذبات کو کچلنا، انتقام کی آگ کو بجھانا، گروہی عصبیت سے اپنے کو اوپر اٹھانا، اختلاف کے باوجود انصاف کرنا، خوشامد کے بجائے حق کی بنیاد پر انسان کی قدر کرنا، یہ سب چیزیں اس کے لئے اس طرح لذیذ بن جائیں کہ ان کو چھوڑنا اس کے لئے ممکن نہ رہے۔

درخت کا سبق

درخت کو دیکھئے ۔ اس کا تنہ کس قدر سخت اور طاقت ور ہے۔ مگر اس کی پتی ، اس کا پھول اور اس کے پھل اتنا ہی زیادہ نازک اور کمزور ہیں۔ ایک شخص جب پتیوں کے حسن، پھولوں کی رنگ کاری اور پھلوں کی لطافت پر غور کرتا ہے تو اس کو محسوس ہوتا ہے کہ درخت کے یہ نرم و نازک حصے اس کے مضبوط حصوں سے زیادہ قدرت کی توجہ کے مستحق رہے ہیں ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تنہ اور شاخیں اس لئے تھیں کہ وہ تخلیق کے اس نرم و نازک شاہکار کو وجود میں لانے کا ذریعہ بنیں جن کو پتی اور پھول اور پھل کہا جاتا ہے ۔

یہ خدا کی طرف سے ایک خاموش اشارہ ہے جو بتاتا ہے کہ انسان سے اس کے خالق کو کیا مطلوب ہے۔ زندگی کے درخت کو حسین پھولوں کے انجام تک پہنچانے کے لئے آدمی کو کیا کرنا چاہئے۔ وہ یہ ہے کہ آدمی طاقت سے زیادہ معنویت کا دلدادہ ہو۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے جنت کے دروازے کھولے جائیں گے۔

انسان پتھروں کے آگے جھکتا ہے اور سچائی کو نظرانداز کردیتا ہے۔ لوگ طاقتور تنوں پر اپنے حسنِ سلوک کا ثبوت دے رہے ہیں حالانکہ ان کا خدا ان سے پھولوں اور پتیوں کی سطح پر حسنِ سلوک کا نذرانہ مانگ رہا ہے۔ لوگ بڑوں کا استقبال کرکے اپنی شرافت اور انسانیت کا مظاہرہ کررہے ہیں۔ حالانکہ خدا جہاں ان کی شرافت اور انسانیت کو دیکھنے کا منتظر ہے وہ اس کے وہ بندے ہیں جن کو چھوٹا سمجھ کر نظرانداز کردیا جاتا ہے۔ لوگ شہرت کے مواقع پر پیسہ دے کر فیاضی کا ٹائٹل لے رہے ہیں حالانکہ خدا کے یہاں فیاضی کا ٹائٹل اس کو ملتا ہے جو ایسے مواقع پر پیسہ دے جہاں جیب خالی کرکے بھی شہرت اور عزت حاصل نہیں ہوتی۔

جنت کی وراثت

مومن خدا کی اس دنیا میں گویا ایک تناور درخت ہے۔ ایک شخص جب مومن بنتا ہے تو ساری کائنات اس کو رزق پہنچانے کے لئے مستعد ہو جاتی ہے۔ وہ ایک شاندار درخت کی مانند بڑھنا شروع ہوتا ہے۔ زمین کے اندر بھی وہ اپنی جڑیں پھیلاتا ہے اور آسمان تک بھی اس کی شادابیاں پہنچتی ہیں۔ خدا کی مدد ہر مرحلہ میں اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ وہ ہر موقع پر اپنی بہار دکھاتا ہے۔ اس کی کامیابیاں دنیا کی زندگی سے لے کر آخرت کی زندگی تک چلی جاتی ہیں۔

اس کے برعکس غیر مومن خدا کی اس زمین پر جھاڑ جھنکاڑ کی طرح ہے، وہ غیر مطلوب پودے کے طور پر بس ادھر ادھر اگ آتا ہے۔ خدا کی مدد اس کے ساتھ نہیں ہوتی۔ اس لئے نہ دنیا میں اس کو جماؤ حاصل ہوتا اور نہ آخرت میں وہ کوئی پھل دیتا۔ وہ یہاں بھی محروم رہتا ہے اور وہاں بھی۔

غیر مومن کو موجودہ دنیا میں جو مواقع ملتے ہیں وہ خدا کے قانون مہلت کی بنا پر ہیں۔ امتحان کی مصلحت کے تحت اس کو وقتی طور پر زمین کی سطح پر اگنے اور بڑھنے کا موقع مل جاتا ہے۔ مگر امتحان کی مدت ختم ہوتے ہی اس کو زمین سے اکھاڑ دیا جائے گا۔ اس کے بعد اس کو آگ کی دنیا میں پھینک دیا جائے گا جہاں وہ ابدی طور پر جہنم میں جلتا رہے۔ اور خدا کی سرسبز و شاداب دنیا اپنی جنتی فضاؤں کے ساتھ صرف ان لوگوں کی وراثت میں دے دی جائے گی جو موت سے پہلے کی زندگی میں سچے ربانی انسان ثابت ہوئے ہوں۔

آخرت میں جینے والے

جنت اس کے لئے ہے جو جنت کا طالب ہو اور جنت کا طالب وہ ہے جس کے لئے جنت کے مقابلہ میں ہر دوسری چیز بے قیمت ہو جائے۔ جو شخص حقیقی معنوں میں جنت کا طالب ہو اس کی نگاہ میں دنیا کی تمام چیزیں حقیر بن جاتی ہیں۔ اخروی چیزوں کی اہمیت کا احساس دنیوی چیزوں کو اس کی نظر میں غیر اہم بنا دیتا ہے۔

جب آدمی کا ذہن آخرت کی باتیں سوچنے میں اتنا گم ہو کہ وہ دنیا کی باتیں بھولنے لگے۔ جب آخرت کا غم اس کے اوپر اس طرح چھا جائے کہ دنیا کے غم اس کو یاد نہ آئیں۔ جب آنے والے مستقل آرام و تکلیف مسئلہ اس کو اتنا فکرمند بنا دے کہ عارضی آرام و تکلیف کے مسئلے اس کے لئے بے حقیقت ہو جائیں۔ جب کل کی زندگی اس کو اس طرح اپنی طرف کھینچ لے کہ آج کی زندگی کے بارے میں وہ لوگوں کو غافل نظر آنے لگے۔ جب بلند تر حقیقتوں کی طرف متوجہ ہونے کی وجہ سے وہ دنیا میں اس طرح رہنے لگے گویا وہ دنیا میں نہیں ہے۔ جب وہ دنیا کا کوئی آرام دیکھے تو یہ سوچ کر رو پڑے کہ معلوم نہیں آخرت میں کیا ہونے والا ہے۔ اور جب کوئی تکلیف اس کو ستائے تو اس کی زبان سے نکلے کہ خدایا، دنیا کی معمولی تکلیف تو برداشت نہیں ہوتی پھر آخرت کی تکلیف کس طرح برداشت ہوگی۔ جب دنیا کی لذتیں اس کو تسکین نہ دے سکیں اور دنیا کی مصیبتیں اس کی نگاہ میں حقیر بن جائیں۔

جن لوگوں کا یہ حال ہو جائے وہی وہ لوگ ہیں جو آخرت کے ماننے والے بنے۔ انھیں خوش نصیب روحوں کے لئے آخرت میں جنت کے دروازے کھولے جائیں گے۔

جنّتی عمل

جنتی عمل وہ ہے جو آدمی کے اندر جنت کے پھول کھلا رہا ہو، جس کو کرنے کے دوران آدمی کو خود بھی کچھ ملے۔ اگر آدمی بظاہر سرگرمیاں دکھا رہا ہو اور اس کا اپنا وجود کچھ پانے سے محروم ہو تو اس کی سرگرمیوں کی کوئی حقیقت نہیں۔ عمل وہی عمل ہے جس کے دوران آدمی کے ذہن میں شعور کی چنگاری پڑے۔ اس کے دل میں سوز و تڑپ کا کوئی لاوا ابلے۔ اس کی روح کے اندر کوئی کیفیاتی ہلچل پیدا ہو۔ اس کے اندرون میں کوئی ایسا حادثہ گزرے جو برتر حقیقتوں کی کوئی کھڑکی اس کے لئے کھول دے۔

آخرت کے پیمانہ میں اہمیت کی چیز یہ نہیں ہے کہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ اہمیت کی چیز یہ ہے کہ آپ کیا ہو رہے ہیں۔ اگر آپ کی مصروفیات بہت بڑھی ہوئی ہوں۔ اگر بتانے کے لئے آپ کے پاس بہت سے کارنامے ہوں مگر آپ کی اندرونی ہستی خالی ہو تو آپ کی مصروفیات محض بے فائدہ سرگرمیاں ہیں، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ ہوائیں ہوں مگر ان سے آکسیجن نہ ملے۔ پانی ہو مگر اس سے سیرابی حاصل نہ ہو۔ غذا ہو مگر اس سے آدمی کو قوت نہ ملے۔ سورج ہو مگر وہ روشنی نہ دے رہا ہو تو ایسا ہونا ہونا نہیں ہے بلکہ نہ ہونے کی بدترین شکل ہے۔

غیر جنتی انسان وہ ہے کہ جب وہ بولے تو اس کے الفاظ اس کے دل کی دھڑکن نہ بنیں۔ وہ عمل کرے مگر اس کا عمل اس کے دل کو نہ چھوئے۔ اس کے برعکس جنتی انسان وہ ہے جس کا عمل اس کے لئے روحانی تجربہ بن رہا ہو۔ اس کی ہستی کو کیفیت کی غذائیں مل رہی ہوں۔ اس کی ظاہری کارروائیاں اس کے اندرونی وجود میں ہلچل پیدا کرنے کا سبب بن جائیں۔

جنت کس کا حصہ ہے

جنت کسی کو سستے داموں نہیں مل سکتی ۔ یہ تو اسی خوش نصیب روح کا حصہ ہے جو حقیقی معنوں میں خدا کا مومن بندہ ہونے کا ثبوت دے ۔ مومن ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی اپنی دنیا دارانہ زندگی کے ساتھ کچھ عملیات کا جوڑ لگالے ۔ مومن ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اسلام ہی آدمی کی پوری زندگی بن جائے ۔ آدمی کا پورا وجود خدا کے دین میں نہا اٹھے ۔

مومن وہ ہے جس کے سینہ میں اسلام ایک نفسیاتی طوفان بن کر داخل ہو ۔ جو خدا کو اپنے اتنا قریب پائے کہ اس سے اس کی سرگوشیاں جاری ہو جائیں ۔ جس کی تنہائیاں خدا کے فرشتوں سے آباد رہتی ہوں ۔ جس کے دینی احساس نے اس کی زبان میں خدا کی لگام دے رکھی ہو ۔ جس کے ہاتھوں اور پیروں میں خدا کی بیڑیاں پڑی ہوئی ہوں ۔ جس کے اسلام نے اس کو حشر کی آمد سے پہلے حشر کے میدان میں کھڑا کر دیا ہو ۔

حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ کافر پر مرنے کے بعد گزرنے والا ہے ، وہ مومن پر جیتے جی اسی دنیا میں گزر جاتا ہے ۔ دوسرے لوگ جن باتوں کو اس وقت پائیں گے جب کہ خدا غیب کا پردہ پھاڑ کر سامنے آجائے گا ۔ مومن ان باتوں کو اس وقت پالیتا ہے جب کہ خدا ابھی غیب کے پردہ میں چھپا ہوا ہے ۔ مومن پر قیامت سے پہلے قیامت گزر جاتی ہے جب کہ دوسروں پر قیامت اس وقت گزرے گی جب کہ وہ عملاً ان کے اوپر آچکی ہوگی ۔

جنتی کون

جنتی وہ ہے جس پر جنت سے پہلے جنت کا تجربہ گزر جائے۔ یہ وہ شخص ہے جس نے دنیا میں ان کیفیات کو پالیا ہو جو آخرت میں اس کو جنت کا مستحق بنانے والی ہیں۔ جس کے رونگٹے کھڑے ہو کر اس کو خدائی محاسبہ کا احساس دلا چکے ہوں۔ جس کے قلب پر ٹکڑے کر دینے والی تجلیات کے نزول نے اس کو قربت خداوندی سے آشنا کیا ہو۔ جس نے بغض و انتقام کے جذبات کو اپنے اندر کچل کر عفوِ خداوندی کا مشاہدہ کیا ہو۔ جس نے اپنے ندامت کے آنسوؤں میں وہ منظر دیکھا ہو جب کہ ایک مہربان آقا اپنے خادم کے اعترافِ قصور پر اس سے درگزر فرماتا ہے۔ جس پر یہ لمحہ گزرا ہو کہ ایک شخص پر قابو پانے کے باوجود وہ اس کو اس لئے چھوڑ دے کہ اس کا خدا بھی اس دن اُسے چھوڑ دے جب کہ وہ بالکل عاجز ہو کر اس کے سامنے کھڑا ہوا ہوگا۔ جو اختیار کے باوجود اپنی زبان کو صرف خدا کی خاطر روک لے۔ جو حق کے آگے اس طرح گر پڑے جیسے لوگ آخرت میں خدا کو دیکھ کر ڈھ پڑیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ مومن جنت کا ایک پھول ہے۔ وہ موجودہ دنیا میں آنے والی دنیا کا ایک ابتدائی شگوفہ ہے۔ مومن پر وہ سارے تجربات اسی دنیا میں گزر جاتے ہیں جو دوسروں پر موت کے بعد گزرنے والے ہیں۔ آدمی کی زندگی میں مختلف قسم کے جو حالات پیش آتے ہیں انھیں میں ہر آدمی کی جنت اور جہنم چھپی ہوئی ہوتی ہے۔ ان حالات میں کوئی شخص شیطان کا انداز اختیار کر کے جہنم کا مستحق ہو جاتا ہے اور کوئی شخص فرشتوں کا انداز اختیار کر کے جنت کا۔

قیمت نہ دینا

جنت کی قیمت آدمی کا اپنا وجود ہے۔ جو شخص اپنے وجود کو اللہ کے لئے قربان کرے گا وہی جنت کو پائے گا۔ وجود کی قربانی دئے بغیر جنت کا حصول ممکن نہیں۔

ہر آدمی کی زندگی میں وہ لمحہ آتا ہے جب کہ خدا کا دین اس سے کسی قسم کی قربانی مانگتا ہے ـــــ نفس کی قربانی، شخصیت کی قربانی، مال کی قربانی، زندگی کی قربانی۔ ایسے مواقع پر جو شخص مطلوبہ قربانی پیش کر دے وہ خدا کے انعام کا مستحق ہوگیا۔ جو شخص ہچکچا کر رک جائے وہ خدا کی نعمتوں سے ہمیشہ کے لئے محروم ہوگیا۔

جنت اتنی زیادہ قیمتی ہے کہ ہماری کوئی بھی چیز اس کا بدل نہیں بن سکتی۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے ایک بہت معمولی چیز کو اس کی قیمت بنا دیا ہے۔ یہ ہماری قربانی ہے۔ آدمی اور جنت کے درمیان بس اتنا ہی فاصلہ ہے کہ وہ خدا کی راہ میں اپنی بے قیمت جان کو پیش کر دے۔ وہ اس مقصد کے لئے اپنے حقیر مال کو لٹا دے۔ وہ خدا کے کام میں اپنی مختصر عمر کو صرف کر دے ـــــ سچائی کو مان لینا قربانی ہے۔ اپنے اثاثہ کو اللہ کے لئے دینا قربانی ہے۔ اپنے وقت اور قوت کو خدا کی راہ میں لگانا قربانی ہے۔ اپنے خلاف مزاج بات کو خدا کی خاطر سہہ لینا قربانی ہے۔

کتنی بڑی چیز کی یہ کتنی چھوٹی قیمت ہے۔ مگر آدمی یہ معمولی قیمت دینے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ آدمی اپنی مختصر زندگی گزار کر اس حال میں دنیا سے چلا جاتا ہے کہ اس نے جنت کی قیمت ادا کرنے کے لئے کچھ نہیں کیا تھا۔

جنتی اعمال

آخرت میں جنت کی لذتیں اس شخص کو ملیں گی جس کے لئے جنت والے اعمال اسی دنیا میں لذیذ بن گئے ہوں۔ جب آدمی کا حال یہ ہو جائے کہ وہ دنیا کے دکھائی دینے والے سہاروں سے زیادہ خدا کے نہ دکھائی دینے والے سہارے پر بھروسہ کرنے لگے۔ دنیوی چیزوں کی محبت سے زیادہ خدا کی محبت اس کو عزیز ہو اور دنیوی چیزوں کے خوف سے زیادہ خدا کا خوف اس کے لئے اہمیت رکھتا ہو۔ رسول کے بتائے ہوئے طریقہ کو قبول کرنا اس کو ہر حال میں پسند ہو، خواہ وہ اس کے ذوق کے خلاف کیوں نہ ہو۔ وہ دنیا کی مصلحتوں کے بجائے آخرت کی مصلحتوں کو اہمیت دے۔ حق کو نظر انداز کرنے کے مقابلہ میں حق کو مان لینا اس کی نظر میں زیادہ محبوب بن جائے۔ بے فکری کے ساتھ قہقہہ لگانے سے بڑھ کر تسکین اس کے دل کو اس وقت ملتی ہو جب کہ وہ اللہ کے لئے آنسو بہا رہا ہو۔ وقار کا سوال اگر سچی بات کو قبول کرنے میں رکاوٹ بنے تو وہ اپنے وقار کو مجروح کر کے سچائی کا طریقہ اختیار کرنے پر تیار ہو جائے۔

جب اس کو کسی سے شکایت ہو جائے تو اس سے انتقام لینے کے بجائے اس کو معاف کر دینے میں اس کا دل ٹھنڈک پاتا ہو۔ حقوق کو غصب کرنے سے زیادہ اس کو یہ بات پسند ہو کہ وہ دوسروں کے حقوق ادا کرے۔ جب اس کے سینہ میں حسد اور بغض کے جذبات بھڑک اٹھیں تو ان کو ظاہر کرنے کے بجائے ان کو کچل ڈالنا اس کو زیادہ محبوب ہو۔ کسی کے خلاف بری رائے قائم کرنے سے زیادہ اس کو یہ بات پسند ہو کہ وہ اس کے بارے میں اچھی رائے قائم کرے۔

جنت کا مسافر

خدا کا مطالبہ یہ ہے کہ بندہ اپنے تمام اثاثہ کو خدا کے حوالے کر دے۔ اس کے معاوضہ میں خدا نے آخرت میں اپنی جنت کا وعدہ کیا ہے۔

آدمی اکثر اپنے آپ کو بچا کر رکھتا ہے اور اس کے جواب میں دشواریوں کی ایک فہرست پیش کر دیتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہی دشواریاں وہ قیمتی مواقع ہیں جن کو عذر نہ بنا کر وہ اپنے رب کو خوش کر سکتا ہے۔ آدمی جن مسائل کی بنا پر اسلام کی طرف بڑھنے سے رکتا ہے وہی دراصل اس کے لئے ترقی کے زینے ہوتے ہیں۔ وہ اس لئے نہیں ہیں کہ آدمی ان کو دیکھ کر رک جائے، وہ اس لئے ہیں تاکہ آدمی انھیں پھاند کر آگے بڑھ جائے۔ وہ ان کو خدا تک پہنچنے کا زینہ بنا لے۔

خدا کے نزدیک اس کا سب سے محبوب بندہ وہ ہے جو اپنی تمناؤں کو اس کے لئے دفن کر دے۔ جو اپنے آرام کو اس کی خاطر چھوڑ دے۔ جو اپنی مشکلات کو نظر انداز کر کے اس کی طرف بڑھ جائے۔ دنیا میں کسی کی کامیابی یہ نہیں ہے کہ وہ یہاں کچھ حاصل کرے۔ کامیاب دراصل وہ ہے جو خدا کی راہ میں اپنا سب کچھ قربان کر دے۔

سب سے زیادہ صحت مند وہ ہے جس کی صحت خدا کی راہ میں برباد ہو گئی ہو۔ سب سے زیادہ صاحب مال وہ ہے جو خدا کی خاطر بے مال ہو جائے۔ سب سے زیادہ بلند مرتبہ وہ ہے جو خدا کے لئے بے مرتبہ ہو گیا ہو۔ سب سے زیادہ خوش نصیب وہ شخص ہے جو بالکل لٹا ہوا اپنے رب کے پاس پہنچے، کیونکہ اس کا رب اپنی رحمتوں کو اس کے اوپر انڈیل دے گا۔

جنتی اخلاقیات

خدا کو اپنی جنتی دنیا میں بسانے کے لئے کیسے انسان مطلوب ہیں، اس کا نمونہ اس نے موجودہ کائنات میں قائم کر دیا ہے۔ جو آدمی خدا کی ابدی نعمتوں میں حصہ دار بننا چاہتا ہو اس کو چاہئے کہ وہ خدا کی پسند کو اپنی پسند بنائے، وہ خدا کی تابعداری میں بقیہ کائنات کا ہم سفر بن جائے۔

کائنات میں جو واقعہ لوہے کی صورت میں پایا جاتا ہے وہ انسانی سطح پر بے لچک کردار کی صورت میں مطلوب ہے۔ جو چیز پتھریلی زمین سے پانی کی صورت میں بہہ نکلتی ہے وہ انسان سے نرم مزاجی کی صورت میں مطلوب ہے۔ فطرت میں جو چیز اٹل قوانین کی صورت میں پائی جاتی ہے وہ انسان سے عہد کی پابندی کی صورت میں مطلوب ہے۔ مادی دنیا میں جو چیز مہک اور لذت اور رنگ کی صورت میں پائی جاتی ہے وہ انسان سے خوش معاملگی کی صورت میں مطلوب ہے۔ خلا میں کھربوں ستارے مسلسل حرکت کرتے ہیں مگر ان میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ یہی واقعہ انسان کی زندگی میں اس طرح مطلوب ہے کہ ہر آدمی اپنے اپنے دائرہ میں اس طرح سرگرم ہو کہ ایک اور دوسرے کے درمیان ٹکراؤ کی نوبت نہ آئے۔ درخت کاربن لے لیتا ہے اور آکسیجن ہماری طرف لوٹاتا ہے۔ یہی چیز انسانی سطح پر اس اخلاقی اصول کی صورت میں مطلوب ہے کہ جو تمھارے ساتھ برا سلوک کرے اس کے ساتھ تم اچھا سلوک کرو۔ پہاڑ اور تمام کھڑی ہوئی چیزیں اپنا سایہ زمین پر ڈال دیتی ہیں، یہی چیز انسانی زندگی میں اس طرح مطلوب ہے کہ ہر آدمی تواضع اختیار کرے۔ کوئی کسی کے اوپر فخر نہ کرے، کوئی دوسرے کے مقابلہ میں اپنے کو بڑا نہ سمجھے۔

جنت والے

جو لوگ خدا کی کتاب کی بنیاد پر کھڑے ہوں ان پر خدا کے خصوصی انعامات ہوتے ہیں اور آخرت میں ان کے لئے جنت کی بشارتیں دی جاتی ہیں۔ مگر یہ انعامات کسی نسل یا قوم سے تعلق کی بنیاد پر نہیں ہوتے بلکہ صرف کردار کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ بعد کے دور میں اس گروہ کے افراد اس فرق کو بھول جاتے ہیں۔ اب لوگ یہ یقین کر لیتے ہیں کہ وہ خواہ عمل کریں یا نہ کریں خدا کے وعدے ان کے حق میں ضرور پورے ہوں گے۔ وہ ضرور خدا کی ابدی جنتوں میں داخل ہوں گے۔

آسمانی کتاب کی حامل قوم میں جب دین کی اصل روح زندہ ہو تو اس کے اندر حقیقت پسندی کا مزاج پیدا ہوتا ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ خدا کے عادلانہ قانون میں اندھیر نہیں ہے۔ وہاں کسی کو وہی کچھ ملے گا جو اس نے کیا ہے نہ اس سے زیادہ اور نہ اس سے کم۔

اس کے برعکس جب دین کی اصل روح مٹ جاتی ہے تو خوش خیالیاں جنم لیتی ہیں۔ لوگ حقیقی عمل کے بجائے فرضی امیدوں میں جینے لگتے ہیں۔ وہ سمجھ لیتے ہیں کہ محض ایک خاص گروہ سے وابستہ ہونے کی بنا پر وہ جنتوں میں داخل کر دئے جائیں گے خواہ وہ عمل کریں یا نہ کریں۔

آخرت کی سرفرازیاں ان لوگوں کے لئے ہیں جنھوں نے دنیا میں عدل خداوندی کی سطح پر زندگی گزاری ہو۔ جنھوں نے خدائی حقیقتوں سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کیا ہو۔ جو دوزخ کے سامنے آنے سے پہلے دوزخ سے بھاگے ہوں اور جنت کو دیکھنے سے پہلے جنت کی طرف دوڑ پڑے ہوں۔

جب آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی

خدا جب اپنے بندے کے کسی عمل کو قبول کرتا ہے تو اس وقت حیرت انگیز طور پر کچھ ملکوتی قسم کی کیفیات آدمی کے اوپر گزرتی ہیں۔ یہ اس جنت کا تعارف ہے جس کا وعدہ سچے بندوں سے کیا گیا ہے۔ یہ باغ بہشت کی خوشبو ہے جس کو اہل ایمان دنیا کے اندر پاتے ہیں۔ یہ کیفیات اگرچہ تڑپ کی صورت میں ہوتی ہیں مگر وہ تمام لذتوں سے زیادہ لذیذ ہیں۔

جب آدمی کو ایسا صدقہ کرنے کی توفیق ملتی ہے جبکہ وہ انسان کو دے کر خدا سے پا رہا ہو۔ جب اس کو ایسی تلاوت نصیب ہوتی ہے جب کہ خدا کے کلام کا تاثر اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی صورت میں بہہ پڑے۔ جب اس پر ایسے دردانگیز لمحات گزرتے ہیں جس میں وہ قربت خداوندی کا تجربہ کرتا ہے۔ جب وہ بے قرار دل اور کپکپاتے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ اپنے رب کو ایسے الفاظ میں پکارنے لگتا ہے جو خود اس کے رب کی طرف سے اس کے قلب پر اتارے گئے ہوں تو یہ سب اللہ کا رزق ہوتا ہے جو اس کو روحانی ذریعوں سے پہنچتا ہے۔ وہ ان جنتی پھلوں میں سے ایک پھل کا مزہ چکھتا ہے جو خدا نے اپنے نیک بندوں کے لئے چھپا رکھے ہیں۔ آج یہ پھل ایمانی کیفیات کی صورت میں ملتے ہیں اور کل وہ جنت کے ابدی نعامات کی صورت میں اس کے حوالے کئے جائیں گے۔

دنیا میں اگر آپ خدا سے قریب نہیں ہوئے تو آخرت میں آپ کو خدا کی قربت کس طرح مل سکتی ہے۔ جس کی عبادت دنیا میں اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک نہیں بنی اس کو آخرت کی وہ نعمتیں کس طرح ملیں گی جن کو پا کر ہمیشہ کے لئے اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔

جنت کا پھول

مومن جنت کا پھول ہے۔ اس کی خوشبو دنیا کی زندگی میں ربانی اخلاقیات کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے اور آخرت میں وہ مادی نعمتوں کی صورت میں ڈھل جائے گی۔ جس کا دوسرا نام جنت ہے۔

مومن وہ ہے جس کا لگاؤ آخرت کے معاملہ میں اتنا بڑھے کہ دنیا کی چیزوں کے بارہ میں وہ بے نفس ہو جائے۔ دوسروں کی طرف سے جب اس کے دل پر چوٹ لگے تو وہ اس کو برداشت کرے۔ اس کو اپنی کمیوں کا اتنا زیادہ احساس ہو کہ دوسروں کی طرف سے کی جانے والی تنقید کو وہ برا نہ مانے۔ دوسرے اس کو بے عزت کریں تو خدا کی خاطر وہ اس کو نظر انداز کر دے۔ اس کا دل خدا کے سمندر میں نہا کر اتنا صاف ہو جائے کہ وہ دوسروں کی زیادتیوں پر ان کو معاف کر سکے اور ان کی تلخ باتوں کو بھلا دیا کرے۔ حتیٰ کہ اس کے دل کا یہ حال ہو جائے کہ تکلیف پہنچانے والوں کے لئے اس کی زبان سے دعائیں نکلنے لگیں۔

یہی وہ روح ہے جو اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے اور یہی وہ لوگ ہیں جو آخرت میں جنت کی دنیا کے شہری بنائے جائیں گے۔ جنت کی دنیا پھولوں جیسی لطیف دنیا ہے، صرف لطیف روحیں ایسی دنیا میں جگہ پا سکتی ہیں۔ جو لوگ اپنے آپ کو منفی جذبات اور ردعمل کی نفسیات سے اوپر نہ اٹھا سکیں وہ گویا کانٹوں کی سطح پر جی رہے ہیں۔ ایسے لوگ پھولوں کے پڑوسی کس طرح بن سکتے ہیں۔

لوگ جنت سے کتنا دور ہیں پھر بھی وہ اپنے کو جنت سے کتنا قریب سمجھتے ہیں۔

ربانی اوصاف

جنت ایک مثالی دنیا ہے جو مخصوص خدائی اہتمام کے تحت بنائی جائے گی۔ موجودہ دنیا دکھ اور محنت کی دنیا ہے اور موت کے بعد آنے والی دنیا خوشیوں اور لذتوں کی دنیا۔ موجودہ دنیا میں وہ انسان چنے جارہے ہیں جو آنے والی ابدی دنیا میں بسائے جانے کے قابل ہوں۔

اگلی دنیا میں عزت و مسرت کے لازوال مکانات میں بسانے کے لئے وہ لوگ مطلوب ہیں جو اخلاق خداوندی کو اپنا اخلاق بنائیں۔ اخلاق خداوندی کیا ہے، اس کے نمونے آج کی دنیا میں انسان کے چاروں طرف پھیلا دئے گئے ہیں۔

یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے دل و دماغ میں پہاڑوں کی بلندیاں اور سمندروں کی وسعتیں لئے ہوئے ہوں۔ جو ہواؤں کی مانند لوگوں سے ٹکرائے بغیر ان کے بیچ سے گزر جانے والے ہوں۔ جو ستاروں اور سیاروں کی طرح خاموش سفر کرنا جانتے ہوں جو سورج کی طرح اپنوں اور غیروں کے اوپر یکساں چمکنے والے ہوں۔ جو پھول کی طرح شہرت اور نمائش سے بے نیاز ہوکر کھلنا جانتے ہوں۔ جو دریا کی مانند حسد اور نفرت سے خالی ہوکر زمین کے سینہ پر بہہ رہے ہوں۔ جو درخت کی طرح ساری کائنات کو اپنے لئے ربانی غذا کا دسترخوان بنا چکے ہوں۔ جو زمین پر پڑے ہوئے سایہ کی طرح کبر و غرور سے خالی ہوکر اپنے آپ کو اللہ کے آگے ڈال دینے والے ہوں۔

جو لوگ آج کی دنیا میں ان ربانی خصوصیات کے حامل بنیں وہی وہ لوگ ہیں جو آنے والی جنتی دنیا کے مالک ہوں گے۔

خدا کے لئے جھکنے والے

خدا کو اپنی جنت میں بسانے کے لئے وہ حقیقت پسند انسان مطلوب ہے جو خدا کو نہ دیکھتے ہوئے بھی دنیا میں اس طرح رہے جیسے کہ وہ اس کو دیکھ رہا ہے۔ خدا کی بڑائی اور اس کے کمالات، اس کے ذہن پر اس طرح چھا جائیں کہ وہ اس کو ہر وقت یاد آنے لگے۔ اس کا دل ہر وقت خدا کی باتوں سے سرشار رہے اور اس کی پوری زندگی خدا کے گرد گھومنے لگے۔

جنت کی حسین دنیا میں رہنے کا اہل صرف وہ ہے جو خدا کو اس طرح اپنا معبود بنالے کہ وہی اس کی زندگی بن جائے۔ جو اپنے شعور کو اس حد تک ترقی دے کہ اپنے آپ کو اپنے سے الگ ہو کر دیکھنے لگے۔ جو خود مختار ہو کر بھی پابند زندگی گزارے۔ جو آزاد ہو کر بھی اپنی آزادی کو مقرر دائرہ میں استعمال کرے۔

یہ بلند نظری اور حقیقت پسندی کا وہ مقام ہے جہاں آدمی نفسیاتی پردوں سے باہر آکر سوچتا ہے۔ جہاں وہ اپنے آپ کو ذاتی نگاہ سے نہیں بلکہ حقیقتِ واقعہ کی نگاہ سے دیکھنے لگتا ہے۔ جہاں وہ مجبور نہ ہوتے ہوئے بھی ہمہ تن اپنے آپ کو اپنے آقا کے آگے جھکا دیتا ہے۔ جہاں مخالف ترغیبات کے باوجود وہ اپنے آپ کو اللہ کی حدود پر قائم رکھتا ہے۔ جہاں ڈھٹائی کے مواقع ہوتے ہوئے بھی وہ سرتاپا اپنے کو حق کے آگے ڈال دیتا ہے۔ مالک کائنات کے ظہور کے بعد لوگوں کا جو حال ہوگا وہ حال اس کا اسی وقت ہو جاتا ہے جب کہ مالک کائنات ابھی غیب کے پردہ میں چھپا ہوا ہے۔

جنتی کردار

جنت کی لطیف دنیا میں بسنے کے قابل وہ لوگ ہیں جن کا یہ حال ہو کہ ان کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آئے تو وہ مایوس نہ ہوں بلکہ صبر کا طریقہ اختیار کریں۔ کسی سے ان کو تکلیف پہنچے تو اس کے حق میں دعائیں دیں۔ کسی سے معاملہ پڑے تو انصاف کے مطابق اس کے حقوق ادا کریں۔ کوئی تنقید کرے تو اس کو برا مانے بغیر ٹھنڈے دل سے سن لیں۔ کسی سے شکایت ہو تب بھی اس کے بارے میں انصاف کا رویہ نہ چھوڑیں۔ جب بھی کسی سے معاملہ پڑے تو دوسرے شخص کو ان سے بہتر سلوک کا تجربہ ہو۔

مومن وہ ہے جو دنیا کی زندگی میں خدا کا ایسا پھول بن جائے جو اپنی کثافت کو بھی مہک کی صورت میں ظاہر کرتا ہے۔ ایسی پاک زندگی گزارنے کی توفیق ان لوگوں کو ملتی ہے جو اللہ کو اس طرح یاد کرنے لگیں جس طرح کوئی آدمی سانس لیتا ہے۔ وہ اللہ کو اس طرح پالیں کہ وہ ان کی روح کے اندر تیر جائے، وہ ان کی دل کی دھڑکنوں میں شامل ہو جائے، وہ اللہ کے خوف و محبت میں نہا اٹھیں۔

جہاں لوگوں میں سرکشی بھڑکتی ہے، مومن تواضع سے جھک جاتا ہے۔ جب نفرت امنڈتی ہے وہ محبت کا رویہ اختیار کرتا ہے۔ جب بدخواہی کا موقع ہو تو وہ خیرخواہی کا ثبوت دیتا ہے۔ جہاں حقوق دبائے جاتے ہیں وہ انصاف کے ساتھ حقوق لوٹاتا ہے۔ جب اعتراف کرنے میں وقار گرتا ہے تو وہ سچائی کا اعتراف کر لیتا ہے۔ جب جوابی کارروائی کا ذہن ابھرتا ہے تو اس وقت بھی وہ وہی کرتا ہے جو انصاف کے مطابق ہو۔

داعی خدا کا نمائندہ

خدا کا داعی خدا کے سمندر میں نہاتا ہے۔ وہ خدا سے الفاظ پا کر بولتا ہے۔ اس طرح اس کے لئے ممکن ہوتا ہے کہ وہ خدا کی دنیا میں خدا کے گیت گائے۔ وہ فطرت کے ساز پر خدا کے ابدی نغمے چھیڑے۔ مگر انسان اتنا غافل ہے کہ پھر بھی وہ اس سے کوئی اثر نہیں لیتا۔ پھر بھی وہ اپنے بند سینہ کو نہیں کھولتا۔

خدا کی طرف سے ایک پکارنے والے کا وجود میں آنا کسی مشین پر بجنے والے ریکارڈ کا وجود میں آنا نہیں ہے۔ یہ روح انسانی میں ایک ایسے انقلاب کا برپا ہونا ہے جس کی شدت جوالا مکھی پہاڑوں سے بھی زیادہ سخت ہوتی ہے۔ داعی کا بولنا اپنے جگر کے ٹکڑوں کو باہر لانا ہوتا ہے۔ اس کا لکھنا اپنے خون کو سیاہی بنانے کے بعد وجود میں آتا ہے۔ اس کے نغمے محض نغمے نہیں ہوتے بلکہ روح انسانی میں ایک لطیف ترین خدائی بھونچال کی آواز ہوتے ہیں۔

مگر اس دنیا کا یہ سب سے زیادہ عجیب واقعہ ہے کہ ایسے ربانی کلمات بھی انسان کو نہیں پگھلاتے۔ داعی اپنے پورے وجود کے ساتھ نذیر عریاں بن جاتا ہے اس کے باوجود آدمی اندھا بہرا بنا رہتا ہے۔ انسان کے سامنے جنت کی کھڑکیاں کھولی جاتی ہیں مگر وہ وجد میں نہیں آتا۔ اس کو بھڑکتے ہوئے جہنم کا نقشہ دکھایا جاتا ہے پھر بھی اس پر گریہ طاری نہیں ہوتا۔ اس کے سامنے خدا خود آکر کھڑا ہو جاتا ہے اس کے باوجود وہ سجدہ میں نہیں گرتا۔

انسان سے زیادہ نازک مخلوق خدا نے کوئی نہیں بنائی مگر انسان سے زیادہ بے حسی کا ثبوت بھی اس دنیا میں کوئی نہیں دیتا۔

REGD. NO. D. (DN) 532 JUNE 1982

AL-RISALA MONTHLY

JAMIAT BUILDING QASIMJAN STREET DELHI-110006 (INDIA) PHONE 232231

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

۱۔ الاسلام	۱۵—۰
۲۔ مذہب اور جدید چیلنج	۱۵—۰
۳۔ ظہور اسلام	۱۵—۰
۴۔ دین کیا ہے ؟	۲—۰
۵۔ قرآن کا مطلوب انسان	۵—۰
۶۔ تجدید دین	۳—۰
۷۔ اسلام دین فطرت	۳—۰
۸۔ تعمیر ملت	۳—۰
۹۔ تاریخ کا سبق	۳—۰
۱۰۔ مذہب اور سائنس	۵—۰
۱۱۔ عقلیات اسلام	۳—۰
۱۲۔ فسادات کا مسئلہ	۲—۰
۱۳۔ انسان اپنے آپ کو پہچان	۱—۰
۱۴۔ تعارف اسلام	۲—۵۰
۱۵۔ اسلام پندرھویں صدی میں	۲—۰
۱۶۔ راہیں بند نہیں	۳—۰
۱۷۔ دینی تعلیم	۳—۰
۱۸۔ ایمانی طاقت	۳—۰
۱۹۔ اتحاد ملت	۳—۰
۲۰۔ سبق آموز واقعات	زیر طبع
۲۱۔ اسلامی تاریخ سے	۰
۲۲۔ قال اللہ	
۲۳۔ اسلامی دعوت	۳—۰
۲۴۔ زلزلۂ قیامت	۴—۰
۲۵۔ سچا راستہ	۔۰

سرپرست

مولانا وحید الدین خان

بڑے دل والا آدمی ہمیشہ کامیاب ہوتا ہے

اور چھوٹے دل والا آدمی ہمیشہ ناکام

قیمت فی پرچہ —— تین ۳ روپے

اسلامی مرکز کا ترجمان

الرسالہ

جولائی ۱۹۸۲
شمارہ ۶۸

جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دھلی ۱۱۰۰۰۶ (انڈیا)

علاقائی اجتماعات

اسلامی مرکز کے نمائندہ اجتماع بھوپال (۱۷-۱۸ اپریل ۱۹۸۲) میں متفقہ طور پر یہ بات طے کی گئی ہے کہ موجودہ سال کے دوران مختلف مقامات پر مرکز کے علاقائی اور مقامی اجتماعات کئے جائیں، اس کے بعد اگلے سال مرکز کا دوسرا سالانہ اجتماع کسی مناسب مقام پر منعقد کیا جائے۔ ان علاقائی یا مقامی اجتماعات میں حسب سہولت مولانا وحید الدین خاں صاحب (صدر اسلامی مرکز) اور مولانا حمید اللہ ندوی (سکریٹری اسلامی مرکز) شریک ہوں گے۔

جہاں جہاں الرسالہ کا حلقہ ہے یا اسلامی مرکز سے اتفاق کرنے والے لوگ ہیں، ان سے گزارش ہے کہ دفتر ماہنامہ الرسالہ کے پتہ پر خط و کتابت کرکے پروگرام طے فرمائیں

——— ادارۂ الرسالہ

منی آرڈر کوپن پر اپنا پورا پتہ تحریر فرمائیں۔ ہر خط و کتابت کے ساتھ خریداری نمبر یا ایجنسی نمبر کا حوالہ ضرور دیں

اسلامی مرکز

کے لئے

تعاون کی اپیل

اسلامی مرکز کا مقصد جدید تقاضوں کے مطابق اسلام کی اشاعت اور ملتِ اسلامیہ کی تعمیر ہے۔ اسلامی مرکز کے ساتھ تعاون کرنا اللہ کے راستے میں تعاون کرنا ہے۔

اسلامی مرکز پچھلے دس سال سے خاموش خدمت میں مصروف ہے۔ مگر یہ کام زیادہ تر انفرادی قربانی کے بل پر ہو رہا ہے۔ ابھی تک اس کے پاس اپنی کوئی عمارت نہیں۔ اس کے متعدد اہم شعبے وسائل کی کمی کی وجہ سے شروع نہ کئے جا سکے۔ وغیرہ

الرسالہ اور دوسرے کام جو جاری ہیں وہ تمام تر خسارے پر چلائے جا رہے ہیں۔ ان حالات میں اسلامی مرکز اپنے ہمدردوں کے تعاون کا شدید طور پر منتظر ہے۔ یاد رکھئے اسلامی مرکز کی اعانت وقت کی سب سے اہم دینی مد میں اعانت ہے۔

اس سلسلہ میں عمومی اعانت کے علاوہ زکوٰۃ وغیرہ کی رقمیں بھی بھیجی جا سکتی ہیں۔ رقم بھیجتے ہوئے اس کی مد کی ضرور صراحت فرمائیں

وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز
دفتر الرسالہ متصل۔ جمعیۃ بلڈنگ
قاسم جان اسٹریٹ۔ دہلی ۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انسان نے ہمیشہ خدا کو سمجھنے میں بھی غلطی کی ہے اور اپنے آپ کو سمجھنے میں بھی۔ اس نے خدا کو اپنے جیسا سمجھ لیا اور اپنے آپ کو خدا جیسا۔ یہی ہر دور کے انسان کی غلطی رہی ہے۔ ساری انسانی تاریخ اسی غلطی اور اس کے نتائج کی داستان ہے۔

خدا کو اپنے جیسا سمجھنا یہ ہے کہ خدا کو انسانی سطح پر اتار لایا جائے۔ الحاد اور شرک کی تمام قسمیں اسی غلطی کی پیداوار ہیں۔ الحاد بھی خدا کو انسان پر قیاس کرنے کا دوسرا نام ہے اور شرک بھی۔

انسان ہمیشہ باپ اور ماں کے ذریعہ پیدا ہوتا ہے، وہ کسی جننے والے کے ذریعہ جنا جاتا ہے۔ اس بنا پر گمان کر لیا گیا کہ خدا اگر ہے تو اس کو جننے والا بھی کوئی ہونا چاہئے۔ کسی کو خدا سے پہلے ہونا چاہئے جو خدا کو وجود بخشے۔ اب چونکہ انسان کو خدائے لم یزل کا پیدا کرنے والا کوئی نظر نہ آیا اس لئے اس نے خدا کے وجود کا انکار کر دیا۔ انسان اپنی تخلیق کی صورت میں اپنے خالق کو دیکھ رہا تھا۔ مگر وہ اپنے ایک غلط مفروضہ کی وجہ سے اس کو ماننے پر تیار نہ ہوا۔

جن لوگوں نے خدا کو مانا انھوں نے یہی غلطی دوسرے انداز سے کی۔ انھوں نے دیکھا کہ انسان جب کوئی کام انجام دیتا ہے تو بہت سے لوگوں کی مدد سے انجام دیتا ہے۔ اس بنا پر انھوں نے خدا کے بھی شریک اور مددگار فرض کر لئے۔ انسان کے یہاں بڑے لوگوں کی سفارشیں چلتی ہیں۔ چنانچہ مان لیا گیا کہ خدا کے بھی کچھ مخصوص اور قریبی لوگ ہیں جو خدا کے دربار میں اثر رکھتے ہیں اور خدا ان کی سفارشیں قبول کرتا ہے۔ انسان جذبات سے مغلوب ہوتا ہے۔ وہ اکثر حق کے تقاضوں کو چھوڑ کر جذباتی میلان کے تحت فیصلے کرتا ہے۔ اس پر قیاس کرتے ہوئے یہ عقیدہ بنا لیا گیا کہ خدا محض گروہی تعلق کی بنیاد پر کچھ لوگوں سے ایسا معاملہ کرتا ہے جو معاملہ وہ دوسرے گروہ سے تعلق رکھنے والوں کے ساتھ نہیں کرتا۔ اس قسم کا ہر عقیدہ خدا کی خدائی کی نفی ہے۔ مگر انسان اپنی نادانی سے اکثر اپنے ذہن میں ایسے متضاد خیالات کو جمع کر لیتا ہے جن کا بیک وقت درست ہونا ممکن نہیں۔

اپنے آپ کو خدا جیسا سمجھنا یہ ہے کہ آدمی یہ گمان کرے کہ وہ اپنی تقدیر کا مالک آپ ہے۔ وہ آزاد ہے کہ جو چاہے کرے اور جو چاہے نہ کرے۔ وہ اپنی زندگی کا اصول آپ وضع کرے اور اپنے حلال و حرام کو خود اپنی عقل سے متعین کرے۔ اس قسم کی ہر کوشش گویا اپنے آپ کو خدا کے مقام پر بٹھانا ہے، جو چیز صرف خدا کا حق ہے اس کا حق دار اپنے آپ کو سمجھنا ہے۔ مگر ایسا ہر گمان اس کائنات میں سراسر باطل ہے۔ کیونکہ انسان صرف ایک عاجز مخلوق ہے، وہ کسی بھی اعتبار سے خالق کا درجہ حاصل نہیں کر سکتا۔

وحید الدین   ۱۴ مارچ ۱۹۸۲

جنت کا دروازہ

امام ابن تیمیہ کا قول ہے: دنیا میں بھی ایک جنت ہے، جو شخص دنیا کی جنت کا ذائقہ نہیں چکھے گا وہ آخرت کی جنت میں نہیں جا سکتا (ان فی الدنیا جنۃ من لم یذقھا لم یدخل جنۃ الآخرۃ) دنیا کی جنت یہ ہے کہ وہ اعمال جو آدمی کو آخرت کی جنت میں لے جانے والے ہیں وہ اس کے لئے محبوب بن جائیں۔ جنت میں داخلہ جس طرح آدمی کے لئے انتہائی پسندیدہ ہوگا اسی طرح جنت والے اعمال میں اس کو لذت اور اطمینان حاصل ہونے لگے۔

دنیا کی جنت یہ ہے کہ آدمی دنیا کے دکھائی دینے والے سہاروں سے زیادہ خدا کے نہ دکھائی دینے والے سہارے پر بھروسہ کرنے لگے۔ دنیا کی محبتوں سے زیادہ خدا کی محبت اس کو عزیز ہو اور دنیا کے خوف سے زیادہ خدا کا خوف اس کے لئے اہمیت رکھتا ہو۔ رسول کے بتائے ہوئے طریقے کو قبول کرنا اس کو ہر حال میں پسند ہو خواہ وہ اس کے خلاف کیوں نہ جاتا ہو۔ وہ دنیا کی مصلحتوں کے بجائے آخرت کی مصلحتوں کو اہمیت دے۔ حق کو نظر انداز کرنے کے مقابلہ میں حق کو مان لینا اس کی نظر میں زیادہ محبوب بن جائے۔ بے فکری کے ساتھ قہقہہ لگانے سے بڑھ کر تسکین اس کے دل کو اس وقت ملتی ہو جب کہ وہ اللہ کے لئے آنسو بہا رہا ہو۔ وقار کا سوال اگر سچی بات کو قبول کرنے میں مانع ہو تو اپنے وقار کو مجروح کر کے وہ سچائی کا طریقہ اختیار کرنے پر راضی ہو جائے۔

جب اس کو کسی سے شکایت ہو تو انتقام لینے کے بجائے اس کو معاف کر دینے میں اس کا دل ٹھنڈک پاتا ہو۔ حقوق کو غصب کرنے سے زیادہ اس کو یہ بات پسند ہو کہ وہ دوسروں کے حقوق ادا کرے۔ جب اس کے سینہ میں حسد اور بغض اور گھمنڈ کے جذبات بھڑکیں تو ان کو ظاہر کرنے کے بجائے ان کو کچل ڈالنا اس کو زیادہ مرغوب ہو۔ کسی کے خلاف بری رائے قائم کرنے سے زیادہ اس کو یہ بات پسند ہو کہ وہ اس کے بارے میں اچھی رائے قائم کرے۔

جنت میں جینا یہ ہے کہ آدمی جنتی اعمال میں جی رہا ہو۔ وہ صبر و شکر کا طریقہ اپنائے ہوئے ہو۔ اس کو عجز و تواضع میں لذت ملتی ہو۔ وہ نمائشی کاموں کے بجائے خاموش کاموں میں رغبت رکھتا ہو۔ وہ اپنی آنکھ اور اپنی زبان پر خدا کی نگرانی قائم کئے ہوئے ہو۔ جس آدمی کا حال یہ ہو کہ وہ جنتی اعمال میں اپنے لئے کشش پاتا ہو وہ گویا جنت کی فضاؤں میں جی رہا ہے۔ اور جس آدمی کا حال یہ ہو کہ اس کے برعکس اعمال اس کی دلچسپی کا باعث بنے ہوئے ہوں وہ گویا جہنم میں اپنے صبح و شام بسر کر رہا ہے۔

روزہ کی حقیقت

حدیث میں آیا ہے کہ اللہ نیکیوں کا بدلہ دس گنے سے لے کر سات سو گنے تک دیتا ہے۔ مگر روزہ خاص اللہ کے لئے ہے اور وہی اس کا (بے حساب) بدلہ دے گا۔ دوسری طرف حدیث میں ہے کہ بہت سے روزہ دار ایسے ہیں جن کو اپنے روزہ سے بھوک پیاس کے سوا اور کچھ نہیں ملتا۔

ایک روزہ اور دوسرے روزہ میں اس فرق کی وجہ کیا ہے جب کہ بظاہر ہر آدمی کا روزہ یکساں ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ روزہ کی جو ظاہری شکل ہے وہی اصل روزہ نہیں ہے بلکہ وہ اصل روزہ کی ایک علامت ہے۔ ایک شخص وہ ہے جو علامتی روزہ کو اس کی اصل حقیقت کے ساتھ رکھتا ہے، وہ خدا کے یہاں اس کا بہت بڑا اجر پائے گا۔ اس کے برعکس معاملہ اس شخص کا ہے جو علامتی روزہ کا اہتمام کرے اور حقیقی روزہ کو چھوڑ دے، ایسے آدمی کے روزہ کی خدا کے یہاں کوئی قیمت نہیں۔ جو چیز علامتی نوعیت رکھتی ہو اس کی قدر و قیمت کا تعین ہمیشہ اس کی حقیقت کے اعتبار سے ہوتا ہے نہ کہ محض اس کی ظاہری صورت کے اعتبار سے۔

روزہ کی ظاہری صورت کھانا پینا چھوڑ دینا ہے۔ یہ "چھوڑنا" اس بات کی علامت ہے کہ بندہ خدا کے حکم کے ماتحت ہے۔ وہ ہر اس چیز کو چھوڑنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے جس کو چھوڑنے کا خدا اسے حکم دے۔ حتیٰ کہ اگر وہ حکم دے تو وہ کھانے پینے جیسی ضروری چیزیں بھی اس کی خاطر چھوڑ دے گا۔

اب ظاہر ہے کہ جو شخص ایک مہینہ کے مخصوص اوقات میں کھانا پینا چھوڑ دے۔ مگر خدا کی دوسری منع کی ہوئی چیزوں، مثلاً جھوٹے بول اور جھوٹی کارروائیاں نہ چھوڑے، اس نے گویا علامتی حکم کی تو پیروی کی مگر جو اصلی حکم تھا اس کو نظر انداز کر دیا۔ ایسا آدمی کسی انعام کا مستحق نہیں ہو سکتا۔

روزہ دار دراصل وہ ہے جس کا روزہ اس کی پوری زندگی کا روزہ بن جائے، جو تمام معاملات میں اس کے اوپر خدا کی لگام لگا دے ــــ اس کی زبان بدخواہی کا کلمہ بولنا چھوڑ دے۔ اس کا ہاتھ ظالمانہ کارروائی کرنے سے رک جائے۔ اس کے پاؤں بے انصافی کے راستوں میں نہ چلیں۔ حدیث کے الفاظ میں، وہ اس گھوڑے کی مانند ہو جائے جو کھونٹے سے بندھا ہوا ہے۔ اس کی رسی جتنی لمبی ہے بس اسی کے دائرہ میں وہ گھومتا رہتا ہے، وہ اس کے باہر نہیں جا سکتا۔

روزہ حقیقتہً برائی کو چھوڑنے کا نام ہے۔ اسی کا روزہ روزہ ہے جو اس کے لئے زندگی کے تمام معاملات میں برائی کو چھوڑ دینے کے ہم معنی بن جائے۔

ہر طرف فریب

آج کی دنیا فریب کی دنیا ہے۔ آج کے انسان کو ایسے نعرے مل گئے ہیں جن سے وہ اپنی شخصی لوٹ کی سیاست کو قومی خدمت کی سیاست ظاہر کر سکے۔ ہر آدمی ایسے الفاظ کا ماہر بنا ہوا ہے جو اس کے ظلم و فساد کو عین حق و انصاف کا روپ دے سکیں۔ ہر آدمی کو ایسے قانونی نکتے ہاتھ آ گئے ہیں جو اس کے جرم کو بے گناہی کا سرٹیفکٹ عطا کر دیں۔

یہ دنیا پرستوں کا حال ہے۔ مگر خدا پرستوں کا معاملہ بھی اس سے کچھ مختلف نہیں۔ یہاں بھی لوگوں نے ایسے فضائل و مسائل کا خزانہ جمع کر رکھا ہے جو ان کی بے دینی کو دینی کمال کے خانہ میں ڈال دیں۔ جو ان کی بے عملی کو عمل کا شاندار کریڈٹ دے دیں۔

لوگوں نے ایسا خدا دریافت کر رکھا ہے جس سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ لوگوں کو ایسا رسول ہاتھ آگیا ہے جو صرف اس لئے آیا تھا کہ ان کی ساری بداعمالیوں کے باوجود خدا کے یہاں ان کا یقینی سفارشی بن جائے۔ لوگوں کو ایسی آخرت مل گئی ہے جہاں جنت صرف اپنے لئے ہے اور جہنم صرف دوسروں کے لئے۔ لوگوں کو ایسی نمازیں حاصل ہو گئی ہیں جن کے ساتھ کبر اور حسد جمع ہو سکتا ہے۔ لوگوں کو ایسے روزے معلوم ہو گئے ہیں جو جھوٹ اور ظلم سے فاسد نہیں ہوتے۔ لوگوں کو ایسا دین ہاتھ آگیا ہے جو صرف بحث و مباحثہ کرنے کے لئے ہے نہ کہ عمل کرنے کے لئے۔ لوگوں کو اسلامی دعوت کے ایسے نسخے معلوم ہو گئے ہیں جو ان کی شخصی قیادت اور قومی سیاست کو اسلام کا لباس اوڑھا دیں۔

مگر جھوٹا سونا اسی وقت تک سونا ہے جب تک وہ کسوٹی پر کسا نہ گیا ہو۔ اسی طرح فریب کا یہ کاروبار بھی صرف اس وقت تک ہے جب تک کہ خدا ظاہر ہو کر اپنے انصاف کی ترازو کھڑا نہ کر دے۔ آج امتحان کی آزادی ہے۔ آج آدمی کو موقع ہے کہ جو چاہے کرے۔ مگر جب امتحان کی مدت ختم ہوگی تو آدمی اپنے آپ کو بالکل بے بس پائے گا۔ وہ بولنا چاہے گا مگر اس کے پاس الفاظ نہ ہوں گے کہ وہ بولے۔ وہ چلنا چاہے گا مگر اس کے پاس پاؤں نہ ہوں گے کہ ان کے ذریعہ وہ بھاگ کر کہیں جا سکے۔

یہ سچائی کا دن ہوگا۔ اس دن ہر آدمی کے اوپر سے فریب کا وہ لباس اتر چکا ہوگا جس کو آج وہ پہنے ہوئے ہے۔ ہر آدمی اپنی اس اصل صورت میں نمایاں ہو جائے گا جو فی الواقع اس کی ہے مگر امتحان کی آزادی سے فائدہ اٹھا کر آج وہ اس کو چھپائے ہوئے ہے۔ آدمی کی یہ اصل صورت خدا کے سامنے آج بھی عریاں ہے۔ مگر آخرت کی دنیا میں وہ تمام لوگوں کے سامنے نمایاں ہو جائے گی۔

شناختی کارڈ کے بغیر

دیہات کا ایک لڑکا شہر آیا۔ سڑک پر چلتے ہوئے وہ ایک اسکول کی عمارت کے سامنے سے گزرا۔ یہ اسکول کے جشن کا دن تھا۔ سیکڑوں لڑکے ایک کھڑکی کے سامنے لائن لگائے ہوئے تھے۔ دیہاتی لڑکے نے قریب جاکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس کھڑکی پر مٹھائی تقسیم ہورہی ہے۔ اور ہر ایک اس کو لے کر باہر آرہا ہے۔ دیہاتی لڑکا بھی لائن میں شامل ہوکر کھڑا ہوگیا۔ وہ لائن کے ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ وہ سمجھتا تھا کہ جب میری باری آئے گی تو مٹھائی کا پیکٹ اسی طرح میرے ہاتھ میں بھی ہوگا جس طرح وہ دوسروں کے ہاتھ میں دکھائی دے رہا ہے۔

لائن ایک کے بعد ایک آگے بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ دیہاتی لڑکا کھڑکی کے سامنے پہنچ گیا۔ اس نے خوش خوش اپنا ہاتھ کھڑکی کی طرف بڑھایا۔ اتنے میں کھڑکی کے پیچھے سے آواز آئی "تمھارا شناختی کارڈ"۔ لڑکے کے پاس کوئی کارڈ نہ تھا۔ وہ کارڈ پیش نہ کرسکا۔ چنانچہ وہ کھڑکی سے ہٹا دیا گیا۔ اب لڑکے کو معلوم ہوا کہ یہ مٹھائی ان لوگوں کو تقسیم ہورہی تھی جو سال بھر اسکول کے طالب علم تھے نہ کہ کسی ایسے شخص کے لیے جو اچانک کہیں سے آکر کھڑکی پر کھڑا ہوگیا ہو۔

ایسا ہی کچھ معاملہ آخرت میں پیش آنے والا ہے۔ آخرت کا دن خدائی فیصلہ کا دن ہے۔ اس دن سارے لوگ خدا کے یہاں جمع کیے جائیں گے۔ وہاں لوگوں کو انعامات تقسیم ہورہے ہوں گے۔ مگر پانے والے صرف وہ ہوں گے جنھوں نے اس دن کے آنے سے پہلے پانے کا استحقاق پیدا کیا ہو، جو اپنا "شناختی کارڈ" لے کر وہاں حاضر ہوئے ہوں۔

وہ وقت آنے والا ہے جب کسی آنکھ کے لیے سب سے زیادہ پُرکیف منظر یہ ہوگا کہ وہ اپنے رب کو دیکھے۔ کسی ہاتھ کے لیے سب سے زیادہ لذیذ تجربہ یہ ہوگا کہ وہ اپنے رب کو چھوئے۔ کسی سر کے لیے سب سے زیادہ عزت اور فخر کی بات یہ ہوگی کہ وہ اس کو رب العالمین کے آگے جھکا دے۔ مگر یہ سب کچھ صرف ان لوگوں کے لیے ہوگا جنھوں نے اس دن کے آنے سے پہلے اپنے کو خدا کی نظر عنایت کا مستحق ثابت کیا ہو۔ بقیہ لوگوں کے لیے ان کی غفلت ان کے اور ان کے خدا کے درمیان حائل ہوجائے گی۔ وہ خدا کی دنیا میں پہنچ کر بھی خدا کو نہ دیکھیں گے۔ وہ پانے والے دن بھی اپنے لیے کچھ پانے سے محروم رہیں گے۔

دعوت کا میدان

دوسری جنگ عظیم میں جرمنی اور جاپان ایک فوجی اتحاد میں شامل تھے جس کو محوری طاقتیں (Axis Powers) کہا جاتا تھا۔ ۱۹۴۰ میں اس اتحاد کا نعرہ تھا ـــــــ آج یورپ، کل دنیا:

Today Europe, tomorrow the world

اس مقصد کے لئے جرمنی اور جاپان نے وہ خوفناک جنگ چھیڑی جس کو دوسری جنگ عظیم کہا جاتا ہے۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ فوجی طاقت کے ذریعہ دنیا پر اپنی بالا دستی قائم کرنے کا یہ منصوبہ سراسر ناکام رہا۔ تاہم جنگ میں ناکامی نے جرمنی اور جاپان کو سبق دیا۔ انھوں نے اپنے فوجی منصوبہ کو ترک کر کے اپنی ساری توجہ صنعتی اور اقتصادی منصوبوں پر لگادی۔ طریق عمل کی اس تبدیلی کا شاندار نتیجہ برآمد ہوا۔ خاموش عمل نے ان ملکوں کو اقتصادی ترقی کے بلند ترین مقام پر پہنچا دیا۔ آج جرمنی اور خاص طور پر جاپان نے ساری دنیا میں صنعتی بالادستی کا مقام حاصل کر لیا ہے۔ دنیا کے بازار ان کی صنعتی پیداوارں سے پٹے ہوئے ہیں۔ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لندن کا ایک ہفتہ وار میگزین "نیو سوسائٹی" (۵ فروری ۱۹۸۱) یہ معنی خیز جملہ لکھتا ہے کہ ان قوموں نے اپنے اس خواب کو امن سے پورا کر لیا جو ان کو ۴۰ سال پہلے جنگ کے میدان میں لے گیا تھا:

They have fulfilled in peace the visions
which took them to war 40 years ago.

جدید صنعتی قوموں کے اس واقعہ میں مسلمانوں کے لئے بہت بڑا سبق ہے۔ مسلمان پچھلے سو سال سے اپنے حریفوں کے مقابلہ میں سیاسی اور فوجی لڑائی چھیڑے ہوئے ہیں۔ ان لڑائیوں میں جان و مال کا اتنا زیادہ نقصان ہوا جس کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم بے پناہ قربانیوں کے باوجود ان کا کوئی فائدہ مسلمانوں کو نہیں ملا۔ اب وقت آگیا ہے کہ مسلمان اپنی جدید تاریخ پر نظر ثانی کریں اور اپنے طریق عمل کو بدل دیں۔ مسلمان کے پاس قرآن اور دین حق کی صورت میں اس سے زیادہ بڑی طاقت موجود ہے جس کو جرمنی اور جاپان نے سائنس اور ٹیکنالوجی کی صورت میں پایا ہے۔ مسلمان اگر سیاسی ہنگاموں اور فوجی مقابلہ آرائیوں کو چھوڑ دیں اور اپنی ساری قوت دیگر اقوام میں اسلام کی اشاعت پر لگائیں تو یقینی طور پر وہ اپنے ان حوصلوں کی تکمیل کر سکتے ہیں جن کی تکمیل میں وہ اب تک ناکام رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان جس چیز کو "جنگ" کے میدان میں ناکام طور پر تلاش کر رہے ہیں وہ "دعوت" کے میدان میں کامیاب طور پر موجود ہے۔ بشرطیکہ وہ اس کو جانیں اور اس کو صحیح طور پر استعمال کریں۔

نمائشی حق پرستی

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ پتھر کے اوپر کچھ مٹی جم جاتی ہے۔ اس مٹی کے اوپر سبزہ اگ آتا ہے۔ بظاہر دیکھنے میں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ کوئی کھیت ہو۔ لیکن اگر زور کی بارش ہو جائے تو مٹی سمیت سارا سبزہ بہہ جاتا ہے اور اس کے بعد صرف پتھر کی صاف چٹان باقی رہ جاتی ہے جو ہر قسم کی ہریالی اور نباتات سے بالکل خالی ہوتی ہے۔

یہی معاملہ اکثر انسانوں کا ہے۔ وہ دیکھنے میں بظاہر بالکل ٹھیک معلوم ہوتے ہیں۔ ظاہری طور طریق میں بہت "شاداب" نظر آتے ہیں۔ مگر حالات کا ایک جھٹکا ان کی ساری شادابی اور ہریالی کو ختم کر دیتا ہے اس کے بعد ان کی شخصیت ایک سوکھے پتھر کی مانند ہو کر رہ جاتی ہے۔

ایک شخص جو بات چیت میں شرافت اور معقولیت کی تصویر بنا ہوا تھا وہ عملی تجربہ کے وقت اچانک ایک نامعقول انسان بن جاتا ہے۔ ایک شخص جو انصاف اور انسانیت کے موضوع پر تقریر کر رہا تھا وہ عمل کے موقع پر بے انصافی کا طریقہ اختیار کر لیتا ہے۔ ایک شخص جو مسجد کے رکوع اور سجدہ میں تواضع کا مظاہرہ کر رہا تھا وہ مسجد کے باہر انسانوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں گھمنڈ اور خود پسندی کا مجسمہ بن جاتا ہے۔ ایک شخص جو دوسروں کو عالی ظرفی اور حقوق رسی کی تلقین کر رہا تھا جب اس کا اپنا وقت آتا ہے تو وہ بغض، حسد اور ظلم کے راستہ پر چلنے لگتا ہے

یہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں ہر آدمی کی آزمائش ہو رہی ہے۔ یہ آزمائش معمول کے حالات میں نہیں ہوتی بلکہ غیر معمولی حالات میں ہوتی ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ آدمی عین اس وقت ناکام ہو جاتا ہے جب کہ اس کو سب سے زیادہ کامیابی کا ثبوت دینا چاہئے۔

لوگ باتوں میں حق پرستی کا ثبوت دے رہے ہیں حالانکہ حق پرستی وہ ہے جس کا ثبوت عمل سے دیا جائے۔ لوگ دوستی کے وقت خوش اخلاق بنے رہتے ہیں حالانکہ خوش اخلاق وہ ہے جو بگاڑ کے وقت خوش اخلاق ثابت ہو۔ لوگ خدا کے سامنے تواضع کی رسم ادا کر کے مطمئن ہیں حالانکہ کسی کا متواضع ہونا یہ ہے کہ وہ بندوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں تواضع پر قائم رہے۔

چٹان کی مٹی پر کی جانے والی کھیتی نمائشی کھیتی ہے۔ ایسی کھیتی کسی کسان کے کچھ کام آنے والی نہیں۔ سیلاب کا ایک ہی ریلا اس کو جھوٹی کھیتی ثابت کر دیتا ہے۔ اسی طرح نمائشی حق پرستی بھی جھوٹی حق پرستی ہے جس کو قیامت کا سیلاب اس طرح باطل ثابت کر دے گا کہ وہاں اس کے لئے کچھ نہ ہو گا جو اس کا سہارا بنے۔

اختلاف نہیں

سب سے بڑی طاقت اتحاد ہے اور سب سے بڑی کمزوری اختلاف۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں ہر قیمت پر اتحاد کو باقی رکھنے کا حکم ہے، خواہ اس کی خاطر کسی دوسری بڑی چیز کو قربان کر دینا پڑے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون سے نجات پانے کے بعد چالیس دن کے لئے کوہ طور پر گئے۔ اس درمیان میں سامری نے بنی اسرائیل کو گوسالہ پرستی میں مبتلا کر دیا۔ یہ کھلا ہوا شرک تھا۔ حضرت ہارون حضرت موسیٰ کی غیر موجودگی میں بنی اسرائیل کے ذمہ دار تھے۔ انھوں نے بنی اسرائیل کو کافی سمجھایا مگر وہ نہ رکے۔ جب حضرت موسیٰ کوہ طور سے واپس آئے اور قوم کو شرک میں مبتلا دیکھا تو قرآن کے بیان کے مطابق، انھوں نے حضرت ہارون سے سخت بازپرس کی۔ انھوں نے کہا کہ اے ہارون، جب تم نے دیکھا کہ قوم کے لوگ بہک گئے ہیں تو تم کو ان کی اصلاح سے کس چیز نے روکا۔ کیا تم میرے راستہ سے ہٹ گئے۔ حضرت ہارون نے کہا، اے میرے بھائی، میری داڑھی اور میرا سر نہ پکڑیے۔ میں نے بہت کوشش کی۔ مگر مجھ کو اندیشہ ہوا کہ آپ یہ کہیں کہ تم نے بنی اسرائیل کے درمیان پھوٹ ڈال دی اور میری بات یاد نہ رکھی (طٰہٰ ۹۳-۹۲)

حضرت موسیٰ کے پیچھے حضرت ہارون بنی اسرائیل کے نگراں تھے۔ انھوں نے جب دیکھا کہ بنی اسرائیل ایک شخص کے فریب میں آکر شرک کر رہے ہیں تو انھوں نے زبانی نصیحت کی حد تک انھیں روکنے کی پوری کوشش کی مگر وہ نہ رکے۔ حضرت ہارون، جو شریک نبوت تھے، انھوں نے حضرت موسیٰ کو جواب دیا کہ اگر میں زبانی نصیحت سے آگے بڑھ کر عملی مقابلہ کی حد تک جاتا تو مجھے ڈر تھا کہ برائی تو ختم نہ ہوگی البتہ بنی اسرائیل دو ٹکڑوں میں بٹ جائیں گے۔ کچھ لوگ میرا ساتھ دیں گے اور کچھ سامری کا۔ اور پھر دونوں کے درمیان ٹکراؤ شروع ہو جائے گا۔ اس پھوٹ سے بچنے کے لئے میں نے ایسا کیا کہ برائی کے خلاف عملی اقدام نہ کر کے اس وقت کا انتظار کرتا رہا جب کہ آپ واپس آئیں اور پھوٹ کا خطرہ مول لئے بغیر مسئلہ کو حل کیا جا سکے۔ حضرت موسیٰ نے ان کے اس عذر کو تسلیم کر لیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اہل ایمان کے درمیان باہمی تفریق اتنی بری ہے کہ اس سے بچنے کی خاطر بڑی سے بڑی چیز بھی گوارا کی جا سکتی ہے۔ اجتماعی زندگی میں ہر دوسری چیز کی اہمیت اتحاد کے بعد ہے۔ ہر اہم چیز اس وقت غیر اہم بن جاتی ہے جب کہ اس کو حاصل کرنے کے لئے اتحاد و اتفاق کی قیمت دینی پڑے۔

مومن کیسا ہوتا ہے

مومن وہ ہے جو خدا کو اس حیثیت سے پالے کہ وہ سب سے زیادہ خدا سے ڈرے اور سب سے زیادہ خدا سے محبت کرے۔ وہ اپنی سوچ اور اپنے جذبات کا مرکز صرف ایک خدا کو بنالے۔

ایسا آدمی ہر قسم کے سطحی اور منفی جذبات سے اوپر اٹھ جاتا ہے۔ اس کے سینہ میں دوسرے آدمیوں کے لئے خیر خواہی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ جب اپنے کسی بھائی سے اس کی ملاقات ہوتی ہے تو اس کا سلامتی کا جذبہ "السلام علیکم" کی صورت میں اس کے منھ سے نکل پڑتا ہے۔ اس طرح وہ پہلے ہی قدم پر اپنا تعارف اس حیثیت سے کراتا ہے کہ وہ اس کی بھلائی چاہنے والا ہے، وہ اس کی برائی چاہنے والا نہیں ہے۔

جب گفتگو ہوتی ہے تو وہ نرمی اور شرافت کے ساتھ بات کرتا ہے۔ وہ نہ چیختا اور نہ سخت آواز میں بولتا۔ وہ اپنی زبان سے صرف سچی بات نکالتا ہے، جھوٹی بات نہیں نکالتا۔ وہ ایسا نہیں کرتا کہ اس کے دل میں کچھ ہو اور اپنی زبان سے کچھ کہے۔ وہ کسی سے ایسا وعدہ نہیں کرتا جس کو پورا کرنے کے لئے اس کے دل میں پکا ارادہ نہ ہو۔ کوئی ایسی بات پیش آجائے جس سے اس کے دل پر چوٹ لگی ہو تب بھی وہ بیہودہ انداز اختیار نہیں کرتا۔ کوئی چھوٹا ہو تو وہ اس کے ساتھ حقارت کا رویہ اختیار نہیں کرتا۔ کسی کے ساتھ اس نے احسان کیا ہو تو وہ اس کو طعنہ نہیں دیتا۔ وہ اپنے چھوٹوں کے لئے ہمدرد ہوتا ہے اور جو اس سے بڑے ہیں ان سے ادب کے ساتھ پیش آتا ہے۔

مومن کے دل میں خدا کا ڈر سمایا ہوا ہوتا ہے۔ یہ چیز اس کو اس سے روکتی ہے کہ وہ کسی کو ستائے اور کسی کے ساتھ بے انصافی کرے۔ وہ ہر ایک کو اس کا حق دیتا ہے وہ سخت احتیاط کرتا ہے کہ اس کی ذات سے کسی کو کوئی تکلیف پہنچے۔ اس کا وجود کسی دوسرے کے اوپر بوجھ بن جائے۔ وہ کسی کو مصیبت میں دیکھتا ہے تو اس کی مدد کے لئے بے چین ہو جاتا ہے اور اگر وہ مدد کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اس کا دل اس کے لئے دعائیں کرنے لگتا ہے۔ اگر وہ اپنے عمل سے کسی کو نہ دے سکے تو وہ اپنے دل اور اپنی زبان سے اس کو وہ بہترین چیز دیتا ہے جو وہ اسے دے سکتا ہے۔

مومن وہ ہے جو اپنے آپ کو خدا کی نگرانی میں سمجھے، جو یہ سمجھ کر زندگی گزارے کہ اس کو اپنے ہر قول و فعل کا جواب خدا کو دینا ہے۔ جو کمزور کے معاملہ میں شریر نہ بنے کیونکہ ہر کمزور کے ساتھ اس کا خدا کھڑا ہوا ہے۔ جو طاقت ور سے مرعوب نہ ہو، کیونکہ بالآخر ہر ایک خدا کے آگے بے طاقت ہو جانے والا ہے۔

سچائی کو پانے والا

معانی کی دنیا خدا کے جلووں کی دنیا ہے۔ کون ہے جو خدا کے جلووں کو انسانی زبان میں بیان کر سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاں الفاظ ختم ہو جاتے ہیں وہاں سے معانی کا آغاز ہوتا ہے۔ جب ہم کسی معنی کو بیان کرتے ہیں تو ہم اس کو بیان نہیں کرتے بلکہ اس کو کچھ گھٹا دیتے ہیں، اس کے اوپر ایک قسم کا لفظی پردہ ڈال دیتے ہیں۔

کسی بامعنی حقیقت کو کوئی آدمی صرف اس کے الفاظ سے سمجھ نہیں سکتا۔ ایک اندھا شخص کسی کے بتانے سے یہ نہیں جان سکتا کہ پھول کیا ہے خواہ اس نے پھول کے تعارف کے لئے انسانی زبان کے تمام الفاظ جمع کر دئے ہوں۔ اسی طرح ایک شخص جس نے معنوی حقیقتوں کو دیکھنے کی صلاحیت اپنے اندر نہ جگائی ہو وہ معنوی حقیقتوں سے باخبر نہیں ہو سکتا، خواہ ڈکشنری کے تمام الفاظ اس کے سامنے دہرا دئے جائیں، خواہ قاموس المعانی کی تمام جلدوں کو اسے پڑھا دیا جائے۔

ہدایت ہر آدمی کی فطرت کی آواز ہے مگر ہدایت اسی کو ملتی ہے جو اپنے اندر اس کی سچی طلب رکھتا ہو۔ جو اپنے اندر سچائی کی کھٹک لئے ہوئے ہو، سچائی جس کی ضرورت بن گئی ہو۔ جو سچائی کو پانے کے لئے اتنا بے قرار ہو کہ وہ اسی کی یاد لے کر سوتا ہو اور اسی کی یاد لے کر جاگتا ہو۔ جو آدمی اس طرح سچائی کا طالب بن جائے وہی سچائی کو پاتا ہے۔

ایسا شخص گویا ہدایت کا نصف راستہ طے کر چکا ہے۔ وہ اپنے اندر چھپے ہوئے عہد الست کی خدائی آوازوں کو سن رہا ہے۔ وہ اپنے اندر اس فطری صلاحیت کو بیدار کر چکا ہے جو معانی کی زبان کو سمجھتی ہے۔ ایسا شخص غیر حقیقی دنیا سے بے رغبتی کی وجہ سے حقیقی دنیا کے اتنا قریب آ جاتا ہے کہ وہ فرشتوں کی سرگوشیوں کو سننے لگتا ہے۔

پیغمبر اس تلاش حق کی راہ میں آدمی کا مددگار ہے۔ پیغمبر کے ذریعہ حقیقت کا علم ملنے سے پہلے یہ تمام تجربات آدمی کے اندر مبہم اور مجہول انداز میں ہوتے ہیں۔ اس کے بعد جب پیغمبر کی آواز اس کے اندر داخل ہوتی ہے تو وہ اس کی کتاب فطرت کی تفسیر بن جاتی ہے۔ وہ اپنے اندر چھپے ہوئے غیر ملفوظ اشارات کو ملفوظ زبان میں پا لیتا ہے —— قرآن اور قرآن کو پڑھنے والا دونوں ایک دوسرے کا مثنیٰ بن جاتے ہیں۔ قرآن وہ بن جاتا ہے اور وہ قرآن۔

انسان کا المیہ

یہ جولائی کی ایک حسین صبح تھی۔ سورج ابھی نکلا نہیں تھا مگر آسمان کی وسعتوں میں اس کی پھیلتی ہوئی روشنی بتا رہی تھی کہ وہ جلد ہی نکلنے والا ہے۔ افق پر بادل کے ٹکڑوں کے پیچھے سے پھوٹنے والی سورج کی ابتدائی شعاعیں عجیب رنگ برنگ منظر پیش کر رہی تھیں۔ درختوں کی سرسبزی، چڑیوں کے چہچہے اور صبح کی ہوا کے لطیف جھونکے ماحول کی رعنائی میں مزید اضافہ کر رہے تھے۔ میری زبان سے بے اختیار نکلا: خدا کی دنیا انتہائی حد تک بامعنی ہے، مگر وہ اس وقت انتہائی حد تک بے معنی ہو جاتی ہے جب کہ اس کے ساتھ آخرت کو شامل نہ کیا جائے۔

دنیا بے حد لذیذ ہے مگر اس کی لذتیں چند لمحے سے زیادہ باقی نہیں رہتیں۔ دنیا بے پناہ حد تک حسین ہے مگر اس کو دیکھنے والی آنکھ بہت جلد بے نور ہو جاتی ہے۔ دنیا میں عزت اور خوشی حاصل کرنا انسان کو کتنا زیادہ مرغوب ہے مگر دنیا کی عزت اور خوشی آدمی ابھی پوری طرح حاصل نہیں کر پاتا کہ اس پر زوال کا قانون جاری ہو جاتا ہے۔ دنیا میں وہ سب کچھ ہے جس کو انسان چاہتا ہے مگر اس سب کچھ کو حاصل کرنا انسان کے لئے ممکن نہیں، حتیٰ کہ اس خوش قسمت انسان کے لئے بھی نہیں جو بظاہر سب کچھ حاصل کر چکا ہو۔

انسان ایک کامل وجود ہے۔ مگر اس کا المیہ یہ ہے کہ اسی کے ساتھ وہ طرح طرح کی محدودیت کا شکار ہے اور بہت سے ناموافق حالات اس کو گھیرے ہوئے ہیں، انسان کی زندگی کامل زندگی ہونے کے باوجود اس وقت تک بے معنی ہے جب تک اس کو ایک ایسی دنیا نہ ملے جو ہر قسم کی محدودیت اور ناموافق حالات سے پاک ہو

خدا نے یہ کامل اور ابدی دنیا جنت کی صورت میں بنائی ہے۔ مگر یہ دنیا کسی کو اپنے آپ نہیں مل سکتی۔ اس آنے والی مکمل دنیا کی قیمت موجودہ نامکمل دنیا ہے۔ جو شخص اپنی موجودہ دنیا کو آنے والی دنیا کے لئے قربان کر سکے وہی آنے والی جنتی دنیا کو پائے گا۔ جو شخص اس قربانی کے لئے تیار نہ ہو وہ بھی اگرچہ موت کے بعد ابدی دنیا میں داخل ہوگا۔ مگر اس کے لئے یہ ابدی دنیا حسرتوں اور مایوسیوں کی دنیا ہوگی نہ کہ خوشیوں اور لذتوں کی دنیا۔

رخ صحیح کیجئے

ایک مغربی مفکر نے کہا ہے ـــــ کامیابی کے راستہ کی اکثر رکاوٹوں کو تم نے دور کر لیا ہے اگر تم نے یہ جان لیا ہے کہ محض حرکت اور صحیح رخ پر حرکت میں کیا فرق ہے:

You've removed most of the roadblocks to success when you've learnt the difference between motion and direction.

ہر سرگرمی بظاہر سرگرمی معلوم ہوتی ہے۔ آپ اپنی گاڑی مطلوبہ منزل کی سمت میں چلا رہے ہوں یا منزل کے بالکل الٹی سمت میں اپنی گاڑی دوڑا رہے ہوں، دونوں حالتوں میں دیکھنے والوں کو گاڑی یکساں طور پر حرکت کرتی ہوئی نظر آئے گی۔ مگر دونوں میں اتنا زیادہ فرق ہے کہ ایک حرکت آپ کو ہر آن منزل سے قریب کر رہی ہوگی اور دوسری حرکت ہر آن منزل سے دور۔

انفرادی زندگی کا معاملہ ہو یا اجتماعی زندگی کا، ہمیشہ یہ ضرورت ہوتی ہے کہ حالات اور وسائل کا جائزہ لے کر اس کے مطابق صحیح رخ پر سفر شروع کیا جائے۔ ایسا سفر دیر یا سویر منزل پر پہنچ کر رہتا ہے۔ اس کے برعکس اگر الل ٹپ طریقہ پر ایک دوڑ جاری کر دی جائے تو ایسی دوڑ صرف نقصان اور بربادی پر ختم ہوگی۔

اکثر لوگ ایسا کرتے ہیں کہ سوچے سمجھے بغیر ایک کام شروع کر دیتے ہیں یا وقتی جذبات کے اثر سے کوئی کارروائی کرنے لگتے ہیں اور اس کے بعد جب اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا تو دوسروں کی شکایت کرتے ہیں کہ ان کے ضد اور تعصب کی وجہ سے ایسا ہوا۔ حالاں کہ اگر وہ گہرائی کے ساتھ سوچیں تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ انھوں نے کچھ نہ کچھ کرنے کو کرنا سمجھ لیا۔ حالانکہ کرنا صرف وہ ہے جو درست طریقہ پر اور درست سمت میں کیا جائے نہ کہ درست اور نادرست کا لحاظ کئے بغیر بس یوں ہی ہاتھ پاؤں چلانا شروع کر دیا جائے۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اپنی ناکامی کے لئے دوسروں کو الزام دیتا ہے۔ حالاں کہ دوسروں کو اس کے خلاف جو موقع ملا وہ اسی لئے ملا کہ اس نے غلط رخ سے اپنا سفر جاری کیا تھا، اگر اس نے صحیح رخ سے اپنا سفر شروع کیا ہوتا تو اس کی نوبت ہی نہ آتی کہ کوئی اس کے راستہ میں حائل ہو جائے۔ وہ اس کے کامیابی کے سفر کو ناکامی اور بربادی کا سفر بنا دے۔

بڑی کامیابی

انگریزی کے ایک شاعر نے کہا ہے "جس شخص کو دنیا میں بڑا آدمی بننا ہوتا ہے وہ اس وقت کام میں مصروف رہتا ہے جس وقت عام لوگ سو رہے ہوتے ہیں" مطلب یہ ہے کہ ایسا آدمی صرف عام وقتوں ہی میں کام نہیں کرتا بلکہ اس وقت بھی کام کرتا ہے جب کہ لوگ اپنے کام سے فارغ ہو کر آرام کر رہے ہوتے ہیں۔ وہ لوگوں سے زیادہ کام کرتا ہے اس لئے وہ لوگوں سے زیادہ ترقی حاصل کرتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ زیادہ بڑی کامیابی ہمیشہ زیادہ بڑی محنت کا نتیجہ ہوتی ہے۔

سرسی وی رمن ہندستان کے مشہور سائنس داں گزرے ہیں جن کو نوبل انعام دیا گیا۔ ان سے کسی نے کہا کہ سائنس دانوں نے جو بڑی بڑی دریافتیں کی ہیں ان میں سائنس دانوں کا اپنا کوئی کارنامہ نہیں۔ کیونکہ اکثر دریافتیں محض اتفاق سے حاصل ہوئی ہیں۔ ڈاکٹر رمن نے جواب دیا: ہاں، مگر ایسا اتفاق صرف ایک سائنس داں کو پیش آتا ہے۔

سائنسی دریافتیں (مثلاً بجلی کی دریافت) اکثر اس طرح ہوئی ہیں کہ ایک سائنس داں اپنی تجربہ گاہ میں تحقیق کر رہا ہے۔ تحقیق کرتے کرتے اچانک ایک چیز چمک اٹھی۔ اب سائنس داں نے اس کی کھوج شروع کی۔ یہاں تک کہ وہ ایک نئی دریافت تک پہنچ گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نئی دریافت اگرچہ اچانک ہوتی ہے۔ مگر یہ اچانک دریافت اسی شخص کے حصہ میں آتی ہے جو مسلسل تحقیق و تلاش میں لگا ہوا ہو۔ کوئی آدمی بے کار بیٹھا ہوا ہو تو اس کے ساتھ ایسا خوش قسمت لمحہ کبھی نہیں آئے گا۔

یہی معاملہ زندگی کی تمام ترقیوں کا ہے۔ بڑی کامیابی اکثر کسی کے حصہ میں اس طرح آتی ہے کہ وہ اپنے کام میں لگا ہوا ہے۔ وہ محنت میں رات دن ایک کئے ہوئے ہے۔ پھر اچانک ایک موقع سامنے آتا ہے اور وہ اس کو استعمال کر کے آگے بڑھ جاتا ہے۔ یہ موقع اچانک آتا ہے اور پہلے سے بتائے بغیر آتا ہے۔ کوئی شخص دن کو کام کرے اور رات کو غافل ہو تو رات کو وہ موقع آئے گا اور وہ اس سے فائدہ اٹھانے سے محروم رہے گا۔ اسی طرح کوئی شخص رات کو کام کرے اور دن کو غافل ہو تو دن میں وہ موقع آئے گا اور وہ اس سے فائدہ اٹھانے سے محروم رہ جائے گا۔ بڑی کامیابی ہمیشہ بڑی جدوجہد سے حاصل ہوتی ہے۔ بڑی کامیابی حاصل کرنے کی دوسری کوئی صورت نہیں۔

کوئی فرق نہیں

ایک آدمی ایک درخت کے نیچے آرام کر رہا تھا۔ اس کا ایک دوست ادھر سے گزرا۔ اس نے پکار کر کہا "میرے بھائی، تم کیوں نہیں جاتے کہ کچھ لکڑیاں کاٹ کر لاؤ"۔

"کس لئے" سوئے ہوئے آدمی نے پوچھا۔

"تاکہ تم ان لکڑیوں کو بیچ کر پیسہ حاصل کرو اور اپنے لئے ایک گدھا خریدو اور پھر لکڑی کو گدھے پر لاد کر گھر گھر بیچو۔ اس طرح ایک وقت آئے گا کہ تم اور نفع کما کر ایک ٹرک خرید لوگے۔ پھر تم اور ترقی کروگے اور تمھارے یہاں آرہ کی مشین اور بہت سے ٹرک ہو جائیں گے"۔

"یہ سب کس لئے"، سونے والے نے دوبارہ پوچھا۔

"تم لکھ پتی ہو جاؤ گے اور آرام سے رہو گے"

"پھر تمھارا کیا خیال ہے، اب میں کیا کر رہا ہوں"

یہ ایک واقعہ ہے کہ جو آرام ایک آدمی کوٹھی بنا کر حاصل کرنا چاہتا ہے وہی آرام ایک آدمی درخت کے سایہ میں بھی حاصل کر رہا ہے۔ دیکھنے والوں کے نزدیک ضرور دونوں میں فرق ہے۔ مگر خود آرام کرنے والے کے لئے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ بلکہ درخت کے نیچے سونے والا جس سکون میں ہے وہ کوٹھی والے کو شاید میسر نہیں۔

ایک تاجر ایک بار مجھے اپنا نیا مکان دکھانے کے لئے لے گئے۔ کافی بڑا دو منزلہ مکان تھا۔ گھر کے ہر چھوٹے بڑے کے لئے الگ الگ کمرے اور اس کے ساتھ تمام ضروری سہولتیں مہیا تھیں۔ سارے گھر میں قیمتی قالین بچھے ہوئے، تمام دروازے اور کھڑکیاں خوبصورت پردوں سے ڈھکی ہوئی۔ ہر کمرہ میں اعلیٰ درجہ کا فرنیچر۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا پورا گھر جدید سامانوں کی ایک نمائش گاہ ہے۔

مگر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں ایک خوبصورت قید خانہ میں بند کر دیا گیا ہوں۔ یہ مکان ایک کھلی جگہ پر تھا مگر وہ قدرت کی ہر چیز سے خالی اور قسم قسم کی مصنوعی چیزوں سے بھرا ہوا تھا۔ ہر طرف بجلی کی روشنی کا اعلیٰ انتظام تھا مگر سورج کی روشنی کو اجازت نہ تھی کہ وہ بند مکان میں داخل ہو۔ ہر کمرہ میں ایر کنڈیشنر لگا ہوا تھا مگر قدرتی ہوا کا کہیں گزر نہ تھا۔ انسانی آرٹ کے نمونے دیوار پر تھے مگر قدرت کے آرٹ کو دیکھنے کے لئے وہاں کوئی کھڑکی کھلی ہوئی نہ تھی۔ کمرہ میں میوزک کا انتظام تھا مگر باہر کے درخت پر چہچہانے والی چڑیوں کی آواز سننے کے تمام راستے بند تھے ـــــ جدید تمدن نے انسان کو قدرت سے کتنا دور کر دیا ہے۔

کتنا فرق

خنسار (تماضر بنت عمرو بن الحارث) عرب کی مشہور شاعرہ تھی۔ زمانۂ جاہلیت میں اس کے بھائی کا انتقال ہوگیا۔ یہ حادثہ اس کے لئے اتنا سخت ثابت ہوا کہ وہ اس کے اوپر چھا گیا۔ وہ ہر وقت غم میں ڈوبی رہتی اور دردناک اشعار پڑھ پڑھ کر روتی رہتی۔

خنسار نے بعد کو اسلام قبول کیا۔ حضرت عمر کی خلافت کے زمانہ میں قادسیہ کی جنگ چھڑی تو اس نے اپنے چار لڑکوں کو جہاد کے لئے روانہ کیا۔ یہ چاروں لڑکے جنگ قادسیہ میں شہید ہوگئے۔ جب اس نے اس حادثہ کی خبر سنی تو اس کی زبان سے نکلا:

الحمد للہ الذی شرفنی بقتلھم فی سبیل نصرۃ الدین، و اعلاء کلمۃ الاسلام۔ وارجو ان یلحقنی بھم فی مستقر رحمتہ

اس خدا کا شکر ہے جس نے مجھے یہ عزت دی کہ میرے لڑکے نصرت دین اور اعلاء کلمۃ الاسلام کی راہ میں مارے گئے۔ اور میں امید کرتی ہوں کہ خدا مجھے اپنی رحمت کے مقام پر ان سے ملائے گا۔

ایک عورت جو اسلام سے پہلے اپنے بھائی کی موت کو برداشت نہ کرسکی تھی وہی عورت اسلام کے بعد اپنے چار بیٹوں کے قتل کی خبر کو اتنے اطمینان کے ساتھ سنتی ہے کہ اس کی زبان سے شکر کا کلمہ نکل جاتا ہے۔ اس فرق کی وجہ کیا ہے۔ اس فرق کی وجہ اسلام اور جاہلیت کا فرق ہے۔ جاہلیت زدہ انسان دنیا میں جیتا ہے۔ دنیا کا فائدہ دیکھ کر اس کا دل بڑھتا ہے۔ اور دنیا کا نقصان ہو تو اس کا دل ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کے برعکس اسلام آدمی کی نظر میں آخرت کو اہم بنا دیتا ہے۔ وہ انھیں چیزوں کو اہمیت دیتا ہے جو آخرت کے لحاظ سے اہم ہوں اور جن چیزوں کی اخروی اہمیت نہ ہو وہ اس کی نظر میں اتنی غیر اہم بن جاتی ہیں گویا ان کی کوئی حقیقت ہی نہیں۔

اسلام آدمی کے اندر ہمت پیدا کرتا ہے، وہ خدا کے سوا ہر دوسری چیز سے آدمی کو بے خوف کر دیتا ہے۔ اسلام آدمی کے اندر محدودیت نگاہ کو ختم کر دیتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ ایک امکان کے خاتمہ کے بعد دوسرے امکان کو دیکھنے لگتا ہے، وہ ایک محرومی میں مبتلا ہو کر دوسری کامیابی کا دروازہ اپنے سامنے کھلا ہوا پاتا ہے۔ اسلام آدمی کے ذہن کو اس طرح روشن کر دیتا ہے کہ وہ وہاں بھی دیکھ لے جہاں لوگوں کو کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ وہ وہاں سے بھی اپنے لئے کام کی بات پالے جہاں لوگوں کو کوئی کام کی بات نظر نہیں آتی۔ اسلام اور غیر اسلام میں اتنا ہی فرق ہے جتنا اجالے اور اندھیرے میں۔

نادانی کی سیاست

پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴) میں ایک طرف برطانیہ اور اس کے حلیف تھے جن کو اتحادی طاقتیں (Allied Powers) کہا جاتا تھا۔ دوسری طرف جرمنی اور اس کے حلیف تھے جن کو محوری طاقتیں (Axis Powers) کہا گیا۔ اس جنگ میں ترکوں نے اتحادیوں کے خلاف جرمنی کا ساتھ دیا۔ اسی زمانہ میں لندن ٹائمس نے اپنے ایک مضمون میں ترکوں کو مشورہ دیا کہ وہ جنگ سے الگ رہیں۔ مولانا محمد علی اس جنگ میں اپنے دشمن انگریز کو ان کے مخالفوں کے ہاتھوں شکست کھاتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے، چنانچہ وہ لندن ٹائمس کے مشورہ کو پڑھ کر بے قابو ہو گئے۔ انھوں نے چالیس گھنٹہ کی لگاتار محنت کے بعد اپنے انگریزی اخبار کامریڈ کے لئے ایک مضمون لکھا جس کا عنوان تھا: ترکوں کا انتخاب (Choice of the Turks)

مولانا محمد علی کے اس مشہور ترین مضمون میں ترکوں کو پرزور مشورہ دیا گیا کہ وہ جرمنی کے ساتھ ہو کر انگریزوں کے خلاف جنگ کرنے کے فیصلہ پر قائم رہیں۔ مولانا محمد علی کے نزدیک دو ممکن راستوں میں سے صحیح راستہ ترکوں کے لئے یہ تھا کہ وہ انگریزوں کے مقابلہ میں جرمنوں کے محاذ میں شامل ہو جائیں۔

مگر جنگ کا نتیجہ مولانا محمد علی کی خواہشوں کے خلاف نکلا۔ جنگ ختم ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ جرمنوں کی شکست کے ساتھ ترکوں کے لئے بھی شکست کا پیغام بن کر آئی ہے۔ اس کے بعد انگریزوں نے ترکوں کے ساتھ وہی سلوک کیا جو کوئی فاتح قوم مفتوح قوم کے ساتھ کرتی ہے۔ اب مولانا محمد علی دوبارہ بے تاب ہو گئے۔ وہ مسلمانوں کا ایک وفد لے کر لندن گئے تاکہ ہندستان کے انگریز وائسرائے لارڈ چیمسفورڈ سے ملاقات کریں۔ مگر وائسرائے نے ان سے ملاقات نہ کی اور انھیں ناکام واپس آنا پڑا۔ اس کے بعد وہ دوسرے وفد کے ساتھ ۱۹۲۰ میں دوبارہ لندن گئے اور انگریزی قوم اور انگریز حکمرانوں کو مسلمانان ہند کے "جذبات" سے آگاہ کرنے کی کوشش کی۔ وہاں انھوں نے چند تقریریں کیں، صرف یہ سننے کے لئے کہ آپ نے جب نازک وقت میں ہمارے جذبات کا لحاظ نہ کیا تو آپ کیسے امید رکھتے ہیں کہ ہم آپ کے جذبات کا لحاظ کریں گے۔

کوئی فاتح قوم جنگ کے بعد ایسے گروہ سے رعایت نہیں کرتی جس نے جنگ کے زمانہ میں اس کے دشمنوں کا ساتھ دیا ہو۔ چنانچہ برطانیہ کی اعلیٰ سیاسی شخصیتوں نے مولانا محمد علی سے ملاقات بھی نہ کی۔ اب فیصلہ کی طاقت اتحادیوں کی طرف جا چکی تھی ان کے نزدیک محمد علی کا کیس اب حق کا کیس نہیں تھا بلکہ مجرم کی چیخ پکار کا کیس تھا۔ انھوں نے ترکوں کی مخالفانہ کارروائی کا یہ بدلہ لیا کہ ترکی کے حصے بخرے کر کے ترکی کی عظیم خلافت کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔

تعبیر کا فرق

"قم" کے معنی عربی زبان میں "اٹھو" کے ہیں اور قم ایران کے ایک شہر کا نام بھی ہے۔ ایک پرانا لطیفہ ہے کہ شہر قم کے قاضی صاحب کو ان کے حاکم کا ایک حکم نامہ ملا جس میں عربی زبان میں یہ تحریر تھا: یا قاضی قم لقد شبت فقم۔ اس جملہ کا لفظی مطلب یہ ہے کہ اے قم کے قاضی، اب تم بوڑھے ہو گئے اس لئے اٹھو (اپنا عہدہ چھوڑ دو) یہ حکم نامہ جب قاضی قم کو ملا تو اس نے کہا: "قتلنی حب الامیر للقافیۃ" (امیر کی قافیہ پسندی نے مجھے مار ڈالا)

قاضی صاحب کی نظر قم پر گئی، شبت پر نہیں گئی۔ اگر وہ شبت کے لفظ پر غور کرتے تو ان کو معلوم ہوتا کہ ان کو عہدۂ قضا سے ہٹانے کی اصل وجہ ان کا بڑھاپا ہے نہ کہ قم کا قافیہ۔ امیر کو انھیں بڑھاپے کے سبب سے اس ذمہ دارانہ منصب سے ہٹا کر کسی دوسرے جواں سال آدمی کو وہاں رکھنا تھا۔ یہ محض اتفاقی بات تھی کہ وہ شہر قم کے قاضی تھے اور اس بنا پر حسن تعبیر کے لئے اس نے اپنے حکم کے لئے مذکورہ الفاظ استعمال کرلئے۔ اگر وہ قم کے بجائے کسی اور شہر کے قاضی ہوتے تب بھی وہ انھیں معزول کرتا۔ البتہ اس صورت میں اس کے حکم کے الفاظ دوسرے ہوتے۔

جب بھی ایک بات کہی جائے تو اس کا کوئی جزء اصلی ہوتا ہے اور کوئی جزء اتفاقی۔ کوئی چیز اصل مقصود کلام کے طور پر آتی ہے اور کوئی اتفاقاً کلام کا جزء بن جاتی ہے۔ آدمی کسی کلام کی حکمت کو اسی وقت سمجھ سکتا ہے جب کہ وہ الفاظ کے اس فرق کو ملحوظ رکھ کر کلام کا مفہوم متعین کرے۔ اس کے برعکس اگر وہ اس فرق کو ملحوظ نہ رکھے تو وہ سخت غلطی کرے گا۔ وہ بظاہر کلام کو سمجھتے ہوئے بھی کلام کو نہیں سمجھے گا۔ وہ نہ کہنے والے کے ساتھ انصاف کرے گا اور نہ خود اپنے ساتھ۔

مذکورہ قاضی صاحب اتنے نادان نہیں ہو سکتے کہ وہ اس راز کو نہ سمجھ سکیں۔ یہ واقعہ اگر دوسرے شخص سے متعلق ہوتا تو وہ فوراً اس کو جان لیتے۔ مگر معاملہ ان کی اپنی ذات کا تھا اس لئے وہ اس کی حقیقت تک نہ پہنچ سکے۔ جب بھی کوئی آدمی نفسیاتی پیچیدگی میں مبتلا ہو تو وہ حقیقت پسندانہ انداز میں سوچ نہیں پاتا اور اس بنا پر اصل معاملہ کو سمجھنے میں اسی طرح ناکام رہتا ہے جس طرح قاضی صاحب ناکام رہے۔

دین غریب، دین معروف

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی مکہ کے منکرین کے سامنے ایمان و اسلام کا ذکر کرتے تو وہ فخر کے ساتھ کہتے کہ ہم تو اس سے بڑا دینی کام کر رہے ہیں، ہمیں تمھارے اسلام کی ضرورت نہیں۔ ہم مسجد حرام کا انتظام کرتے ہیں، ہم حاجیوں کو پانی پلاتے ہیں (نعمر المسجد الحرام ونسقی الحاج) اس پر قرآن میں یہ آیت اتری:

اجعلتم سقایۃ الحاج وعمارۃ المسجد الحرام کمن آمن باللہ والیوم الآخر وجٰھد فی سبیل اللہ لا یستوون عند اللہ واللہ لا یھدی القوم الظٰلمین۔ الذین آمنوا وھاجروا وجٰھدوا فی سبیل اللہ باموالھم وانفسھم اعظم درجۃ عند اللہ واولٰئک ھم الفائزون (التوبہ)

کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد حرام کا انتظام کرنے کو اس کے برابر کر دیا جو اللہ اور آخرت پر ایمان لایا اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ اللہ کے نزدیک یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ اور اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔ جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جان سے جہاد کیا ان کا درجہ اللہ کے یہاں بڑا ہے اور وہی ہیں کامیاب ہونے والے

پیغمبر اسلام کی دعوت اپنے ابتدائی زمانہ میں مجرد دعوت تھی جس کی پشت پر نظری سچائی کے سوا اور کوئی چیز موجود نہ تھی۔ دوسری طرف بیت اللہ کی حیثیت ایک ایسے ادارہ کی تھی جس کے ساتھ درو دیوار کی عظمتیں اور تاریخ کی روایتیں شامل ہو چکی ہوں۔ بیت اللہ کے ساتھ اپنے کو وابستہ کرنے کی اہمیت اتنی معلوم اور مسلّم تھی کہ وہ فخر کا نشان بنی ہوئی تھی۔ جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر ایمان لانا ایک ایسی چیز پر ایمان لانا تھا جس نے اپنی اہمیت کو ابھی محسوسات کے روپ میں ظاہر نہ کیا ہو۔

اس فرق کو ایک لفظ میں اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ ایک چیز ہے نصرتِ دعوت اور دوسری چیز ہے نصرتِ ادارہ۔ نصرت دعوت ہر زمانہ میں انسان کے لئے مشکل ترین کام رہا ہے۔ اس کے برعکس نصرت ادارہ ہر دور کے انسانوں کو سب سے زیادہ آسان کام معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ دعوت کے ساتھ ہمیشہ صرف نظری صداقت ہوتی ہے اور ادارہ کے ساتھ مادی اہمیت کی چیزیں شامل ہو جاتی ہیں۔ مگر خدا کے یہاں عزت اور بڑائی انھیں لوگوں کے لئے ہے جو سچائی کا ساتھ اس وقت دیں جب کہ وہ صرف ایک دعوت ہو۔ ادارہ بننے کے بعد اس کا ساتھ دینا خدا کی نظر میں کوئی قیمت نہیں رکھتا۔ دعوت کا ساتھ دینا خدا کا ساتھ دینا ہے اور ادارہ کا ساتھ دینا مادی عظمتوں کا ساتھ دینا۔

قدرت کے آغوش میں

یہ ایک پہاڑی مقام ہے۔ میں سطح سمندر سے چھ ہزار فٹ کی بلندی پر بیٹھا ہوں۔ ہری گھاس کی قدرتی مخمل ہمارا فرش ہے۔ ہمارے چاروں طرف آفاقی حسن کے مناظر پھیلے ہوئے ہیں۔ سبزہ سے ڈھکی ہوئی پہاڑیاں، قدرتی چشموں کی موسیقی، فرحت بخش ہوا کے جھونکے، سورج کی سہانی کرنیں نیلا آسمان اور اس میں جگہ جگہ سفید بادل کی گل کاریاں، چڑیوں کے چہچہانے کی لطیف آوازیں، تمدن کے ہنگاموں اور آلائشوں سے دور قدرت کی خاموش فضا، یہ سب چیزیں عجیب ناقابل بیان منظر پیدا کر رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوا جیسے کائنات کا حسین چہرہ اپنے حسین تر خالق کا آئینہ بن گیا ہو۔

میری زبان سے بے اختیار نکلا —— خدایا، تو اس سے زیادہ ہے کہ میں اپنے لفظوں میں تجھ کو بیان کرسکوں۔ میں نے تیری حمد میں جو کچھ کہا وہ جھوٹ تھا۔ کیونکہ میں نے تیری بے پایاں ہستی کو بیان نہیں کیا بلکہ اس کو گھٹا دیا۔ میں نے تیرا چرچا کیا مگر میں نے تیرا چرچا نہیں کیا، کیونکہ تو اس سے بلند ہے کہ تیرا چرچا کرنے کے لئے کوئی شخص الفاظ پا سکے۔ میں نے تیری عبادت کی، مگر میں نے تیری عبادت نہیں کی، کیونکہ تو اس سے برتر ہے کہ کوئی انسان تیری عبادت کا حق ادا کرسکے۔

پہاڑ کا ہمالیائی ماحول خدا کے جلال و جمال کو اس طرح نمایاں کر رہا تھا کہ اس کے مقابلہ میں ہر چیز حقیر اور بے قیمت نظر آئی۔ یہاں بیٹھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آدمی خدا کی آفاقی دنیا میں پہنچ گیا ہے۔ تمام منفی جذبات اور سطحی داعیات خدا کی وسیع دنیا میں تحلیل ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ خود پرستی کائنات کی عظمتوں کے سامنے اپنا وجود کھوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اللہ کی عقیدت کے سوا دوسری تمام عقیدتیں اور پرستاریاں ایسی ہو جاتی ہیں جیسے مالک کائنات کی بارگاہ میں ان کو جگہ نہ مل رہی ہو۔ دنیا پرستی یہاں کی جنتی فضاؤں میں ایک ایسی حقیر چیز بن جاتی ہے جس پر آدمی کو خود شرم آنے لگے۔

میں کائناتی حسن کے اس ماحول میں گم تھا کہ اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ خدا کی یہ دنیا ہی خدا کے ذکر کی سب سے موزوں جگہ ہے۔ یہاں کی ربانی فضا ہی اس کام کے لئے سب سے زیادہ مناسب ہے کہ یہاں وہ ربانی انسان پیدا کئے جائیں جو سارے عالم کو کونوا ربانیین (ربانی بنو) کی دعوت دے سکیں یہاں کے جنتی پڑوس ہی میں وہ انسان تیار کئے جاسکتے ہیں جو لوگوں کو یہ پیغام دیں کہ جنت کی طرف دوڑو

اور جہنم سے اپنے آپ کو بچاؤ۔

میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا: جی چاہتا ہے کہ یہاں ایک تربیتی ادارہ قائم ہو جس میں لوگ دس دس، بیس بیس کی تعداد میں آکر شریک ہوں۔ یہاں کی آفاقی فضاؤں میں ہی وہ تربیت گاہ بن سکتی ہے جس میں وہ انسان پیدا کرنے کی کوشش کی جائے جو خدا میں جیتے ہوں۔ جو انسانی پستیوں کے بجائے خدائی بلندیوں میں اپنی روح کی غذا پا رہے ہوں۔ جو فانی دنیا کے بجائے ابدی دنیا میں سانس لیتے ہوں۔

کائنات میں غور و فکر آدمی کو خدا سے جوڑتا ہے، جب کہ انسانی بحثوں میں خوض سے صرف ذہنی موشگافیاں وجود میں آتی ہیں۔ ایک کے اندر معرفتِ خداوندی کی غذا ہے اور دوسرے کے اندر اختلاف انتشار کا سامان۔ اس قسم کا پہاڑی مقام جو قدرتی مناظر سے گھرا ہوا ہو وہ یقیناً سب سے زیادہ موزوں جگہ ہے جہاں خدا کے بندوں کو خدا پرستی کا درس دیا جائے۔

یہاں ہر طرف قدرتی چشمے ہیں جن سے سال بھر شفاف پانی ابلتا رہتا ہے۔ ایسے ماحول میں جب کوئی کہنے والا کہے کہ اللہ کا فیضان ہدایت ہر وقت تمہارے لئے برس رہا ہے اس میں سے اپنا حصہ لو تو پانی کے بہتے ہوئے چشمے اپنی دھیمی موسیقی کے ساتھ اس کی تائید کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ جب آپ کہیں کہ اللہ سب سے بڑا ہے، اس کی بڑائی کو مان کر اس کے آگے جھک جاؤ تو پہاڑوں کی بلندیاں اپنی خاموش زبان میں بول پڑتی ہیں کہ کہنے والے نے سچ کہا۔ جب آپ لوگوں سے کہیں کہ ایمان کو اس طرح اپناؤ کہ وہ تمہاری پوری ہستی کو تر و تازہ کر دے تو چاروں طرف اگے ہوئے سرسبز شاداب درخت اس قول کی مجسم تفسیر بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جب آپ کہیں کہ اختلاف اور شکایت سے اوپر اٹھ کر زندگی گزارو تو آسمان کی بلندیاں اپنے آفاقی پھیلاؤ کے ساتھ اس کی خاموش تصدیق بن جاتی ہیں۔ جب آپ کہیں کہ ہر آدمی کو چاہئے کہ وہ دوسروں سے ٹکرائے بغیر اپنی سرگرمیوں کو جاری کرے تو یہاں کی کھلی ہوئی کائنات اپنے پورے وجود کے ساتھ پکار اٹھتی ہے کہ مجموعی ترقی کا راز بلاشبہ اس دنیا میں یہی ہے، اس کے سوا اور کسی چیز میں نہیں۔

خدا سے قریب ہونے کی سب سے بہتر جگہ خدا کی کھلی ہوئی کائنات ہے مگر لوگوں کا حال یہ ہے کہ خدا کی قربت کو کوئی شخص تنگ و تاریک حجروں میں تلاش کر رہا ہے اور کوئی سیاست و تمدن کے ہنگاموں میں کوئی اپنے مادی مسائل میں الجھا ہوا ہے اور کوئی اپنے قومی مسائل میں۔ انسانی روح کی غذا اور اصل واقعات خداوندی میں رکھی گئی ہے مگر لوگ واقعات انسانی کو اپنی روح کی غذا بنائے ہوئے ہیں۔ ایسی حالت میں خدا کی زمین اگر ربانی انسانوں سے خالی ہو تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں

یہ بگاڑ ہے یا اصلاح

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: کہو کہ خدا اس پر قادر ہے کہ وہ تم پر کوئی عذاب بھیج دے، تمہارے اوپر سے یا تمہارے قدموں کے نیچے سے، یا تم کو گروہ گروہ کرکے بھڑادے اور تمہارے ایک کو تمہارے دوسرے کی طاقت کا مزہ چکھائے۔ دیکھو ہم کیونکر اپنی نشانیاں طرح طرح سے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ سمجھیں (الانعام ۶۵)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ کسی قوم پر نافرمانی کے سبب سے خدا کا جو عذاب آتا ہے وہ تین صورتوں میں آتا ہے۔ ایک وہ جو اوپر سے آئے۔ جیسے پتھر برسنا یا طوفانی ہوا اور شدید بارش۔ دوسرے وہ جو پاؤں کے نیچے سے آئے، جیسے زلزلہ یا سیلاب وغیرہ۔ تیسرا وہ جس کو داخلی عذاب کہا جا سکتا ہے، یعنی باہمی ٹکراؤ اور آپس کی خوں ریزی۔ پہلا اور دوسرا عذاب ہمیشہ ان قوموں پر آتا ہے جن پر نبی کے ذریعہ اتمام حجت کیا گیا ہو، اس کے باوجود وہ منکر بنی رہے۔ ختم نبوت کے بعد اب چونکہ کوئی نبی آنے والا نہیں۔ اس لئے اب امت مسلمہ کے لئے ان دونوں عذابوں کا خطرہ نہیں۔ البتہ تیسری قسم کے عذاب سے وہ مامون نہیں ہے۔ جب بھی اس امت میں غفلت اور سرکشی بڑھے گی وہ اس تیسرے عذاب کی لپیٹ میں آجائے گی۔

ایک روایت الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ مختلف کتب حدیث میں آئی ہے۔ حافظ ابن کثیر نے مذکورہ آیت کی تفسیر کے تحت احمد، نسائی، ابن حبان اور ترمذی کے حوالے سے جو روایت درج کی ہے اس کو ہم یہاں نقل کرتے ہیں:

عن خباب بن الارت انه قال رایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی لیلۃ صلاھا کلھا حتی کان مع الفجر فسلم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من صلاتہ فقلت یارسول اللہ لقد صلیت اللیلۃ صلاۃ ما رأیتك صلیت مثلھا فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اجل انھا صلاۃ رغب ورھب۔ سألت ربی عزوجل فیھا ثلاث خصال فاعطانی اثنتین ومنعنی واحدۃ۔ سألت ربی عزوجل ان لا یھلکنا بما اھلك به الامم قبلنا فاعطانیھا۔ وسألت ربی عزوجل ان لا یظھر علینا عدوا من غیرنا فاعطانیھا۔ وسألت

حضرت خباب بن ارت کہتے ہیں کہ میں اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا جب کہ آپ نے ساری رات نماز پڑھی۔ یہاں تک کہ جب فجر کا وقت آگیا تو آپ نے سلام پھیر کر اپنی نماز ختم کی۔ میں نے کہا، اے خدا کے رسول، آج کی رات آپ نے ایسی نماز پڑھی جیسی نماز پڑھتے ہوئے میں نے اس سے پہلے آپ کو نہ دیکھا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں، وہ ڈر اور اشتیاق کی نماز تھی۔ میں نے اس میں اپنے رب سے تین باتیں مانگیں۔ اس نے دو باتیں مجھ کو دے دیں اور ایک سے منع فرمایا۔ میں نے اپنے رب سے مانگا کہ وہ ہم کو اس طرح ہلاک نہ کرے جس طرح پچھلی

ربی عزوجل ان لا یلبسنا شیعا فمنعنیها

امتیں ہلاک کی گئیں۔ یہ اس نے مجھ کو دے دیا۔ پھر میں نے اپنے رب سے مانگا کہ وہ ہمارے اوپر ہمارے باہر کے دشمن کو (کامل طور پر) مسلط نہ کرے۔ یہ بھی اس نے مجھ کو دے دیا۔ پھر میں نے اپنے رب سے مانگا کہ وہ ہم کو گروہوں میں نہ بانٹے۔ اس کی قبولیت سے اس نے انکار کر دیا۔

ایک اور روایت میں مزید یہ الفاظ ہیں کہ میں اپنی امت پر گمراہ قائدین کے سوا کسی اور سے نہیں ڈرتا۔ جب میری امت میں ایک بار تلوار چل جائے گی تو وہ قیامت تک اس سے اٹھائی نہ جائے گی (انی لا اخاف علی امتی الا الائمۃ المضلین فاذا وضع السیف فی امتی لم یرفع عنھم الی یوم القیامۃ)

امت مسلمہ کے بگاڑ پر ہونے کی کم از کم ایک یقینی پہچان یہ ہے کہ وہ گروہوں میں بٹ جائے اور اس کے ایک گروہ کی طاقت دوسرے گروہ کے خلاف استعمال ہونے لگے۔

موجودہ زمانہ میں بگاڑ کی یہ علامت مسلمانوں میں پوری طرح نمایاں ہو چکی ہے۔ آج ان میں ایسے مذہبی مسائل اور سیاسی نظریات فروغ پا رہے ہیں جو انھیں باہم حریف بنا کر ایک کو دوسرے سے ٹکرا دیں۔ ان میں ایسے لیڈر اٹھ رہے ہیں جو خود اپنے ملک کو فتح کر کے اس کے اوپر اپنی کامرانی کا جھنڈا لہرائیں۔ ان میں ایسے بہادر ابھر رہے ہیں جو خود اپنی قوم کے اداروں پر دھاوا بول کر ان پر قبضہ کر لیں اور ان کے اموال کو اپنے لئے غنیمت بنا لیں۔ ان میں ایسے مفکرین اور مدبرین پیدا ہو رہے ہیں جو اپنی قوم کے کچھ لوگوں کو "برائی کی علامت" قرار دے کر ان کے خلاف محاذ آرائی کریں اور ان کے قتل وغارت کا منصوبہ بنائیں۔ ان میں ایسی جماعتیں وجود میں آ رہی ہیں جو خود اپنی قوم کی دوسری جماعتوں کی بیخ کنی کو نشانہ بنا کر کام کریں غرض یہ پوری قوم بے شمار گروہوں میں بٹ گئی ہے۔ ہر شخص جس کے پاس کچھ طاقت ہے وہ اپنے بھائی کو اس کا مزہ چکھانے کے لئے بے قرار نظر آتا ہے۔

آج پوری امت، فرد سے لے کر گروہ تک، باہمی تصادم میں مشغول ہے۔ ملت کے افراد کا حال یہ ہے کہ وہ دوسری قوم کے آدمی کو برداشت کر سکتے ہیں مگر اپنی قوم کے آدمی کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں۔ دوسری اقوام کے خلاف کارروائی کرنے کے لئے ہر ایک بزدل ہے، مگر اپنی قوم سے لڑنے کے لئے ہر ایک بہادر بنا ہوا ہے۔ امت مسلمہ کی طاقت جو اغیار کے استیصال کے لئے تھی وہ خود ساختہ الفاظ بول کر خود اپنی قوم کے لوگوں کے خلاف استعمال ہو رہی ہے۔ یہ بلاشبہ خدا کے غضب کی علامت ہے، خواہ ہم بطور خود اس کو خدا کی رحمت قرار دے کر خوش ہو رہے ہوں۔

سورۃ یونس مکیۃ وھی مائۃ وتسع آیات واحد عشر رکوعا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الٓرٰ تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ الۡحَکِیۡمِ ﴿۱﴾ اَکَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنۡ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰی رَجُلٍ مِّنۡہُمۡ اَنۡ اَنۡذِرِ النَّاسَ وَ بَشِّرِ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنَّ لَہُمۡ قَدَمَ صِدۡقٍ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ ؕؔ قَالَ الۡکٰفِرُوۡنَ اِنَّ ہٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِیۡنٌ ﴿۲﴾

آیاتہا ۱۰۹ سورہ یونس مکیہ رکوعاتہا ۱۱

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

الف لام ر، یہ پُرحکمت کتاب کی آیتیں ہیں۔ کیا لوگوں کو اس پر حیرت ہے کہ ہم نے انھیں میں سے ایک شخص پر وحی کی کہ لوگوں کو ڈراؤ اور جو ایمان لائیں ان کو خوش خبری سنا دو کہ ان کے لئے ان کے رب کے پاس سچا مرتبہ ہے۔ منکروں نے کہا کہ یہ شخص تو کھلا جادوگر ہے ۲-۱

پیغمبر کا کلام انتہائی محکم دلائل پر مبنی ہوتا ہے۔ وہ اپنے غیر معمولی انداز کی بنا پر خود اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے بول رہا ہے۔ اس کے باوجود ہر زمانہ میں لوگوں نے پیغمبر کا انکار کیا اس کی وجہ انسان کی ظاہر پرستی ہے۔ پیغمبر اپنے معاصرین کی نظر میں عام انسانوں کی طرح بس ایک انسان ہوتا ہے۔ اس کے گرد ابھی عظمت کی وہ تاریخ جمع نہیں ہوتی جو بعد کے زمانہ میں اس کے نام کے ساتھ وابستہ ہو جاتی ہے۔ اس لئے پیغمبر کے زمانہ کے لوگ پیغمبر کو محض ایک انسان سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ وہ پیغمبر کو نہ خدا کے بھیجے ہوئے کی حیثیت میں دیکھ پاتے اور نہ مستقبل میں بننے والی تاریخ کے اعتبار سے اس کا اندازہ کر پاتے، جب کہ ہر آدمی اس کی پیغمبرانہ عظمت کو ماننے پر مجبور ہوگا۔

پیغمبر کا کلام سراپا اعجاز ہوتا ہے جو سننے والوں کو بے دلیل کر دیتا ہے۔ مگر منکرین اس کی اہمیت کو گھٹانے کے لئے یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ ادبی ساحری ہے۔ وہ دلیل کے میدان میں اپنے آپ کو عاجز پاکر اس کے اوپر عیب لگانے لگتے ہیں۔ اس طرح وہ پیغمبر کے کلام کی صداقت کو مشتبہ کرتے ہیں۔ پیغمبر کا کلام جن لوگوں کو مفتوح کر رہا تھا ان کے بارے میں یہ تاثر دیتے ہیں کہ وہ محض سادگی میں پڑے ہوئے ہیں، ورنہ یہ سارا معاملہ الفاظ کے فریب کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ زبان کی جادوگری ہے نہ کہ کوئی واقعی اہمیت کی چیز۔

پیغمبر کا اصل مشن انذار و تبشیر ہے۔ یعنی خدا کی پکڑ سے ڈرانا اور جو لوگ خدا سے ڈر کر دنیا میں رہنے کے لئے تیار ہوں ان کو جنت کی خوش خبری دینا۔ پیغمبر اس لئے آتا ہے کہ لوگوں کو اس حقیقت واقعہ سے آگاہ کر دے کہ آدمی اس دنیا میں آزاد اور خود مختار نہیں ہے اور نہ زندگی کا قصہ آدمی کی موت

کے ساتھ ختم ہو جانے والا ہے۔ بلکہ موت کے بعد ابدی زندگی ہے اور آدمی کو سب سے زیادہ اسی کی فکر کرنا چاہئے۔ جو شخص غفلت برتے گا یا سرکشی کرے گا وہ موت کے بعد کی دنیا میں اس حال میں پہنچے گا کہ وہاں اس کے لئے دکھ کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔

ظاہر پرست انسان ہمیشہ یہ سمجھتا رہا ہے کہ عزت اور ترقی اس شخص کے لئے ہے جس کے پاس دنیا کا اقتدار ہے، جو دنیا کی دولت کا مالک ہے۔ پیغمبر بتاتا ہے کہ یہ سراسر دھوکا ہے۔ یہ عزت و ترقی تو وہ ہے جو موجودہ عارضی زندگی میں انسانوں کے درمیان ملتی ہے۔ مگر عزت اور ترقی دراصل وہ ہے جو مستقل زندگی میں خدا کے یہاں حاصل ہو۔ وہی عزت و ترقی حقیقی ہے اور اسی کے ساتھ دائمی بھی۔

إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مَا مِنْ شَفِيعٍ إِلَّا مِنْ بَعْدِ إِذْنِهِ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴿٣﴾ إِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا وَعْدَ اللَّهِ حَقًّا إِنَّهُ يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ لِيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ بِالْقِسْطِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ شَرَابٌ مِنْ حَمِيمٍ وَعَذَابٌ أَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ ﴿٤﴾

بے شک تمھارا رب اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں (ادوار) میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر قائم ہوا۔ وہی معاملات کا انتظام کرتا ہے۔ اس کی اجازت کے بغیر کوئی سفارش کرنے والا نہیں۔ یہی اللہ تمھارا رب ہے پس تم اسی کی عبادت کرو، کیا تم سوچتے نہیں۔ اسی کی طرف تم سب کو لوٹ کر جانا ہے، یہ اللہ کا پکا وعدہ ہے۔ بے شک وہ پیدائش کی ابتدا کرتا ہے، پھر وہ دوبارہ پیدا کرے گا تاکہ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کئے ان کو انصاف کے ساتھ بدلہ دے۔ اور جنھوں نے انکار کیا ان کے انکار کے بدلے ان کے لئے کھولتا پانی اور دردناک عذاب ہے ۴-۳

کائنات میں مختلف قسم کی چیزیں ہیں۔ علمی مطالعہ بتاتا ہے کہ ان چیزوں کا ظہور بیک وقت نہیں ہوا بلکہ تدریج کے ساتھ ایک کے بعد ایک ہوا ہے۔ قرآن اس تدریجی تخلیق کو چھ ادوار (Periods) میں تقسیم کرتا ہے۔ یہ دوری تخلیق ثابت کرتی ہے کہ کائنات کی پیدائش شعوری منصوبہ کے تحت ہوئی ہے۔ پھر کائنات کا مطالعہ یہ بھی بتاتا ہے کہ اس کا نظام حد درجہ محکم قوانین کے تحت چل رہا ہے۔ ہر چیز ٹھیک اسی طرح عمل کرتی ہے جس طرح مجموعی تقاضے کے تحت اسے عمل کرنا چاہئے۔ یہ واقعہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اس کارخانہ کائنات کا ایک زندہ مدبر ہے جو ہر لمحہ اس کا انتظام کر رہا ہے۔

کائنات کا یہ حیران کن نظام خود ہی پکار رہا ہے کہ اس کا مالک اتنا کامل اور اتنا عظیم ہے جس کے یہاں کسی سفارشی کی سفارش چلنے کا کوئی سوال نہیں۔ کائنات اپنی خصوصیات کے آئینہ میں اپنے خالق کی خصوصیات کو بتا رہی ہے۔

ساری کائنات میں "قسط" کا نظام قائم ہے۔ یہاں ہر ایک کے ساتھ یہ ہو رہا ہے کہ جو کچھ وہ کرتا ہے اسی کے مطابق نتیجہ اس کے سامنے آتا ہے۔ ہر ایک کو وہی ملتا ہے جو اس نے کیا تھا اور ہر ایک سے وہ چھن جاتا ہے جس کے لئے اس نے نہیں کیا تھا۔ زمین کا جو حصہ رات کے اسباب جمع کرے وہاں تاریکی پھیل کر رہتی ہے اور زمین کا جو حصہ روشنی کے اسباب پیدا کرے اس کے اوپر روشن سورج چمک کر رہتا ہے۔

یہ مادی نتائج کا حال ہے۔ مگر اخلاقی نتائج کے معاملہ میں دنیا کی تصویر بالکل مختلف نظر آتی ہے۔ انسان نیکی کرتا ہے اور اس کو نیکی کا پھل نہیں ملتا۔ انسان سرکشی کرتا ہے مگر اس کی سرکشی اپنا نتیجہ دکھائے بغیر جاری رہتی ہے۔ خالق کی جو مرضی اس کی دوسری مخلوقات میں چل رہی ہے اس کی وہی مرضی انسان کے معاملات میں کیوں ظاہر نہیں ہوتی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ انسان کی زندگی میں خدائی انصاف کے ظہور کو خدا نے بعد کو آنے والی دنیا کے لئے مؤخر کر دیا ہے۔ پہلی زندگی انسان کو عمل کے لئے دی گئی ہے، دوسری زندگی اس کو اپنے عمل کا نتیجہ پانے کے لئے دی جائے گی۔ اور دوسری زندگی کا ظہور یقیناً اتنا ہی ممکن ہے جتنا پہلی زندگی کا ظہور۔

هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاءً وَالْقَمَرَ نُورًا وَقَدَّرَهُ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوا عَدَدَ السِّنِينَ وَالْحِسَابَ ۚ مَا خَلَقَ اللَّهُ ذَٰلِكَ إِلَّا بِالْحَقِّ ۚ يُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ۝٥ إِنَّ فِي اخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللَّهُ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَتَّقُونَ ۝٦

اللہ ہی ہے جس نے سورج کو چمکتا بنایا اور چاند کو روشنی دی اور اس کی منزلیں مقرر کر دیں تاکہ تم برسوں کا شمار اور حساب معلوم کرو۔ اللہ نے یہ سب کچھ بے مقصد نہیں بنایا ہے۔ وہ نشانیاں کھول کر بیان کرتا ہے ان کے لئے جو سمجھ رکھتے ہیں۔ یقیناً رات اور دن کے الٹ پھیر میں اور اللہ نے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں پیدا کیا ہے ان میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو ڈرتے ہیں ۶-۵

سورج ہماری زمین سے نہایت درست فاصلہ پر قائم ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ ہمارے لئے روشنی اور حرارت جیسی نعمتوں کا خزانہ بنا ہوا ہے۔ اگر اس اندازہ میں فرق ہو جائے تو سورج ہمارے لئے سورج نہ رہے

بلکہ آگ کا جہنم بن جائے، وہ زندگی کے بجائے موت کا پیغام ثابت ہو۔ چاند ایک حد درجہ ریاضیاتی حساب کے مطابق اپنے مدار پر ٹھیک ٹھیک گردش کرتا ہے۔ اسی بنا پر یہ ممکن ہوتا ہے کہ چاند بذات خود بے نور ہونے کے باوجود ہمارے لئے نہ صرف ٹھنڈی روشنی دے بلکہ مہینہ اور سال کی قدرتی تقویم بھی فراہم کرے۔ یہ فلکیاتی نشانیاں ثابت کرتی ہیں کہ اس کائنات میں گہری مقصدیت ہے، اور مقصدیت والی کائنات کا آخری انجام بے مقصد نہیں ہوسکتا۔

پھر ہماری دنیا میں رات کے بعد دن کا آنا مادی تمثیل کی زبان میں اس اخلاقی حقیقت کو بتا رہا ہے کہ موجودہ دنیا میں یہ قانون نافذ ہے کہ تاریکی کے بعد روشنی پھیلے، اندھیرے کے بعد اجالے کا ظہور ہو۔ یہاں حقوق کی پامالی کے بعد حقوق کی ادائگی کا نظام آنے والا ہے۔ انسان کی سرکشی کی جگہ خدائی انصاف کو غلبہ ملنے والا ہے۔ یہاں اس وقت کا آنا مقدر ہے جب کہ دھاندلی ختم ہو اور حق کے اعتراف کا ماحول چاروں طرف قائم ہوجائے۔

آخرت کی حقیقتوں کو خدا نے نشانیوں کے انداز میں ظاہر کیا ہے۔ بالفاظ دیگر، خدا موجودہ دنیا میں دلیل کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے نہ کہ محسوس مشاہدہ کے روپ میں۔ پھر خدا جس روپ میں اپنا جلوہ دکھاتا ہے اسی روپ میں ہم اس کو پاسکتے ہیں نہ کہ کسی اور روپ میں۔

خدا نے اس دنیا میں ہدایت کے راستے کھول رکھے ہیں مگر یہ ہدایت انھیں کا مقدر ہے جو خدائی نقشہ کے مطابق اس کی پیروی کرنے کے لئے تیار ہوں۔ یہاں وہی لوگ صحیح راستہ پر چلنے کی توفیق پائیں گے جو دلیل کی زبان میں بات کو سمجھنے اور ماننے کے لئے تیار ہوں۔ جو لوگ سچی دلیل کے آگے نہ جھکیں وہ گویا خدا کے آگے نہیں جھکے۔ انھوں نے خدا کو نہیں مانا۔ ایسے لوگوں کو اپنے لئے جہنم کے سوا کسی اور چیز کا انتظار نہ کرنا چاہیے۔

زمین و آسمان میں اگرچہ بے شمار نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں مگر وہ انھیں لوگوں کے لئے سبق بنتی ہیں جو ڈر رکھنے والے ہیں۔ ڈر یا اندیشہ وہ چیز ہے جو آدمی کو سنجیدہ بناتا ہے۔ جب تک آدمی کسی معاملہ میں سنجیدہ نہ ہو وہ اس معاملہ پر پورا دھیان نہیں دے گا اور نہ اس کے پہلوؤں کو سمجھے گا ——

پوری کائنات ایک زبردست تخلیقی توازن میں جکڑی ہوئی ہے۔ یہ اس بات کا کھلا ہوا اشارہ ہے کہ کائنات کا مالک ایسا مالک ہے جو انسان کو پکڑنے کی طاقت رکھتا ہے۔ اسی طرح پہلی زندگی جس کا ہم تجربہ کر رہے ہیں وہ اس کا یقینی ثبوت ہے کہ دوسری زندگی بھی ممکن ہے۔ موجودہ دنیا میں مادی نتائج کا نکلنا مگر اخلاقی نتائج کا نہ نکلنا تقاضا کرتا ہے کہ ایک اور دنیا بنے جہاں اخلاقی نتائج اپنی پوری صورت میں ظاہر ہوں۔ یہ سب انتہائی محکم باتیں ہیں مگر ان کا محکم ہونا وہی شخص جانے گا جو اندیشہ کی نفسیات کے تحت زندگی کے معاملہ کو دیکھتا ہو۔

إِنَّ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا وَرَضُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاطْمَأَنُّوا بِهَا وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ آيَاتِنَا غَافِلُونَ ﴿٧﴾ أُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿٨﴾ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ يَهْدِيهِمْ رَبُّهُم بِإِيمَانِهِمْ ۖ تَجْرِي مِن تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ ﴿٩﴾ دَعْوَاهُمْ فِيهَا سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلَامٌ ۚ وَآخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿١٠﴾

بے شک جو لوگ ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے اور دنیا کی زندگی پر راضی اور مطمئن ہیں اور جو ہماری نشانیوں سے بے پروا ہیں، ان کا ٹھکانا جہنم ہوگا بہ سبب اس کے جو وہ کرتے تھے۔ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کئے، اللہ ان کے ایمان کی بدولت ان کو پہنچا دے گا۔ ان کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی نعمت کے باغوں میں۔ اس میں ان کا قول ہوگا کہ اے اللہ تو پاک ہے۔ اور ملاقات ان کی سلام ہوگی۔ اور ان کی آخری بات یہ ہوگی کہ ساری تعریف اللہ کے لئے ہے جو رب ہے سارے جہان کا ۱۰-۷

جہنم کس کے لئے ہے —— ان لوگوں کے لئے جو اس دن کو بھولے ہوئے ہوں جب کہ خدا سے ان کا سامنا ہوگا۔ جو آخرت کی ابدی نعمتوں کے مقابلہ میں دنیا کی عارضی چیزوں پر راضی ہو گئے ہوں۔ جن کا یہ حال ہو کہ دنیا میں انھیں جو کچھ امتحان کے طور پر ملا ہے اسی پر وہ مطمئن ہو جائیں۔ جو غیر خدائی چیزوں میں اپنا دل لگالیں کہ خدا کی طرف سے ظاہر کی جانے والی حقیقتوں سے غافل ہو جائیں۔ یہ سب خدا کے نزدیک جہنمی راستوں میں چلنا ہے، اور جو لوگ جہنمی راستوں میں چل رہے ہوں وہ آخر کار جہنم کے سوا اور کہاں پہنچیں گے۔

"اللہ انھیں ان کے ایمان کی وجہ سے جنت کی منزل تک پہنچائے گا" اس سے معلوم ہوا کہ ایمان آدمی کے لئے رہنمائی ہے۔ وہ آدمی کو غلط راہوں سے بچا کر صحیح راستہ پر چلاتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اس کو حقیقی منزل تک پہنچا دیتا ہے۔

ایمان خدا کی دریافت ہے۔ جس آدمی کو ایمان حاصل ہو جائے اس کو علم کا سرا ہاتھ آجاتا ہے، وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ ہر معاملہ میں صحیح مقام سے اپنی سوچ کا آغاز کر سکے۔ وہ فکری بے راہ روی سے بچ کر فکری صحت کا مالک بن جائے۔ مزید یہ کہ خدا کو ماننا کسی کتابی فلسفہ کو ماننا نہیں ہے۔ یہ ایک زندہ خدا کو ماننا ہے جو بالآخر تمام انسانوں کو اپنے یہاں جمع کر کے ان کا حساب لینے والا ہے۔ اس طرح ایمان آدمی کے اندر اپنے انجام کے بارے میں اندیشہ کی کیفیت پیدا کر کے اس کو انتہائی سنجیدہ انسان بنا دیتا ہے۔ وہ اپنے کو مجبور پاتا ہے کہ

بنی تمام کارروائیوں کو صحیح اور غلط کی روشنی میں دیکھے اور صرف صحیح رخ پر چلے اور غلط رخ پر چلنے سے ہمیشہ پرہیز کرے۔

اس طرح ایمان آدمی کو صحیح فکر بھی دیتا ہے اور اسی کے ساتھ وہ قوت تمیز بھی جو اس کے لئے مستقل عملی رہنما بن جائے۔

آخرت کی جنت ان لوگوں کے لئے ہے جنھوں نے دنیا میں اپنے آپ کو اس کا مستحق ثابت کیا ہو۔ آخرت خدا کے براہ راست جلووں میں سرشار ہونے کا مقام ہے، وہاں بسنے کا موقع صرف ان لوگوں کو ملے گا جو دنیا میں خدا کے بالواسطہ جلووں سے سرشار ہوئے تھے۔ آخرت میں لوگوں کے دل ایک دوسرے کے لئے سلامتی اور خیر خواہی کے جذبات سے بھرے ہوئے ہوں گے، اس لئے وہاں کی آبادی میں وہی لوگ جگہ پائیں گے جنھوں نے دنیا میں اس بات کا ثبوت دیا تھا کہ دوسروں کے لئے ان کے دل میں سلامتی اور خیر خواہی کے سوا کوئی دوسرا جذبہ نہیں۔

وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ اِلَيْهِمْ اَجَلُهُمْ ۖ فَنَذَرُ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۱﴾ وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖٓ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا ۚ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ ۭ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲﴾

اگر اللہ لوگوں کے لئے عذاب اسی طرح جلد پہنچا دے جس طرح وہ ان کے ساتھ رحمت میں جلدی کرتا ہے تو ان کی مدت ختم کر دی گئی ہوتی۔ لیکن ہم ان لوگوں کو جو ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے ان کی سرکشی میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔ اور انسان کو جب کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے ہم کو پکارتا ہے۔ پھر جب ہم اس سے اس کی تکلیف کو دور کر دیتے ہیں تو وہ ایسا ہو جاتا ہے گویا اس نے کبھی اپنے کسی برے وقت پر ہم کو پکارا ہی نہ تھا۔ اس طرح حد سے گزر جانے والوں کے لئے ان کے اعمال خوش نما بنا دئے گئے ہیں ۱۲ — ۱۱

خدا کا قانون یہ ہے کہ کوئی شخص قابل انعام عمل کرے تو اس کا عمل فوراً اس کے اعمال نامہ میں شامل کر دیا جاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص قابل سزا فعل کا ارتکاب کرتا ہے تو خدا اس کو ڈھیل دیتا ہے تاکہ وہ کسی نہ کسی موڑ پر متنبہ ہو کر اپنی اصلاح کرے۔ خدا کا یہ قانون انسان کے لئے بہت بڑی رحمت ہے، ورنہ انسان اتنا ظالم ہے کہ وہ ہر وقت برائی کرنے پر آمادہ رہتا ہے، اور اگر لوگوں کو ان کی برائیوں پر فوراً پکڑا جانے

لگے تو ان کی مہلت عمر بہت جلد ختم ہو جائے اور زمین کی پشت چلنے والے انسانوں سے خالی ہو جائے۔

دنیا کی زندگی میں سرکش وہ لوگ بنتے ہیں جو دنیا میں یہ سمجھ کر رہیں کہ مرنے کے بعد انھیں خدا کا سامنا نہیں کرنا ہوگا۔ جو پکڑ کے اندیشہ سے خالی ہو کر زندگی گزارتے ہیں۔ جو سمجھتے ہیں کہ وہ آزاد ہیں کہ جو دھاندلی چاہیں کریں اور جو فساد چاہیں پھیلائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ لوگوں کے درمیان سچائی اور انصاف کے ساتھ معاملہ کرنے کا ایک ہی حقیقی محرک ہے۔ اور وہ یہ کہ آدمی یہ سمجھے کہ سب طاقت وروں کے اوپر ایک طاقت ور ہے۔ ہر آدمی اس کے آگے بے بس ہے۔ وہ ایک دن تمام انسانوں کو پکڑے گا اور ہر ایک مجبور ہوگا کہ اپنے بارے میں اس کے فیصلہ کو تسلیم کرے۔

دنیا کا نظام اس طرح بنا ہے کہ آدمی بار بار کسی نہ کسی تکلیف یا حادثہ کی زد میں آجاتا ہے، آدمی محسوس کرنے لگتا ہے کہ خارجی طاقتوں کے مقابلہ میں وہ بالکل بے بس ہے۔ اس وقت آدمی بے اختیار ہو کر خدا کو پکارنے لگتا ہے۔ وہ خدا کی قدرت کے مقابلہ میں اپنے عجز کا اعتراف کر لیتا ہے۔ مگر یہ حالت صرف اس وقت تک رہتی ہے جب تک وہ مصیبتوں کی گرفت میں ہو، مصیبت سے نجات پاتے ہی وہ دوبارہ ویسا ہی غافل اور سرکش بن جاتا ہے جیسا وہ پہلے تھا۔ ایسے لوگوں کے اظہار بندگی کو خدا تسلیم نہیں کرتا۔ کیونکہ اظہار بندگی وہ مطلوب ہے جو آزادانہ حالات میں کی جائے، مجبورانہ حالات میں ظاہر کی ہوئی بندگی کی خدا کے نزدیک کوئی قیمت نہیں۔

آدمی ایک توجیہ پسند مخلوق ہے۔ وہ ہر عمل کا ایک جواز تلاش کرتا ہے۔ اگر آدمی سرکشی کو اپنے لئے پسند کرے تو اس کا ذہن بھی اسی طرف مڑ جائے گا۔ وہ عملاً سرکشی کرے گا اور اس کا ذہن اس کی سرکشی کو درست ثابت کرنے کے لئے اس کو خوبصورت الفاظ فراہم کرتا رہے گا۔ اسی کا نام تزئین اعمال ہے۔ آدمی اپنی غلطیوں کو خوش نما الفاظ میں بیان کر کے اپنے کو مطمئن کر لیتا ہے کہ وہ حق پر ہے۔ مگر یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص آگ کا انگارہ اپنے ہاتھ میں لے لے اور سمجھے کہ وہ اس کو نہیں جلائے گا کیونکہ اس کا نام اس نے سرخ پھول رکھ دیا ہے۔

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا ۙ وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا ۚ كَذٰلِكَ نَجْزِى الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۳﴾ ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِى الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴﴾

اور ہم نے تم سے پہلے قوموں کو ہلاک کیا جب کہ انھوں نے ظلم کیا۔ اور ان کے پیغمبر ان کے پاس کھلی دلیلوں کے ساتھ آئے اور وہ ایمان لانے والے نہ بنے۔ ہم ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں مجرم لوگوں کو۔ پھر ہم نے ان کے بعد تم کو ملک میں جانشین بنایا تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کیسا عمل کرتے ہو ۱۴-۱۳

"پیغمبر اپنی قوموں کے پاس بینات کے ساتھ آئے مگر انھوں نے نہ مانا" بینہ جمع بینات کے معنی دلیل کے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کا داعی ہمیشہ بینات کی بنیاد پر اٹھتا ہے۔ لوگوں کو اسے دلائل کی سطح پر پہچاننا پڑتا ہے۔ جو لوگ ظاہری عظمتوں اور عوامی استقبالیوں میں خدا کے داعی کو پانا چاہیں وہ کبھی اس کو نہیں پائیں گے، کیونکہ خدا کا داعی وہاں موجود ہی نہیں ہوتا۔ نبی معجزہ دکھاتا ہے۔ مگر معجزہ آخری مرحلہ میں اتمام حجت کے لئے آتا ہے، دعوتی مرحلہ میں سارا کام دلائل کی بنیاد پر ہوتا ہے۔

کسی شخص یا گروہ کا ظالم ہونا یہ ہے کہ وہ دلیل کے روپ میں ظاہر ہونے والی دعوت خداوندی کو نہ پہچانیں اور اپنے خود ساختہ معیار پر نہ پانے کی وجہ سے اس کا انکار کر دیں۔ ایسے لوگ اپنی اس روش کی وجہ سے خدائی قانون کی زد میں آجاتے ہیں۔

ماضی کی جن قوموں پر انکار نبوت کے جرم میں خدا کا عذاب نازل ہوا وہ سرے سے نبوت کی منکر نہ تھیں۔ یہ تمام قومیں کسی نہ کسی سابق پیغمبر کو مانتی تھیں۔ البتہ انھوں نے وقت کے پیغمبر کو ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ پچھلے پیغمبر کا معاملہ یہ تھا کہ اس کی پشت پر تاریخ کی تصدیقات قائم ہو گئی تھیں اور قومی عصبیتیں اس کے ساتھ وابستہ ہو چکی تھیں۔ جب کہ معاصر پیغمبر ابھی اس قسم کی اضافی خصوصیات سے خالی تھا۔ انھوں نے اس گزرے ہوئے پیغمبر کا اقرار کیا جو نسلوں کی روایات کے نتیجہ میں ان کا قومی پیغمبر بن چکا تھا، جس کے ساتھ اپنے کو منسوب کرنا تاریخی عظمت کے مینارے اپنے کو منسوب کرنے کے ہم معنی تھا۔ انھوں نے اپنے قومی پیغمبر کو پیغمبر مانا مگر اس پیغمبر کا انکار کر دیا جس کو صرف دلیل اور برہان کے ذریعہ جانا جا سکتا تھا۔

یہ جرم خدا کی نظر میں اتنا شدید تھا کہ وہ لوگ نبی کے منکر قرار دے کر ہلاک کر دئے گئے۔

"پھر ہم نے اس کے بعد تم کو ملک میں خلیفہ بنایا" خلیفہ کے اصل معنی ہیں بعد کو آنے والا۔ یہ لفظ جانشین، خاص طور پر، اقتدار میں جانشین کے لئے بولا جاتا ہے۔ یہ جانشینی انسان کی ہوتی ہے نہ کہ خدا کی۔ کوئی انسان اقتدار میں خدا کا جانشین نہیں ہو سکتا۔ انسان ہمیشہ کسی مخلوق کا جانشین ہوتا ہے۔ قرآن میں جہاں بھی خلافت کا لفظ آیا ہے وہ مخلوق کی جانشینی کے لئے ہے نہ کہ خدا کی جانشینی کے لئے۔

کسی کو خلیفہ (جانشین) بنانا اعزاز کے لئے نہیں بلکہ صرف امتحان کے لئے ہوتا ہے۔ جانشین بنانے کا مطلب ایک کے بعد دوسرے کو کام کا موقع دینا ہے، ایک قوم کے بعد دوسری قوم کو امتحان کے میدان میں کھڑا کرنا ہے۔ جیسے ہندستان میں دیسی راجاؤں کی جگہ مغلوں کو اختیار دیا گیا۔ پھر ان کو ہٹا کر انگریز ان کے جانشین بنائے گئے۔ اس کے بعد انھیں ملک سے نکال کر اکثریتی فرقہ کے لئے جگہ خالی کی گئی۔ ان میں سے ہر بعد کو آنے والا اپنے پہلے کا خلیفہ تھا۔

ہمارے علماء

مولانا عبید اللہ سندھی (۱۸۷۲ - ۱۹۴۴) نے ہندستان کی آزادی کی تحریک کے زمانہ میں یورپ کا سفر کیا تھا۔ وہ یورپ کے سفر سے واپس آئے تو انھوں نے یہ تجویز پیش کی کہ علماء اپنا موجودہ کرتا اور پائجامہ اتار دیں اور ہیٹ اور پتلون پہنیں۔ اس سے ان کا جمود ٹوٹے گا اور ان کے اندر جدید حالات کے لحاظ سے سوچنے کی صلاحیت پیدا ہوگی۔ علماء یہ تجویز سن کر بگڑ گئے۔ کسی نے مولانا عبید اللہ سندھی کو کافر قرار دیا، کسی نے کہا کہ وہ پاگل ہو گئے ہیں۔

ہمارے علماء کبھی اس کے لئے تیار نہیں ہو سکتے کہ وہ ہیٹ اور کوٹ پینٹ پہن کر سڑکوں پر چلیں، حالانکہ یہ زیادہ سے زیادہ لغو ہے نہ کہ حرام۔ دوسری طرف یہی علماء جان بوجھ کر ایسے کام کرتے ہیں جو شریعت میں صراحۃً حرام قرار دئے گئے ہیں ——— وہ اسلامی اتحاد کو توڑتے ہیں، وہ ایک دوسرے کے خلاف تخریب کاری کے منصوبے بناتے ہیں۔ ان کا ایک گروہ دوسرے گروہ پر غبن، خیانت، کذب بیانی اور عہد شکنی کے الزامات لگاتا ہے۔ وہ ایک دوسرے کی پوشیدہ باتوں کا پتہ لگا کر عوام میں ان کو شہرت دیتے ہیں۔ اگر کوئی شخص ان کے اوپر تنقید کر دے تو اس کے خلاف ان کے انتقام کی آگ برسوں تک نہیں بجھتی۔

یہ سارے کام بلاشبہ خدا کی شریعت میں حرام ہیں۔ مگر ہمارے علماء پوری دلیری کے ساتھ ان کا ارتکاب کرتے ہیں، وہ اس مقصد کے لئے جلسے کرتے ہیں، لاکھوں روپے خرچ کرکے اخبار نکالتے ہیں جو ان کی ان خرافات کی اشاعت کرے، وہ اپنے لوگوں کو ملا کر جتھے بناتے ہیں اور پھر ایک جتھا دوسرے جتھے کو گرانے اور ذلیل کرنے کے لئے وہ تمام کارروائیاں کرتا ہے جو اس کے لئے ممکن ہیں۔

یہ صورت حال ثابت کر رہی ہے کہ ہمارے علماء کے یہاں اب صرف نمائش والا دین باقی رہ گیا ہے، حقیقت والا دین ان کے یہاں موجود نہیں۔ عوام میں اپنا دینی وقار قائم رکھنے کے لئے عرفی طور پر جن چیزوں کی اہمیت ہے ان پر وہ سختی سے قائم ہیں اور جو چیزیں خدا کے یہاں ان کو روسیاہ کرنے والی ہیں ان کی انھیں کوئی فکر نہیں۔ ان کو عوام کا ڈر ہے۔ مگر خدا کا ان کے دل میں کوئی ڈر نہیں۔

عوام چندے دیتے ہیں، عوام استقبال کرتے ہیں، عوام حلقہ فراہم کرتے ہیں۔ عوام کے بل پر قیادت و پیشوائی حاصل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگ سب سے زیادہ اہمیت اس بات کو دیتے ہیں کہ عوام کے درمیان ان کا دینی بھرم قائم رہے۔ ان کو دنیا کی ضرورت تھی جو عوام کے ذریعہ انھیں مل گئی۔ پھر خدا کی جنت اور جہنم کے لئے فکر مند ہونے کی انھیں کیا ضرورت۔

استہزار اور گریز

آدمی کے سامنے جب ایک ایسی سچائی آتی ہے جس کا توڑ وہ دلائل کی زبان میں نہ کر سکتا ہو تو اکثر وہ دو چیزوں کا سہارا لیتا ہے ۔ استہزار اور گریز۔ استہزار کا مقصد داعی کے بارے میں یہ تاثر دینا ہے کہ وہ اتنا حقیر شخص ہے کہ اس کی بات قابل اعتنا ہی نہیں۔ اسی طرح گریز کا طریقہ آدمی اس وقت اختیار کرتا ہے جب کہ اس کے پاس اصل بات کی براہ راست دلیل موجود نہ ہو۔ ایسے موقع پر وہ ادھر اُدھر کی باتیں زور شور سے بول کر یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کے پاس جواب دینے کے لئے بہت کچھ ہے، دلیل کے میدان میں وہ خالی نہیں۔

پہلی چیز کی ایک مثال قرآن کی سورہ نمبر ۳۷ میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنی وہ دعوت پیش کی جو قرآن کے مطابق تمام پیغمبروں کی مشترک دعوت تھی تو قریش نے کہا "کیا ہم ایک شاعر دیوانہ کے کہنے سے اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں" (الصافات ۳۶)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مضبوط دلائل کا قریش کے پاس کوئی جواب نہ تھا اس لئے انھوں نے آپ کو شاعر اور دیوانہ کہا تاکہ آپ کو ناچیز ظاہر کر کے آپ کی بات کو مذاق میں اڑا دیں۔

دوسری چیز کی مثال سورہ نمبر ۳ میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب اونٹ کا گوشت اور دودھ استعمال کرتے تھے۔ یہود نے ان چیزوں کو اپنی شریعت میں حرام کر رکھا تھا۔ چنانچہ یہود نے یہ کہنا شروع کیا کہ محمد اپنے کو ملت ابراہیمی کا حامل بتاتے ہیں حالاں کہ وہ ان چیزوں کو کھاتے ہیں جو ملت ابراہیمی میں حرام ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ ملت ابراہیمی پر ہم ہیں نہ کہ محمد اور ان کے ساتھی۔ قرآن میں کہا گیا کہ اگر تم سچے ہو تو اپنی مقدس کتاب تورات لاؤ اور دکھاؤ کہ اس کی کس آیت میں یہ بات لکھی ہوئی ہے (آل عمران ۹۳) اس کے جواب میں یہود نے تورات کی کوئی آیت پیش نہیں کی۔ البتہ وہ دوسری دوسری باتیں کہنے لگے۔ مثلاً یہ کہ یہ بات تو بالکل معلوم و مشہور ہے، پھر اس کے لئے تورات کی کوئی آیت پیش کرنے کی کیا ضرورت۔

انسان کا حال ہمیشہ یہی رہا ہے کہ جب وہ دلیل کے میدان میں اپنے کو خالی پاتا ہے تو وہ استہزار اور گریز کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ وہ آدمی کو ناقابل التفات ظاہر کرتا ہے یا غیر متعلق الفاظ بول کر یہ تاثر دیتا ہے کہ اس کے پاس کہنے کے لئے بہت کچھ موجود ہے۔ اس کی مثالیں پچھلے دور میں بھی دیکھی جا سکتی ہیں اور آج کے دور میں بھی۔

فساد کا ذمہ دار

منتخب التواریخ علامہ عبد القادر بدایونی کی مشہور کتاب ہے۔ موصوف شہنشاہ اکبر کے ہم عصر ہیں۔ اور اس کے دربار میں رہے ہیں۔ وہ اکبر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ ایک بادشاہ تھا جو حق کا طالب تھا اور اپنے اندر نفیس جوہر رکھتا تھا (بادشاہے کہ جوہر نفیس داشت و طالب حق) اکبر اپنی ابتدائی زندگی میں بڑا دیندار اور عبادت گزار تھا۔ اس نے سات عالم صرف نماز کی امامت کے لئے مقرر کر رکھے تھے جن میں ایک خود ملاّ عبد القادر بدایونی تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ اکبر کے دربار میں پانچوں وقت جماعت کے ساتھ نماز ہوتی تھی جس میں بادشاہ خود شریک ہوتا تھا (ہر پنج وقت برائے خاطر جماعت در دربار می گفتند) اکبر جب سفر کے لئے نکلتا تو اس کے ساتھ ایک خاص خیمہ نماز کا ہوتا تھا جس میں بادشاہ جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتا تھا۔

شہنشاہ اکبر کے اس دیندارانہ مزاج کا یہ قدرتی نتیجہ ہوا کہ اس کے دربار میں علمار جمع ہونے لگے۔ اکبر کو حدیثیں سننے اور مسائل دین پر گفتگو کرنے سے خاص دل چسپی تھی۔ اس مقصد کے لئے وہ علمار کی صحبتوں میں دیر دیر تک بیٹھتا تھا، ملا بدایونی نے لکھا ہے کہ اکبر کے گرد جمع ہونے والے علمار کی تعداد ایک سو سے بھی اوپر تک پہنچ گئی تھی (جماعت مناظرین و مباحثین چہ محقق چہ مقلد از صد نفر متجاوز بودند) بادشاہ کے گرد جمع ہونے والے یہ علمار قدرتی طور پر بادشاہ کی عنایتوں میں حصہ پانے لگے۔ بس یہیں سے وہ حالات پیدا ہوئے جس نے ایک دیندار بادشاہ کو بے دین بنا ڈالا۔

ظاہر ہے کہ سو آدمی بیک وقت بادشاہ کے قریب نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ چنانچہ پہلا جھگڑا نشست گاہوں پر شروع ہوا۔ ہر ایک اس کوشش میں رہتا کہ وہ بادشاہ کے قریب بیٹھے۔ اب جس کو قریب جگہ نہ ملتی وہ جلن میں مبتلا ہوتا۔ اسی طرح بادشاہ کے انعامات میں جس کو کم حصہ ملتا وہ اس سے حسد کرنے لگتا جس کو اتفاق سے زیادہ انعام مل گیا ہو۔

علمار کا حال یہ ہوا کہ وہ ایک دوسرے کو گرانے کے لئے ایک دوسرے کی برائیاں کرنے لگے۔ ملاّ بدایونی کے الفاظ میں علمار کے گروہ سے بہت سی بیہودگی ظاہر ہوئی (بدنفسی ہا ازیں جماعت ظاہر شدند) ایک نے دوسرے کے خلاف زبان کی تلوار نکالی، ایک دوسرے کی نفی اور تردید میں لگ گیا۔ ان کا اختلاف یہاں تک بڑھا کہ ایک نے دوسرے کو کافر بنایا، ایک نے دوسرے کو گمراہ ثابت کیا (با یک دیگر تیغ زبان کشیدہ در مقام تنافی و تقابل بودند و اختلاف بجائے رسید کہ تکفیر و تضلیل ہمدگر می نمودند) نوبت یہاں تک پہنچی کہ شاہی دربار میں ان علمار کی گردنوں کی رگیں پھول آئیں، آوازیں بلند ہوئیں اور زبردست شور برپا ہوا

رگ گردن علمارِ زماں برآمده آواز ہائے بلند و دمدمہ بسیار ظاہر شد)

علمار کی ان نازیبا حرکتوں سے بادشاہ کا متاثر ہونا فطری تھا۔ اس کو سخت گراں گزرا (برخاطر اشرف گراں آمد) اس کے بعد بادشاہ نے پہلی کارروائی یہ کی کہ ملا بدایونی کو حکم دیا کہ اس قسم کے نامعقول عالموں کو آئندہ بادشاہ کی مجلس میں آنے نہ دیں۔ اس کے باوجود علمار کی حرکتیں بند نہ ہوئیں۔ ان کی باتیں بادشاہ کے لئے ایمانی قوت کے بجائے بدگمانی اور برگشتگی میں اضافہ کا سبب بنتی رہیں۔ علمار کا یہ حال تھا کہ ایک دوسرے کی ضد میں کوئی عالم ایک چیز کو حرام کہتا اور دوسرا اس کو حلال بتاتا۔ ان چیزوں نے بادشاہ کو شک میں ڈال دیا۔ اس کی حیرانی بڑھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ اصل مقصد ہی سامنے سے جاتا رہا (در شک انداختہ حیرت بر حیرت افزود و مقصود از میاں رفت)

درباری علمار میں سے ایک ملا عبداللہ سلطان پوری تھے۔ ان کا سرکاری لقب مخدوم الملک تھا۔ انھوں نے مختلف طریقوں سے جو دولت جمع کی تھی اس کا حال ملا بدایونی نے ان الفاظ میں لکھا ہے "ان کا انتقال ہوا تو بادشاہ کے حکم سے ان کے مکان کا جائزہ لیا گیا جو لاہور میں تھا۔ اتنے خزانے اور دفینے ظاہر ہوئے کہ ان خزانوں کے تالوں کو وہم کی کنجیوں سے بھی کھولنا ممکن نہ تھا۔ حتیٰ کہ سونے سے بھرے ہوئے چند صندوق مخدوم الملک کے خاندانی قبرستان سے برآمد ہوئے جنھیں مُردوں کے بہانے سے زمین میں دفن کیا گیا تھا۔"

شاہ عبدالقدوس گنگوہی کے پوتے ملا عبدالنبی تھے جو اکبر کے زمانہ کے سب کے بڑے عالم سمجھے جاتے تھے۔ پورے ملک کے خطبار اور ائمہ کے درمیان جاگیر تقسیم کرنے کا انھیں اختیار تھا۔ شہنشاہ اکبر ان کا اتنا زیادہ احترام کرتا تھا کہ ان کی جوتیاں سیدھی کرتا تھا۔ مگر مذکورہ مخدوم الملک اور ملا عبدالنبی کے درمیان رقیبانہ کشمکش شروع ہوئی۔ ایک نے دوسرے کو جاہل اور گمراہ ثابت کرنے کے لئے رسالے لکھے۔ ایک نے دوسرے کی بابت لکھا کہ چونکہ انھیں بواسیر ہے اس لئے ان کے پیچھے نماز ناجائز ہے۔ دوسرے نے لکھا کہ تم اپنے باپ کے عاق کئے ہوئے بیٹے ہو اس لئے تمھارے پیچھے بھی نماز جائز نہیں۔ اس قسم کی لایعنی بحثوں سے شاہی کیمپ صبح و شام گونجتا رہتا تھا۔

شہنشاہ اکبر ابتداءً نہایت دین دار تھا اور دینی شخصیتوں سے بڑی عقیدت رکھتا تھا۔ مگر دین کے نمائندوں کی خرافات کو مسلسل دیکھنے کے بعد وہ دین سے بھی بیزار ہوگیا اور دینی شخصیتوں سے بھی۔ علمار کا یہ حال تھا کہ جانوروں کی طرح آپس میں لڑتے۔ ایک عالم ایک فعل کو حرام بتاتا اور دوسرا عالم اسی فعل کو حلال قرار دیتا۔ ملا بدایونی لکھتے ہیں:

علمار عہد خویش را بہتر از غزالی و رازی تصور نمودہ بودند۔ رکاکت ہائے ایشاں را دیدہ قیاس غائب بر شاہد	اکبر اپنے زمانہ کے علمار کو غزالی اور رازی سے بہتر سمجھتا تھا۔ جب اس نے ان کی پست حرکتوں کو دیکھا تو حال

کردہ سلف را نیز منکر شدند   پر ماضی کو قیاس کر کے سب کا منکر ہو گیا۔

اس کے بعد اکبر کے دربار میں علمار کا وقار ختم ہو گیا۔ ابوالفضل اور فیضی جیسے لوگ دربارِ شاہی میں اہمیت اختیار کر گئے۔ اکبر کو علمار کی باتوں کی کوئی پرواہ نہیں رہی۔ ابوالفضل اکبر کے سامنے علمار کا مذاق اڑاتا اور اکبر اس کو سن کر خوش ہوتا۔ ملا بدایونی کے الفاظ میں: کسی بحث کے درمیان اگر ائمہ مجتہدین کی کوئی بات پیش کی جاتی تو ابوالفضل اس کو نظر انداز کرتے ہوئے کہتا کہ فلاں حلوائی، فلاں کفش دوز اور فلاں چرم ساز کے قول سے تم میرے اوپر حجت قائم کرنا چاہتے ہو۔

حسد اور کبر یہودی علمار کا عام مرض تھا۔ یہی ہمارے علمار کا بھی سب سے زیادہ عام مرض بن گیا ہے۔ صحابہ کرام بھی دین کے عالم تھے۔ مگر ان کے درمیان حسد اور کبر کا وجود نہ تھا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ بعد کے زمانہ کے علمار کے اندر یہ اخلاقی برائی اس قدر عمومی طور پر پیدا ہو گئی۔ اس کی وجہ خود علم کا فرق ہے۔ صحابہ کرام کے زمانہ میں عالم ہونے کا مطلب کچھ اور تھا اور بعد کے زمانہ میں عالم ہونے کا مطلب کچھ اور۔ صحابہ کرام کا نصاب تعلیم صرف قرآن و حدیث تھا، اس کے برعکس بعد کے زمانہ میں دینی نصاب کے نام سے جو تعلیمی نصاب رائج ہوا اس میں قرآن و حدیث برائے نام رہ گئے اور اصل اہمیت دوسرے فنون نے لے لی۔ اس فرق کا نتیجہ لازماً ظاہر ہونا تھا، کیونکہ قرآن و حدیث کے علم سے آدمی کے اندر خشیت پیدا ہوتی ہے (فاطر ۲۸) اور فنی علوم سے احساس برتری (غافر ۸۳)

علم کے ساتھ عام طور پر بڑائی کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ اس سے مستثنیٰ صرف خدا کا علم ہے۔ خدا کا علم ایک ایسا علم ہے جس میں آدمی مالک کائنات کی عظمت اور اس کے مقابلہ میں اپنے عجز کو دریافت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدائی علم آدمی کے اندر خاکساری پیدا کرتا ہے۔ جبکہ دوسرے علوم آدمی کے اندر عجب اور گھمنڈ پیدا کرنے کا سبب بنتے ہیں۔

خدائی علم ابتدائی زمانہ میں صرف خدا کی کتاب اور رسول کی سنت پر مشتمل ہوتا ہے۔ مگر بعد کے زمانہ میں اس کو فنی بنانے کی کوشش شروع ہو جاتی ہے۔ فنی بنانے کی کوشش میں سادہ خدائی علم اس سطح پر پہنچ جاتا ہے جو عام دنیوی علوم کی سطح ہے۔ مشکل اصطلاحیں، پیچیدہ اسلوب، منطقی ترتیب، دور از کار بحثیں وغیرہ مل کر دینی علم کو ایسی شکل دے دیتے ہیں کہ وہ کہنے کے لئے بظاہر ایک دینی علم ہوتا ہے۔ مگر اپنے مجموعی تاثر کے اعتبار سے وہ ایک عام علم بن جاتا ہے۔ اس کو پڑھنے سے آدمی کے اندر نہ کوئی ربانی شعور جاگتا اور نہ اس کے دل میں خوف خدا کا کوئی قطرہ ٹپکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے علم کے ماہرین وہی کچھ کریں گے جس کی ایک تصویر اوپر کے واقعہ میں نظر آتی ہے۔

دیباچہ تذکیر القرآن

قرآن اگرچہ ایک اعلیٰ ترین علمی کتاب ہے، اس میں فطری حدود کے اندر علم وعقل کی پوری رعایت رکھی گئی ہے۔
ژآن میں کسی بات کو ثابت کرنے کے لئے معروف علمی اور فنی انداز اختیار نہیں کیا گیا ہے۔ قرآن کا طریقہ یہ ہے کہ فنی
راب اور علمی تفصیلات کو چھوڑ کر اصل بات کو مؤثر دعوتی اسلوب میں بیان کیا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کا مقصد
ی مطالعہ پیش کرنا نہیں ہے، اس کا مقصد تذکیر ونصیحت ہے اور تذکیر ونصیحت کے لئے ہمیشہ سادہ اسلوب کارآمد
تا ہے نہ کہ فنی اسلوب۔

تاہم یہ ایک طالب علمانہ ضرورت ہے کہ قرآن کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک آدمی قرآن کے بیانات کی علمی
نصیلات اور اس کے فنی پہلوؤں کو جاننا چاہے۔ ایسی حالت میں یہ سوال ہے کہ قرآن کی تفسیر کے لئے کیا انداز اختیار
یا جائے۔ قرآن کی تفسیر اگر اس کے اپنے سادہ دعوتی اسلوب میں کی جائے تو اس کا یہ فائدہ ہوگا کہ تفسیر میں نصیحت
ر تذکیر کی فضا باقی رہے گی جو قرآن کا اصل مقصود ہے مگر ایسی صورت میں خالص علمی تقاضوں کی رعایت نہ ہوسکے
ی۔ دوسری طرف اگر علمی وفنی پہلوؤں کو ملحوظ رکھتے ہوئے مفصل تفسیر لکھی جائے تو بعض خاص طبیعتوں کو وہ پسند
سکتی ہے مگر عام لوگوں کے لئے وہ ایک مقدس دستاویز بن کر رہ جائے گی۔ مزید یہ کہ وہ قرآن کے اصل مقصد —
ذکیر ونصیحت کو مجروح کرنے کی قیمت پر ہوگا۔

اس مسئلہ کا ایک سادہ حل یہ ہے کہ تفسیر اور معلومات کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا جائے۔ قرآن کے ساتھ
تفسیر شائع کی جائے وہ خود تو نصیحت اور تذکیر کے انداز میں ہو۔ اس کے بعد اس سے الگ ایک مستقل کتاب
موس القرآن یا قرآنی انسائیکلوپیڈیا کے طور پر مرتب کرکے شائع کی جائے۔ اس دوسری کتاب میں وہ تمام فنی
شیں اور علمی اور تاریخی معلومات ہوں جو قرآنی حوالوں کو تفصیلی انداز میں سمجھنے کے لئے ضروری ہیں۔ مثلاً حضرت
براہیم علیہ السلام سے متعلق آیات کے ذیل میں جو تفسیر لکھی جائے اس میں تو آنجناب کی زندگی کے صرف قابل عبرت
پہلوؤں کی وضاحت ہو جن کی طرف قرآن میں اشارے کئے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ آپ کے بارے میں جو تاریخی اور
ثریاتی معلومات ہیں ان کو قاموس القرآن میں جمع کر دیا جائے جن کو آدمی لفظ "ابراہیم" کے تحت دیکھ سکے۔ اسی
طرح نحوی، فقہی، کلامی اور طبیعیاتی مسائل کی تفصیل بھی قرآن کی انسائیکلوپیڈیا میں درج ہوں نہ کہ قرآن کی تفسیر میں۔

تذکیرالقرآن اسی نہج پر قرآن کی ایک خدمت ہے۔ تذکیرالقرآن کو ہم نے اصل مطالب قرآن کی یاددہانی تک محدود رکھا ہے۔ اور جہاں تک دیگر علمی وفنی معلومات کا تعلق ہے وہ انشاء اللہ علیحدہ کتاب کی صورت میں مرتب کر کے شائع کی جائیں گی۔

یہ انداز عین وہی ہے جو خود قرآن نے اختیار کیا ہے۔ قرآن میں طبیعیات اور فلکیات کے حوالے ہیں مگر ان کی تفصیلات کو خدا نے چھوڑ دیا کہ بعد کے زمانہ کے اہل علم انھیں دریافت کر کے ان کو مدون کریں۔ قرآن میں قدیم شخصیتوں کا ذکر ہے۔ مگر خدا نے یہ کام آئندہ آنے والے والے ماہرین اثریات کے لئے باقی رکھا کہ وہ ان کی تحقیق کریں اور ان کی تاریخی تفصیلات سے دنیا کو آگاہ کریں۔ خدا قرآن میں خود ان تمام واقعات کو شامل کر سکتا تھا۔ مگر وہ صرف اس قیمت پر ہوتا کہ قرآن میں عبرت اور نصیحت کی فضا ختم ہو جائے۔ چنانچہ خدا نے، ہر چیز سے باخبر ہونے کے باوجود، سارا زور صرف نصیحت کی باتوں پر دیا اور بقیہ تفصیلات کو دوسروں کے لئے چھوڑ دیا۔

قرآن میں ایک طرف معلومات کی نوعیت کی بے شمار تفصیلی باتوں کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ دوسری طرف بنیادی نصیحت والی باتوں کو بار بار دہرایا گیا ہے حتیٰ کہ بہت سے لوگوں کو یہ کہنے کا موقع مل گیا ہے کہ قرآن میں مضامین کی تکرار ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کا یہ مقصد نہیں کہ لوگ اس کو معلومات کی ایک کتاب سمجھ کر پڑھ لیں۔ قرآن خدا اور آخرت کی باتوں کو لوگوں کی روح کی غذا بنانا چاہتا ہے۔ کسی چیز کو آدمی معلوماتی طور پر پڑھے تو اس کی تکرار اس کو ناگوار ہوگی۔ مگر جو چیز آدمی کی زندگی میں روح کی غذا بن کر داخل ہو جائے اس کی ہر تکرار آدمی کو نئی لذت دیتی ہے۔ جہاں لذت ہو وہاں تکرار کا تصور ختم ہو جاتا ہے۔ قرآن میں یہ انداز اس لئے اختیار کیا گیا تاکہ وہ لوگ چھٹ کر الگ ہو جائیں جو معلومات اور تکرار کی اصطلاحوں میں پڑے ہوئے ہیں اور وہ انسان چن لئے جائیں جن کے لئے قرآنی حقیقتیں لذت روح کا درجہ حاصل کر چکی ہوں۔

قرآن ایک دعوتی کتاب

قرآن عام طرز کی علمی تصنیف نہیں، وہ ایک دعوتی کتاب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک بندے کو ساتویں صدی عیسوی کے ثلث اول میں ایک خاص قوم کے اندر اپنا نمائندہ بنا کر کھڑا کیا اور اس کو اپنے پیغام کی پیغام بری پر مامور فرمایا۔ اس پیغمبر نے اپنے ماحول میں یہ کام شروع کیا اور اسی کے ساتھ قرآن کا تھوڑا تھوڑا حصہ حسب ضرورت اس کے اوپر اترتا رہا۔ یہاں تک کہ ۲۳ سال میں پیغمبر کے دعوتی کام کی تکمیل کے ساتھ قرآن کی بھی تکمیل ہو گئی۔

قرآن اگرچہ خدا کی ابدی رہنمائی ہے مگر مذکورہ ترتیب نے اسی کے ساتھ اس کو تاریخی کتاب بھی بنا دیا ہے۔ قرآن ایک ایسی کتاب ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ابدی رہنمائی کو تاریخ کے سانچہ میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔ ایسی حالت میں بعد کے زمانہ میں قرآن کی تفسیر کرنا آدمی کو ایک نئے مسئلہ سے دوچار کر دیتا ہے۔ قرآن کی تفسیر اگر اس ابتدائی پس منظر کی روشنی میں کی جائے جس میں قرآن کے احکام اترے تھے تو قرآن قدیم زمانہ کی ایک تاریخی کتاب معلوم ہوگی۔ اس کے برعکس قرآن کی تفسیر اگر اس کی ابدی اہمیت کی بنیاد پر کی جائے تو اس کا تاریخی پہلو مجروح ہوتا ہوا دکھائی

دیتا ہے۔ اس مسئلہ کی وجہ سے بعد کے زمانہ میں قرآن کی تفسیر کرنا ایک ایسا کام بن گیا ہے جس میں دوگونہ پہلوؤں کو نبھانا ضروری ہو۔

تذکیر القرآن میں یہی دوگونہ انداز اختیار کیا گیا ہے۔ اس میں تاریخی پس منظر بھی مختصر طور پر دکھایا گیا ہے مگر اس طرح نہیں کہ قرآن ایک تاریخی کتاب معلوم ہونے لگے۔ اسی طرح اس میں قرآنی تعلیمات کو آج کے حالات کے مطابق کرتے ہوئے بیان کیا گیا ہے۔ مگر ایسا نہیں کہ قرآن اپنی تاریخی بنیاد سے بالکل علیحدہ ہو جائے۔

قرآن کا مقصد نزول

قرآن کس لئے آتارا گیا ہے، ایک لفظ میں اس کا جواب یہ ہے کہ انسان کے بارے میں خدا کی اسکیم کو بتانے کے لئے۔ انسان کو خدا نے ابدی مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا ہے۔ موجودہ محدود دنیا میں پچاس سال یا سو سال گزار کر اس کو آخرت کی دنیا میں داخل کر دیا جاتا ہے۔ جہاں اس کو مستقل طور پر رہنا ہے۔ موجودہ دنیا عمل کرنے کی جگہ ہے اور آخرت کی دنیا اس کا انجام پانے کی جگہ۔ آج کی زندگی میں آدمی جیسا عمل کرے گا اسی کے مطابق وہ اپنی اگلی زندگی میں اچھا یا برا بدلہ پائے گا۔ کوئی اپنی نیک کرداری کے نتیجہ میں ابدی طور پر جنت میں جائے گا اور کوئی اپنی بدکرداری کی وجہ سے ابدی طور پر جہنم میں۔ قرآن اس لئے آتارا گیا کہ اس سنگین مسئلہ سے آدمی کو باخبر کرے اور اس کو بتائے کہ اگلی زندگی میں برے انجام سے بچنے کے لئے اسے اپنی موجودہ زندگی میں کیا کرنا چاہئے۔

خدا نے انسان کو فہم و شعور کے اعتبار سے اسی صحیح فطرت پر پیدا کیا ہے جو اس کو انسانوں سے مطلوب ہے۔ پھر اس نے گرد و پیش کی پوری کائنات کو مطلوبہ درست کردار کا عملی مظاہرہ بنا دیا ہے۔ تاہم یہ سب کچھ خاموش زبان میں ہے۔ انسانی فطرت احساسات کی صورت میں اپنا کام کرتی ہے اور فطرت کے مظاہر تمثیل کی صورت میں۔ قرآن اس لئے آیا کہ فطرت اور کائنات میں جو کچھ خاموش زبان میں موجود ہے وہ نطق کی زبان میں اس کا اعلان کر دے تاکہ کسی کے لئے اس کا سمجھنا مشکل نہ رہے۔ فطرت اور کائنات اگر آدمی کی خاموش رہنما ہیں تو قرآن ایک ناطق رہنما۔

مزید یہ کہ قرآن ایک ایسے پیغمبر پر آتارا گیا جو غلبہ کا پیغمبر تھا۔ پچھلے انبیاء صرف داعی کی حیثیت سے بھیجے گئے۔ ان کا کام اس وقت ختم ہو جاتا تھا جب کہ وہ اپنی مخاطب قوم کو خدا کی مرضی سے پوری طرح آگاہ کر دیں۔ انھوں نے اپنی مخاطب قوموں کی زبان میں کلام کیا۔ مگر انسان نے اپنی آزادی کا غلط استعمال کرتے ہوئے ان کی بات نہیں مانی۔ اس طرح پچھلے زمانوں میں خدا کی مرضی انسان کی زندگی میں عملی صورت اختیار نہ کر سکی۔ پیغمبر آخر الزماں کو خدا نے غلبہ کی نسبت دی۔ یعنی آپ کے لئے فیصلہ کر دیا کہ آپ کا مشن صرف پیغام رسانی پر ختم نہ ہوگا بلکہ خدا کی خصوصی مدد سے اس کو عملی واقعہ بننے تک پہنچایا جائے گا۔ اس خدائی فیصلہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ خدا کے دین کے حق میں ہمیشہ کے لئے ایک مزید تائیدی بنیاد فراہم ہو گئی، یعنی مذکورہ بالا اہتمام کے علاوہ انسان کی حقیقی زندگی میں خدا کی مرضی کا ایک کامل عملی نمونہ۔

پچھلے زمانہ میں خدا کے جتنے پیغمبر آئے وہ سب اسی دعوت کو لے کر آئے جس کو لے کر پیغمبر آخر الزماں کو بھیجا گیا تھا۔ مگر پچھلے پیغمبروں کے ساتھ عام طور پر ایسا ہوا کہ لوگوں نے ان کے پیغام کو نہ مانا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس کو اپنی

دی مصلحتوں کے خلاف سمجھتے تھے۔ ان کو غلط طور پر یہ اندیشہ تھا کہ اگر انھوں نے خدا کے سچے دین کو پکڑا تو ان کی بنی
ئی دنیا تباہ ہو جائے گی۔ قرآن کی تاریخ اس اندیشہ کی عملی تردید ہے۔ قرآن کے ذریعہ جو تحریک چلائی گئی اس کو خدا نے
خصوصی نصرت کے ذریعہ دعوت سے شروع کر کے واقعہ بننے کے مرحلہ تک پہنچایا اور اس کے عملی نتائج کو دکھا دیا۔ اس
ح خدا کے دین کی ایک مستقل تاریخ وجود میں آگئی۔ اب قیامت تک لوگ حقیقی تاریخ کی زبان میں دیکھ سکتے ہیں کہ خدا
سچے دین کو اختیار کرنے کے نتیجہ میں کس طرح زمین و آسمان کی تمام برکتیں نازل ہوتی ہیں۔
پھر اسی کے ذریعہ قرآن کی مستقل حفاظت کا انتظام بھی کر دیا گیا۔ ایک بڑے جغرافیہ میں اہل اسلام کا
دار اور وہاں اسلامی تہذیب و تمدن کا غلبہ اس بات کی ضمانت بن گیا کہ قرآن کو ایسا حفاظتی ماحول مل جائے جہاں کوئی
میں کسی قسم کی تبدیلی پر قادر نہ ہو سکے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مسلمانوں کا غلبہ تقریباً ڈیڑھ ہزار سال سے قرآن
ؤکیدار بنا ہوا ہے۔

ربانی دسترخوان

قرآن کو کچھ لوگ فضائل کی کتاب سمجھتے ہیں، کچھ لوگ مسائل کی کتاب اور کچھ لوگ سیاست کی کتاب۔ تینوں باتوں
جزئی صداقت ہے مگر ان میں سے کوئی بھی قرآن کی صحیح تعبیر نہیں۔
قرآن کو فضائل کی کتاب ماننے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی آیتوں اور سورتوں میں طلسماتی برکتیں چھپی ہوئی ہیں۔ اور
ن کے محض الفاظ کو دہرا لینا ان برکتوں کے حصول کے لئے کافی ہے۔ اگر اس بات کو مان لیا جائے تو قرآن کی وہ تمام آیتیں
ی ہو جاتی ہیں جن میں آدمی کو غور کرنے پر ابھارا گیا ہے۔ قرآن ایسی آیتوں سے بھرا ہوا ہے جو آدمی کو اکساتی ہیں کہ وہ الفاظ
گزر کر معانی کی گہرائی میں اترنے کی کوشش کرے۔ وہ قرآن میں تدبر کرے اور قرآنی زاویۂ نگاہ سے اپنے آپ کو اور
نات کو دیکھے۔ ان تعلیمات کی روشنی میں دیکھئے تو قرآن کا مقصد ایسے انسان پیدا کرنا ہے جن کی فکری قوتیں بیدار
ں، جو قرآن سے ذہنی غذا حاصل کریں اور عبرت کی نگاہ کے ساتھ دنیا میں زندگی گزاریں۔ ایسی حالت میں قرآن کو
ائل کی کتاب کہنا قرآن کی تصغیر ہے۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن ذہنوں کو کھولنے والی کتاب نہیں۔ وہ صرف
ت کی کتاب ہے جس کو بند ذہن کے ساتھ پڑھا جائے اور پھر بند غلاف میں محفوظ کر کے رکھ دیا جائے۔
اسی طرح قرآن کو مسائل کی کتاب کہنا بھی قرآن پر ظلم کرنا ہے۔ "مسائل" کے لفظ سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ قرآن
یے اعمال کی کتاب ہے جن کو ظاہری آداب کے ساتھ ادا کر لینا کافی ہو۔ حالانکہ قرآن میں اس کے مطلوب اعمال کے
ہری آداب کا ذکر ہی نہیں۔ قرآن آدمی کو ایمان کی دعوت دیتا ہے مگر وہ اس ایمان کو ایمان نہیں مانتا جو داخل القلب
ان نہ ہو، جس میں صحت مخارج کے ساتھ بس کلمۂ ایمان کے الفاظ کو دہرا دیا گیا ہو۔ قرآن کے نزدیک حقیقی ایمان وہ
ے جو روح میں اتر جائے، جس میں آدمی کے دل کی دھڑکنیں شامل ہو جائیں۔ قرآن نماز کو فلاح کا ذریعہ بتاتا ہے مگر
اُن کی مطلوب نماز وہ ہے جو خشوع کی نماز ہو نہ کہ سہو کی نماز۔ قرآن چاہتا ہے کہ لوگ اللہ کا ذکر کریں۔ مگر وہ ذکر نہیں جو
ار لسان کے طور پر ہوتا ہے بلکہ ایسا ذکر جس میں وہ والہانہ شیفتگی شامل ہو جو قومی ہیروؤں کے ذکر میں ہوتی ہے بلکہ اس

بھی بڑھ کر۔ قرآن کے نزدیک قربانی بہت بڑا عمل ہے مگر وہ قربانی نہیں جو گوشت اور خون کے ہم معنی ہو بلکہ وہ قربانی
آدمی کے لئے تقویٰ کا ذریعہ بن جائے۔ اس طرح کے بے شمار احکام ہیں جو بتاتے ہیں کہ قرآن معروف معنوں میں مسائل
کتاب نہیں بلکہ حقیقت کی کتاب ہے۔ وہ انسان کے اندر زندہ عمل دیکھنا چاہتا ہے نہ کہ محض ظاہری آداب و قواعد
الاعمل۔

قرآن میں یقیناً بعض سیاسی نوعیت کے احکام ہیں۔ مگر قرآن کو کتاب سیاست سمجھنا ایسا ہی ہے جیسے بعض
ئی مشابہت کی بنا پر انسان کو معاشی حیوان سمجھنا۔ اس نقطۂ نظر کے حاملین یہ دیکھتے ہیں کہ نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ
سلم کے ذریعہ یہ واقعہ ہوا کہ دعوت و تبلیغ سے شروع ہو کر آپ کا مشن حکومت و سیاست تک پہنچا۔ اس بنا پر وہ کہتے
یں کہ خدا کے پیغمبر اس لئے آتے ہیں کہ مخصوص احکام کی بنیاد پر خدا کی حکومت قائم کریں۔ مگر قرآن سے یہ ثابت ہے
کہ خدا کی طرف سے جتنے پیغمبر آئے ان کا مشن الگ الگ نہ تھا بلکہ سب کا مشن ایک تھا۔ حتیٰ کہ قرآن میں پچھلے نبیوں کا
ذکر کر کے نبی آخرالزماں سے کہا گیا ہے کہ تم بھی انھیں کی پیروی کرو (فبھداھم اقتدہ) ایسی حالت میں یہ سوال ہے
کہ جب نبیوں کا مشن خدائی حکومت قائم کرنا ہوتا ہے تو آخری نبی کے سوا دوسرے نبیوں نے بھی آپ کی طرح حکومت
کیوں نہ قائم کی۔

اس نقطۂ نظر کے حاملین اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ عمل کی حد تک تمام نبیوں نے خدائی حکومت کے قیام
کے لئے جدوجہد کی۔ البتہ کسی کا عمل کوشش کے مرحلہ میں رہ گیا اور کسی کا عمل آخری نتیجہ تک پہنچا۔ مگر یہ جواب متعدد وجوہ
سے غلط ہے۔ مثال کے طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو لیجئے۔ اگر آنجناب کا مشن یہ تھا کہ مصر کے اقتدار سے فرعون کو
بے دخل کر کے وہاں خدائی قانون کی حکومت قائم کریں تو ایسا کیوں ہوا کہ جب خدا نے فرعون کو ہلاک کر دیا اور اس کی
پوری جنگی طاقت کو سمندر میں غرق کر دیا تو حضرت موسیٰ مصر کو چھوڑ کر صحراے سینا میں چلے گئے۔ اگر آپ کا مشن مصر میں
حکومت الٰہیہ قائم کرنا تھا تو فرعون کی غرقابی کے بعد مصر میں اس کا پورا موقع آپ کے لئے کھل چکا تھا۔ ایسی حالت میں
مصر کو چھوڑ کر چلے جانے کی کیا توجیہہ کی جائے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن خدائی نعمتوں کا ابدی خزانہ ہے، قرآن خدا کا تعارف ہے۔ قرآن بندے اور خدا کا
مقام ملاقات ہے۔ مگر اس قسم کے مفروضہ خیالات نے قرآن کو لوگوں کے لئے ایک ایسی کتاب بنا دیا جو یا تو ایک چٹیل
زمین ہے جہاں آدمی کی روح کے لئے کوئی غذا نہیں یا وہ کسی شاعر کے مجموعہ کلام کی طرح ایک ایسا لفظی مجموعہ ہے
جس سے ہر آدمی بس اپنے مخصوص ذہن کی تصدیق حاصل کر لے۔ وہ اصلاً خود اپنے آپ کو پائے اور یہ سمجھ کر خوش ہو
کہ اس نے خدا کو پا لیا ہے۔

قرآن فہمی کے شرائط

قرآن ایک فکری کتاب ہے اور فکری کتاب میں ہمیشہ ایک سے زیادہ تعبیر کی گنجائش رہتی ہے۔ اس لئے قرآن
کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پڑھنے والا خالی الذہن ہو۔ اگر پڑھنے والے کا ذہن خالی نہ ہو تو وہ قرآن میں خود

اپنی بات پڑھے گا۔ اس کو سمجھنے کے لئے قرآن کی ایک آیت کی مثال لیجئے:

ومن الناس من یتخذ من دون اللہ انداداً یحبونھم کحب اللہ والذین آمنوا اشد حبا للہ ۔ بقرہ ۱۶۵	کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کا مدمقابل بناتے ہیں اور ان سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی محبت اللہ کے ساتھ ہونا چاہئے۔ حالاں کہ ایمان رکھنے والے سب سے زیادہ اللہ سے محبت کرتے ہیں۔

ایک شخص جو سیاسی ذوق رکھتا ہو اور سیاسی اکھیڑ پچھاڑ کو کام سمجھتا ہو وہ جب اس آیت کو پڑھے گا تو اس کا ذہن پوری آیت میں بس انداد (مدمقابل) پر رک جائے گا۔ وہ قرآن سے "مدمقابل" کا لفظ لے لے گا اور بقیہ مفہوم کو اپنے ذہن سے جوڑ کر کہے گا کہ اس سے مراد سیاسی مدمقابل ٹھہرانا ہے، اس آیت میں کہا گیا ہے کہ آدمی کے لئے جائز نہیں کہ وہ کسی کو خدا کا سیاسی مدمقابل بنائے۔ اس تشریح کے مطابق یہ آیت اس کے لئے اس بات کا اجازت نامہ بن جائے گی کہ جس کو وہ خدا کا "سیاسی مدمقابل" بنا ہوا دیکھے اس سے ٹکراؤ شروع کر دے۔ اس کے برعکس جو آدمی سادہ ذہن کے ساتھ اس کو پڑھے گا وہ "انداد" کے لفظ پر نہیں رکے گا بلکہ پوری آیت کی روشنی میں اس کا مفہوم متعین کرے گا۔ ایسے شخص کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگے گی کہ یہاں مدمقابل ٹھہرانے کی جس صورت کا ذکر ہے وہ باعتبار محبت ہے نہ کہ باعتبار سیاست۔ یعنی آیت یہ کہہ رہی ہے کہ آدمی کو سب سے زیادہ محبت صرف خدا سے کرنا چاہئے۔ "حب شدید" کے معاملہ میں کسی دوسرے کو خدا کا ہمسر نہیں بنانا چاہئے۔

قرآن کا ایک عمومی مفہوم ہے اور اس کو سمجھنے کی شرط یہ ہے کہ آدمی خالی الذہن ہو کر قرآن کو پڑھے۔ مگر جو شخص قرآن کے گہرے معانی تک پہنچنا چاہے اس کو ایک اور شرط پوری کرنی پڑتی ہے۔ اور وہ یہ کہ وہ اس راہ کا مسافر بنے جس کا مسافر اس کو قرآن بنانا چاہتا ہے۔ قرآن آدمی کی عملی زندگی کی رہنما کتاب ہے اور کسی عملی کتاب کو اس کی گہرائیوں کے ساتھ سمجھنا اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب کہ آدمی عملاً ان تجربات سے گزرے جن کی طرف اس کتاب میں رہنمائی کی گئی ہے۔

یہ عمل کوئی سیاسی یا سماجی عمل نہیں ہے بلکہ مکمل طور پر ایک نفسیاتی عمل ہے۔ اس عمل میں آدمی کو خود اپنے نفس کے مقابلہ میں کھڑا ہونا پڑتا ہے نہ کہ حقیقۃً کسی خارج کے مقابلہ میں۔ قرآن چاہتا ہے کہ آدمی ظاہری دنیا کی سطح پر نہ جئے بلکہ غیب کی دنیا کی سطح پر جئے۔ اس سلسلے میں جن مراحل کی نشان دہی قرآن میں کی گئی ہے ان کو وہ شخص کیسے سمجھ سکتا ہے جو ان مراحل سے آشنا نہ ہوا ہو۔ قرآن چاہتا ہے کہ آدمی صرف اللہ سے ڈرے اور صرف اللہ سے محبت کرے۔ اب جس کا دل اللہ کی محبت میں نہ تڑپا ہو، جس کے بدن کے رونگٹے اللہ کے خوف سے نہ کھڑے ہوئے ہوں وہ کیسے جان سکتا ہے کہ اللہ سے ڈرنا کیا ہے اور اللہ سے محبت کرنا کیا۔ قرآن چاہتا ہے کہ آدمی خدائی مشن میں اپنے آپ کو اس طرح شامل کرے کہ وہ اس کو اپنا ذاتی مسئلہ بنا لے۔ اب جس شخص نے خدا کے کام کو اپنا ذاتی کام نہ بنایا ہو وہ کیوں کر جانے گا کہ خدا کے ساتھ اپنے کو شامل کرنے کا مطلب کیا ہے۔ قرآن یہ چاہتا ہے کہ آدمی انسانوں کے چھیڑے ہوئے مسائل میں گم نہ ہو بلکہ خدا کی طرف سے برسنے والے فیضان میں اپنے کو گم کرے۔ اب جس شخص پر ایسے صبح و شام ہی نہ گزرے ہوں جب کہ خدا کے فیضان

میں وہ نہا اٹھے وہ کیسے سمجھ سکتا ہے کہ خدائی فیضان میں نہانے کا مطلب کیا ہے۔ قرآن چاہتا ہے کہ آدمی جہنم سے بھاگے اور جنت کی طرف دوڑے۔ اب جو شخص اس طرح زندگی گزارے کہ جہنم کو اس نے اپنا مسئلہ نہ بنایا ہو اور جنت اس کی ضرورت نہ بنی ہو اس کو کیا معلوم کہ جہنم سے بھاگنا کیا ہوتا ہے اور جنت کی طرف دوڑنا کیا معنی رکھتا ہے۔ قرآن چاہتا ہے کہ آدمی اللہ کی عظمت و کبریائی کے احساس سے سرشار ہو۔ اب جو شخص اپنی عظمت و کبریائی کے مینار میں لذت لے رہا ہو اس کو اس کیفیت کا ادراک کہاں ہو سکتا ہے جب کہ آدمی خدا کی کبریائی کو اس طرح پاتا ہے کہ اپنی طرف اس کو عجز کے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

قرآنی عمل اصلاً نفس یا انسان کے اندرونی وجود کی سطح پر ہوتا ہے۔ مگر انسان کسی خلا میں زندگی نہیں گزارتا بلکہ دوسرے بہت سے انسانوں کے درمیان رہتا ہے۔ اس لئے قرآنی عمل باعتبار حقیقت ذاتی عمل ہونے کے باوجود، دو پہلوؤں سے دوسرے انسانوں سے بھی متعلق ہو جاتا ہے۔ ایک اس اعتبار سے کہ آدمی جس قرآنی راستہ کو خود اپناتا ہے اسی راستہ کو اختیار کرنے کی وہ دوسروں کو بھی دعوت دیتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں ایک آدمی اور دوسرے آدمی کے درمیان داعی اور مدعو کا رشتہ قائم ہوتا ہے۔ یہ رشتہ آدمی کو بے شمار تجربات سے گزارتا ہے جو مختلف صورتوں میں آخر وقت تک جاری رہتا ہے۔ دوسرے یہ کہ مختلف قسم کے انسانوں کے درمیان زندگی گزارتے ہوئے طرح طرح کے تعلقات و معاملات پیش آتے ہیں۔ کسی سے لینا ہوتا ہے اور کسی کو دینا، کسی سے اتفاق ہوتا ہے اور کسی سے اختلاف، کسی سے دوری ہوتی ہے اور کسی سے قربت۔ ان مواقع پر آدمی کیا رویہ اختیار کرے اور کس قسم کا ردعمل پیش کرے، قرآن ان امور میں اس کی مکمل رہنمائی کرتا ہے۔ اگر آدمی اپنی خواہش پر چلنا چاہے تو قرآن کا یہ باب اس پر بند رہے گا اور اگر وہ اپنے کو قرآن کی ماتحتی میں دیدے تو اس پر قرآنی تعلیمات کے ایسے بھید کھلیں گے جو کسی اور طرح اس پر کھل نہیں سکتے۔

قرآن آدمی کو جو مشن دیتا ہے وہ حقیقۃً کوئی "نظام" قائم کرنے کا مشن نہیں ہے۔ بلکہ اپنے آپ کو قرآنی کردار کی صورت میں ڈھالنے کا مشن ہے۔ قرآن کا اصل مخاطب فرد ہے نہ کہ سماج۔ اس لئے قرآن کا مشن فرد پر جاری ہوتا ہے نہ کہ سماج پر۔ تاہم افراد کی قابل لحاظ تعداد جب اپنے آپ کو قرآن کے مطابق ڈھالتی ہے تو اس کے سماجی نتائج بھی لازماً نکلنا شروع ہوتے ہیں۔ یہ نتائج ہمیشہ یکساں نہیں ہوتے بلکہ حالات کے اعتبار سے ان کی صورتیں بدلتی رہتی ہیں۔ قرآن میں مختلف انبیاء کے واقعات انھیں سماجی نتائج یا سماجی ردعمل کے مختلف نمونے ہیں اور اگر آدمی نے اپنی آنکھیں کھول رکھی ہوں تو وہ ہر صورت حال کی بابت قرآن میں رہنمائی پاتا چلا جاتا ہے ——— قرآن فطرت انسانی کی کتاب ہے۔ قرآن کو وہی شخص بخوبی طور پر سمجھ سکتا ہے جس کے لئے قرآن اس کی فطرت کا مثنیٰ بن جائے۔

تذکیر القرآن کی خصوصیات

۱۔ تذکیر القرآن کا خاص مقصد قرآن کی یاد دہانی ہے۔ قرآن کی اصل حیثیت یہ ہے کہ وہ نصیحت ہے۔ تذکیر القرآن کی ترتیب میں سب سے زیادہ اسی پہلو کا لحاظ کیا گیا ہے کہ وہ پڑھنے والے کے لئے نصیحت بن سکے۔

۲۔ تذکیر القرآن کو تین حصوں پر تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر حصہ تقریباً دس پاروں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ سورہ فاتحہ سے

سورہ توبہ تک۔ دوسرا حصہ سورہ یونس سے سورہ عنکبوت تک۔ تیسرا حصہ سورہ روم سے سورہ ناس تک۔

۳۔ قرآن عام انسانی کتاب کی طرح ابواب کے انداز میں نہیں ہے بلکہ شذرات کے انداز میں ہے۔ اگرچہ قرآن کی سورتوں اور عبارتوں میں ایک گہری ترتیب بھی ہے۔ مگر اس کا عام انداز یہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں ایک پورا پیغام ہے۔ ایک ایک "پیراگراف" میں ایک ایک بات ذہن نشین کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔ تذکیر القرآن میں اسی شذراتی انداز کو تشریح کے لئے اختیار کیا گیا ہے۔ یعنی قرآن کا ایک ٹکڑا یا ایک "پیراگراف" لے کر اس میں جو بات کہی گئی ہے اس کو ایک مرتب تشریح کی صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ ایسا اس لئے کیا گیا ہے تاکہ متعلقہ تشریح کو پڑھتے ہوئے قاری کے ذہن میں معانی کا سلسلہ نہ ٹوٹے اور وہ قرآن کی تذکیری غذا مسلسل لیتا چلا جائے۔

۴۔ تذکیر القرآن کی ترتیب یہ رکھی گئی ہے کہ پہلے قرآن کا زیر تشریح ٹکڑا (پیراگراف) درج کیا گیا ہے۔ اس کے نیچے اس کا ترجمہ ہے۔ ترجمہ کے بعد ایک لکیر دے کر متعلقہ ٹکڑے کی تشریح ہے۔ جہاں تشریح ختم ہوتی ہے وہاں پھر قرآن کا اگلا ٹکڑا درج کر کے دوبارہ مذکورہ ترتیب سے ترجمہ اور تشریح درج ہے۔ اسی طرح ایک کے بعد ایک پوری سورہ کی تفسیر ہے۔ اس ترتیب میں قاری ہر تشریح کو پڑھتے ہوئے بیک وقت اس کا متن بھی سامنے رکھ سکتا ہے اور اسی کے ساتھ اس کا ترجمہ بھی۔

۵۔ تذکیر القرآن میں یہ حکمت ملحوظ رکھی گئی ہے کہ ہر صفحہ پر ایک پوری بات آجائے۔ آدمی اگر ایک صفحہ پڑھے تب بھی قرآنی نصیحت کا کوئی حصہ اسے مل جائے اور زیادہ صفحات پڑھے تب بھی۔

۶۔ ترتیب یہ رکھی گئی ہے کہ صفحہ کے اوپر قرآن کے ایک ٹکڑے (پیراگراف) کا ترجمہ ہے۔ اس کے بعد ایک لکیر دے کر اس کے نیچے تفسیر ہے۔ ان چند آیتوں میں جو باتیں کہی گئی ہیں ان باتوں کا حد درجہ پابند رہتے ہوئے ان کو ایک مسلسل مضمون کی صورت میں اس طرح لکھا گیا ہے کہ ہر صفحہ کی تفسیر اسی صفحہ پر ختم ہو جائے۔

۷۔ تذکیر القرآن میں ترجمہ کا جو انداز اختیار کیا گیا ہے وہ نہ پوری طرح لفظی ہے اور نہ پوری طرح بامحاورہ۔ بلکہ درمیان کی ایک صورت اختیار کی گئی ہے۔ دونوں ہی انداز کے اپنے اپنے فائدے ہیں اور درمیانی انداز اس لئے اختیار کیا گیا ہے کہ دونوں پہلوؤں کی رعایت شامل رہے۔

۸۔ تفسیر میں عام طور پر تفصیل سے پرہیز کیا گیا ہے۔ زیادہ تر جو چیز پیش نظر رکھی گئی ہے وہ یہ کہ قرآن کی فطری سادگی اس کی تفسیر میں بھی باقی رہے۔ قرآن ایک طرف خدا کے جلال کا اظہار ہے اور دوسری طرف وہ انسان کی عبدیت کا آئینہ ہے۔ تفسیر میں بس انھیں اصل پہلوؤں کو غیر فنی انداز میں نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

وحید الدین جمعہ ۱۳ نومبر ۱۹۸۱

نئی مطبوعات اسلامی مرکز

تذکیرالقرآن جلد اول (سورہ فاتحہ تا سورہ توبہ) قیمت مجلد	۵۰	روپے
محمد دی آئیڈیل کیرکٹر (MUHAMMAD: The Ideal Character)	۳	//
اتحاد ملت	۳	//
راہیں بند نہیں	۳	//
سبق آموز واقعات	۳	//
دین کی سیاسی تعبیر (زیادہ تعداد منگانے پر خصوصی کمیشن)	۲	//
تعارفی سٹ : سچا راستہ	ایک	//
دینی تعلیم	۳	//
حیات طیبہ (زیر طبع)	۳	//
باغ جنت	۳	//
نار جہنم	۳	//

——— مکتبہ الرسالہ

ہفتہ وار اجتماعات

بھوپال کے اجتماع میں جو باتیں طے ہوئی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ ہرمقام پر الرسالہ کے حلقے اپنے آپ کو اسلامی مرکز کے حلقہ میں تبدیل کرلیں اور ہفتہ وار اجتماع کا نظم شروع کردیں۔ ہم ہرمقام کے الرسالہ کے ہمدردوں سے گزارش کرتے ہیں کہ وہ اپنے یہاں ہفتہ وار اجتماع شروع کردیں اور خط و کتابت کے ذریعہ ضروری مشورے حاصل کریں۔

وحیدالدین خاں

صدر اسلامی مرکز

دفتر الرسالہ منتقل۔ جمعیۃ بلڈنگ۔ قاسم جان اسٹریٹ۔ دہلی ۶

ایجنسی : ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دل چسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ بیک وقت سال بھر کا زر تعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد او رمتفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت ـــــــ الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کرکے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا۔ بشرطیکہ پرچے خراب نہ ہوئے ہوں۔

دوسری صورت ـــــــ الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ ۱۳۵ روپے یا ماہانہ ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ سے شائع کیا

REGD.NO. D. (DN) 532 JULY 1982

AL-RISALA MONTHLY

JAMIAT BUILDING QASIMJAN STREET DELHI-110006 (INDIA) PHONE 232231

الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

اینٹیں بکھری ہوئی ہوں تو وہ ملبہ کا ڈھیر ہیں
مگر جب اینٹیں ایک دوسرے سے جڑ کر عمارت بن جائیں
تو وہ طاقت کا قلعہ ہیں جس میں قومیں پناہ لیں

قیمت فی پرچہ ——— تین ۳ روپے

جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۱۱۰۰۰۶ (انڈیا)

مشاورتی نشست

اسلامی مرکز کی ایک مشاورتی نشست دہلی میں دفتر اسلامی مرکز میں رمضان ۱۴۰۲ھ کے پہلے ہفتہ میں منعقد ہوئی اس میں حسب ذیل اصحاب شریک ہوئے

۱۔ مولانا وحید الدین خاں صاحب صدر اسلامی مرکز

۲۔ مولانا محسن عثمانی صاحب ندوی۔ دہلی

۳۔ مولانا ہاشم القاسمی صاحب۔ حیدر آباد

۴۔ مولانا حمید اللہ ندوی صاحب۔ بھوپال

اس نشست میں اسلامی مرکز کے تنظیمی امور اور مرکز کے لئے ایک عمارت کے حصول کی بابت گفتگو ہوئی۔ اتفاق رائے سے بعض اہم امور طے کئے گئے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ان کی تکمیل کا سامان بہم پہنچائے۔

اس نشست میں یہ بات بھی طے پائی کہ اسلامی مرکز کی ذیلی شاخوں سے کہا جائے کہ وہ اپنے کام اور سرگرمیوں کی باقاعدہ رپورٹ مرکز کو بھیجا کریں۔

منی آرڈر کوپن پر اپنا پورا پتہ تحریر فرمائیں۔ ہر خط و کتابت کے ساتھ خریداری نمبر یا ایجنسی نمبر کا حوالہ ضرور دیں

خدا ———— قادر مطلق ہے ، اور
انسان ———— عاجز مطلق
دونوں دو انتہائیں ہیں
انسان کا کمال یہ ہے کہ وہ اس حقیقت کا شعوری ادراک کرلے
وہ شعورِ قدرت کے مقابلہ میں شعورِ عجز کی دوسری انتہا بنا سکے
معرفت یہی ہے کہ آدمی اس مقام شعور تک پہنچ جائے

جنت باشعور انسانوں کی آبادی ہے
اور جہنم بے شعور لوگوں کا قید خانہ

آغاز نیچے سے

ایک شخص جس کی داڑھی میں سفیدی آچکی تھی، ریکروٹنگ آفس میں داخل ہوا "مجھے سپاہی کی حیثیت سے بھرتی کر لیجئے" اس نے کہا۔

"مگر تمھاری عمر کیا ہے"، سارجنٹ نے پوچھا۔

"باسٹھ سال"

"تم اچھی طرح جانتے ہو کہ باسٹھ سال کی عمر سپاہی بننے کے لئے بہت زیادہ ہے"

"سپاہی کے لئے یہ عمر زیادہ ہو سکتی ہے" آدمی نے کہا "مگر کیا آپ کو کسی جنرل کی ضرورت نہیں"

ایک انگریزی رسالہ (مئی ۱۹۸۲) میں مذکورہ واقعہ چھپا ہے اور اس کا عنوان طنزیہ طور پر ان لفظوں میں قائم کیا گیا ہے ——— اوپر سے آغاز :

Starting at the Top

ایک شخص جنرل کے عہدہ سے اپنی فوجی زندگی شروع کرنا چاہے تو وہ کبھی ایسا نہیں کر سکتا۔ یہی معاملہ عام زندگی کا ہے۔ یہاں کسی کے لئے چھلانگ ممکن نہیں۔ جس طرح درخت کا آغاز بیج سے ہوتا ہے اسی طرح زندگی کی تعمیر کا آغاز بھی ابتدائی نقطہ سے ہوتا ہے۔ آخری نقطہ سے آپ اپنی زندگی کا آغاز نہیں کر سکتے۔

تجارت روپیہ لگانے سے شروع ہوتی ہے نہ کہ نفع کمانے سے۔ ڈاکٹری تعلیم محنت سے شروع ہوتی ہے نہ کہ بازار میں شان دار بورڈ لگانے سے۔ مکان کی تعمیر بنیاد سے شروع ہوتی ہے نہ کہ چھت ڈالنے سے۔ کھانے کا آغاز فصل بونے سے ہوتا ہے نہ کہ دسترخوان لگانے سے۔ کارخانہ کا آغاز مشین کی فراہمی سے ہوتا ہے نہ کہ تیار مال بیچنے سے وغیرہ

اسی طرح اجتماعی معاملات میں آغاز یہاں سے ہوتا ہے کہ افراد کے اندر مقصد کا شعور ابھارا جائے۔ ان کو محنتی اور دیانت دار بنایا جائے۔ ان کے اندر برداشت اور اتحاد کی صلاحیت پیدا کی جائے۔ قوم کے افراد میں، قابل لحاظ حد تک، ان صلاحیتوں کو پیدا کرنے سے پہلے اگر عملی اقدام شروع کر دیا جائے تو وہ صرف ناکامی پر ختم ہوگا۔ اس قسم کی قومی تعمیر کی مثال بالکل ایسی ہوگی جیسے دیوار بنانے سے پہلے چھت کھڑی کرنے کی کوشش۔ ایسی چھت ہمیشہ اٹھانے والے کے سر پر گرتی ہے۔ اسی طرح افراد کی تعمیر سے پہلے قومی اقدام صرف ناکامی اور بربادی پر ختم ہوتا ہے۔

نئی طاقت جاگ اٹھی

گیرارڈ (اٹلی) نے مغربی لاطینیوں کے لئے وہی کام کیا جو حنین ابن اسحٰق نے مشرقی عربوں کے لیے کیا تھا۔ اس نے عربی زبان سے فلسفہ، ریاضی، طب اور علوم طبیعی کی بے شمار کتابوں کا ترجمہ لاطینی زبان میں کر ڈالا۔

گیرارڈ ۱۱۱۴ء میں کریمونا (اٹلی) میں پیدا ہوا۔ وہ عربی زبان بخوبی جانتا تھا۔ بطلیموس کی المجسطی (عربی) کی تلاش میں وہ طلیطلہ آیا۔ اس نے ۱۱۷۵ء میں اس کتاب کا ترجمہ لاطینی زبان میں کیا۔ وہ عربی کی کتابوں کا ترجمہ کرنے والوں میں نمایاں ترین شخص بن گیا۔ ایک مسیحی اور ایک یہودی عالم اس کام میں اس کے مددگار تھے۔ اس نے یونانی اور عربی علوم کے دروازے پہلی بار مغرب کے لئے کھول دئے۔ اس کے بعد دوسرے بہت سے افراد پیدا ہوئے جنھوں نے اس معاملہ میں اس کی تقلید کی۔ ڈاکٹر میکس میرہاف کے الفاظ میں وہ یورپی دنیا میں عربیت کا بانی تھا۔

علم طب میں گیرارڈ نے بقراط و جالینوس کی کتابوں، حنین کے تقریباً تمام ترجموں، الکندی کی تمام تصانیف، بوعلی سینا کی ضخیم "قانون" اور ابوالقاسم زہراوی کی کتاب "جراحت" کا ترجمہ کر دیا۔ طبیعیات میں اس نے ارسطو کی بہت سی کتابوں کا عربی سے ترجمہ کیا۔ جن میں تجربیات کا وہ رسالہ بھی شامل ہے جو ارسطو سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس شعبہ علم میں الکندی، الفارابی، اسحاق اور ثابت وغیرہ کی کتابوں کو بھی لاطینی میں منتقل کیا۔

گیرارڈ ۱۱۸۷ میں بیمار پڑا۔ اس نے گمان کیا کہ اب اس کی موت قریب ہے۔ "اگر میں مر گیا تو قیمتی عربی کتابوں کا ترجمہ مغربی زبان میں کون کرے گا"۔ اس احساس نے اس کو تڑپا دیا۔ اس کے اندر نئی قوت عمل جاگ اٹھی۔ بیماری کے باوجود اس نے ان بقیہ عربی کتابوں کا ترجمہ شروع کر دیا جن کو اس نے اپنے پاس جمع کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اپنی موت سے پہلے صرف ایک مہینے کے اندر اس نے تقریباً اسی کتابوں کے ترجمے پورے کر لئے۔

عمل کا تعلق حقیقۃً جذبے سے ہے نہ کہ صحت اور طاقت سے۔ اگر آدمی کے اندر کسی کام کی آگ بھڑک اٹھے تو اس کام کو وہ ہر حال میں کر ڈالتا ہے، خواہ وہ بستر مرض پر ہو۔ خواہ اس کے ظاہری حالات کسی طرح اس کی اجازت نہ دیتے ہوں۔

منفی سیاست مہنگی پڑی

موجودہ زمانہ میں اسپین کے مورخین اسپین کے اسلامی دور کا ذکر بے حد نفرت کے ساتھ کرتے ہیں، اسپین کی قرونِ وسطیٰ کی تاریخ کا ایک ماہر لکھتا ہے "اگر اسلام نہ ہوتا تو اسپین بھی فرانس، جرمنی، اٹلی اور انگلینڈ کی طرح ترقی کا راستہ اختیار کرتا، بلکہ وہ یورپ کا رہنما بن جاتا۔ مگر اسلام نے آئبیریا (اسپین اور پرتگال) کی تقدیر کو بگاڑ دیا۔ اس میں شک نہیں کہ یورپ کو اسلام نے بے اندازہ فائدہ پہنچایا، مگر اسپین کو اس نے انسانی ترقی کے قافلہ سے پیچھے کر دیا۔"

جو اسلام یقینیہ یورپ کے لئے رحمت ثابت ہوا وہی اسلام اسپین کے لئے نقصان دہ کیسے بن سکتا تھا۔ یہ فرق ثابت کرتا ہے کہ اس کی ذمہ داری خود اسپین پر تھی نہ کہ اسلام پر۔ چنانچہ پروفیسر جے۔ بی ٹرینڈ نے لکھا ہے کہ اس کی وجہ اسپین کی منفی سیاست تھی۔ مسلمانوں کی فتح اسپین (۷۱۱) کے بعد یہ ہوا کہ اٹلانٹک سے لے کر بحر روم تک سارے شمالی اسپین میں جگہ جگہ "مسلم حملہ آوروں" کی مخالفت کے مرکز قائم ہو گئے۔ بیشتر لوگوں کا مشغلہ بس جنگ وجدال بن کر رہ گیا۔ تمام مردان کار نے فوجی وعسکری زندگی اختیار کر لی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر قسم کی علمی اور اقتصادی سرگرمیاں ٹھپ ہو کر رہ گئیں۔

اسپین والوں کی مسلم مخالف سرگرمیاں صدیوں کے بعد سولھویں صدی میں اپنی کامیابی کو پہنچیں۔ انھوں نے اسپین کے تمام مسلمانوں کو یا تو مار ڈالا یا ملک سے باہر نکال دیا۔ مگر یہ شاندار کامیابی ان کو صرف اس قیمت پر حاصل ہوئی کہ ملک اپنے تمام ہنرمند کاریگروں اور لاکھوں زرعی کارکنوں سے محروم ہو کر رہ گیا۔ اس خلا کے بعد اسپین کا زوال بالکل لازمی اور ناگزیر تھا۔

مزید یہ کہ اسلام جب ایک خطرناک ہمسایہ کی حیثیت سے ان کے درمیان باقی نہ رہا تو ان کی صدیوں کی تربیت یافتہ جنگ جوئی نے باہمی اختلاف اور لڑائی کی صورت میں اس کا استعمال پا لیا۔ اسپین کی مسیحی ریاستیں مسلم نشانہ کو نہ پاکر آپس کے جنگ وپیکار میں مصروف ہو گئیں۔ ان کی انقطاع پسندی نے ان کے درمیان مختلف زبانیں اور مختلف روایتیں پیدا کر دیں۔ ابتدائی صدیاں اگر مسلمانوں کے خلاف کارروائیوں میں ضائع ہوئی تھیں تو بعد کا زمانہ خود اپنوں کے خلاف ہنگامہ کرنے میں برباد ہو گیا (لیگیسی آف اسلام، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، لندن)

امامت کا راز

سسلی ایک یوروپی ملک ہے جو میڈیٹرینین سمندر میں واقع ہے اور اٹلی سے ملا ہوا ہے۔ بارھویں صدی عیسوی میں یہاں ایک مسیحی نارمن بادشاہ راجر دوم (۱۱۵۴ — ۱۱۰۱) حکومت کرتا تھا۔ قدیم بادشاہوں (مثلاً اسکندر اعظم) کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ وہ اپنی زیر حکومت دنیا کا خاکہ تیار کرا کر اپنے پاس رکھیں۔ شاہ راجر دوم کے دل میں بھی یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ دنیا کا ایک بڑا نقشہ تیار کرائے جس میں اس کی اپنی سلطنت کے حدود دکھائے گئے ہوں۔ اس کام کے لئے راجر دوم نے اپنے وقت کے جس ماہر شخص کا انتخاب کیا وہ ایک مسلمان جغرافیہ داں الادریسی تھا۔ اسی مغربی بادشاہ کی خواہش پر الادریسی نے جغرافیہ کے بارے میں اپنی مشہور کتاب تیار کی جس میں جغرافی معلومات کے ساتھ ۷۰ نقشے شامل تھے۔ الادریسی کی عربی کتاب کا پہلا یوروپی ترجمہ روم میں ۱۶۱۹ میں کیا گیا۔

جے۔ ایچ۔ کریمرز نے الادریسی کے مذکورہ جغرافیہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "شاہ راجر دوم نے اپنے وقت کی معلوم دنیا کا تفصیلی خاکہ تیار کرنے کا کام ایک مسلمان عالم کے سپرد کیا، اس سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں مسلمانوں کے علم و فضل کی برتری ایک مسلّم حقیقت سمجھی جاتی تھی" ہر قسم کے فنی ماہرین مسلمانوں سے لئے جاتے تھے۔

اس زمانہ میں مسلمان ساری دنیا میں علم کے میدان میں بڑھے ہوئے تھے۔ ریاضی، طب، فلسفہ، جغرافیہ، فن تعمیر، فن حرب، تاریخ اور زبان و ادب ہر چیز میں وہ دنیا کی امامت کر رہے تھے۔ اس واقعہ کی ایک شہادت وہ ہے جو زبان کی صورت میں آج بھی موجود ہے۔ یورپ کی زبانوں میں کثرت سے ایسے الفاظ ہیں جن کی اصل عربی ہے۔

مسلمان پچھلے تقریباً ہزار سال تک دنیا کے قائد بنے ہوئے تھے۔ مگر یہ مقام ان کو مطالبہ اور احتجاج کی سیاست سے نہیں ملا تھا اور نہ کوڑے اور پھانسی کی سزاؤں کو جاری کر کے وہ اس بلندی تک پہنچے تھے۔ اس کا راز تھا اہلیت۔ اس کا سبب یہ تھا کہ وہ دنیا کو دینے والے بن گئے تھے نہ کہ صرف لینے والے۔

بڑاپن

شہنشاہ اکبر نے اپنے لڑکے شہزادہ سلیم کی شادی جے پور کے راجہ بھگوان داس کی لڑکی سے کی تھی۔ اس سلسلہ میں اکبر خود بارات لے کر جے پور گیا۔ نکاح کے بعد جب دولہن کا ڈولا باہر نکلا تو راجہ بھگوان داس نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا:

ما رچیری تہار گھر کی باندی   ہم باند غلام رے

(ہماری لڑکی آپ کے گھر کی کنیز ہے اور ہم آپ کے غلام ہیں)

یہ سن کر اکبر تڑپ اٹھا۔ وہ بے تابانہ کھڑا ہوگیا اور راجہ بھگوان داس کو گلے لگا کر کہا کہ نہیں، ایسا نہیں ہے۔ بلکہ یوں ہے:

تہار چیری مار گھر کی رانی   تم صاحب سردار رے

(تمھاری لڑکی ہمارے گھر کی رانی ہے اور تم ہمارے سردار ہو)

یہ کہہ کر اکبر نے دولھن کے ڈولے میں خود کا ندھا لگا دیا۔ اس کے بعد ساری فضا ہی دوسری ہوگئی، تمام شہزادے اور امرار دوڑ پڑے۔ ہر ایک دولھن کا ڈولہ اٹھانے میں سبقت کرنے لگا۔ کچھ دور تک یہی لوگ ڈولہ لے کر چلتے رہے۔ اس کے بعد اس کو کہاروں نے سنبھالا۔

خلیفہ ہارون رشید کا قول ہے کہ شریف آدمی وہ ہے جو اپنے سے بڑے کو دبائے اور چھوٹے سے خود دب جائے۔ اکبر کا مذکورہ واقعہ اس کی ایک مثال ہے۔ اکبر ایک بے حد بلند فطرت انسان تھا، اگرچہ وقت کے علمار کے غلط کردار نے اس کو بگاڑ دیا۔

جو لوگ پست طبیعت کے ہوتے ہیں ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ طاقت وروں کے ساتھ اخلاق برتتے ہیں اور جس کو کمزور پاتے ہیں اس کو ذلیل کرنے لگتے ہیں۔ مگر اونچی طبیعت والے آدمی کو اس بات سے شرم آتی ہے کہ وہ دو قسم کا اخلاق برتے۔ وہ ایک کے مقابلہ میں کچھ ہو اور دوسرے کے مقابلہ میں کچھ۔ وہ ہر حال میں سچائی کے سامنے جھکنے والا ہوتا ہے۔ وہ معقولیت کے سامنے بھی اسی طرح دیتا ہے جس طرح قوت کے سامنے۔ وہ کمزور کا بھی اتنا ہی لحاظ کرتا ہے جتنا طاقت ور کا۔ اس کا کردار اصول کے تابع ہوتا ہے نہ کہ لالچ اور خوف کے تابع۔

بڑا آدمی اپنی بڑائی جتا کر حقیقۃً چھوٹا ہو جاتا ہے۔ اونچی حیثیت والا جب گھمنڈ کا مظاہرہ کرتا ہے تو وہ اپنے کو نیچے گرا لیتا ہے۔

مدعو نہ کہ حریف

منٹگومری واٹ کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے اسلام کیا ہے (What is Islam) ڈھائی سو صفحات کی اس کتاب میں انگریز مصنف نے اسلام کا نظریاتی اور تاریخی جائزہ لیا ہے۔ آخر میں وہ کتاب کو ختم کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ کتاب مغربی لوگوں کو اس قابل بنائے گی کہ وہ اس زندہ اور طاقت ور قوم کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکیں جو کہ ان کی شریک بھی ہے اور ان کی حریف بھی :

This book will enable occidentals to understand better this living and powerful community which is both their partner and their rival

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمان کی تصویر آج دوسری قوموں کی نظر میں کیا ہے۔ یہ تصویر محض قومی ہے نہ کہ نظریاتی۔ دوسری قومیں ہم کو بس اس نظر سے دیکھتی ہیں کہ مسلمان دنیا کی آبادی کا ایک بڑا حصہ ہیں اور اس اعتبار سے وہ زمین کے دوسرے باسیوں کے لئے قومی شریک اور مادی حریف کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ہر قوم کو دوسرے لوگ اسی خاص حیثیت سے جانتے ہیں جس حیثیت سے اس نے اپنے آپ کو دوسروں کی نظر میں متعارف کیا ہو۔ ہر قوم اپنی تصویر آپ بناتی ہے۔ جاپان کو لوگ ایک ٹیکنیکی معاشرہ سمجھتے ہیں۔ چین کو ایک جبری معاشرہ اور برطانیہ کو ایک جمہوری معاشرہ۔ ان قوموں کے بارے میں لوگوں کی یہ رائیں خود ان قوموں کے طرز عمل سے بنی ہیں نہ کہ دوسروں کی اپنی خیال آرائی سے۔ یہی معاملہ مسلمانوں کا بھی ہے۔ مغرب کے لوگ اگر ہم کو محض ایک جغرافی شریک یا مادی حریف کی حیثیت سے دیکھتے ہیں تو اس کی ذمہ داری خود ہمارے اوپر ہے نہ کہ دوسروں کے اوپر۔ ہم نے اسی روپ میں ان کی نظر میں اپنا تعارف کرایا ہے پھر وہ اس کے علاوہ کسی اور روپ میں ہم کو کس طرح دیکھ سکتے ہیں۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ مسلمان کی یہ تصویر اس کے لئے ازالۂ حیثیت عرفی کے ہم معنی ہے۔ مسلمان دنیا میں خدا کے دین کے نمائندہ ہیں۔ ان کے اور دوسری قوموں کے درمیان داعی اور مدعو کا رشتہ ہے۔ اس رشتہ کو اگر قومیت اور رقابت کا رشتہ بنا دیا جائے تو یہ دوسری قوموں کے لئے سب سے بڑا المیہ ہوگا اور مسلمانوں کے لئے سب سے بڑا جرم۔

بے فائدہ مصروفیات

سالزنیٹسین (Alexander Solzhenitsyn) ایک روسی ناول نگار ہے۔ اس کو روسی عوام کے دکھوں کا احساس ہوا اور اس کو اس نے اپنی کہانیوں میں تمثیلی روپ میں ظاہر کرنا شروع کیا۔ اس کے نتیجہ میں وہ روس کی اشتراکی حکومت کی نظر میں ناپسندیدہ شخص بن گیا۔ چنانچہ اس نے اپنا وطن چھوڑ کر امریکہ میں پناہ لی ہے۔ وہ امریکہ کی ایک بستی (Vermont) میں خاموشی کی زندگی گزار رہا ہے۔ اور اپنے خیالات کتابوں کی صورت میں مرتب کرنے میں مصروف ہے۔

مئی ۱۹۸۲ میں سالزنیٹسین کو امریکی حکومت کا ایک دعوت نامہ ملا۔ اس کے اعزاز میں واشنگٹن کے وھائٹ ہاؤس میں ایک سرکاری تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں دوسرے معزز لوگوں کے علاوہ خود صدر امریکہ بھی شریک ہوئے۔ نیز اس دوران میں امریکی صدر ریگن اور سالزنیٹسین کے درمیان ۱۵ منٹ کی ایک خصوصی ملاقات بھی شامل تھی۔

سالزنیٹسین نے صدر امریکہ کے نام ۳ مئی ۱۹۸۲ کو ایک جوابی خط لکھا جس کے ذریعہ تقریب میں شرکت سے قطعی معذوری ظاہر کی۔ اس نے لکھا کہ زندگی کے جو مختصر لمحات میرے پاس رہ گئے ہیں وہ مجھے اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ میں رسمی ملاقاتوں میں اپنا وقت صرف کروں:

The life span at my disposal does not leave any time for symbolic encounters.

سالزنیٹسین کے سامنے ایک محدود مقصد ہے۔ یعنی روسی عوام کی دکھ بھری زندگی کو ناول کے انداز میں پیش کرنا۔ اس مقصد نے اس کے اوقات پر اتنا قبضہ کر لیا کہ اس کے لئے اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ وہ صدر امریکہ کے دعوت نامہ کو رد کر دے۔

آدمی کے سامنے اگر کوئی واضح مقصد ہو تو اس کا یہی حال ہوتا ہے۔ مگر جب آدمی کی زندگی مقصد سے خالی ہو جائے تو اس کی نظر میں اپنے وقت کی کوئی قیمت نہیں رہتی۔ وہ اپنا اندازہ خود اپنی رائے سے کرنے کے بجائے دوسروں کی رائے سے کرنے لگتا ہے۔ وہ رسمی جلسوں اور تقریبات میں رونق کا سامان بنتا رہتا ہے۔ وہ اپنے لئے جینے کے بجائے دوسروں کے لئے جینے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی عمر پوری ہو جاتی ہے۔ بظاہر مصروفیتوں سے بھری ہوئی ایک زندگی اس طرح اپنے انجام کو پہنچ جاتی ہے کہ اس کے پاس ایک خالی زندگی کے سوا اور کوئی سرمایہ نہیں ہوتا۔

انجینئرنگ کافی نہیں

ڈاکٹر فضل الرحمٰن خاں دنیا کے مشہور ترین تعمیراتی انجینئر تھے۔ وہ ڈھاکہ میں پیدا ہوئے۔ کلکتہ میں تعمیراتی انجینئرنگ (Architectural Engineering) کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد اسی فن میں امریکہ سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔ ۱۹۶۳ میں انھوں نے شکاگو میں ۴۳ منزلہ عمارت کا ٹھیکہ لے کر اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔ اپنی غیر معمولی ذہانت کی وجہ سے انھوں نے اس میدان میں مجتہدانہ کارنامے انجام دئے۔ شکاگو میں ۱۱۰ منزلہ عمارت (Sears Tower) بنانے کے بعد انھوں نے جدید تعمیرات میں عالمی شہرت حاصل کی۔ دنیا کی یہ سب سے اونچی عمارت ان کے اپنے وضع کردہ غیر روایتی اصولوں پر بنائی گئی ہے۔ جس کو (Tubular Design) کہا جاتا ہے (ہندستان ٹائمس ۹ مئی ۱۹۸۲)

ڈاکٹر فضل الرحمٰن خاں کو اپنی اس غیر معمولی کامیابی کے باوجود قلبی سکون حاصل نہ تھا۔ مسٹر کے ایم املادی ۱۹۷۶ میں فضل الرحمٰن خاں کے شکاگو کے دفتر میں ملے تھے۔ مسٹر املادی نے انھیں ان کی کامیابیوں پر مبارک باد دی مگر ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے اس کو سادہ چہرے کے ساتھ سنا۔ انھوں نے گفتگو کے دوران مسٹر املادی سے کہا کہ زندگی انجینئرنگ سے زیادہ ہے:

Life is more than engineering

۲۷ مارچ ۱۹۸۲ کو ڈاکٹر فضل الرحمٰن خاں کا اچانک اس وقت انتقال ہوگیا جب کہ ان کی عمر صرف ۵۲ سال تھی۔ فضل الرحمٰن خاں نے تعمیراتی انجینئرنگ میں جو اجتہادی اصول وضع کئے ان کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے جرمن انجینئر رابرٹ گیبریل (Robert Gabriel) نے ۴۶۵ منزلہ عمارت کا منصوبہ بنایا ہے جو زمین سے ایک میل اونچی ہوگی۔ مسٹر املادی نے اپنی ملاقات میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن خاں سے پوچھا کہ کیا وہ ایسی عمارت کی تعمیر کو ممکن سمجھتے ہیں۔ فضل الرحمٰن خاں نے اثبات میں جواب دیا۔ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے مسٹر املادی اپنے مضمون کو اس جملہ پر ختم کرتے ہیں کہ آئندہ یورپ اور امریکہ میں ایسی اونچی عمارتیں کھڑی ہو چکی ہوں گی مگر افسوس کہ وہی آدمی ان کو دیکھنے کے لئے موجود نہ ہوگا جس نے ایسی عمارتوں کی تعمیر کو ابتدائی طور پر ممکن بنایا تھا:

The man who laid the foundation for making them possible, alas, will no longer be there to witness them.

مقبول بندے

جسم میں اگر ایسا خون داخل کیا جائے جو آدمی کے بلڈ گروپ کا نہ ہو تو جسم اس کو قبول نہیں کرتا۔ اس کے اندر فوراً ضد جسم (Antibodies) پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور وہ خون باہر نکال دیا جاتا ہے۔ اسی طرح جلے یا کٹے ہوئے حصہ جسم پر قلم بندی ہوتی ہے جس کی محفوظ صورت یہ ہے کہ خود اپنے جسم کی کھال لے کر مقام ماؤف پر لگا دی جائے جس کو آٹو گرفٹنگ کہتے ہیں۔ اب اگر کسی مقام پر کھال کی قلم بندی (Skin Grafting) کرنی ہے اور وہاں کسی غیر متعلق جسم کی کھال لے کر لگا دی گئی تو وہ چند دن ٹھیک رہے گی۔ مگر ایک ہفتہ کے اندر جسم اس کی اجنبیت کو پہچان لے گا۔ خون کا دوران اس مقام پر رک جائے گا اور بالآخر کھال کا مذکورہ ٹکڑا الگ ہو کر گر جائے گا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر ولیم بائڈ (William Boyd) نے اپنی پیتھالوجی کی کتاب (۱۷۷) میں لکھا ہے کہ خودی غیر خودی کو قبول نہیں کرتی:

Self will not accept not-self

یہ چھوٹے سلف (انسان) کی خود داری کی ایک مثال ہے۔ اسی پر بڑے سلف (خدا) کی غیرت اور خودداری کو قیاس کیا جا سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا تمام غیرت مندوں سے زیادہ غیرت مند اور تمام یکتا پسندوں سے زیادہ یکتا پسند ہے۔ خدا کسی حال میں بھی کسی قسم کی دوئی کو گوارہ نہیں کرتا۔ وہ ہر دوسرے قصور کو معاف کر دے گا مگر شرک کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔

وہ کون خوش قسمت لوگ ہیں جو آخرت میں خدا کے مقبول بندے ٹھہریں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے سلف کے خول کو توڑ کر خدا کے سلف میں گم ہونے پر راضی ہو گئے۔ جو اپنی یا کسی دوسرے کی یکتائی کو بھلا کر خدا کی یکتائی کے آگے جھک گئے۔ جنھوں نے ہر قسم کے شرک کو چھوڑ کر توحید خالص کو اختیار کر لیا۔ انسان کے لئے اگرچہ یہ مشکل ترین کام ہے کہ وہ اپنے سوا کسی دوسرے کا اقرار کرے۔ جب بھی کوئی شخص کسی دوسرے کو مانتا ہوا نظر آئے تو وہ یا تو خوف کی بنیاد پر ہوگا یا مصلحت کی بنیاد پر۔ تاہم یہی وہ عطیہ جو کوئی انسان کبھی کسی کو نہیں دیتا اسی کا مطالبہ انسان کے خالق نے انسان سے کیا ہے۔ اور اسی کا نام اسلام ہے۔ مسلم وہی ہے جو اپنی خودی کا اثاثہ اپنے خالق کو دینے پر راضی ہو جائے۔ جو اپنے آپ کو پوری طرح خدا کی سپردگی میں دے دے۔ جو ہر اعتبار سے خدا کا تابع فرمان بن جائے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ انسان کے لئے ناقابل برداشت کو برداشت کرنا ہے۔ مگر اسی کو خدا نے اپنی جنت کی قیمت بنا دیا ہے۔ جنت کی انوکھی نعمت اسی خوش نصیب کے حصہ میں آئے گی جو اس انوکھے عطیہ کی صورت میں اس کی قیمت پیش کر دے۔

خدا کی یاد

اخبار ہندستان ٹائمس کے ایڈیٹر نے ایک فیلڈ اسٹڈی (۵ امئی ۱۹۸۲) کے ذریعہ ہندستانی لوگوں کا مزاج معلوم کیا۔ وہ اپنے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہندستانیوں کا حال یہ ہے کہ جب کوئی مصیبت پڑتی ہے تو خدا ان کے یہاں سب سے اوپر ہوتا ہے۔ جب ہر چیز ٹھیک ہو تو پیسہ سب سے اوپر آجاتا ہے اور خدا کو دوسرے درجہ میں پہنچا دیتا ہے:

When a catastrophe strikes, God is tops. When all is tranquil, money manages to push God down to the second place.

یہ بات نہ صرف ہندستانیوں کے لئے صحیح ہے بلکہ وہ عام انسانوں کے لئے بھی بڑی حد تک درست ہے۔ انسان کا حال یہ ہے کہ تکلیف اور بے بسی کے لمحات میں وہ سب سے زیادہ خدا کو یاد کرتا ہے۔ اس وقت اس کی ساری توجہ خدا کی طرف لگ جاتی ہے۔ مگر جب حالات اچھے ہوں اور کوئی پریشانی سامنے نہ ہو تو وہ اپنے مادی مفادات کو اپنی تمام توجہ کا مرکز بنالیتا ہے۔

مگر اس قسم کی خدا پرستی خدا پرستی نہیں۔ وہ صرف آدمی کے اس جرم کو بتاتی ہے کہ وہ اپنے رب کو بھولا ہوا تھا۔ وہ وقت جب کہ اسے خدا کو یاد کرنا چاہئے تھا اس وقت اس نے خدا کو یاد نہیں کیا۔ یہاں تک کہ خدا نے اس کی حقیقت اس پر کھول دی۔ اس کی آنکھ سے غفلت کا پردہ ہٹ گیا۔ جب ایسا ہوا تو وہ گھبرا کر خدا کو پکارنے لگا۔

انسان ایک آزاد اور با اختیار مخلوق ہے۔ اس سے آزادانہ خدا پرستی مطلوب ہے نہ کہ مجبورانہ۔ انسان کا یاد کرنا وہ یاد کرنا ہے جب کہ اس نے راحت کے لمحات میں خدا کو یاد کیا ہو۔ راحت کے وقت خدا کو بھلائے رکھنا اور جب مصیبت آئے تو خدا کی طرف دوڑنا ایک ایسا عمل ہے جس کی خدا کے یہاں کوئی قیمت نہیں۔

پھر یہ واقعہ بتاتا ہے کہ جو لوگ دولت کو سب سے بڑا درجہ دئے ہوئے ہیں وہ جھوٹے معبود کو اپنا معبود بنائے ہوئے ہیں۔ جو چیز مصیبت کے وقت آدمی کا سہارا نہ بنے، جس کو آدمی خود نازک لمحات میں بھول جائے وہ کسی کا معبود کس طرح ہو سکتی ہے۔

محل سے کھنڈر

اندلس کے مسلم حکمرانوں میں سلطان عبد الرحمن ثالث بہت مشہور ہے۔ وہ ۳۰۰ ھ میں تخت سلطنت پر بیٹھا اور ۳۵۰ ھ میں بہتر سال کی عمر میں وفات پائی۔ اس کی ایک عیسائی بیوی تھی جس کا نام زہرا تھا۔ سلطان نے اپنی اس بیوی کے نام پر قرطبہ کے کنارے ایک شاندار محل تعمیر کیا اور اس کا نام الزہرار رکھا۔ چار میل لمبا اور تین میل چوڑا یہ محل اتنا بڑا تھا کہ اس کو قصر الزہرار کے بجائے مدینۃ الزہرار کہنے لگے۔ اس محل کی تعمیر ۳۲۵ ھ میں شروع ہوئی اور پچیس سال میں ۳۵۰ ھ میں مکمل ہوئی۔ المقری نے اس محل کی جو تفصیلات لکھی ہیں اس کے لحاظ سے یہ محل الف لیلہ کا کوئی طلسماتی شہر معلوم ہوتا ہے۔

اس محل کے بنانے پر دس ہزار معمار، چار ہزار اونٹ اور خچر روزانہ کام کرتے تھے۔ اس میں ۴۳۱۶ برج اور ستون تھے۔ سنگ مرمر اور دوسرے بہت سے قیمتی سامان فرانس، ترکی، یونان، شام اور افریقہ کے ملکوں کے بادشاہوں نے بطور تحفہ دئے تھے۔ اس کی چھتوں میں سونے چاندی کا کام اس کثرت سے کیا گیا تھا کہ دیکھنے والوں کی آنکھ جھپکتی تھی۔ اس محل کے انتظام اور نگرانی کے لئے ۱۳۷۵۰ ملازم مقرر تھے۔ اس کے علاوہ ۱۳۳۸۲ غلام تھے۔ حرم سرا کے اندر چھ ہزار عورتیں خدمت گزاری کے لئے حاضر رہا کرتی تھیں۔ سارا قصر باغات اور فواروں سے گلزار رہتا تھا۔ یورپ اور دوسرے ملکوں کے سیاح کثرت سے اس کو دیکھنے کے لئے آتے رہتے تھے۔

مگر اس عظیم الشان محل کا انجام کیا ہوا۔ ۲۵ سال میں موجودہ معیار سے ایک کھرب روپیہ سے بھی زیادہ میں بننے والا محل صرف پچاس سال میں ختم ہوگیا۔ اندلس کے مسلم حکمرانوں کے باہمی اختلافات کی وجہ سے عیسائیوں نے ان کے اوپر قابو پالیا اور ان کو شکست دے کر ان کے نام و نشان تک کو مٹا ڈالا، قرطبہ کا الزہرار کھنڈر بنا دیا گیا۔ اس کے بعد اس پر زمانہ کی گرد پڑتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ نظروں سے غائب ہوگیا۔ موجودہ زمانہ میں اس مقام کی کھدائی کی گئی ہے۔ مگر کھدائی کرنے والوں کو وہاں ٹوٹی ہوئی نالیوں کے سوا اور کچھ نہیں ملا۔

دنیا میں عیش و آرام کے نشانات کو مٹا کر خدا دکھاتا ہے کہ اس کی نظر میں یہاں کے عیش و آرام کی کوئی قیمت نہیں۔ مگر کوئی آدمی اس سے سبق نہیں لیتا۔ ہر بعد والا عین اسی مقام پر اپنا عیش خانہ بنانے میں مصروف ہو جاتا ہے جہاں اس کے پیش رو کا عیش خانہ برباد ہوا تھا۔

گڑھے میں پاؤں

مسٹر پی۔ ڈی۔ وینکٹیشورن ایک سرکاری ادارہ میں چیف مارکٹنگ منیجر تھے۔ ۲۹ مئی ۱۹۸۲ کی شام کو انھوں نے دہلی کے گوپالا ٹاور میں ایک میٹنگ میں شرکت کی۔ آٹھویں منزل پر اپنی میٹنگ سے فارغ ہو کر وہ دفتر سے باہر نکلے تو بجلی فیل ہو چکی تھی۔ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ لفٹ تک آئے۔ انھوں نے دیکھا کہ اس کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ وہ سمجھے کہ لفٹ آگئی ہے حالاں کہ لفٹ ابھی اوپر نویں منزل پر تھی۔ مسٹر وینکٹیشور لفٹ کے دروازے کی طرف لپکے۔ اس وقت وہ میٹنگ کے فیصلوں سے اتنا خوش تھے کہ وہ صورت حال کی نزاکت کا اندازہ نہ کر سکے۔ انھوں نے اپنا ایک پاؤں لفٹ کے اندر ڈال دیا۔ مگر وہاں خالی تھا۔ وہ اچانک آٹھویں منزل سے زمین پر آگئے۔ ان کا ذاتی ڈاکٹر ان کے ساتھ تھا مگر وہ صرف یہ خدمت انجام دے سکا کہ نیچے اتر کر ان کی لاش کو دیکھے اور ان کے مردہ ہونے کا اعلان کرے۔ موت کے وقت ان کی عمر اکیاون سال تھی (ہندستان ٹائمس ۳۰ مئی ۱۹۸۲)

مسٹر وینکٹیشور ایک نہایت کامیاب افسر تھے۔ حال میں ایک سرکاری جرنل میں ان کے بارے میں یہ الفاظ چھپے تھے —— ایک بہادر کارکن، ایک مستعد اور اختراعی منتظم، جس کے اندر میں آگ لگی ہوئی ہو اور جس کے دماغ میں نظریات کا خزانہ ہو۔ ایک ہوشیار جنرل:

A thoroughbred professional and a dashing, innovative manager with fire in his belly and ideas in his mind, an astute general

دنیا کے اعتبار سے مسٹر وینکٹیشور کا کیس ایک انوکھا کیس ہے۔ مگر آخرت کے اعتبار سے ہر آدمی یہی فعل انجام دے رہا ہے۔ ہر آدمی عقل مندی اور کامیابی کے جوش میں ایسی جگہ اپنا پاؤں رکھ رہا ہے جو اس کو سیدھے آخرت کے گڑھے میں گرا دینے والا ہے —— کسی کو بے عزت کرنے والے الفاظ بولنا، کسی کو ستانے کے لئے اقدام کرنا، کسی کے خلاف ضد اور انتقام کے تحت کارروائی کرنا، کسی کے ساتھ ظلم اور بے انصافی برتنا۔ کسی کو ناحق اپنے زور و طاقت کا نشانہ بنانا، کسی کا بے دلیل مذاق اڑانا، یہ سب گویا "آٹھویں منزل" کے خالی مقام پر پاؤں رکھنا ہے۔ ایسا ہر اقدام آدمی کو تباہی کے نچلے گڑھے میں پہنچا دیتا ہے۔ اس کے بعد نہ اس کے ساتھی اس کو بچانے والے ثابت ہو سکتے ہیں نہ اس کی خوش فہمیاں —— ہر آدمی گڑھے میں پاؤں رکھ رہا ہے۔ اگرچہ بطور خود وہ سمجھتا ہے کہ وہ محفوظ تختہ پر اپنا قدم جمائے ہوئے ہے۔

ارتقاء علم کی کسوٹی پر

حیاتیاتی ارتقا کے متعلق چارلس ڈارون کی کتاب ۱۸۵۹ میں شائع ہوئی تو مغربی اقوام کے درمیان اس کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کتاب میں زندگی کی پیدائش کے بارے میں جو نظریہ پیش کیا گیا تھا وہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ اس کے پہلے ایڈیشن میں ٹائٹل پر حسب ذیل نام درج تھا:

The Origin of Species of natural Selection, or the Preservation of Favoured Species in the Struggle for Life

ڈارون کے نظریہ کا خلاصہ یہ تھا کہ کسی جاندار سے جب چند بچے پیدا ہوتے ہیں تو ان میں تھوڑا تھوڑا فرق ہوتا ہے۔ ان میں سے کسی کا فرق اس کو دوسرے ہم جنسوں کے مقابلہ میں زیادہ بہتر پوزیشن میں کر دیتا ہے، اسی بنا پر وہ زندہ رہتا ہے اور دوسرے ختم ہو جاتے ہیں۔ یہ فرق توالد و تناسل کے ذریعہ بڑھتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ لاکھوں سال میں یہ نوبت آتی ہے کہ ایک نوع کا جانور دوسری نوع میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ مثلاً بکری کا گھوڑا بن جانا۔ اس طرح مختلف جاندار ارتقا کی سیڑھیوں پر چڑھتے رہتے ہیں یہاں تک کہ انسان وجود میں آجاتا ہے۔

بظاہر اس خوبصورت نظریہ میں بہت سے خلا تھے۔ مثلاً یہ کہ ارتقا اگر ایک مسلسل عمل ہے تو کیوں ایسا ہے کہ زمین کے طبقات سے حاصل ہونے والے متحجرات صرف کمال کے مرحلہ کو پہنچے ہوئے انواع حیات کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ کیوں نہ ایسا ہوا کہ درمیانی مرحلہ کی قسمیں بھی کثیر تعداد میں موجود ہوتیں۔ یعنی ایسے جانور جو آدھا ایک جیسے ہوں اور آدھا دوسرے جیسے:

If evolution has been a continuous process, why does the fossil record only show us apparently settled and established species. Why does it not include an abundance of intermediate forms.

ڈارون کا جواب یہ تھا کہ متحجرات کا ذخیرہ ابھی نامکمل ہے۔ آئندہ جب زیادہ متحجرات دستیاب ہو چکے ہوں گے تو یہ کمی دور ہو جائے گی۔ ڈارون کے بعد مزید بہت زیادہ متحجرات انسان کے علم میں آئے۔ مگر مذکورہ کمی اس کے باوجود بدستور باقی رہی۔

اس قسم کی کثیر خامیوں کے باوجود ڈارونزم کو کیوں اتنی زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ نظریہ ۱۹ویں صدی کے مغربی انسان کی نوآبادیاتی توسیع پسندی کے عین مطابق تھا۔ برٹرینڈ رسل کے الفاظ میں "یہ آزاد اقتصادیات کے اصول کو نباتات اور حیوانات کی دنیا تک وسیع کرنا تھا:

It was an extension to the animal and vegetable world of laissez-faire economics.

قدیم معقولات

بوعلی سینا ایک مشہور مسلم فلسفی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جب وہ مرض الموت میں مبتلا ہوا تو اس نے مرنے سے پہلے اپنے فلسفیانہ خیالات سے توبہ کی اور آخر میں کہا: "خدا سچا ہے اور بوعلی سینا جھوٹا ہے"، بوعلی سینا کا فلسفہ کفر کا فلسفہ نہ تھا۔ وہ اسلامی عقائد کو قدیم فلسفیانہ اسلوب میں بیان کرنے کی ایک کوشش تھی۔ پھر اس نے ایسا کیوں کیا۔ اس کی وجہ اسلوب بحث کا وہ فرق ہے جو قرآن و حدیث کے اسلام اور متکلمین کے اسلام میں پایا جاتا ہے۔ موت کے وقت بوعلی سینا، رازی اور دوسرے متکلمین کو اس کا احساس ہوا اور انھوں نے فلسفیانہ اسلام پر مرنے کے بجائے قرآنی اسلام پر مرنا پسند کیا۔

پھر ایسا کیوں ہوا کہ اسلام کا علم کلام قرآن کے فطری اسلوب میں مرتب ہونے کے بجائے فلسفہ کے منطقی اسلوب میں مرتب کیا گیا، اس کا سبب وقتی حالات تھے۔ بنو امیہ کے عہد کے آخر اور بنو عباس کے عہد کے آغاز میں شام و مصر وغیرہ کے علاقوں کے یہودی اور مسیحی کثرت سے مسلمان ہوئے۔ اس سے کلیسا کے ذمہ داروں کو پریشانی ہوئی۔ مسیحی کلیسا صدیوں سے فلسفیانہ بحث مباحثہ میں مشغول تھا۔ اس کے مقابلہ میں عرب مسلمان فلسفیانہ طرز کلام سے بالکل ناآشنا تھے۔ انھوں نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں سے فلسفیانہ مناظرے شروع کر دیے۔

"خدا کی فطرت کس کو کہتے ہیں، اس سے مراد کیا ہے کہ خدا قادر مطلق اور عالم مطلق ہے۔ خدا کے علم اور خدا کی صفات میں کیا تعلق ہے۔ اگر خدا نے اپنے ناقابل تغیر فیصلہ سے ہر چیز کی تقدیر معین کر دی ہے تو پھر انسان کے فاعل مختار ہونے کا مطلب کیا ہے"۔ مسلمان اس قسم کی بحثوں سے ناآشنا تھے، جب کہ مسیحی علما ران کے تعلیم و تعلم میں مشغول ہونے کی وجہ سے ان میں خوب ماہر ہو چکے تھے۔ چنانچہ ابتداءً مسلمانوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

دمشق کا سینٹ جان جب اس انداز پر بحث کرتا تو وہ مسلمانوں کو بے جواب کر دیتا۔ تاہم مسلمانوں نے اپنے مخالفین کو، جو یونانی بحث و مناظرہ کے ہتھیاروں سے مسلح تھے، زیادہ مدت تک تفوق کا موقع نہیں دیا۔ انھوں نے فلسفہ و منطق کو پڑھنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ وہ اس انداز بحث کے ماہر بن گئے جو یونانی اور شامی حکما کی کتابوں میں موجود تھا۔ حتیٰ کہ المامون (۲۱۸ ـ ۱۹۸ھ) کے زمانہ میں بغداد میں بیت الحکمت کے قیام

کے بعد انھوں نے اپنے حریفوں پر واضح برتری حاصل کرلی۔
اسلام اور غیر اسلام کے مقابلہ میں اسلام جیت گیا۔ یہ انداز کلام اگرچہ قرآن وحدیث کے لئے اجنبی تھا۔ تاہم اگر اس کی حیثیت ایک وقتی ہتھیار کی ہوتی تو اس سے اسلام کو کوئی حقیقی نقصان نہ ہوتا۔ مگر غلطی یہ ہوئی کہ اس کو اسلام کے نصاب تعلیم کا جزء بنا دیا گیا۔ اب ایسے علماء پیدا ہونے لگے جو اس انداز کلام کے ماہر تھے۔ اس طرح اسلامی تاریخ میں اس کا تسلسل قائم ہوگیا۔ ایک وقتی اہمیت کی چیز اسلام کا مستقل جزء بنتی چلی گئی، حتیٰ کہ وہ مقدس حیثیت اختیار کرگئی۔ اب اس کو بدلنا لوگوں کو ایسا ہی معلوم ہونے لگا جیسے قرآن وحدیث کو بدلنا۔ "خدا ادراک کی علت ہے۔ ادراک نفس کی علت ہے۔ نفس فطرت کی علت ہے۔ فطرت تمام افراد اشیاء کی علت ہے اور پھر خدا ہر شے کی علت ہے" اس قسم کی پُر پیچ باتیں کرنے والا عالم ہے۔ اور جو ایسی باتیں نہ کرسکے وہ جاہل۔

اس کے بعد شدید تر غلطی یہ ہوئی کہ اسلامی علوم، مثلاً علم عقائد، علم فقہ، علم کلام اسی مخصوص فنی زبان میں مرتب کر دئے گئے۔ چنانچہ آج کوئی شخص اصول فقہ کی کتابوں کو اس وقت تک سمجھ نہیں سکتا جب تک وہ اس چیز سے بخوبی واقف نہ ہو جس کو معقولات کہا جاتا ہے، یہاں پہنچ کر وہ چیز مسلمانوں کو قرآنی اسلام سے دور کرنے کا سبب بن گئی جس کو ابتداءً غیر مسلموں کو اسلام سے قریب لانے کے لئے ایک علمی ہتھیار کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔

آج کا مسلمان دو چیزوں کے درمیان ہے۔ وہ یا تو قرآن وحدیث والے فطری اسلام کو لے اور منطقی اسلام کو چھوڑ دے یا منطقی اسلام کو لے اور قرآن وحدیث والے فطری اسلام کو چھوڑے رکھے۔ یہ یقینی ہے کہ بیک وقت وہ دونوں چیزوں کو نہیں لے سکتا۔ ایک چیز کو لینے کے لئے بہرحال اس کو دوسری چیز چھوڑنی پڑے گی۔

موجودہ زمانہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ اسلامی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ وہ اسلامیات کا گہرا مطالعہ کرتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کے اندر قرآنی ذہن پیدا نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے اسلامی مطالعہ کا مرکز قرآن ہے ہی نہیں۔ وہ قرآن یا اسلام کے مطالعہ کے نام پر مذکورہ بالا قسم کی فنی کتابیں پڑھتے ہیں نہ کہ اصل قرآن۔ پھر جو اسلام وہ پڑھتے ہیں وہی ان کا دینی ذہن بنائے گا نہ کہ وہ اسلام جو انھوں نے پڑھا ہی نہیں۔

زبان جنت بھی ہے اور زبان جہنم بھی

حضرت ابوالدرداء انصاری نے فرمایا: مومن کے جسم کا کوئی حصہ اللہ کو اتنا محبوب نہیں جتنا کہ اس کی زبان، اس کے ذریعہ وہ اس کو جنت میں داخل کرے گا۔ اور کافر کے جسم کا کوئی حصہ اللہ کو اتنا مبغوض نہیں جتنا کہ اس کی زبان، جس کے ذریعہ وہ اس کو آگ میں داخل کرے گا۔ (ما فی المومن بضعة احب الی اللہ عز وجل من لسانه به یدخله الجنة وما فی الکافر بضعة ابغض الی اللہ عز وجل من لسانه. به یدخله النار، حلیۃ الاولیاء لابی نعیم جلد ۱)

چپ رہنا بھی ایک عمل ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: چپ رہو الا یہ کہ بھلی بات کہنا ہو (الصمت الا من خیر)

اللہ سے ڈرنے والا زبان کو روکنے والا ہوتا ہے

ایک شخص نے حضرت عبداللہ سے کہا کہ مجھے نصیحت کیجئے۔ انھوں نے کہا: اپنے گھر کو اپنے لئے کافی سمجھ، اپنی زبان کو روک لے اور اپنی خطاؤں کو یاد کرکے رویا کر (لیسعك بیتك واکفف لسانك وابك علی ذکر خطیئتك۔ حلیۃ الاولیاء لابی نعیم)

سب سے زیادہ گناہ زبان سے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انسان کی اکثر خطائیں زبان سے ہوتی ہیں (اکثر خطایا ابن آدم من لسانه)

خاموشی ایک علم ہے

ابن عساکر نے حضرت ابوالدرداء انصاری سے نقل کیا ہے۔ انھوں نے فرمایا، تم خاموشی کو سیکھو جس طرح تم بولنا سیکھتے ہو۔ کیونکہ خاموشی بہت بڑی بردباری ہے۔ اور تم سنانے سے زیادہ سننے کے حریص بنو۔ اور تم ایسی چیز کے بارے میں بات مت کرو جس کا تمھیں کوئی فائدہ نہ ہو۔ اور عجب کے بغیر ہنسنے والا نہ بن۔ اور غیر حاجت کی طرف چلنے والا نہ بن (تعلموا الصمت کما تعلمون الکلام فان الصمت حلم عظیم وکن الی أن تسمع احرص منك الی ان تتکلم ولا تتکلم فی شیئ لا یعنیك ولا تکن مضحاکا من غیر عجب ولا مشاء الی غیر ارب کنز الاعمال جلد دوم)

کسی کو برے نام سے نہ پکارو

حضرت عطاء بن یسار کہتے ہیں کہ جب حضرت صفیہ (زوجۂ رسول) خیبر سے مدینہ آئیں تو حارثہ بن نعمان کے گھر اتاری گئیں۔ جب انصار کی عورتوں نے یہ خبر سنی تو وہ ان کو دیکھنے کے لئے جمع ہو گئیں۔ حضرت عائشہ بھی اپنے اوپر نقاب ڈالے ہوئے آئیں۔ جب وہ دیکھ کر واپس ہوئیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ اے عائشہ تم نے کیا دیکھا۔ انھوں نے جواب دیا کہ ایک یہودیہ دیکھی۔ آپ نے فرمایا ایسا مت کہو۔ کیونکہ وہ اسلام لے آئی اور اس کا اسلام اچھا رہا (قالت: رأیت یهودیة، فقال: لا تقولی ذلك فانها اسلمت وحسن اسلامها۔ طبقات ابن سعد)

اس ماحول میں کوئی خیر نہیں جہاں احتساب پر پابندی ہو

حضرت ابوبکرہ بیمار ہوئے تو ان کے لڑکے چیخ پڑے۔ حضرت ابوبکرہ نے کہا کہ مجھ پر چلاؤ نہیں۔ خدا کی قسم کوئی جان جو نکالی جانے والی ہو اس کا نکالا جانا مجھے ابوبکرہ کی جان نکالے جانے سے زیادہ پسند نہیں۔ یہ سن کر لوگ گھبرا گئے۔ ان کے لڑکوں نے کہا اے باپ کیوں۔ انھوں نے کہا: میں ڈرتا ہوں کہ کہیں مجھ پر وہ زمانہ آجائے جب کہ میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہ کرسکوں اور اس زمانہ میں کوئی خیر نہ ہوگا (انی اخشیٰ ان ادرك زمانا لا استطیع ان آمر بالمعروف ولا انهی عن منکر ولا خیر یومئذ، طبرانی)

خدا کا ڈر آدمی کی زبان کو روک دیتا ہے

خلیفہ ثانی عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیا۔ انھوں نے اللہ کی حمد و ثنا کی اور پھر کہا کہ عورتوں کی مہر میں زیادتی نہ کرو۔ اور جب بھی مجھے کسی کے بارے میں یہ اطلاع ملے گی کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر (تقریباً ۴۰۰ درہم) سے زیادہ مہر مقرر کیا ہے تو میں اس زیادتی کو لے کر بیت المال میں جمع کر دوں گا۔ اس کے بعد وہ منبر سے اترے تو قریش کی ایک عورت ان کے سامنے آئی۔ اس نے کہا: اے امیر المومنین، خدا کی کتاب زیادہ قابل اتباع ہے یا آپ کا قول (اکتاب اللہ احق ان یتبع ام قولك) حضرت عمر نے کہا کہ اللہ کی کتاب۔ مگر یہ بات تو نے کس لئے کہی۔ عورت نے کہا۔ آپ نے ابھی لوگوں کو منع کیا ہے کہ وہ عورتوں کی مہر زیادہ نہ باندھیں۔ حالانکہ اللہ اپنی کتاب میں فرماتا ہے: وآتیتم احداهن قنطارا فلا تاخذوا منه شیئاً۔ یعنی اگر تم نے ان میں سے کسی کو ڈھیر سا مال دیا ہے تو اس میں سے کچھ واپس نہ لو۔ حضرت عمر نے کہا ہر شخص عمر سے زیادہ عالم ہے (کل احد افقه من عمر) اس جملہ کو تین بار فرمایا۔ اس کے بعد دوبارہ منبر کی طرف لوٹے اور کہا میں نے تم کو عورتوں کا مہر زیادہ باندھنے سے منع کیا تھا اب ہر آدمی کو اختیار ہے کہ اپنے مال میں جو چاہے کرے۔ حضرت عمر نے مزید کہا کہ مہر اگر آخرت میں فخر اور بڑائی کی چیز ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹیاں اور آپ کی عورتیں اس کی زیادہ مستحق تھیں (لو کان المهر سناء ورفعة فی الآخرة کان بنات النبی صلی اللہ علیہ وسلم ونسائه احق بذلك، کنز الاعمال جلد ۸)

نصیحت کا گوارا کرنا اسلامیت کی پہچان ہے

عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے کہا: بے شک تم خیر پر رہو گے جب تک تم برائیوں کو پہچانو گے اور جب تک تم بھلائیوں کا انکار نہ کرو گے۔ اور جب تک تمہارا عالم تم میں کھڑا ہو کر تم کو نصیحت کرے گا اور اس کو ہلکا نہ سمجھا جائے گا (انکم لن تبرحوا بخیر ما دمتم تعرفون ما کنتم تنکرون ولا تنکرون ما کنتم تعرفون وما قام عالمکم تیکلم بینکم غیر مستخف۔ کنز الاعمال جلد ۲)

مومن نرم مزاج والا انسان ہوتا ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ اس آدمی پر رحم فرمائے جو خریدتے اور بیچتے وقت نرم ہو اور قرض کا تقاضا کرتے ہوئے نرمی کا طریقہ اختیار کرے (رحم اللہ رجلا سمحا اذا باع واذا اشتری واذا اقتضیٰ)

زبان شر ہے اور زبان خیر بھی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بھلی بات کہو تم فائدہ حاصل کروگے اور شر سے خاموشی برتو تم محفوظ رہوگے (قولوا خیرا تغنموا واسکتوا عن شر تسلموا، طبرانی)

ہر چیز پر صبر و شکر کے ساتھ راضی رہنا

حضرت ابو ایوب انصاری سے ایک شخص نے پوچھا کہ پیغمبر اسلام کا مزاج کیسا تھا۔ انھوں نے جواب دیا کہ آپ کا حال یہ تھا کہ آپ نے کبھی کسی کھانے کی فرمائش نہیں کی اور جو کھانا آپ کے سامنے پیش کیا گیا، آپ نے کبھی اس کی برائی نہ کی، (وفار الوفار جلد ا)

ٹکراؤ کرنے سے پہلے اپنی طاقت کا جائزہ لو

حضرت عبداللہ بن عمر کہتے ہیں کہ میں نے حجاج کو خطبہ دیتے ہوئے سنا۔ اس نے ایک ایسی بات کہی جو مجھے اچھی نہ لگی۔ میں نے چاہا کہ اس کی تردید کروں۔ مگر مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول یاد آگیا کہ مومن کے لئے مناسب نہیں کہ اپنے آپ کو ذلیل کرے۔ حضرت ابن عمر کہتے ہیں کہ میں نے کہا اے خدا کے رسول، کوئی شخص کس طرح اپنے آپ کو ذلیل کرتا ہے، آپ نے فرمایا کہ ایسی آفت سے چھیڑ کرے جس سے مقابلہ کی طاقت نہ رکھتا ہو۔ (لا ینبغی للمؤمن ان یذل نفسہ قال قلت یا رسول اللہ، کیف یذل نفسہ۔ قال یتعرض من البلاء لما لا یطیق۔ رواہ البزار والطبرانی)

مومن کی زبان کیسی زبان ہوتی ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مومن نہ کسی کو طعنہ دیتا ہے، نہ وہ کسی کو لعنت کرتا ہے۔ نہ وہ فحش گوئی کرتا ہے اور نہ وہ بدزبانی کرنے والا ہوتا ہے (لیس المومن بالطعان ولا اللعان ولا الفاحش ولا البذی۔ ترمذی)

اچھا مسلمان وہ ہے جو کردار میں اچھا ہو

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کون مسلمان سب سے افضل ہے۔ آپ نے فرمایا: وہ جس کی زبان اور جس کے ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں (من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ۔ متفق علیہ)

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ۭ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ اِنِّىْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ڮ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَي اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ ۝

اور جب ان کو ہماری کھلی ہوئی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو جن لوگوں کو ہمارے پاس آنے کا کھٹکا نہیں ہے وہ کہتے ہیں کہ اس کے سوا کوئی اور قرآن لاؤ یا اس کو بدل دو۔ کہو کہ میرا یہ کام نہیں کہ میں اپنے جی سے اس کو بدل دوں۔ میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پاس آتی ہے۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو میں ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ کہو کہ اگر اللہ چاہتا تو میں اس کو تمھیں نہ سناتا اور نہ اللہ اس سے تمھیں باخبر کرتا۔ میں اس سے پہلے تمھارے درمیان ایک عمر بسر کر چکا ہوں۔ پھر کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔ اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ بہتان باندھے یا اس کی نشانیوں کو جھٹلائے۔ یقیناً مجرموں کو فلاح حاصل نہیں ہوتی ۱۵ــ۱۷

مکہ کے قریش خدا اور رسول کو مانتے تھے۔ وہ اپنے کو ملت ابراہیمی کا پیرو کہتے تھے۔ حتیٰ کہ اسلام کی بہت سی دینی اصطلاحیں مثلاً صلاۃ، صوم، زکوٰۃ، حج وغیرہ وہی ہیں جو پہلے سے ان کے یہاں رائج تھیں۔ اس کے باوجود کیوں انھوں نے کہا کہ دوسرا قرآن لاؤ یا اس قرآن میں کچھ ترمیم کرو تب ہم اس کو مانیں گے۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ قرآن میں خدا کے خالص دین کا اعلان تھا۔ جب کہ قریش خدا کے دین کے نام پر ایک ملاوٹی دین کو اختیار کیے ہوئے تھے۔

قرآن کی توحید سے ان کے مشرکانہ عقیدۂ خدا پر زد پڑتی تھی۔ قرآن کے تصور عبادت کی روشنی میں ان کی عبادتیں محض کھیل تماشا معلوم ہوتی تھیں۔ وہ پیغمبر کو اپنے قومی فخر کا نشان بنائے ہوئے تھے اور قرآن ان سے ایک ایسے پیغمبر کو ماننے کا مطالبہ کر رہا تھا جو ان کی عملی زندگی میں رہنما کا درجہ حاصل کرلے۔ انھوں نے کعبہ کی خدمت کو اپنی دینداری کا سب سے بڑا ثبوت سمجھ رکھا تھا جب کہ قرآن نے بتایا کہ دین داری یہ ہے کہ آدمی خدا سے ڈرے اور جو کچھ کرے آخرت کو سامنے رکھ کر کرے۔

آدمی چند الفاظ بول کر حق کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے دل میں "کھٹکا" نہیں ہوتا۔ اگر آدمی کے دل میں یہ کھٹکا لگا ہوا ہو کہ وہ اپنے قول و فعل کے لئے خدا کے یہاں جواب دہ ہے تو وہ فوراً سنجیدہ ہو جائے گا۔ اور جو شخص سنجیدہ ہو وہ معاملہ کو حقیقت پسندی کی نظر سے دیکھے گا، وہ سرسری طور پر اس کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ۭ قُلْ اَتُنَبِّئُوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ ۭ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۱۸﴾ وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيْمَا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۹﴾

اور وہ اللہ کے سوا ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو ان کو نہ نقصان پہنچا سکیں اور نہ نفع پہنچا سکیں۔ اور وہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے یہاں ہمارے سفارشی ہیں۔ کہو، کیا تم اللہ کو ایسی چیز کی خبر دیتے ہو جو اس کو آسمانوں اور زمین میں معلوم نہیں۔ وہ پاک اور برتر ہے اس سے جس کو وہ شریک کرتے ہیں۔ اور لوگ ایک ہی امت تھے۔ پھر انھوں نے اختلاف کیا۔ اور اگر تمھارے رب کی طرف سے ایک بات پہلے سے نہ ٹھہر چکی ہوتی تو ان کے درمیان اس امر کا فیصلہ کر دیا جاتا جس میں وہ اختلاف کر رہے ہیں ۱۹ — ۱۸

ہماری دنیا میں جو واقعات ہو رہے ہیں وہ بظاہر مادی اسباب کے تحت ہو رہے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ تمام واقعات کے پیچھے خدا کا تصرف کام کر رہا ہے۔ اس دنیا میں کسی کو کوئی ذاتی اختیار حاصل ہی نہیں۔ توحید یہ ہے کہ آدمی ظاہری چیزوں سے گزر کر غیب میں چھپے ہوئے خدا کو پا لے۔ اس کے مقابلہ میں شرک یہ ہے کہ آدمی ظاہری چیزوں میں اٹک کر رہ جائے۔ وہ چیزوں ہی کو چیزوں کے خالق کا مقام دے دے۔

اس دنیا میں خدا کے سوا کسی کے پاس نفع دینے یا نقصان پہنچانے کی طاقت نہیں۔ جو آدمی اس حقیقت کو پالیتا ہے اس کی تمام توجہ خدا کی طرف لگ جاتی ہے۔ وہ خدا ہی کی پرستش کرتا ہے۔ وہ اسی سے ڈرتا ہے اور اسی سے امیدیں قائم کرتا ہے۔ وہ اپنا سب کچھ ایک خدا کو بنا لیتا ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ چیزوں میں اٹکے ہوئے ہوں وہ اپنے اپنے ذوق کے لحاظ سے کسی غیر خدا کو اپنا خدا بنا لیتے ہیں اور ان غیر خداؤں سے وہی امیدیں اور اندیشے وابستہ کر لیتے ہیں جو درحقیقت خدائے واحد کے ساتھ وابستہ کرنا چاہئے۔ اسی کی ایک صورت شفاعت کا عقیدہ ہے۔ لوگ یہ فرض کر لیتے ہیں کہ انسانوں یا غیر انسانوں میں کچھ ایسی برتر ہستیاں ہیں جو خدا کی نظر میں

مقدس ہیں۔ خدا ان کی سنتا ہے اور ان کی سفارش پر دنیوی رزق یا اخروی نجات کے فیصلے کرتا ہے۔ مگر اس قسم کا عقیدہ باطل ہے۔ وہ خدا کی خدائی کا کمتر اندازہ ہے۔

خدا اس قسم کے ہر شرک سے پاک ہے۔ خدا اپنی صفات کا جو تعارف اپنی عظیم کائنات میں کرا رہا ہے اس کے لحاظ سے اس قسم کے تمام عقائد بالکل بے جوڑ ہیں۔ ایسے کسی عقیدہ کا مطلب یہ ہے کہ خدا وہ نہیں ہے جو بظاہر اپنی تخلیقی صفات کے آئینہ میں نظر آرہا ہے یا پھر خدا کی صفتوں میں تضاد ہے۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی چیز ممکن نہیں۔

خدا نے انسانیت کا آغاز دین فطرت سے کیا تھا۔ اس وقت تمام انسانوں کا ایک ہی دین تھا۔ اس کے بعد لوگوں نے فرق کرکے دین کے مختلف روپ بنا لئے۔ اس کی وجہ اس آزادی کا غلط استعمال ہے جو لوگوں کو امتحان کی غرض سے دی گئی ہے۔ اگر خدا ظاہر ہوجائے تو اس کی طاقتوں کو دیکھ کر لوگوں کی سرکشی ختم ہوجائے اور اچانک اختلاف کی جگہ اتحاد پیدا ہوجائے۔ کیونکہ شدت خوف رایوں کے تعدد کو ختم کر دیتا ہے۔ مگر خدا قیامت سے پہلے اس صورت حال میں مداخلت نہیں کرے گا۔ موجودہ دنیا کو خدا نے امتحان کے لئے بنایا ہے اور امتحان کی فضا باقی رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ حقیقت چھپی رہے اور لوگوں کو موقع ہو کہ وہ اپنی عقل کو صحیح رخ پر بھی استعمال کرسکیں اور غلط رخ پر بھی۔

وَيَقُولُونَ لَوْلَآ أُنزِلَ عَلَيْهِ ءَايَةٌ مِّن رَّبِّهِۦ ۖ فَقُلْ إِنَّمَا ٱلْغَيْبُ لِلَّهِ فَٱنتَظِرُوٓا۟ إِنِّى مَعَكُم مِّنَ ٱلْمُنتَظِرِينَ ﴿٢٠﴾ وَإِذَآ أَذَقْنَا ٱلنَّاسَ رَحْمَةً مِّنۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُمْ إِذَا لَهُم مَّكْرٌ فِىٓ ءَايَاتِنَا ۚ قُلِ ٱللَّهُ أَسْرَعُ مَكْرًا ۚ إِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُونَ مَا تَمْكُرُونَ ﴿٢١﴾

اور وہ کہتے ہیں کہ نبی پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتاری گئی، کہو کہ غیب کی خبر تو اللہ ہی کو ہے۔ تم لوگ انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں۔ اور جب کوئی تکلیف پڑنے کے بعد ہم لوگوں کو اپنی رحمت کا مزا چکھاتے ہیں تو وہ فوراً ہماری نشانیوں کے معاملہ میں حیلے بنانے لگتے ہیں۔ کہو کہ خدا اپنے حیلوں میں ان سے بھی زیادہ تیز ہے۔ یقیناً ہمارے فرشتے تمہاری حیلہ بازیوں کو لکھ رہے ہیں ۲۱—۲۰

مکہ کے لوگ جب مسلسل انکار کی روش پر قائم رہے تو خدا نے ان پر قحط بھیجا جو سات سال مسلسل رہا اور بالآخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کے بعد ختم ہوا۔ یہ ایک نشانی تھی جس سے انھیں یہ سبق لینا چاہئے تھا کہ رسول کا انکار کرنے کے بعد وہ خدائی پکڑ کی زد میں آجائیں گے۔ مگر ان کا حال یہ ہوا کہ جب تک قحط رہا الحاح وزاری کرتے رہے اور جب قحط رخصت ہوا تو کہنے لگے کہ یہ تو زمانہ کی گردشیں ہیں جو ہر ایک کے ساتھ پیش آتی ہیں۔ اس کا

رسول کو ماننے یا نہ ماننے سے کوئی تعلق نہیں ۔

پیغمبر سے لوگ نشانی مانگتے ہیں ۔ مگر اصل سوال نشانی کے ظہور کا نہیں بلکہ اس سے سبق لینے کا ہے ۔ کیونکہ نشانی صرف دیکھنے کے لئے ہوتی ہے وہ مجبور کرنے کے لئے نہیں ہوتی ۔ نشانی ظاہر ہونے کے بعد بھی یہ آدمی کے اپنے اختیار میں ہوتا ہے کہ وہ اس کو مانے یا کوئی جھوٹی توجیہ نکال کر اسے رد کر دے ۔

تاہم جب خدا کی آخری نشانی ظاہر ہوتی ہے تو اس کے مقابلہ میں انسان کو کوئی اختیار نہیں ہوتا ۔ یہ آخری نشانی اتمام حجت کے بعد خدا کی عدالت بن کر آتی ہے اور وہ مختلف پیغمبروں کے لئے مختلف صورتوں میں آتی ہے ۔ پیغمبر آخر الزماں کے لئے مختلف مصلحتوں کی بنا پر یہ نشانی اس صورت میں ظاہر ہوئی کہ منکرین کو مغلوب کر کے مومنین کو ان کے اوپر غالب کر دیا گیا ۔ شاہ عبد القادر صاحب اس سلسلہ میں موضح القرآن میں لکھتے ہیں "یعنی اگر کہیں کہ ہم کیسے جانیں کہ تمھاری بات سچ ہے ۔ فرمایا کہ آگے حق تعالی اس دین کو روشن کرے گا اور مخالف ذلیل اور برباد ہو جائیں گے ۔ سو ویسا ہی ہوا ۔ سچ کی نشانی ایک بار کافی ہے ۔ اور ہر بار مخالف ذلیل ہوں تو فیصلہ ہو جائے ۔ حالانکہ فیصلہ کا دن دنیا میں نہیں "

آدمی جب سرکشی کرتا ہے اور اس کی وجہ سے اس کا کچھ بگڑتا ہوا نظر نہیں آتا تو وہ اور بھی زیادہ ڈھیٹ ہو جاتا ہے ۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ خدا کی پکڑ سے باہر ہے ۔ حالانکہ یہ عین خدا کی تدبیر ہوتی ہے ۔ خدا سرکش آدمی کو ڈھیل دیتا ہے تاکہ وہ بے فکر ہو کر خوب سرکشی کرے ۔ اور اس سرکشی کے دوران خدا کے کارندے پردہ میں رہ کر خاموشی کے ساتھ اس کے تمام اقوال و افعال کو لکھتے رہتے ہیں ۔ یہاں تک کہ جب اس کا وقت پورا ہو جاتا ہے تو اچانک موت کا فرشتہ ظاہر ہو کر اس کو پکڑ لیتا ہے تاکہ اس کو اس کے اعمال کا حساب دینے کے لئے خدا کے سامنے حاضر کر دے ۔

هُوَ الَّذِي يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيحٍ طَيِّبَةٍ وَفَرِحُوا بِهَا جَاءَتْهَا رِيحٌ عَاصِفٌ وَجَاءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ أُحِيطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ لَئِنْ أَنْجَيْتَنَا مِنْ هَٰذِهِ لَنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ ﴿۲۲﴾ فَلَمَّا أَنْجَاهُمْ إِذَا هُمْ يَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۗ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ ۖ مَتَاعَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ ثُمَّ إِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۲۳﴾

وہ اللہ ہی ہے جو تم کو خشکی اور تری میں چلاتا ہے ۔ چنانچہ جب تم کشتی میں ہوتے ہو اور کشتیاں لوگوں کو لے کر موافق

ہوا سے چل رہی ہوتی ہیں اور لوگ اس سے خوش ہوتے ہیں کہ یکایک تند ہوا آتی ہے اور ان پر ہر جانب سے موجیں اٹھنے لگتی ہیں اور وہ گمان کر لیتے ہیں کہ ہم گھر گئے۔ اس وقت وہ اپنے دین کو اللہ ہی کے لئے خالص کر کے اس کو پکارنے لگتے ہیں کہ اگر تو نے ہمیں اس سے نجات دے دی تو یقیناً ہم شکر گزار بندے بنیں گے۔ پھر جب وہ ان کو نجات دے دیتا ہے تو فوراً ہی زمین میں ناحق کی سرکشی کرنے لگتے ہیں۔ اے لوگو تمہاری سرکشی تمہارے اپنے ہی خلاف ہے، دنیا کی زندگی کا نفع اٹھالو، پھر تم کو ہماری طرف لوٹ کر آنا ہے، پھر ہم بتادیں گے جو کچھ تم کر رہے تھے ۲۲ — ۲۳

انسان ایک بے حد حساس وجود ہے۔ وہ تکلیف کو برداشت نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ انسان پر جب تکلیف کا کوئی لمحہ آتا ہے تو وہ فوراً سنجیدہ ہو جاتا ہے۔ اس وقت اس کے ذہن سے تمام مصنوعی پردے ہٹ جاتے ہیں۔ فکر کے لمحات میں آدمی اس حقیقت کا اعتراف کر لیتا ہے جس کا اعتراف کرنے کے لئے وہ بے فکری کے لمحات میں تیار نہ ہوتا تھا۔

اس کی ایک مثال سمندر کا سفر ہے۔ سمندر میں سکون ہو اور کشتی منزل کی طرف رواں ہو تو اس کے مسافروں کے لئے یہ بڑا خوش گوار لمحہ ہوتا ہے۔ اس وقت ان کے اندر ایک جھوٹا اعتماد پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ سمجھ لیتے ہیں کہ ان کا معاملہ درست ہے، اب اس کو کوئی بگاڑنے والا نہیں۔

اس کے بعد سمندری ہوائیں اٹھتی ہیں۔ پہاڑ جیسی موجیں مسافروں کو چاروں طرف سے گھیر لیتی ہیں۔ ان کے درمیان بڑے سے بڑا جہاز بھی معمولی تنکے کی طرح ہچکولے کھانے لگتا ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب ہلاکت کے سوا دوسرا کوئی انجام نہیں۔ اس وقت خدا کے منکر خدا کا اقرار کر لیتے ہیں۔ دیوتاؤں کو پوجنے والے خدائے واحد کو پکارنا شروع کرتے ہیں۔ اپنی قوت اور اپنی تدبیر پر بھروسہ کرنے والے ہر دوسری چیز کو چھوڑ کر صرف خدا کو یاد کرنے لگتے ہیں۔ یہ ایک تجرباتی ثبوت ہے کہ توحید ایک فطری عقیدہ ہے۔ توحید کے سوا دوسرے تمام عقیدے بالکل بے بنیاد ہیں۔

یہ تجربہ بتاتا ہے کہ خدا کو نہ ماننے کے لئے آدمی خواہ کتنا ہی فلسفہ پیش کرے، حقیقتاً اس قسم کی تمام باتیں بے فکری کی نظریہ سازی ہیں۔ انسان اگر جانے کہ دنیا کے مواقع محض وقتی طور پر اس کو امتحان کے لئے دئے گئے ہیں تو وہ فوراً سنجیدہ ہو جائے۔ اس کے ذہن سے تمام مصنوعی دیواریں گر جائیں اور ایک خدا کو ماننے کے سوا اس کے لئے کوئی چارہ نہ رہے۔

وہ وقت آنے والا ہے جب انسان خدا کے جلال کو دیکھ کر کانپ اٹھے اور تمام خدائی باتوں کا اقرار کرنے پر مجبور ہو جائے۔ مگر عقل مند وہ ہے جو موجودہ زندگی کے تجربات میں آنے والی زندگی کی حقیقتوں کو دیکھ لے اور آج ہی اس بات کو مان لے جس کو وہ کل ماننے پر مجبور ہوگا۔ مگر کل کا ماننا اس کے کچھ کام نہ آئے گا۔

إِنَّمَا مَثَلُ الْحَيَوٰةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ أَنزَلْنَٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهِۦ نَبَاتُ الْأَرْضِ مِمَّا يَأْكُلُ النَّاسُ وَالْأَنْعَٰمُ حَتَّىٰٓ إِذَآ أَخَذَتِ الْأَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ أَهْلُهَآ أَنَّهُمْ قَٰدِرُونَ عَلَيْهَآ أَتَىٰهَآ أَمْرُنَا لَيْلًا أَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنَٰهَا حَصِيدًا كَأَن لَّمْ تَغْنَ بِالْأَمْسِ كَذَٰلِكَ نُفَصِّلُ الْءَايَٰتِ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ۝

دنیا کی زندگی کی مثال ایسی ہے جیسے پانی کہ ہم نے اس کو آسمان سے برسایا تو زمین کا سبزہ خوب نکلا جس کو آدمی کھاتے ہیں اور جس کو جانور کھاتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب زمین پوری رونق پر آگئی اور سنور اٹھی اور زمین والوں نے گمان کر لیا کہ اب یہ ہمارے قابو میں ہے تو اچانک اس پر ہمارا حکم رات کو یا دن کو آگیا، پھر ہم نے اس کو کاٹ کر ڈھیر کر دیا گویا کل یہاں کچھ تھا ہی نہیں۔ اس طرح ہم نشانیاں کھول کر بیان کرتے ہیں ان لوگوں کے لئے جو غور کرتے ہیں ۲۴

دنیا کی زندگی امتحان کے لئے ہے۔ اس لئے انسان کو یہاں مکمل آزادی اور ہر قسم کے کھلے مواقع دئے گئے ہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان آزاد ہے کہ جو چاہے کرے اور جس قسم کا مستقبل چاہے اپنے لئے بنائے۔ مگر انھیں حالات کے درمیان ایسے واقعات بھی رکھ دئے گئے ہیں جو سوچنے والوں کے لئے نصیحت کا کام کرتے ہیں۔ جو اس حقیقت کی نشان دہی کر رہے ہیں کہ یہ سب کچھ محض وقتی ہے اور بہت جلد اس سے چھن جانے والا ہے۔

انھیں میں سے ایک زمین کی سرسبزی کا واقعہ ہے۔ جب بارش ہوتی ہے تو زمین ہر قسم کی نباتات سے لہلہا اٹھتی ہے۔ آدمی ان کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ وہ سمجھنے لگتا ہے کہ معاملہ پوری طرح اس کے قابو میں ہے اور بہت جلد وہ تیار فصل کا مالک بننے والا ہے۔ عین اس وقت اچانک کوئی آفت آجاتی ہے۔ مثلاً بگولا آگیا۔ اولے پڑ گئے۔ ٹڈی دل پہنچ گیا اور ایک لمحہ میں ساری فصل کا خاتمہ کر دیا۔

یہی حال انسانی زندگی کا ہے۔ آدمی ایک عمدہ جسم لے کر پیدا ہوتا ہے۔ دنیا کے اسباب اس کا ساتھ دیتے ہیں اور وہ اپنے لئے ایک کامیاب اور شان دار زندگی بنا لیتا ہے۔ اب اس کے اندر ایک اعتماد پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کا معاملہ اس کے اپنے اختیار میں ہے۔ اس کے بعد کسی دن یا کسی رات میں اچانک اس کی موت آجاتی ہے۔ اپنے آپ کو با اختیار سمجھنے والا یکایک اپنے کو اس حال میں پاتا ہے کہ مجبوری اور بے اختیاری کے سوا اس کے پاس اور کوئی سرمایہ نہیں ـــــــ آدمی اگر اس حقیقت کو سامنے رکھے تو وہ دنیا میں کبھی سرکش نہ بنے اور وہ کبھی کسی کے ساتھ ظلم اور بے انصافی کا طریقہ اختیار نہ کرے۔

وَاللّٰهُ یَدْعُوْٓا اِلٰی دَارِ السَّلٰمِ ؕ وَیَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۲۵﴾ لِلَّذِیْنَ
اَحْسَنُوا الْحُسْنٰی وَ زِیَادَةٌ ؕ وَلَا یَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ
الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۶﴾ وَالَّذِیْنَ كَسَبُوا السَّیِّاٰتِ جَزَآءُ سَیِّئَةٍ بِمِثْلِهَا ۙ وَتَرْهَقُهُمْ
ذِلَّةٌ ؕ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ كَاَنَّمَآ اُغْشِیَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّیْلِ
مُظْلِمًا ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷﴾

ر اللہ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے اور وہ جس کو چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھا دیتا ہے۔ جن لوگوں نے بھلائی
ان کے لئے بھلائی ہے اور اس پر مزید بھی۔ اور ان کے چہروں پر نہ سیاہی چھائے گی اور نہ ذلت۔ یہی جنت والے
ں ہیں۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور جنھوں نے برائیاں کمائیں تو برائی کا بدلہ اس کے برابر ہے۔ اور ان
رسوائی چھائی ہوئی ہوگی۔ کوئی ان کو اللہ سے بچانے والا نہ ہوگا۔ گویا کہ ان کے چہرے اندھیری رات کے ٹکڑوں سے
ھانک دئے گئے ہیں۔ یہی لوگ دوزخ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ۲۵ — ۲۷

دنیا کے ظاہری حالات سے آدمی دھوکا کھا جاتا ہے۔ وہ وقتی چیز کو مستقل چیز سمجھ لیتا ہے۔ اس کا خیال
ہو جاتا ہے کہ خوشیوں اور راحتوں کی زندگی جو وہ چاہتا ہے وہ اس کو اسی موجودہ دنیا میں حاصل ہو سکتی ہے۔ مگر
سانی آرزوؤں کی دنیا دراصل آخرت میں بننے والی ہے اور اس کو وہی شخص پائے گا جو خدا کے بتائے ہوئے طریقہ
ے مطابق اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

دنیا میں آدمی بالفرض سب کچھ حاصل کرے تب بھی وہ اس پر قادر نہیں کہ اپنی زندگی کو دکھ اور غم سے پاک
ر سکے۔ یہاں ہر خوشی کے ساتھ کوئی اندیشہ لگا ہوا ہے۔ یہاں کی ہر کامیابی بہت جلد کسی دکھ کی نذر ہو جاتی ہے۔ دکھ اور
رنج سے خالی زندگی ایک ایسی انوکھی زندگی ہے جو صرف جنت کے ماحول میں آدمی کو حاصل ہوگی۔ جو لوگ اس راز کو
پالیں وہی وہ لوگ ہیں جو جنت کا راستہ اختیار کریں گے اور بالآخر خدا کی ابدی جنتوں میں پہنچیں گے۔

راحت اور خوشی کی زندگی جو انسان کو بے حد مرغوب ہے وہ خدا کے وفادار بندوں کو کامل طور پر جنت میں
ملے گی۔ مگر راحت اور خوشی کا ایک اور درجہ ہے جو معروف راحتوں اور خوشیوں سے بہت بلند ہے۔ یہ مالک کائنات
کا دیدار ہے جو اہل جنت کو خصوصی طور پر حاصل ہوگا۔ جو خدا راحتوں اور لذتوں کا خالق ہے وہ یقینی طور پر تمام
راحتوں اور لذتوں کا سب سے بڑا خزانہ ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ جب جنت والے جنت میں اور دوزخ والے
دوزخ میں داخل ہو چکے ہوں گے تو ایک پکارنے والا پکارے گا۔ اے جنت والو، تمھارے لئے خدا کا ایک وعدہ
باقی ہے جس کو اب وہ پورا کرنا چاہتا ہے۔ جنت والے یہ سن کر کہیں گے کہ وہ کیا ہے۔ کیا ہمارے پلڑے بھاری

نہیں کر دئے گئے۔ کیا ہمارے چہروں کو روشن نہیں کر دیا گیا۔ کیا خدا نے ہمیں جنت میں نہیں داخل کر دیا اور ہم کو آگ سے نہیں بچا لیا۔ اس کے بعد ان کے اوپر سے حجاب اٹھا لیا جائے گا اور وہ اپنے رب کو دیکھنے لگیں گے۔ پس خدا کی قسم کوئی نعمت جو خدا نے انھیں دی ہے وہ ان کے لئے خدا کو دیکھنے سے زیادہ محبوب نہ ہوگی اور نہ اس سے زیادہ ان کی آنکھوں کو ٹھنڈی کرنے والی ہوگی (تفسیر ابن کثیر)

آدمی کے لئے اس سے زیادہ سخت حالت اور کوئی نہیں کہ وہ ایک ایسی بے بسی سے دوچار ہو جو ابدی ہے۔ وہ اپنے آپ کو ایک ایسی ناکامی میں پڑا ہوا پائے جو دوبارہ کامیابی میں تبدیل نہیں ہو سکتی۔ جو لوگ آخرت میں جہنم کے باشندے قرار دئے جائیں گے وہ اسی حالت سے دوچار ہوں گے۔ ان کے چہرے شدید مایوسی کی وجہ سے ایسے کالے ہو جائیں گے گویا کہ وہ تہ بہ تہ اندھیروں میں ڈوب گئے ہیں۔ آدمی کو اگرچہ اس کی برائی کا بدلہ اتنا ہی دیا جائے گا جتنا اس نے برائی کی ہے۔ مگر ابدی محرومی کا احساس اس کے لئے اتنا سخت ہوگا کہ اس کا چہرہ تک اس کی وجہ سے سیاہ پڑ جائے گا۔

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا مَكَانَكُمْ أَنتُمْ وَشُرَكَاؤُكُمْ ۚ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ ۖ وَقَالَ شُرَكَاؤُهُم مَّا كُنتُمْ إِيَّانَا تَعْبُدُونَ ﴿٢٨﴾ فَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ إِن كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغَافِلِينَ ﴿٢٩﴾ هُنَالِكَ تَبْلُو كُلُّ نَفْسٍ مَّا أَسْلَفَتْ ۚ وَرُدُّوا إِلَى اللَّهِ مَوْلَاهُمُ الْحَقِّ ۖ وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٣٠﴾ ع۸

اور جس دن ہم ان سب کو جمع کریں گے، پھر ہم شرک کرنے والوں سے کہیں گے کہ ٹھہرو تم بھی اور تمھارے بنائے ہوئے شریک بھی۔ پھر ہم ان کے درمیان تفریق کر دیں گے اور ان کے شریک کہیں گے کہ تم ہماری عبادت تو نہیں کرتے تھے۔ اللہ ہمارے درمیان گواہی کے لئے کافی ہے۔ ہم تمھاری عبادت سے بالکل بے خبر تھے۔ اس وقت ہر شخص اپنے اس عمل سے دوچار ہوگا جو اس نے کیا تھا اور لوگ اللہ اپنے مالک حقیقی کی طرف لوٹائے جائیں گے اور جو جھوٹ انھوں نے گھڑے تھے وہ سب ان سے جاتے رہیں گے ۲۸ — ۳۰

شرک کا پورا کاروبار جھوٹی امیدوں پر قائم ہوتا ہے، وہ واقعات جو خدا کے کئے سے ہو رہے ہیں ان کو آدمی جھوٹے معبودوں کی طرف منسوب کر دیتا ہے اور اس طرح خود ساختہ تصور کے تحت ان کو اپنی عقیدت و پرستش کا مرکز بنا لیتا ہے، اپنے ان معبودوں پر اس کا اعتماد اتنا بڑھتا ہے کہ وہ سمجھ لیتا ہے کہ آخرت میں بھی وہ ضرور خدا کے مقابلہ میں اس کے مددگار بن جائیں گے۔ اور اس کو خدا کی پکڑ سے بچا لیں گے۔

یہ سراسر جھوٹی امیدیں ہیں۔ مگر دنیا کی زندگی میں ان کا جھوٹ ہونا ظاہر نہیں ہوتا کیونکہ یہاں امتحان کی

جہ سے ہر چیز پر غیب کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ یہاں آدمی کو موقع ہے کہ وہ واقعات کو اپنے فرضی معبودوں کی طرف سوب کرے اور اس طرح ان کی معبودیت پر مطمئن ہو جائے۔ مگر آخرت میں ساری حقیقتیں کھل جائیں گی۔ وہاں معلوم وگا کہ اس کائنات میں ایک خدا کے سوا کسی کو کوئی زور حاصل نہ تھا۔

موجودہ دنیا میں آدمی اس خوش فہمی میں جی رہا ہے کہ وہ اپنے بڑوں یا اپنے معبودوں کی مدد سے آخرت کے مرحلے میں کامیاب ہو جائے گا۔ مگر آخرت میں اچانک اس پر کھلے گا کہ اس کا اعتماد سراسر جھوٹا تھا۔ یہاں کسی کو صرف وہی ملے گا جو اس نے خود کیا تھا۔ فرضی سہارے وہاں اس طرح غائب ہو جائیں گے جیسے کہ ان کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ۝ كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُوْٓا اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ

کہو کہ کون تم کو آسمان اور زمین سے روزی دیتا ہے۔ یا کون ہے جو کان پر اور آنکھوں پر اختیار رکھتا ہے۔ اور کون بے جان میں سے جاندار کو اور جاندار میں سے بے جان کو نکالتا ہے۔ اور کون معاملات کا انتظام کر رہا ہے۔ وہ کہیں گے کہ اللہ۔ کہو کہ پھر کیا تم ڈرتے نہیں۔ پس وہی اللہ تمہارا پروردگار حقیقی ہے۔ توحق کے بعد بھٹکنے کے سوا اور کیا ہے، تم کدھر پھیرے جاتے ہو۔ اسی طرح تیرے رب کی بات سرکشی کرنے والوں کے حق میں پوری ہوچکی ہے کہ وہ ایمان نہ لائیں گے ۳۳ — ۳۱

انسان کو رزق کی ضرورت ہے۔ یہ رزق انسان کو کیسے ملتا ہے۔ کائنات کے مجموعی عمل سے۔ ساری کائنات حد درجہ ہم آہنگی کے ساتھ ایک خاص رخ پر عمل کرتی ہے۔ تب یہ ممکن ہوتا ہے کہ انسان کے لئے وہ رزق فراہم ہو جس کے بغیر اس کا وجود اس سرزمین پر ممکن نہیں۔ خدائی کے مفروضہ شرکاء یا دیوی دیوتا خود مشرکین کے عقیدہ کے مطابق، انسان کے لئے رزق فراہم نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ہر مفروضہ شریک کسی جزء کا معبود ہے، اور جزء کا معبود کبھی ایسے واقعہ کو ظہور میں نہیں لا سکتا جو کل اجزاء کی موافقت سے ظہور میں آتا ہو۔

اسی طرح مثلاً انسان کے اندر کان اور آنکھ جیسی حیرت انگیز صلاحیتیں ہیں۔ وہ بھی کسی دیوتا کی دی ہوئی

نہیں ہوسکتیں۔ دیوی دیوتا یا تو خود ان صلاحیتوں سے محروم ہیں یا اگر کسی مفروضہ معبود کے اندر یہ صلاحیتیں ہوں تو وہ ان کا خالق نہیں۔ حتیٰ کہ خود اس سے یہ صلاحیتیں ویسے ہی چھن جاتی ہیں جیسے عام انسانوں سے چھن جاتی ہیں۔ اسی طرح بے جان چیزوں میں جان ڈالنا اور جان دار کو بے جان کر دینا بھی مفروضہ معبودوں کے لئے ممکن نہیں۔ نہ اس کا کوئی ثبوت ہے اور نہ کوئی پوجنے والا ان کے بارے میں اس قسم کا عقیدہ رکھتا ہے۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ یہ چیزیں ان معبودوں سے انسان کو ملیں۔

کیسی عجیب بات ہے کہ انسان ایک بڑے خدا کو مانتا ہے۔ اس کے باوجود وہ خدا کی طرف ایسی باتیں منسوب کرتا ہے جو اس کی تمام اعلیٰ صفات کی نفی کر دیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو خدا کا ڈر نہیں۔ جھوٹے خیالات کے ذریعہ اس نے اپنے آپ کو یہ تسلی دے لی ہے کہ خدا اس سے بازپرس کرنے والا نہیں۔ اور اگر بازپرس کی نوبت آئی تو اس کی مدد پر ایسی ہستیاں ہیں جو خدا کے یہاں سفارش کرکے اس کو بچا لیں ——

ڈر آدمی کو سنجیدہ بناتا ہے۔ جب کسی کے دل سے ڈر نکل جائے تو اس کو غیر منصفانہ رویہ اختیار کرنے سے کوئی چیز روک نہیں سکتی۔ ایسا آدمی سرکش ہو جاتا ہے۔ اور سرکش آدمی کبھی سچائی کا اعتراف نہیں کرتا۔

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ۭ قُلِ اللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ۝ قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ ۭ قُلِ اللّٰهُ يَهْدِيْ لِلْحَقِّ ۭ اَفَمَنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا يَهِدِّيْٓ اِلَّآ اَنْ يُّهْدٰى ۚ فَمَا لَكُمْ ۣ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ۝۳۵ وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا ۭ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَـيْـــًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ۝۳۶

کہو، کیا تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں میں کوئی ہے جو پہلی بار پیدا کرتا ہو پھر وہ دوبارہ بھی پیدا کرے۔ کہو، اللہ ہی پہلی بار بھی پیدا کرتا ہے پھر وہی دوبارہ بھی پیدا کرے گا۔ پھر تم کہاں بھٹکے جاتے ہو۔ کہو، کیا تمہارے شرکاء میں کوئی ہے جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہو، کہہ دو کہ اللہ ہی حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ پھر جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے وہ پیروی کئے جانے کا مستحق ہے یا وہ جس کو خود ہی راستہ نہ ملتا ہو بلکہ اسے راستہ بتایا جائے۔ تم کو کیا ہوگیا ہے، تم کیسا فیصلہ کرتے ہو۔ ان میں سے اکثر صرف گمان کی پیروی کر رہے ہیں۔ اور گمان حق بات میں کچھ بھی کام نہیں دیتا۔ اللہ کو خوب معلوم ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں ۳۴-۳۶

اللہ کے سوا جن کو خدائی کا مقام دیا جاتا ہے، خواہ وہ انسان ہوں یا غیر انسان، کوئی بھی یہ طاقت نہیں رکھتا کہ وہ کسی غیر موجود کو موجود کر دے۔ یہ صرف اللہ ہے جس کے لئے تخلیق کا عمل ثابت ہے۔ اور جب

ن کا عمل ایک بار اللہ کے لئے ثابت ہے تو اسی سے یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ وہ اس کا اعادہ کر سکتا ہے
کرے گا۔ پھر جب وجود اول اور وجود ثانی دونوں کا اختیار صرف ایک اللہ کو ہے تو دوسرے شریکوں کی
ف توجہ لگانا بالکل عبث ہے۔ ان سے آدمی نہ اپنی پہلی زندگی میں کچھ پانے والا ہے اور نہ دوسری زندگی میں۔
یہی معاملہ رہنمائی کا ہے۔ "اللہ رہنمائی کرتا ہے" یہ چیز پیغمبروں کی ہدایت سے ثابت ہے —
بروں نے جس ہدایت کو خدائی ہدایت کہہ کر انسان کے سامنے پیش کیا وہ مسلم طور پر ایک ہدایت ہے۔ اس
برعکس شریکوں کا حال یہ ہے کہ وہ یا تو سرے سے اس قابل نہیں کہ وہ انسان کو حق اور ناحق کے بارے میں
لی علم دیں (مثلاً بت) یا وہ اپنی کمیوں اور محدودیتوں کی وجہ سے خود رہنمائی کے محتاج ہیں، کجا کہ وہ
سروں کو کوئی واقعی رہنمائی فراہم کریں (مثلاً انسانی معبود) جب صورت حال یہ ہے تو انسان کو صرف ایک
ا کی طرف رجوع کرنا چاہئے نہ کہ فرضی شریکوں کی طرف۔
شرک کا کاروبار کسی واقعی علم پر قائم نہیں ہے بلکہ وہ مفروضات اور قیاسات پر قائم ہے۔ کچھ
تیوں کے بارے میں بے بنیاد طور پر یہ رائے قائم کر لی گئی ہے کہ وہ خدائی صفات کے حامل ہیں۔ حالاں کہ
ی بڑی رائے کسی حقیقی علم کی بنیاد پر قائم کی جا سکتی ہے نہ کہ محض اٹکل اور قیاس کی بنیاد پر۔

مَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۷﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۸﴾ بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۹﴾

ر یہ قرآن ایسا نہیں کہ اللہ کے سوا کوئی اس کو بنا لے۔ بلکہ یہ تصدیق ہے ان پیشین گوئیوں کی جو اس کے
لے سے موجود ہیں۔ اور کتاب کی تفصیل ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ خداوند عالم کی طرف سے ہے۔
یا لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص نے اس کو گھڑ لیا ہے۔ کہو کہ تم اس کی مانند کوئی سورہ لے آؤ۔ اور اللہ کے سوا
جس کو بلا سکو بلا لو، اگر تم سچے ہو۔ بلکہ یہ لوگ اس چیز کو جھٹلا رہے ہیں جو ان کے علم کے احاطے میں نہیں آئی۔
ر جس کی حقیقت ابھی ان پر نہیں کھلی۔ اسی طرح ان لوگوں نے بھی جھٹلایا جو ان سے پہلے گزرے ہیں، پس
یکھو کہ ظالموں کا انجام کیا ہوا ۳۹ — ۳۰

قرآن اپنی دلیل آپ ہے۔ قرآن کا مافوق انداز کلام انتہائی طور پر ناقابل تقلید ہے۔ اور یہی واقعہ

یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ قرآن ایک غیر انسانی کلام ہے۔ اگر وہ کسی انسان کا کلام ہوتا تو یقیناً دوسرے انسانوں کے لئے بھی یہ ممکن ہونا چاہئے تھا کہ وہ اپنی کوشش سے ویسا ہی ایک کلام بنا لیں۔

قرآن کے کلام الٰہی ہونے کا دوسرا ثبوت یہ ہے کہ وہ ان پیشین گوئیوں کی تصدیق ہے جو اس کے بارے میں پہلے سے آسمانی صحیفوں میں موجود ہیں۔ آسمانی تعلیمات کی حامل قومیں پہلے سے ایک آخری ہدایت نامہ کی منتظر تھیں۔ قرآن اسی انتظار کا جواب بن کر آیا ہے، پھر اس میں شک کرنے کی کیا ضرورت۔ مزید یہ کہ وہ "کتاب" کی تفصیل ہے۔ یعنی وہ الٰہی تعلیمات جو تمام آسمانی کتابوں کا خلاصہ ہیں انھیں کو وہ صحیح اور بے آمیز روپ میں پیش کرتا ہے۔ یہ ایک واضح قرینہ ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن اسی خدا کی طرف سے آیا ہے جس کی طرف سے پچھلی آسمانی کتابیں آئی تھیں۔

جب کوئی شخص کہتا ہے کہ قرآن ایک انسانی تصنیف ہے تو وہ اپنے دعوے کو ایک ایسے میدان میں لاتا ہے جہاں اس کو جانچنا آسان ہو۔ کیونکہ وہ اپنی یا دوسروں کی انسانی صلاحیتوں کو کام میں لا کر قرآن جیسی ایک کتاب یا اس کے جیسی ایک سورہ تیار کر سکتا ہے۔ اور اس طرح عملی طور پر اس دعوے کو رد کر سکتا ہے کہ قرآن خدائی ذہن سے نکلی ہوئی کتاب ہے۔ مگر قرآنی چیلنج کے باوجود کسی کا ایسا نہ کر سکنا آخری طور پر ثابت کر رہا ہے کہ قرآن کو انسانی کتاب کہنے والوں کا دعویٰ درست نہیں۔

قرآن کی صداقت کے یہ دلائل ایسے نہیں ہیں کہ آدمی ان کو سمجھ نہ سکے۔ اصل یہ ہے کہ قرآن کو جھٹلانے کے نتائج سے وہ بے خوف ہیں۔ ان کو یہ ڈر نہیں کہ قرآن کا انکار کر کے وہ کسی عذاب کی پکڑ میں آجائیں گے۔ ان کی مخالفانہ روش کی وجہ وہ غیر سنجیدگی ہے جو ان کی بے خوفی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے نہ کہ کسی قسم کا عقلی اور استدلالی اطمینان۔

وَمِنْهُم مَّن يُؤْمِنُ بِهِ وَمِنْهُم مَّن لَّا يُؤْمِنُ بِهِ ۚ وَرَبُّكَ أَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِينَ ﴿٤٠﴾ وَإِن كَذَّبُوكَ فَقُل لِّي عَمَلِي وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ ۖ أَنتُم بَرِيئُونَ مِمَّا أَعْمَلُ وَأَنَا بَرِيءٌ مِّمَّا تَعْمَلُونَ ﴿٤١﴾ وَمِنْهُم مَّن يَسْتَمِعُونَ إِلَيْكَ ۚ أَفَأَنتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوا لَا يَعْقِلُونَ ﴿٤٢﴾ وَمِنْهُم مَّن يَنظُرُ إِلَيْكَ ۚ أَفَأَنتَ تَهْدِي الْعُمْيَ وَلَوْ كَانُوا لَا يُبْصِرُونَ ﴿٤٣﴾ إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَلَٰكِنَّ النَّاسَ أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿٤٤﴾

اور ان میں سے وہ بھی ہیں جو قرآن پر ایمان لے آئیں گے اور وہ بھی ہیں جو اس پر ایمان نہیں لائیں گے۔ اور تیرا رب مفسدوں کو خوب جانتا ہے۔ اور اگر وہ تم کو جھٹلاتے ہیں تو کہہ دو کہ میرا عمل میرے لئے ہے اور تمہارا عمل تمہارے لئے۔ تم اس سے بری ہو جو میں کرتا ہوں اور میں اس سے بری ہوں جو تم کر رہے ہو۔

اور ان میں بعض ایسے بھی ہیں جو تمھاری طرف کان لگاتے ہیں تو کیا تم بہروں کو سناؤ گے جب کہ وہ سمجھ سے کام نہ لے رہے ہوں۔ اور ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو تمھاری طرف دیکھتے ہیں تو کیا تم اندھوں کو راستہ دکھاؤ گے اگر چہ وہ دیکھ نہ رہے ہوں۔ اللہ لوگوں پر کچھ بھی ظلم نہیں کرتا مگر لوگ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں ۴۴۔۴۰

ایمان نہ لانے والے خدا کی نظر میں مفسد ہیں۔ کیونکہ اپنی فطرت کو بگاڑ کر ہی کسی کے لئے یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ حق کو قبول کرنے سے باز رہے۔ ایسا آدمی اپنے ضمیر کی آواز کو دبا تا ہے، وہ اپنے سوچنے کی صلاحیت کو استعمال نہیں کرتا، وہ کھلے کھلے دلائل کو جھوٹے الفاظ بول کر نظر انداز کر دیتا ہے، وہ سن کر نہیں سنتا اور سمجھنے کے باوجود سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا، وہ حق کے مقابلہ میں اپنے تعصبات اور اپنے مفادات کو ترجیح دیتا ہے۔

بحث و مناظرہ کرنے والے لوگ آخر وقت تک اپنی بحث جاری رکھتے ہیں۔" میرا معاملہ میرے ساتھ ہے اور تمھارا معاملہ تمھارے ساتھ"، اس قسم کا جملہ کہنا ان کو اپنی شکست نظر آتا ہے، مگر داعی فتح و شکست کی نفسیات سے بلند ہو کر کام کرتا ہے، اس لئے جب وہ دیکھتا ہے کہ مخاطب ضد اور ہٹ دھرمی پر اتر آیا ہے اور مزید بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تو وہ یہ کہہ کر الگ ہو جاتا ہے کہ اصل فیصلہ اللہ کے یہاں ہونا ہے۔ خدا کی میزان میں جو شخص جیسا نکلے گا ویسا ہی اس کا انجام ہوگا۔

حق کو نہ ماننے والوں میں ایک طبقہ وہ ہے جو شروع سے اپنا منکر ہونا ظاہر کر دیتا ہے۔ مگر زیادہ ہوشیار قسم کے لوگ یہ کرتے ہیں کہ بظاہر وہ باتوں کو اس طرح سنتے ہیں گویا کہ وہ سچ مچ سمجھنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ان کے دل میں یہ ہوتا ہے کہ اس کو سمجھنا نہیں ہے۔ وہ داعی کی صداقت کی نشانیوں کو اس طرح دیکھتے ہیں جیسے وہ کھلے دل سے اس کا مشاہدہ کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ان کا ذہن پہلے سے یہ طے کئے ہوئے ہوتا ہے کہ اس کو دیکھنا اور ماننا نہیں ہے۔ ایسے لوگوں کی ظاہری سادگی سے داعی اس خوش گمانی میں پڑ جاتا ہے کہ وہ قبولیت حق کے قریب ہیں۔ مگر خدا کی نظر میں وہ ایسے لوگ ہیں جو کان رکھتے ہوئے بہرے اور آنکھ رکھتے ہوئے اندھے بن جائیں۔ ایسے لوگوں کو کبھی خدا کی طرف سے قبول حق کی توفیق نہیں ملتی۔

خدا نے انسان کو بہترین صلاحیتیں دی ہیں۔ اگر وہ ان صلاحیتوں کو استعمال کرے تو وہ کبھی گمراہ نہ ہو۔ مگر انسان اپنے کو آزاد پا کر غلط فہمی میں پڑ جاتا ہے۔ وہ بے جا سرکشی کرنے لگتا ہے۔ ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ اس نے خدا کی اسکیم کو نہیں سمجھا، جو چیز اس کو آزمائش کے طور پر دی گئی تھی اس کو اس نے اپنا حق سمجھ لیا۔

مراسلت

باسمہ سبحانہٗ

برادر مکرم، السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

ادھر کچھ عرصہ سے میں جماعت اسلامی کی مخالفت میں لکھی جانے والی کتابوں کا مطالعہ کر رہا ہوں اور ابتک اس سلسلہ کی تقریباً تمام ہی کتابیں مطالعہ میں آچکی ہیں، مثلاً مولانا زکریا صاحب کی "فتنۂ مودودیت" مولانا منظور نعمانی صاحب کی "سرگذشت" مولینا علی میاں کی "دین کی تفہیم و تشریح" وغیرہ۔ لیکن ان کتابوں میں مجھے کوئی خاص بات قابلِ ذکر نظر نہیں آئی، البتہ جناب وحید الدین خانصاحب کی "تعبیر کی غلطی" میں خاص طور سے دو چیزیں قابلِ توجہ نظر آئیں: (۱) جماعت اسلامی کے نزدیک نظامِ حق کے غلبے کے لئے کوشش اور جد و جہد اُمتِ مسلمہ کا نصب العین قرار پاتا ہے حالانکہ قرآن مجید میں کوئی نص قطعی ایسی نہیں جس سے اس کا وجوب ثابت ہوتا ہو۔ (۲) اس مقصد کی روشنی میں بیشتر انبیاء کی ناکامی ثابت ہوتی ہے کیونکہ ان میں سے بیشتر دین کی بنیادی دعوت توحیدٗ آخرت کی طرف بلاتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوگئے اور نظامِ حق قائم نہیں کرسکے۔

اصل میں ان کتابوں کے مطالعہ کی ضرورت خاص طور سے اس لئے پیش آئی کہ جماعت اسلامی سے اتفاق و ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے ایک زمانہ گذر گیا۔ اب کچھ عرصہ سے باربار یہ خیال آرہا ہے کہ کیوں نہ آگے بڑھکر رکنیت کا فارم پُر کردیا جائے لیکن پھر سوچا کہ کیوں نہ اس اقدام سے پہلے آپ سے بھی مشورہ کرلیا جائے۔

اس سلسلہ میں آپ کی کیا رائے ہے؟ یہ خط تحریر کرنے کا مقصد یہی ہے کہ آپ کی رہنمائی حاصل کروں۔ امید ہے تشفی بخش جواب عنایت فرمائیں گے۔

والسلام۔ شفیق احمد اصلاحی

شیش محل۔ آزاد مارکیٹ۔ دہلی

جوابی خط

محمد امانت اللہ اصلاحی
مسلم کالج ایجیبو اوڈے
اوگن اسٹیٹ (نائجیریا)

۲۳ر صفر ۱۴۰۲ ہجری
۱۹ر دسمبر ۱۹۸۱ء

باسمہٖ و بحمدہٖ

برادر مکرم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آپ کا خط ملا۔ جواب فوراً دینا چاہتا تھا لیکن نہ دے سکا۔ پھر لفافہ لے کر گھر سے نکلا کہ راستہ میں کہیں لکھوں گا لیکن سفر نہ کرسکا اور واپس آکر آپ کو یہ چند سطریں لکھ رہا ہوں۔

قیادت کی تبدیلی کی اطلاع مل چکی تھی۔ یہ بات مزید خوش آئند ہے کہ جو وفد مولانا کو آمادہ کرنے گیا اس میں خود موجودہ امیر بھی شامل تھے۔ اللہ تعالیٰ اس فیصلہ کو باعثِ خیر و برکت بنائے۔

میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ آپ نے رکنیت کا فارم بھر رکھا ہے اور اب رکن بن بھی چکے ہوں گے۔ اچھا ہے، خوب سوچ سمجھ کر یہ اقدام کیا جائے، لیکن یہ خوب رہا کہ بڑے بڑے روحانی بزرگوں کے یہاں تو آپ کو کچھ نہ ملا، کھٹک پیدا ہوئی تو "تعبیر کی غلطی" سے! کیا مثل ہے "آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا"! اگر شاعروں اور مجذوبوں ہی سے دین کو سمجھنا ہے تو اقبال کو پڑھئے، شاید کچھ خون میں گرمی آئے اور حوصلہ میں بلندی اور فکر و نظر میں وسعت! یا کسی محاذ پر جا کر چند روز طبی امداد رضاکارانہ طور پر کر آئیے، شاید دل کی کدورت کچھ دور ہو! اچھا ہے معلومات کے لئے اس طرح کی چیزیں گاہے گاہے دیکھ لیا کریں لیکن اگر شرح صدر چاہتے ہیں، اطمینان قلب چاہتے ہیں اور بصیرت ـــــ تو اللہ سے لو لگائیے اور اس کی کتاب سے تعلق استوار کیجئے،

اپنی سرگرمیاں منضبط کیجئے۔ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کو جو نصیحت کی تھی، شاید یاد ہو:

اِنّ للہ عملاً باللیل لا یقبلہ بالنہار و عملا بالنہار لا یقبلہ باللیل۔

رہیں آپ کی مذکورہ دونوں الجھنیں تو حقیقت یہ ہے کہ اس سے بڑھ کر حیرت ناک بات کیا ہو گی کہ ایک طرف اسلام دشمن مفکرین کا اس پر اجماع ہے کہ جب تک یہ کتاب مسلمانوں کے پاس موجود ہے اس وقت تک ان کو زیر نہیں کیا جا سکتا اور کبھی زیر نگیں ہو بھی گئے شامتِ اعمال کی وجہ سے تو کچھ نہیں کیا جا سکتا کہ یہ دیو کب جاگ جائے اور تمام بیڑیاں چشم زدن میں توڑ کر پھینک دے۔ آج ہلکی سی بیداری نظر آرہی ہے تو ساری دنیا لرزاں و ترساں ہے دوسری طرف وہ لوگ ہیں جن کا دن رات کا مشغلہ ہی ہے قال اللہ و قال الرسول، اسی کی روٹی کھاتے ہیں اور اسی کے بل پر امت پر راج کرتے ہیں، ان کو کہیں ایک بھی واضح اور محکم آیت نہیں ملتی جس سے غلبہ و اقتدار کے لئے کوشش کا وجوب تو درکنار جواز ثابت ہو سکے الی اللہ المشتکیٰ۔

میری آنکھیں نم ہیں اور قلم زبردستی چلا رہا ہوں ضربت علیہم الذلۃ والمسکنۃ کی اس سے زیادہ واضح مثال کیا ہو گی۔ حقیقت یہ ہے کہ غلامانہ ذہنیت رکھنے والے مسلمان سے ایک آزاد غیر مسلم کی نگاہ زیادہ دور رس اور حقیقت شناس ہوتی ہے جسؑ کی آمد سے دو ہزار سال پہلے بلکہ اس سے بھی بہت پہلے اسؑ کے غلبہ و اقتدار کی خبر گرم تھی اور بار بار دوہرائی جاتی رہی اور تحریفات کے بعد آج بھی موجود ہے، جسؑ کی آمد کے قریب شدت سے انتظار ہی اس بات کا تھا کہ اسؑ کی آمد پر سخت کشت و خون ہو گا، اللہ تعالیٰ اپنے دشمنوں سے انتقام لے گا، مشرق سے مغرب تک اس کا اقتدار چھا جائیگا، قوموں کی قومیں اس کے آگے سرنگوں ہوں گی، جسؑ کی خبر ملنے سے پہلے ہی

ہرقل نے کہا تھا ظہر، ملک ھذہ الأمۃ (اس دور کا بادشاہ آگیا) جسؐ کا سفیر پہنچا تو اس نے کہا کہ اگر یہ باتیں صحیح ہیں تو اس سرزمین پر اس کا اقتدار ہوگا جو اس وقت میرے قدموں کے نیچے ہے، جسؐ نے دس سال کی مختصر مدت میں نو عظیم الشان جنگی مہموں کی قیادت کی، اسّی سے زیادہ جنگی مہموں پر اپنے ساتھیوں کو روانہ کیا، وفات سے چند روز پہلے بیرونِ ملک کے لئے لشکر تیار کیا اور اپنے دست مبارک سے جھنڈا باندھا اور جاتے جاتے اس کو روانہ کرنے کی وصیت کر گیا، جاتے جاتے نماز اور غلاموں کے بارے میں وصیت کی یعنی سچے غلام اور اچھے آقا بن کر رہنا۔ پھر اسؐ کے بعد اسؐ کے ساتھیوں نے اس مہم کو پورے زور وشور سے جاری رکھا، آج اسؐ کے امتیوں کے لئے ان سرگرمیوں کے لئے وجہ جواز ماننا مشکل ہورہا ہے۔ اگر آپ کو فرصت ہو تو انڈکس تیار کیجئے اور نہ ہو تو بنے بنائے انڈکسوں پر نظر ڈال لیئے۔ قرآن کے بھی اور حدیث کے بھی۔ کیا جہاد وقتال سے بھی وسیع اور مفصّل کوئی باب نظر آتا ہے؟ کیا اس سے افضل کوئی عمل ملتا ہے؟ پھر کیا خوں ریزی اور خوں آشامی بذاتِ خود مقصود تھی یا اس کا کوئی مقصد تھا؟ امر بالمعروف، نہی عن المنکر، کمزوروں کی حمایت عدل و انصاف کے قیام کی تعلیمات کیا غلاموں کے لئے تھیں؟ استخلاف فی الارض، تمکین فی الارض کے دعوے محض چلّوں اور وِردوں کے ذریعہ پورے ہوئے یا ہونے والے تھے؟ فقد اٰتینا اٰل ابراھیم الکتاب والحکم والنبوۃ واٰتینٰھم ملکا عظیما کا وعدہ کیا بغیر اس کا حق ادا کئے پورا ہوا اور کیا بغیر حق ادا کئے باقی رہ سکتا ہے؟ کیا یہود کے لئے غلامی اللہ تعالےٰ کے غضب اور پھٹکار کی علامت تھی اور

اس امت کے لئے فعل خاص کی علامت جس سے نکلنے کی کوشش کرنا بھی گناہ ہو!

افسوس! آج وہ قوم بھی جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے قیامت تک غلامی لکھ دی ہے: (و إذ تأذن ربک لیبعثن علیهم إلى یوم القیامة من یسومهم سوء العذاب) وہ اقتدار کے لئے کوشاں ہے اور مسلمانوں کی گردن پر مسلط ہے اور مسلمانوں کو کوئی نص صریح ہی نہیں مل رہی ہے کہ حرکت میں آئے۔ آج جن کے پاس کوئی آسمانی ہدایت نہیں وہ اس کی اہمیت کے بارے میں دو رائیں نہیں رکھتے لیکن مسلمان ایسی روشن کتاب رکھتے ہوئے، ایسا شاندار ماضی رکھتے ہوئے اس کی ضرورت سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اگر کتاب نہیں پڑھتے تو کم از کم چشم دید واقعات اور تاریخی حقائق سے سبق حاصل کرتے، لیکن جب کوئی قوم اللہ کی کتاب پر ظلم کرتی ہے تو اس کی عقل پر پردہ پڑ جاتا ہے اور بینائی سلب ہو جاتی ہے۔ اس امت کی تاریخ اٹھا کر دیکھئے ـــ جتنے بھی قابلِ ذکر اتار چڑھاؤ آتے ہیں سب کا رشتہ انقلابات سے بندھا ہوا ہے۔ دورِ حاضر میں درجنوں ملک روس اور چین ہڑپ کر گئے۔ وہاں اسلام کا کیا حال ہے جہاں دور سے بھی یہ طاقتیں اثر انداز ہو رہی ہیں۔ واللہ بصیر بما یعملون ٥

اب اگر جماعت اسلامی والے اس کا نعرہ بے تکے اور بھونڈے انداز سے بلند کر رہے ہوں یا بے موقع بلند کر رہے ہوں یا محض کھوکھلا نعرہ ہو تو ان کو سمجھانا چاہئے، اصلاح کی کوشش کرنی چاہئے، نہ کہ اس روشن حقیقت کا انکار کرنا چاہئے۔

اپنے یہاں ان حقائق کی موجودگی میں دوسرے انبیاء کے یہاں ہدایت تلاش کرنا ہی غلط ہے۔ اور جن کو اپنے یہاں اندھیرا نظر آرہا ہے ان کو وہاں بھی اندھیرا ہی نظر آئے گا ورنہ قرآن اور تاریخ کی شہادت اس کے بالکل برعکس ہے۔

محمد امانت اللہ

تبصرہ الرسالہ

اوپر جو "دو خط" نقل کئے گئے ہیں وہ ایک اسلامی جماعت سے وابستہ دو افراد کی باہمی خط و کتابت ہے جو پمفلٹ کی صورت میں دہلی سے شائع کی گئی ہے۔ "تعبیر کی غلطی" کے حوالے سے پہلے خط میں دو متعین سوال کئے گئے تھے۔ مگر دوسرے خط میں طویل کلام کے باوجود پڑھنے والے کو استہزاء اور گریز کے سوا اور کچھ نہیں ملتا۔ سوال کے مطابق مجیب کو مذکورہ مفہوم کے لئے قرآن کی متعین آیت پیش کرنا چاہئے تھا۔ مگر جوابی خط کا حال یہ ہے کہ اس کے آغاز میں تعبیر کی غلطی کے مصنف کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ اور پھر اس کے بعد کے صفحات میں اصل سوال سے گریز کرتے ہوئے ادھر ادھر کی باتیں جوش و خروش کے ساتھ درج ہیں۔ فاضل مجیب نے اپنے مخالفین پر حیرت ظاہر کی ہے کہ ان کو قرآن میں مذکورہ انقلابی مفہوم کے حق میں ایک بھی واضح اور محکم آیت نہیں ملی۔ مگر خود بھی وہ ایسی کسی واضح اور محکم آیت کی نشان دہی نہ فرما سکے۔ ان کے نزدیک یہ "روشن کتاب" کی سب سے زیادہ "روشن حقیقت" ہے مگر اس کے بارہ میں انھوں نے کوئی ایسا حوالہ پیش نہیں فرمایا جو متعلقہ سوال کا براہ راست جواب بنتا ہو۔ تعجب ہے کہ اس کے باوجود ان حضرات کو اپنے مسلک کی صحت پر اتنا یقین ہے کہ وہ ہمارا مذاق اڑائیں اور اس کو چھاپ کر شائع بھی کریں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسی حالت میں ان کے یقین و اطمینان کا سرچشمہ کیا ہے۔

سب کا مشن ایک

قرآن کی سورہ نمبر ۶ میں ارشاد ہوا ہے ——— اور یہ ہے ہماری حجت جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم کے اوپر عطا کی۔ ہم جس کو چاہتے ہیں بلند درجے عطا کرتے ہیں۔ بیشک تیرا رب حکیم اور علیم ہے اور ہم نے ابراہیم کو اسحاق اور یعقوب دیا، ہم نے ہر ایک کو ہدایت دی اور ہم نے نوح کو ہدایت دی اس سے پہلے۔ اور اس کی نسل میں داؤد اور سلیمان اور ایوب اور یوسف اور موسیٰ اور ہارون کو بھی اور ہم نیکوں کو اسی طرح بدلہ دیتے ہیں۔ اور زکریا اور یحییٰ اور عیسیٰ اور الیاس کو بھی۔ ہر ایک ان میں سے صالح تھا۔ اور اسماعیل اور الیسع اور یونس اور لوط کو بھی۔ اور ان سب کو ہم نے تمام دنیا والوں پر فضیلت دی۔ اور ان کے آبا میں اور ان کے بھائیوں میں بھی بہت سے لوگوں کو، اور ہم نے ان کو چن لیا اور ان کو سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کی۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے جس سے وہ اپنے بندوں میں جس کو چاہتا ہے رہنمائی کرتا ہے۔ اور اگر وہ شرک کرتے تو ان کا سارا عمل اکارت ہو جاتا۔ یہ ہیں وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب اور حکمت اور نبوت عطا کی۔ اب اگر یہ لوگ اس سے انکار کرتے ہیں تو ہم نے کچھ اور لوگوں کو یہ نعمت دے دی جو اس کے منکر نہیں ہیں۔ (اے محمد) یہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت دی تو تم انھیں کی ہدایت کی پیروی کرو۔ کہہ دو کہ میں اس کام پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا، یہ تو ایک نصیحت ہے تمام دنیا والوں کے لئے (الانعام ۹۱ - ۸۳)

مذکورہ آیت قرآن کی ان بہت سی آیتوں میں سے ہے جن سے قطعی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام کو جو دین دیا گیا وہ ٹھیک وہی دین تھا جو دوسرے تمام نبیوں کو دیا گیا تھا۔ یہ یکسانیت اتنی زیادہ ہے کہ پیغمبر اسلام کو حکم ہوا کہ تم اسی راستے پر چلو جس پر تمہارے پیش رو انبیاء چلے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبرانہ مشن کی کوئی ایسی تعبیر ہرگز صحیح نہیں ہو سکتی جو کسی ایک نبی پر چسپاں ہوتی ہو اور دوسرے نبی پر وہ چسپاں نہ ہو سکے۔ وہی مشن پیغمبرانہ مشن ہے جو تمام نبیوں کے یہاں یکساں طور پر پایا جائے۔ جو چیز ایک پیغمبر کے یہاں ہو اور دوسرے پیغمبر کے یہاں نہ ہو، وہ مشن کی نوعیت کی چیز نہ ہوگی۔ اس کا تعلق حالات کے تقاضے سے ہوگا اور حالات کا تقاضا یکساں نہیں ہوتا۔ مشن ہمیشہ ایک ہوتا ہے اور حالات کا تقاضا ہمیشہ مختلف

سیاسی احکام کی نوعیت

ایک مسلمان کمیونسٹ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تاریخ کے سب سے بڑے اشتراکی تھے
ان کے نزدیک پیغمبر اسلام کا مشن یہ تھا کہ دنیا سے معاشی استحصال کا خاتمہ کریں۔ اور زمین پر معاشی انصاف
کا نظام قائم کریں۔ اپنے نقطۂ نظر کو ثابت کرنے کے لئے ان کو قرآن کے بہت سے حوالے مل گئے ——
زمین اللہ کی ہے (اعراف ۱۲۸) دولت کا اجتماع ہلاکت کا باعث ہے (الہمزہ ۲) ضرورت سے زیادہ مال
رکھنے کا کسی کو حق نہیں (البقرہ ۲۱۹) سرمایہ دارانہ سماج پر خدا اپنا عذاب نازل کرتا ہے (الاسراء ۱۶)
دولت صرف سرمایہ دار طبقہ میں نہیں رہنا چاہئے (الحشر ۷) خدا کا مطلوب سماج وہ ہے جس میں ایک
طبقہ کے لئے دوسرے طبقہ کو لوٹنے کا موقع نہ ہو (ھود ۸۴) دولت کے زور پر جو لوگ دوسروں کا استحصال
کرتے ہیں ان سے جنگ کرو (البقرہ ۲۷۹)

مذکورہ کمیونسٹ اپنے نقطۂ نظر کے حق میں اس طرح کے قرآنی دلائل پیش کرتے رہے۔ آخر میں
میں نے کہا کہ پیغمبر کا مشن اگر وہی ہے جو آپ نے بیان فرمایا تو قرآن میں ایسی کوئی آیت ہونی چاہئے جس
کا مفہوم یہ ہو کہ "اے پیغمبر، ہم نے تم کو اس لئے بھیجا ہے تاکہ تم دنیا سے معاشی لوٹ کو ختم کرو اور زمین پر
معاشی انصاف کا نظام قائم کرو۔" اگر آپ اپنے دعوے میں برحق ہیں تو قرآن سے ایسی کوئی آیت نکال کر
دکھائیے۔ موصوف نے مذکورہ بالا قسم کے معاشی حوالے تو بہت دئے مگر وہ ایسی کوئی آیت پیش نہ کر سکے جس
کے الفاظ سے براہ راست طور پر یہ نکلتا ہو کہ پیغمبر کا مشن دنیا میں معاشی انقلاب برپا کرنا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن میں بہت سی معاشی آیتیں ہیں۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ قرآن میں کوئی
ایک بھی ایسی آیت نہیں جس کے عبارت النص سے مذکورہ بالا قسم کا معاشی نصب العین نکلتا ہو۔ یہ فرق
ثابت کرتا ہے کہ معاشی احکام اگرچہ قرآن میں موجود ہیں مگر معاشی احکام کا نفاذ ہی وہ چیز نہیں جو پیغمبر خدا
کا اصل نصب العین ہو۔ معاشی احکام کی اہمیت کسی اور پہلو سے ہے نہ کہ نصب العین کے پہلو سے۔

یہی معاملہ سیاسی احکام کا ہے۔ قرآن میں یقیناً سیاسی نوعیت کے احکام بھی ہیں۔ مگر ان احکام کی بنیاد
پر ایک نظام قائم کرنا ہی وہ اصل نصب العین نہیں جس کے لئے پیغمبر کی بعثت ہوئی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں
ایسی آیتیں تو ملتی ہیں جن میں سیاسی پہلو بھی شامل ہو۔ مگر سارے قرآن میں ایسی کوئی ایک آیت نہیں جس کا
مفہوم یہ ہو کہ "اے پیغمبر تمہارا نصب العین یہ ہے کہ تم قرآنی احکام کی بنیاد پر ایک مکمل سیاسی نظام قائم کرو۔"
قرآن معاشی نصب العین کی آیت سے بھی خالی ہے اور سیاسی نصب العین کی آیت سے بھی۔

مذاق اڑانا حرام ہے

قرآن میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ اے ایمان والو، تم دوسرے کا مذاق نہ اڑاؤ، ہوسکتا ہے کہ وہ تم سے بہتر ہو (الحجرات ۱۱) حافظ ابن کثیر اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

ینھیٰ تعالیٰ عن السخریۃ بالناس ۔ ۔ ۔ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کا مذاق اڑانے سے منع فرمایا۔
والمراد من ذلک احتقارھم واستصغارھم اور اس سے مراد ان کو حقیر جاننا اور ان کو چھوٹا
وھذا حرام سمجھنا ہے اور یہ حرام ہے ۔

مولانا شبیر احمد عثمانی اپنے تفسیری نوٹ میں لکھتے ہیں "عموماً دیکھا جاتا ہے کہ جہاں دو شخصوں یا دو جماعتوں میں اختلاف رونما ہوا بس ایک دوسرے کا تمسخر اور استہزار کرنے لگتا ہے۔ ذرا سی بات ہاتھ لگ گئی اور ہنسی مذاق اڑانا شروع کر دیا۔ حالانکہ اسے معلوم نہیں کہ شاید جس کا مذاق اڑا رہا ہے وہ اللہ کے نزدیک اس سے بہتر ہو۔ بلکہ بسا اوقات یہ خود بھی اختلاف سے پہلے اس کو بہتر سمجھتا ہوتا ہے۔ مگر ضد و نفسانیت میں دوسرے کی آنکھ کا تنکا نظر آتا ہے، اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا"

دلیل کی بنیاد پر کسی کی تنقید کرنا عین جائز ہے۔ مگر بلا دلیل کسی کا مذاق اڑانا سراسر حرام ہے۔
جب آدمی کسی کا مذاق اڑاتا ہے تو اس کے پیچھے دراصل کبر ہوتا ہے۔ وہ اپنے کو بڑا سمجھتا ہے اور دوسرے کو حقیر خیال کرتا ہے۔ یہی وہ نفسیات ہے جس کے تحت کسی کی زبان سے وہ الفاظ نکلتے ہیں جس کو تمسخر یا مذاق اڑانا کہا جاتا ہے۔

یہ متکبرانہ نفسیات کسی کے اندر کیوں پیدا ہوتی ہے۔ اس کی وجہ ہے دنیوی یا مادی چیزوں کو اہم سمجھنا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جن لوگوں کے گرد دولت، شہرت، قیادت اور مناصب جمع ہو جائیں ان کو لوگ بڑا سمجھ لیتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں جس آدمی کے گرد یہ رونقیں دکھائی نہ دیں اس کو حقیر سمجھ لیا جاتا ہے، یہی حقیر سمجھنا لوگوں کو جرأت دلاتا ہے کہ وہ ایسے آدمی کا مذاق اڑائیں، وہ بھول جاتے ہیں کہ اصل بڑائی وہ ہے جو خدا کے یہاں حاصل ہو۔ اور خدا کے یہاں بڑائی کا معیار دنیوی رونقیں نہیں ہیں بلکہ تقویٰ ہے۔

مذاق اڑانے والے کو اس سے ڈرنا چاہئے کہ اس کو قیامت کا پردہ پھٹنے کے بعد اس بات پر شرمندہ ہونا پڑے کہ اس نے ایک بندہ خدا کا اس بنا پر مذاق اڑایا کہ وہ دکھائی دینے والی بڑائی سے خالی تھا حالانکہ عین اس وقت نہ دکھائی دینے والی بڑائی اس کے اندر پوری طرح موجود تھی۔

دو طریقے

آدمی کے سامنے جب ایک ایسی سچائی آتی ہے جس کا توڑ وہ دلائل کی زبان میں نہ کر سکتا ہو تو اکثر دو چیزوں کا سہارا لیتا ہے — استہزا اور گریز۔ استہزا کا مقصد داعی کے بارے میں یہ تاثر دینا ہے کہ وہ اتنا حقیر شخص ہے کہ اس کی بات قابل اعتنا ہی نہیں۔ اسی طرح گریز کا طریقہ آدمی اس وقت اختیار کرتا ہے جب کہ اس کے پاس اصل بات کی براہ راست دلیل موجود نہ ہو۔ ایسے موقع پر وہ ادھر ادھر کی باتیں زور شور سے بول کر یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کے پاس جواب دینے کے لئے بہت کچھ ہے، دلیل کے میدان میں وہ خالی نہیں۔

پہلی چیز کی ایک مثال قرآن کی سورہ نمبر ۳۷ میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنی وہ دعوت پیش کی جو قرآن کے مطابق تمام پیغمبروں کی مشترک دعوت تھی تو قریش نے کہا "کیا ہم ایک شاعر دیوانہ کے کہنے سے اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں" (الصافات ۳۶)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مضبوط دلائل کا قریش کے پاس کوئی جواب نہ تھا اس لئے انھوں نے آپ کو شاعر اور دیوانہ کہا تاکہ آپ کو حقیر ظاہر کر کے آپ کی بات کو مذاق میں اڑا دیں۔

دوسری چیز کی مثال سورہ نمبر ۳ میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب اونٹ کا گوشت اور دودھ استعمال کرتے تھے۔ یہود نے ان چیزوں کو اپنی شریعت میں حرام کر رکھا تھا۔ چنانچہ یہود نے یہ کہنا شروع کیا کہ محمد اپنے کو ملت ابراہیمی کا حامل بتاتے ہیں حالاں کہ وہ ان چیزوں کو کھاتے ہیں جو ملت ابراہیمی میں حرام ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ ملت ابراہیمی پر ہم ہیں نہ کہ محمد اور ان کے ساتھی۔ قرآن میں کہا گیا کہ اگر تم سچے ہو تو اپنی مقدس کتاب تورات لاؤ اور دکھاؤ کہ اس کی کس آیت میں یہ بات لکھی ہوئی ہے (آل عمران ۹۳)۔ اس کے جواب میں یہود نے تورات کی کوئی آیت پیش نہیں کی۔ البتہ وہ دوسری دوسری باتیں کہنے لگے۔ مثلاً یہ کہ یہ بات تو بالکل معلوم و مشہور ہے، پھر اس کے لئے تورات کی کوئی آیت پیش کرنے کی کیا ضرورت۔

انسان کا حال ہمیشہ یہی رہا ہے کہ جب وہ دلیل کے میدان میں اپنے کو خالی پاتا ہے تو وہ استہزا اور گریز کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ وہ آدمی کو ناقابل التفات ظاہر کرتا ہے یا غیر متعلق الفاظ بول کر یہ تاثر دیتا ہے کہ اس کے پاس کہنے کے لئے بہت کچھ موجود ہے۔ اس کی مثالیں پچھلے دور میں بھی دیکھی جا سکتی ہیں اور آج کے دور میں بھی۔

فلسطین: ایک علامت

فلسطینی مسلمان ۱۹۴۸ء میں اپنے وطن فلسطین سے بے گھر کئے گئے۔ اس کے بعد وہ اطراف کے علاقوں مصر اور شام اور اردن سے نکالے گئے۔ لبنان ان کا آخری مرکز تھا، اب ۱۹۸۲ء میں وہ یہاں سے بھی نکلنے پر مجبور کر دئے گئے ہیں۔ پچھلے ۳۵ سال سے ان پر جتنا ظلم ہو رہا ہے اتنا ظلم شاید اسلامی تاریخ کے کسی دور میں کسی بھی مسلم گروہ پر نہیں ہوا۔

یہ معاملہ کوئی سادہ یا مقامی معاملہ نہیں۔ یہ ایک علامتی واقعہ ہے جس کا تعلق ساری دنیا کے مسلمانوں سے ہے۔ فلسطینیوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ تمام دنیا کے مسلمانوں کے لئے ایک انتباہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان بحیثیت مجموعی خدائی عتاب کی زد میں ہیں اور فلسطینی مسلمانوں کا معاملہ اس کی ایک علامت ہے۔ خدا مسلمانوں کو رد کر چکا ہے۔ اور یہ اس کے باوجود ہے کہ ان کے درمیان ایسے بزرگ موجود ہیں جو بین اقوامی اسٹیج پر کھڑے ہو کر یہ تقریر کر رہے ہیں کہ اکتشفت الامۃ العربیۃ نفسہا (عرب قوم نے اپنے آپ کو دریافت کر لیا) ان میں ایسے مفکرین اسلام موجود ہیں جو موجودہ عہد کو اسلام کا عہد بنانے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ ان کے درمیان آج اسلام کے نام پر اتنی سرگرمیاں جاری ہیں کہ وہ یہ کہنے کی پوزیشن میں ہیں کہ ہم نے سارے عالم میں اسلام کی ہوائیں چلا دی ہیں۔

ظہور آیات کا مقام

محمد صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین تھے۔ آپ کے بعد پچھلے انبیاء کی نبوتیں عملی طور پر منسوخ ہو گئیں۔ اب صرف آپ کی نبوت خدا کی نظر میں مستند نبوت ہے اور صرف آپ کی پیروی سے کسی کو نجات مل سکتی ہے۔ پیغمبر اسلام کے ظہور کے ذریعہ اللہ نے یہ چاہا کہ وہ اپنے اس فیصلہ کا ایک حسی مظاہرہ یا علامتی نمونہ دکھائے۔ چنانچہ اس کے لئے معراج میں یہ کیا گیا کہ سابقہ انبیاء کو ایک مقام پر جمع کیا گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل کی ہدایت پر ان کی امامت فرمائی اور تمام انبیاء نے آپ کی قیادت میں آپ کے پیچھے نماز ادا کی (وقد رأیتنی فی جماعۃ من الانبیاء ۔۔۔ فحانت الصلوٰۃ فاممتہم، صحیح مسلم)

امامت انبیاء کا یہ واقعہ کعبہ (عرب) میں بھی ہو سکتا تھا۔ مگر اس کے لئے معراج ہوئی اور آپ کو بیت المقدس (فلسطین) لے جایا گیا۔ اس کی وجہ قرآن میں یہ بتائی گئی ہے ــــــــ تاکہ ہم پیغمبر کو اپنی نشانیاں دکھائیں (لنریہ من آیاتنا، اسراء ۱) بیت المقدس تاریخی طور پر وہ مقام بن چکا تھا جہاں امت یہود کے سلسلہ کی خدائی نشانیاں پچھلے ہزاروں سال سے ظاہر ہو رہی تھیں۔ اب معراج کے موقع پر

خود نبی آخرالزماں کو خدائی نشانی دکھانے کے لئے وہاں لے جاتا ظاہر کرتا ہے کہ کعبہ اور بیت المقدس دونوں کی وراثت اب آپ کی امت کو دے دی گئی۔ پھر جب بیت المقدس مسلمانوں کے حصہ میں آیا تو اس کی وہ دینی اور آیاتی حیثیت بھی انھیں کی طرف لوٹ آئے گی جو قدیم انبیاء کے زمانہ میں انھیں حاصل تھی۔

بائبل سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل پر جب خدا کی رحمت ہوتی تو وہ فلسطین میں فارغ البال اور ذی اقتدار بنا دئے جاتے۔ اور جب ان پر خدا کا عتاب ہوتا تو فلسطین ان سے چھن جاتا اور وہ سخت مصیبتوں کی زد میں آجاتے۔ فلسطین بنی اسرائیل کے مرحوم یا معتوب ہونے کی علامت تھی۔ یہی معاملہ خدا کا اب مسلمانوں کے ساتھ ہے۔ فلسطین مسلمانوں کے حق میں حکم خداوندی کی علامت ہے۔ اگر مسلمانوں کو فلسطین پر غلبہ حاصل ہو اور وہاں وہ امن کی زندگی بسر کر رہے ہوں تو سمجھنا چاہئے کہ خدا ان سے خوش ہے۔ اور اگر مسلمانوں کو فلسطین پر غلبہ حاصل نہ ہو تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ عتاب خداوندی کی زد میں آگئے ہیں (احبار، باب ۲۶، استثنا، باب ۲۸)

نبی آخرالزماں کے ظہور کے بعد بیت المقدس اور کعبہ دونوں کی وراثت آپ کی امت کو دی جا چکی ہے۔ اس اعتبار سے امت مسلمہ کے بارہ میں مرحومیت یا معتوبیت کا اظہار کعبہ کی سطح پر بھی ہو سکتا تھا۔ مگر کعبہ دین محفوظ کا قبلہ اور اس کا قیامت تک کے لئے مرکز ہے، اس لئے اس کو تخریبی فتنوں سے بچانا بھی ضروری ہے۔ کعبہ محفوظ نہ رہے تو دین کی محفوظیت بھی خطرہ میں پڑ جائے گی۔ اس بنا پر ضروری ہوا کہ امت مسلمہ کے بارے میں آیات رحمت یا آیات غیر رحمت کے ظہور کے لئے بیت المقدس کو بدستور اپنی سابقہ حیثیت پر باقی رکھا جائے۔

فلسطین کے مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے اس کو امریکہ اور اسرائیل کی جارحیت سمجھنا خدا کی سنت سے بے خبری کا ثبوت ہے۔ یہ دراصل خدا کا وہ معاملہ ہے جو وہ حاملین کتاب کے ساتھ اس وقت کرتا ہے جب کہ وہ حامل کتاب ہونے کی ذمہ داری کو ادا نہ کر رہے ہوں۔ پہلے یہود کتاب الٰہی کے حامل تھے۔ اس لئے پچھلے زمانہ میں یہود کے ساتھ یہ معاملہ ہوتا رہا۔ اب مسلمان کتاب الٰہی کے حامل ہیں، اس لئے اب خدا کا وہ معاملہ فلسطین کے مسلمانوں کے ساتھ ہوگا جو پہلے فلسطین کے یہود کے ساتھ کیا جا رہا تھا۔

پھر یہ کام یہود سے کیوں لیا جا رہا ہے، اس کی خاص مصلحت ہے۔ یہود کا فلسطین میں جمع ہونا اور ان کے ذریعہ مسلمانوں کو ذلت کی سزا دینا بیک وقت دو مقاصد کا حامل ہے۔ ایک طرف ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہود کو ایک مقام پر جمع کر کے بالآخر انھیں کوئی سخت اجتماعی سزا دی جانے والی ہے۔ دوسری طرف ایک "مغضوب" قوم کے ذریعہ مسلمانوں کو سزا دینا اس شدتِ عتاب کو بتا رہا ہے جس کا مورد اس وقت

مسلمان بن رہے ہیں اور اس وقت تک بنتے رہیں گے جب تک وہ دوبارہ اپنے آپ کو کتاب الٰہی کی بنیاد پر کھڑا نہ کریں۔

آج تمام دنیا کے مسلمان فلسطینیوں کی حمایت پر متحد ہیں۔ شاید عالم اسلام کا دوسرا کوئی بھی ایسا مسئلہ نہیں جس پر ان کے درمیان اتنا زیادہ اتفاق پایا جاتا ہو۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ تمام دنیا کے مسلمانوں نے فلسطین کے مسئلہ کو اپنا مسئلہ بنا رکھا ہے۔ مسلمانوں کے تمام اصاغر و اکابر اس معاملہ میں یکساں طور پر امریکہ اور اسرائیل کی مذمت کر رہے ہیں اور مجاہدین فلسطین کے نام اپنے حمایتی الفاظ نشر کرنے میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانا چاہتے ہیں۔ اس طرح فلسطین کا مسئلہ، عملاً، تمام دنیا کے مسلمانوں کا مسئلہ بن گیا ہے۔ فلسطینی مسلمانوں کی عزت تمام مسلمانوں کی عزت ہے اور فلسطینی مسلمانوں کی بے عزتی تمام مسلمانوں کی بے عزتی۔

اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کی عمومی حمایت کسی بھی درجہ میں فلسطینیوں کے مسئلہ کو حل کرنے میں کامیاب ثابت نہیں ہو رہی ہے۔ فلسطینی مسئلہ دن بدن سخت سے سخت تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسئلہ کسی اور مقام پر پیدا ہوا ہے اور مسلمان اس کا حل کسی اور مقام پر تلاش کر رہے ہیں۔

یہ مسئلہ امریکہ اور اسرائیل کی سطح پر نہیں ہے بلکہ خدا کی کتاب کی سطح پر ہے۔ اگر یہ امریکہ کا مسئلہ ہوتا تو ہم اس کو اسی طرح حل کر چکے ہوتے جس طرح ویت نام نے اس کو بہت پہلے حل کر لیا۔ خدا کی کتاب کے ساتھ غفلت اور بے انصافی نے یہ مسئلہ پیدا کیا ہے اور خدا کی کتاب کے ساتھ غفلت اور بے انصافی کو ختم کر کے ہی یہ مسئلہ دوبارہ ختم ہو سکتا ہے۔

یہ واقعہ مزید اس بات کی علامت ہے کہ اس وقت مسلمانوں کے درمیان جو کچھ اسلام کے نام پر ہو رہا ہے۔ وہی وہ چیز نہیں جو اللہ تعالیٰ کو ان سے مطلوب ہو یا جو کتاب الٰہی کی اقامت کے ہم معنی ہو۔ کیونکہ موجودہ زمانہ میں اتنی بڑی بڑی اسلامی شخصیتیں پیدا ہوئی ہیں اور اتنے بڑے پیمانہ پر اسلامی کام ہو رہے ہیں کہ اگر یہی وہ چیز ہوتی جو خدا کو مطلوب ہو تو کبھی ممکن نہ تھا کہ مسلمان عتاب خداوندی کی زد میں آئیں کیونکہ یہ سب کام مقدار میں اتنے زیادہ ہیں کہ اگر وہ صحیح اور مطلوب ہوں تو ان پر نصرت خداوندی کا نزول ہونا چاہئے نہ کہ عتاب خداوندی کا۔

یہ سب سے بڑا مسئلہ ہے جس پر آج تمام دنیا کے مسلمانوں کو غور کرنا چاہئے۔ کیونکہ خدا اگر انھیں رد کر دے تو پھر ان کے لئے نہ دنیا میں کوئی جگہ ہے اور نہ آخرت میں۔ غیر مطلوب سرگرمیاں، خواہ وہ دین کے نام پر کی جا رہی ہوں، کسی کو خدا کی نظر میں رحمت و نصرت کا مستحق نہیں بناتیں۔

ایجنسی : ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دلچسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ بیک وقت سال بھر کا زر تعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت —— الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کر کے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا۔ بشرطیکہ پرچے خراب نہ ہوئے ہوں۔

دوسری صورت —— الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ ۱۳۵ روپے یا ماہانہ ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی سے شائع کیا

AL-RISALA MONTHLY

JAMIAT BUILDING QASIMJAN STREET DELHI-110006 (INDIA) PHONE 232231

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

۱۔ الاسلام	۱۵—۰
۲۔ مذہب اور جدید چیلنج	۱۵—۰
۳۔ ظہورِ اسلام	۱۵—۰
۴۔ دین کیا ہے ؟	۲—۰
۵۔ قرآن کا مطلوب انسان	۵—
۶۔ تجدید دین	۳—۰
۷۔ اسلام دینِ فطرت	۳—۰
۸۔ تعمیرِ ملت	۳—۰
۹۔ تاریخ کا سبق	۳—۰
۱۰۔ مذہب اور سائنس	۵—۰
۱۱۔ عقلیاتِ اسلام	۳—۰
۱۲۔ فسادات کا مسئلہ	۲—۰
۱۳۔ انسان اپنے آپ کو پہچان	۱—۰
۱۴۔ تعارفِ اسلام	۲—۵۰
۱۵۔ اسلام پندرھویں صدی میں	۲—۰
۱۶۔ راہیں بند نہیں	۳—۰
۱۷۔ دینی تعلیم	۳—۰
۱۸۔ ایمانی طاقت	۳—۰
۱۹۔ اتحادِ ملت	۳—۰
۲۰۔ سبق آموز واقعات	زیر طبع
۲۱۔ اسلامی تاریخ سے	″
۲۲۔ قال اللہ	″
۲۳۔ اسلامی دعوت	۳—۰
۲۴۔ زلزلۂ قیامت	۴—۰
۲۵۔ سچا راستہ	۱—۰

حقیقتِ واقعہ کا اعتراف سب سے بڑا قول ہے
اور حقیقتِ واقعہ سے مطابقت سب سے بڑا عمل

ستمبر ۱۹۸۲ ☐ قیمت فی پرچہ — تین روپے ☐ شمارہ ۷۰
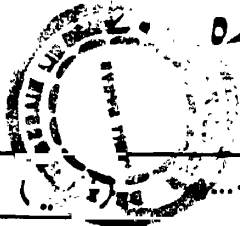
بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ کا زیر نظر شمارہ جزئی طور پر اجتماع نمبر ہے۔ اس میں مولانا وحید الدین خاں صاحب (صدر اسلامی مرکز) کی وہ تین تقریریں شائع کی جارہی ہیں جو بھوپال کے اجتماع (۱۷-۱۸ اپریل ۱۹۸۲) کے موقع پر پیش کی گئی تھیں۔

پہلی تقریر میں اسلام اور اسلامی دعوت کی نظریاتی وضاحت ہے۔ دوسری تقریر میں صحابۂ کرام کی تصویر پیش کی گئی ہے جو ہمیشہ کے لئے اسلام اور اسلامی دعوت کا عملی نمونہ ہیں۔ تیسری تقریر میں اس عام سوال پر گفتگو کی گئی ہے کہ اسلامی مقصد کو بروئے کار لانے کے لئے ہمارا پروگرام کیا ہے۔ امید ہے کہ یہ شمارہ دل چسپی کے ساتھ پڑھا جائے گا۔ اور الرسالہ اور اسلامی مرکز کے مشن کے عمومی تعارف کے لئے مفید ہوگا۔

زر تعاون سالانہ ۳۶ روپیہ • خصوصی تعاون سالانہ دو سو روپے • بیرونی ممالک سے ۲۰ ڈالر امریکی

احیاء اسلام

تمہید

اللہ تعالیٰ کو یہ مطلوب ہے کہ اس کا دین سربلند ہو۔ اس کو دنیا میں غالب فکر کا مقام حاصل ہو۔ مگر دین کے فکری غلبہ کے لئے عالمی حالات کی موافقت ضروری ہے۔ خدا نے ہزاروں سال کے عمل سے پیغمبر آخر الزماں کے لئے موافق حالات پیدا کئے۔ آپ نے ان حالات کو جانا اور ان کو حکیمانہ طور پر استعمال کر کے اسلام کو دنیا میں غالب فکر کا مقام عطا کیا۔

اب دوبارہ پچھلے ہزار سال کے عمل کے نتیجہ میں خدا نے وہ تمام موافق حالات جمع کر دئے ہیں جن کو استعمال کر کے از سر نو اسلام کو دنیا کا غالب فکر بنایا جا سکے۔ اسلام کو دوبارہ وہی برتری اور سربلندی حاصل ہو جو ماضی میں اسے حاصل تھی۔

مگر ان امکانات کو واقعہ بنانے کے لئے ایک ایسی سنجیدہ جدوجہد درکار ہے جو وقت کے گہرے شعور پر ابھری ہو۔ جو ردعمل کی نفسیات سے پاک ہو کر مثبت عمل کرنا جانتی ہو۔ جو ہر دوسرے احساس کو قربان کر کے صرف دین کی سربلندی کے لئے کوشش کرنے والی ہو۔ جو ربانی حکمت کی رہنمائی میں اٹھی ہو نہ کہ انسانی کج فہمیوں کی بنیاد پر۔ جس کا محرک خدا کی بڑائی قائم کرنا ہو نہ کہ قومی فخر اور مادی عظمت کا جھنڈا لہرانا۔ ایسے ہی لوگوں نے پہلے بھی خدا کے دین کو سربلند کیا تھا اور ایسے ہی لوگ آج بھی خدا کے دین کو سربلند کریں گے۔ اس کے برعکس جو لوگ سطحی نعروں پر بھیڑ جمع کرنے کو کام سمجھیں، جو ہر پیش آمدہ مسئلہ پر دوڑنا شروع کر دیں، وہ صرف خدا کے پیدا کئے ہوئے امکانات کو برباد کریں گے۔ وہ ان امکانات کو واقعہ بنانے والے ثابت نہیں ہو سکتے۔

ایک تقابل

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو اسلامی انقلاب آیا اس میں تاریخی روایات کے مطابق کل ۱۰۱۸ آدمی ہلاک ہوئے۔ اس انقلاب کی تکمیل ۲۳ سال میں ہوئی۔ ان ۲۳ سالوں میں جو غزوات پیش آئے ان کی تعداد ۸۱ بتائی جاتی ہے۔ تاہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف ۲۷ غزوات میں شریک تھے اور عملاً باقاعدہ جنگ صرف چند ہی غزوات میں پیش آئی۔ ان لڑائیوں میں مجموعی طور پر ہلاک ہونے والوں کی تعداد اس طرح ہے:

مسلمان مقتولین ۲۵۹

غیر مسلم مقتولین ۷۵۹ = ۱۰۱۸

صدر اول کا یہ انقلاب تاریخ کا عظیم ترین انقلاب تھا جس نے انسانی تاریخ کے دھارے کو موڑ دیا۔ اتنے بڑے انقلاب میں مقتولین کی یہ تعداد اتنی کم ہے کہ اس کو غیر خونی انقلاب (Bloodless Revolution) کہا جا سکتا ہے۔

ہمارے لکھنے اور بولنے والے اکثر پُرجوش انداز میں اس انقلاب کا مقابلہ موجودہ زمانہ کے غیر اسلامی انقلابات سے کرتے ہیں۔ وہ فخر کے ساتھ کہتے ہیں کہ اسلامی انقلاب صرف ایک ہزار آدمیوں کی جان دے کر کامیاب ہو گیا۔ جبکہ فرانس میں جمہوری انقلاب لانے کے لئے اور روس میں اشتراکی انقلاب لانے کے لئے اتنے زیادہ آدمیوں کو قربان ہونا پڑا جن کی تعداد لاکھوں میں شمار ہوتی ہے۔

یہ تقابل ہم کو بہت پسند ہے کیونکہ اس میں ہماری پُرفخر نفسیات کو تسکین ملتی ہے۔ مگر یہاں تقابل کی ایک اور صورت ہے جس پر مسلمانوں نے کبھی غور نہیں کیا۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ یہ دوسرا تقابل نصیحت کا تقابل ہے اور نصیحت آدمی کے لئے ہمیشہ بہت کڑوی ہوتی ہے۔

یہ دوسرا تقابل یہ ہے کہ آپ صدر اول کی اسلامی دعوت میں مرنے والے کا مقابلہ موجودہ زمانہ کی مسلم تحریکوں میں مرنے والوں سے کریں۔ بالفاظ دیگر، صدر اول کے انقلاب سے خود اپنی انقلابی کوششوں کا موازنہ کریں۔ مسلمانوں نے موجودہ زمانہ میں دینی انقلاب اور اسلامی جہاد کے نام پر بڑی بڑی تحریکیں اٹھائی ہیں۔ مسلمان جس طرح زمانہ رسالت کے دینی انقلاب کا تقابل غیر مسلموں کے لادینی انقلابات سے کرتے ہیں۔ اسی طرح انھیں چاہئے کہ وہ زمانۂ رسالت کے انقلاب کو سامنے رکھ کر خود اپنی اٹھائی ہوئی تحریکوں کو تولیں اور ان کے نتائج کا جائزہ لیں۔

اگر مسلمان یہ تقابل کریں تو وہ حیرت انگیز طور پر پائیں گے کہ انھوں نے پیغمبر کی تحریک کے مقابلہ میں دوسری اقوام کی لادینی تحریکوں کو جس مقام پر کھڑا کر رکھا ہے، عین اسی مقام پر خود ان کی موجودہ زمانہ کی تحریکیں بھی کھڑی ہوئی ہیں —— الجزائر کے جہاد آزادی میں ۲۵ لاکھ مسلمان مرے، ہندستان کے جہاد آزادی میں ۵ لاکھ علماء اور مسلمان شہید ہوئے، اسلامی پاکستان کو وجود میں لانے کے درمیان ایک کروڑ انسان کام آگئے۔ اسی طرح شام، عراق، ایران، مصر، فلسطین اور دوسرے علاقوں میں جو لوگ اسلام کے نام پر جانیں دے رہے ہیں ان کی تعداد لاکھوں سے بھی زیادہ ہے۔ مزید یہ کہ ان تمام قربانیوں کا حاصل کچھ بھی نہیں۔ صدر اول کی اسلامی تحریک میں دس سو آدمی کام آئے، اور اس کے بعد ایسا دور رس انقلاب آیا جس کے اثرات ساری دنیا نے محسوس کر لئے۔

موجودہ زمانہ کی اسلامی تحریکوں میں مجموعی طور پر دس کروڑ آدمی ہلاک اور برباد ہو گئے۔ اس کے باوجود زمین کے اوپر کوئی ایک چھوٹا سا خطہ بھی نہیں جہاں اسلامی انقلاب حقیقی معنوں میں کامیاب اور نتیجہ خیز نظر آتا ہو۔

پھر بات صرف اتنی ہی نہیں ہے بلکہ اس سے زیادہ سخت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں ہماری کوششوں کا بالکل الٹا نتیجہ برآمد ہوا ہے۔ ہمارے حق میں بائبل کے وہ الفاظ پورے ہوئے ہیں جو یہود کے بارے میں کہے گئے تھے ——— "اور تمھارا بیج بونا فضول ہوگا کیونکہ تمھارے دشمن اس کی فصل کھائیں گے۔ اور جن کو تم سے عداوت ہے وہی تم پر حکمرانی کریں گے۔ اور تمھاری قوت بے فائدہ صرف ہوگی کیونکہ تمھاری زمین سے کچھ پیدا نہ ہوگا۔ اور میدان کے درخت پھلنے ہی کے نہیں" (احبار، باب ۲۶)

ہماری جدید تاریخ ان الفاظ کے عین مصداق ثابت ہو رہی ہے۔ ہم نے خلافت اسلامی اور اتحاد عالمی کی دھواں دھار تحریکیں چلائیں اور اس کی راہ میں ان گنت قربانیاں دیں۔ مگر جب نتیجہ نکلا تو ساری مسلم دنیا بہت سی قومی حکومتوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ ہم نے آزادیٔ وطن کے لئے جہاد کیا مگر جب وطن آزاد ہوا تو عملاً وہ دوسرے فرقوں کے قبضہ میں چلا گیا۔ ہم نے اسلامی پاکستان وجود میں لانے کے لئے قربانیاں دیں مگر جب اسلامی پاکستان بنا تو وہاں غیر اسلامی لیڈروں کی حکومت قائم تھی۔ ہم نے مصر میں اسلامی اقتدار قائم کرنے کے لئے عظیم الشان تحریک اٹھائی مگر جب مصر کی قسمت کا فیصلہ ہوا تو وہ اسلام پسندوں کے بجائے فوجی حوصلہ مندوں کے ہاتھ میں جا چکا تھا۔ تقریباً ثلث صدی سے فلسطین کی یہودی ریاست کو مٹانے کے لئے جہاد جاری ہے اور مسلمانوں کا جان ومال بے پناہ مقدار میں تباہ ہو رہا ہے مگر عملاً صرف یہ ہوا ہے کہ یہودی ریاست کی قوت اور وسعت میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس سلسلہ میں آخری دردناک خبر جو بہت جلد مسلمانوں کو سننی ہوگی وہ یہ کہ ایران میں ناقابل بیان قربانیوں کے بعد اسلامی اقتدار لایا گیا مگر یہ اسلامی اقتدار بہت جلد ملحد طاقتوں کا اقتدار قائم ہونے کا ابتدائی زینہ بن گیا۔

یہ موجودہ زمانہ کی پتھر سے بھی زیادہ سنگین حقیقتیں ہیں۔ کوئی شخص یہ کر سکتا ہے کہ اپنے ذہن میں خوش خیالیوں کی ایک دنیا بنا کر اس میں جیتا رہے مگر آئندہ آنے والا مورخ یقیناً ہماری خوش خیالیوں کی تصدیق نہیں کرے گا۔ وہ یہ لکھنے پر مجبور ہوگا کہ فرانس اور روس کے انقلاب میں مرنے والوں کے حصہ میں پھر بھی یہ فائدہ آیا کہ انھوں نے عالمی فکر کا دھارا موڑ دیا۔ اس کے بعد دنیا میں شہنشاہی طرز فکر کے بجائے جمہوری طرز فکر رائج ہو گیا اور سرمایہ دارانہ طریق معیشت پر سوشلسٹ طریق معیشت کو فکری غلبہ حاصل ہو گیا۔ مگر اسلام کے نام پر برباد ہونے والے اگرچہ تعداد میں ان سے بھی زیادہ تھے مگر وہ عالمی فکر پر کسی قسم کا اثر نہ ڈال سکے۔

صدر اول کا اسلامی انقلاب بتاتا ہے کہ اگر ایک ہزار آدمی بھی یہ ثبوت دے دیں کہ وہ خدا کے دین کی خاطر قربانی کی حد تک جانے کے لئے تیار ہیں تو خدا ان کی قربانی کو قبول کر کے اسلام کو زمین پر غالب کر دیتا ہے۔

موجودہ زمانہ میں کروروں آدمیوں نے قربانی کا ثبوت دیا مگر خدا کی نصرت ان کا ساتھ دینے کے لئے آسمان سے نہیں اتری۔ وہ اس کے باوجود مغلوب ہی بنے رہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں ہماری یہ تمام قربانیاں حقیقتہً اس صراطِ مستقیم کے مطابق نہ تھیں جس کی پیروی پر خدا نے نصرعزیز اور فتح مبین کا وعدہ فرمایا ہے۔ (الفتح)

کوئی کسان اگر کہے کہ میں نے گیہوں کے بیج زمین میں ڈالے مگر اس سے گیہوں اگنے کے بجائے جھاڑ جھنکاڑ اُگے تو ایسا کسان جھوٹ بولتا ہے۔ کیونکہ خدا کی اس دنیا میں یہ ممکن ہی نہیں کہ آدمی گیہوں کے بیج بوئے اور اس سے اس کے لئے جھاڑ جھنکاڑ اگے۔ یہ ناممکن ہے، یہ کرور بار ناممکن ہے۔ اسی طرح موجودہ زمانہ میں ہماری قربانیاں اگر فی الواقع اس راہ پر ہوتیں جس راہ پر رسول اور اصحاب رسول چلے اور اپنی جانیں دیں تو ناممکن تھا کہ اتنی غیر معمولی کوششوں کے باوجود اس کا کوئی مثبت نتیجہ نہ نکلے۔ واقعات کا یہ کھلا ہوا فیصلہ ہے۔ اگر اس کے باوجود کوئی آدمی خوش فہمی کے گنبد میں رہنا چاہے تو رہے۔ بہت جلد قیامت اس کے گنبد کو توڑ دے گی۔ اس کے بعد وہ دیکھے گا کہ وہاں اس کے لئے جھوٹی خوش فہمیوں کے کھنڈر کے سوا اور کچھ نہیں۔

نصرت خداوندی

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اے ایمان لانے والو، اگر تم خدا کی مدد کروگے تو خدا تمھاری مدد کرے گا۔ اور تمھارے قدموں کو جما دے گا (یا ایہا الذین آمنوا ان تنصروا اللہ ینصرکم ویثبت اقدامکم، محمد ۷) یہاں خدا کی نصرت کرنے سے مراد خدا کی اسکیم کے ساتھ موافقت ہے، یعنی واقعات کو ظہور میں لانے کے لئے خدا کا جو نقشہ ہے اور اس کے لئے اس نے جو موافق حالات فراہم کئے ہیں ان کے ساتھ اپنی کوششوں کو جوڑ دینا، جو لوگ اس طرح خدا کی نصرت کریں ان کو جماؤ حاصل ہوتا ہے اور بالآخر وہ کامیاب رہتے ہیں۔ خدا کی اس دنیا میں خدائی منصوبہ سے مطابقت کر کے ہی کوئی نتیجہ حاصل کیا جاسکتا ہے نہ کہ بطور خود آزادانہ عمل کر کے۔

اس معاملہ کو سمجھنے کے لئے ایک مثال لیجئے۔ ایک پادری صاحب اپنے مکان کے سامنے ایک ہرا بھرا درخت دیکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے سوچا کہ اگر میں اس کا بیج بوؤں تو وہ دس سال میں پورا درخت بنے گا۔ انھوں نے ایسا کیا کہ کہیں سے ایک بڑا درخت کھدوایا پھر کئی آدمیوں کے ذریعہ اس کو وہاں سے اٹھوایا اور اس کو لاکر اپنے گھر کے سامنے لگا دیا۔ وہ خوش تھے کہ انھوں نے دس سال کی مدت ایک دن میں طے کرلی ہے، لیکن اگلے دن جب وہ صبح کو سو کر اٹھے تو ان کو یہ دیکھ کر بڑا صدمہ ہوا کہ درخت کے پتے مرجھا چکے ہیں۔ شام تک شاخیں بھی لٹک گئیں۔ چند دن کے بعد درخت کے پتے سوکھ کر جھڑ گئے اور اس کے بعد ان کے گھر کے سامنے صرف لکڑی کا ایک ٹھنٹھ کھڑا ہوا تھا۔

انھیں دنوں پادری صاحب کا ایک دوست ان سے ملنے کے لئے آیا۔ دوست نے دیکھا کہ پادری صاحب اپنے گھر کے سامنے بے چینی کے ساتھ ٹہل رہے ہیں۔ اس نے کہا، آج میں آپ کو غیر معمولی طور پر پریشان دیکھ رہا ہوں، آخر کیا بات ہے۔ پادری صاحب نے جواب دیا ـــــ میں جلدی میں ہوں مگر خدا جلدی نہیں چاہتا:

I am in hurry, but God doesn't

اس کے بعد پادری صاحب نے درخت کے مذکورہ قصہ کو بتاتے ہوئے کہا کہ دنیا میں جو واقعات ہوتے ہیں ان میں ایک حصہ خدا کا ہوتا ہے اور ایک حصہ انسان کا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے دو دندانہ دار پہیوں (Cog Wheels) کے ملنے سے مشین کا چلنا۔ ایک پہیہ خدا کا ہے، دوسرا پہیہ انسان کا۔ انسان جب خدا کے پہیہ کا ساتھ دیتا ہے تو وہ کامیاب رہتا ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ خدا کے پہیے کی رفتار کا لحاظ کئے بغیر چلنا چاہے تو وہ ٹوٹ جائے گا کیونکہ خدا کا پہیہ مضبوط ہے اور انسان کا پہیہ کمزور۔

خدا نے کروروں سال کے عمل سے زمین کے اوپر زرخیز مٹی کی تہ بچھائی جس کے اوپر کوئی درخت اگے۔ سورج کے ذریعہ اوپر سے ضروری حرارت بھیجی۔ آفاقی اہتمام کے تحت پانی مہیا فرمایا۔ موسموں کی تبدیلی کے ذریعہ اس کی پرورش کا انتظام کیا۔ کھرب ہا کھرب کی تعداد میں بیکٹیریا پیدا کئے جو درخت کی جڑوں کو نائٹروجن کی غذا فراہم کریں۔ یہ تمام انتظام گویا خدا کا دندانہ دار پہیہ (Cog Wheel) ہے۔ اب انسان کو اس میں اپنا دندانہ دار پہیہ ملانا ہے تاکہ مذکورہ مواقع اس کے لئے درخت کی صورت اختیار کر سکیں۔ انسان کو یہ کرنا ہے کہ وہ ایک بیج لے اور اس کو زمین میں دبا دے۔ اگر وہ ایسا کرے تو گویا اس نے خدا کے پہیے میں اپنے پہیے کو ملایا۔ اس کے بعد فطرت کی مشین چلنا شروع ہو جائے گی اور وقت پر اپنا نتیجہ دکھائے گی۔ اس کے برعکس اگر انسان اپنا بیج پتھر پر ڈال دے، یا بیج کے بجائے اس کے ہم شکل پلاسٹک کے دانے زمین میں بوئے۔ یا وہ ایسا کرے کہ بیج بونے کے بجائے پورا درخت اکھاڑ کر لائے اور اس کو اپنی زمین میں اچانک کھڑا کرنا چاہے تو گویا اس نے اپنا پہیہ خدا کے پہیے میں نہیں ملایا، اس نے اپنے آپ کو خدا کے منصوبے میں شامل نہیں کیا۔ ایسے آدمی کے لئے اس دنیا میں ہرے بھرے درخت کا مالک بننا مقدر نہیں۔

یہی معاملہ اسلامی انقلاب کا بھی ہے۔ وہ بھی خدا کے پیدا کردہ مواقع کو سمجھنے اور ان کو استعمال کرنے سے ظہور میں آتا ہے، نہ کہ خود ساختہ قسم کی اچھل کود مچانے سے۔ صدر اول میں جو انقلاب آیا وہ اس لئے آیا کہ خدا کے کچھ بندوں نے اپنا پہیہ خدا کے پہیہ میں ملا دیا۔ اس کے برعکس موجودہ زمانہ میں ہماری تمام قربانیاں اس لئے رائگاں چلی گئیں کہ ہم نے خدائی منصوبہ کے ساتھ موافقت نہیں کی بلکہ خود ساختہ راہوں میں غیر متعلق قسم کی

ہنگامہ آرائیاں کرتے رہے۔

دین توحید اور دین شرک

قرآن کے اشارات (البقرہ ۲۱۳) سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم کے بعد جب انسان زمین پر آباد ہوا تو سب کا دین توحید تھا۔ یہ صورت چند سو سال تک جاری رہی۔ اس کے بعد لوگوں کے اندر مظاہر پرستی کا آغاز ہوا جس کا دوسرا نام شرک ہے۔ دکھائی نہ دینے والے خدا کو اپنا مرکز توجہ بنانا انسان کے لئے مشکل تھا، چنانچہ اس نے عقیدۃً خدا کو مانتے ہوئے یہ کیا کہ دکھائی دینے والی چیزوں کو اپنا مرکز توجہ بنالیا۔ یہی وہ دور ہے جب کہ سورج، چاند اور ستاروں کی پرستش شروع ہوئی۔ پہاڑوں اور سمندروں کو دیوتا سمجھ لیا گیا۔ حتیٰ کہ انسانوں میں سے جس کے پاس عظمت و اقتدار نظر آیا اس کو بھی خدا کا شریک فرض کرلیا گیا۔ اس طرح تقریباً ایک ہزار سال بعد وہ وقت آیا جب کہ توحید کا فکری غلبہ ختم ہوگیا۔ اور انسانی ذہن پر دین شرک غالب آگیا۔

ابتدائی دین توحید میں اس بگاڑ کے بعد خدا نے اپنے پیغمبر بھیجنے شروع کئے۔ مگر ان پیغمبروں کو کبھی اتنی مقبولیت حاصل نہ ہوسکی کہ دین شرک کو مٹاکر دوبارہ دین توحید کو غالب اور سربلند کرتے۔ انسانی نسل اس زمانہ میں جن جن مقامات پر پھیلی تھی، ہر مقام پر خدا کے پیغمبر لگاتار آتے رہے (المومنون ۴۴) ایک حدیث کے مطابق ان پیغمبروں کی تعداد تقریباً ڈیڑھ لاکھ تھی۔ مگر تمام پیغمبروں کا یہ حال ہوا کہ ان کو استہزار کا موضوع بنا لیا گیا (یس ۳۰)

جب آدمی سچائی کا انکار کرتا ہے، بلکہ اس کا مذاق اڑانے پر اتر آتا ہے تو یہ خواہ مخواہ نہیں ہوتا۔ ایسا رویہ آدمی ہمیشہ کسی چیز کے بل پر اختیار کرتا ہے۔ اس کے پاس کوئی ناز ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ حق سے بے نیاز ہوجاتا ہے۔ یہ کیا ہے۔ اس کا جواب قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے:

فلما جاءتهم رسلهم بالبينات فرحوا بما	جب ان کے پاس ان کے رسول دلائل لے کر آئے تو وہ
عندهم من العلم وحاق بهم ما كانوا به	اس علم پر مگن رہے جو ان کے پاس تھا اور ان کو گھیر لیا
يستهزءون	المومن ۸۳ — اس چیز نے جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔

یہاں "علم" سے مراد وہ بگڑا ہوا مذہب ہے جو زمانہ گزرنے کے بعد ان قوموں کے نزدیک مقدس بن گیا تھا۔ اس قسم کا آبائی مذہب ہمیشہ ایک قائم شدہ مذہب ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ مانے ہوئے بزرگوں کے نام وابستہ ہوتے ہیں۔ اس کے اوپر بڑے بڑے ادارے چل رہے ہوتے ہیں۔ اس کی بنیاد پر ان کا پورا قومی ڈھانچہ کھڑا ہوا ہوتا ہے۔ اس کو لمبی روایات کے نتیجہ میں عظمت کا سب سے اونچا مقام مل چکا ہوتا ہے۔

ان قوموں کے پاس ایک طرف ان کا یہ مسلّمہ مذہب تھا، جو شرک کی بنیاد پر قائم تھا۔ دوسری طرف پیغمبر ایک ایسی توحید کی آواز بلند کرتا جو وقت کے ماحول میں اجنبی ہوتی تھی۔ اس کا داعیٔ حق ہونا ایک ایسے

دعوے کی حیثیت رکھتا تھا جس کی پشت پر ابھی تاریخ کی تصدیقات جمع نہیں ہوئی ہیں۔ اس کے پاس اپنی نبوت کو ثابت کرنے کے لئے لفظی دلیل کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اس تقابل میں انھیں وقت کا پیغمبر واضح طور پر حقیر نظر آتا اور ان کا اپنا آبائی مذہب واضح طور پر عظیم۔ حضرت مسیح بے گھر تھے اور درخت کے نیچے سوتے تھے۔ دوسری طرف یہودیوں کا مذہبی سردار ہیکل کی عظیم عمارت میں جلوہ افروز تھا۔ پھر ہیکل کے صدر نشین کے مقابلہ میں درخت کے نیچے سونے والا لوگوں کو زیادہ برسرِ حق کیسے نظر آتا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ قومیں اپنے معاصر پیغمبروں کو استہزار کا موضوع بناتی رہیں۔ اس استہزار پر جو چیز انھیں آمادہ کرتی وہ ان کا یہ احساس تھا کہ ہم تو مسلّمہ اکابر کا دامن تھامے ہوئے ہیں، پھر ان کے مقابلہ میں اس معمولی آدمی کی کیا حیثیت۔ اکابر کی اس فہرست میں اگرچہ قدیم انبیار تک ہوتے تھے۔ مگر ان انبیار کی حیثیت عملاً ان کے یہاں ایک قسم کے قومی ہیرو کی تھی نہ کہ فی الواقع داعیٔ حق کی۔

اعلار کلمۃ اللہ

آپ نے دیکھا ہوگا کہ سڑکوں کے چوراہے پر کھمبا لگا ہوتا ہے جس میں ہری اور لال روشنیاں ہوتی ہیں۔ جس رخ پر ہری روشنی ہو ادھر سواریوں کو جانے کی اجازت ہوتی ہے۔ اور جس رخ پر لال روشنی ہو رہی ہو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ادھر سواریاں نہ جائیں۔ اگر کوئی سواری اس نشان دہی کی خلاف ورزی کرے تو وہ ٹریفک قوانین کے مطابق قابل سزا قرار پاتی ہے۔

داعیٔ حق کی حیثیت اصلاً اسی قسم کے رہنما کھمبا کی ہے۔ وہ خدا کی طرف سے مقرر کیا جاتا ہے کہ زندگی کے راستوں پر کھڑا ہو کر لوگوں کو بتائے کہ وہ کدھر جائیں اور کدھر نہ جائیں۔ کون سا راستہ جنت کی طرف جا رہا ہے اور کون سا جہنم کی طرف۔ (وکذلک جعلناکم امۃ وسطاً لتکونوا شہداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شہیدا)

ابتدائی دور توحید کے بعد غلبۂ شرک کے زمانے میں خدا کی طرف سے جو رسول آئے وہ اسی خاص مقصد کے لئے آئے۔ ان کو خدا نے حقیقت کا صحیح علم دے کر کھڑا کیا کہ وہ قوموں کی رہنمائی کریں اور ان کو یہ بتائیں کہ کہ دنیا کی زندگی میں ان کے لئے صحیح کیا ہے اور غلط کیا۔ ہر نبی نے اپنی اس ذمہ داری کو پوری طرح انجام دیا۔ انھوں نے ان کی قابلِ فہم زبان میں دلائل کی پوری قوت کے ساتھ لوگوں کے سامنے حق کو پیش کیا اور مسلسل اتنی وضاحت کی کہ ان کے مخاطبین کے سامنے اتمام حجت کی حد تک خدا کا پیغام پہنچ گیا پھر جس نے رسول کا ساتھ دیا وہ خدا کے نزدیک جنتی ٹھہرا۔ جس نے رسول کو نہ مانا وہ سرکش اور باغی قرار دے کر جہنم میں ڈال دیا گیا۔

تاہم اللہ تعالیٰ کو حق کے اعلان کے ساتھ یہ بھی مطلوب تھا کہ دوبارہ حق کا اظہار ہو۔ حق کا اعلان تو یہ ہے

کہ لوگوں کو حق کے بارے میں پوری طرح بتا دیا جائے۔ خیر خواہی اور حکمت کے تمام تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے بات کو اس طرح کھول دیا جائے کہ سننے والوں کے لئے یہ کہنے کی گنجائش نہ رہے کہ ہم اس سے بے خبر تھے۔ ہم یہ جانتے ہی نہ تھے کہ زندگی میں کیا صحیح ہے اور کیا غلط۔ اسی کا نام اتمام حجت ہے۔

اظہار اس سے آگے کی چیز ہے۔ اظہار کا مطلب یہ ہے کہ دینی فکر دنیا کا غالب فکر بن جائے۔ اس کے مقابلہ میں دوسرے افکار پست اور مغلوب ہو کر رہ جائیں۔ اس کو دوسرے لفظوں میں اعلاء کلمۃ اللہ کہا گیا ہے۔ اظہار دین یا اعلاء کلمۃ اللہ سے مراد اصلاً حدود و قوانین کا نفاذ نہیں ہے بلکہ اس سے مراد فکری غلبہ ہے۔ یعنی اسی قسم کا غلبہ جیسا غلبہ موجودہ زمانہ میں جدید علوم کو قدیم روایتی علوم پر حاصل ہوا ہے۔ مثلاً سرمایہ داری پر سوشلزم کا فکری غلبہ، شہنشاہیت پر جمہوریت کا فکری غلبہ اور قیاسی فلسفہ پر تجرباتی سائنس کا فکری غلبہ۔ جدید سائنسی دنیا میں بعض علوم نے غالب علم کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ اور بعض دوسرے علوم نے ان کے مقابلہ میں اپنی برتری کھو دی ہے۔ اسی قسم کا غلبہ دین حق کا بھی دین باطل کے اوپر مطلوب ہے۔

خدا قادر مطلق ہے۔ اس کے لئے بہت آسان تھا کہ وہ حق کو دوسری باتوں پر فائق و برتر کر دے جس طرح اس نے سورج کی روشنی کو دوسری تمام زمینی روشنیوں پر فائق کر رکھا ہے۔ مگر موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں خدا اپنے مطلوب واقعات کو اسباب کے روپ میں ظاہر کرتا ہے نہ کہ معجزات کے روپ میں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کیا کہ اسباب کے دائرہ میں اس مقصد کے لئے تمام ضروری حالات پیدا کئے جائیں اور اس کے بعد ایک ایسا پیغمبر بھیجا جائے جس کو خصوصی طور پر غلبہ کی نسبت دی گئی ہو۔ وہ اپنے آپ کو خدا کے منصوبہ میں شامل کر کے نہ صرف حق کا اعلان کرے بلکہ حق کا اظہار بھی کر دے تاکہ خدا کے بندوں پر خدا کی نعمت کا اتمام ہو اور ان پر ان برکتوں کے دروازے کھلیں جو ان کی نادانی سے ان کے اوپر بند پڑے ہوئے ہیں۔ یہی وہ بات ہے جو قرآن کی ان آیتوں میں کہی گئی ہے :

یریدون لیطفئوا نور اللہِ بافواھھم واللہ متمُّ نورہٖ ولو کرہَ الکٰفرون ○ ھوَ الذی ارسل رسولہٗ بالھدیٰ ودین الحقّ لیظھرہ علی الدین کلہٖ ولو کرہَ المشرکون ○

الصف ۸ - ۹

وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں اور اللہ اپنے نور کو پورا کر کے رہے گا خواہ وہ منکروں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔ وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اس کو تمام دین پر غالب کر دے خواہ وہ مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار ہو

ایک نئی قوم برپا کرنا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انا دعوۃ ابراھیم (میں ابراہیم کی دعا ہوں) حضرت ابراہیمؑ

نے کعبہ کی تعمیر کے وقت یہ دعا کی تھی کہ اے خدا تو میرے لڑکے اسمٰعیل کی اولاد میں ایک نبی پیدا کر (البقرہ ۱۲۹
تاہم حضرت ابراہیم کی دعا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کے درمیان تقریباً ڈھائی ہزار سال کا
فاصلہ ہے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ حضرت زکریا نے اپنی اولاد میں ایک پیغمبر پیدا کئے جانے کی دعا کی تو ایک
سال کے اندر ہی آپ کے یہاں حضرت یحیٰی پیدا ہو گئے (آل عمران ۳۹) اور حضرت ابراہیم نے اسی قسم کی دعا
فرمائی تو اس کی عملی قبولیت میں ڈھائی ہزار سال لگ گئے۔ اس فرق کی وجہ کیا تھی۔

اس فرق کی وجہ یہ تھی کہ حضرت یحیٰی کو ایک وقتی کردار ادا کرنا تھا۔ آپ اس لئے بھیجے گئے کہ یہود کے
دینی بھرم کو کھولیں اور بالآخر ان کے ہاتھوں قتل ہو کر یہ ثابت کریں کہ یہود اب اتنا بگڑ چکے ہیں کہ انھیں معزول
کر دیا جائے اور ان کی جگہ دوسری قوم کو کتاب الٰہی کا حامل بنایا جائے۔ اس کے مقابلہ میں پیغمبر اسلام کے ذمہ
یہ کام تھا کہ وہ شرک کو مغلوب کر کے توحید کو غالب فکر کی حیثیت دے دیں۔ اس کام کو اسباب کے ڈھانچہ
میں انجام دینے کے لئے ایک نئی صالح قوم اور موافق حالات درکار تھے۔ یہی وہ قوم اور یہی وہ حالات ہیں
جن کو وجود میں لانے کے لئے ڈھائی ہزار سال لگ گئے۔

اس منصوبہ کے تحت حضرت ابراہیمؑ کو حکم ہوا کہ وہ عراق کے متمدن علاقہ سے نکلیں اور حجاز کے خشک اور
غیر آباد مقام پر اپنی بیوی ہاجرہ اور اپنے بیٹے اسماعیل کو لاکر بسا دیں (ابراہیم ۳۷) یہ مقام اس وقت وادیٔ
غیر ذی زرع ہونے کی وجہ سے دنیا سے الگ تھلگ تھا۔ یہاں تمدنی آلائشوں سے دور رہ کر خالص فطرت کی
آغوش میں ایک ایسی قوم کی تعمیر کی جا سکتی تھی جس کے اندر خدا کی پیدا کی ہوئی فطری صلاحیتیں محفوظ ہوں۔
(ربنا واجعلنا مسلمین لک ومن ذریتنا امۃ مسلمۃ لک، البقرہ ۱۲۸) قبولیت دعا میں ڈھائی ہزار
سالہ تاخیر کا واضح مطلب یہ تھا کہ مخصوص ماحول میں توالد و تناسل کے ذریعہ وہ جاندار قوم وجود میں آئے جو
خدا کے دین کی سچی حامل بن سکے۔ جو پورے معنوں میں ایک جان دار قوم ہو اور ان تمام مصنوعی کمیوں سے
پاک ہو جن کی وجہ سے دور اول میں خدا کے دین کے اظہار کے لئے کار آمد آدمی نہ مل سکے۔ جب منصوبہ کے
مطابق مکمل اسٹیج تیار ہو گیا اس وقت بنو ہاشم کے یہاں آمنہ بنت وہب کے پیٹ سے وہ پیغمبر غلبہ پیدا
کر دیا گیا جس کی دعا حضرت ابراہیم کی زبان پر جاری ہوئی تھی۔

حضرت ابراہیم نے خدا کے حکم سے ہاجرہ اور اسمٰعیل کو موجودہ مکہ کے مقام پر لاکر بسا دیا جہاں اس
وقت سوکھی زمین اور خشک پتھروں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ جب مشک کا پانی ختم ہو گیا اور اسماعیل پیاس کی
شدت سے ہاتھ پاؤں مارنے لگے تو خشک بیابان میں زمزم کا چشمہ نکل آیا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ خدا نے
اگرچہ تم کو بڑے سخت محاذ پر کھڑا کیا ہے مگر وہ ایسا نہیں کرے گا کہ تم کو بے سہارا چھوڑ دے۔ تمہارا معاملہ خدا

کا معاملہ ہے اور خدا ہر نازک موڑ پر تمھاری مدد کے لئے موجود رہے گا۔ اسماعیل جب نوجوانی کی عمر کو پہنچے تو حضرت ابراہیمؑ نے خواب دیکھا کہ وہ اپنے بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں۔ اس خواب کو انھوں نے حکم خداوندی سمجھا اور بیٹے کو ذبح کرنے کے لئے تیار ہو گئے مگر عین اس وقت جب کہ ان کی چھری اسماعیل کے گلے پر پہنچ چکی تھی خدا نے آواز دے کر انھیں روک دیا اور اس کے بدلے انھیں ایک مینڈھا دیا جس کو وہ خدا کے نام پر ذبح کریں۔ یہ اس بات کا مظاہرہ تھا کہ تم سے اگرچہ ہم نے بہت بڑی قربانی مانگی ہے مگر یہ صرف جذبہ کا امتحان ہے۔ قربانی پیش تو کرنا ہوگا مگر ابھی قربان ہونے کی نوبت نہیں آئے گی کہ خدا تمھیں بچالے گا کیونکہ اصل مقصد تم کو ایک بڑے کام کے لئے استعمال کرنا ہے نہ کہ خواہ مخواہ ہلاک کر دینا۔

حضرت اسماعیل بڑے ہوئے تو انھوں نے قبیلۂ جرہم کی ایک لڑکی سے شادی کر لی جو زمزم نکلنے کے بعد آکر مکہ میں آباد ہو گیا تھا۔ حضرت ابراہیم جو اس وقت شام میں تھے، ایک روز گھوڑے پر سوار ہو کر آئے اس وقت گھر پر اسماعیل نہ تھے، صرف ان کی بیوی موجود تھیں جو اپنے خسر کو پہچانتی نہ تھیں، حضرت ابراہیم نے پوچھا کہ اسماعیل کہاں گئے ہیں، بیوی نے کہا کہ شکار کرنے کے لئے۔ پھر پوچھا کہ تم لوگوں کی گزر کیسی ہوتی ہے۔ بیوی نے معاشی تنگی اور گھر کی ویرانی کی شکایت کی، اس کے بعد حضرت ابراہیم واپس چلے گئے اور خاتون سے کہا کہ جب اسماعیل آئیں تو ان سے میرا سلام کہنا اور یہ پیغام پہنچا دینا کہ اپنی چوکھٹ کو بدل دو (غیر عتبۃ بابك) حضرت اسماعیل نے واپسی کے بعد جب پورا واقعہ سنا تو انھوں نے سمجھ لیا کہ یہ میرے باپ تھے جو ہمارا حال دیکھنے آئے تھے اور "چوکھٹ بدل دو" کا مطلب استعارے کی زبان میں یہ ہے کہ اس بیوی کو چھوڑ کر دوسری بیوی کر و، کیونکہ وہ اس نسل کو پیدا کرنے کے لئے موزوں نہیں جس کا منصوبہ خدا نے بنایا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اس بیوی کو طلاق دے دی اور دوسری عورت سے شادی کر لی۔ اس کے کچھ دن بعد حضرت ابراہیم دوبارہ گھوڑے پر سوار ہو کر آئے، اب بھی اسماعیل گھر پر موجود نہ ملے۔ حضرت ابراہیم نے دوسری بیوی سے بھی وہی سوال کیا جو انھوں نے پہلی بیوی سے کیا تھا۔ اس بیوی نے اسماعیل کی تعریف کی اور کہا کہ جو کچھ ہے بہت اچھا ہے، سب خدا کا شکر ہے، اس کے بعد حضرت ابراہیم یہ کہہ کر واپس چلے گئے کہ اسماعیل آئیں تو ان کو میرا سلام کہنا اور یہ پیغام پہنچا دینا کہ چوکھٹ کو قائم رکھو (ثبت عتبۃ بابك) یعنی تمھاری یہ بیوی پیش نظر منصوبہ کے لئے بالکل ٹھیک ہے، اس کے ساتھ اپنا تعلق باقی رکھو (تفسیر ابن کثیر)

اس طرح عرب کے الگ تھلگ علاقے میں اسماعیل کے ابتدائی خاندان سے ایک نئی نسل بننا شروع ہوئی جس نے بالآخر اس جاندار قوم (بنو اسماعیل) کی صورت اختیار کی جو نبی آخر الزماں کا گہوارہ بن سکے اور تاریخ کی اس عظیم ترین ذمہ داری کو سنبھالے جو خدا اس کے سپرد کرنا چاہتا تھا۔

یہ قوم جو عرب کے صحراؤں اور چٹیل بیابانوں میں تیار ہوئی، اس کی خصوصیات کو ایک لفظ میں المروۃ کہا جاسکتا ہے۔ المروۃ کے لفظی معنی ہیں مردانگی۔ یہ عربوں کے یہاں کسی کے جوہر انسانیت کو بتانے کے لئے سب سے اونچا لفظ سمجھا جاتا تھا۔ قدیم عربی شاعر کہتا ہے:

اذا المرء اعیته المروۃ ناشئا　　فمطلبہا کھلا علیہ شدید

(آدمی اگر اٹھتی جوانی میں مردانگی کا مقام حاصل کرنے سے عاجز رہ جائے تو بڑھاپے میں اس کو حاصل کرنا بہت مشکل ہے)

پروفیسر فلپ ہٹی نے عرب تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ عرب کے بیابانوں میں صدیوں کے عمل سے جو قوم تیار ہوئی وہ دنیا کی ایک نرالی قوم تھی جو مندرجہ ذیل اخلاقی صفات میں کمال درجہ رکھتی تھی:

> Courage, endurance in time of trouble (sabr) observance of the rights and obligations of neighbourliness (jiwar) manliness (muruah) generosity and hospitality, regard for women and fulfilment of solemn promises. (P. 253)

ہمت، مشکل کے وقت برداشت، پڑوسی کے حقوق اور ذمہ داریوں کی ادائگی، مردانگی، فیاضی اور مہمان نوازی، عورتوں کی عزت اور وعدہ کرلینے کے بعد اسے پورا کرنا۔

خیر امت

اس طرح ڈھائی ہزار سالہ عمل کے ذریعہ ایک ایسی قوم نکالی گئی جو اپنے انسانی اوصاف کے اعتبار سے تمام قوموں میں سب سے بہتر تھی (کنتم خیر امۃ اخرجت للناس، آل عمران ۱۱۰) حضرت عبداللہ بن عباس نے خیر امت سے مہاجرین کا گروہ مراد لیا ہے (ھم الذین ھاجروا مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من مکۃ الی المدینۃ، تفسیر ابن کثیر) مہاجرین دراصل اس گروہ کی علامت تھے۔ باعتبار حقیقت اس سے وہ پورا عرب گروہ مراد ہے جس کو اصحاب رسول کہا جاتا ہے۔

پیغمبروں کو ہر زمانہ میں ایک ہی سب سے بڑی رکاوٹ پیش آئی ہے۔ ان کی مخاطب قوموں کے پاس جو آبائی دین ہوتا تھا اس کے ساتھ مادی رونقیں اور در و دیوار کی عظمتیں شامل ہوتی تھیں۔ دوسری طرف وقت کا پیغمبر دلیل مجرد کی سطح پر کھڑا ہوتا تھا۔ عرب میں جو قوم تیار ہوئی اس کے اندر یہ انوکھی صفت تھی کہ وہ حق کو دلیل مجرد کی سطح پر پاسکے۔ وہ اپنے آپ کو ایک ایسے حق کے حوالے کردے جس نے ابھی ظواہر کا روپ اختیار نہیں کیا ہے۔ کھلے آسمان اور وسیع صحراؤں کے درمیان جو قوم تیار ہوئی وہ حیرت انگیز طور پر اپنے اندر یہ صلاحیت رکھتی تھی کہ حقیقت کو اس کے بے آمیز روپ میں دیکھ سکے، وہ ایک ایسے حق کے لئے اپنا سب کچھ سونپ دے جس سے بظاہر دنیا میں کچھ بھی ملنے والا نہیں۔ اصحاب رسول کی اس خصوصیت کو حضرت عبداللہ بن مسعود نے تین

لفظوں میں اس طرح ادا کیا ہے: وہ اس امت کے سب سے افضل لوگ تھے۔ وہ سب سے زیادہ نیک دل، سب سے زیادہ گہرا علم رکھنے والے اور سب سے کم تکلف والے تھے۔ اللہ نے ان کو اپنے نبی کی صحبت اور دین کے قیام کے لئے چن لیا تھا (کانوا افضل هذه الامة ابرّها قلوبا واعمقها علما واقلها تکلفا اختارهم الله لصحبة نبيه ولاقامة دينه)

دور شرک میں انسان سے سب سے اہم صفت جو کھوئی گئی تھی، وہ تھی ——— حقیقت کو مجرد سطح پر دیکھنے کی صلاحیت۔ اب انسان حقیقت کو محسوسات اور مظاہر کی سطح پر دیکھتا تھا، وہ حقیقت کو مجرد سطح پر دیکھنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکا تھا۔ یہی اصل رکاوٹ تھی جس کی وجہ سے پچھلے زمانے میں نبیوں کا مذاق اڑایا جاتا رہا۔

وہ خدا کے منکر نہ تھے مگر انھوں نے خدا کو محسوسات کے پیکر میں ڈھال لیا تھا۔ وہ غیب میں چھپے ہوئے خدا کو سمجھ نہیں پاتے تھے۔ اس لئے انھوں نے نظر آنے والی چیزوں کو خدائی کا پیکر فرض کرکے ان کو اپنا مرکز توجہ بنا لیا تھا، خواہ یہ مادی بڑائیاں ہوں یا انسانی بڑائیاں۔ ان کی یہی کمزوری پیغمبر کی پیغمبری پر یقین کرنے میں مانع تھی۔ ہر پیغمبر جب آتا ہے تو اپنے زمانہ کے لوگوں کے لئے وہ محض ایک انسان ہوتا ہے۔ ابھی اس کے نام کے ساتھ وہ تاریخی بڑائیاں شامل نہیں ہوتیں جو بعد کے دور میں اس کے ساتھ شامل ہو جاتی ہیں۔

حضرت ابراہیم نے اپنی دعا میں فرمایا تھا: اے میرے رب، اس شہر (مکہ) کو تو امن والا شہر بنا دے اور مجھ کو اور میری اولاد کو اس سے دور رکھ کہ ہم بتوں کو پوجیں۔ اے میرے رب، ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا۔ پس جس نے میری پیروی کی وہ میرا ہے اور جس نے میرا کہا نہ مانا تو تو بخشنے والا مہربان ہے۔ اے میرے رب، میں نے اپنی اولاد کو ایک ایسے میدان میں بسایا ہے جہاں کھیتی نہیں، تیرے محترم گھر کے پاس، اے ہمارے رب تاکہ وہ نماز قائم کریں (ابراہیم ۳۷-۳۵)

حضرت ابراہیم کے زمانہ میں شرک کا غلبہ اپنے عروج پر پہنچ چکا تھا۔ عالی شان بت خانے ہر طرف قائم تھے۔ انسان کے لئے بظاہر ناممکن ہو گیا تھا کہ وہ اس سے ہٹ کر سوچ سکے۔ اس وقت اللہ کے حکم سے حضرت ابراہیم نے ایک چٹیل زمین میں ایک نئی نسل پیدا کرنے کا منصوبہ بنایا۔ یہ ایک محفوظ علاقہ میں ایسے افراد تیار کرنے کا منصوبہ تھا جو ظواہر سے اوپر اٹھ کر حقائق کا پرستار بن سکے۔ چنانچہ اسی انسانی مادہ سے وہ قوم بنی جس کے متعلق قرآن میں یہ الفاظ آئے ہیں:

ولكن الله حبب اليكم الايمان وزينه في قلوبكم	مگر اللہ نے ایمان کو تمھارے لئے محبوب بنا دیا اور اس کو تمھارے دلوں میں مزین کر دیا اور تمھارے لئے کفر
وكره اليكم الكفر والفسوق والعصيان	

اولئک ھم الراشدون (الحجرات ۷) اور فسق اور نا فرمانی کو قابل نفرت بنا دیا۔ یہی لوگ راہ راست والے ہیں۔

اس آیت کو ہم اس وقت سمجھ سکتے ہیں جب کہ اس کو ڈیڑھ ہزار سال پہلے کے حالات میں رکھ کر دیکھیں جب کہ اصحاب رسول کے ایمان کا واقعہ پیش آیا۔ انھوں نے دکھائی دینے والے خداؤں کے ہجوم میں دکھائی نہ دینے والے خدا کو پایا اور اس کو اپنا سب کچھ بنا لیا۔ عظمت کے مناروں کے درمیان انھوں نے عظمتوں سے خالی پیغمبر کو پہچانا اور اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیا۔ ایک دین غریب (اجنبی دین) اپنی ساری بے سر و سامانی کے باوجود ان کی نظر میں اتنا محبوب ہو گیا کہ اس کی خاطر کوئی بھی قربانی کرنا ان کے لئے مشکل نہ رہا۔ خلاصہ یہ کہ انھوں نے ایک ایسی سچائی کو دیکھ لیا جو ابھی مجرد روپ میں تھی۔ جس کی پشت پر تاریخ کی تصدیقات ابھی جمع نہیں ہوئی تھیں۔ جو ابھی قومی فخر کا نشان نہیں بنا تھا۔ جس میں اپنا سب کچھ دے دینا تھا۔ مگر دنیا میں اس کے بدلے کچھ بھی پانا نہ تھا۔

اس معاملہ کی ایک نمائندہ مثال وہ ہے جو ہجرت سے پہلے بیعت عقبہ ثانیہ کے وقت پیش آئی۔ عین اس زمانہ میں جب کہ مکہ میں اسلام کے حالات بے حد تنگ ہو چکے تھے، مدینہ میں کچھ مسلمانوں کی تبلیغ سے اسلام پھیلنے لگا۔ حتیٰ کہ ہر گھر میں داخل ہو گیا۔ اس وقت مدینہ کے کچھ لوگوں نے طے کیا کہ وہ مکہ جا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر نصرت کی بیعت کریں اور آپ کو مکہ چھوڑ کر مدینہ آنے کی دعوت دیں۔ حضرت جابر انصاری کہتے ہیں کہ جب مدینہ کے گھر گھر میں اسلام پہنچ گیا تو ہم نے مشورہ کیا کہ آخر کب تک ہم اللہ کے رسول کو اس حال میں چھوڑے رکھیں کہ آپ مکہ کے پہاڑوں میں پریشان اور ڈرے سہمے پھرتے رہیں (ثم ائتمروا جمیعا فقلنا حتی متی نترک رسول اللہ یطوف و یطرد فی جبال مکۃ و یخاف) رسول اللہ کا بے یار و مددگار ہونا ظاہر بینوں کے لئے اس بات کا ثبوت تھا کہ آپ اللہ کے رسول ہی نہیں۔ اگر اللہ کے رسول ہوتے تو آپ کی یہ حالت کیوں ہوتی۔ مگر اہل مدینہ نے آپ کے معاملہ کو حقیقت کی نظر سے دیکھا۔ انھوں نے یہ راز پالیا کہ آپ کا معاملہ ایک خدائی معاملہ ہے اور آپ کی مدد کر کے وہ خدا کی رحمتوں اور برکتوں کے مستحق بن سکتے ہیں۔

بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر مدینہ کے ستر سے کچھ اوپر نمائندوں نے مکہ آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی۔ یہ بیعت کیسے نازک حالات میں ہوئی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس وفد کے ایک رکن کعب بن مالک انصاری کہتے ہیں کہ ہم مدینہ سے مکہ کے لئے اس طرح روانہ ہوئے کہ ہمارا قبیلہ جو حسب معمول زیارت کعبہ کے لئے جا رہا تھا اس کے ساتھ خاموشی سے حج کے نام پر شریک ہو گئے۔ مکہ کے قریب قبیلہ والوں نے پڑاؤ ڈالا۔ رات کے وقت ہم دوسروں کی طرح ان کے ساتھ سو گئے۔ یہاں تک کہ جب رات کا تہائی

حصہ گزر گیا تو ہم رسول اللہ کی قرار داد کے مطابق اپنے بستروں سے خاموشی کے ساتھ اٹھے، اور مقام دعود کی طرف اس طرح چلے جیسے چڑیا جھاڑیوں میں آہستہ آہستہ چھپتی ہوئی چلتی ہے (نتسلل تسلل القطا مستخفین، سیرۃ ابن ہشام، جزء ثانی، صفحہ ۴۹)

وہ لمحہ بھی کیسا عجیب تھا جب کہ ایک دنیا پیغمبر کو رد کر چکی تھی، اس وقت کچھ لوگ اس کو قبول کرنے کے لئے سبقت کر رہے تھے، یہ وہ وقت تھا کہ پیغمبر سے ان کا وطن چھینا جا چکا تھا۔ طائف سے انھیں پتھر مار کر بھگا دیا گیا تھا۔ تمام قبائل نے آپ کو پناہ میں لینے سے انکار کر دیا تھا۔ ایسے نازک وقت میں مدینہ کے لوگوں نے آپ کی صداقت کو پہچانا اور آپ کی پکار پر لبیک کہا۔ اس وقت جب کہ انصار مدینہ بیعت کے لئے بڑھے، ایک شخص نے اٹھ کر کہا، کیا تم جانتے ہو کہ تم کس چیز پر بیعت کر رہے ہو۔ یہ اپنے اموال اور اپنی اولاد کو ہلاک کرنے پر بیعت کرنا ہے۔ انھوں نے کہا ہاں۔ ہم علی نہکۃ الاموال والاولاد بیعت کر رہے ہیں پھر انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اگر ہم نے اس عہد بیعت کو آخر تک پورا کر دیا تو ہمارے لئے کیا ہے۔ آپ نے فرمایا جنت۔ انھوں نے کہا، اپنا ہاتھ لائیے، ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں ——

اپنے آپ کو اس طرح ایک متنازعہ صداقت کے حوالے کرنا، اپنا سب کچھ اس طرح ایک غیر قائم شدہ حق کو سونپ دینا اتنا انوکھا واقعہ ہے کہ وہ اجتماعی سطح پر تاریخ میں صرف ایک ہی بار پیش آیا ہے، نہ اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد۔

غیر متعلق مسائل سے تعرض نہ کرنا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے تو عرب میں وہ تمام مسائل پوری طرح موجود تھے جن کو موجودہ زمانہ میں قومی مسائل کہا جاتا ہے اور جن مسائل کے نام پر عام طور پر دنیا میں تحریکیں اٹھتی ہیں۔ یہ مسائل ذہین افراد کو متاثر کرتے ہیں اور وہ ان کا نعرہ لے کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہ تمام مسائل موجود تھے لیکن آپ نے ان سے مطلق تعرض نہیں کیا۔ اگر آپ ان مسائل میں الجھتے تو یہ خدا کے منصوبہ میں اپنے کو شامل کرنا نہ ہوتا۔ وہ سارے مواقع جو ڈھائی ہزار سالہ عمل کے نتیجہ میں پیدا کئے گئے تھے برباد ہو کر رہ جاتے۔

۱۔ حبش نے ۵۲۵ء میں عرب کے سرحدی علاقہ یمن پر قبضہ کر لیا تھا۔ ابرہہ اس زمانہ میں شاہ حبش کی طرف سے یمن کا گورنر تھا۔ ابرہہ کے حوصلے اتنے بڑھے ہوئے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کے سال (۵۷۰ء) میں اس نے ہاتھیوں کی فوج سے مکہ پر حملہ کیا تاکہ کعبہ کو ڈھا دے اور مکہ کی مرکزی حیثیت کو ختم کر دے۔ ۵۰ سالہ قبضہ کے بعد یمن پر حبش کی حکومت ختم ہوئی اور اس پر شاہ فارس کی حکومت

قائم ہوگئی جس کی طرف سے باذان یمن کا گورنر مقرر ہوا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی، اور اس کی خبر کسریٰ (شاہ فارس) کو پہنچی تو اس نے باذان کو لکھا کہ اس آدمی کے پاس جاؤ جو نبوت کا دعویٰ کرتا ہے اور اس سے کہو کہ وہ اس دعوی سے باز آئے۔ اگر وہ باز نہ آئے تو اس کا سر کاٹ کر میرے پاس بھیجو (والا فابعث الیّ براسه، سیرۃ ابن ہشام)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب عرب میں ظاہر ہوئے تو اس وقت عرب کی سرحدوں پر غیر ملکی قبضہ نے کیسے سنگین مسائل پیدا کر رکھے تھے۔ ان حالات میں ایک صورت یہ تھی کہ آپ اپنے ہم قوموں کو غیر ملکی قبضہ کے خلاف اکساتے اور اس کے خلاف جنگ چھیڑ دیتے۔ اگر آپ ایسا کرتے تو یہ خدا کے منصوبے سے انحراف کے ہم معنی ہوتا۔ کیونکہ خدا کا منصوبہ تو یہ تھا کہ لوگوں سے غیر متعلق امور پر ٹکراؤ نہ کیا جائے بلکہ خاموشی سے دعوت الی اللہ کا کام جاری رکھا جائے۔ چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا اور تاریخ نے دیکھا کہ بالآخر خود باذان نے اسلام قبول کر لیا اور یمن کے عیسائی باشندوں کی اکثریت نے بھی ———— جو مقصد ایک قومی لیڈر ناکام طور پر سیاسی کارروائیوں کے ذریعہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا وہ آپ نے کامیاب طور پر دعوتی کارروائی کے ذریعہ حاصل کر لیا۔

۲۔ ابوطالب کی وفات کے بعد قبائلی رسم کے مطابق بنو ہاشم کا سردار ابولہب مقرر ہوا۔ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی حمایت میں لینے سے انکار کر دیا۔ اب آپ کو کسی دوسرے حمایتی قبیلہ کی ضرورت پیش آئی۔ آپ حمایتی کی تلاش میں مختلف قبائل کے پاس گئے۔ عرب کا ایک سرحدی قبیلہ بنو شیبان بن ثعلبہ تھا۔ آپ اس سے ملے تو قبیلہ کے سردار مثنیٰ بن حارثہ نے کہا کہ ہم کسریٰ (شاہ فارس) کی مملکت کے قریب رہتے ہیں۔ وہاں ہم ایک معاہدہ کے تحت مقیم ہیں جو کسریٰ نے ہم سے لیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہم کوئی نئی بات نہ کریں گے اور نہ کسی نئی بات کرنے والے کو پناہ دیں گے۔ اور شاید بادشاہوں کو وہ بات ناپسند ہو جس کی طرف آپ بلاتے ہیں (ان لا نحدث حدثا ولا نؤوی محدثا۔ ولعل هذا الامر الذی تدعوا الیه تکرهه الملوك، سیرۃ ابن کثیر)

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اطراف عرب میں بیرونی سلطنتوں کے نفوذ نے جو مسائل پیدا کئے تھے وہ صرف سیاسی یا ملکی ہی نہ تھے بلکہ دعوت و تبلیغ کے معاملہ تک بھی پہنچ گئے تھے۔ اس کے باوجود آپ نے ایسا نہیں کیا کہ یہ کہہ کر پہلے مرحلہ ہی میں ان سے لڑائی چھیڑ دیں کہ جب تک یہ خارجی رکاوٹیں دور نہ ہوں کوئی دعوتی کام نہیں کیا جا سکتا۔ اگر آپ اول مرحلہ میں ان خارجی طاقتوں سے لڑ جاتے تو یہ خدائی منصوبہ کے خلاف ہوتا۔ کیونکہ خدائی منصوبہ تو یہ تھا کہ روم و فارس کو آپس میں بیس سال تک لڑا کر بالکل کمزور کر دیا

جائے اور پھر خود انھیں پر جارحیت کا الزام ڈال کر مسلمانوں کے لئے ان کو فتح کرنا آسان بنا دیا جائے۔ اگر مسلمان ابتدائی مرحلہ میں روم و فارس سے لڑ جاتے تو وہ نتیجہ بالکل برعکس صورت میں نکلتا جو بعد کے تصادم کے ذریعہ حیرت انگیز غیر ملکی فتوحات کی صورت میں برآمد ہوا۔

خدائی منصوبہ سے مطابقت

کسان کا معاملہ قدرت کے کاگ (دندانہ) میں اپنا کاگ دینے کا معاملہ ہے۔ خدا نے ہماری زمین پر فصل اگانے کے بہترین امکانات پیدا کئے ہیں۔ مگر ان امکانات کو اپنے حق میں واقعہ بنانے کے لئے کسان کو ایک حصہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر زمین کی سطح پر زرخیز مٹی (Soil) کی تہ رکھی گئی ہے جو معلوم کائنات میں کسی بھی دوسرے مقام پر نہیں۔ مگر تمام زرخیزی کے باوجود اس مٹی سے فصل اسی وقت اگتی ہے جب کہ اس میں نمی بھی ہو۔ اس نمی کے نہ ہونے کی وجہ سے خشک علاقوں کے صحرا چٹیل بیابان بن کر رہ گئے ہیں، اس حقیقت کو قدرت لاؤڈ اسپیکر پر اعلان کر کے نہیں بتاتی بلکہ خاموش اشارہ کی زبان میں بتاتی ہے۔ کسان کو اسے خاموش اشارہ کی زبان میں جاننا پڑتا ہے۔ چنانچہ کسان یہ کرتا ہے کہ وہ یا تو بارش سے نم ہونے والی زمین میں اپنی فصل بوتا ہے یا آب پاشی کے ذریعہ پہلے اس میں نمی پہنچاتا ہے، پھر اپنا دانہ اس میں ڈالتا ہے۔ یہی معاملہ داعی کا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے عرب میں اگرچہ بہترین حالات پیدا کر دئے گئے تھے اس کے باوجود ضروری تھا کہ آپ ربانی حکمت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے کام کو آگے بڑھائیں۔ اگر آپ کا منصوبہ خدائی منصوبہ کی رعایت کے بغیر چلتا تو آپ کو کبھی وہ کامیابی حاصل نہ ہوتی جو عملاً آپ کو حاصل ہوئی۔

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا بنیادی اصول یہ تھا کہ دعوتی عمل میں ساری اہمیت مسئلہ آخرت کو دی جائے۔ مسئلہ دنیا کو کسی بھی حال میں دعوت کا اشو نہ بنایا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہی مسئلہ انسان کا ابدی اور حقیقی مسئلہ ہے۔ دوسرے تمام مسائل وقتی اور اضافی مسئلے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آخرت کے بغیر انسان کی کامیابی بھی اتنی ہی بے معنی ہے جتنی کہ اس کی ناکامی بے معنی۔

دوسری بات یہ کہ انسانی زندگی میں ہر قسم کی کامیابی کا تعلق افراد کے کردار سے ہے۔ اور انسان کے اندر حقیقی اور مستقل کردار صرف آخرت پر گہرے یقین ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ عقیدۂ آخرت کا مطلب یہ ہے کہ انسان آزاد اور خود مختار نہیں ہے، بلکہ وہ ہر آن خدا کی پکڑ میں ہے۔ یہ عقیدہ آدمی سے بے راہ روی کا مزاج چھین لیتا ہے اور اس کو پابند اور ذمہ دار انسان بنا دیتا ہے ——— قرآن و حدیث کو اگر خالی الذہن ہو کر پڑھا جائے تو اس میں آخرت کا مسئلہ سب سے زیادہ ابھرا ہوا مسئلہ نظر آئے گا۔ دوسرے مسئلوں کا ذکر بھی اگرچہ آتا ہے مگر وہ ضمناً ہے نہ کہ اصلاً۔

۲۔ دوسری بات یہ کہ داعی اور مدعو کے درمیان کسی بھی حال میں کوئی مادی جھگڑا نہ کھڑا کیا جائے ۔ مدعو کو کسی بھی حال میں فریق نہ بننے دیا جائے، خواہ اس کی جو بھی قیمت دینی پڑے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اس حکمت کی ایک نمایاں مثال حدیبیہ کا معاہدہ ہے۔ قریش نے مسلمانوں کے خلاف جنگ چھیڑ کر یہ صورت حال پیدا کر دی تھی کہ مسلم گروہ اور غیر مسلم گروہ دونوں ایک دوسرے کے جنگی فریق بن گئے تھے۔ تمام وقت جنگ کی باتوں اور جنگ کی تیاریوں میں گزرنے لگا تھا۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے ہر مطالبہ کو مانتے ہوئے ان سے دس سال کا ناجنگ معاہدہ کر لیا۔ یہ معاہدہ اس قدر یک طرفہ تھا کہ بہت سے مسلمانوں نے اس کو ذلت کا معاہدہ سمجھا، مگر خدا کے نزدیک وہ فتح مبین (الفتح ۱) کا دروازہ تھا۔ کیونکہ اس کے ذریعہ جنگی مقابلہ آرائی کی فضا ختم ہوتی تھی اور مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان داعی اور مدعو کا رشتہ بحال ہو رہا تھا۔ چنانچہ اس معاہدہ کے بعد جیسے ہی اہل عرب جنگی فریق کے بجائے مدعو کے مقام پر آئے، ان کے درمیان دعوت حق کی آواز پھیلنے لگی۔ یہاں تک کہ صرف دو سال میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً دس گنا بڑھ گئی۔ جو مکہ جنگ سے فتح ہوتا نظر نہ آتا تھا وہ دعوتی عمل کے ذریعہ مسخر ہو گیا۔

۳۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق عمل کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ مدعو پر قابو پانے کے باوجود اس کے ساتھ فراخی کا سلوک کیا جائے۔ اس معاملہ کی مثالیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی میں پھیلی ہوئی ہیں۔ فتح مکہ کے بعد قریش کے تمام وہ لوگ پوری طرح آپ کے قابو میں تھے جنھوں نے آپ کے ساتھ اور مسلمانوں کے ساتھ بدترین ظلم کئے تھے۔ مگر آپ نے ماضی کے جرائم کی بنیاد پر کسی کو سزا نہ دی۔ سب کو یک طرفہ طور پر معاف کر دیا۔ قریش کے لوگ جب بندھے ہوئے آپ کے سامنے حاضر کئے گئے تو آپ نے فرمایا: اذھبوا فانتم الطلقاء (جاؤ تم سب آزاد ہو) کچھ لوگوں کے بارے میں آپ نے وقتی طور پر قتل کئے جانے کا حکم دے دیا۔ مگر اس کے بعد ان میں سے بھی ہر اس شخص کو معاف کر دیا گیا جب کہ اس نے یا اس کی طرف سے کسی نے آکر آپ سے جان بخشی کی درخواست کی۔ اس قسم کے سترہ نامزد آدمیوں میں سے صرف پانچ کو قتل کیا گیا جنھوں نے معافی نہیں مانگی تھی۔ احد کی جنگ میں وحشی بن حرب نے حضرت حمزہ کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد ہند بنت عتبہ نے آپ کی لاش کو لے کر اس کا مثلہ کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو وقتی طور پر آپ کی زبان سے نکل گیا کہ اگر اللہ نے مجھے ان کے اوپر فتح دی تو میں ان کے تین آدمیوں کا مثلہ کروں گا (لئن اظھرنی اللہ علیھم لا مثلن بثلا ثین رجلا منھم، تفسیر ابن کثیر، جلد ثانی صفحہ ۳۵۲) فتح مکہ کے بعد آپ نے جن سترہ آدمیوں کے قتل کا حکم دیا تھا ان میں وحشی اور ہند دونوں شامل تھے۔ مگر دونوں نے جب آپ کی خدمت میں آکر معافی مانگی تو دونوں کو معاف کر دیا گیا۔ کیونکہ یہی طریقہ منصوبۂ الٰہی کے مطابق تھا۔

یہ اصول بے حد اہم حکمت پر مبنی ہے۔ انسان پتھر نہیں ہے کہ ایک پتھر کو توڑ دیا جائے تو اس کے دوسرے قریبی پتھر توڑنے والے کے بارے میں کوئی ردعمل ظاہر نہ کریں۔ انسان زندہ معاشرہ کا ایک زندہ جزء ہے۔ جب بھی ایک انسان پر جارحانہ کارروائی کی جاتی ہے تو اس کے قریبی لوگوں میں انتقام کا جذبہ بھڑک اٹھتا ہے۔ اس طرح سماج میں تخریبی کارروائیاں جنم لیتی ہیں۔ فتح کے بعد جو وقت نئی تعمیر میں لگتا وہ تخریب کاروں کا مقابلہ کرنے میں صرف ہونے لگتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد پچھلے مخالفین کو عمومی معافی دے کر آئندہ کے لئے ہر قسم کی تخریبی سرگرمیوں کا دروازہ بند کر دیا۔ مزید یہ کہ ان کی اکثریت اسلام قبول کر کے اسلام کی طاقت کا ذریعہ بن گئی، جیسے کہ عکرمہ ابن ابی جہل۔

۴۔ فتح و غلبہ حاصل کرنے کے بعد اجتماعی معاملات کی اصلاح کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔ یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جلد بازی کا طریقہ اختیار نہیں فرمایا بلکہ صبر و تدریج کے ذریعہ اصلاحات کا نفاذ کیا۔

مکہ کے قریش دین ابراہیمی کے وارث تھے۔ مگر انھوں نے اصل دین ابراہیمی کو بگاڑ دیا اور اس میں بہت سی بدعتیں جاری کر دیں۔ مثلاً حضرت ابراہیم نے حج کو قمری مہینوں کی بنیاد پر ذی الحجہ میں قائم کیا تھا۔ قمری سال شمسی سال سے گیارہ دن کم ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے قمری مہینوں کی مطابقت موسموں کے ساتھ باقی نہیں رہتی۔ چنانچہ حج کبھی ایک موسم میں آتا اور کبھی دوسرے موسم میں۔ یہ صورت قریش کے تجارتی مفاد کے خلاف تھی۔ انھوں نے حج کو ہمیشہ گرمی کے موسم میں رکھنے کے لئے نسئ (کبیسہ) کا طریقہ اختیار کر لیا۔ وہ قمری مہینوں میں ہر سال گیارہ دن بڑھا دیتے۔ اس طرح نام اگرچہ قمری مہینوں کا ہوتا مگر عملاً اس کا سال شمسی سال کے ساتھ چلتا۔ اس کی وجہ سے تاریخیں ۳۳ سال تک کے لئے بدل جاتیں، ایک بار مہینوں کو اپنی جگہ سے ہٹانے کے بعد دوبارہ ۳۳ سال پر ایسا ہوتا کہ حج ابراہیمی طریقہ کے مطابق اصل ذی الحجہ میں پڑتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر مامور تھے کہ وہ قریش کی بدعتوں کو ختم کر کے حج کو دوبارہ ابراہیمی طریقہ پر قائم کریں۔ فتح مکہ (رمضان ۸ھ) کے بعد آپ عرب کے حکمراں بن گئے۔ آپ ایسا کر سکتے تھے کہ نسئ کی بدعت کو فوری طور پر ختم کرنے کا اعلان کر دیں۔ مگر آپ نے صبر سے کام لیا۔ اس وقت نسئ کے ۳۳ سالہ دور کو پورا ہونے میں صرف دو سال باقی تھے۔ آپ نے دو سال انتظار فرمایا۔ مکہ کے فاتح ہونے کے باوجود دو سال آپ حج کے لئے نہیں گئے۔ آپ نے صرف تیسرے سال (۱۰ھ) حج کی عبادت میں شرکت کی جو کہ ۳۳ سالہ دور کو پورا کر کے ٹھیک ابراہیمی تاریخ پر ذی الحجہ میں ہو رہا تھا۔ اس وقت مشہور حجۃ الوداع میں آپ نے اعلان فرمادیا کہ اس سال حج جس طرح ہو رہا ہے اسی طرح اب ہر سال ہوگا۔ اب نسئ کا اصول ہمیشہ کے لئے ختم کیا جاتا ہے۔ یہی بات ہے جو حجۃ الوداع کے خطبہ میں آپ نے ان الفاظ میں ادا فرمائی:

ایھا الناس ان الزمان قد استدار فھو الیوم کھیئتہ یوم خلق اللہ السموٰت والارض، وان عدۃ الشھور عند اللہ اثنا عشر شھراً (ابن جریر وابن مردویہ)	اے لوگو زمانہ گھوم گیا۔ پس آج کے دن وہ اپنی اس ہیئت پر ہے جس دن کہ اللہ نے زمین وآسمان کو پیدا کیا تھا۔ اور مہینوں کی گنتی اللہ کے نزدیک ۱۲ مہینے ہیں۔

اس تاخیر میں بہت گہری مصلحت تھی۔ کیونکہ مذہب میں جب کوئی طریقہ عرصہ تک رائج رہے تو وہ مقدس بن جاتا ہے۔ لوگوں کے لئے اس کے خلاف سوچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ چونکہ دو سال بعد خود ہی حج ان تاریخوں پر آرہا تھا جو آپ چاہتے تھے۔ اس لئے آپ نے قبل از وقت اقدام کرکے غیر ضروری مسئلہ کھڑا کرنے سے پرہیز کیا۔ جب فطری رفتار سے حج اپنی اصل تاریخ پر آگیا تو آپ نے اعلان فرما دیا کہ یہی حج کی اصل تاریخ ہے اور آئندہ اب انھیں تاریخوں میں حج ہوتا رہے گا۔

یہ چند مثالیں ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح اپنی پوری تحریک میں ربانی حکمت کو ملحوظ رکھا۔ آپ نے خدا کے کاگ میں اپنا کاگ ملایا، آپ نے خدائی منصوبہ سے موافقت کرتے ہوئے تمام کارروائیاں کیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی کوششوں کے عظیم الشان نتائج برآمد ہوئے۔

دور جدید میں اسلامی دعوت

دین کی دعوت کو دو بڑے دوروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک، پیغمبر آخر الزماں کے ظہور سے پہلے۔ دوسرا، پیغمبر آخر الزماں کے ظہور کے بعد۔ آپ سے پہلے خدا کی جو کتابیں آئیں ان کی حفاظت کی ذمہ داری خود ان لوگوں پر ڈالی گئی تھی جن کی طرف وہ کتابیں بھیجی گئی تھیں۔ اس لئے ان کے بارے میں استحفاظ (حفاظت طلب کرنا) کا لفظ آیا ہے (بما استحفظوا من کتاب اللہ وکانوا علیہ شھداء، مائدہ ۴۴) مگر قرآن کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے خود اپنے ہاتھ میں لے لی (انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون، الحجر ۹)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر مامور تھے کہ شرک کو مغلوب کریں اور توحید کو غالب فکر کی حیثیت سے دنیا میں رائج کر دیں (الانفال ۳۹) یہ کام صرف خدا کی نصرت سے ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ڈھائی ہزار سالہ عمل کے نتیجہ میں وہ حالات پیدا کئے جن کو استعمال کرکے آپ نے شرک کو مغلوب کیا اور توحید کو فکری غلبہ کے مقام پر پہنچایا۔

رسول اور اصحاب رسول کی کوششوں کے نتیجہ میں شرک ہمیشہ کے لئے مغلوب ہو گیا۔ اب

اس کی کوئی امید نہیں کہ شرک دوبارہ ایک غالب فکر کی حیثیت سے دنیا میں ابھر سکے۔ تاہم موجودہ زمانہ میں دوبارہ یہ واقعہ ہوا کہ توحید نے غالب فکر کی حیثیت سے اپنا مقام کھو دیا۔ آج ساری دنیا میں الحاد کو غالب فکر کی حیثیت حاصل ہے۔ بے خدا ذہن یا سکولر طرز فکر آج دنیا کا غالب فکر ہے۔ اس کے مقابلہ میں توحید کا فکر عملاً دوسرے درجہ پر چلا گیا ہے۔

موجودہ زمانہ میں کرنے کا اصل کام یہی ہے کہ ملحدانہ طرز فکر کو مغلوب کیا جائے تاکہ توحید اپنا غلبہ کا مقام دوبارہ حاصل کر سکے۔ اللہ تعالیٰ کو یقیناً معلوم تھا کہ آئندہ دور الحاد آنے والا ہے۔ اس لئے اس کی نصرت دوبارہ متحرک ہوئی۔ پچھلے ہزار سالہ عمل کے دوران اس نے دوبارہ ایسے حالات پیدا کرنے شروع کئے جو بالآخر دعوت توحید کے لئے معاون بن سکیں۔ یہ عمل اب اپنی تکمیل کے مرحلہ میں پہنچ گیا ہے۔ آج اگرچہ بظاہر الحاد کا فکری غلبہ ہے۔ مگر وہ حالات پوری طرح پیدا ہو چکے ہیں جن کو استعمال کر کے دوبارہ توحید کو فکری غلبہ کا مقام دیا جا سکے۔

پہلے مرحلہ میں غلبۂ توحید کا کام دعوت کے بعد طاقت کے ذریعہ انجام پایا (وقاتلوھم حتیٰ لا تکون فتنۃ، البقرہ ۱۹۳، بل نقذف بالحق علی الباطل فیدمغہ فاذا ھو زاھق، الانبیاء ۱۸) مگر دوسرے مرحلہ میں یہ کام تبیین و تبلیغ کے ذریعہ انجام پاتا ہے، جیسا کہ قرآن کے اشارہ سے معلوم ہوتا ہے:

سنریھم آیاتنا فی الآفاق وفی انفسھم حتی یتبین لھم انہ الحق اولم یکف بربک انہ علیٰ کل شیئ شھید (حم سجدہ ۵۳)	ہم ان کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے دنیا میں بھی اور ان کے اندر بھی، یہاں تک کہ ان پر کھل جائے کہ یہ (قرآن) بالکل حق ہے۔ کیا تیرے رب کا ہر بات پر شاہد ہونا کافی نہیں

ذہنی انقلاب

موجودہ زمانہ میں ایک زبردست ذہنی انقلاب آیا ہے۔ یہ انقلاب کیا ہے؟ اس کے لئے کوئی دوسرا موزوں لفظ نہ ہونے کی وجہ سے میں اس کو سائنسی انقلاب کہتا ہوں۔ جدید سائنسی انقلاب نے انسانی تاریخ میں پہلی بار ایسی فکری تبدیلیاں پیدا کی ہیں جو دعوت توحید کے عین موافق ہیں۔ ان کو صحیح طور پر استعمال کیا جائے تو صرف قلمی و لسانی تبلیغ کے ذریعہ غلبہ توحید کا وہ مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے جس کے لئے اس سے پہلے تلوار اٹھانی پڑی تھی۔

جدید سائنسی انقلاب دراصل صدر اول کے اسلامی انقلاب کا ایک ضمنی حاصل (By-product) ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسلامی انقلاب کے ذریعہ ایسے اسباب پیدا کئے جنھوں نے تاریخ کے اندر اپنا عمل شروع کیا۔

یہاں تک کہ وہ اس انقلاب تک پہنچا جس کو جدید سائنسی انقلاب کہا جاتا ہے۔ گویا خدا نے صدر اول میں شرک کے اوپر توحید کو غلبہ دیا تو اسی کے اندر وہ اسباب بھی پیدا کر دئے جو بعد کے زمانہ میں الحاد پر توحید کو غالب کرنے میں مددگار بن سکیں۔

اسلام کے ذریعہ آنے والے توحیدی انقلاب سے پہلے ساری دنیا میں شرک کا غلبہ تھا۔ شرک دراصل مظاہر پرستی کا دوسرا نام ہے۔ دنیا کی ہر چیز جو نمایاں نظر آئی اسی کو انسان نے پوجنا شروع کر دیا، خواہ وہ آسمان کا سورج ہو یا زمین کا بادشاہ۔ اس کی وجہ سے دور شرک میں سائنسی تحقیق کا کام ممکن نہ ہو سکا۔ آرنلڈ ٹوائن بی کے الفاظ میں، فطرت کے مظاہر اس وقت پرستش کا موضوع (Object of Worship) بنے ہوئے تھے، پھر وہ تحقیق کا موضوع (Object of Investigation) کیسے بنتے۔ اسلام نے شرک کو مغلوب کر کے توحید کو غالب کیا تو ایک خدا کے سوا ہر چیز مخلوق نظر آنے لگی، اس انقلاب نے یہ ممکن بنا دیا کہ چیزوں پر تحقیق کا عمل جاری کیا جاسکے۔ یہ عمل ابتدائی صورت میں دور اول ہی میں شروع ہو گیا تھا۔ ایک بار چاند گرہن کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سورج گرہن اور چاند گرہن اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں۔ وہ کسی بڑے آدمی کی پیدائش یا موت کی بنا پر نہیں ہوتے۔ اس طرح آپ نے مادی بڑائی کی بھی نفی کر دی اور انسانی بڑائی کی بھی۔ یہ فکری لہر عقیدہ سے الگ ہو کر یورپ پہنچی اور بالآخر جدید انقلاب کا سبب بنی۔

۱۔ اس انقلاب کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ توہماتی دور کا خاتمہ ہو گیا۔ توہم پرستی کیا ہے۔ توہم پرستی نام ہے حقائق کی بنیاد پر رائے قائم کرنے کے بجائے مفروضات و قیاسات کی بنیاد پر رائے قائم کرنے کا۔ (مثلاً یہ فرض کر لینا کہ جب کسی بڑے آدمی کی موت ہوتی ہے تو سورج یا چاند گہنا جاتے ہیں) یہ ذہن اسلام کی طرف بڑھنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ ایسا آدمی حقائق واقعی کی بنیاد پر اسلام اور غیر اسلام کا جائزہ نہیں لیتا بلکہ پیشگی مفروضات کی بنیاد پر بلا دلیل ایک کو صحیح اور دوسرے کو غلط مان لیتا ہے۔ مثلاً اسلام تاریخی طور پر ایک مستند دین ہے اور دیگر تمام مذاہب تاریخی استناد سے محروم ہیں۔ مگر توہمات کے دور میں انسان اس کو اہمیت نہیں دے پاتا تھا۔ جدید دور نے اس کو پوری اہمیت کے ساتھ لیا۔ چنانچہ موجودہ زمانہ میں تنقید عالیہ (Higher Criticism) کے نام سے ایک مستقل فن وجود میں آگیا ہے۔ اس فن کے تحت یہ حقیقت پوری طرح مسلّم ہو گئی ہے کہ تاریخی طور پر معتبر دین صرف اسلام ہے۔ دوسرے ادیان کو تاریخی اعتباریت کا درجہ حاصل نہیں۔

۲۔ سائنسی ذہن نے کائنات کو تجربہ اور مشاہدہ کی روشنی میں جاننے کی کوشش کی۔ اس کے

نتیجہ میں کائنات میں چھپے ہوئے ایسے فطری حقائق انسان کے علم میں آئے جو اسلام کی تعلیمات کی تصدیق اعلیٰ سطح پر کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر انسان کی تحقیق نے بتایا کہ کائنات میں ہر جگہ ایک ہی قانون فطرت کارفرما ہے۔ جو قانون زمین کے احوال پر حکمراں ہے وہی قانون کائنات کے دور دراز مقامات پر بھی حکمراں ہے۔ اس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اس کائنات کا خدا صرف ایک ہے۔ دو خدا یا بہت سے خداؤں کی اس کائنات میں گنجائش نہیں۔

۳۔ دین توحید کو قدیم زمانہ میں اختیار کرنے کے لئے، ایک علمی رکاوٹ، قدیم فلسفہ بھی تھا۔ قدیم زمانہ میں فلسفہ کو غالب علم کا مقام حاصل تھا۔ تعلیم یافتہ طبقہ کے سوچنے کی ذہنی زمین اس زمانہ میں فلسفہ ہوتا تھا۔ اس کے نتیجہ میں دین توحید کی راہ میں ایک بہت بڑی مصنوعی رکاوٹ حائل ہو گئی تھی۔

قدیم فلسفہ کا آخری نشانہ ہمیشہ سے آخری سچائی کی تلاش رہا ہے۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ تقریباً پانچ ہزار سال کی شان دار تاریخ کے باوجود فلسفہ اپنے نشانہ تک پہنچنے میں مکمل طور پر ناکام رہا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ فلسفہ انسان کی محدودیتوں (Limitations) کا ادراک نہ کر سکا۔ وہ آخری سچائی تک پہنچنے کے لئے ساری کوششیں صرف کرتا رہا۔ جب کہ انسان اپنی محدود صلاحیتوں کی وجہ سے بطور خود آخری سچائی تک پہنچ ہی نہ سکتا تھا۔

اس فلسفیانہ طرز فکر کی وجہ سے ہزاروں برس تک انسان یہ چاہتا رہا کہ دین توحید کی بنیاد جن اساسی عقائد پر قائم ہے اس کو انسان کے لئے مکمل طور پر معلوم اور مشاہد بنا دیا جائے۔ مگر یہ تمام غیبی حقیقتیں تھیں اور انسان اپنی موجودہ صلاحیتوں کے ساتھ ان غیبی حقیقتوں کا کامل ادراک نہیں کر سکتا۔

جدید سائنس کا، دینی نقطۂ نظر سے، سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اس مفروضہ کو ڈھا دیا۔ اس نے آخری طور پر یہ ثابت کر دیا کہ انسان کی صلاحیتیں محدود ہیں۔ وہ اپنی محدودیت کی وجہ سے حقیقت کا کلی ادراک نہیں کر سکتا۔ قدیم فلسفہ کی پیدا کردہ ذہنی زمین اب ساری دنیا میں دفاعی حیثیت کے مقام پر جا چکی ہے اور اب سائنس کی دریافت کردہ ذہنی زمین کو علمی دنیا میں غالب مقام حاصل ہے۔

ذہن کی اس تبدیلی نے دین توحید کے لئے راستہ صاف کر دیا ہے۔ اب اس نقطۂ نظر کو، کم از کم بالواسطہ طور پر، مکمل علمی تائید حاصل ہے کہ انسان کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ حقیقت اعلیٰ کو پانے کے لئے وہ پیغمبر کی اطلاع کا اعتبار کرے۔ اب یہ مطالبہ سراسر غیر علمی مطالبہ بن چکا ہے کہ خدا اور وحی اور آخرت کو ہماری آنکھوں سے ہمیں دکھاؤ، اس کے بعد ہی ہم اس پر ایمان لائیں گے۔

معلوم تاریخ میں یہ پہلا واقعہ ہے کہ خود علم انسانی نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ انسان کا علم محدود ہے

اور ہمیشہ محدود رہے گا۔ انسان سائنسی ذرائع سے جب کائنات کی کھوج کرتا ہے تو اس پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ کائنات اس سے زیادہ پیچیدہ ہے کہ انسان کا محدود ذہن اس کا احاطہ کرسکے۔ سائنس کی یہ دریافت اسلامی نقطۂ نظر سے بے حد اہم ہے۔ کیونکہ اس سے رسالت کی اہمیت ثابت ہوتی ہے۔ ایک طرف انسان کا یہ حال ہے کہ وہ حقیقت کو آخری حد تک جان لینا چاہتا ہے۔ دوسری طرف انسان اپنی بناوٹ کے اعتبار سے ایسی محدودیت کا شکار ہے کہ وہ کبھی بھی حقیقت کو آخری حد تک نہیں جان سکتا۔ انسانی زندگی کا یہ خلا واضح طور پر یہ بتاتا ہے کہ اس کو ایک برتر رہنما کی ضرورت ہے۔ اسی برتر رہنما کا دوسرا نام پیغمبر ہے۔ انسانی محدودیت کے بارے میں سائنس کے اقرار نے پیغمبر کی ضرورت کو خالص علمی سطح پر ثابت کر دیا ہے۔

۴۔ قدیم زمانہ میں انسان کو اظہار رائے کی آزادی حاصل نہ تھی۔ اس کی اصل وجہ بادشاہوں اور بڑے انسانوں کے تقدس کا عقیدہ تھا۔ جو لوگ کسی وجہ سے اونچے مقام پر پہنچ جاتے ان کو مقدس سمجھ لیا جاتا۔ ان کی رائے دوسروں سے برتر مانی جاتی۔ ان کو یہ حق مل جاتا کہ جس طرح چاہیں دوسروں کو اپنی مرضی کا پابند بنائیں۔ توحید کے انقلاب نے انسانی بڑائی کا خاتمہ کیا اور یہ اعلان کیا کہ کسی انسان کو دوسرے انسان پر فضیلت نہیں۔ اس کے بعد تاریخ میں ایک نئی فکری لہر چل پڑی۔ یہی وہ فکری لہر ہے جس کی سیاسی تکمیل بالآخر یورپ میں جمہوریت کی صورت میں ہوئی۔ جمہوری انقلاب نے تمام انسانوں کو برابر ٹھہرا دیا۔ ہر شخص کے لئے یہ فکری حق تسلیم کر لیا گیا کہ وہ اپنے ضمیر کے مطابق جو چاہے لکھے اور جو چاہے بولے۔ اس انقلاب نے تاریخ میں پہلی بار اس بات کو ممکن بنا دیا کہ خدا کے دین کی تبلیغ اس طرح کی جائے کہ تبلیغ کرنے والے کے لئے کسی طرح کی پکڑ دھکڑ کا اندیشہ نہ ہو۔

۵۔ سائنس نے آج کے انسان کے لئے خدا کی بہت سی وہ مادی نعمتیں کھولی ہیں جو ہزاروں برس سے کائنات کے اندر چھپی ہوئی تھیں۔ ان میں اسلامی دعوت کے نقطۂ نظر سے سب سے اہم جدید ذرائع مواصلات ہیں۔ پریس، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اسی طرح مختلف قسم کی تیز رفتار سواریاں۔ یہ چیزیں اسلام کے حق میں عظیم نعمتیں ہیں۔ ان کو استعمال کرکے اسلامی دعوت کو عالمی سطح پر پھیلایا جا سکتا ہے۔

یہ مواقع جو عین اسلامی دعوت کے حق میں ہیں، پچھلے ہزار سالہ عمل کے نتیجے میں پیدا ہوئے ہیں۔ پچھلے زمانہ میں جس طرح اللہ تعالیٰ نے ڈھائی ہزار سالہ عمل کے ذریعہ اسلام کے غلبۂ اول کے حالات فراہم کئے، اسی طرح اس نے دوبارہ ہزار سالہ عمل کے نتیجہ میں اسلام کے غلبۂ ثانی کے حالات فراہم کر دئے ہیں۔ تاہم یہ حالات و مواقع خود اپنے زور پر واقعہ نہیں بن جائیں گے۔ اس امکان کو واقعہ بنانے کے لئے زندہ

انسانوں کی ایک جماعت درکار ہے۔ ایسی ایک جماعت اگر کھڑی ہو جائے تو قریبی مستقبل میں اسی طرح دوبارہ اسلام کو فکری غلبہ مل سکتا ہے جس طرح قرن اول میں اس کو شرک کے مقابلہ میں فکری غلبہ حاصل ہوا تھا۔

اوپر جن امکانات کا ذکر ہوا وہ تقریباً ایک سو سال سے ایسی کسی جماعت کا انتظار کر رہے ہیں مگر بدقسمتی سے ایسی کوئی جماعت ابھی تک کھڑی نہ ہو سکی۔ اس میں شک نہیں کہ پچھلے سو سال کے اندر ہمارے یہاں بے شمار جماعتیں اور تحریکیں اٹھی ہیں، مگر یہ تحریکیں وقتی حالات، خصوصاً سیاسی حالات کے ردعمل کے طور پر اٹھیں نہ کہ اس ربانی شعور کے تحت جو پچھلے ہزار سال سے تاریخ کے اندر کام کرتا رہا ہے اور چودھویں صدی ہجری میں اپنی تکمیل کو پہنچا ہے۔

سیرت کی کتابوں میں آتا ہے کہ بدر کے میدان میں جب طاقت ور اہل کفر بظاہر کمزور اہل ایمان کے اوپر ٹوٹ پڑے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شدت احساس کے تحت سجدے میں گر گئے اور اللہ تعالیٰ سے نصرت کی دعائیں مانگنے لگے۔ اس نازک لمحہ میں آپ کی زبان سے جو کلمات نکلے ان میں سے ایک جملہ یہ تھا: اللہم ان تہلک ھذہ العصابۃ لا تعبد بعد ھا فی الارض (خدایا اگر یہ گروہ ہلاک ہوگیا تو اس کے بعد زمین پر تیری عبادت نہ ہوگی)۔ یہ کوئی مبالغہ نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ تین سو تیرہ روحیں جو بے سرو سامانی کے باوجود بدر کے معرکہ میں کھڑی ہوئی تھیں یہ محض عام قسم کے تین سو تیرہ لوگ نہ تھے۔ یہ عصابہ دراصل وہ گروہ تھا جس پر ڈھائی ہزار سالہ تاریخ منتہی ہوئی تھی۔ اسی طرح آج دوبارہ ایک نیا عصابہ (گروہ) درکار ہے جس پر پچھلی ہزار سالہ تاریخ منتہی ہوئی ہو۔ جو اپنے شعور کے اعتبار سے پچھلی ہزار سالہ تاریخ کا وارث ہو۔ جو اپنے کردار کے اعتبار سے ان امکانات کو واقعہ بنانے کا اٹل ارادہ اپنے اندر لئے ہوئے ہو، جو سنجیدہ فیصلے کی اس حد پر پہنچا ہوا ہو جہاں پہنچ کر آدمی اس قابل ہو جاتا کہ وہ اپنے مقصد سے پوری طرح وابستہ رہے۔ کوئی بھی خارجی واقعہ اس کو اس کے نشانہ سے ہٹانے والا ثابت نہ ہو۔ یہی وہ لوگ ہیں جو خدا کے کاگ میں اپنا کاگ ملائیں گے۔ اور بالآخر یقینی کامیابی کی منزل تک پہنچیں گے

اصحاب رسول

قرآن میں لوگوں کو ایمان کی دعوت دیتے ہوئے کہا گیا ہے :

فان آمنوا بمثل ما آمنتم بہ فقد اھتدوا — اگر وہ اس طرح ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو
وان تولوا فانما ھم فی شقاق (البقرہ ۱۳۷) — تو بے شک وہ ہدایت یاب ہوئے اور اگر وہ منھ موڑیں تو وہ اختلاف میں پڑے ہوئے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ اصحاب رسول نہ صرف اول الایمان ہیں بلکہ وہی ہمیشہ کے لئے حق کا نمونہ بھی ہیں۔ خدا کے یہاں جو ایمان معتبر ہے وہ وہی ایمان ہے جو صحابہ کرام جیسا ایمان ہو۔ دین و ایمان کی کوئی ایسی قسم جو صحابۂ کرام کے دین و ایمان سے مختلف ہو، اللہ تعالیٰ کو مطلوب نہیں۔

یہاں صحابۂ کرام کی چند خصوصیات مختصراً درج کی جاتی ہیں

دین ان کے لئے محبوب چیز بن گیا تھا

اصحاب رسول کی خصوصیت قرآن میں یہ بتائی گئی ہے کہ ایمان ان کے لئے ایک محبوب شئے بن گیا تھا (الحجرات ۷) محبت کسی چیز سے تعلق کا آخری درجہ ہے۔ اور جب کسی چیز سے محبت کے درجہ کا تعلق پیدا ہوجائے تو وہ آدمی کے لئے ہر چیز کا بدل بن جاتا ہے۔ اس کے بعد آدمی کا ذہن اس چیز کے بارے میں اس طرح متحرک ہوجاتا ہے کہ آدمی بغیر بتائے ہوئے اس سے متعلق ہر بات کو جان لیتا ہے۔ اس کو خواہ معروف معنوں میں کوئی نقشہ کار نہ دیا گیا ہو مگر اس کا ذہن خود بتا دیتا ہے کہ اس کو اپنی محبوب شئے کے لئے کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہئے (التوبہ ۴۶)

محبت کی سطح کے تعلق کا مطلب ہے دل چسپی کی سطح کا تعلق۔ یعنی یہ کہ آدمی اسلام کے نفع نقصان کو خود اپنا نفع نقصان سمجھنے لگے۔ اصحاب رسول کو اسلام سے اسی قسم کا تعلق پیدا ہوگیا تھا۔ وہ اسلام کے فائدے سے اسی طرح خوش ہوتے تھے جس طرح کوئی شخص اپنے بیٹے کی کامیابی سے خوش ہوتا ہے۔ اسلام کو کوئی نقصان پہنچے تو وہ اسی طرح بے چین ہوجاتے تھے جیسے کوئی شخص اپنے بیٹے کے متعلق ناخوش گوار خبر سن کر تڑپ اٹھتا ہے اور اس وقت تک اسے چین نہیں آتا جب تک وہ اس کی تلافی نہ کرلے۔

کسی چیز سے محبت کے درجے کا تعلق پیدا ہوجائے تو آدمی کا ذہن اس کے بارے میں پوری طرح

جاگ اٹھتا ہے۔ وہ اس کی خاطر ہر قربانی دینے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ اس کی ضرورت اور تقاضوں کو وہ بتائے بغیر جان لیتا ہے۔ اس کی بات کو پانے کے لئے کوئی نفسیاتی گرہ اس کی راہ میں حائل نہیں ہوتی۔ اس کے راستے میں اپنا حصہ ادا کرنے کے لئے وہ کسی چیز کو عذر نہیں بناتا۔

جب آدمی کسی معاملہ کو اپنا معاملہ سمجھ لے تو اس کے بعد اس کو نہ زیادہ بتانے کی ضرورت ہوتی اور نہ زیادہ سمجھانے کی۔ اس کا قلبی تعلق اس کے لئے ہر دوسری چیز کا بدل بن جاتا ہے۔ وہ کسی معاوضہ کی امید کے بغیر یک طرفہ طور پر اپنا سب کچھ اس کے لئے لٹا دیتا ہے۔ اس کی خاطر کھونا بھی اس کو پانا معلوم ہوتا ہے۔ اس کی خاطر بے قیمت ہو جانا اس کی نظر میں سب سے زیادہ قیمتی ہو جاتا ہے۔ اس کے لئے وہ ہر دوسری مصلحت کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اس کے لئے وہ ہر تکلیف کو اس طرح سہہ لیتا ہے جیسے کہ وہ کوئی تکلیف ہی نہ ہو۔

اصحاب رسول کوئی غیر معمولی انسان نہ تھے۔ وہ کوئی ماورائے بشر مخلوق نہیں تھے۔ ان کی خصوصیت صرف یہ تھی کہ "محبت" کے درجہ کا تعلق جو عام انسانوں کو صرف اپنے آپ سے ہوتا ہے وہی تعلق ان کو دین وایمان سے ہو گیا تھا۔ عام آدمی اپنے مستقبل کی تعمیر کو جو اہمیت دیتا ہے وہی اہمیت وہ اسلام کے مستقبل کی تعمیر کو دینے لگے تھے۔ وہ دین کے لئے اپنا حصہ ادا کرنے کو اتنا ہی ضروری سمجھنے لگے تھے جتنا کوئی شخص اپنی ذاتی دلچسپی کے معاملہ میں اپنے آپ کو اور اپنے اثاثہ کو استعمال کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ ان کی یہی خصوصیت تھی کہ وہ تاریخ کے وہ گروہ بنے جس نے اسلام کو عظیم ترین کامیابی کے مقام تک پہنچایا۔

پیغمبر کو آغاز تاریخ میں پہچاننا

صحابہ کی یہ انوکھی صفت تھی کہ انھوں نے اپنے ایک معاصر رسول کو پہچانا اور اس کا ساتھ دیا۔ یہ کام اتنا مشکل ہے کہ معلوم تاریخ میں جماعت کی سطح پر صرف ایک بار پیش آیا ہے۔ قدیم تاریخ کے ہر دور میں یہ قصہ پیش آیا کہ رسولوں کے مخاطبین نے ان کا انکار کیا اور ان کا مذاق اڑایا۔ بائبل میں ہے کہ "تم نے میرے نبیوں کو ناچیز جانا" یہ نبیوں کو ناچیز جاننے والے کون لوگ تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو وحی و رسالت کو مانتے تھے۔ نبیوں کے نام پر ان کے یہاں ادارے قائم تھے اور بڑے بڑے جشن ہوتے تھے۔ مگر یہ سب کچھ قدیم نبیوں کے نام پر ہوتا تھا۔ جہاں تک وقت کے نبی کا سوال تھا، اس کے لئے ان کے پاس استہزاء و تمسخر کے سوا کچھ نہ تھا۔

یہود نے حضرت مسیح کا انکار کیا، حالانکہ وہ موسیٰ کو مانتے تھے۔ نصاریٰ نے حضرت محمد کا انکار کیا، حالانکہ وہ حضرت مسیح کی پرستش کی حد تک عزت کرتے تھے۔ اسی طرح قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پتھر مارے اور آپ کو گھر سے نکالا، حالانکہ وہ حضرت ابراہیم کے وارث ہونے پر فخر کرتے تھے۔

اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قدیم نبی کی نبوت تاریخی روایات کے نتیجہ میں ثابت شدہ نبوت بن جاتی ہے۔ وہ کسی قوم کے قومی اثاثہ کا ایک لازمی جزء ہوتی ہے۔ کسی قوم میں آنے والا نبی اس کی بعد کی نسلوں کے لئے ایک طرح کا مقدس ہیرو بن جاتا ہے۔ اس کو ماننا اپنے قومی تشخص کو قائم کرنے کے ہم معنی ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے نبی کو کون نہیں مانے گا۔ مگر وقت کے نبی کی نبوت ایک متنازعہ نبوت ہوتی ہے۔ وہ التباس کے پردہ میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس کو ماننے کے لئے ظواہر کا پردہ پھاڑ کر حقیقت کو دیکھنا پڑتا ہے۔ اس کا ساتھ دینے کے لئے اپنی انا کو دفن کرنا ہوتا ہے۔ اس کے مشن کی راہ میں اپنا سرمایہ خرچ کرنا ایک ایسے مشن کی راہ میں اپنا سرمایہ خرچ کرنا ہوتا ہے جس کا برسرِ حق ہونا ابھی اختلافی ہو، جس کے بارے میں تاریخ کی تصدیقات ابھی جمع نہ ہوئی ہوں۔ صحابہ کرام وہ لوگ تھے جنھوں نے معاصر رسول کو اس طرح مانا جس طرح کوئی شخص تاریخی رسول کو مانتا ہے۔

غزوۂ خندق میں جب محاصرہ شدید ہوا اور معمولی ضروریات کی فراہمی ناممکن ہوگئی تو ایک مسلمان کی زبان سے یہ جملہ نکل گیا کہ محمد ہم سے وعدہ کرتے تھے کہ ہم کسریٰ اور قیصر کے خزانے حاصل کریں گے اور اب یہ حال ہے کہ ہمارا ایک شخص بیت الخلا جانے کے لئے بھی محفوظ نہیں (کان محمد یعدنا ان ناکل کنوز کسریٰ وقیصر واحدنا لا یأمن ان یذهب الی الغائط، سیرۃ ابن ہشام جزء ثانی صفحہ ۲۲۴) غزوۂ خندق کے وقت رسول اللہ کا وعدہ محض ایک لفظی وعدہ تھا، آج یہ ایک تاریخی واقعہ بن چکا ہے۔ صحابہ نے اس وعدہ کے تاریخی واقعہ بننے سے پہلے رسول کی عظمت کو مانا۔ ہم آج اس وعدہ کے تاریخی واقعہ بننے کے بعد رسول کی عظمت کو مان رہے ہیں۔ دونوں ماننے میں اتنا زیادہ فرق ہے کہ ایک کو دوسرے سے کوئی نسبت نہیں۔ آج ایک غیر مسلم محقق بھی پیغمبر اسلام کو تاریخ کا سب سے بڑا انسان کہنے پر مجبور ہے مگر آپ کی زندگی میں آپ کی عظمت کو پہچاننا اتنا مشکل تھا کہ صرف وہی لوگ اس کو پہچان سکتے تھے جن کو خدا کی طرف سے خصوصی توفیق ملی ہو۔

قرآن کو دورِ نزاع میں اپنانا

سیرت کی کتابوں میں صحابہ کا دعوتی طریقہ یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ قرآن کے نازل شدہ حصہ کو لے لیتے اور اس کو لوگوں کے سامنے پڑھ کر سناتے تھے (فعرض علیهم الاسلام وتلا علیهم القرآن) چنانچہ مدینہ میں جو صحابہ تبلیغ کے لئے گئے ان کو وہاں مقری (قرآن پڑھنے والا) کہا جاتا تھا۔ یہ بات آج کے ماحول میں بظاہر انوکھی معلوم نہیں ہوتی۔ لیکن اگر چودہ سو سال کی تاریخ کو حذف کر کے آپ اسلام کے ابتدائی دور میں پہنچ جائیں اور اس وقت کے حالات میں اسے دیکھیں تو یہ اتنا انوکھا واقعہ معلوم ہوگا کہ نہ اس سے پہلے وہ کبھی جماعتی سطح پر پیش آیا اور نہ اس کے بعد۔

آج جب ہم لفظ "قرآن"، بولتے ہیں تو یہ ہمارے لئے ایک ایسی عظیم کتاب کا نام ہوتا ہے جس نے چودہ صدیوں میں اپنی عظمت کو اس طرح مسلم کیا ہے کہ آج کروروں انسان اس کو خدا کی کتاب ماننے پر مجبور ہیں۔ آج اپنے آپ کو قرآن سے منسوب کرنا کسی آدمی کے لئے فخر و اعزاز کی بات بن چکی ہے۔ مگر زمانۂ نزول میں لوگوں کے نزدیک اس کی یہ حیثیت نہ تھی۔ عرب میں بہت سے لوگ تھے جو یہ کہتے تھے کہ محمد نے پرانے زمانہ کے قصے کہانیوں کو جوڑ کر ایک کتاب بنالی ہے۔ ہم چاہیں تو ہم بھی ایسی ایک کتاب بنالیں (لو نشاء لقلنا مثل ھذا ان ھذا الا اساطیر الاولین، الانفال ۳۱) کوئی قرآن میں تکرار کو دیکھ کر کہتا کہ یہ کوئی خاص کتاب نہیں۔ محمد کے پاس بس چند باتیں ہیں، انھیں کو وہ صبح شام دہراتے رہتے ہیں (وقالوا اساطیر الاولین اکتتبھا فھی تملی علیہ بکرۃ و اصیلا، الفرقان ۵)

ایسی حالت میں قرآن کو پہچاننا گویا مستقبل میں ظاہر ہونے والے واقعہ کو حال میں دیکھنا تھا۔ یہ ایک چھپی ہوئی حقیقت کو اس کے ثابت شدہ بننے سے پہلے پالینا تھا۔ پھر ایسے وقت میں قرآن کو کتاب دعوت بنالینا اور بھی زیادہ مشکل کام ہے۔ کیونکہ اس کے لئے اپنی عظمت کو کھو کر دوسرے کی عظمت میں گم ہونا پڑتا ہے۔ یہ اپنے مقابلہ میں دوسری شخصیت کا اعتراف کرنا ہے، اور وہ بھی ایسی شخصیت کا جس کی حیثیت ابھی مسلّم نہ ہوئی ہو۔ عرب کے مشہور شاعر لبید نے اسلام قبول کیا اور شاعری چھوڑ دی۔ کسی نے پوچھا کہ تم نے شاعری کیوں چھوڑ دی۔ لبید نے کہا: ابعد القرآن (کیا قرآن کے بعد بھی) آج کوئی آدمی شاعری چھوڑ کر یہ جملہ کہے تو اس کو زبردست عظمت اور مقبولیت حاصل ہوگی۔ مگر لبید کے قول میں اور آج کے شاعر کے قول میں کوئی نسبت نہیں۔ کیونکہ آج کا شاعر تاریخ کے اختتام پر یہ جملہ کہہ رہا ہے جب کہ لبید نے تاریخ کے آغاز پر یہ جملہ کہا تھا۔ یہی وہ حقیقت ہے جو قرآن میں ان لفظوں میں بیان کی گئی ہے۔

لا یستوی منکم من انفق من قبل الفتح وقاتل اولئک اعظم درجۃ من الذین انفقوا من بعد وقاتلوا   الحدید ۱۰

تم میں سے جو لوگ فتح کے بعد خرچ اور جہاد کریں وہ ان لوگوں کے برابر نہیں ہوسکتے جنھوں نے فتح سے پہلے خرچ اور جہاد کیا۔ ان کا درجہ بعد میں خرچ اور جہاد کرنے والوں سے بہت زیادہ ہے۔

غیر قائم شدہ صداقت کے لئے مال لٹانا

ابن ابی حاتم نے ایک صحابی کا واقعہ ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

عن عبد اللہ بن مسعود قال لما نزلت ھذہ الآیۃ (من ذا الذی یقرض اللہ قرضا حسنا فیضاعفہ

عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب قرآن میں یہ آیت اتری کہ کون ہے جو اللہ کو قرض حسن دے

له الحديد ۱۱) قال ابوالدحداح الانصاری یارسول الله وانّ الله لیرید منا القرض قال نعم یا ابا الدحداح۔ قال ارنی یدك یا رسول الله۔ قال فناوله یده۔ قال فانی قد اقرضت ربی حائطی۔ وله حائط فیه ستمائة نخلة وام الدحداح فیه وعیالها۔ قال فجاء ابوالدحداح فناداها یا امّ الدحداح قالت لبیك۔ قال اخرجی فقد اقرضته ربی عزوجل فقالت له ربح بیعك یا ابا الدحداح و نقلت منه متاعها وصبیانها۔ وانّ رسولَ الله صلی الله علیه قال کم من عذق رداح فی الجنة لابی الدحداح

(تفسیر ابن کثیر)

توحضرت ابو دحداح انصاری نے رسول اللہ صلی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: اے خدا کے رسول، کیا اللہ واقعی ہم سے قرض چاہتا ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں اے ابو دحداح۔ انھوں نے کہا اے خدا کے رسول، اپنا ہاتھ لائیے۔ راوی کہتے ہیں کہ آپ نے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دیا۔ ابو دحداح نے کہا کہ میں نے اپنا باغ اپنے رب کو قرض میں دے دیا۔ ان کا ایک کھجوروں کا باغ تھا جس میں چھ سو درخت تھے۔ اس وقت ان کی بیوی ام دحداح اپنے بچوں کے ساتھ باغ میں تھیں۔ وہ باغ میں واپس آئے اور آواز دی کہ اے ام دحداح۔ انھوں نے کہا ہاں۔ ابو دحداح نے کہا باغ سے نکلو، کیونکہ اس کو میں نے اپنے رب کو قرض میں دے دیا۔ بیوی نے کہا: اے ابو دحداح آپ کی تجارت کامیاب رہی۔ اور اس کے بعد اپنے سامان اور اپنے بچوں کو لے کر باغ سے نکل آئیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابو دحداح کے لئے جنت میں کتنے ہی شاداب اور پھل دار درخت ہیں۔

یہ ایک نمائندہ واقعہ ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صحابہ کرام جس دین پر ایمان لائے تھے اس دین کی خاطر قربانی پیش کرنے کے لئے وہ کس قدر بے چین رہتے تھے۔ یہاں دوبارہ ذہن میں رکھ لیجئے کہ یہ واقعہ چودہ سو سال پہلے کا ہے۔ آج کوئی شخص دین کے نام پر اس قسم کا انفاق کرے تو عین ممکن ہے کہ لاکھوں مسلمانوں کے درمیان مقبولیت کی صورت میں اس کو بہت جلد اپنے انفاق سے زیادہ بڑی چیز مل جائے۔ مگر اصحاب رسول کے زمانے میں صورت حال بالکل مختلف تھی۔ اس وقت دین کی راہ میں اپنا مال لٹانا ماحول میں دیوانگی کا خطاب پانے کا ذریعہ تھا، وہ اونچے میناروں پر نمایاں ہونے کے بجائے بنیاد کی زمین میں دفن ہونے کے ہم معنی تھا۔ اس وقت ایسا اقدام ایک ایسی تحریک کے خانہ میں لکھا جانے والا تھا جس کی صداقت ابھی مشتبہ تھی جس کی پشت پر تاریخ کی تصدیقات ابھی جمع نہیں ہوئی تھیں۔ یہ ایک غیر مسلمہ مد میں اپنا اثاثہ پیش کرنا تھا، جب کہ آج کا آدمی ایک مسلمہ مد میں اپنا اثاثہ پیش کرتا ہے۔

اپنا تاج دوسرے کے سر پر رکھنا

مدینہ میں عبداللہ بن ابی بہت عاقل اور صاحب شخصیت آدمی تھا، وہ مدینہ کا سب سے زیادہ ممتاز سردار سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ مدینہ کے باشندوں کو اپنا اختلاف و انتشار ختم کرنے کا احساس ہوا تو انھوں نے عبداللہ بن ابی کو منتخب کیا کہ اس کو اپنا بادشاہ بنائیں اور اس کی علامت کے طور پر اس کو ایک تاج پہنائیں (فاما عبد اللہ بن ابی فکان قومہ قد نظموا لہ الخرز لیتوجوہ ثم یملکوہ علیھم، سیرۃ ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۲۱۶)

عبداللہ بن ابی کی تاج پوشی کا انتظام مکمل ہو چکا تھا کہ عین اس وقت اسلام مدینہ میں پہنچ گیا۔ مدینہ کے باشندوں کی فطرت نے اس کی صداقت کی گواہی دی اور اسلام گھر گھر میں پھیلنے لگا۔ اس کے بعد مدینہ کے باشندوں کا ایک نمائندہ وفد مکہ آیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی اور آپ کی زبان سے آپ کا پیغام سنا۔ انھیں نظر آیا کہ مدینہ کی اجتماعی تنظیم کے لئے انھیں جو شخصیت درکار ہے وہ زیادہ بہتر طور پر محمد بن عبداللہ کی صورت میں موجود ہے۔ انھوں نے مدینہ کے لوگوں کی طرف سے آپ کو پیش کش کی کہ آپ مدینہ آئیں اور وہاں ہمارے سردار بن کر رہیں۔ اسلامی تاریخ کا یہی وہ واقعہ ہے جو بیعت عقبہ ثانیہ کے نام سے مشہور ہے۔

یہ واقعہ کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ یہ اپنا تاج دوسرے آدمی کے سر پر رکھ دینے کے ہم معنی تھا۔ قدیم قبائلی دور میں ایسا کوئی واقعہ بے حد نادر واقعہ تھا۔ اپنی قوم یا قبیلہ سے باہر کسی آدمی کو اپنا غیر مشروط سردار بنا لینا ہمیشہ انسان کے لئے مشکل ترین کام رہا ہے اور قدیم زمانہ میں تو یہ اور بھی زیادہ مشکل تھا۔ مزید یہ کہ جب یہ واقعہ پیش آیا اس وقت "محمد" اس پر عظمت ہستی کا نام نہ تھا جس سے ہم آج واقف ہیں۔ اس وقت محمد ایک ایسے انسان تھے جن کو ان کے اہل وطن نے نکال دیا تھا۔ جن کے ساتھ قومی عصبیت اور تاریخی عظمت شامل نہ ہوئی تھی۔ جو نہ صرف متنازعہ شخصیت تھے بلکہ ایک لٹے ہوئے بے گھر انسان تھے۔ جن کو اپنا سب کچھ دے دینا تھا اور ان سے پانا کچھ بھی نہ تھا ——— بیسویں صدی میں کسی برنارڈشا کے لئے بہت آسان ہے کہ وہ پیغمبر اسلام کے لئے یورپ کی سرداری کی پیش کش کرے۔ مگر چھٹی صدی عیسوی میں کسی کے لئے اس کا تصور بھی ناممکن تھا کہ وہ آپ کو پیغمبر مان کر آپ کو اپنا اجتماعی امام بنالے۔

اپنی محدودیت کو جاننا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ تھا کہ جب بھی کوئی معاملہ پیش آتا تو آپ اس کے بارے میں لوگوں سے مشورہ کرتے۔ آپ اپنے اصحاب کو جمع کرتے اور معاملہ کو بیان کرکے فرماتے کہ اشیروا علی ایھا الناس

(اے لوگو مجھے مشورہ دو) آپ بظاہر سب سے مشورہ طلب کرتے۔ مگر عملاً یہ ہوتا کہ کچھ دیر خاموشی رہتی اور اس کے بعد حضرت ابوبکر کھڑے ہو کر مختصراً اپنی رائے ظاہر کرکے بیٹھ جاتے۔ اس کے بعد حضرت عمر کھڑے ہوتے اور مختصراً کچھ بول کر بیٹھ جاتے۔ اس کے بعد معمولی طور پر کچھ لوگ بولتے اور اتفاق رائے سے فیصلہ ہو جاتا۔ آپ کی وفات کے بعد جب حضرت ابوبکر کی خلافت کا زمانہ آیا تو آپ بھی اسی طرح لوگوں کو جمع کرکے مشورہ طلب کرتے، اب یہ ہوتا کہ کچھ دیر خاموشی کے بعد حضرت عمر کھڑے ہوتے اور مختصر طور پر اپنی رائے ظاہر کرکے بیٹھ جاتے، اس کے بعد چند لوگ بولتے اور اتفاق رائے سے فیصلہ ہو جاتا۔ حضرت عمر کے بعد غیر اصحاب کی تعداد بڑھ گئی اور مذکورہ صورت باقی نہ رہی۔

یہ بظاہر ایک سادہ سی بات ہے مگر یہ اتنی اہم بات ہے کہ تاریخ میں کوئی دوسرا معاشرہ نہیں پایا جاتا جس نے اس کا ثبوت دیا ہو۔ یہ طرز عمل صرف اس وقت ممکن ہوتا ہے جب کہ آدمی اتنا خود شناس ہو جائے کہ وہ اپنی کمیوں اور محدودیتوں کو جاننے لگے۔ وہ دوسرے کے "ہے"، کے مقابلہ میں اپنے "نہیں" سے واقف ہو جائے۔ وہ اپنے کو اس حقیقت پسندانہ نظر سے دیکھنے لگے جس نظر سے دوسرا شخص اسے دیکھ رہا ہے۔

اس میں اتنا اور اضافہ کر لیجئے کہ یہ واقعہ جس ابوبکر و عمر کے ساتھ پیش آیا وہ ابوبکر و عمر وہ نہ تھے جن کو آج ہم جانتے ہیں، آج ہم تکمیل تاریخ والے ابوبکر و عمر کو جانتے ہیں۔ مگر وہ آغاز تاریخ والے ابوبکر و عمر کو جانتے تھے۔ اس وقت وہ اپنے معاصرین کے لئے صرف ان میں سے ایک تھے۔ جب کہ آج وہ ہمارے لئے گوری ہوئی تاریخ کے ستون ہیں جن کو ہم اس طرح دیکھتے ہیں جیسے کوئی ثابت شدہ واقعہ کو دیکھتا ہے۔ "ابوبکر و عمر"، کو تاریخ بننے کے بعد جاننا انتہائی آسان ہے۔ لیکن "ابوبکر و عمر" کو تاریخ بننے سے پہلے جاننا اتنا ہی مشکل ہے۔ اصحاب رسول وہ لوگ تھے جو اس مشکل ترین معیار پر پورے اترے۔

ذمہ داری کو اپنے اوپر لے لینا

غزوۂ ذات السلاسل کا واقعہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاً ایک دستہ حضرت عمرو بن العاص کی سرداری میں بھیجا۔ یہ جگہ شام کے اطراف میں تھی۔ حضرت عمرو بن العاص نے وہاں پہنچ کر دشمن کی تیاریوں کا حال معلوم کیا تو اپنا دستہ انھیں اس کے لئے ناکافی معلوم ہوا۔ انھوں نے ایک مقام پر ٹھہر کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پیغام بھیجا کہ موجودہ فوج ناکافی ہے، مزید کمک روانہ کی جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین میں سے دو سو آدمیوں کا دستہ تیار کیا اور حضرت ابوعبیدہ بن الجراح کی سرکردگی میں اس کو روانہ فرمایا۔

حضرت ابوعبیدہ جب اپنے دستہ کو لے کر منزل پر پہنچے اور دونوں دستے ساتھ ہو گئے تو یہ سوال پیدا

ہوا کہ دونوں دستوں کا امیر کون ہو۔ حضرت عمرو بن العاص نے کہا کہ دوسرا دستہ میری مدد کے لئے بھیجا گیا ہے اس لئے اصلاً میں ہی دونوں کا امیر ہوں۔ حضرت ابوعبیدہ کے ساتھی اس سے متفق نہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یا تو ابوعبیدہ دونوں دستوں کے مشترک امیر ہوں یا دونوں دستوں کا امیر الگ الگ رہے۔ جب اختلاف بڑھا تو ابوعبیدہ بن الجراح نے کہا: اے عمرو، جان لو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے جو آخری عہد لیا وہ یہ تھا کہ آپ نے کہا کہ جب تم اپنے ساتھی سے ملو تو ایک دوسرے کی بات ماننا اور اختلاف نہ کرنا۔ اس لئے خدا کی قسم اگر تم میری نافرمانی کروگے تب بھی میں تمھاری اطاعت کروں گا (تعلم یا عمرو ان آخر ما عهد الیّ رسول الله صلی الله علیہ وسلم ان قال: اذا قدمت علی صاحبك فتطاوعا ولا تختلفا۔ وانك والله ان عصيتنى لاطعتك، رواه البیہقی وابن عساکر)

حضرت ابوعبیدہ کے لئے یہ ممکن تھا کہ وہ ذمہ داری کو عمرو بن العاص پر ڈال کر ان سے لامتناہی بحث کرتے رہیں۔ اگر وہ ایسا کرنا چاہتے تو وہ بہت سے ایسے الفاظ پا سکتے تھے جن میں ان کا اپنا وجود بالکل درست اور دوسرے کا وجود بالکل باطل دکھائی دے۔ مگر اس کے بجائے انھوں نے یہ کیا کہ ساری ذمہ داری خود اپنے اوپر لے لی۔ انھوں نے مسئلہ کو یک طرفہ طور پر ختم کر دیا۔ اجتماعی زندگی میں یہ چیز بے حد ضروری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی اجتماعی زندگی چلتی ہی اس وقت ہے جب کہ اس کے افراد میں اتنی بلندی ہو کہ وہ حقوق کی بحث میں پڑے بغیر اپنے اوپر ذمہ داری لینے کی جرأت رکھتے ہوں۔ جہاں یہ مزاج نہ ہو وہاں صرف آپس کا اختلاف جنم لیتا ہے نہ کہ آپس کا اتحاد۔

شکایات سے اوپر اٹھ کر سوچنا

خالد بن الولید بے حد بہادر تھے۔ ان کے اندر غیر معمولی فوجی قابلیت تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے لے کر حضرت ابوبکر کی خلافت تک وہ مسلسل اسلامی فوج کے سردار رہے۔ تاہم حضرت عمر کو ان کی بعض عادتیں پسند نہ تھیں۔ چنانچہ انھوں نے حضرت ابوبکر سے کہا کہ ان کو سرداری کے عہدہ سے ہٹا دیا جائے۔ مگر حضرت ابوبکر نے ان کے مشورہ کو نہیں مانا۔ مگر حضرت عمر کو اپنی رائے پر اتنا اصرار تھا کہ جب وہ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے حضرت خالد کو سرداری سے معزول کر کے ایک معمولی سپاہی کی حیثیت دے دی۔

اس وقت حضرت خالد شام کے علاقہ میں فتوحات کے کارنامے دکھا رہے تھے۔ عین اس وقت خلیفہ ثانی نے انھیں معزول کر کے ابوعبیدہ بن الجراح کو ان کے اوپر سردار لشکر بنا دیا۔ اس کے بعد فوجیوں کی ایک تعداد خالد بن ولید کے خیمہ میں جمع ہوئی اور ان سے کہا کہ ہم آپ کے ساتھ ہیں، آپ خلیفہ کا حکم نہ مانیے۔ مگر حضرت خالد نے سب کو رخصت کر دیا اور کہا کہ میں عمر کے لئے نہیں لڑتا بلکہ عمر کے رب کے لئے لڑتا ہوں (انی لا اقاتل

فی سبیل عمر ولکن اقاتل فی سبیل رب عمر) وہ پہلے سردار لشکر کی حیثیت سے لڑتے تھے اور اب ایک ماتحت فوجی کی حیثیت سے لڑنے لگے۔

اس قسم کا کردار اسی وقت ممکن ہے جب کہ آدمی اتنا اونچا ہو جائے کہ وہ شکایتوں اور تلخیوں سے اوپر اٹھ کر سوچے اس کا رویہ ردعمل کے طور پر نہ بنے بلکہ مثبت فکر کے تحت بنے۔ وہ اللہ میں جینے والا ہو نہ کہ انسانی باتوں میں جینے والا۔

قانونی حد سے آگے بڑھ کر ساتھ دینا

شعبان ۲ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر پہنچی کہ قریش کے تمام سرداروں کی رہنمائی میں ایک ہزار کا لشکر مدینہ کی طرف حملہ کرنے کے لئے بڑھ رہا ہے۔ اس میں چھ سو زرہ پوش تھے اور اسی کے ساتھ ایک سو سواروں کا خصوصی دستہ بھی شامل تھا۔ یہ ایک بہت نازک وقت تھا۔ آپ نے مدینہ کے انصار اور مہاجرین کو جمع کیا اور ان کے سامنے تقریر کرتے ہوئے یہ سوال رکھا کہ ایسی حالت میں کیا کرنا چاہئے، حسب معمول اولاً مہاجرین کے ممتاز افراد اٹھے اور انھوں نے کہا کہ اے خدا کے رسول، آپ کا رب جس بات کا حکم دے رہا ہے اس کی طرف بڑھیے، ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ ہم یہود کی طرح یہ کہنے والے نہیں ہیں کہ تم اور تمھارا خدا جاکر لڑیں، ہم یہاں بیٹھے ہیں بلکہ ہمارا کہنا یہ ہے کہ آپ اور آپ کا خدا چل کر لڑیں، ہم بھی آپ کے ساتھ ہیں۔ جب تک ہم میں سے ایک آنکھ بھی گردش کر رہی ہے ہم آپ کا ساتھ چھوڑنے والے نہیں۔

مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مہاجرین کی اس قسم کی تقریروں کے باوجود بار بار یہ فرما رہے تھے کہ لوگو مجھے مشورہ دو (اشیروا علیّ ایها الناس) چنانچہ سعد بن معاذ کھڑے ہوئے اور انھوں نے کہا کہ اے خدا کے رسول، شاید آپ کا رخ ہماری طرف ہے۔ آپ نے کہا، ہاں، اس پر سعد بن معاذ نے انصار کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا: ہم آپ پر ایمان لائے، آپ کی تصدیق کی، اور اس بات کی گواہی دی کہ جو کچھ آپ لائے ہیں، وہ حق ہے، اور اس پر آپ سے سمع وطاعت کا پختہ عہد باندھ چکے ہیں، پس اے خدا کے رسول، آپ جو کچھ چاہتے ہیں اس کو کر گزرئے، ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔ اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ اگر آپ ہمیں لے کر سمندر کے سامنے جاپہنچیں اور اس میں گھس جائیں تو ہم بھی آپ کے ساتھ سمندر میں گھس جائیں گے۔ ہم میں سے ایک آدمی بھی پیچھے نہ رہے گا۔ ہم کو ہرگز یہ ناگوار نہیں ہے کہ آپ ہمیں لے کر کل کے دن دشمن سے ٹکرا جائیں۔ ہم جنگ میں ثابت قدم رہنے والے ہیں۔ مقابلہ کے وقت سچے اترنے والے ہیں۔ شاید اللہ تعالیٰ آپ کو ہم سے وہ کچھ دکھائے جس سے آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔ پس اللہ کی برکت کے بھروسے پر آپ ہم کو لے کر چلیں۔ (سیرت ابن ہشام)

انصار کے قائد کی اس تقریر کے بعد اقدام کا فیصلہ کر لیا گیا۔

بدر کی جنگ کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بار بار انصار کی طرف رخ کرنا بے سبب نہ تھا۔ اس کا ایک خاص پس منظر تھا۔ ابن ہشام اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وذلك انهم حين بايعوه بالعقبة قالوا: يارسول الله، إنا بُرَآء من ذِمامِك حتى تصل إلى ديارنا، فاذا وصلت إلينا فأنت في ذمتنا نمنعك مما نمنع منه أبناءنا ونساءنا، فكان رسول الله صلى الله عليه وسلم يتخوف الا تكون الانصار ترى عليها نصره الا ممن دهمه بالمدينة من عدوه، وأن ليس عليهم ان يسير بهم الى عدوٍ من بلادهم، (سیرۃ ابن ہشام، جزء ثانی، صفحہ ۲۵۳)

اور ایسا اس لئے ہوا کہ انصار نے جب عقبہ میں بیعت کی تھی تو انھوں نے کہا تھا کہ اے خدا کے رسول، ہم آپ کی ذمہ داری سے بری ہیں یہاں تک کہ آپ ہمارے دیس میں پہنچ جائیں۔ جب آپ ہمارے پاس آجائیں گے تو آپ ہماری ذمہ داری میں ہوں گے اور ہم آپ کا دفاع کریں گے جس طرح ہم اپنے لڑکوں اور عورتوں کا دفاع کرتے ہیں۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اندیشہ تھا کہ انصار کہیں یہ سمجھتے ہوں کہ ان پر آپ کی مدد کرنا اس وقت ہے جب کہ آپ کا دشمن مدینہ پہنچ کر حملہ کرے۔ ان پر یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ اپنی بستی سے دور جا کر مقابلہ کریں۔

انصار کی بیعت قدیم عربی اصطلاح کے مطابق بیعت نسار (دفاعی بیعت) تھی۔ اس کے مطابق مدینہ سے ۸۰ میل دور بدر کے مقام پر جا کر لڑنا ان کے لئے ضروری نہ تھا۔ مگر انصار نے اس کو اپنے لئے عذر نہیں بنایا۔ وہ قانونی حد کو توڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے اور بدر کے میدان میں جا کر قربانی پیش کی۔

اختلاف سے بچ کر اصل نشانہ پر لگے رہنا

اخرج الطبرانی عن المسور بن مخرمة قال: خرج رسول الله صلى الله عليه وسلم على اصحابه فقال ان الله بعثني رحمة للناس كافة فادوا عني رحمكم الله، ولا تختلفوا كما اختلف الحواريون على عيسى بن مريم فانه دعاهم الى مثل ما ادعوكم اليه فامامن بَعُدَ مكانه فكرهه فشكا عيسى بن مريم ذلك الى الله عزوجل ۔۔۔ فقال اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم نحن يا رسول الله نؤدّي اليك فابعثنا حيث شئت

مسور بن مخرمہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کے سامنے تقریر کی اور فرمایا کہ اللہ نے مجھ کو تمام انسانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ پس تم میری طرف سے اس ذمہ داری کو ادا کرو۔ خدا تم پر رحم کرے اور تم لوگ اختلاف نہ کرنا جس طرح عیسیٰ بن مریم کے حواریوں نے اختلاف کیا۔ انھوں نے اپنے حواریوں کو اسی چیز کے لئے پکارا جس کی طرف میں تم کو پکار رہا ہوں۔ پس جس کا مقام دور تھا اس کو وہاں جانا ناگوار ہوا۔ تو عیسیٰ بن مریم نے اللہ تعالیٰ سے اس کی شکایت کی۔ رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب نے کہا کہ اے خدا کے
رسول ہم آپ کی ذمہ داری کو ادا کریں گے۔ آپ ہم کو بھیجئے
جہاں آپ چاہیں۔

اجتماعی کام میں رکاوٹ ڈالنے والی سب سے بڑی چیز اختلاف ہے۔ مگر صحابہ کرام کو اللہ کے خوف نے اتنا بے نفس بنا دیا تھا کہ وہ اختلافات سے بلند ہو کر اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں لگے رہتے تھے۔ چنانچہ رسول اللہ کے زمانے میں انھوں نے عرب میں اور اطراف عرب میں آپ کی منشا کے مطابق اسلام کی دعوت پوری طرح پہنچائی۔ آپ کی وفات کے بعد وہ مال وجاہ کے حصول میں نہیں پڑے بلکہ اطراف کے ملکوں میں پھیل گئے۔ ہر صحابی کا گھر اس زمانہ میں ایک چھوٹا مدرسہ بنا ہوا تھا جہاں وہ صرف اللہ کی رضا کے لئے لوگوں کو عربی سکھاتے اور قرآن وسنت کی تعلیم دیتے۔ اس زمانہ میں ایک طرف مسلمانوں کا ایک طبقہ فتوحات اور سیاسی انتظامات میں لگا ہوا تھا۔ عام طریقہ کے مطابق اصحاب رسول کو اپنا سیاسی حصہ لینے میں سرگرم ہونا چاہئے تھا۔ مگر وہ اس سے بے پروا ہو گئے۔ انھوں نے اسلامی فتوحات کے ذریعہ پیدا ہونے والی فضا کو تبلیغ دین کے لئے استعمال کیا، اس طرح ان کے اور ان کے شاگردوں کے خاموش پچاس سالہ عمل کے نتیجہ میں وہ جغرافی خطہ وجود میں آیا جس کو عرب دنیا کہا جاتا ہے، جہاں لوگوں نے نہ صرف اپنے دین کو بدلا بلکہ ان کی زبان اور ان کی تہذیب بھی بدل گئی۔

۲۔ پچھلی نشست پر بیٹھنے کے لئے راضی ہو جانا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو سب سے پہلا مسئلہ خلیفہ کا انتخاب تھا۔ انصار بنو ساعدہ کی چوپال (سقیفہ) میں جمع ہو گئے۔ اس وقت سعد بن عبادہ انصار کے سب سے زیادہ ابھرے ہوئے سردار تھے۔ چنانچہ انصار میں بہت سے لوگوں کا یہ خیال تھا کہ سعد بن عبادہ کو خلیفہ مقرر کیا جانا چاہئے۔ مہاجرین کو یہ خبر ملی تو ان کے ممتاز افراد تیزی سے چل کر مذکورہ مقام پر پہنچے۔ حضرت ابوبکر نے تقریر کرتے ہوئے کہا:

أما ما ذكرتم فيكم من خيرٍ فأنتم له اهل، ولن تعرف العرب هذا الامر الا لهذا الحي من قريش: هم اوسط العرب نسبًا و دارًا، وقد رضيت لكم احد هذين الرجلين فبايعوا ايهما شئتم

(سیرۃ ابن ہشام، جزء رابع صفحہ ۳۳۹)

(اے انصار) تم نے اپنی جس فضیلت کا ذکر کیا ہے اس کے تم اہل ہو۔ مگر عرب اس معاملہ (امارت) کو قریش کے سوا کسی اور قبیلہ کے بارے میں نہیں جانتے۔ وہ عربوں میں نسب اور مقام کے اعتبار سے سب سے بہتر ہیں۔ میں تمھارے لئے ان دو آدمیوں (عمر اور ابوعبیدہ بن الجراح) میں سے کسی ایک پر راضی ہوں۔ تم دونوں میں سے جس سے چاہو بیعت کر لو

اس کے بعد حضرت عمر اٹھے اور انھوں نے فوراً حضرت ابوبکر کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کر لی اور پھر تمام مہاجرین نے بیعت کی۔ اس کے بعد انصار نے بھی حضرت ابوبکر کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ تاہم انصار کے ایک طبقہ کے لئے یہ واقعہ اتنا سخت تھا کہ ایک شخص نے مہاجرین سے کہا کہ تم لوگوں نے سعد ابن عبادہ کو قتل کر دیا (قتلتم سعد ابن عبادۃ)

انصار نے اسلام کے لئے بے پناہ قربانیاں دی تھیں۔ انھوں نے اسلام کے بے یار و مددگار قافلہ کو اس وقت پناہ دی جب کہ انھیں اپنے وطن سے نکلنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ اس کے باوجود انصار اس فیصلہ پر راضی ہو گئے کہ اقتدار میں ان کا حصہ نہ ہو اور خلیفہ صرف مہاجرین (قریش) میں سے منتخب کیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کے پیچھے بہت گہری مصلحت تھی۔ قریش سیکڑوں سال سے عرب کے قائد بنے ہوئے تھے۔ ایسی حالت میں اگر کسی غیر قریش کو خلیفہ مقرر کیا جاتا تو اس کے لئے اجتماعی نظم کو سنبھالنا ناممکن ہو جاتا۔ یہ انصار کی حقیقت پسندی تھی کہ انھوں نے اپنی اس کمی کو جانا اور یک طرفہ فیصلہ پر راضی ہو گئے۔ تاہم یہ حقیقت پسندی کی اتنی نایاب قسم ہے کہ اس کی کوئی دوسری مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔

غیر جذباتی فیصلہ کرنے کی طاقت

احد کی لڑائی اسلام کی تمام جنگوں میں سب سے زیادہ سخت لڑائی تھی۔ قریش کے تمام جنگی جوان غصہ میں بھرے ہوئے مسلمانوں کے اوپر ٹوٹ پڑے تھے۔ عین اس وقت جب کہ قتل و خون کا معرکہ گرم تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تلوار ہاتھ میں لی اور کہا کہ کون اس تلوار کو اس کے حق کے ساتھ لے گا۔ کچھ لوگ آپ کی طرف بڑھے۔ مگر آپ نے انھیں تلوار نہ دی۔ پھر ابودجانہ سامنے آئے اور پوچھا کہ اے خدا کے رسول اس تلوار کا حق کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تم اس سے دشمن کو مارو یہاں تک کہ اس کو ٹیڑھا کر دو (ان تضرب به العدو حتى ينحني) ۔ ابودجانہ نے کہا کہ میں اس کو اس کے حق کے ساتھ لیتا ہوں۔ چنانچہ آپ نے انھیں تلوار دے دی۔

حضرت ابودجانہ تلوار لے کر چلے۔ اس وقت ان پر ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ وہ اکڑ کر چلنے لگے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھ کر فرمایا کہ اس قسم کی چال خدا کو پسند نہیں سوا ایسے موقع کے (انها لمشية يبغضها الله الا في مثل هذا الموطن)

ابودجانہ نے اپنے سر پر لال کپڑا باندھ لیا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ وہ موت سے نڈر ہو کر جنگ کے لئے نکل پڑے ہیں۔ وہ انتہائی بہادری کے ساتھ لڑ رہے تھے۔ جو بھی ان کے سامنے آتا وہ ان کی تلوار کا نشانہ بن جاتا۔ اس کے بعد ایک حیرت انگیز واقعہ ہوا جس کو خود ابودجانہ ان الفاظ میں نقل کرتے ہیں:

رأيت انسانا يخمش الناس خمشا شديدا   میں نے ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ بری طرح لوگوں کو جنگ

فصمدت لہٗ فلما حملت علیہ السیف ولول فاذا امرأۃ فاکرمت سیف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اضرب بہ امرأۃ

(سیرت ابن ہشام جزء ۳، صفحہ ۱۴)

پر اُبھار رہا تھا۔ میں اس کی طرف لپکا۔ جب میں نے اس پر تلوار اٹھائی تو اس نے کہا یا ویلاہ (ہائے تباہی) اب میں نے جانا کہ یہ ایک عورت ہے۔ تو میں نے خدا کے رسول کی تلوار کو اس سے پاک رکھا کہ اس سے میں کسی عورت کو قتل کروں

اس واقعہ کو ایک صحابی ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں: پھر میں نے دیکھا کہ ان کی تلوار ہند بنت عتبہ کے سر پر اٹھ گئی ہے مگر اس کے بعد انھوں نے اپنی تلوار اس سے ہٹالی (ثم رایتہ قد حمل السیف علی مفرق راس ھند بنت عتبۃ، ثم عدل السیف عنھا) جنگ کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات میں سے ایک ہدایت یہ تھی کہ عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو نہ مارا جائے۔ حضرت ابو دجانہ نے عین قتل و خون کے ہنگامہ میں اس کو یاد رکھا اور اپنی چلی ہوئی تلوار کو درمیان سے روک لیا۔

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اصحاب رسول کو اپنے جذبات پر کتنا زیادہ قابو تھا۔ ان کے افعال ان کے شعور کے ماتحت تھے نہ کہ ان کے جذبات کے ماتحت۔ وہ انتہائی اشتعال انگیز موقع پر انتہائی ٹھنڈا فیصلہ کر سکتے تھے۔ وہ غصہ اور انتقام کی آخری حد پر پہنچ کر بھی اچانک اپنا ذہن تبدیل کر سکتے تھے۔ وہ ایک رخ پر پوری رفتار سے چل پڑنے کے بعد معاً اپنا رخ دوسری طرف پھیر سکتے تھے۔ یہ بظاہر ایک سادہ سی بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر عملاً وہ اتنی زیادہ مشکل ہے کہ اس پر کوئی ایسا شخص ہی قادر ہو سکتا ہے جو خدا سے اس طرح ڈرنے والا ہو گویا خدا اپنے تمام جلال و جبروت کے ساتھ اس کے سامنے کھڑا ہوا ہے اور وہ اس کو اپنی کھلی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔

درخت کی طرح آگے بڑھنا

قرآن میں انجیل اور تورات کے دو حوالوں کا ذکر ہے۔ تورات کا حوالہ صحابۂ کرام کے انفرادی اوصاف سے متعلق ہے۔ اس کے بعد انجیل کے حوالے سے ان کی اجتماعی صفت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

ومثلھم فی الانجیل کزرع اخرج شطأہٗ فآزرہٗ فاستغلظ فاستوی علی سوقہ یعجب الزراع لیغیظ بھم الکفار وعد اللہ الذین آمنوا و عملوا الصالحات منھم مغفرۃ واجرا عظیما

(الفتح - آخر)

اور انجیل میں ان کی مثال یوں ہے کہ جیسے ایک کھیتی ہو۔ اس نے نکالا اپنا انکھوا۔ پھر اس کو مضبوط کیا۔ پھر وہ موٹا ہوا۔ پھر اپنے تنہ پر کھڑا ہو گیا۔ اچھا لگتا ہے کسانوں کو تاکہ منکروں کا دل ان سے جلائے۔ اللہ نے ان لوگوں سے جو ان میں سے ایمان لائے اور نیک عمل کئے مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ کیا ہے۔

موجودہ انجیل میں یہ تمثیل ان لفظوں میں ہے ——— اور اس نے کہا، خدا کی بادشاہی ایسی ہے جیسے کوئی

آدمی زمین میں بیج ڈالے اور رات کو سوئے اور دن کو جاگے۔ اور وہ بیج اس طرح اُگے اور بڑھے کہ وہ نہ جانے۔ زمین آپ سے آپ پھل لاتی ہے۔ پتی، پھر بالیں، پھر بالوں میں تیار دانے۔ پھر جب اناج پک چکا تو وہ فی الفور درانتی لگاتا ہے۔ کیونکہ کاٹنے کا وقت آپہنچا (مرقس ۴: ۲۶-۳۲)

انجیل اور قرآن کی اس تمثیل میں یہ بتایا گیا ہے کہ پیغمبر آخرالزماں کے اصحاب کا اجتماعی ارتقاء درخت کی مانند ہوگا۔ اس کا آغاز بیج سے ہوگا، پھر وہ دھیرے دھیرے بڑھے گا اور اپنا تنہ مضبوط کرتے ہوئے اوپر اٹھے گا۔ یہاں تک کہ فطری رفتار سے تدریجی ترقی کرتے ہوئے اپنے کمال کو پہنچ جائے گا۔ اس کی ترقی اتنی شان دار ہوگی کہ ایک طرف اہل ایمان اس کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوں گے اور دوسری طرف دشمن دانت پیس رہے ہوں گے کہ اس کا معاملہ اتنا مضبوط ہے کہ اس کے خلاف ہمارا کچھ بس نہیں چلتا۔

اسلام کو درخت کی طرح ترقی دینے کے لئے خدا کا یہ منصوبہ تھا جو صحابہ کرام کے ذریعہ انجام پایا۔ تاہم یہ کوئی آسان معاملہ نہ تھا۔ اس کے لئے ضرورت تھی کہ وہ جلد بازی کے بجائے صبر کو اپنا طریقہ بنائیں۔ اس کے لئے ضرورت تھی کہ فوری محرکات کے تحت وہ کوئی اقدام نہ کریں۔ اس کے لئے ضرورت تھی کہ وہ اپنے ذوق پر چلنے کے بجائے قوانین فطرت کی پیروی کریں۔ اس کے لئے ضرورت تھی کہ وہ اس سے بے پرواہو کر کام کریں کہ نتیجہ ان کی زندگی میں سامنے آتا ہے یا ان کے بعد۔ "درخت اسلام" کو اگانے کے لئے ضرورت تھی کہ وہ اپنے جذبات کو کچلیں اور اپنی امنگوں کو دفن کر دیں۔ صحابہ کرام نے یہ سب کچھ کیا۔ انھوں نے کسی تحفظ کے بغیر اپنے آپ کو خدائی اسکیم کے حوالہ کر دیا۔ اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ زمین میں خدا کا دین ایک ایسے ابدی باغ کی صورت میں کھڑا ہوگیا جس کو ساری دنیا مل کر بھی مٹانا چاہے تو نہ مٹا سکے۔

مردانِ کار کی ضرورت

اکثر لوگ احیاء اسلام کی مہم کو اس کے "پروگرام" میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ اس کو اسی وقت سمجھ پاتے ہیں جب کہ انھیں ایک متعین پروگرام بتا دیا جائے۔ مگر یہ پروگرام کو تحریک کا بدل سمجھنا تحریک کی وسعتوں کی تصغیر (Underestimation) ہے۔ پروگرام ایک محدود نقشۂ کار کا نام ہے اور انسانی زندگی اس سے زیادہ وسیع ہے کہ وہ کسی محدود نقشہ کار کے دائرہ میں سما سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ سب سے بڑا پروگرام خود افراد کو پروگرام ساز بنانا ہے نہ کہ افراد کے ہاتھوں میں کوئی لگا بندھا پروگرام دینا۔

اسلامی دعوت یہی کام کرتی ہے۔ حقیقی اسلامی دعوت افراد کے ذہن کو اس طرح جگا دیتی ہے کہ وہ خود پروگرام ساز بن جاتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں صرف توحید کی دعوت پیش کی تھی۔ آپ نے اس قسم کی کوئی چیز لوگوں کو نہیں دی جس کو موجودہ زمانہ میں "پروگرام" کہا جاتا ہے۔ اس کے باوجود ہر وہ شخص جو آپ کی دعوت سے متاثر ہوتا اس کو اپنے لئے مکمل پروگرام مل جاتا تھا۔ وہ آپ سے توحید کا شعور لینے کے بعد خود ہی سارا کام کرنے لگتا تھا۔ مسلمانوں میں سے جو لوگ مکہ چھوڑ کر حبش گئے ان کو آپ نے معروف معنوں میں کوئی پروگرام نہیں بتایا تھا۔ مگر انھوں نے حبش میں اسلام کی اتنی کامیاب نمائندگی کی کہ اسلام بین اقوامی دعوت کے مرحلہ میں داخل ہوگیا۔ آپ کی ہجرت سے پہلے جو مسلمان مدینہ گئے ان کو آپ نے قرآن کی سورتوں کے سوا اور کچھ نہیں دیا تھا۔ مگر انھوں نے مدینہ میں اسلامی دعوت کی مہم اس طرح چلائی کہ صرف چند سالوں میں مدینہ اس قابل ہوگیا کہ وہ دار الہجرت (اسلام کا مرکز) بن سکے۔

تقلیدی مذہب سے ہٹا کر شعوری مذہب پر لانے کی مہم سب سے بڑی انقلابی مہم ہے۔ وہ ایسے افراد وجود میں لاتی ہے جو اپنی ذات میں مکمل پروگرام ہوتے ہیں۔ ایسی مہم کی زد انسان کے پورے وجود پر پڑتی ہے۔ وہ انسانی فطرت کو اس طرح جگاتی ہے کہ اس کے اندر ربانی حکمت کا چشمہ ابل پڑے۔ اب ایسے انسان وجود میں آتے ہیں جو خدا کے پاؤں سے چلیں، جو خدا کے ہاتھ سے پکڑیں، جو خدا کی آنکھ سے دیکھیں اور خدا کے کان سے سنیں۔ وہ حدیث کے الفاظ میں، وہ بے پناہ انسان بن جائیں جس کی ہوش مندی ہر دوسری چیز سے بلند تر ثابت ہوتی ہے (اتقوا فراسة المومن فانه ينظر بنور الله) ایسا آدمی خود ہر چیز کا بدل بن جاتا ہے۔ اس کے پاس ہر سوال کا صحیح ترین جواب ہوتا ہے۔ وہ ہر موقع پر اپنے لئے کامیاب ترین راہ عمل تلاش کر لیتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب میں یہی حکمت ربانی جگا دی تھی، اس کے بعد انھیں کسی اور چیز کی ضرورت نہ رہی۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا نے انسان کی فطرت میں وہ سب کچھ بھر دیا ہے جس کی اسے اپنی زندگی میں ضرورت ہے۔ عام حالات میں یہ فطرت ڈھکی ہوئی رہتی ہے۔ اسی انسانی فطرت سے جمود اور تعصب اور بے شعوری کے پردوں کو ہٹانا اسلامی دعوت کا اصل کام ہے۔ ان پردوں کے ہٹتے ہی انسانی فطرت اس آفاقی روشنی میں آجاتی ہے جس سے تمام زمین و آسمان جگمگا رہے ہیں۔ اس کے بعد ہر چیز اس کو اپنے واقعی روپ میں دکھائی دینے لگتی ہے۔ اور جو آدمی چیزوں کو ان کے واقعی روپ میں دیکھ لے اس کے لئے پروگرام کا مسئلہ اتنا ہی آسان ہو جاتا ہے جتنا آنکھ والے ایک شخص کے لئے سیڑھی کے زینوں پر قدم رکھتے ہوئے کسی عمارت کے اوپر چڑھنا۔

یہاں میں ایک واقعہ نقل کروں گا جو اس مسئلہ کو بہت خوبی کے ساتھ واضح کرتا ہے۔

ایک ہندستانی خاتون اپنے شوہر کے ساتھ طرابلس میں رہتی تھیں۔ وہ عربی نہیں جانتی تھیں۔ وہاں ان کی زندگی بالکل گھریلو زندگی تھی۔ باہر کی دنیا سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ ایک روز رات کو اچانک ان کے شوہر کے پیٹ میں سخت درد اٹھا۔ گھر میں بیوی کے سوا کوئی دوسرا نہ تھا جو ڈاکٹر کو بلائے۔ طرابلس میں گھریلو ٹیلی فون بھی نہیں ہوتے کہ ٹیلی فون پر ڈاکٹر یا اسپتال سے رابطہ قائم کیا جائے۔ مگر بستر پر تڑپتا ہوا شوہر اور اس سے قلبی تعلق خاتون کے لئے اپنی ہرکمی کا بدل بن گیا۔ وہ رات کے سناٹے میں اپنے گھر سے نکلی۔ راستہ سے ناواقفیت، مقامی زبان سے اجنبیت، کسی ڈاکٹر کا نام یا پتہ معلوم نہ ہونا کوئی بھی چیز اس کے لئے رکاوٹ نہ بنی۔ وہ اپنی بیتابی کی رہنمائی میں چلتی رہی۔ یہاں تک کہ بے شمار مرحلوں سے گزرنے کے بعد بالآخر وہ ایک پاکستانی ڈاکٹر کے گھر پہنچ گئی۔ پاکستانی ڈاکٹر اس کی زبان (اردو) جانتا تھا۔ وہ فوراً اس کے ساتھ آیا۔ دیکھنے کے بعد اس نے سمجھ لیا کہ یہ اپنڈکس کا کیس ہے اور اس کا فوراً آپریشن ہونا چاہئے، چنانچہ اسی وقت وہ اس کو اپنی گاڑی میں بٹھا کر اسپتال لے گیا۔ وہاں اس کا آپریشن ہوا اور چند دن کے بعد وہ اچھا ہو کر اپنے گھر واپس آگیا۔

اس قسم کا واقعہ ہر آدمی کی زندگی میں پیش آتا ہے۔ ہر آدمی ایسی صورت حال سے دوچار ہوتا ہے جس کے بارے میں پہلے سے اس کے پاس کوئی نقشۂ عمل نہیں ہوتا۔ مگر وہ پوری طرح اس کا مقابلہ کرتا ہے اور بالآخر کامیاب ہو جاتا ہے۔ تاہم اس قسم کے قصے کسی کے ساتھ ہمیشہ اپنے بیوی بچوں اور اپنے ذاتی معاملات میں پیش آتے ہیں۔ اگر تعلق اور دلچسپی کا یہی درجہ دین کے ساتھ پیدا ہو جائے تو دین کے معاملات بھی اسی طرح حل ہونے لگیں جس طرح لوگ اپنے ذاتی معاملات روزانہ حل کر رہے ہیں۔ پھر لوگوں کے لئے دینی تقاضوں کو جاننا مشکل رہے اور نہ دین کے لئے قربانی دینا۔ وہ اپنے پروگرام کو اسی طرح پالیں جس طرح مذکورہ خاتون نے اپنے ڈاکٹر کو پالیا۔

ہم سے اکثر کہا جاتا ہے کہ آپ کے پاس نقشۂ کار کیا ہے۔ آہ، لوگوں کو کس طرح بتایا جائے کہ نقشۂ کار کی نہیں بلکہ مردانِ کار کی ضرورت ہے۔ کوئی واقعہ خواہ وہ اسلامی ہو یا غیر اسلامی، اس کو برپا کرنے والے ہمیشہ انسان ہوتے ہیں۔ نہ کہ کوئی پروگرام یا نقشۂ کار۔ اجتماعی زندگی میں انقلاب ہمیشہ وہ لوگ لاتے ہیں جو اپنی ذات میں پروگرام ہوں نہ کہ وہ لوگ جنھیں کوئی لگا بندھا ڈھرا دے دیا جائے اور اس پر وہ دوڑتے رہیں۔

شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کا واقعہ ہے۔ ایک بار انھوں نے نماز پڑھی۔ نماز کے بعد انھوں نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔ وہ ہاتھ اٹھائے خاموش دعا کرتے رہے۔ اس وقت اورنگ زیب کے پیچھے ان کے وزیر سعد اللہ خاں کھڑے ہوئے تھے۔ اورنگ زیب جب دعا سے فارغ ہوئے تو سعد اللہ خاں نے کہا: عالی جاہ، آپ کی سلطنت کا پرچم کشمیر سے لے کر راس کماری تک لہرا رہا ہے، کیا اس کے بعد بھی کوئی ارمان ہے جو آپ کے دل میں باقی رہ گیا ہے۔ اورنگ زیب یہ سوال سن کر کچھ دیر خاموش رہے اور اس کے بعد تاثر کے ساتھ کہا: سعد اللہ، مردے خواہم (سعد اللہ، میں ایک مرد چاہتا ہوں)

اورنگ زیب کے پاس وہ چیز مکمل طور پر موجود تھی جس کو نقشۂ کار کہا جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ اس کے پاس حکومت اور وسائل بھی پوری طرح موجود تھے۔ اس کے باوجود وہ مغل سلطنت کو مستحکم بنانے میں اس لئے ناکام ہو گیا کہ اس کے پاس مردانِ کار نہ تھے۔ اگر اورنگ زیب کے پاس سچے مردان کار کی ٹیم موجود ہوتی تو اورنگ زیب کے بعد آنے والی تاریخ اس سے مختلف ہوتی جیسا کہ اب ہمیں نظر آتی ہے۔

اسلام کے مشن کو آج انسانوں کی بھیڑ میں انسان کی تلاش ہے۔ خدا کے نام پر بولنے والوں کے درمیان اس کو اس انسان کی تلاش ہے جس کو خدا کے خوف نے چپ کر رکھا ہو، دنیا کے پیچھے دوڑنے والوں کے درمیان وہ اس انسان کی راہ دیکھ رہا ہے جو آخرت کی خاطر کھڑا ہو گیا ہو۔ خدا کے نام پر خوشیاں منانے والوں کے درمیان وہ اس انسان کو ڈھونڈھ رہا ہے جس کو خدا کی یاد نے رونے پر مجبور کر دیا ہو۔ اپنی انا کا جھنڈا اٹھانے والوں کے درمیان اس کو اس انسان کی تلاش ہے جس نے خدا کو اس طرح پایا ہو کہ اس کے پاس ایک بے انا روح کے سوا اور کچھ باقی نہ رہ گیا ہو۔ دین کے نام پر لڑنے والوں کے درمیان وہ اس انسان کو تلاش کر رہا ہے جس نے دین کی خاطر لڑائی بھڑائی چھوڑ دی ہو۔ حاسبوا اغیادکم کا جھنڈا اٹھانے والی فوج کے درمیان وہ ان لوگوں کا انتظار کر رہا ہے جو حاسبوا انفسکم کو اپنا شعار بنائے ہوئے ہوں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو آج اسلام کو مطلوب ہیں۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے ذریعہ اسلام دوبارہ فکری غلبہ کا مقام حاصل کرے گا۔

آج اسلام کو ایسے انسان درکار ہیں جو اپنے کو اس حد تک خالص کریں کہ وہ ظواہر سے گزر کر حقیقت کو دیکھنے لگیں۔ جو اس صبر کے حامل ہوں کہ غیر متعلق مسائل سے اپنا دامن بچا کر اصل نشانہ پر اپنی ساری توجہ مرکوز

ہیں۔ جو آخرت کے مقابلہ میں دنیا کو اتنا ہیچ سمجھیں کہ دنیا کی ہر قربانی دینا ان کے لئے آسان ہو جائے۔ جو اتنے
یادہ حقیقت پسند ہوں کہ اپنے مقابلہ میں دوسروں کی خوبی دیکھ سکیں اور اپنی سیٹ پر دوسرے کو بٹھا سکیں۔
وحقائق کو اس طرح دیکھنے لگیں کہ کوئی لفظی شوشہ انھیں اس سے بدکانے والا ثابت نہ ہو۔ جو منفی جذبات سے
ں قدر خالی ہوں کہ کوئی ذاتی رنجش انھیں منحرف نہ کر سکے اور کسی کی ترقی انھیں حسد میں مبتلا نہ کرے۔ جو دوسرے
وا اپنے مقام پر رکھ کر دیکھیں اور اپنے کو دوسرے کے مقام پر۔ جو ظواہر سے زیادہ حقیقت کے دلدادہ ہوں۔
ور حال سے زیادہ مستقبل پر نظر رکھتے ہوں۔ خلاصہ یہ کہ وہ دنیا کے بجائے آخرت میں جیتے ہوں اور اپنی بڑائی
کے بجائے خدا کی بڑائی میں گم ہو چکے ہوں۔ ایسے ہی لوگوں نے دور اوّل میں اسلام کو غالب فکر کا مقام عطا کیا تھا
ور ایسے ہی لوگ دور ثانی میں بھی اسلام کو غالب فکر کا مقام عطا کریں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ پروگرام کا سوال اصلاً افراد تیار کرنے کا سوال ہے۔ افراد کسی تربیتی نظام میں نہیں ڈھلتے
ور نہ کسی قسم کے خارجی ہنگاموں کے درمیان بنتے ہیں۔ افراد تیار کرنے کی صورت تو صرف یہ ہے کہ دین قیم کی
بنیاد پر ایک ایسی بے آمیز تحریک اٹھے جو فطرت انسانی کو مس کرنے والی ہو۔ جو آدمی کے باطن میں ضرب
لگا کر اس کے اندر سوئے ہوئے ربانی انسان کو جگا دے، جو انسان کے فکر میں خدا کا رنگ اس طرح گھولے کہ
اس کی پوری ہستی خدا کے رنگ میں رنگ جائے۔

ایسی تحریک حالات کے ردعمل کے طور پر نہیں اٹھتی۔ وہ فطرت کے ساز پر خدا کا ابدی نغمہ چھیڑنے کے
ہم معنی ہوتی ہے۔ وہ کتاب الٰہی کی حکمت کو لسان عصر میں کھولتی ہے۔ وہ پیغمبرانہ دعوت کا زمانی اظہار ہوتی ہے۔ وہ
خدا اور انسان کے درمیان ربط بن کر سامنے آتی ہے۔ وہ سورج کی روشنی اور پھولوں کی مہک کی طرح خدا کے تخلیقی
حسن کا نمونہ ہوتی ہے۔ کسی معاشرہ میں ایسی تحریک کا اٹھنا اس بات کی سب سے بڑی ضمانت ہے کہ وہاں وہ ربانی
انسان بن کر اٹھیں جو اپنی ذات ہیں پروگرام ہوں۔ تاہم پیغمبروں کی تاریخ بتاتی ہے کہ ایسی دعوت اٹھنے کے بعد بھی عملاً
صرف وہی لوگ اس سے فیض یاب ہوتے ہیں جو پہلے سے اپنے اندر زرخیزی کا مادہ رکھتے ہوں۔ بنجر زمین بارش
سے پہلے بھی بنجر رہتی ہے اور بارش کے بعد بھی۔ بنجر (والبلد الطیب یخرج نباتہ باذن ربہ والذی خبث
لا یخرج الا نکدا، الاعراف ۵۸)

اسلام کی نئی تاریخ شروع کرنے کے لئے سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ انسانوں کی ایسی جماعت
ہے جس کی فطری صلاحیتیں زندہ ہوں۔ تاکہ اس کو جب اسلام کی دعوتِ فطرت کا مخاطب بنایا جائے تو وہ اس کو صحیح
طور پر قبول کر سکے۔ جب اس کے اندر اسلام کا بیج ڈالا جائے تو اس کی کھیتی اس طرح لہلہا اٹھے جس طرح زرخیز
زمین میں دانہ ڈالنے کے بعد اس کی فصل لہلہا اٹھتی ہے۔ اسلام کی دعوت اپنی قبولیت کے لئے آج ایسے کسی گروہ کا

انتظار کررہی ہے۔ اس قسم کے زندہ افراد اگر مسلمانوں میں سے نکل آئیں تو یہ مسلمانوں کی خوش قسمتی ہے اور اگر ایسے جاندار لوگ مسلمانوں میں سے نہ نکلیں تو خدا کسی دوسری قوم کو یہ توفیق دے گا اور اس کے اندر سے ایسے زندہ افراد اٹھائے گا جو اسلام کی بارش سے نہائیں اور دنیا کو اس میں نہلانے کے لئے اپنا سب کچھ لگا دیں (وان تتولوا یستبدل قوماً غیرکم ثم لایکونوا امثالکم)

اوپر ہم نے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ جنگ بدر کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کے متعلق دعا کی کہ خدایا یہ گروہ (العصابہ) اگر ہلاک ہوگیا تو اس کے بعد زمین پر تیری عبادت نہ ہوگی۔ یہ اصحاب بدر کُل ۳۱۳ تھے۔ مگر یہی ۳۱۳ کی تعداد رسول کی نظر میں فیصلہ کن بن گئی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے غلبہ کے لئے اصل میں جو چیز درکار ہے وہ کسی قسم کی بھیڑ نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ بھیڑ کے اندر دعوتی عمل کرکے اس کے زندہ افراد کو اس سے نکال لیا جائے۔ یہ زندہ افراد خواہ ۳۱۳ ہوں مگر ان کو انسانیت کا خلاصہ ہونا چاہئے۔ شعور کے اعتبار سے وہ شعور ربانی کے ہم سطح ہوں اور عمل کے اعتبار سے وہ اخلاق خداوندی کا پیکر بن چکے ہوں۔ ان کا سوچنا اور کرنا دونوں خدا کی میزان عدل میں پورا اتر رہا ہو۔ ایسے گروہ کو چھانٹ کر نکالنا ہی دعوت اسلامی کا اصل مقصود ہے۔ جس دن ایسا گروہ وجود میں آجائے گا تو خواہ وہ ۳۱۳ جیسی اقلیت میں کیوں نہ ہو وہ خدا کی مدد سے خدا کے دین کو غلبہ کے مقام پر پہنچا کر رہے گا۔ ایسا ایک گروہ ہمیشہ خدا کی فرقان ہوتا ہے۔ اور جو گروہ خدا کی فرقان بن جائے اس کے لئے اس دنیا میں غلبہ کے سوا کوئی اور چیز مقدر نہیں۔

اسلام دور جدید میں

اسلام چونکہ آخری دین ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے وجود کے اعتبار سے قیامت تک باقی رہے۔ اسی لئے دین کا تحفظ بھی ایک ضروری اور مطلوب کام ہے۔ موجودہ زمانہ کی بعض تحریکوں نے اس اعتبار سے یقیناً مفید خدمات انجام دی ہیں۔ وہ اسلام کے فکری اور عملی نقشہ کی محافظ ثابت ہوئی ہیں۔ بعض ادارے قرآن اور حدیث اور اسلامی مسائل کے علم کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ بعض جماعتیں اسلامی عبادات کے ڈھانچہ کو ایک نسل سے دوسری تک پہنچانے کا کام کررہی ہیں۔ کچھ اور ادارے قرآن و حدیث کا متن صحت و صفائی کے ساتھ چھاپ کر ہر جگہ پھیلا رہے ہیں۔ یہ تمام کام بجائے خود مفید ہیں مگر بہر حال وہ تحفظ دین کے کام ہیں نہ کہ دعوتِ دین کے۔ جہاں تک اسلام کو دعوتی قوت کی حیثیت سے زندہ کرنے کا سوال ہے وہ موجودہ زمانہ میں ابھی تک واقعہ نہ بن سکا۔ حتیٰ کہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کو شاید اس کا شعور بھی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اکثر ایسے کاموں کو اسلامی دعوت کا عنوان دے دیتے ہیں جن کا اسلامی دعوت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

موجودہ زمانہ میں کسی حقیقی اسلامی کام کے آغاز کی پہلی شرط یہ ہے کہ ہم اس صورت حال کو
تم کریں جس نے ساری دنیا میں اسلامی تحریک کو سیاسی تحریک کے ہم معنی بنا رکھا ہے۔ مسلمان ہر ملک میں وقت
ے حکمرانوں کے خلاف شور وشر برپا کرنے میں مشغول ہیں۔ کہیں ان کی یہ تحریک غیر مسلم اقتدار کے خلاف برپا ہے اور کہیں
سلم اقتدار کے خلاف۔ کہیں وہ مسلح جدوجہد کے روپ میں ہے اور کہیں زبانی اور قلمی احتجاج کے روپ میں۔ کہیں
ہ ایک اسلامی سیاسی فلسفہ کے زیر سایہ کام کر رہی ہے اور کہیں فلسفہ اور نظریہ کے بغیر متحرک ہے۔ کہیں اس نے
ی عنوان اختیار کر رکھا ہے اور کہیں نظامی عنوان۔ تاہم سارے فرق و اختلاف کے باوجود نتیجہ سب کا ایک ہے ——
دید امکانات کو دعوت توحید اور انذار آخرت کے لئے استعمال نہ کرنا اور اپنی قوتوں کو بے فائدہ طور پر مفروضہ
یفوں کے خلاف محاذ آرائی میں ضائع کرتے رہنا۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو مسلمانوں نے موجودہ زمانہ میں بالکل الٹی
ارکردگی کا ثبوت دیا ہے۔ خدا نے دعوتِ حق کی راہ سے سیاسی رکاوٹ کو دور کر کے انھیں موقع دیا تھا کہ وہ آزادانہ حالات
ں خدا کے تمام بندوں تک خدا کا پیغام پہنچا دیں۔ وہ خدا کے بندوں کو خدا کی اس اسکیم سے باخبر کر دیں جس کے تحت اس نے
نسان کو پیدا کیا ہے اور جس کے مطابق وہ ایک ایک شخص کا حساب لینے والا ہے۔ مگر انھوں نے دوبارہ نئے نئے عنوان سے
پنے خلاف سیاسی رکاوٹیں کھڑی کر لیں۔ خود ساختہ سیاسی جہاد میں ہر ایک مشغول ہے۔ مگر دعوتی جہاد میں اپنا حصہ ادا کرنے
کی فرصت کسی کو نہیں۔

قرآن میں ہے کہ اللہ اس کی مدد کرتا ہے جو اللہ کی مدد کرے (حج ۴۰) ہر دور میں خدا اپنے دین کے حق میں
کچھ امکانات کھولتا ہے۔ اس وقت ضرورت ہوتی ہے کہ کچھ لوگ ہوں جو خدا کے اشارہ کو سمجھیں اور خدا کے
منصوبہ میں اپنے آپ کو شامل کر دیں۔ صحابہ کرام وہ خوش نصیب لوگ ہیں جنھوں نے اپنے زمانہ میں خدائی منصوبہ
کو سمجھا اور اپنے آپ کو پوری طرح اس کے حوالہ کر دیا۔ اس کا نتیجہ وہ عظیم انقلاب تھا جس نے انسانی تاریخ
کے رخ کو موڑ دیا۔

بارش کا آنا خدا کے ایک منصوبہ کا خاموش اعلان ہے۔ یہ کہ آدمی اپنا بیج زمین میں ڈالے تاکہ خدا
اپنے کائناتی انتظام کو اس کے موافق کر کے اس کے بیج کو ایک پوری فصل کی صورت میں اس کی طرف لوٹائے۔
کسان اس خدائی اشارہ کو فوراً سمجھ لیتا ہے اور اپنے آپ کو اس خدائی منصوبہ میں پوری طرح شامل کر دیتا ہے۔
اس کا نتیجہ ایک لہلہاتی ہوئی فصل کی صورت میں اس کو واپس ملتا ہے۔ اسی طرح موجودہ زمانہ میں، ہزار سالہ
عمل کے نتیجہ میں، اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کے حق میں کچھ نئے مواقع کھولے تھے۔ یہ مواقع کہ اقتدار کا حریف
بنے بغیر توحید اور آخرت کی دعوت کو عام کیا جائے۔ جو کام پہلے معجزاتی سطح پر انجام دینا پڑتا تھا، اس کو عام
طبیعیاتی استدلال کی سطح پر انجام دیا جائے۔ جو کام پہلے تعصب کے ماحول میں کرنا پڑتا تھا اس کو مذہبی رواداری

کے ماحول میں کیا جائے۔ جو کام پہلے "حیوانی رفتار" سے کیا جاتا تھا اس کو "مشینی رفتار" کے ساتھ انجام دیا جائے۔

یہ موجودہ زمانہ میں خدا کا منصوبہ تھا۔ خدا نے سارے بہترین امکانات کھول دئے تھے اور اب صرف اس کی ضرورت تھی کہ خدا کے کچھ بندے ان کو استعمال کر کے ان امکانات کو واقعہ بننے کا موقع دیں۔ مگر مسلم قیادت خدا کے اس منصوبہ میں شامل ہونے کے لئے تیار نہ ہوئی۔ اس نے نئے نئے عنوانات کے تحت وہی سیاسی جھگڑے دوبارہ چھیڑ دئے جن کو خدا نے ہزار سالہ عمل کے نتیجہ میں ختم کیا تھا۔ انھوں نے اسلامی دعوت کو سیاسی اور قومی دعوت بنا کر دوبارہ اسلام کو اقتدار کا حریف بنا دیا اور کہا کہ یہی عین خدا کا پسندیدہ دین ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مدعو قوموں کے ساتھ ہر جگہ بالکل بے فائدہ قسم کی مقابلہ آرائی شروع ہو گئی اور سارے نئے امکانات غیر استعمال شدہ حالت میں پڑے رہ گئے۔ مسلمانوں اور دیگر قوموں کے درمیان داعی اور مدعو کا رشتہ قائم نہ ہو سکا۔

کام کی ایک سو سال سے بھی زیادہ لمبی مدت مسلمانوں نے کھو دی۔ یہاں تک کہ شیطان نے بیدار ہو کر قدیم شرک کی جگہ جدید شرک (کمیونزم) کی صورت میں کھڑا کر دیا۔ اب کم از کم کمیونزم کے زیر تسلط علاقوں میں دوبارہ کام کرنے کی وہی مشکلات پیدا ہو گئی ہیں جو اس سے پہلے شرک کے زیر تسلط علاقوں میں پائی جاتی تھیں۔ تاہم غیر کمیونسٹ دنیا میں اب بھی کام کے مواقع کھلے ہوئے ہیں اور یہاں پندرھویں صدی ہجری میں اس صالح جد و جہد کا آغاز کیا جا سکتا ہے جو چودھویں صدی ہجری میں نہ کیا جا سکا۔

آزادی نے ہمیں
ترقّی کا موقع دیا
نیا 20 نکاتی
پروگرام
راہ دکھاتا اور تحریک
دیتا ہے
"قوم کے لئے یہ کارروائی نامہ
ترقی کے مجموعی منصوبے سے منسلک کیا گیا ہے۔ یہ ان میدانوں
کی نشاندہی کرتا ہے جن میں خصوصی کام کرنے سے مختلف طبقوں
کے لئے فوری اور واضح نتائج برآمد ہو سکتے ہیں"
اسے کامیابی سے بروئے کار لانے کے لئے
ہر ایک شخص ہی کے تعاون کی ضرورت ہے۔
آیئے مل جل کر ایک ٹیم کی طرح کام کریں
"یہ پروگرام آپ سب کے لئے اور اس ملک کے لئے ہے جو
ہمارا ملک ہے۔ جس کی خدمت، نشو و نما اور تعمیر ہمیں کرنی ہے۔
اس پروگرام کو کامیاب بنانے کے لئے میں آپ سے پورے دلی
تعاون کی مانگ کرتی ہوں"
— وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی
آزادی کا 36 واں سال —— 9 ویں ایشیائی کھیلوں کا سال
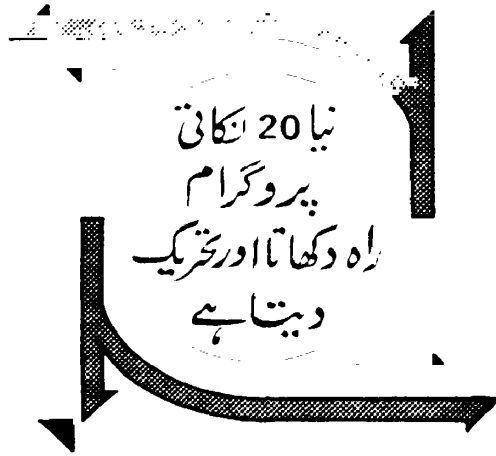
davp 82/211

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیتہ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ سے شائع کیا

REGD.NO. D. (DN) 532

ISSUE NO. 70
SEPTEMBER 1982

AL-RISALA MONTHLY
JAMIAT BUILDING QASIMJAN STREET DELHI-110006 (INDIA) PHONE 232231

الرسالہ

سرپرست
مولانا وحیدالدین خاں

زندگی مسلسل امتحان ہے۔ یہاں دس بار گرنے کے بعد
گیارھویں بار اٹھ جانے کا نام کامیابی ہے

اکتوبر ۱۹۸۲ ☐ قیمت فی پرچہ — تین روپے ☐ شمارہ ۷۱

اسلامی مرکز کا ترجمان

الرسالہ

اکتوبر ۱۹۸۲
شمارہ ۷۱

جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۱۱۰۰۰۶ (انڈیا)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نئی مطبوعات اسلامی مرکز

تذکیر القرآن جلد اول (سورہ فاتحہ تا سورہ توبہ) ہدیہ مجلد	۵۰ روپے
احیائے اسلام	۱۲ "
حقیقتِ حج	ایک روپیہ پچاس پیسے
حیات طیبہ	۳ روپے
محمد دی آئیڈیل کرکٹر (انگریزی)	۳ روپے

——— مکتبہ الرسالہ

زر تعاون سالانہ ۳۶ روپیہ • خصوصی تعاون سالانہ دو سو روپے • بیرونی ممالک سے ۲۰ ڈالر امریکی

کتنا فرق

ہمارے اخبارات و رسائل میں جو موضوعات بہت زیادہ رائج ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب کوئی شخصیت اپنی عمر پوری کر کے اگلی دنیا کی طرف جاتی ہے تو بڑے جذباتی قسم کے مضامین شائع کئے جاتے ہیں ——

روشن چراغ بجھ گیا، آفتاب علم غروب ہو گیا، ملت کا چاند دنیا سے چلا گیا وغیرہ۔ اس قسم کی سرخیاں مرنے والوں کے بعد ہماری صحافت میں اتنی بار شائع ہو چکی ہیں کہ اگر واقعۃً یہ صحیح ہوں تو اب تک اتنا زیادہ اندھیرا چھا جانا چاہئے کہ ان سرخیوں کو پڑھنا بھی کسی آنکھ والے کے لئے ممکن نہ رہے۔

"اک چراغ اور بجھا اور بڑھا سناٹا" یہ سرخی یا اس کے ہم معنیٰ سرخی ہمارے اخبارات و رسائل میں عام ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ہر مرنے والا جب صرف ہماری ویرانی اور ہماری تاریکی میں اضافہ کر رہا ہے تو اس کے بعد عقل کس کے پاس ہوگی اور روشنی کہاں باقی رہے گی۔ اور جب روشنی اور عقل رخصت ہو جائے تو کون دیکھنے والا ہوگا جو دیکھے اور کون سمجھنے والا ہوگا جو سمجھے۔

یہ دور زوال کی بات ہے۔ مگر جب ملت زندہ تھی تو کیا حال تھا، اس کی ایک مثال لیجئے۔ اموی خلیفہ عبد الملک بن مروان کا انتقال ۸۶ھ میں ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب اس کا انتقال ہوا تو اس کے لڑکے ولید نے اس کی نماز جنازہ پڑھائی۔ اس وقت اس کے دوسرے لڑکے ہشام کی زبان سے یہ شعر نکلا :

فما كان قيس هُلكه هلك واحدٍ ولكنه بنيان قوم تهدّما

قیس کی موت تنہا ایک شخص کی موت نہیں بلکہ اس کے مرنے سے قوم کی بنیاد منہدم ہو گئی

یہ سن کر ولید نے کہا، چپ ہو! تو شیطان کی زبان سے بول رہا ہے۔ تو نے اس طرح کیوں نہ کہا جس طرح ایک اور شاعر نے کہا ہے :

اذا مات منا سيدٌ قام سيدٌ قؤولٌ لما قال الكرام فعولُ

جب ہم میں سے کوئی سردار مرتا ہے تو دوسرا سردار کھڑا ہو جاتا ہے اور وہ وہی کرتا اور کہتا ہے جو شریف لوگ کہتے اور کرتے ہیں۔

دور زوال میں جب کوئی شخص مرتا ہے تو وہ دوسروں کو صرف مرثیہ کا سبق دیتا ہے۔ دور عروج میں جب کوئی مرتا ہے تو دوسروں کو حوصلہ دے کر نئی زندگی عطا کر دیتا ہے۔

قرآن میں تکرار

قرآن میں مضامین کی تکرار ہے۔ اللہ اگر چاہتا تو ہر لفظ میں ایک بالکل نئی بات کہتا۔ مگر ذہن سازی کی حکمت کے پیش نظر قرآن میں کچھ خاص مضامین بار بار دہرائے گئے ہیں۔ اس واقعہ کو قرآن کے مخالفین نے ایک شوشہ بنالیا اور اس کی بنا پر اس کا مذاق اڑانے لگے:

وقالوا اساطیر الاولین اکتتبها فهی تملیٰ علیه بکرة واصیلا (الفرقان ۶)

اور وہ کہتے ہیں کہ یہ پچھلوں کے قصے ہیں جن کو اس نے لکھ رکھا ہے۔ پس وہی لکھوائی جاتی ہیں اس کے پاس صبح وشام

مولانا شبیر احمد عثمانی اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مکہ کے مخالفین اسلام کہتے تھے کہ "محمدؐ نے اہل کتاب سے کچھ قصے کہانیاں سن کر نوٹ کر لی ہیں یا کسی سے نوٹ کرا لی ہیں۔ وہی شب وروز ان کے سامنے پڑھی اور رٹی جاتی ہیں۔ نئے نئے اسلوب سے ان ہی باتوں کا الٹ پھیر رہتا ہے اور کچھ بھی نہیں"

اس قسم کی باتیں وہی لوگ کہتے ہیں جو سچائی کے معاملہ میں سنجیدہ نہ ہوں۔ اگر وہ سنجیدگی کے ساتھ معاملہ کو سمجھیں تو انھیں معلوم ہو کہ جس چیز کو وہ تکرار کہہ رہے ہیں وہ ایک فطری ضرورت ہے۔

دنیا میں کوئی ایسا آدمی نہیں جو "تکرار" میں مبتلا نہ ہو۔ سگرٹ پینے والا ہر روز اسی سگرٹ کی تکرار کرتا ہے۔ چائے پینے والا ہر روز اسی چائے کی تکرار کرتا ہے۔ ماں یا باپ جب روزانہ اپنے بچہ کو پیار کرتے ہیں تو وہ اسی ایک چیز کی تکرار کرتے ہیں۔ ہر آدمی کی کوئی مرغوب چیز ہوتی ہے اور ہر روز وہ اسی کی تکرار کرتا رہتا ہے۔ اس کے باوجود اس کو تکرار کا احساس نہیں ہوتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تکرار آدمی کی فطرت ہے۔ البتہ جس چیز سے اسے دلچسپی ہو اس کی تکرار کرنے سے وہ نہیں اکتائے گا اور جس چیز سے اس کو دلچسپی کا تعلق نہ ہو اس کی تکرار اسے ناگوار معلوم ہو گی۔

قرآن چاہتا ہے کہ ربانی باتیں آدمی کو اس درجہ محبوب ہو جائیں کہ ان کے معاملہ میں تکرار کا احساس اس کے اندر ختم ہو جائے۔ قرآن ایسے ہی انسان پیدا کرنا چاہتا ہے۔

قرآن کا مطلوب انسان وہ ہے جس کے لئے قرآنی باتیں اتنی لذیذ بن جائیں کہ ان کی بار بار تکرار صرف اس کی لذت میں اضافہ کرے۔ وہ ان باتوں کے اعادہ سے اکتائے نہیں بلکہ ان کو اپنے ذہن کی غذا بنائے۔ ہر تکرار میں اس کو نئی لذت ملے، قرآنی مضامین کا ہر اعادہ اس کو ازسرنو معانی کے سمندر میں غرق کر دے۔

یہ تضاد

ہمارے سامنے ایک دینی پرچہ (اگست ۱۹۸۲) ہے جس کا مقصد "اشاعت اسلام کی عالمی مہم" ہے۔ پہلا ورق کھولتے ہی قاری کے سامنے یہ عبارت آتی ہے: "عید اس کی نہیں جس نے کھایا پیا اور مزے اڑائے بلکہ عید درحقیقت اس کی ہے جس نے اپنے عمل کو اللہ کے لئے خالص کر لیا"

بعد کے مضامین میں ایک وہ ہے جو ایڈیٹر صاحب کے بیرون ملک سفر کی روداد پر مشتمل ہے۔ اس میں "آرام دہ کار پر سفر" اور "پر تکلف دعوت" کے تذکروں کے ساتھ اپنی بیٹی اور داماد سے ملاقات کا حال بھی درج ہے جو مذکورہ بیرونی شہر میں مقیم ہیں۔ فرماتے ہیں ــــــ "اسی شہر کے ایک محلہ میں بشریٰ بیٹی کا مکان ہے۔ چھوٹا سا صاف ستھرا مکان جس میں ضرورت، آرائش اور آرام کی ہر چیز الحمدللہ موجود ہے۔ مکان دیکھ کر اور بشریٰ بیٹی کو خوش و خرم پا کر بے اختیار خوشی کی ایسی کیفیت پیدا ہوئی جس کو میں برداشت نہ کر سکا اور بیڈ پر دراز ہو گیا۔"

اس عبارت میں جس نفسیات کی تصویر ہے وہی آج تمام داعیان دین اور مفکرین اسلام کا حال ہے۔ دوسروں کو وہ "ضرورت" پر قانع اور شکر گزار بننے کا درس دیتے ہیں اور خود اپنے لئے "آرام و آسائش کی ہر چیز" جمع کر کے الحمدللہ کہنا چاہتے ہیں۔ دوسروں کے لئے وہ ایسا اسلام پسند کرتے ہیں جس میں آدمی اپنے عمل کو اللہ کے لئے خالص کرنے کو "عید" سمجھے اور خود اپنے لئے انھوں نے ایسا اسلام دریافت کر رکھا ہے جس میں کھانے پینے اور مزے اڑانے کا نام "عید" ہوتا ہے۔

آج کوئی اسلام کا علم بردار ایسا نہیں جس کو اس بات پر خوشی ہو کہ اس کے بیٹے اور بیٹی دین کی خاطر اپنے ماحول میں اجنبی ہو گئے ہیں۔ یوم الحساب کے خوف نے ان سے ان کے چہرے کی شادابی چھین لی ہے۔ آخرت کی جنت کی تلاش میں دنیا کی جنت کا سرا ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے۔ خدا کی یاد نے ان کے ذہنوں پر اتنا غلبہ حاصل کیا ہے کہ اب کسی اور چیز کی یاد میں ان کے لئے لذت باقی نہیں رہی۔

لوگ اگر اس اسلام کو خود اختیار کر لیں جس کی وہ دوسروں کو دعوت دیتے ہیں تو ان کی ساری عافیت ختم ہو جائے۔ ان کا اپنا گھر ان کے لئے وہ میدان جہاد بن جائے جس کو ہر ایک نے صرف دور کے کسی مقام پر تلاش کر رکھا ہے۔

کام یا نام

مولانا شبلی نعمانی سے کسی نے پوچھا کہ بڑا آدمی بننے کا آسان نسخہ کیا ہے۔ انھوں نے جواب دیا ـــــ کسی بڑے آدمی کے اوپر کیچڑ اچھالنا شروع کر دو۔

اصل یہ ہے کہ کام کی دو قسمیں ہیں۔ ایک کام وہ ہے جو معروف میدانوں میں ہوتا ہے، دوسرا وہ جو غیر معروف میدان میں کیا جاتا ہے۔ معروف میدان میں زور دکھانے والا آدمی فوراً لوگوں کی نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔ اس کے برعکس غیر معروف میدان میں محنت سے آدمی کو نہ شہرت ملتی ہے اور نہ مقبولیت۔ جس چیز کا عوام میں چرچا ہو اس کے ساتھ اپنے کو ملانے میں آپ کا چرچا بھی بڑھے گا۔ اور جس چیز کا عوام میں چرچا نہ ہو اس کے ساتھ لگنے میں آپ بھی چرچے سے محروم رہیں گے۔

اگر آپ کسی مسلمہ شخصیت کے خلاف بولنے لگیں۔ کسی مشہور معاملہ کو اپنا نشانہ بنائیں، کسی حکومت سے ٹکراؤ شروع کر دیں۔ کوئی عالمی عنوان لے کر جلسہ جلوس کی دھوم مچائیں تو فوراً آپ اخبارات کے صفحہ اول میں چھپنے لگیں گے۔ لوگوں کے درمیان آپ پر تبصرے شروع ہو جائیں گے۔ آپ بہت سے لوگوں کے خیالات کا مرجع بن جائیں گے۔ آپ جلسہ کا اعلان کریں گے تو بھیڑ کی بھیڑ وہاں جمع ہو جائے گی۔ آپ چندے کا مطالبہ کریں گے تو لوگ آپ کو روپیہ میں تول دیں گے۔

لیکن اگر آپ خاموش تعمیری کاموں میں اپنے آپ کو لگائیں۔ "گنبد" کے بجائے "بنیاد" سے اپنے کام کا آغاز کریں۔ انقلابی پوسٹر چھاپنے کے بجائے خاموش جدوجہد کو اپنا شعار بنائیں۔ ملت کا جھنڈا بلند کرنے کے بجائے فرد کی اصلاح پر محنت کریں۔ سیاسی ہنگامہ چھیڑنے کے بجائے غیر سیاسی میدان میں اپنے کو مشغول کریں، تو حیرت انگیز طور پر آپ دیکھیں گے کہ آپ کے گرد نہ ساتھیوں کی بھیڑ ہے اور نہ چندہ دینے والوں کی قطاریں۔ آپ کا نام نہ اخباروں کی سرخیوں میں جگہ پا رہا ہے اور نہ پُر رونق جلسوں کے ڈائس کی زینت بن رہا ہے۔

مگر یہی دوسرا کام کام ہے۔ اسی کے ذریعہ کسی حقیقی نتیجہ کی امید کی جا سکتی ہے۔ اس کے برعکس پہلا کام کام کے نام پر استحصال ہے۔ اس سے شخصی قیادتیں تو ضرور چمکتی ہیں مگر قوم اور ملت کو اس سے کچھ ملنے والا نہیں ہے۔ ایک اگر کام ہے تو دوسرا صرف نام۔

جگانے کے لئے

سلطان عبدالرحمٰن الناصر اسپین کا ایک مسلم حکمراں تھا۔ اس نے ۲۵ سال کی محنت سے قرطبہ کے پاس ایک شان دار محل بنایا۔ یہ محل چار میل لمبی اور تین میل چوڑی زمین پر واقع تھا، سیکڑوں تاج محل اکٹھا کئے جائیں تب اس کا محل تیار ہوگا۔ اس محل کا نام اس نے الزہرار رکھا۔ مگر غیر معمولی طور پر بڑا ہونے کی وجہ سے اس کو قصر الزہرار کے بجائے مدینۃ الزہرار کہنے لگے۔

سلطان عبدالرحمٰن الناصر کے زمانہ میں ایک بار اسپین میں قحط پڑا۔ بارش رک جانے کی وجہ سے لوگ بے حد پریشان ہو گئے۔ جب حالات بہت سخت ہوئے تو سلطان نے اپنا ایک خاص آدمی قاضی منذر بن سعید کے پاس بھیجا جو قرطبہ کی جامع مسجد کے امام اور قاضی تھے۔ قاصد نے قاضی منذر سے کہا کہ سلطان نے مجھ کو یہ پیغام لے کر بھیجا ہے کہ آپ استسقار کی نماز پڑھائیں۔ اور اللہ تعالیٰ سے بارش کی دعا کریں۔ قاضی منذر نے پوچھا کہ سلطان خود کیا کر رہے ہیں۔ قاصد نے جواب دیا کہ آج سے زیادہ ہم نے کبھی سلطان کو اللہ سے ڈرنے والا نہیں دیکھا۔ میں ان کو اس حال میں چھوڑ کر آیا ہوں کہ وہ زمین پر سجدہ میں پڑے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور وہ کہہ رہے تھے کہ خدایا میری پیشانی تیرے ہاتھ میں ہے۔ کیا تو میری وجہ سے لوگوں کو عذاب دے گا، حالاں کہ تو سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے (ھٰذہ ناصیتی بیدک اتراک تعذب بی الرعیۃ وانت الرحم الراحمین)

قاضی منذر نے کہا: اپنے ساتھ بارش لے کر واپس جاؤ۔ کیونکہ زمین کا حاکم جب تضرع کرتا ہے تو آسمان کا حاکم ضرور رحم فرماتا ہے (اذا خشع جبار الارض فقد رحم جبار السماء) چنانچہ قاصد واپس ہو کر سلطان کے پاس پہنچا تھا کہ بارش شروع ہو گئی۔

زمین پر خشک سالی اس لئے آتی ہے تاکہ آنکھوں کی خشک سالی ختم ہو۔ آسمان پر بادل اس لئے گرجتے ہیں تاکہ لوگوں کے دل خدا کے خوف سے دہلیں۔ گرمی کی شدت اس لئے ہوتی ہے کہ لوگ جہنم کی آگ کو یاد کرکے تڑپ اٹھیں۔ صحابہ کرام کا یہ حال تھا کہ تیز آندھی آتی تو وہ مسجد کی طرف بھاگتے کہ کہیں قیامت نہ آگئی ہو۔ مگر جب بے حسی پیدا ہو جائے تو کوئی بھی واقعہ لوگوں کے دلوں کو نہیں پگھلاتا۔ خدا کی نشانیاں ان کے پاس گرجتی ہیں مگر ان کے کان ان کو نہیں سنتے۔ خدا روشن سورج بن کر ان کے سامنے آجاتا ہے۔ اس کے باوجود ان کی آنکھیں اس کو دیکھنے سے محروم رہتی ہیں۔ اسی لئے حدیث میں آیا ہے کہ لوگوں میں سب سے زیادہ خدا سے دور وہ ہیں جس کا دل بے حس ہو گیا ہو (ان ابعد الناس من اللہ القلب القاسی)

اچھا گمان رکھئے

خلیفہ منصور عباسی وہ شخص ہے جس نے بغداد کا شہر بنایا۔ عباسی دور میں بغداد کو اتنی ترقی ہوئی کہ وہ دنیا کا سب سے عظیم شہر بن گیا۔

بغداد جیسے ایک شہر کی تعمیر بڑا مہنگا منصوبہ تھا۔ چنانچہ کچھ دنوں کے بعد خلیفہ منصور کو اس کے اخراجات بہت گراں گزرنے لگے۔ یہ دیکھ کر اس کے ایک درباری ابوایوب موریانی نے خلیفہ کو مشورہ دیا کہ کسریٰ کے محل جو بغداد سے کچھ فاصلہ پر ہیں ان کو توڑ دیا جائے اور ان کا اینٹ پتھر بغداد کی تعمیر میں استعمال کیا جائے۔

خلیفہ منصور کے وزیر خالد بن برمک کو اس کی خبر ہوئی تو اس نے کہا کہ "امیرالمومنین، ایسا نہ کیجئے۔ کسریٰ کے محل اسلام کی فتح کی نشانی ہیں۔ ان کو دیکھ کر ہماری نسلوں کے اندر اسلام کی عظمت کا یقین بڑھتا ہے۔ مزید یہ کہ اس کو توڑنے کا جو خرچ ہے وہ اس سے حاصل ہونے والے فائدے سے زیادہ ہے"۔ مگر خلیفہ منصور نے خالد بن برمک کی رائے کی پرواہ نہیں کی۔ اس نے کہا "تم کسریٰ کے محل کو توڑنے کی مخالفت اس لئے کر رہے ہو کہ تمھارے اندر ابھی تک عجمیت کا تعصب پایا جاتا ہے"۔ خالد بن برمک عجمی (ایرانی) تھا، خلیفہ منصور نے اس کی رائے کو اس کے ایرانی النسل ہونے کے پس منظر میں دیکھا اور سمجھا کہ وہ کسریٰ کا محل توڑنے کی مخالفت اس لئے کر رہا ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ کسریٰ کی عظمت کا نشان باقی رہے۔

خلیفہ منصور نے کسریٰ کے محل کو توڑنے کا حکم دے دیا۔ مزدوروں اور کارکنوں کی ایک فوج اس کام پر لگ گئی کہ وہ محل کو توڑے اور اس کے پتھروں کو گدھوں اور خچروں پر لاد کر بغداد لے آئے۔ مگر بہت جلد منصور کو اندازہ ہوا کہ اس طرح جتنا عمارتی سامان ملتا ہے اس سے زیادہ اس کے اوپر خرچ ہو رہا ہے۔ چنانچہ اس نے درمیان ہی میں اس کام کو روک دیا۔

کسی کے مشورہ کو مشورہ کی حیثیت سے دیکھئے، اس کو بدنیتی پر محمول نہ کیجئے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کا قیاس غلط ہو اور مشورہ دینے والے نے واقعی وہ مشورہ دیا ہو جو آپ کے لئے سب سے بہتر اور مفید ہے۔

آدمی بدل جاتا ہے

عبدالملک بن مروان ایک اموی خلیفہ تھا، خلیفہ بننے سے پہلے عبدالملک کا شمار بڑے فقہا میں ہوتا تھا۔ وہ زیادہ تر مسجد میں رہتا اور عبادت اور دینی مطالعہ میں مشغول رہتا تھا۔ حتیٰ کہ لوگ اس کو حمامۃ المسجد (مسجد کا کبوتر) کہنے لگے تھے۔ ۶۵ھ میں جب اس کے باپ مروان بن الحکم کا انتقال ہوا تو اس وقت وہ مسجد میں قرآن پڑھ رہا تھا۔ محل کا آدمی اس کے پاس خبر لے کر گیا اور کہا کہ آج سے آپ امیرالمومنین ہیں۔ عبدالملک نے یہ سنا تو فوراً قرآن کو بند کر کے طاق پر رکھ دیا اور کہا:

ھٰذا افتراق بینی و بینک　　　　آج سے میرے اور تمہارے درمیان جدائی ہے۔

خلافت کے تخت پر بیٹھنے کے بعد عبدالملک بالکل دوسرا انسان بن گیا۔ اب اس کا سارا وقت دنیا کی چیزوں میں گزرنے لگا۔ یہی وہ اموی خلیفہ ہے جس نے حجاج بن یوسف جیسے ظالم کو گورنر بنا کر اس کو لوگوں کے اوپر مسلط کیا۔ اس نے عبداللہ بن زبیر اور مصعب بن زبیر اور دوسرے بے شمار لوگوں کو قتل کرایا۔ اس نے اپنے سیاسی حریفوں کو ختم کرنے کے لئے کعبہ پر منجنیق سے پتھر برسائے، وغیرہ

عبدالملک نے ایک روز سعید بن مسیب سے کہا "سعید اب میرا یہ حال ہے کہ جب میں کوئی نیک کام کرتا ہوں تو میرے دل کو کوئی خوشی نہیں ہوتی اور جب کوئی برائی کرتا ہوں تو اس کا مجھے کوئی رنج نہیں ہوتا۔ سعید بن مسیب نے جواب دیا:

اس کا مطلب یہ ہے کہ اب تمہارا دل پوری طرح مر چکا ہے۔

یہی ہر اس آدمی کا حال ہوتا ہے جو اوپری سطح پر دین دار نظر آتا ہو مگر وہ اپنی پوری ہستی کے ساتھ دین دار نہ بنا ہو۔ ایسے آدمی کو جب کوئی جھٹکا لگتا ہے تو اچانک اس کا ظاہری لبادہ اتر جاتا ہے اور اندر کا واقعی انسان ننگا ہو کر سامنے آجاتا ہے۔ ایک شخص بظاہر دین دار ہے مگر کوئی بڑائی ملتے ہی اس کی دین داری ختم ہو جاتی ہے۔ ایک شخص بہت شریف بنا ہوا ہے لیکن اگر کسی سے اس کو شکایت ہو جائے تو اس کے لئے وہ اچانک ایک ظالم انسان بن جاتا ہے۔ ایک شخص مسکینی کے ساتھ لوگوں کے درمیان رہ رہا ہے لیکن اگر اس کو دولت مل جائے تو اس کے بعد وہ ایک متکبر انسان کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ ایک شخص لکھنے اور بولنے میں انصاف کی باتیں کرتا ہے۔ لیکن اگر کوئی ایسا معاملہ سامنے آجائے جس میں اس کو اختیار حاصل ہو تو وہ ایسے پہلو کی طرف جھک جائے گا جو اس کی ذاتی دلچسپی کا ہو۔ وہ انصاف کے مطابق فیصلہ کرنے کے بجائے اپنے مفاد کے مطابق فیصلہ کرے گا، وغیرہ۔

حیاتِ طیبہ

از

مولانا وحید الدین خاں

مکتبہ الرسالہ جمعیتہ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

مطبوعات اسلامی مرکز

سال اشاعت ۱۹۸۲

قیمت دو روپیہ پچاس پیسے

ناشر مکتبہ الرسالہ
جمعیتہ بلڈنگ
قاسم جان اسٹریٹ۔ دہلی ۶

طابع: جے کے آفسٹ پرنٹرز۔ دہلی ۶

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلام کے سادہ اور مختصر تعارف کے لئے کتابوں کے ایک سٹ کی ضرورت عام ط
پر محسوس کی جاتی رہی ہے۔ یہ سٹ بچوں کے لئے درسی نصاب کے طور پر استعمال ہوگا اور ا
کے ساتھ بڑوں کے درمیان اسلام کے تعارفی مطالعہ کے لئے بھی کار آمد ہوگا۔
اس سلسلے میں خدا کے فضل سے پانچ مختصر کتابوں کا ایک سٹ تیار ہوگیا ہے
یہ سٹ بالترتیب حسب ذیل ہے :

۱۔ سچا راستہ
۲۔ دینی تعلیم
۳۔ حیات طیبہ
۴۔ باغ جنت
۵۔ نار جہنم

زیر نظر رسالہ (حیات طیبہ) اس سلسلہ کا تیسرا نمبر ہے۔ فی الحال یہ مکمل سٹ اردو ز بان
میں شائع کیا جارہا ہے۔ اس کے بعد انشاء اللہ اس کو دوسری زبانوں میں بھی شائ
کیا جائے گا۔
حیات طیبہ نامی زیر نظر کتاب تمام کی تمام قرآنی آیتوں کے ترجمہ پر مشتمل ہے۔ اس م
کوئی تعبیری یا تشریحی اضافہ نہیں کیا گیا ہے۔ قرآنی آیات کا انتخاب ایک خاص ترتیب :
نقل کیا گیا ہے اور ہر ٹکڑے پر اس کے مضمون کی مناسبت سے ایک مختصر عنوان قائم کرد
گیا ہے۔ عنوان کے سوا پوری کتاب میں مرتب نے کوئی اور اضافہ نہیں کیا ہے۔ اس
طرح یہ رسالہ اسلام کے تعارف کے لئے ایک مستند اور براہ راست مجموعہ بن گیا ہے۔
زیر نظر کتاب کا نام قرآن کی اس آیت سے لیا گیا ہے :

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَّ

جو کوئی نیک کام کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت اور وہ ایمان والا ہو تو ہم اس کو دنیا

لَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (النحل ۹۷)

میں اچھی زندگی عطا کریں گے اور آخرت میں ان کے اچھے کاموں کے بدلے ان کا اجر عطا کریں گے

اس آیت میں حیات طیبہ سے کیا مراد ہے، اس کی وضاحت آیت کے اگلے ٹکڑے (باحسن ما کانوا یعملون) سے ہو رہی ہے۔ اس سے مراد حسن عمل کی زندگی ہے۔ صحابہ اور تابعین عام طور پر اس کا یہی مفہوم لیتے تھے جس کی ترجمانی ضحاک کے اس قول سے ہوتی ہے کہ اس سے مراد دنیا میں رزق حلال پر قانع رہنا اور خدا کی عبادت کرنا ہے (ھی الرزق الحلال والعبادۃ فی الدنیا، تفسیر ابن کثیر)

اللہ پر ایمان لانا اور اللہ کے احکام کی تعمیل میں لگنا اپنے آپ کو اللہ کی نصرت کا مستحق بنانا ہے۔ جب کوئی شخص ایسا کرتا ہے تو اس کو خدا کا خصوصی فیضان ملنا شروع ہو جاتا ہے۔ عبادت کے وقت اس کو قربت خداوندی کا تجربہ ہونے لگتا ہے۔ زندگی کے مشاغل میں پھنسنے کے باوجود وہ خدا کی یاد سے غافل نہیں ہونے پاتا۔ دنیا کی چیزوں میں اس کو عبرت اور نصیحت کی غذا ملتی ہے۔ معاملات اور مسائل میں اس کو خدائی طریقہ اختیار کرنے کی توفیق حاصل ہوتی ہے۔ دوستی ہو یا دشمنی ہر حال میں اس کے اندر یہ جذبہ ابھرتا ہے کہ وہ حق پر قائم رہے۔ وہ اپنی زندگی کے ہر معاملہ میں اس صراط مستقیم پر چلنے لگتا ہے جو خدا کو پسند ہے۔

یہ حیات طیبہ اپنی فکری اور عملی تفصیلات میں کیسی ہوتی ہے اس کو قرآن میں بہت واضح طور پر بتا دیا گیا ہے۔ زیر نظر کتاب میں قرآن کی ان آیتوں کا انتخاب کیا گیا ہے جن سے اس حیات طیبہ کے مختلف بنیادی پہلو قرآن کے مخصوص اسلوب میں سامنے آتے ہیں۔ اس طرح یہ اقتباسات گویا حیات طیبہ کا تعارف بھی ہیں اور اس کا مستند نمونہ بھی۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ان کتابوں کو ایک مفید دعوتی اور تعلیمی مجموعہ بنائے۔

وحید الدین ۲۳ مئی ۱۹۸۲

اللہ ایک ہے

کہو وہ اللہ ایک ہے ۔ اللہ بے نیاز ہے۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے نہ وہ کسی کی اولاد ہے۔ اس کا کوئی ہمسر نہیں۔ (سورہ اخلاص)۔ لوگو عبادت کرو اپنے رب کی جس نے تم کو اور تم سے قبل والوں کو پیدا کیا تاکہ تم بچ جاؤ۔ وہی ہے جس نے تمھارے لئے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنادیا۔ اور اوپر سے پانی برسایا۔ پھر تمھاری غذا کے لئے ہر طرح کی پیداوار نکالی۔ پس تم کسی کو اللہ کا برابر نہ ٹھہراؤ حالانکہ تم جانتے ہو۔ (البقرہ ۲۲ — ۲۱)۔ یقیناً اللہ اس کو نہیں بخشے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے۔ اس کے سوا اور گناہوں کو معاف کردے گا جسے وہ معاف کرنا چاہے۔ جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا وہ گمراہی میں بہت دور نکل گیا۔ (النساء ۱۱۶)

سب سے اوپر، سب سے بڑا

اللہ، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ زندہ ہے، سب کو تھامے ہوئے ہے۔ اس کو نہ اونگھ لگتی اور نہ نیند آتی۔ زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے اسی کا ہے۔ کون ہے جو اس کے سامنے بغیر اس کی اجازت کے سفارش کرسکے۔ جو کچھ لوگوں کے سامنے ہے اور جو کچھ ان سے اوجھل ہے سب کا اسے علم ہے۔ اس کے علم کے کسی گوشہ پر بھی کوئی شخص حاوی نہیں ہوسکتا مگر جو وہ چاہے۔ اس کا اقتدار آسمانوں اور زمین پر چھایا ہوا ہے۔ ان کی نگہبانی اس کے لئے تھکا دینے والا کام نہیں۔ وہی سب سے اوپر ہے وہی سب سے بڑا۔ (البقرہ ۲۵۵)

اللہ کی نشانیاں

تمھارا رب اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا، پھر اپنے عرش پر متمکن ہوا۔ وہ رات کو دن پر ڈھانکتا ہے، دن رات کے پیچھے دوڑا چلا آتا ہے۔ سورج اور چاند اور ستارے اس کے حکم کے تابع ہیں۔

آگاہ، اسی کا کام ہے پیدا کرنا اور اسی کے لئے ہے حکم فرمانا۔ بڑی برکت والا ہے، اللہ جو رب ہے سارے جہان کا۔ اپنے رب کو پکارو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے، یقیناً وہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ زمین میں خرابی نہ ڈالو اس کی اصلاح کے بعد اور اللہ کو پکارو ڈر کے ساتھ اور امید کے ساتھ۔ بیشک اللہ کی رحمت نیک کام کرنے والوں کے قریب ہے۔ اور وہ اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو اپنی رحمت سے پہلے خوش خبری لئے ہوئے بھیجتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ بھاری بادلوں کو اٹھالیتی ہیں تو ہم ان کو کسی مردہ بستی کی طرف ہانک دیتے ہیں، پھر ہم اس بادل سے پانی نکالتے ہیں، اس کے بعد ہم اس سے طرح طرح کے پھل نکالتے ہیں اسی طرح ہم مردوں کو نکالیں گے، تاکہ تم غور کرو ۔ اور جو زمین اچھی ہوتی ہے وہ اپنے رب کے حکم سے اپنا اپنا سبزہ نکالتی ہے اور جو زمین خراب ہوتی ہے اس سے ناقص پیداوار کے سوا اور کچھ نہیں نکلتا، اس طرح ہم نشانیوں کو پھیر پھیر کر بیان کرتے ہیں ان لوگوں کے لئے جو شکر کرنے والے ہیں (الاعراف ۵۸-۵۴)

آسمانوں اور زمین میں

پس تسبیح کرو اللہ کی جب کہ تم شام کرتے ہو اور جب کہ تم صبح کرتے ہو اور اسی کے لئے حمد ہے آسمانوں میں اور زمین میں۔ اور اس کی تسبیح کرو تیسرے پہر اور جب کہ تم پر ظہر کا وقت آتا ہے۔ خدا زندہ میں سے مردہ کو نکالتا ہے اور مردہ میں سے زندہ کو نکالتا ہے اور زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے، اسی طرح تم لوگ بھی نکالے جاؤ گے۔ اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا۔ پھر یکایک تم بشر ہو کر زمین میں پھیل گئے اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمھارے لئے تمھاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور اس نے تمھارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کردی، یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو غور کرتے ہیں۔ اور اس کی نشانیوں میں سے ہے آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور تمھاری زبانوں اور تمھارے رنگوں کا اختلاف، یقیناً اس میں نشانیاں ہیں علم

والوں کے لئے۔ اور اس کی نشانیوں میں سے ہے تمھارا رات اور دن کا سونا اور تمھارا اس کے فضل کو تلاش کرنا، یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو سنتے ہیں۔ اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ تم کو بجلی کی چمک دکھاتا ہے خوف اور لالچ کے ساتھ، اور آسمان سے پانی برساتا ہے پھر اس کے ذریعہ سے زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے۔ یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل والے ہیں۔ اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم سے قائم ہیں، پھر جیسے ہی اس نے تم کو پکارا، تم اچانک زمین سے نکل آؤ گے۔ اور آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں سب اس کے بندے ہیں، سب اسی کے تابع ہیں۔ اور وہی ہے جو پیدائش کی ابتدا کرتا ہے پھر وہی ہے جو اس کا اعادہ کرے گا، اور یہ اس کے لئے بہت آسان ہے۔ اور آسمانوں اور زمین میں اس کی صفت سب سے برتر ہے اور وہ زبردست اور حکیم ہے (الروم ۲۷-۱۷)

کائنات کی پکار

بے شک اللہ دانہ اور گٹھلی کو پھاڑنے والا ہے۔ وہ زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے۔ اور وہی مردہ کو زندہ سے نکالنے والا ہے، پھر تم کدھر بہکے جا رہے ہو۔ وہی صبح کو نکالتا ہے۔ اس نے رات کو سکون کا وقت بنایا ہے۔ اس نے سورج اور چاند کا حساب مقرر کیا ہے۔ یہ سب عزیز و علیم کا ٹھہرایا ہوا اندازہ ہے۔ اور وہی ہے جس نے تمھارے لئے ستاروں کو بنایا تاکہ تم اس سے خشکی اور سمندر میں راستہ معلوم کرو۔ ہم نے نشانیاں کھول کر بیان کر دی ہیں ان لوگوں کے لئے جو علم رکھتے ہیں۔ اور وہی ہے جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا۔ پھر ہر ایک کے لئے ایک جائے قرار ہے اور ایک اس کے سونپے جانے کی جگہ۔ ہم نے نشانیاں کھول کر بیان کر دی ہیں ان لوگوں کے لئے جو سمجھ رکھتے ہیں۔ اور وہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا۔ پھر ہم نے اس کے ذریعہ سے ہر قسم کی نباتات اگائی۔ پھر ہم نے اس سے ہریالی پیدا کی جس سے ہم تہ بہ تہ چڑھے ہوئے دانے نکالتے ہیں۔ اور کھجور کے شگوفوں سے پھلوں کے گچھے جو بوجھ سے جھکے پڑتے ہیں اور انگور اور زیتون اور انار کے باغ جن کے پھل ایک دوسرے سے ملتے جلتے بھی ہیں اور پھر ایک دوسرے سے جدا جدا بھی۔ اس کے پھل کو دیکھو جب وہ پھلتا ہے اور اس کے پکنے کو، ان میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو ایمان لاتے ہیں۔ اور لوگوں نے جنوں کو اللہ کا شریک بنا لیا۔ حالانکہ خدا نے ان کو پیدا کیا ہے۔

اور انھوں نے خدا کے لئے بیٹے بیٹیاں گھڑ لیں بغیر علم کے، حالانکہ وہ پاک اور برتر ہے ان باتوں سے جو یہ لوگ کہتے ہیں۔ وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے۔ اس کا کوئی بیٹا کیسے ہو سکتا ہے حالانکہ کوئی اس کی شریک زندگی نہیں۔ اس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے یہ ہے اللہ تمہارا رب۔ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ وہ ہر چیز کا خالق ہے لہذا تم اسی کی عبادت کرو۔ اور وہ ہر چیز کا کفیل ہے۔ نگاہیں اس کو نہیں پا سکتیں اور وہ نگاہوں کو پالیتا ہے اور وہ باریک بین اور باخبر ہے (الانعام ۱۰۴ــــ ۹۶)

عرش عظیم والا

کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تمھیں بے کار پیدا کیا ہے اور تم کو ہماری طرف پلٹنا نہیں ہوگا۔ پس برتر ہے اللہ، بادشاہِ حقیقی، کوئی اس کے سوا معبود نہیں، وہ مالک ہے عرشِ عظیم کا۔ اور جو شخص اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو پکارے تو اس کے پاس اس کے لئے کوئی دلیل نہیں، اس کا حساب اس کے رب کے پاس ہے، ایسے منکر کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ اور کہو کہ اے ہمارے رب مغفرت فرما اور رحم کر، تو سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے (المومنون ۱۱۸ ــــ ۱۱۵)

محبت اللہ سے

بے شک آسمانوں اور زمین کی بناوٹ میں اور رات اور دن کے آنے جانے میں اور ان کشتیوں میں جو انسان کے نفع کی چیزیں لئے ہوئے سمندروں میں چلتی ہیں اور اس پانی میں جو اللہ نے اوپر سے اتارا پھر اس سے زمین کو موت کے بعد زندگی بخشی اور اس نے زمین میں ہر قسم کے جان دار پھیلا دیے اور ہواؤں کی گردش میں اور ان بادلوں میں جو آسمانوں اور زمین کے درمیان مسخر ہیں، نشانیاں ہیں عقل والوں کے لئے۔ اور لوگوں میں ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کا ہمسر بناتے ہیں، وہ ان سے محبت کرتے ہیں جیسی محبت اللہ کے ساتھ کرنی چاہئے۔ حالانکہ ایمان لانے والے اللہ کو سب سے زیادہ محبوب رکھتے ہیں۔ اور اگر یہ ظالم دیکھ لیں اس وقت کو جب کہ وہ عذاب کو دیکھیں گے کہ ساری قوت اللہ کے لئے ہے اور یہ کہ اللہ کا عذاب بڑا سخت ہے۔ جب کہ پیروی کرنے والوں سے وہ لوگ بے تعلقی ظاہر کریں گے جن کی پیروی کی گئی تھی اور وہ عذاب کو دیکھیں گے اور ان کے تمام اسباب ٹوٹ جائیں گے اور پیرو کہیں گے کہ کاش ہم کو پھر دنیا کی طرف لوٹ جانا ملتا تو ہم بھی ان سے بیزاری دکھاتے جس طرح

وہ ہم سے بیزاری ظاہر کر رہے ہیں۔ اس طرح اللہ ان کے کام ان کو حسرت کے لئے دکھائے گا اور وہ ہرگز آگ سے نکل نہ سکیں گے۔ اے لوگو زمین میں جو حلال اور پاک چیزیں ہیں ان میں سے کھاؤ اور شیطان کی پیروی نہ کرو، بے شک وہ تمھارا کھلا ہوا دشمن ہے وہ تم کو برائی اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے اور یہ کہ تم اللہ کے نام پر وہ باتیں کہو جن کو تم نہیں جانتے (البقرہ ۱۶۹ — ۱۶۴)

خدا کے پیغمبر

جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ آلودہ نہیں کیا تو انھیں کے لئے امن ہے۔ اور وہی ہدایت پائے ہوئے ہیں اور یہ ہماری حجت ہے جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم پر دی۔ ہم جن کو چاہتے ہیں بلند مرتبے عطا کرتے ہیں۔ بے شک تیرا رب حکیم اور علیم ہے۔ پھر ہم نے ابراہیم کو، اسحاق اور یعقوب دئے۔ ہم نے ہر ایک کو راہ راست دکھائی اور ہم نے نوح کو اس سے پہلے راہ راست دکھائی اور اس کی نسل میں داؤد اور سلیمان اور ایوب اور یوسف اور موسیٰ اور ہارون کو، اور ہم اسی طرح نیکی کرنے والوں کو بدلہ دیتے ہیں۔ اور اسی طرح زکریا اور یحییٰ اور عیسیٰ اور الیاس کو ہدایت دی۔ ان میں سے ہر ایک صالح تھا۔ اور اسماعیل اور الیسع اور یونس اور لوط کو بھی اور ان میں سے ہر ایک کو ہم نے دنیا والوں پر فضیلت دی۔ اور ان کے آبا میں اور ان کی اولاد میں اور ان کے بھائیوں میں اور ہم نے ان کو چن لیا اور ان کو سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کی۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے۔ اللہ جس کو چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے اس کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اور اگر وہ شرک کرتے تو ان کا سارا عمل غارت ہو جاتا۔ یہ لوگ ہیں جن کو ہم نے کتاب اور حکم اور نبوت عطا کی۔ اب اگر یہ لوگ ان کا انکار کرتے ہیں تو ہم نے ایسے لوگوں کو اس پر مقرر کر دیا ہے جو اس کے منکر نہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت دی، تم انھیں کے راستے پر چلو۔ کہو، میں اس کام پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔ یہ تو صرف ایک نصیحت ہے دنیا والوں کے لئے (الانعام ۹۱ - ۸۲)

جنت اور جہنم

اور لوگوں نے اللہ کی قدر نہ کی جیسا کہ اس کی قدر کرنے کا حق ہے، اور قیامت کے دن زمین اس کی مٹھی میں ہوگی اور آسمان اس کے داہنے ہاتھ میں لپیٹے ہوئے ہوں گے، وہ پاک اور برتر ہے اس شرک سے جو لوگ کرتے ہیں۔ اور صور پھونکا جائے گا پھر بے ہوش ہو جائیں گے جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین

میں ہیں مگر جس کو اللہ چاہے، پھر دوسری بار صور پھونکا جائے گا تو یکایک وہ اٹھ کر دیکھنے لگیں گے۔ زمین اپنے رب کے نور سے چمک اٹھے گی اور کتاب لاکر رکھ دی جائے گی اور پیغمبر اور گواہ حاضر کر دئے جائیں گے اور لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہ ہوگا۔ اور ہر شخص کو اس کے کئے کا پورا بدلہ دیا جائے گا اور اللہ لوگوں کے عمل سے خوب واقف ہے۔ اور کفر کرنے والے جہنم کی طرف گروہ در گروہ ہانکے جائیں گے یہاں تک کہ جب وہ وہاں پہنچیں گے تو اس کے دروازے کھول دئے جائیں گے اور اس کے کارندے ان سے کہیں گے، کیا تمھارے پاس تمھارے اندر سے ایسے پیغمبر نہیں آئے جو تم کو تمھارے رب کی آیتیں سنائیں اور تم کو اس دن کی ملاقات سے ڈرائیں، وہ کہیں گے کیوں نہیں، مگر منکروں کے اوپر خدا کا حکم عذاب ثابت ہوگیا۔ کہا جائے گا کہ داخل ہو جاؤ جہنم کے دروازوں میں، ہمیشہ رہنے کے لئے۔ یہ ایک بری جگہ ہے گھمنڈ کرنے والوں کے لئے۔ اور جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے تھے انھیں گروہ در گروہ جنت کی طرف لے جایا جائے گا، یہاں تک کہ وہ جب وہاں پہنچیں گے اور اس کے دروازے کھولے جائیں گے، اور اس کے ذمہ دار ان سے کہیں گے کہ تم پر سلامتی ہو، تم بہت اچھے آئے، پس داخل ہو جاؤ اس میں ہمیشہ کے لئے۔ اور وہ کہیں گے شکر ہے اللہ کا جس نے ہمارے ساتھ اپنا وعدہ سچا کر دیا اور ہم کو زمین کا وارث بنا دیا، ہم جنت میں جہاں چاہیں اپنی جگہ بنائیں، پس کیا خوب بدلہ ہے عمل کرنے والوں کا۔ اور تم دیکھو گے کہ فرشتے عرش کے گرد گھیرا بنائے ہوئے اپنے رب کی حمد و تسبیح کر رہے ہیں۔ اور لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا کہ ساری تعریف اللہ کے لئے ہے جو رب ہے سارے جہان کا (الزمر ۷۵ ۔ ۶۷)

نماز

میں ہی اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں، پس میری بندگی کر اور نماز قائم کر میری یاد کے لئے (طٰہٰ ۔ ۱۴)۔ نماز قائم کر دن ڈھلے سے لے کر رات کے اندھیرے تک اور فجر کے وقت قرآن بے شک فجر کا قرآن مشہود ہوتا ہے۔ اور رات کے وقت تہجد پڑھو، یہ تمھارے لئے نفل ہے، قریب ہے کہ تیرا رب تجھ کو مقام محمود پر اٹھائے (بنی اسرائیل ۷۹ ۔ ۷۸)۔ اور نماز قائم کرو دن کے دونوں سروں پر اور کچھ رات گزرنے پر۔ بلاشبہ نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں، یہ ایک یاد دہانی ہے ان لوگوں کے لئے جو نصیحت پکڑیں اور صبر کرو اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا (ہود ۱۱۵ ۔ ۱۱۴)۔ اپنی نمازوں کی نگہداشت رکھو، اور بیچ کی نماز کی، اور اللہ کے آگے جھک کر کھڑے ہو (البقرہ ۔ ۲۳۸)۔ اور جب

نماز سے فارغ ہو جاؤ تو کھڑے اور لیٹے اور بیٹھے ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے رہو اور جب تم کو اطمینان ہو جائے تو پھر نماز قائم کرو بلاشبہ نماز ایمان والوں پر وقت کے ساتھ فرض کی گئی ہے (النساء ــ ۱۳۰)۔ پڑھو اس کتاب کو جو تمھاری طرف وحی کی گئی ہے اور نماز قائم کرو، یقیناً نماز فحش اور برے کاموں سے روکتی ہے اور اللہ کا ذکر سب سے بڑی چیز ہے، اللہ جانتا ہے جو کچھ تم لوگ کرتے ہو (العنکبوت ۔ ۴۵)

روزہ

اے ایمان والو تم پر روزے فرض کیے گئے جس طرح تم سے اگلوں پر فرض کیے گئے تھے تاکہ تم پرہیزگار بنو۔ گنتی کے چند دن ہیں، پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا سفر پر ہو تو وہ دوسرے دنوں میں اُتنی ہی تعداد پوری کرے۔ اور جو لوگ روزہ رکھنے کی قدرت رکھتے ہیں ان کے ذمّہ فدیہ ہے، ایک روزے کا بدلہ ایک مسکین کو کھانا کھلانا۔ اور جو اپنی خوشی سے زیادہ دے تو یہ اس کے لئے بہتر ہے۔ اور اگر تم روزہ رکھو تو یہ تمھارے لئے بہتر ہے اگر تم سمجھو۔ رمضان کا مہینہ، اس میں قرآن اتارا گیا جو انسانوں کے لئے ہدایت ہے اور روشن دلیلیں ہیں راہ پانے کی اور حق کو باطل سے جدا کرنے کی۔ پس تم میں سے جو شخص اس مہینہ کو پائے تو وہ ضرور اس کا روزہ رکھے۔ اور جو شخص بیمار ہو یا مسافر ہو تو وہ دوسرے دنوں میں تعداد پوری کرے۔ اللہ تمھارے ساتھ آسانی چاہتا ہے وہ تمھارے لئے دشواری نہیں چاہتا، اور تاکہ تم روزوں کی تعداد پوری کر لو اور تاکہ تم اللہ کی بڑائی کرو اس بات پر کہ اس نے تم کو ہدایت دی اور تاکہ تم شکرگزار بنو۔ اور جب میرے بندے تم سے میرے بارے میں پوچھیں تو کہہ دو کہ میں ان سے قریب ہوں، پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی پکار کو سنتا ہوں اور جواب دیتا ہوں۔ پس انھیں چاہئے کہ وہ میری پکار پر لبیک کہیں اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ وہ سیدھے راستے کو پا لیں (البقرہ ۱۸۶-۱۸۳)

انفاق

اے ایمان والو، جو کچھ ہم نے تم کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرو، قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی اور نہ دوستی کام آئے گی اور جو انکار کرنے والے ہیں وہی دراصل ظالم ہیں (البقرہ ۲۵۴) جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانہ بویا جائے اور اس سے سات بالیں نکلیں اور اس کی ہر بالی میں سَو دانے ہوں۔ اور اللہ بڑھاتا ہے جس کے لئے چاہتا ہے اور اللہ بڑی وسعت والا سب کچھ جاننے والا ہے۔ جو لوگ اپنے مال اللہ کی

راہ میں خرچ کرتے ہیں، پھر خرچ کرنے کے بعد نہ احسان جتاتے ہیں اور نہ دکھ دیتے ہیں انھیں کے لئے اللہ کا ثواب ہے ان کے رب کے پاس۔ ان کے لئے نہ کوئی ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ نرم جواب دینا اور درگذر کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دل آزاری لگی ہوئی ہو، اور اللہ بے نیاز اور تحمل والا ہے۔ اے ایمان والو، احسان جتاکر اور دکھ دے کر اپنی خیرات کو اکارت نہ کرو، اس شخص کی طرح جو اپنا مال دکھاوا کے لئے خرچ کرتا ہے اور اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چٹان ہو جس پر کچھ مٹی ہو، پھر جب اس پر زور کا مینھ برسا تو مٹی بہہ گئی اور صاف چٹان رہ گئی۔ ایسے لوگ اپنی کمائی سے کچھ بھی حاصل نہ کرسکیں گے اور اللہ منکروں کو سیدھی راہ نہیں دکھاتا۔ اور ان لوگوں کی مثال جو اپنے مال اللہ کی خوشی حاصل کرنے کے لئے اور اپنے دلوں کو ثابت کرکے خرچ کرتے ہیں اس باغ کی طرح ہے جو بلند زمین پر ہو، اس پر زور کی بارش ہوئی تو وہ دگنا پھل لایا اور اگر بارش نہ ہوئی تو پھوار ہی کافی ہے۔ اور اللہ خوب دیکھ رہا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرے گا کہ اس کے پاس کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو، اس کے نیچے نہریں بہتی ہوں، اس باغ میں اس کے لئے ہر قسم کے پھل ہوں اور اس پر بڑھاپا آجائے اور اس کے بچے کم زور ہوں، اس وقت باغ پر ایک بگولہ آپڑے جس میں آگ ہو اور وہ باغ جل جائے۔ اللہ اس طرح اپنی باتیں تمھارے سامنے بیان کرتا ہے تاکہ تم سوچو۔ اے ایمان والو، اپنے کمائے ہوئے ستھرے مال میں سے خرچ کرو اور ان چیزوں میں سے خرچ کرو جو ہم نے تمھارے لئے زمین سے پیدا کی ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ اس کی راہ میں دینے کے لئے بری چیز چھانٹنے لگو، حالانکہ وہی چیز اگر تمھیں لینا ہو تو تم ہرگز اس کو لینا گوارا نہ کرو مگر یہ کہ چشم پوشی کر جاؤ۔ اور جان لو کہ اللہ بے نیاز ہے خوبیوں والا ہے۔ شیطان تم کو تنگ دستی سے ڈراتا ہے اور بے حیائی کی راہ سجھاتا ہے اور اللہ تم کو وعدہ دیتا ہے اپنی بخشش کا اور فضل کا۔ اور اللہ وسعت والا جاننے والا ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے اور جس کو حکمت ملی اس کو بہت بڑی خوبی مل گئی اور نصیحت وہی قبول کرتے ہیں جو عقل والے ہیں (۲۶۱ – ۶۹)

عمرہ اور حج

حج اور عمرہ کو پورا کرو اللہ کے لئے، اور اگر تم روک دئے جاؤ تو جو قربانی میسر آئے اسی کو پیش کردو اور اپنے سر نہ مونڈو جب تک کہ قربانی اپنے ٹھکانے نہ پہنچ جائے۔ مگر جو شخص مریض ہو یا اس کو سر کی تکلیف ہو تو اس کے لئے فدیہ ہے روزے رکھنا یا صدقہ دینا یا قربانی کرنا۔ پھر جب تم کو امن ہو جائے

تو جو شخص حج کے ساتھ عمرہ کو ملائے تو اس پر قربانی ہے جو اسے میسر آئے، اور اگر قربانی میسر نہ ہو تو تین روزے حج کے زمانہ میں اور سات گھر پہنچ کر، اس طرح وہ پورے دس روزے رکھ لے یہ حکم اس کے لئے ہے جس کا گھر مسجدِ حرام کے قریب نہ ہو اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔ حج کے چند معلوم مہینے ہیں، جو شخص ان مہینوں میں حج کی نیت کرے تو اس کے لئے حج کے دوران میں کوئی شہوانی فعل اور کوئی بدعملی اور کوئی لڑائی جھگڑے کی بات جائز نہیں، اور جو نیکی تم کرتے ہو اللہ اس کو جانتا ہے۔ اور زادِ راہ لے لیا کرو، سب سے بہتر زادِ راہ تقویٰ ہے پس مجھ سے ڈرو اے عقل والو۔ تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کرو، پھر جب عرفات سے چلو تو مشعرِ حرام (مزدلفہ) کے پاس ٹھہر کر اللہ کو یاد کرو اور اس کو اس طرح یاد کرو جیسا کہ اس نے تمھیں سکھایا ہے، ورنہ اس سے پہلے تم بھٹکے ہوئے لوگ تھے اس کے بعد طواف کے لئے پھر وہاں سے سب لوگ پھریں اور اللہ سے معافی چاہو، بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ پھر جب اپنے حج کے ارکان پورے کر لو تو اللہ کو یاد کرو جیسے کہ تم اپنے باپ دادا کو یاد کرتے تھے بلکہ اس سے بھی زیادہ یاد کرو۔ پس کوئی ہے جو کہتا ہے کہ اے ہمارے رب ہم کو دنیا میں دیدے، اور اس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ اور کوئی کہتا ہے کہ اے ہمارے رب ہم کو دنیا میں بھلائی دے اور آخرت میں بھلائی دے اور ہم کو آگ کے عذاب سے بچا۔ یہی لوگ اپنی کمائی کے مطابق حصہ پائیں گے اور اللہ جلد حساب کرنے والا ہے۔ اور اللہ کو یاد کرو گنتی کے چند دنوں میں، پھر جو شخص دو ہی دن میں جلدی چلا گیا تو اس پر گناہ نہیں اور جو شخص ٹھہر گیا تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں اس کے لئے جو اللہ سے ڈرے، اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ تم سب اسی کے پاس جمع کئے جاؤ گے (البقرہ ۲۰۳ — ۱۹۶)

قربانی

ہر امت کے لئے ہم نے قربانی کا ایک قاعدہ مقرر کر دیا ہے تاکہ لوگ ان جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے انھیں دئے ہیں۔ پس تمھارا خدا ایک ہی خدا ہے، تم اسی کے تابعدار بنو اور بشارت دے دو عاجزی کرنے والوں کو۔ جن کا حال یہ ہے کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل کانپ اٹھتے ہیں اور مصیبتوں پر صبر کرنے والے اور نماز قائم کرنے والے اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں اور قربانی کے جانوروں کو ہم نے تمھارے لئے اللہ کی علامت بنایا ہے، ان میں تمھارے لئے بھلائی ہے۔ پس انھیں کھڑا کر کے ان پر اللہ کا نام لو اور جب ان کی پیٹھیں زمین پر لگ جائیں تو ان میں سے خود بھی

کھاؤ اور کھلاؤ قناعت سے بیٹھنے والوں کو اور ان کو بھی جو اپنی حاجت پیش کریں۔ ان جانوروں کو ہم نے تمھارے بس میں کر دیا ہے تاکہ تم شکر ادا کرو۔ اللہ کو نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ ان کا خون بلکہ اللہ کو تمھارا تقویٰ پہنچتا ہے۔ اس طرح اللہ نے ان کو تمھارے بس میں کر دیا ہے تاکہ تم اللہ کی بڑائی کرو اس بات پر کہ اس نے تم کو راہ بتائی اور خوش خبری دے دو نیکی کرنے والوں کو (الحج ۳۶-۳۷)

اللہ کی بندگی

اللہ ہی کا ہے جو کچھ کہ آسمانوں اور زمین میں ہے اور تم اپنے جی کی بات کو خواہ ظاہر کر دیا اس کو چھپاؤ، اللہ بہرحال تم سے اس کا حساب لے گا۔ پھر وہ جس کو چاہے گا بخشے گا جس کو چاہے گا عذاب دے گا اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ رسول اس ہدایت پر ایمان لایا ہے جو اس کے رب کی طرف سے اس پر اتری ہے اور مسلمانوں نے بھی، سب ایمان لائے ہیں اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر، ان کا کہنا ہے کہ ہم اللہ کے پیغمبروں میں تفریق نہیں کرتے، اور انھوں نے کہا کہ ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی، ہم تیری بخشش چاہتے ہیں اے ہمارے رب، اور تیری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔ اللہ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا، ہر ایک کو ملنا ہے جو اس نے کمایا اور ہر ایک پر پڑنا ہے جو اس نے کیا۔ اے ہمارے رب ہم کو نہ پکڑ اگر ہم بھولیں یا چوکیں، اے ہمارے رب ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جو تو نے ہم سے اگلوں پر ڈالا تھا، اے ہمارے رب ہم پر وہ بوجھ نہ رکھ جس کو اٹھانے کی ہم کو طاقت نہیں، اور ہم سے درگذر کر اور ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم فرما، تو ہی ہمارا مولیٰ ہے، پس منکروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر (البقرہ - آخر)

شریعت

تیرے رب نے حکم دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو، اگر تمھارے پاس ان میں سے کوئی ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو انھیں اُف بھی نہ کہو اور نہ انھیں جھڑکو اور ان سے احترام کے ساتھ بات کرو۔ اور رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک جاؤ اور کہو کہ اے ہمارے رب ان پر رحم فرما جس طرح انھوں نے مجھ کو پالا جب میں چھوٹا تھا۔ تمھارا رب خوب جانتا ہے جو تمھارے دلوں میں ہے۔ اگر تم نیک بن کر رہو تو وہ پلٹ آنے والوں کو معاف کر دیتا ہے۔ اور رشتہ دار کو اس کا حق دو اور مسکین کو اور مسافر کو، اور فضول خرچی نہ کرو۔ فضول خرچی کرنے والے شیطان کے

بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے۔ اور اگر تمھیں ان سے اعراض کرنا ہو اس بنا پر کہ ابھی تم اللہ کی اس رحمت کو جس کے تم امیدوار ہو تلاش کر رہے ہو تو ان کو نرم جواب دو۔ اور اپنا ہاتھ نہ تو گردن سے باندھ لو اور نہ اس کو بالکل کھلا چھوڑ دو کہ تم ملامت زدہ اور عاجز بن کر رہ جاؤ۔ تیرا رب جس کے لئے چاہتا ہے رزق کو کھول دیتا ہے اور جس کے لئے چاہتا ہے اسے تنگ کر دیتا ہے وہ اپنے بندوں سے باخبر ہے اور ان کو دیکھ رہا ہے۔ اور اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو، ہم انھیں بھی رزق دیتے ہیں اور تم کو بھی۔ بے شک ان کو قتل کرنا بڑا گناہ ہے۔ اور زنا کے قریب نہ جاؤ وہ بے حیائی ہے اور بری راہ۔ اور اس جان کو قتل نہ کرو جس کو اللہ نے حرام کیا ہے مگر حق کے ساتھ، اور جو ظلم سے مارا جائے تو اس کے ولی کو ہم نے قصاص کا حق دیا ہے، پس وہ قتل کرنے میں حد سے نہ نکلیں، اس کی مدد کی جائے گی۔ اور یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ مگر جس طرح کہ بہتر ہو یہاں تک کہ وہ اپنی پوری عمر کو پہنچ جائے، اور عہد کو پورا کرو، بے شک عہد کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ اور جب ناپ کر دو تو پورا بھر کر دو اور تول تو ٹھیک ترازو سے تولو۔ یہ بہتر ہے اور اس کا انجام اچھا ہے۔ اور ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کا تمھیں علم نہ ہو، بے شک کان اور آنکھ اور دل سب کے بارے میں پوچھ ہوگی۔ اور زمین میں اکڑ کر نہ چلو، تم زمین کو پھاڑ نہیں سکتے اور نہ پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکتے۔ ان میں سے ہر برا کام تیرے رب کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔ یہ حکمت کی باتیں ہیں جو تیرے رب نے وحی کی، اور اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود نہ بنا ورنہ تم جہنم میں ڈال دئے جاؤ گے ملامت زدہ ہو کر اور بھلائی سے محروم ہو کر

(بنی اسرائیل ۳۹ — ۲۳)

رحمان کے بندے

اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر نرم چال چلتے ہیں اور جب جاہل ان سے الجھیں تو وہ کہہ دیتے ہیں تم کو سلام۔ اور جو اپنے رب کے حضور سجدہ اور قیام میں راتیں گزارتے ہیں۔ اور جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم کو جہنم کے عذاب سے بچالے اس کا عذاب تو پیٹ جانے والا ہے۔ وہ بڑا ہی برا ٹھکانا اور مقام ہے۔ اور جو خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ بخل، بلکہ ان کا خرچ دونوں کے درمیان اعتدال پر ہوتا ہے۔ اور جو اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہیں پکارتے اور وہ اللہ کی حرام کی ہوئی جان کو ناحق قتل نہیں کرتے اور نہ وہ زنا کرتے ہیں اور جو کوئی یہ کام کرے وہ اپنے گناہ کا بدلہ پائے گا۔ قیامت کے روز اس کو دہرا عذاب دیا جائے گا اور اسی میں وہ ہمیشہ ذلت

ے ساتھ رہے گا۔ الاّ یہ کہ کوئی توبہ کرے اور ایمان لائے اور عمل صالح کرے تو ایسے لوگوں کی برائیوں
ہ اللہ بھلائیوں سے بدل دے گا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اور جو شخص توبہ کرے اور نیک عمل کرے
ہ وہ اللہ کی طرف پلٹ آتا ہے جیسا کہ پلٹنا چاہئے۔ اور وہ لوگ جو جھوٹ کی گواہی نہیں دیتے اور جب
ہ کسی لغو چیز پر گزرتے ہیں تو شرافت کے ساتھ گزر جاتے ہیں۔ اور جنھیں اگر ان کے رب کی آیتوں سے
یحت کی جائے تو وہ اس پر اندھے بہرے کی طرح نہیں گرتے۔ اور جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم کو
ی بیویوں اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک دے اور ہم کو پرہیزگاروں کا امام بنا۔ یہی لوگ بالا
انوں میں جگہ پائیں گے کیونکہ انھوں نے صبر کیا اور اس میں ان کا استقبال تحیۃ اور سلام کے ساتھ
دگا۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ کیا ہی اچھا ہے وہ ٹھکانا اور وہ مقام (الفرقان ۷۶ — ۶۳)

بھروسہ اللہ پر

لہ، اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور ایمان والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہئے۔ اے ایمان لانے
الو تمھاری بیویوں اور تمھاری اولاد میں تمھارے دشمن ہیں، ان سے ہوشیار رہو اور اگر تم معاف کردو
ر درگزر کرو اور بخش دو تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ تمھارے مال اور تمھاری اولاد ایک آزمائش ہیں،
ر اللہ ہی کے پاس بڑا اجر ہے۔ پس اللہ سے ڈرو جتنا تمھارے بس میں ہے اور سنو اور اطاعت کرو اور
نے مال خرچ کرو، یہ تمھارے لئے بہتر ہے۔ اور جو اپنے دل کی تنگی سے محفوظ رہا تو ایسے ہی لوگ کامیاب
نے والے ہیں۔ اگر تم اللہ کو قرض حسن دو تو وہ تم کو کئی گنا بڑھا کر دے گا اور تم کو بخش دے گا، اللہ قدردان
ر بردبار ہے۔ وہ حاضر اور غائب کو جاننے والا ہے اور دانا اور زبردست ہے (التغابن ۱۸ — ۱۳)

حکمت کی باتیں

جب لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا اے بیٹے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کر شرک
شبہ بڑا ظلم ہے۔ اور ہم نے انسان کو اس کے والدین کے بارے میں تاکید کی، اس کی ماں نے ضعف
عف اٹھا کر اس کو پیٹ میں رکھا اور اس کا دودھ چھوٹنے میں دو سال لگے، یہ کہ میرا شکر کرو اور
ے والدین کا، میری ہی طرف پلٹ کر آنا ہے۔ اور اگر وہ تم پر دباؤ ڈالیں کہ تم میرے ساتھ کسی ایسے کو
یک کرو جس کو تم نہیں جانتے تو ان کی بات نہ ماننا، اور دنیا میں ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرو اور پیروی
شخص کے راستہ کی کرو جس نے میری طرف رجوع کیا ہے۔ پھر تم سب کو میری طرف پلٹنا ہے۔ اُس

وقت میں تم کو بتادوں گا کہ تم کیسے عمل کر رہے تھے۔ اے بیٹے، کوئی چیز رائی کے دانہ کے برابر ہو، ا
کسی چٹان میں ہو یا آسمانوں میں یا زمین میں، اللہ اس کو نکال لائے گا وہ لطیف و خبیر ہے۔ بیٹے
نماز قائم کر اور نیکی کا حکم دے اور بدی سے منع کر اور جو مصیبت پڑے اس پر صبر کر، بے شک یہ ہم
کے کام ہیں۔ اور لوگوں سے منہ نہ پھیر اور زمین میں اکڑ کر نہ چل، اللہ کسی خود پسند اور فخر کرنے وا
پسند نہیں کرتا۔ اور اپنی چال میں میانہ روی اختیار کر اور اپنی آواز کو پست رکھ، سب آوازوں
زیادہ بری آواز گدھے کی آواز ہے (لقمان ۱۹-۱۳)

اللہ سے ڈرنے والے

لوگ تم سے انفال کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہو کہ انفال اللہ اور اس کے رسول کے لئے ہیں
پس تم لوگ اللہ سے ڈرو اور آپس کے معاملات درست رکھو اور اللہ اور اس کے رسول
اطاعت کرو اگر تم مومن ہو۔ ایمان والے تو وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل لرز ج
ہیں اور جب اللہ کی آیتیں ان کے سامنے پڑھی جائیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے رب
بھروسہ رکھتے ہیں۔ وہ نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے
یہی لوگ سچے مومن ہیں، ان کے لئے ان کے رب کے پاس بڑے درجے ہیں اور بخشش ہے ا
بہترین رزق ہے (الانفال ۴-۱)

حیات طیبہ

اللہ حکم دیتا ہے انصاف کا اور بھلائی کا اور قرابت والوں کے ساتھ صلہ رحمی کرنے کا اور وہ منع
ہے بے حیائی سے اور بدی سے اور زیادتی سے، اللہ تم کو نصیحت کرتا ہے تاکہ تم سبق لو اور اللہ
عہد کو پورا کرو عہد کرنے کے بعد اور اپنی قسموں کو پختہ کرنے کے بعد نہ توڑو جب کہ تم اللہ کو اپنے ا
ضامن بنا چکے ہو، اللہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ اور تم اس عورت کی طرح نہ ہو جاؤ جس نے محنت
سے سوت کاتا اور پھر اس کو توڑ ڈالا، تم اپنی قسموں کو ایک دوسرے کے معاملات میں دخل دینے کا بہ
بناتے ہو تاکہ ایک گروہ دوسرے گروہ سے بڑھ جائے۔ بے شک اللہ اس کے ذریعہ تم کو پرکھتا
اور وہ قیامت کے دن تمھارے اختلاف کی حقیقت کھول دے گا۔ اور اگر اللہ چاہتا تو وہ تم سب
ایک امت بنا دیتا۔ مگر وہ جس کو چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھا دیتا ہے اور ضرور تم سے تمھارے ا

ں پوچھ ہوگی اور تم اپنی قسموں کو آپس میں ایک دوسرے کو دھوکا دینے کا ذریعہ نہ بناؤ کہ کوئی قدم جمنے کے
مد اکھڑ جائے اور تم اس بات کی سزا چکھو کہ تم نے اللہ کے راستہ سے روکا، اور تم کو بڑا عذاب ہو۔ اور اللہ کے
ہد کو تھوڑے فائدے کے بدلے نہ بیچو، جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ تمھارے لئے زیادہ بہتر ہے اگر تم جانو۔
ہ تمھارے پاس ہے وہ سب ختم ہو جائے گا اور جو اللہ کے پاس ہے وہ ہمیشہ رہنے والا ہے، اور ہم صبر
رنے والوں کو ان کے عمل کا بہترین بدلہ دیں گے۔ جو شخص بھی نیک کام کرے گا، وہ مرد ہو یا عورت، اگر وہ
ومن ہے تو ہم اس کو اچھی زندگی بسر کرائیں گے اور ان کو ان کے بہترین کاموں کے مطابق بدلہ دیں گے
النحل ۹۷-۹۰)

حرام و حلال

ہو، آؤ میں تمھیں سناؤں کہ تمھارے رب نے تمھارے لئے کیا چیزیں حرام کی ہیں۔ یہ کہ تم اس کے
اتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو۔ اور ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ اور اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے
نہ ڈالو۔ ہم تم کو بھی رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی۔ بے شرمی کی باتوں کے قریب نہ جاؤ۔ خواہ وہ کھلی
وں یا چھپی۔ اور کسی جان کو ہلاک نہ کرو جس کو اللہ نے حرام ٹھیرایا ہے۔ مگر حق کے ساتھ۔ اللہ ان
وں کی تمھیں ہدایت کرتا ہے تاکہ تم سوچو۔ اور یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ۔ مگر ایسے طریقے سے جو
ہتر ہو، یہاں تک کہ وہ اپنے سن رشد کو پہنچ جائے۔ اور ناپ اور تول میں انصاف کرو۔ ہم کسی شخص پر
ی ہی ذمہ داری ڈالتے ہیں جتنا اس کے بس میں ہو۔ اور جب بات کہو تو انصاف کی بات کہو خواہ اپنے
شتہ دار کے خلاف کیوں نہ ہو۔ اور اللہ کے عہد کو پورا۔ اللہ تمھیں ان کی ہدایت کرتا ہے تاکہ تم نصیحت
کڑو، اور یہی راستہ میرا سیدھا راستہ ہے۔ تم اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو، کہ وہ
للہ کے راستے سے ہٹا کر تم کو متفرق کر دیں گے۔ اللہ اس کی تم کو ہدایت کرتا ہے تاکہ تم بچو (الانعام ۱۵۲-۵۴)
کہو، میرے رب نے جو چیزیں حرام کی ہیں وہ یہ ہیں —— فحش کام خواہ کھلے ہوں یا چھپے اور گناہ
ر ناحق زیادتی اور یہ کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرو جس کے لئے اس نے سند نہیں اتاری۔ اور یہ کہ
للہ پر ایسی بات کہو جس کا تمھیں علم نہیں۔ ہر گروہ کے لئے ایک مدت ہے، پھر جب ان کی مدت آجاتی
ہے تو ایک گھڑی کی دیر یا جلدی نہیں ہوتی۔ اے بنی آدم، جب تمھارے پاس تم میں سے رسول آئیں
تم کو میری آیتیں سنائیں تو جو کوئی ڈرے گا اور اصلاح کرے گا تو اس کے لئے نہ خوف ہے اور
غم۔ اور جو لوگ ہماری نشانیوں کو جھٹلائیں گے اور ان سے سرکشی کریں گے تو وہی آگ والے ہیں

جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے (الاعراف ۳۶ - ۳۴)

جنتی انسان

بے شک انسان بے صبر پیدا کیا گیا ہے۔ اس پر مصیبت آتی ہے تو گھبرا اٹھتا ہے۔ اور جب اس کو خوش حالی نصیب ہوتی ہے تو بخیل بن جاتا ہے، سوائے ان لوگوں کے جو نماز پڑھنے والے ہیں۔ جو اپنی نماز کی ہمیشہ پابندی کرتے ہیں۔ جن کے مالوں میں سائل اور محروم کا مقرر حق ہے۔ اور جو روزِ جزا کو سچا مانتے ہیں اور جو اپنے رب کے عذاب سے ڈرنے والے ہیں۔ ان کے رب کا عذاب اور جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں بجز اپنی بیویوں اور اپنی مملوکہ عورتوں کے کہ ان کے لئے ان پر کوئی ملامت نہیں۔ البتہ جو اس کے علاوہ کچھ اور چاہیں تو وہی ہیں حد سے نکل جانے والے ہیں۔ اور جو اپنی امانتوں کی اور اپنے عہد کی حفاظت کرتے ہیں۔ اور جو اپنی گواہیوں میں سچائی پر قائم رہتے ہیں۔ اور جو اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہی لوگ عزت کے ساتھ جنت کے باغوں میں رہیں گے (المعارج ۳۵ - ۱۹)

اطمینان والی روح

انسان کا حال یہ ہے کہ اس کا رب جب اس کو آزماتا ہے اور اس کو عزت اور نعمت دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھ کو عزت دار بنایا۔ اور جب اس کو دوسری طرح آزماتا ہے اور اس کی روزی اس پر تنگ کر دیتا ہے تو وہ کہنے لگتا ہے کہ میرے رب نے مجھ کو ذلیل کر دیا۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ تم لوگ یتیم کے ساتھ عزت کا سلوک نہیں کرتے۔ میراث کا مال سمیٹ کر کھا جاتے ہو۔ اور مال کی محبت میں بری طرح پڑے ہوئے ہو۔ ہرگز نہیں۔ جب زمین کو توڑ توڑ کر ریزہ کر دیا جائے گا اور تمھارا رب ظاہر ہوگا اور فرشتے قطار در قطار آئیں گے۔ اور جہنم اس روز سامنے لائی جائے گی۔ اس دن انسان کو سمجھ آجائے گی۔ مگر اب سمجھ میں آنے کا موقع کہاں۔ آدمی کہے گا، کاش میں نے اپنی اس زندگی کے لئے آگے کچھ بھیجا ہوتا۔ اس دن اللہ جو عذاب دے گا ویسا عذاب دینے والا کوئی نہیں۔ اور اللہ جیسا باندھے گا ویسا باندھنے والا کوئی نہیں۔ اے اطمینان والی روح، چل اپنے رب کی طرف اس حال میں کہ تو اللہ سے راضی، اللہ تجھ سے راضی۔ شامل ہو جا میرے بندوں میں اور داخل ہو جا میری جنت میں (الفجر ۳۰ - ۱۵)

اللہ والے

اے ایمان والو، سود کئی کئی حصہ بڑھا کر نہ کھاؤ اور اللہ سے ڈرو تاکہ تم کامیاب ہو۔ اور اس آگ سے ڈرو جو منکروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔ اللہ اور رسول کا حکم مانو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ اور اپنے رب کی بخشش کی طرف دوڑو اور اس جنت کی طرف جس کی وسعت سارے آسمان اور زمین ہیں اور جو اللہ سے ڈرنے والوں کے لئے تیار کی گئی ہے۔ جو فراغت اور تنگی دونوں میں خرچ کرتے ہیں۔ جو غصہ کو پی جانے والے ہیں، اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں۔ ایسے نیک لوگ اللہ کو بہت پسند ہیں۔ اور یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان سے کوئی برا کام ہوجاتا ہے یا اپنی جان پر کوئی ظلم کر بیٹھتے ہیں تو اللہ انھیں یاد آجاتا ہے۔ اور وہ اپنے گناہوں سے معافی مانگنے لگتے ہیں اور کون معاف کر سکتا ہے گناہوں کو اللہ کے سوا۔ اور یہ لوگ اپنے فعل پر اصرار نہیں کرتے درآں حالیکہ وہ جان رہے ہوں۔ ایسے لوگوں کی جزا ان کے رب کے پاس یہ ہے کہ وہ ان کو معاف کردے گا۔ اور ایسے باغوں میں انھیں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ کیسا اچھا بدلہ ہے عمل کرنے والوں کے لئے (آل عمران ۱۳۰ ـ ۱۳۶)

اصلاح کا طریقہ

اور جو کچھ تم کو دیا گیا ہے وہ محض دنیا کی زندگی کا سامان ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ بہتر ہے اور باقی رہنے والا ہے ان لوگوں کے لئے جو ایمان لائے اور وہ اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اور جو بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے بچتے ہیں اور جب انھیں غصہ آجائے تو وہ معاف کردیتے ہیں ۔ اور جنھوں نے اپنے رب کی پکار پر لبیک کہی اور انھوں نے نماز قائم کی اور وہ اپنے کام باہم مشورہ سے کرتے ہیں۔ اور ان کو ہم نے ان کو جو رزق دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ اور جب ان پر چڑھائی کی جائے تو وہ ان کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اور برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے، پھر جو شخص معاف کردے اور اصلاح کرے تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے۔ اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔ اور جو ظلم کے بعد بدلہ لے تو ایسے لوگوں پر کوئی الزام نہیں۔ الزام کے قابل تو وہ ہیں جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق زیادتی کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے دردناک عذاب ہے۔ اور جو شخص صبر کرے اور معاف کردے تو یقیناً یہ ہمت کے کام ہیں (الشوریٰ ۳۶ ـ ۴۳)

کامیاب تجارت

اے ایمان والو، کیا میں تم کو ایسی تجارت بتاؤں جو تم کو دردناک عذاب سے بچادے۔ تم ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے۔ یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانو۔ اللہ تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کرے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور بہترین گھر ابدی جنتوں میں، یہ ہے بڑی کامیابی اور دوسری چیز جو تم چاہتے ہو، اللہ کی طرف سے نصرت اور جلد فتح، اور ایمان والوں کو خوش خبری دے دو۔ اے ایمان لانے والو، اللہ کے مددگار بنو، جیسا کہ عیسیٰ ابن مریم نے حواریوں سے کہا تھا کہ کون ہے اللہ کی طرف میرا مددگار۔ حواریوں نے جواب دیا کہ ہم ہیں اللہ کے مددگار۔ پس بنی اسرائیل کا ایک گروہ ایمان لایا اور ایک گروہ نے انکار کیا۔ پس ہم نے ایمان لانے والوں کی تائید کی ان کے دشمنوں کے مقابلہ میں، اور وہ غالب ہو گئے (الصف ۱۴-۱۰)

نیکی کی حقیقت

نیکی یہ نہیں ہے کہ تم اپنے چہرے پورب کی طرف کر لو یا پچھم کی طرف، بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی ایمان لائے اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور فرشتوں پر اور آسمانی کتابوں پر اور پیغمبروں پر، اور اپنا پسندیدہ مال رشتہ داروں کو دے اور یتیموں کو اور مسکینوں کو اور مسافروں کو اور سوال کرنے والوں کو اور گردن چھڑانے کے لئے، اور وہ نماز قائم کرے اور زکوٰۃ ادا کرے اور وہ لوگ کہ جب عہد کریں تو اپنے عہد کو پورا کریں اور صبر کرنے والے تنگی اور مصیبت کے وقت اور جہاد کے وقت، یہی سچے لوگ ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جو اللہ سے ڈرنے والے ہیں (البقرہ ۱۷۷)

اللہ کی مہمانی

کیا انکار کرنے والے یہ خیال رکھتے ہیں کہ وہ مجھے چھوڑ کر میرے بندوں کو اپنا کارساز بنالیں، ہم نے انکار کرنے والوں کی مہمانی کے لئے جہنم بنا رکھی ہے۔ کہو، کیا ہم تم کو بتائیں کہ عمل کے اعتبار سے سب سے زیادہ گھاٹے والے کون ہیں۔ وہ لوگ جن کی ساری کوشش دنیا کی زندگی میں بھٹکتی رہی، اور وہ سمجھتے رہے کہ وہ بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب کی نشانیوں کا انکار کیا اور اس کی ملاقات کا یقین نہ کیا۔ پس ان کے اعمال اکارت ہو گئے۔ قیامت کے دن ہم ان کو کوئی وزن نہ دیں گے۔ ان کا بدلہ جہنم ہے، اس انکار کے

سبب سے جو انھوں نے کیا، اور انھوں نے میری نشانیوں اور میرے پیغمبروں کا مذاق اڑایا۔ جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیا ان کی میزبانی کے لئے فردوس کے باغ ہوں گے جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور کبھی اس سے نکلنا نہ چاہیں گے۔ کہو، اگر سمندر میرے رب کی باتیں لکھنے کے لئے روشنائی بن جائے تو سمندر ختم ہو جائے گا مگر میرے رب کی باتیں ختم نہ ہوں گی، خواہ ہم اتنی ہی روشنائی اور لے آئیں۔ کہو کہ میں تو ایک انسان ہوں تم ہی جیسا، میری طرف وحی کی گئی ہے کہ تمھارا معبود ایک ہی معبود ہے، پس جو شخص اپنے رب سے ملنے کا امیدوار ہو اس کو چاہئے کہ نیک عمل کرے اور بندگی میں اپنے رب کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ کرے (الکہف ۱۱۰ - ۱۰۲)

مومن کی معاشی زندگی

اے ایمان لانے والو جب پکارا جائے نماز کے لئے جمعہ کے دن تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو اور خرید و فروخت چھوڑ دو، یہ تمھارے لئے بہتر ہے اگر تم جانو۔ پھر جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو۔ اور اللہ کو بہت یاد کرو، تاکہ تم کامیاب ہو۔ اور جب انھوں نے تجارت اور کھیل تماشا دیکھا تو اس کی طرف دوڑ پڑے اور تم کو کھڑا چھوڑ دیا۔ ان سے کہو کہ جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ بہتر ہے کھیل تماشے سے اور تجارت سے۔ اور اللہ سب سے بہتر رزق دینے والا ہے (الجمعۃ ۹ - ۱۱)

فردوس والے

کامیاب ہو گئے ایمان لانے والے۔ جو اپنی نماز میں جھکنے والے ہیں۔ اور جو لغو چیزوں سے دور رہتے ہیں۔ اور جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ اور جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، سوا اپنی بیویوں کے یا ان عورتوں کے جو ان کی ملک میں ہیں، کہ ان پر انھیں کوئی ملامت نہیں۔ مگر جو اس کے علاوہ چاہیں تو وہ حد سے بڑھنے والے ہیں۔ اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا لحاظ رکھتے ہیں۔ اور جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہی لوگ وارث ہیں جو فردوس کی وراثت پائیں گے، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے (المومنون ۱ - ۱۱)

سب کچھ اللہ کے لئے

اللہ نے ایمان والوں سے ان کی جان اور مال خرید لیا ہے اس قیمت پر کہ ان کے لئے جنت ہے۔ وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور پھر مارتے ہیں اور مارے جاتے ہیں ان سے اللہ کا وعدہ ہے توراۃ میں انجیل میں اور قرآن میں، اور کون ہے جو اللہ سے بڑھ کر اپنے وعدہ کا پورا کرنے والا ہو۔ پس خوشی مناؤ اپنے اس معاملہ پر جو تم نے اللہ سے

کیا ہے، یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ وہ ہیں اللہ کی طرف پلٹنے والے، اس کی عبادت کرنے والے، اس کا شکر کرنے والے اس کی خاطر زمین میں گردش کرنے والے، اس کے آگے رکوع اور سجدہ کرنے والے، نیکی کا حکم دینے والے اور برائی سے روکنے والے اور اللہ کے حدود کی حفاظت کرنے والے، اور خوشخبری دے دو ایمان لانے والوں کو (التوبہ ۱۱۲ ــ ۱۱۱)

مومن اللہ کا درخت ہے

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے کیسی مثال بیان کی، کلمۂ طیبّہ ایسا ہی ہے جیسے شجرۂ طیبہ (اچھا درخت) اس کی جڑ گہری جمی ہوئی ہے اور شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں۔ وہ ہر وقت اپنے رب کے حکم سے اپنا پھل دیتا ہے، یہ مثال اللہ لوگوں کے لئے بیان کرتا ہے تاکہ وہ سوچیں۔ اور کلمہ خبیثہ کی مثال شجرۂ خبیثہ (برے درخت) جیسی ہے جو زمین کے اوپر سے اکھاڑ لیا جائے، اس کے لئے کوئی ٹھیراؤ نہیں۔ اللہ ایمان والوں کو ایک قولِ ثابت کے ذریعہ دنیا و آخرت میں جماؤ عطا کرتا ہے اور ظالموں کو بھٹکا دیتا ہے اور اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے (ابراہیم ۲۷ـ ۲۴)

اچھی نصیحت

اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے اہل کے سپرد کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔ بے شک اللہ تم کو بہت اچھی بات کی نصیحت کرتا ہے۔ اور یقیناً اللہ سب کچھ سننے والا دیکھنے والا ہے (النساء ۵۸) جس کو ڈر ہوگا وہ نصیحت پکڑے گا۔ اور اس سے گریز کرے گا وہ بدبخت جس کو بڑی آگ میں جانا ہے۔ پھر وہ نہ اس میں مرے گا اور نہ جئے گا۔ کامیاب ہوگیا وہ جس نے پاکیزگی اختیار کی اور اپنے رب کا نام یاد کیا۔ پھر نماز ادا کی۔ مگر تم لوگ دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو۔ حالانکہ آخرت زیادہ بہتر ہے اور باقی رہنے والی ہے (الاعلیٰ ۱۷ـ ۱۰)

تباہی کس کے لئے

تباہی ہے اس شخص کی جو عیب نکالتا ہے اور غیبت کرتا ہے۔ جس نے مال جمع کیا اور اس کو گن گن کر رکھا۔ وہ خیال کرتا ہے کہ اس کا مال ہمیشہ اس کے پاس رہے گا۔ ہرگز نہیں۔ وہ شخص تو روندنے والی جگہ میں پھینک دیا جائے گا۔ اور تم کیا جانو کہ وہ روندنے والی جگہ کیا ہے۔ وہ اللہ کی سلگائی ہوئی آگ ہے جو دلوں

تک جا پہنچے گی۔ وہ ان پر بند کر دی جائے گی، اونچے اونچے ستونوں میں (ہمزہ)

نشانیوں کو جھٹلانے والے

جو شخص میری نصیحت سے منہ پھیرے گا، اس کے لئے ہے تنگ زندگی اور قیامت کے دن ہم اسے اندھا اٹھائیں گے۔ وہ کہے گا کہ اے میرے رب کیوں تو نے مجھ کو اندھا اٹھایا، دنیا میں تو میں آنکھ والا تھا۔ اللہ فرمائے گا، ہاں، اسی طرح پہنچی تھیں تمہارے پاس ہماری نشانیاں، پھر تم نے ان کو بھلا دیا۔ اسی طرح آج تم کو بھلایا جا رہا ہے۔ اسی طرح ہم حد سے گزرنے والے اور اپنے رب کی نشانیاں نہ ماننے والے کو بدلہ دیتے ہیں، اور آخرت کا عذاب بڑا سخت اور بہت باقی رہنے والا ہے (طٰہٰ ۱۲۷ - ۱۲۴)

انصاف کی گواہی

اے ایمان والو اللہ کے لئے کھڑے ہونے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو اور کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ تم انصاف کو چھوڑ دو، انصاف کرو۔ یہی بات تقویٰ کے زیادہ قریب ہے اور اللہ سے ڈرو، اللہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ اللہ کا وعدہ ہے ایمان والوں سے اور نیک عمل کرنے والوں سے کہ ان کے لئے بڑی بخشش اور ثواب ہے۔ اور جن لوگوں نے انکار کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا تو وہی ہیں دوزخ میں جانے والے (المائدہ ۱۰ - ۸)

اختلاف نہیں

اے ایمان والو جب کسی گروہ سے تمہارا مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو بہت زیادہ یاد کرو امید ہے کہ تم کامیاب ہو گے۔ اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑا نہ کرو ورنہ تم کمزور ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور صبر کرو بیشک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اور تم ان لوگوں جیسے نہ بنو جو اپنے گھر سے اتراتے ہوئے اور لوگوں کو دکھاتے ہوئے نکلے، اور وہ اللہ کے راستہ سے روکتے ہیں اور اللہ اُن کے عمل کا احاطہ کئے ہوئے ہے (الانفال ۴۷ - ۴۵)

اسلامی معاشرت

اے ایمان لانے والو، اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو اس کی تحقیق کر لو، ایسا نہ ہو کہ تم

کسی گروہ پر نادانی سے جاپڑو پھر تمھیں اپنے کئے پر پچھتانا ہو اور جان لو کہ تمھارے درمیان اللہ کا رسول ہے، اگر وہ بہت سے معاملات میں تمھاری بات مان لے تو تم مشکل میں پڑ جاؤ گے، مگر اللہ نے تمھارے اندر ایمان کی محبت ڈال دی اور اس کو تمھارے لئے دل پسند بنا دیا اور کفر اور گناہ اور نافرمانی سے تم کو متنفر کر دیا، یہی لوگ نیک راستہ پر ہیں۔ اللہ کے فضل اور احسان سے اور اللہ علیم و حکیم ہے۔ اور اگر مسلمانوں میں دو گروہ آپس میں لڑ جائیں تو ان کے درمیان صلح کرا دو، پھر اگر ان میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے پھر اگر وہ پلٹ آئے تو ان کے درمیان عدل کے ساتھ ملاپ کرا دو اور انصاف کرو کیونکہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ بے شک مسلمان ایک دوسرے کے بھائی ہیں پس اپنے بھائیوں کے درمیان تعلقات کو درست کرو اور اللہ سے ڈرو، امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا۔ اے ایمان والو ایک گروہ دوسرے گروہ کا مذاق نہ اڑائے، ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ ان سے بہتر ہوں، اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں ہو سکتا ہے کہ وہ اُن سے بہتر ہوں۔ آپس میں ایک دوسرے پر عیب نہ لگاؤ اور نہ ایک دوسرے کو بُرے نام سے یاد کرو، گنہ گاری برا نام ہے ایمان کے بعد، اور جو باز نہ آئے تو ایسے ہی لوگ ظالم ہیں۔ اے ایمان والو، بدگمانیوں سے بچو، یقیناً بعض گمان گناہ ہوتے ہیں اور کسی کا بھید نہ ٹٹولو، اور ایک دوسرے کو پیٹھ پیچھے برا نہ کہو کیا تم میں سے کوئی اس کو پسند کرے گا کہ وہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے، تم خود اس سے گھن کرتے ہو اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ معاف کرنے والا مہربان ہے۔ اے لوگو، ہم نے تم کو ایک مرد ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمھارے قبیلے اور برادریاں بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو یقیناً اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمھارے اندر سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے، بے شک اللہ علیم و خبیر ہے (الحجرات ۱۳-۶)

اللہ کی طرف دعوت

اپنے رب کے راستہ کی طرف پکارو، حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ۔ اور لوگوں سے بحث کرو ایسے طریقے سے جو بہتر ہو۔ تمھارا رب زیادہ بہتر جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور کون سیدھے راستے پر ہے۔ اور اگر تم لوگ بدلہ لو تو بس اتنا ہی لو جتنا کہ تم پر زیادتی کی گئی ہے۔ اور اگر تم صبر کرو تو یقیناً یہ صبر کرنے والوں کے لئے بہتر ہے۔ اور صبر سے کام لو، تمھارا صبر اللہ ہی کے لئے ہے، اور ان پر غم نہ کرو اور ان کی کارروائیوں پر دل تنگ نہ ہو۔ اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو اس سے

ڈریں۔ اور جو نیک عمل کرتے ہیں (النحل ۲۸ — ۱۲۵)

اللہ کی بڑائی کرو

اے اوڑھ کر لیٹنے والے، اٹھ اور لوگوں کو خبردار کر۔ اور اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کر۔ اور اپنے آپ کو پاک رکھ۔ اور گندگی سے دور رہ۔ اور ایسا نہ کر کہ احسان کرے اور بہت بدلہ چاہے۔ اور اپنے رب کی خاطر صبر کر۔ پھر جب صور میں پھونک ماری جائے گی، وہ دن بڑا ہی مشکل دن ہوگا، منکروں کے لئے آسان نہ ہوگا (۱۰ — ۱) ہرگز نہیں، قسم ہے چاند کی اور رات کی جب کہ وہ پلٹتی ہے اور صبح کی جب کہ وہ روشن ہوتی ہے۔ دوزخ بڑی چیزوں میں سے ایک ہے۔ انسان کے لئے ڈراوا، تم میں سے اس شخص کے لئے جو آگے بڑھنا چاہے یا پیچھے رہ جانا چاہے۔ ہر آدمی اپنے کئے کاموں میں پھنسا ہوا ہے۔ دائیں طرف والوں کے سوا، وہ باغوں میں ہوں گے۔ وہ مجرموں سے پوچھیں گے، تم کو کیا چیز دوزخ میں لے گئی۔ وہ کہیں گے کہ ہم نماز پڑھنے والوں میں نہ تھے اور ہم محتاج کو کھانا نہیں کھلاتے تھے۔ اور ہم باتیں بنانے والوں کے ساتھ باتیں بناتے تھے۔ اور ہم انصاف کے دن کو جھٹلاتے تھے۔ یہاں تک کہ آپہنچی ہم پر وہ یقینی بات۔ اس وقت سفارش کرنے والوں کی سفارش ان کے کام نہ آئے گی (المدثر ۴۸ — ۳۲)

آخرت بہتر ہے

کامیاب ہو گیا وہ جس نے پاکی اختیار کی۔ اور اپنے رب کا نام یاد کیا اور نماز پڑھی۔ مگر تم لوگ دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو، حالانکہ آخرت بہتر ہے اور باقی رہنے والی ہے۔ یہی بات پچھلے صحیفوں میں بھی کہی گئی تھی ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں (الاعلیٰ ۱۸ — ۱۵)

جن کی کوششیں قابل قدر ٹھہریں گی

ہم نے انسان کو پیدا کیا پانی کی ایک مخلوط بوند سے تاکہ ہم اس کا امتحان لیں۔ پس ہم نے اس کو سننے اور دیکھنے والا بنایا۔ ہم نے اس کو راستہ دکھایا، چاہے وہ شکر کرنے والا بنے یا انکار کرنے والا۔ ہم نے انکار کرنے والوں کے لئے زنجیریں اور طوق اور بھڑکتی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے۔ بے شک نیک لوگ شراب کے ایسے پیالے پئیں گے جن میں چشمۂ کافور کی آمیزش ہوگی۔ اس چشمہ سے اللہ کے بندے پئیں گے، وہ

وہ اس کی شاخیں نکال لیں گے جس طرف چاہیں گے۔ یہ وہ لوگ ہوں گے جو نذر پوری کرتے ہیں اور اس دن سے ڈرتے ہیں جس کی آفت ہر طرف پھیلی ہوئی ہوگی۔ اور وہ اللہ کی محبت میں مسکین کو اور یتیم کو اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔ ہم تم کو صرف اللہ کی خاطر کھلا رہے ہیں۔ ہم تم سے نہ کوئی بدلہ چاہتے ہیں نہ شکریہ۔ ہم کو تو اپنے رب سے اس دن کے عذاب کا ڈر لگا ہوا ہے جو سخت مصیبت کا انتہائی طویل دن ہوگا۔ تو اللہ نے ان کو اس دن کی آفت سے بچا لیا اور ان کو تازگی اور سرور سے نوازا۔ اور انھوں نے جو صبر کیا اس کے بدلے میں ان کو جنت اور ریشمی لباس عطا فرمایا۔ وہاں وہ اونچی مسندوں پر ٹیک لگائے ہوئے ہوں گے۔ نہ ان کو دھوپ کی گرمی ستائے گی اور نہ جاڑے کی سردی۔ جنت کی چھاؤں ان پر جھکی ہوئی سایہ کر رہی ہوگی۔ اور اس کے پھل ہر وقت ان کی دسترس میں ہوں گے اور ان کے سامنے چاندی کے برتن اور شیشے کے پیالے گردش میں ہوں گے۔ وہ نہایت موزوں انداز سے بھرے ہوں گے۔ اور وہاں ان کو ایک اور شراب کے پیالے پلائے جائیں گے جس میں سونٹھ کی آمیزش ہوگی۔ یہ اس میں ایک چشمہ ہے جس کو سلسبیل کہا جاتا ہے۔ اور ان کی خدمت کے لئے ایسے لڑکے دوڑتے پھر رہے ہوں گے جو ہمیشہ ایک ہی سن پر رہیں گے۔ تم انھیں دیکھو تو سمجھو کہ موتی ہیں جو بکھیر دئے گئے ہیں۔ وہاں تم جدھر بھی نظر ڈالو گے عظیم نعمت اور عظیم بادشاہی دیکھو گے۔ ان کے اوپر باریک ریشم کے سبز لباس اور اطلس و دیبا کے کپڑے ہوں گے۔ ان کو چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے۔ اور ان کا رب ان کو پاکیزہ مشروب پلائے گا۔ بے شک یہ تمھارے عمل کا بدلہ ہے اور تمھاری سعی مقبول ہوئی (الدہر)

جزا و سزا کا دن

جب آسمان پھٹ جائے گا۔ اور جب تارے بکھر جائیں گے۔ اور جب سمندر پھاڑ دئے جائیں گے۔ اور جب قبریں کھول دی جائیں گی۔ اس وقت ہر آدمی جان لے گا جو اس نے آگے بھیجا اور جو اس نے پیچھے چھوڑا۔ اے انسان، کس چیز نے تجھ کو اپنے رب کریم کے بارے میں دھوکے میں ڈال دیا جس نے تجھ کو پیدا کیا۔ پھر تجھے درست کیا اور تجھ کو متناسب بنایا۔ جس صورت میں چاہا تجھ کو جوڑ کر تیار کیا۔ ہرگز نہیں، بلکہ تم لوگ جزا و سزا کو جھٹلاتے ہو۔ حالانکہ تمھارے اوپر نگراں مقرر ہیں، معزز لکھنے والے۔ جو تمھارے ہر فعل کو جانتے ہیں۔ بے شک نیک لوگ نعمتوں میں ہوں گے اور بے شک برے لوگ جہنم میں جائیں گے۔ جزا کے دن وہ اس میں داخل ہوں گے اور وہ اس سے ہرگز غائب نہ ہو سکیں گے۔ اور تم کیا جانتے ہو کہ وہ جزا کا دن کیا ہے۔ ہاں، تم کیا جانتے ہو کہ وہ جزا کا دن کیا ہے۔ یہ وہ دن ہے جب کہ

ایک شخص کے لئے دوسرے کے لئے کچھ کرنا ممکن نہ ہوگا۔ اور اس دن فیصلہ صرف اللہ کے اختیار میں ہوگا (الانفطار)

خدا کا مقبول دین

آخرت کا گھر ہم ان لوگوں کے لئے خاص کر دیں گے جو دنیا میں نہ بڑا بننا چاہیں اور نہ فساد کرنا، اور عاقبت متقیوں ہی کے لئے ہے۔ جو کوئی بھلائی لے کر آئے گا اس کے لئے اس سے بہتر بھلائی ہے۔ اور جو برائی لے کر آئے تو برائیاں کرنے والے وہی سزا پائیں گے جو وہ کرتے تھے (قصص ۸۴-۸۳)
جس شخص نے سرکشی کی اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے۔ جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا اور نفس کو بری خواہشات سے روکا، اس کا ٹھکانا جنت ہے۔ (النازعات ۴۱-۳۸) جو کوئی اسلام کے سوا کسی اور دین کو اختیار کرے گا، وہ ہرگز اس سے قبول نہ کیا جائے گا اور وہ شخص آخرت میں ناکام و نامراد ہوگا (آل عمران ۸۵)

دعا

سب تعریف صرف اللہ کے لئے ہے جو تمام کائنات کا پروردگار ہے۔ بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے۔ بدلہ کے دن کا مالک ہے۔ خدایا، ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔ ہم کو سیدھا راستہ دکھا، ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا جو تیرے معتوب نہیں ہوئے، جو بھٹکے ہوئے نہیں ہیں (الفاتحہ)

اے ہمارے رب

اے ہمارے رب، ہماری بھول اور ہماری غلطیوں پر ہم کو نہ پکڑ۔ اے ہمارے رب، ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جو تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا۔ اے ہمارے رب، ہم پر وہ بوجھ نہ رکھ جس کو اٹھانے کی ہمیں طاقت نہیں۔ ہم کو معاف کر، ہمیں بخش دے۔ ہم پر رحم فرما۔ تو ہمارا مولا ہے، پس تو انکار کرنے والوں کے مقابلہ میں ہماری مدد کر (البقرہ ۲۸۶) اے اللہ، سلطنت کے مالک، تو جس کو چاہے سلطنت دے اور جس سے چاہے سلطنت چھین لے۔ تو جس کو چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلیل کرے۔ سب خوبی تیرے ہاتھ میں ہے۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔ تو رات کو دن میں داخل کرتا ہے

ور دن کو رات میں داخل کرتا ہے۔ تو مردہ سے زندہ کو نکالتا ہے اور زندہ سے مردہ کو نکالتا ہے
ور تو جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق عطا فرماتا ہے (آل عمران ۲۷-۲۶)

ہم کو بچالے

ے ہمارے رب، ہمیں اپنی بیویوں اور اپنی اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک دے اور ہم کو
ہیزگاروں کا امام بنا (الفرقان ۷۴) اے میرے رب، مجھے نصیب کر کہ میں تیرے احسان کا شکر کروں
ۃ تو نے میرے اوپر اور میرے والدین کے اوپر کیا ہے اور یہ کہ میں نیک کام کروں جو تجھ کو پسند آئے اور
پنی رحمت سے مجھ کو اپنے صالح بندوں میں داخل کرلے (النمل ۱۹) اے ہمارے رب، تیرا رحم اور تیرا
لم ہر چیز پر چھایا ہوا ہے، تو ان لوگوں کو بخش دے جنھوں نے توبہ کی اور تیرے راستہ پر چلے اور
ن کو دوزخ کے عذاب سے بچالے۔ اے رب، اور انھیں داخل کر ہمیشہ رہنے والی جنتوں میں جن کا
وعدہ تو نے ان سے کیا ہے اور ان کے والدین اور ان کی بیویوں اور ان کی اولاد میں سے جو صالح ہوں
ن کو بھی، تو زبردست ہے حکمت والا ہے۔ اور بچالے ان کو خرابیوں سے اور جس کو تو اس دن خرابیوں سے
بچالے اس پر تو نے بڑا رحم کیا۔ اور یہی بڑی کامیابی ہے (المومن ۹-۷)

ہماری مدد کر

ے ہمارے رب، ہم کو دنیا میں بھلائی دے اور ہم کو آخرت میں بھلائی دے۔ اور ہم کو آگ کے عذاب
سے بچا (البقرہ ۲۰۱) اے ہمارے رب، ہمارے اوپر صبر انڈیل دے اور ہمارے قدموں کو جمادے اور
منکر لوگوں کے اوپر ہماری مدد کر (البقرہ ۲۵۰) اے ہمارے رب، ہمارے دلوں کو تو ہدایت دینے کے
بعد پھیر نہ دے۔ اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا فرما۔ بے شک تو ہی سب کچھ دینے والا ہے (آل عمران ۸)
ے ہمارے رب، ہم ایمان لائے۔ ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہم کو آگ کے عذاب سے بچا (آل عمران ۱۶)

ہمارے سینہ کو پاک کردے

ے ہمارے رب، ہم کو بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی جو ہم سے پہلے ایمان لائے اور ہمارے
دلوں میں ایمان والوں کے لئے کدورت نہ رکھ۔ اے ہمارے رب، تو بہت مہربان اور رحم والا ہے (الحشر ۱۰)
اے ہمارے رب، ہم نے تیرے اوپر بھروسہ کیا اور ہم نے تیری طرف رجوع کیا اور تیری ہی طرف لوٹنا ہے۔

اے ہمارے رب، ہمیں منکر لوگوں کے لئے فتنہ نہ بنا اور ہمیں بخش دے، بے شک تو زبردست ہے، حکمت والا ہے (۵-۴) اے ہمارے رب ہمارے لئے ہمارے نور کو کامل دے اور ہم کو بخش دے، تو ہر چیز پر قادر ہے (التحریم ۸)

اچھا خاتمہ کر

اے ہمارے رب، تو نے یہ سب بے مقصد نہیں بنایا، تو پاک ہے، پس ہم کو آگ کے عذاب سے بچا۔ اے ہمارے رب، تو نے جس کو آگ میں ڈالا اس کو تو نے واقعی رسوا کر دیا۔ اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔ اے ہمارے رب، ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا جو ایمان کی طرف پکار رہا تھا کہ اپنے رب پر ایمان لاؤ۔ پس ہم ایمان لائے۔ اے ہمارے رب ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہماری برائیوں کو ہم سے دور کر دے اور ہمارا خاتمہ نیک لوگوں کے ساتھ کر۔ اے ہمارے رب، تو نے جو وعدے اپنے رسولوں کی معرفت ہم سے کئے ہیں ان کو ہمارے ساتھ پورا کر اور قیامت کے دن ہم کو رسوائی میں نہ ڈال۔ بے شک تو اپنے وعدہ کے خلاف کرنے والا نہیں (آل عمران ۹۴ - ۱۹۱)

ہم پر رحم کر

اے میرے رب، مجھ کو نماز قائم کرنے والا بنا اور میری اولاد کو بھی۔ اے رب، میری دعا قبول کر۔ اے ہمارے رب، مجھ کو اور میرے والدین کو اور تمام ایمان والوں کو اس دن معاف کر دے جب کہ حساب قائم ہوگا (ابراہیم ۴۱ - ۴۰) اے میرے رب تو میرے والدین پر رحم کر جس طرح انھوں نے مجھے پالا جب کہ میں چھوٹا تھا (بنی اسرائیل ۲۵)

ہم کو فتنہ نہ بنا

اے ہمارے رب، ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو ہم کو معاف نہ کرے اور ہم پر رحم نہ کرے تو ہم گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے (الاعراف ۲۳) اے ہمارے رب، ہمارے اوپر صبر انڈیل دے اور ہم کو اس حال میں دنیا سے اٹھا کہ ہم تیرے فرماں بردار ہوں (الاعراف ۱۲۶) اے رب، تو ہی ہمارا مددگار ہے۔ پس ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم کر اور تو سب سے اچھا بخشنے والا ہے۔ تو ہمارے لئے اس

دنیا میں بھی بھلائی لکھ دے اور آخرت میں بھی، ہم نے تیری طرف رجوع کیا (الاعراف ۵۶ - ۱۵۵) اے ہمارے رب، ہمیں ظالم لوگوں کے لئے فتنہ نہ بنا۔ اور اپنی رحمت سے ہم کو منکروں سے نجات دے (یونس ۸۶ - ۸۵) اے زمین و آسمان کے پیدا کرنے والے، تو ہی میرا رفیق ہے دنیا میں اور آخرت میں۔ میرا خاتمہ اسلام پر کر اور مجھ کو نیکوں کے ساتھ شامل کر دے (یوسف ۱۰۱)

ہمارے کام کو درست کر دے

اے میرے رب، تو مجھ کو جہاں لے جا سچائی کے ساتھ لے جا اور جہاں سے مجھ کو نکال سچائی کے ساتھ نکال، اور اپنی طرف سے ایک قوت کو میرا مددگار بنا دے (بنی اسرائیل ۸۰) اے ہمارے رب، ہمیں اپنے پاس سے رحمت دے اور ہمارے لئے ہمارے کام میں درستی فرما (الکہف ۱۰)

مجھے اکیلا نہ چھوڑ

اے میرے رب، میرا سینہ کھول دے اور میرے کام کو میرے لئے آسان کر دے۔ اور میری زبان کی گرہ کھول دے تاکہ لوگ میری بات سمجھ لیں (طٰہٰ ۲۸ - ۲۵) اے میرے رب، مجھے زیادہ علم عطا کر (طٰہٰ ۱۱۴) اے رب، مجھے بیماری لگ گئی ہے اور تو سب سے بڑا مہربان ہے (الانبیاء ۸۳) اے میرے رب، مجھے اکیلا نہ چھوڑ دے اور تو سب سے اچھا وارث ہے (الانبیاء ۸۹) اے میرے رب، مجھے برکت والی جگہ میں اتار اور تو سب سے بہتر اتارنے والا ہے (المومنون ۲۹) اے میرے رب، اپنے یہاں جنت میں میرے لئے ایک گھر بنا دے (التحریم ۱۱) اے میرے رب، جو بھلائی تو میرے اوپر اتارے میں اس کا محتاج ہوں (القصص ۲۴) اے میرے رب، مفسد لوگوں کے مقابلہ میں میری مدد کر (العنکبوت ۳۰) اے رب، میں مغلوب ہو گیا، پس تو میرا بدلہ لے لے (القمر ۱۰)

عذاب سے بچا

اے میرے رب، میں تیری پناہ چاہتا ہوں شیطانوں کی اکساہٹ سے۔ اور اے میرے رب، میں تیری پناہ چاہتا ہوں اس سے کہ وہ میرے پاس آئیں (المومنون ۹۹ - ۹۸) اے ہمارے رب، ہم ایمان لائے، تو ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم کر اور تو سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے (المومنون ۱۰۹) اے ہمارے رب، جہنم کے عذاب کو ہم سے ہٹا دے، بیشک اس کا عذاب پکڑ لینے والا ہے (الفرقان ۶۵)

حج کی دعوتی اہمیت

خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور سے پہلے بیت المقدس پیغمبرانہ ہدایت کا مرکز تھا۔ خاتم النبیین کے بعد بیت اللہ الحرام پیغمبرانہ ہدایت کا مرکز ہے (البقرہ ۱۴۴) حج ایک اعتبار سے دنیا بھر کے پیروان اسلام کا سالانہ دعوتی اجتماع ہے۔ وہ خاص دنوں میں حرم کے گرد جمع ہوتے ہیں تاکہ اس کی مقدس فضاؤں میں خدا سے اپنا تعلق استوار کریں۔ اپنے باہمی اتحاد کو مضبوط کریں اور داعیٔ اعظم حضرت ابراہیم کی دعوتی زندگی کے مختلف مراحل کو علامتی طور پر دہرا کر اس بات کا عزم کریں کہ وہ ہر حال میں خدا کے دین کے داعی بنے رہیں گے۔

حج کی تاریخ

اللہ تعالیٰ نے ابراہیم کو امام ہدایت بنایا (انی جاعلک للناس اماما) یعنی آپ کو اس مستقل کام کے لئے چنا کہ آپ کے ذریعہ نبوت کا علم لوگوں تک برابر پہنچتا رہے۔ ابتدائی دو ہزار سال تک اس خدائی فیصلہ کا ظہور آپ کے صاحبزادہ اسحاق کی شاخ میں ہوا۔ حضرت اسحٰق سے لے کر حضرت مسیح تک اس نسل میں کثرت سے انبیاء پیدا ہوئے جنھوں نے فلسطین اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں دعوت حق کا کام مسلسل انجام دیا۔ حضرت مسیح کے بعد یہ دینی امامت آپ کے دوسرے صاحبزادہ اسماعیل کی نسل میں منتقل ہو گئی۔ ان کی اولاد میں آخری نبی پیدا ہوئے۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے خصوصی طور پر غلبہ کی نسبت دی تاکہ آپ کے ذریعہ کتاب الٰہی کی حفاظت کا یقینی انتظام ہو سکے اور دین کے مٹنے کا اندیشہ نہ رہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو قرآن میں اظہار دین (لیظھرہ علی الدین کلہ) کہا گیا ہے۔ عام پیغمبروں سے اصلاً صرف تبلیغ دین مطلوب تھی اور پیغمبر آخر الزماں سے تبلیغ دین کے ساتھ اظہار دین بھی۔

اس مقصد کے لئے انسانوں کی ایک معاون جماعت درکار تھی جو تمام انسانی اوصاف سے متصف ہو۔ وہ پیغمبر آخر الزماں کا ساتھ دے کر اظہار دین کے منصوبہ کو تکمیل تک پہنچائے۔ اسی جماعت کی تیاری کے لئے حضرت ابراہیم نے اپنی بیوی ہاجرہ اور اپنے لڑکے اسماعیل کو قدیم مکہ کے غیر آباد اور خشک علاقے میں لا کر بسا دیا، تاکہ تمدن سے دور فطرت کے سادہ ماحول میں توالد و تناسل کے ذریعہ ایک ایسی قوم پیدا ہو جس کے اندر تمام اعلیٰ انسانی صلاحیتیں محفوظ ہوں۔ جو نیٔے آمیز ڈھنگ سے سوچے۔ جس کے قول و فعل میں تضاد نہ ہو۔ جو ایک نظری حق کی خاطر اپنا سب کچھ لٹا سکے۔ جس کے اندر پہاڑوں کی صلابت، صحرا کی وسعت اور آسمان کی بلندی ہو۔ اس طرح جب صحرائی ماحول میں پرورش پا کر ایک خیر امت وجود میں آگئی (آل عمران ۱۱۰) تو عین وقت پر اس کے اندر وہ نبی پیدا کر دئے گئے جس کے لئے حضرت ابراہیم نے تعمیر کعبہ کے وقت دعا

کی تھی (البقرہ ۱۲۹)

حضرت ابراہیم کی بیوی سارہ کے بطن سے خدا کو ایک پیغمبر پیدا کرنا تھا۔ یہ پیغمبر حضرت ابراہیم ہی کی زندگی میں پیدا ہوگیا اور اس کا نام اسحاق رکھا گیا۔ دوسری طرف حضرت ابراہیم نے مکہ میں دعا کی کہ میرے لڑکے اسماعیل کی اولاد میں ایک نبی پیدا کر، تو اس دعا کی تکمیل میں دو ہزار سال سے زیادہ مدت لگ گئی۔ اس فرق کی وجہ کیا تھی۔ اس کی وجہ دونوں کے تاریخی کردار کا فرق تھا۔ پیغمبر آخرالزماں کو اپنا مطلوبہ کردار ادا کرنے کے لئے ایک زندہ قوم درکار تھی۔ اس طرح کی قوم اسباب کے پردہ میں بننے کے لئے دو ہزار سال سے زیادہ کی مدت لگ گئی۔ چنانچہ جب یہ قوم تیار ہوگئی تو آپ خدائی منصوبہ کے مطابق پیدا کردئے گئے۔ تاہم یہ بھی ضروری تھا کہ تیاری کے اس طویل وقفہ کے دوران پیغمبرانہ دعوت کے تسلسل کو باقی رکھا جائے۔ اس لئے دوسرا انتظام یہ کیا گیا کہ حضرت ابراہیم کی نسل کی اسرائیلی شاخ میں انبیاء کی پیدائش کا سلسلہ قائم کر دیا گیا۔ اور ایک کے بعد ایک پیغمبر آکر لوگوں کو خدا پرستی کا پیغام دیتے رہے۔ تاآنکہ نبی آخرالزماں کے ظہور کا وقت آجانے کی وجہ سے اس کی ضرورت باقی نہ رہی۔

اس منصوبہ کے مطابق حضرت ابراہیم اپنے وطن عراق سے نکلے۔ ایک طرف آپ نے فلسطین (حبرون) میں اپنی بیوی سارہ کو بسایا جن سے اسحاق پیدا ہوئے۔ دوسری طرف آپ نے عرب (مکہ) میں اپنی دوسری بیوی ہاجرہ اور ان کے لڑکے اسماعیل کو رکھا اور یہاں کعبہ کی تعمیر کی۔ گویا حضرت ابراہیم کے ذریعہ ہدایت عالم کی جو منصوبہ بندی کی گئی اس کے ابتدائی جزء کا مرکز فلسطین تھا اور اس کے آخری جزء کا مرکز حجاز۔

حضرت ابراہیم کے بعد اولاً فلسطین ہدایت الٰہی کا مرکز بنا۔ اسی علاقہ میں اس زمانہ کے تمام انبیاء پیدا ہوئے ——— حضرت اسحاق، حضرت یعقوب، حضرت یوسف، حضرت موسیٰ، حضرت داؤد، حضرت سلیمان، حضرت یحییٰ، حضرت عیسیٰ وغیرہ۔ حضرت ابراہیم کے پوتے حضرت یعقوب کا دوسرا نام اسرائیل تھا۔ انھیں کی نسبت سے یہ نسل بنی اسرائیل کے نام سے مشہور ہوئی۔ بعد کو جب بنی اسرائیل پر زوال آگیا اور پیغمبروں کی مسلسل فہمائش کے باوجود انھوں نے اپنی اصلاح نہ کی تو خدا نے ہدایت آسمانی کے حامل ہونے کی حیثیت سے انھیں معزول کر دیا اور یہ مقدس منصب ابراہیمی نسل کی دوسری شاخ بنو اسماعیل کو دے دیا۔ یہ واقعہ عین اس وقت ہوا جب کہ دو ہزار سالہ عمل کے نتیجہ میں ان کے اندر ایک ایسی زندہ قوم تیار ہو چکی تھی جو خدا کے دین کی حامل بن سکے۔ اس تبدیلی کی ایک ظاہری نشانی کے طور پر قبلۂ عبادت بدل دیا گیا۔ حضرت ابراہیم کے بعد تمام انبیاء بیت المقدس کی طرف رخ کرکے عبادت کرتے تھے۔ اب قدیم قبلہ کو منسوخ کرکے کعبہ کو قبلۂ عبادت کی حیثیت دے دی گئی۔

حج ایک دعوتی ادارہ

حج ابراہیمی تاریخ کا اعادہ ہے۔ حضرت ابراہیم کے ذریعہ دعوتِ حق کی جو عالمی منصوبہ بندی کی گئی، اسی کے مختلف مراحل کو حاجی علامتی طور پر دہراتا ہے اور اس طرح خدا سے یہ عہد کرتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اسی ربانی مشن میں لگائے گا جس میں حضرت ابراہیم نے اپنے آپ کو لگایا، وہ ختم نبوت کے بعد نبوت کے کام کو اسی طرح جاری رکھے گا جس طرح خدا کے پاک پیغمبر نے اس کو انجام دیا۔

خدا کے دعوتی منصوبہ کی تکمیل کے لئے حضرت ابراہیم اپنے وطن سے نکلے، اسی طرح حاجی بھی اپنے وطن سے نکل کر زبان حال سے یہ کہتا ہے کہ وہ دین کی خاطر بے وطن ہونے کے لئے تیار ہے۔ انھوں نے بالکل سادہ اور معمولی زندگی پر قناعت کی اسی طرح حاجی احرام باندھ کر یہ عزم کرتا ہے کہ وہ صرف ناگزیر ضرورت پر اکتفا کر کے اپنی توجہ کو اصل مقصد کی طرف لگائے رہے گا۔ انھوں نے کعبہ کے گرد طواف کر کے خدا کے ساتھ اپنی وفاداری کو استوار کیا اسی طرح حاجی بھی کعبہ کا طواف کر کے خدا کا وفادار ہونے کا اعلان کرتا ہے۔ دینی تقاضوں میں مصروف ہونے کی وجہ سے ان کے اہل خاندان پر یہ حالت گزری کہ پانی کی تلاش میں وہ صفا ومروہ کے درمیان دوڑے اسی طرح حاجی دونوں پہاڑوں کے درمیان سعی کر کے ظاہر کرتا ہے کہ خدا کی خاطر وہ اس آخری حد تک جانے کے لئے تیار ہے خواہ اس کے گھر والوں پر وہ کیفیت گزر جائے جو ہاجرہ اور اسماعیل پر گزری۔ حضرت ابراہیم کو شیطان نے خدا کے کام سے ہٹانے کی کوشش کی تو انھوں نے اس کے اوپر کنکریاں پھینکیں اسی طرح حاجی علامتی شیطان پر رمی کر کے اس ارادہ کا اظہار کرتا ہے کہ وہ بھی شیطان کے ساتھ یہی سلوک کرے گا اگر اس نے اس کو ورغلایا۔ حضرت ابراہیم کو خدا کی خاطر بیٹے کی جان تک پیش کرنی پڑی اسی طرح حاجی جانور کو قربان کر کے یہ اعلان کرتا ہے کہ دین کی خاطر وہ قربانی کی حد تک جانے کے لئے تیار ہے۔ حضرت ابراہیم کا دعوتی مشن آخرت سے آگاہ کرنے کا مشن تھا، چنانچہ حاجی میدان عرفات میں جمع ہو کر میدان حشر کو یاد کرتا ہے تاکہ اس سب سے بڑی حقیقت کی یاد کو وہ اپنے ذہن کا جزء بنائے اور اس کے بارے میں لوگوں کو آگاہ کرے۔ حضرت ابراہیم کو جب جب ان کے رب نے پکارا وہ فوراً حاضر ہو گئے اسی طرح حاجی اٹھتے بیٹھتے اور حج کے ارکان ادا کرتے ہوئے بار بار کہتا ہے: لبیك اللّٰھم لبیك لا شریك لك لبیك ان الحمد والنعمۃ لك والملك لا شریك لك (میں حاضر ہوں، اے اللہ میں حاضر ہوں تیرا کوئی شریک نہیں۔ میں حاضر ہوں۔ تعریف اور نعمت تیرے ہی لئے ہے اور اقتدار میں تیرا کوئی شریک نہیں) اس طرح حاجی اعلان کرتا ہے کہ وہ اپنے رب کی پکار پر ہر وقت حاضر ہونے کے لئے تیار ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ بیت اللہ دعوت اسلامی کا مرکز ہے اور حج اسلام کے داعیوں کا عالمی اجتماع۔

حج کے موقع پر جو افعال کئے جاتے ہیں وہ سب وہی ہیں جو حضرت ابراہیم کی دعوتی زندگی کی یادگار ہیں۔ حج کے مناسک انھیں واقعات کا تمثیلی اعادہ ہیں جو حضرت ابراہیم کو اپنی دعوتی سرگرمیوں کے درمیان مختلف صورتوں میں پیش آئے۔ حاجی بطور شعار (علامت) انھیں حج کے دنوں میں دہراتا ہے اور اس طرح اس بات کا عزم کرتا ہے کہ وہ اسی طرح داعی بن کر رہے گا جس طرح حضرت ابراہیم دنیا میں خدا کے داعی بن کر رہے۔ ان میں سے کچھ دعوتی زندگی کے براہ راست مرحلے ہیں اور کچھ بالواسطہ مرحلے۔

حضرت ابراہیم کی زندگی بتاتی ہے کہ حج کے یہ مراسم ان کی دعوتی زندگی کا جزء یا ان کے دعوتی سفر کے مراحل تھے۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے لئے حج اور کعبہ کی زیارت محض ایک قسم کی سالانہ مذہبی رسم بن کر رہ گئی ہے۔ مسلمانوں میں اگر دعوتی شعور اور تبلیغی روح زندہ ہو تو حج کا اجتماع خود بخود دعوتی اہمیت اختیار کرے گا اور سالانہ دعوتی کانفرنس کے ہم معنی بن جائے گا۔ مگر جب مسلمانوں میں دعوتی روح ختم ہو جائے تو حج اسی طرح ایک بے روح عمل بن کر رہ جاتا ہے جیسا کہ وہ اس وقت مسلمانوں کے درمیان بنا ہوا ہے۔ وہ پتھر کے شیطان پر کنکریاں پھینکتے ہیں مگر زندہ شیطان کو زیر کرنے کے لئے کچھ نہیں کرتے۔ وہ علامتی اعمال کو دہراتے ہیں مگر حقیقی اعمال کی ادائگی کے لئے ان کے اندر کوئی جذبہ نہیں بھڑکتا۔

حج ذریعۂ اتحاد

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی سب سے بڑی خصوصیت ان کا اختلاف و انتشار ہے۔ کیا وجہ ہے کہ حج جیسا نادر اجتماعی ادارہ ان کے درمیان پوری طرح موجود ہے، اس کے باوجود ان کے اندر باہمی اتحاد پیدا نہیں ہوتا۔ حالانکہ حج اپنے سالانہ عالمی اجتماع کے ساتھ ساری دنیا کے مسلمانوں کے لئے اتحاد کا ایسا طاقت ور ذریعہ ہونا چاہئے جس میں تمام اختلافات پگھل کر رہ جائیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حج موجودہ حالت میں صرف ایک قسم کا روایتی ہجوم بن کر رہ گیا ہے نہ کہ کسی عظیم مقصد کے حاملین کا زندہ اجتماع۔

اتحاد کے لئے ضروری ہے کہ لوگوں کے درمیان کوئی ایسا مشترک مقصد موجود ہو جو ان کی توجہات کو بلند تر نصب العین کی طرف لگا دے۔ اگر ایسا کوئی بڑا مقصد سامنے موجود نہ ہوگا تو لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں میں الجھ کر رہ جائیں گے اور بڑے بڑے اجتماعات کے باوجود مجتمع اور متحد نہ ہوں گے۔ دعوت، امت مسلمہ کا یہی عظیم مقصد ہے۔ اگر مسلمانوں کے اندر دعوتی جذبہ ابھر آئے تو اچانک پوری امت ایک بڑے نشانہ کی طرف متوجہ ہو جائے گی۔ اس کے بعد حج کا اجتماع اپنے آپ مسلمانوں کے درمیان عالمی اتحاد پیدا کرنے کا ذریعہ بن جائے گا اور اسی کے ساتھ اسلام کی دعوت کا عالمی مرکز بھی۔

حج ایک زندہ عمل

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنہ۱۰ھ میں آخری حج ادا فرمایا۔ اس موقع پر ایک لاکھ سے زیادہ مسلمانوں کی موجودگی میں آپ نے ۹ ذی الحجہ کو میدان عرفات میں ایک مفصل خطبہ دیا جو خطبہ حجۃ الوداع کے نام سے مشہور ہے۔ آپ کے اس حج کو حجۃ البلاغ بھی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ اس میں آپ نے اسلام کی تمام بنیادی تعلیمات کو امت تک پہنچا کر اس سے اس کا عہد لیا تھا۔ چنانچہ خطبہ کے آخر میں یہ الفاظ آتے ہیں :

الا فلیبلغ الشاھد الغائب۔ فرب مبلغ اوعی من سامع۔ و انتم تسألون عنی ماذا انتم قائلون۔ قالوا نشھد انک قد ادیت الامانۃ و بلغت الرسالۃ و نصحت فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باصبعہ السبابۃ یرفعھا الی السماء و ینکتھا الی الناس : اللھم اشھد اللھم اشھد

خبردار، جو موجود ہیں وہ میری بات کو غیر موجود تک پہنچادیں۔ کیونکہ پہنچائے جانے والے اکثر سننے والوں سے زیادہ محفوظ رکھنے والے ہوتے ہیں۔ اور تم سے میرے بارے میں پوچھا جائے گا پھر تم کیا جواب دوگے۔ لوگوں نے کہا ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ نے امانت ادا کردی اور پیغام پہنچادیا اور خیر خواہی کا حق ادا کردیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انگلی آسمان کی طرف اٹھائی اور پھر لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: اے اللہ تو گواہ رہ، اے اللہ تو گواہ رہ۔

اس واقعہ کے تین مہینے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی۔ اس وقت تک اسلام عملاً عرب کے ملک تک پھیلا تھا۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کے اصحاب عرب سے باہر نکلے۔ انھوں نے تبلیغ اسلام کو اپنا مشن بنالیا۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی اور سارا اثاثہ دین کی اشاعت کی راہ میں لگادیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کی وفات کے پچاس سال کے اندر اسلام قدیم آباد دنیا کے بڑے حصہ میں پھیل گیا۔

اب بھی حج باقاعدہ ادا کیا جاتا ہے اور "حجۃ البلاغ" سے زیادہ بڑے مجمع کو خطاب کرتے ہوئے امام حج ہر سال اسی قسم کی باتیں دہراتا ہے جو پیغمبر اسلام نے چودہ سو سال پہلے کہی تھیں۔ مگر آج ان باتوں کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ اس فرق کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے حج ایک زندہ عمل تھا، آج وہ ایک روایتی عمل بن گیا ہے۔ پیغمبر اسلام نے حج کے موقع پر جن لوگوں کو خطاب کیا تھا وہ اسی ارادہ اور عزم کے ساتھ وہاں جمع ہوئے تھے کہ ان کو جو ہدایت دی جائے اس کو انھیں

پورا کرنا ہے۔ اس کے برعکس آج حاجیوں کی بھیڑ مکہ اور مدینہ صرف اس لئے جاتی ہے کہ وہ حج کے نام پر کچھ رسوم ادا کر کے واپس آجائے۔ اور جس حال میں پہلے تھی اسی حال میں دوبارہ رہنے لگے۔

اس سے معلوم ہوا کہ حج کو ایک مؤثر عمل کی حیثیت سے زندہ کرنے کا کام سب سے پہلے "حاجیوں" کو زندہ کرنے کا کام ہے۔ جب تک حاجیوں، بالفاظ دیگر مسلمانوں میں شعور بیدار نہ کیا جائے، حج کی عبادت اسی طرح بے اثر رہے گی جیسے ایک غیر صالح بندوق جس کی لبلبی دبائی جائے مگر اس کے باوجود وہ فائر نہ کرے۔

حج کی تنظیم نو

حج کو دوبارہ اس کی اصل روح کے ساتھ زندہ کرنا یہ ہے کہ اس کو دعوتی ادارہ کی حیثیت سے زندہ کیا جائے۔ حج کو دعوت اسلامی کی عالمی منصوبہ بندی کا مرکز بنا دیا جائے۔ اس بین اقوامی موقع پر ہر ملک کے لوگ اپنے ملک کے دعوتی حالات پیش کریں۔ ایک جگہ کے لوگ دوسری جگہ کے تجربات کو جانیں اور اس سے فائدہ اٹھائیں۔ حج کے خطبات میں دعوت کی اہمیت اور اس کے جدید مواقع کی وضاحت کی جائے۔ حج کے ادارہ کے تحت مختلف زبانوں میں موثر دعوتی لٹریچر تیار کرنے کا انتظام کیا جائے، اور اس کو عالمی سطح پر پھیلایا جائے۔ وغیرہ

تاہم یہ بھی اچھی طرح جان لینا چاہئے کہ حج کی نئی رخ بندی خود مسلمانوں کی زندگی کی نئی رُخ بندی کے بغیر نہیں ہوسکتی۔ مسلمان کی اصل ذمہ داری شہادت علی الناس ہے۔ ان کے اور دوسری قوموں کے درمیان داعی اور مدعو کا رشتہ ہے۔ مگر مسلمان موجودہ زمانہ میں اس حقیقت کو بالکل بھول گئے ہیں۔ انھوں نے ساری دنیا میں غیر مسلم اقوام کو اپنا مادی حریف اور قومی فریق بنا رکھا ہے۔ حج کو دعوتی ادارہ کی حیثیت سے زندہ کرنے کے لئے سب سے پہلے مسلمانوں کو دعوتی گروہ کی حیثیت سے زندہ کرنا ہوگا۔ مسلمانوں کو اس کے لئے آمادہ کرنا ہوگا کہ دنیا بھر میں وہ اپنی ان قومی سرگرمیوں کو ختم کر دیں جو ان کے اور دوسری قوموں کے درمیان داعی اور مدعو کی فضا پیدا نہیں ہونے دیتیں۔ اگر آپ کے اور دوسری قوموں کے درمیان معتدل فضا نہ ہو تو آپ کس کو تبلیغ کریں گے اور کون آپ کی تبلیغ کو سنے گا۔

پھر اس مقصد کے لئے ضرورت ہے کہ اعلیٰ درجہ کی تبلیغی یونیورسٹیاں قائم کی جائیں، جن کا نصاب اور نظام کامل طور پر دعوت رخی ہو۔ ایسے ادارے قائم کئے جائیں جہاں لوگوں کی تربیت داعیانہ انداز سے کی جائے۔ ایسا لٹریچر تیار کیا جائے جو ایک طرف لوگوں کے اندر دعوتی ذہن بنائے اور

دوسری طرف ان کو دعوتی معلومات سے مسلح کرے۔ حتیٰ کہ اس کے لئے ضرورت ہے کہ اسلام کا جدید بنیادی لٹریچر دوبارہ تیار کیا جائے۔ کیونکہ موجودہ زمانہ میں تفسیر قرآن اور سیرت رسول پر جو کتابیں تیار ہوئی ہیں وہ زیادہ تر ردعمل کی نفسیات کے تحت لکھی گئی ہیں، وہ غیر قوموں کے فکری اور عملی حملوں کے جواب کے طور پر وجود میں آئیں نہ کہ دعوت اسلام کی مثبت وضاحت کے لئے۔

اب سے چودہ سو سال پہلے کی دور میں چلے جائیے تو آپ دیکھیں گے کہ اسلام کا پیغمبر تنہا کعبہ کا طواف کر رہا ہے۔ اس وقت اسلام ایک فی دنیا کی تعداد کی حیثیت رکھتا تھا۔ مگر آج ہر دن کثرت سے لوگ کعبہ کا طواف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور حج کے زمانہ میں ساری دنیا کے لاکھوں انسان اس طرح ہجوم کر کے مکہ آتے ہیں کہ مسجد حرام کی مسلسل توسیع کے باوجود ہر سال اس کی عمارت ناکافی ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ تعداد کی یہ کثرت کیسے ممکن ہوئی، جواب یہ ہے کہ دعوت کے ذریعہ۔ حقیقت یہ ہے کہ حج کا عالمی اجتماع اسلام کی دعوتی قوت کا ایک سالانہ مظاہرہ ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ اسلام کی دعوتی قوت ہی میں اللہ تعالیٰ نے اس کی تمام ترقیوں کا راز چھپا دیا ہے۔ اسی میں اہل اسلام کی دنیوی نجات بھی ہے اور اسی میں ان کی اخروی نجات بھی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اسلام کی قوت ہمیشہ دعوت رہی ہے۔ ابتدائی دور میں اسلام اگرچہ مکہ کے عوام کو متاثر نہ کر سکا، مگر وہ سارے قیمتی افراد مکہ کے ابتدائی دور ہی میں ملے جو بعد کو اسلام کی تاریخ کے ستون قرار پائے۔ یہ صرف اسلامی دعوت کا نتیجہ تھا کیونکہ اس وقت اسلام کے پاس کوئی دوسری قوت موجود ہی نہ تھی۔ بعد کو مکہ کے جو لوگ اسلام لائے وہ بھی اسلام کی نظریاتی برتری سے متاثر ہو کر اسلام لائے، مثلاً عمرو بن العاص اور خالد بن الولید وغیرہ۔

دوسرے مرحلہ میں مدینہ میں اسلام کا مستحکم ہونا بھی دعوت ہی کے ذریعہ عمل میں آیا۔ مدینہ پر کبھی کوئی حملہ نہیں کیا گیا۔ صرف چند لوگ اسلام کے داعی بن کر مدینہ پہنچے وہاں انھوں نے سادہ انداز میں اسلام کی دعوت شروع کی۔ اس کے نتیجہ میں لوگ جوق در جوق مسلمان ہونے لگے۔ یہاں تک کہ وہ نوبت آئی کہ مدینہ اسلام کا فکری اور عملی مرکز بن گیا۔

بعد کے دور میں مغلوں اور تاتاریوں کا مسئلہ اسلام کے لئے پیش آیا۔ یہ وحشی قومیں گھوڑوں پر سوار ہو کر تیر اور تلوار لئے ہوئے مسلم ملکوں پر ٹوٹ پڑیں اور ان کے طاقتی مراکز کو زیر وزبر کر ڈالا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسلام کی تاریخ اسی طرح ختم ہو جائے گی جس طرح اس سے پہلے بہت سی تہذیبوں کی تاریخ پیدا ہوئی اور ختم ہو گئی۔ مگر عین اس وقت اسلام کی دعوتی طاقت ابھری اور اس نے سارے مسئلہ کو اس طرح حل کر دیا کہ خود فاتح قوموں کو اسلام کا جزء بنا دیا۔

حج اور بیت اللہ ایک عظیم دعوتی منصوبہ بندی کی علامت ہیں۔ حضرت ابراہیم کی آواز جب عراق اور شام اور مصر کے متمدن علاقوں میں نہیں سنی گئی تو آپ نے خدا کے حکم سے اپنی اولاد کو لا کر مکہ میں بسایا اور یہاں کعبہ کی تعمیر کی تاکہ وہ ہدایت الٰہی کے مستقل مرکز کے طور پر کام دے:

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِلْعَالَمِينَ (آل عمران ۹۶)

پہلا گھر جو لوگوں کے لئے مقرر کیا گیا وہ وہی ہے جو مکہ میں ہے، برکت والا اور سارے جہان کے لئے رہنما۔

عمرو بن عوف رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان الدين ليأرز الى الحجاز كما تأرز الحية الى جحرها وليعقلن الدين من الحجاز معقل الاروية من رأس الجبل۔ ان الدين بدأ غريباً و سيعود كما بدأ فطوبى للغرباء وهم الذين يصلحون ما افسد الناس (اخرجه الترمذی)

دین حجاز کی طرف سمٹ آئے گا جس طرح سانپ اپنے بل کی طرف سمٹ آتا ہے اور دین حجاز کے ساتھ باندھ دیا جائے گا جس طرح بکرے کو پہاڑ کے تھان پر باندھ دیا جاتا ہے۔ دین شروع ہوا تو وہ اجنبی تھا۔ وہ دوبارہ اجنبی ہو جائے گا تو اجنبیوں کو مبارک ہو۔ یہی لوگ ہیں جو اس وقت لوگوں کی اصلاح کریں گے جب کہ وہ بگڑ جائیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں حجاز دعوت اسلامی کا مرکز بنا اسی طرح آئندہ بھی جب دین لوگوں کے اندر سے گم ہو گا تو دوبارہ حجاز ہی خدا کے دین کو زندہ کرنے کا مرکز بنے گا۔ حج کا مقام خدا کی عبادت کا مقام بھی ہے اور خدا کے دین کی دعوت و تجدید کا مرکز بھی۔ ضرورت ہے کہ آج حج اور حج کے مراکز کو دوبارہ اسی حیثیت سے زندہ کیا جائے۔

موجودہ زمانہ میں سائنسی انقلاب نے بہت سے نئے دعوتی امکانات کھول دئے ہیں۔ ان کے نتیجہ میں آج یہ بات ہمیشہ سے زیادہ بڑے پیمانہ پر ممکن ہو گئی ہے کہ حج کے عالم گیر اجتماع کو دعوت دین کی عالمی منصوبہ بندی کے لئے استعمال کیا جائے اور اس طرح اسلام کے طرز فکر کو دنیا میں دوبارہ غالب طرز فکر بنا دیا جائے۔ جیسا کہ ماضی میں وہ غالب طرز فکر بنا ہوا تھا۔ یہی وہ مقصود ہے جس کو قرآن میں اظہار دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کہا گیا ہے، اور اس کو پانے کا راز بلاشبہ حج کی دعوتی اہمیت کو دوبارہ زندہ کرنے میں چھپا ہوا ہے۔

نوٹ: یہ مقالہ (انگریزی میں) لندن کے انٹرنیشنل حج سیمینار (۴-۷ اگست ۱۹۸۲) کے موقع پر پڑھا گیا۔

عقیل احمد خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی سے شائع کیا

OCTOBER 1982

AL-RISALA MONTHLY

JAMIAT BUILDING QASIMJAN STREET DELHI-110006 (INDIA) PHONE 232231

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

۱۔	تذکیر القرآن	۵۰-۰
۲۔	الاسلام	۱۵-۰
۳۔	مذہب اور جدید چیلنج	۱۵-۰
۴۔	ظہور اسلام	۱۵-۰
۵۔	دین کیا ہے ؟	۲-۰
۶۔	قرآن کا مطلوب انسان	۵-۰
۷۔	تجدید دین	۳-۰
۸۔	اسلام دین فطرت	۳-۰
۹۔	تعمیر ملت	۳-۰
۱۰۔	تاریخ کا سبق	۳-۰
۱۱۔	مذہب اور سائنس	۵-۰
۱۲۔	عقلیات اسلام	۳-۰
۱۳۔	فسادات کا مسئلہ	۲-۰
۱۴۔	انسان اپنے آپ کو پہچان	۱-۰
۱۵۔	تعارف اسلام	۲-۵۰
۱۶۔	اسلام پندرھویں صدی میں	۲-۰
۱۷۔	راہیں بند نہیں	۳-۰
۱۸۔	دینی تعلیم	۳-۰
۱۹۔	ایمانی طاقت	۳-۰
۲۰۔	اتحاد ملت	۳-۰
۲۱۔	سبق آموز واقعات	۳-۰
۲۲۔	اسلامی دعوت	۳-۰
۲۳۔	زلزلۂ قیامت	۴-۰
۲۴۔	سچا راستہ	۱-۰
۲۵۔	نارِ جہنم	۳-۰
۲۶۔	باغِ جنت	۳-۰

الرسالہ

سرپرست

مولانا وحید الدین خان

اسلامی مرکز کا ترجمان

الرسالہ

نومبر ۱۹۸۲
شمارہ ۷۲

جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دھلی ۱۱۰۰۰۶ (انڈیا)

تعارفی سٹ

اسلام کے تعارف پر ہم نے پانچ کتابوں کا ایک سٹ تیار کیا ہے جو مدارس میں ابتدائی اسلامی تعلیم کے لئے بھی مفید ہے اور اسلام کے عمومی تعارف کے لئے بھی۔ یہ سٹ حسب ذیل ہے۔

۱۔ سچا راستہ	ایک روپیہ پچاس پیسے
۲۔ دینی تعلیم	تین روپیہ
۳۔ حیات طیبہ	دو روپیہ پچاس پیسے
۴۔ باغ جنت	تین روپیہ
۵۔ نار جہنم	تین روپیہ

اس تعارفی سٹ کو اردو کے علاوہ دوسری زبانوں میں شائع کرنے کے لئے جو لوگ کوئی تعاون کریں وہ انشاءاللہ خدا کے یہاں اس کا اجر پائیں گے۔

مکتبہ الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

زرتعاون سالانہ ۳۶ روپیہ • خصوصی تعاون سالانہ دو سو روپے • بیرونی ممالک سے ۲۰ ڈالر امریکی

خدا کی نشانیاں

میکسویل وہ شخص ہے جس نے فطرت میں برقی مقناطیسی تعامل کے قوانین کو انتہائی کامیابی کے ساتھ ریاضیاتی مساوات میں بیان کیا۔ کہا جاتا ہے کہ جب عظیم جرمن سائنسداں بولٹزمین نے اس کو دیکھا تو اس نے تعجب کے ساتھ کہا کہ کون وہ خدا ہے جس نے یہ نشانیاں لکھ دیں۔

Maxwell put the laws of electromagnetic interactions into equations so marvellous that when the great German physicist, Boltzmann, saw them he exclaimed, 'Who was the God who wrote these signs?'

کائنات کا مطالعہ کرنے والے کے لئے سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ ہر مطالعہ بالآخر ایک ایسی چیز پر ختم ہوتا ہے جو انتہائی پراسرار طور پر حکیمانہ ہوتی ہے۔ کائنات اپنے آخری مطالعہ میں ایک حد درجہ منظم واقعہ ہے نہ کہ کوئی بے ترتیب انبار۔ یہ حقیقت ہر واقف کار کو یہ ماننے پر مجبور کرتی ہے کہ کائناتی واقعات کے پیچھے کوئی برتر ذہن کام کر رہا ہے۔

آئن سٹائن ایک خالص سائنسی مزاج کا آدمی تھا۔ تاہم اس نے اقرار کیا ہے کہ میں طبیعیات داں سے زیادہ ایک فلسفی ہوں۔ کیونکہ میرا یقین ہے کہ ہمارے باہر بھی ایک حقیقت ہے:

I am more a philosopher than a physicist,
for I believe there is a reality outside of us

—— The World As I See It.

آئن سٹائن اپنے اس ذہن کی وجہ سے کہتا ہے کہ اس معنی میں میں بھی ایک پکا مذہبی آدمی ہوں:

In this sense, I belong to the ranks of devoutly religious men

کائنات خدا کی نشانی ہے۔ وہ مخلوق کے روپ میں خالق کی تصویر دکھاتی ہے۔ جو شخص کھلے ذہن کے ساتھ کائنات کو دیکھے گا وہ اس کے اندر اس کے خدا کو پالے گا۔ البتہ جن کے ذہن میں ٹیڑھ ہو وہ عین روشنی کے درمیان بھی اندھیرے میں رہیں گے، وہ خدا کے قریب کھڑے ہو کر بھی خدا کو نہ پائیں گے۔

یہ فرق کیوں

ملک کے کسی شہر میں فرقہ وارانہ فساد کی خبر معلوم ہو تو تمام مسلم لیڈر اچانک جاگ اٹھتے ہیں۔ کوئی پرشور بیان دیتا ہے۔ کوئی جوشیلی تقریر کرتا ہے، کوئی حکومت کے ذمہ داروں سے ملاقات کے لئے دوڑ پڑتا ہے۔ کوئی ریلیف فنڈ قائم کرکے چندہ جمع کرنا شروع کردیتا ہے۔ کوئی باہر کے دورہ پر ہو تو وہ اپنا بیرونی دورہ مختصر کرکے فوراً ہوائی جہاز سے واپس آجاتا ہے تاکہ مصیبت زدگان کی مدد کرسکے۔

مگر یہی مسلم لیڈر جو اجتماعی فساد میں اپنا حصہ ادا کرنے کے لئے اتنی تیزی دکھاتے ہیں، وہ انفرادی فساد کے موقع پر بالکل بے حس بنے رہتے ہیں۔ ان کے اپنے شہر میں ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو ستارہا ہو یا کوئی مسلمان خود ان کی اپنی فساد انگیزی کا شکار ہو رہا ہو تو ایسے موقع پر ان سے کی گئی ہر فریاد صدا بہ صحرا ثابت ہوتی ہے۔ قوم کے ظلم پر بے چین ہوجانے والے لوگ فرد کے ظلم پر اس طرح بے حس و حرکت بنے رہتے ہیں جیسے ان کے سینہ میں دل نہیں بلکہ خشک پتھر ہے۔ وہ انسان نہیں بلکہ ایک ایسی مخلوق ہیں جو رحم اور ہمدردی اور انصاف جیسی چیزوں سے آشنا ہی نہیں۔

یہ فرق کیوں ہے۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ ان لیڈروں کی تمام سرگرمیاں اپنے قیادتی مصالح کے تحت ہیں نہ کہ خدا کو خوش کرنے کے لئے۔ اگر ان کو خدا کی خوشنودی عزیز ہو، اگر وہ آخرت کی پکڑ سے ڈرتے ہوں تو وہ ہر ظلم پر تڑپ اٹھیں گے۔ ہر شخص کی مصیبت میں اس کے کام آنے کی کوشش کریں گے۔ مگر ان کے دل میں خدا اور آخرت جیسی چیزوں کا کوئی خانہ نہیں۔ ان کو تو صرف اپنی قیادت عزیز ہے اور قیادت ہمیشہ عوامی شہرت کے واقعات میں حصہ لینے سے چمکتی ہے نہ کہ انفرادی مصیبت میں کسی کے کام آنے سے۔ پھر کسی فرد کو مصیبت سے نکالنے کے لئے وہ کیوں اپنی جان کھپائیں۔ بے فائدہ طور پر کس لئے اس میں اپنا وقت ضائع کریں۔

یہود کے نقش قدم پر

حضرت سلیمان بن داؤد (۹۳۰-۹۹۰ ق م) کا زمانہ یہود کی تاریخ میں سب سے زیادہ باعظمت زمانہ ہے۔ اس زمانہ میں فلسطین اور اطراف کے علاقوں میں ان کی مضبوط اور شاندار سلطنت قائم تھی۔ حضرت سلیمان کے بعد یہودیوں میں دینی اور اخلاقی زوال شروع ہوا۔ وہ خدا سے بے خوف ہوکر سطحی اعمال میں مبتلا ہو گئے اور آپس میں ایک دوسرے سے لڑنے لگے۔

اس زمانہ میں یہود کے مصلحین اور انبیاء نے ان کو زبردست تنبیہات کیں جو آج بھی کثرت سے بائبل میں موجود ہیں۔ یہاں مثال کے طور پر ایک جز نقل کیا جاتا ہے:

رب الافواج یوں فرماتا ہے کہ میں ان پر تلوار اور کال اور وبا بھیجوں گا اور ان کو خراب انجیروں کی مانند بناؤں گا جو ایسے خراب ہیں کہ کھانے کے قابل نہیں۔ اور میں تلوار اور کال اور وبا سے ان کا پیچھا کروں گا اور میں ان کو زمین کی سب سلطنتوں کے حوالے کروں گا کہ دھکے کھاتے پھریں اور ستائے جائیں اور سب قوموں کے درمیان جن میں میں نے ان کو ہانک دیا ہے لعنت اور حیرت اور سسکار اور ملامت کا باعث ہوں۔ اس لئے کہ انھوں نے میری باتیں نہیں سنیں۔ خداوند فرماتا ہے کہ جب میں نے اپنے خدمت گزار نبیوں کو ان کے پاس بھیجا، ہاں میں نے ان کو بروقت بھیجا، پر تم نے نہ سنا (یرمیاہ ۲۹ : ۱۸)

اس بگاڑ اور اختلاف کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی سلطنت ٹوٹ کر دو حصوں میں بٹ گئی۔ ایک، یہودیہ جو جنوبی فلسطین اور ادوم کے علاقہ میں تھی، اس کا پایہ تخت یروشلم تھا۔ دوسرے، اسرائیل جو شمالی فلسطین اور شرق اردن کے علاقہ میں قائم ہوئی، اس کا پایہ تخت سامریہ قرار پایا۔ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان کی قائم کی ہوئی عظیم ریاست ٹکڑے ٹکڑے ہو کر صرف دو کمزور حکومتوں کی صورت میں باقی رہ گئی۔

یہودیوں کے اخلاقی زوال اور باہمی اختلافات سے فائدہ اٹھا کر اطراف کی سلطنتوں نے ان پر حملے شروع کر دئے۔ ۷۲۱ ق م میں اشور (Assyrian) کے حکمراں سارگون نے سامریہ کو فتح کر کے اسرائیل کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اس کے بعد ۵۹۸ ق م میں بابل کے بادشاہ بنوکدنصر (Nebuchadnezzar) نے یروشلم کو مسخر کر کے سلطنت یہودیہ پر قبضہ کر لیا۔

خدا کے خاص لوگوں کے اوپر غیر قوم کا قبضہ یہود کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ ان کے اندر شدت سے مخالفانہ جذبات جاگ اٹھے۔ ان کے درمیان وہ قومی رہنما ابھرے جن کو بائبل میں "جھوٹے نبی" یا "جھوٹی نبوت کرنے والے لوگ" کہا گیا ہے۔ یہ لوگ اگرچہ دینی الفاظ بولتے تھے۔ مگر حقیقۃً جو چیز ان کی رہنما تھی وہ صرف ان کے اپنے رومانی تخیلات تھے جو اسرائیل کی عظمت رفتہ کو جلد از جلد واپس لانے کے لئے وقت کے حالات کے اثر سے ان کے اندر پیدا ہو گئے تھے۔ وہ نبوت کی زبان میں کلام کرتے تھے مگر حقیقۃً وہ جھوٹے نبی تھے۔ بائبل کے الفاظ میں وہ خدا کے نام پر اپنی بات کہتے تھے۔ وہ لوگوں کو جھوٹی امیدیں دلاتے تھے (یرمیاہ ۲۸: ۱۵، ۲۹: ۳۱) ان رہنماؤں کی جذباتی باتوں کے زیر اثر یہودیوں میں آزادی اور احیاء نو کی تحریکیں شروع ہوئیں۔ وہ بابل کی حکومت کے خلاف بغاوت کرکے دوبارہ اپنی گزری ہوئی عظمت کو واپس لانے کا خواب دیکھنے لگے۔

اس موقع پر ان کے نبی حضرت یرمیاہ اٹھے اور یہودیوں سے کہا کہ تم کو دوسروں کے خلاف مہم چلانے سے پہلے خود اپنی اصلاح کی فکر کرنی چاہئے۔ غیر قوم کا غلبہ تمہارے اوپر خدا کے حکم سے ہے۔ وہ اس لئے ہے کہ تم خدا کے راستہ سے ہٹ گئے ہو۔ اب اپنے آپ کو خدا کی طرف واپس لا کر ہی تم اس مغلوبیت سے نجات پا سکتے ہو نہ کہ محض دنیوی قسم کی کارروائیاں کرکے۔ اسرائیلی پیغمبر کی زبان سے خدا کی یہ تنبیہات بائبل کی کتاب یرمیاہ (باب ۲۷۔ ۳۰) میں موجود ہیں۔ چند فقرے یہ ہیں:

تم اپنے (جھوٹے) نبیوں اور غیب دانوں اور خواب بینوں اور شگونیوں اور جادوگروں کی نہ سنو جو تم سے کہتے ہیں کہ تم شاہ بابل کی خدمت گزاری نہ کروگے۔ کیونکہ وہ تم سے جھوٹی نبوت کرتے ہیں تاکہ تم کو تمہارے ملک سے آوارہ کریں اور میں تم کو خارج کردوں اور تم ہلاک ہو جاؤ (۲۷: ۹ — ۱۰) تم اپنی گردن شاہ بابل کے جوئے تلے رکھ کر اس کی اور اس کی قوم کی خدمت کرو اور زندہ رہو (۲۷: ۱۲) اور ان نبیوں کی باتیں نہ سنو جو تم سے کہتے ہیں کہ تم شاہ بابل کی خدمت نہ کروگے کیونکہ وہ تم سے جھوٹی نبوت کرتے ہیں۔ کیونکہ خداوند فرماتا ہے میں نے ان کو نہیں بھیجا۔ پر وہ میرا نام لے کر جھوٹی نبوت کرتے ہیں۔ تاکہ میں تم کو خارج کردوں اور تم ان نبیوں کے ساتھ جو تم سے نبوت کرتے ہیں ہلاک ہو جاؤ۔ خداوند یوں فرماتا ہے کہ اپنے نبیوں کی باتیں نہ سنو جو تم سے نبوت کرتے اور کہتے ہیں کہ دیکھو خداوند کے گھر کے ظروف اب تھوڑی ہی دیر میں بابل سے واپس آ جائیں گے۔ کیونکہ وہ تم سے جھوٹی نبوت کرتے ہیں۔ ان کی نہ سنو، شاہ بابل کی خدمت گزاری کرو اور زندہ رہو۔ پر اگر وہ نبی ہیں اور خداوند کا کلام ان کی امانت میں ہے تو وہ رب الافواج

سے شفاعت کریں تاکہ وہ ظروف جو خداوند کے گھر میں اور شاہ یہوداہ کے گھر میں اور یروشلم میں باقی ہیں بابل کو نہ جائیں (۲۷ : ۱۸ ـ ۱۴) رب الافواج اسرائیل کا خدا ان سب اسیروں سے جن کو میں نے یروشلم سے اسیر کرواکر بابل بھیجا ہے یوں فرماتا ہے، تم گھر بناؤ اور ان میں بسو اور باغ لگاؤ اور ان کا پھل کھاؤ۔ بیویاں کرو تاکہ تم سے بیٹے بیٹیاں پیدا ہوں، اور اپنے بیٹوں کے لئے بیویاں لو اور اپنی بیٹیاں شوہروں کو دو تاکہ ان سے بیٹے بیٹیاں پیدا ہوں اور تم وہاں پھلو پھولو اور کم نہ ہو۔ اور اس شہر کی خیر مناؤ جس میں میں نے تم کو اسیر کرواکر بھیجا ہے اور اس کے لئے خداوند سے دعا کرو۔ کیونکہ اس کی سلامتی میں تمہاری سلامتی ہوگی۔ کیونکہ رب الافواج اسرائیل کا خدا یوں فرماتا ہے کہ وہ نبی جو تمہارے درمیان ہیں اور تمہارے غیب داں تم کو گمراہ نہ کریں اور اپنے خواب بینوں کو جو تمہارے ہی کہنے سے خواب دیکھتے ہیں نہ مانو۔ کیونکہ وہ میرا نام لے کر تم سے جھوٹی نبوت کرتے ہیں۔ میں نے ان کو نہیں بھیجا (۲۹ : ۹ ـ ۵)

حضرت یرمیاہ کی ان باتوں کا مطلب یہ نہیں تھا کہ یہود غیر قوموں کی غلامی پر ہمیشہ کے لئے راضی ہو جائیں۔ ان کا مطلب صرف یہ تھا کہ تم اپنی موجودہ کمزوریوں کے ساتھ حکومت کے خلاف تحریکیں چلا کر کامیاب نہیں ہو سکتے۔ تمہاری جن کمزوریوں نے غیر قوم کو تمہارے اوپر غلبہ دیا ہے ان کو ختم کئے بغیر کس طرح یہ ممکن ہے کہ تم دوبارہ اپنی سابقہ پوزیشن حاصل کر لو۔ اس لئے ان کا کہنا تھا کہ تم بغاوت کی مہم چلانے سے پہلے اصلاح کی مہم چلاؤ۔ چنانچہ انھوں نے "شاہ بابل کا جوا" قبول کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے یہود کو یہ بشارت بھی دی کہ اگر تم خدا کے بتائے ہوئے طریقہ پر چلو تو رب الافواج فرماتا ہے کہ میں اس کا جوا تیری گردن پر سے توڑ دوں گا اور تیرے بندھنوں کو کھول ڈالوں گا اور بیگانے پھر تجھ سے خدمت نہ کرائیں گے۔ اس لئے اے اسرائیل گھبرا نہ جا کیونکہ دیکھ میں تیری اولاد کو اسیری کی سرزمین سے چھڑاؤں گا اور یعقوب واپس آئے گا اور کوئی اسے نہ ڈرائے گا (۳۰ : ۹ ـ ۸)

مگر یہود نے اپنے نبی کا مشورہ نہیں مانا۔ وہ ان جھوٹے رہنماؤں کی باتیں سنتے رہے جو ان کو الفاظ کی جذباتی شراب پلا رہے تھے۔ جو ان کو معمولی عمل سے بڑے بڑے نتائج کی فرضی امیدیں دلاتے تھے۔ جو نفرت اور ٹکراؤ جیسی فتنہ انگیز باتیں کرتے تھے (یرمیاہ ۲۸ : ۱۶) اس حماقت (۲۹ : ۲۳) کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاہ بابل بنوکد نضر ان کے اوپر غضب ناک ہوا اور ۵۸۷ ق م میں دوبارہ ان کے اوپر شدید تر حملہ کیا۔ اس کے بعد اس نے یہودیہ کی تمام آبادیوں کو ویران کر کے رکھ دیا۔ بے شمار یہودیوں کو قتل کیا۔ یروشلم اور ہیکل سلیمانی کو اس طرح برباد کیا کہ بائبل کے الفاظ میں اس کی ایک اینٹ بھی دوسری اینٹ کے اوپر باقی نہ رہی۔

سابق حاملین کتاب (یہود) کی یہ تاریخ موجودہ حاملین کتاب (مسلمان) پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ مسلمان پچھلے ہزار برس تک دنیا کی سب سے بڑی طاقت بنے ہوئے تھے۔ اس کے بعد وہ کمزوریوں کا شکار ہوئے۔ ان کے افراد میں اعلیٰ کردار باقی نہ رہا۔ وہ محنت کے بجائے عیش کے عادی ہو گئے۔ باہمی اختلافات نے ان کو بے شمار گروہوں میں بانٹ دیا۔ علم اور تہذیب کی ترقی میں وہ دوسری قوموں سے پیچھے ہو گئے۔ اس قسم کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر غیر مسلم قومیں ان کے اوپر غالب آگئیں۔ مسلمانوں کی عظمت ہر جگہ پامال کر کے رکھ دی گئی۔

یہ واقعہ انیسویں صدی عیسوی میں پیش آیا۔ بیسویں صدی عیسوی اس صورت حال کے خلاف جدوجہد کی صدی ہے۔ مگر یہاں بھی عملاً وہی ہوا جو ڈھائی ہزار سال پہلے یہود کے ساتھ پیش آیا تھا۔ اب کچھ اللہ کے بندے اٹھے جنھوں نے مسلمانوں سے یہ کہا کہ پہلے اپنے آپ کو مستحکم بناؤ۔ غالب قوتوں سے تصادم کے بغیر اصلاحی میدان میں اپنی کوششیں صرف کرو جو اب بھی تمھارے لئے کھلا ہوا ہے ۔ مگر مسلمانوں نے ایسے مصلحین کی بات بالکل نہیں سنی۔ ان کو انھوں نے بزدل، سامراج کا ایجنٹ اور انقلاب اسلام کا دشمن قرار دیا۔

دوسری طرف بہت بڑی تعداد میں ایسے لوگ اٹھے جو جہاد اور انقلاب کی باتیں کرتے تھے۔ انھوں نے جذباتی تقریریں کیں۔ رومانی اشعار سنائے۔ خوبصورت نظریے پیش کئے۔ مبالغہ آمیز قسم کی امیدیں دلائیں۔ مسلمان ایسے لوگوں کے پیچھے دوڑ پڑے۔ وہ ہر جگہ دوسری قوموں کے خلاف سیاسی ٹکراؤ اور انقلابی جہاد میں مشغول ہو گئے۔

بائبل کے الفاظ میں اس "جھوٹی نبوت" کا نتیجہ وہی ہوا جو یہودیوں کے ساتھ پیش آیا تھا۔ مسلمانوں نے اپنی کمزوریوں کی وجہ سے ہر محاذ پر شکست کھائی۔ ان کی بڑی بڑی تحریکیں اس طرح فنا ہو گئیں جیسے وہ ایک تنکا تھا جو ہواؤں کے طوفان میں اڑ گیا۔ ان کے مفکروں اور رہنماؤں کے بولے ہوئے شاندار الفاظ کاغذ کی کشتی ثابت ہوئے جو دریا کی موجوں میں ایک منٹ بھی کسی مسافر کے کام نہیں آتی۔

ان مسلم رہنماؤں کی مقبولیت کا راز یہ تھا کہ وہ لوگوں کو جھوٹی امیدیں دلاتے تھے۔ وہ حق کے ترجمان نہ تھے بلکہ عوامی جذبات کے ترجمان تھے۔ اور جو لوگ اس قسم کی بے حقیقت چیزوں کے اوپر کھڑے ہوں ان کا انجام حقیقت کی اس دنیا میں وہی ہے جو ان رہنماؤں کا ہوا۔

اوپر جس حقیقت کا ذکر کیا گیا، وہ کوئی انوکھی یا غیر معلوم بات نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تاریخ اور دینی تعلیمات میں بالکل واضح ہے۔ اس کے باوجود ہمارے رہنما اور مفکرین کیوں اس کو سمجھ نہیں پاتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ردعمل کی نفسیات نے لوگوں کا ذہنی شاکلہ بگاڑ دیا ہے، اور آدمی کسی بات کو اپنے ذہنی شاکلہ ہی کے مطابق سمجھ پاتا ہے۔ اگر آدمی کا ذہنی شاکلہ مختلف ہو تو وہ کسی طرح اصل بات کو سمجھ نہیں سکتا۔ یہاں ہم اس کی ایک مثال پیش کریں گے۔

ایک مشہور مفکر اسلام نے سورہ بنی اسرائیل (آیت ۵) کی تفسیر کے تحت ایک لمبا نوٹ لکھا ہے۔ اس نوٹ میں وہ یہود کے بگاڑ کی تاریخ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"حضرت یسعیاہ اور حضرت یرمیاہ کی مسلسل کوششوں کے باوجود یہودیہ کے لوگ بت پرستی اور بد اخلاقیوں سے باز نہ آئے تو ۵۹۸ قبل مسیح میں بابل کے بادشاہ بخت نصر نے یروشلم سمیت پوری دولت یہودیہ کو مسخر کر لیا اور یہودیہ کا بادشاہ اس کے پاس قیدی بن کر رہا۔ یہودیوں کی بداعمالیوں کا سلسلہ اس پر بھی ختم نہ ہوا اور حضرت یرمیاہ کے سمجھانے کے باوجود وہ اپنے اعمال درست کرنے کے بجائے بابل کے خلاف بغاوت کر کے اپنی قسمت بدلنے کی کوشش کرنے لگے۔"

اوپر کے اقتباس کے آخری جملہ پر غور کیجئے۔ موصوف کے الفاظ کے مطابق یہ بداعمالی کی ایک قسم ہے کہ غالب حکومت کے خلاف سیاسی جہاد کر کے اپنی قسمت بدلنے کی کوشش کی جائے۔ گویا انھوں نے ہماری مذکورہ بات کی صداقت کو مزید شدید تر الفاظ میں تسلیم کر لیا ہے۔ مگر یہی وہ مصنف اور مفکر ہیں جنھوں نے موجودہ زمانہ میں اس نظریہ کی پرزور وکالت کی کہ اسلام اور مسلمانوں کے لئے نیا دور لانے کا واحد راستہ یہ ہے کہ حکمرانوں سے تصادم کر کے ان کو تخت سے بے دخل کیا جائے اور خود اپنی طویل عمر کے تمام بہترین سال انھوں نے اسی قسم کے سیاسی جہاد میں گزار دئے۔

حقیقت کے اس قدر قریب پہنچ کر بھی حقیقت سے اس قدر بے خبر رہنے کی وجہ صرف شاکلہ کا فرق ہے۔ آدمی ایک آیت کے مطالعہ کے ذیل میں تاریخ انبیاء کے مذکورہ واقعہ کو پڑھتا ہے۔ وہ اس کے علم میں آتی ہے۔ مگر چونکہ اس کا ذہنی شاکلہ مختلف ہے اس لئے یہ حقیقت اس کے ذہن کا جزء نہیں بنتی، وہ اس کی فکر کی تشکیل میں مؤثر ثابت نہیں ہوتی ——— ہدایت کے راستہ کو پانے کی اہم ترین شرط یہ ہے کہ آدمی اپنے مصنوعی شاکلہ کو توڑے اور فطرت کے حقیقی شاکلہ کے مطابق چیزوں کو دیکھے۔ اس کے بغیر کوئی شخص ہدایت کے ابدی راستہ کو نہیں پا سکتا۔

مرتبہ

مولانا وحید الدین خاں

مکتبہ الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ٦

فہرست

سال اشاعت ۱۹۸۲ — قیمت تین روپے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

امریکہ سے ایک کتاب چھپی ہے جس کا نام ہے "ایک سو"۔ اس کتاب میں ساری انسانی تاریخ کے ایک سو ایسے آدمیوں کا تذکرہ ہے جنھوں نے، مصنف کے نزدیک، تاریخ پر سب سے زیادہ اثرات ڈالے۔ کتاب کا مصنف نسلی طور پر عیسائی اور تعلیمی طور پر سائنس داں ہے۔ مگر اپنی فہرست میں اس نے نمبر ایک پر نہ حضرت مسیح کا نام رکھا ہے اور نہ نیوٹن کا۔ اس کے نزدیک وہ شخصیت جس کو اپنے غیر معمولی کارناموں کی وجہ سے نمبر ایک پر رکھا جائے وہ پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ مصنف کا کہنا ہے کہ آپ نے انسانی تاریخ پر جو اثرات ڈالے وہ کسی بھی دوسری شخصیت، خواہ مذہبی ہو یا غیر مذہبی، نے نہیں ڈالے۔ مصنف نے آپ کے کمالات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

He was the only man in history who was supremely successful on both the religious and secular levels

Dr. Michael H. Hart, The 100, New York 1978

آپ تاریخ کے تنہا شخص ہیں جو انتہائی حد تک کامیاب رہے۔ مذہبی سطح پر بھی اور دنیوی سطح پر بھی۔ ٹامس کارلائل (انگریز) نے پیغمبر اسلام کو نبیوں کا ہیرو قرار دیا تھا۔ مائیکل ہارٹ (امریکی) نے آپ کو ساری انسانی تاریخ کا سب سے بڑا انسان قرار دیا ہے۔ پیغمبر اسلام کی عظمت اتنی واضح ہے کہ وہ صرف آپ کے پیروؤں کے ایک "عقیدہ" کی حیثیت نہیں رکھتی۔ وہ ایک مسلّمہ تاریخی واقعہ ہے اور ہر آدمی جو تاریخ کو جانتا ہے وہ مجبور ہے کہ اس کو بطور واقعہ تسلیم کرے۔

کوئی شخص اوپر نظر ڈالے تو اس کو ہر طرف آسمان چھایا ہوا نظر آئے گا۔ اسی طرح انسانی زندگی میں جس طرف بھی دیکھا جائے، پیغمبر اسلام کے اثرات نمایاں طور پر اپنا کام کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ ساری بہترین قدریں اور تمام اعلیٰ کامیابیاں جن کو آج اہمیت دی جاتی ہے وہ سب آپ کے لائے ہوئے انقلاب کے براہ راست یا بالواسطہ نتائج ہیں۔ مذہبی اداروں میں شخصیت پرستی کے بجائے خدا پرستی کس نے قائم کی۔ اعتقادیات کو توہمات کے بجائے حق کی بنیاد کس نے عطا کی۔ سائنس میں فطرت کی پرستش کے بجائے فطرت کو مسخر کرنے کا سبق کس نے دیا۔ سیاسیات میں نسلی شہنشاہیت کے بجائے عوامی حکومت کا راستہ کس نے دکھایا۔ علم کی دنیا میں خیال آرائی کے بجائے حقیقت نگاری کی طرح کس نے ڈالی۔ سماج کی تنظیم کے لئے ظلم کے بجائے عدل کی بنیاد کس نے فراہم کی۔ جواب یہ ہے کہ تمام چیزیں انسان کو پیغمبر اسلام سے ملیں۔ آپ کے سوا کوئی نہیں ہے جس کی طرف حقیقی طور پر ان کارناموں کو منسوب کیا جاسکے۔ دوسرے تمام افراد آپ کے انقلابی دھارے کو استعمال کرنے والے ہیں نہ کہ اس کو وجود میں لانے والے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو تاریخ کا سب سے بڑا انسان بنا کر انسانی نسل پر اپنا سب سے بڑا احسان فرمایا ہے۔ اس طرح معلوم تاریخ میں ایک ایسا بلند ترین مینار کھڑا کر دیا گیا ہے کہ آدمی جس طرف بھی نظر ڈالے وہ آپ کو دیکھ لے۔ جب وہ اپنے رہنما کی تلاش میں نکلے تو اس کی نظر سب سے پہلے آپ پر پڑے۔ جب وہ حق کا راستہ جاننا چاہے تو آپ کا بلند و بالا وجود اس کو سب سے پہلے اپنی طرف متوجہ کرے۔ آپ ساری انسانیت کے لئے ہادی اعظم کی حیثیت رکھتے ہیں، اسی لئے آپ کو اتنے بلند تاریخی مقام پر کھڑا کیا گیا ہے کہ کوئی آنکھ والا جب آنکھ اٹھائے تو آپ کو دیکھے بغیر نہ رہ سکے۔
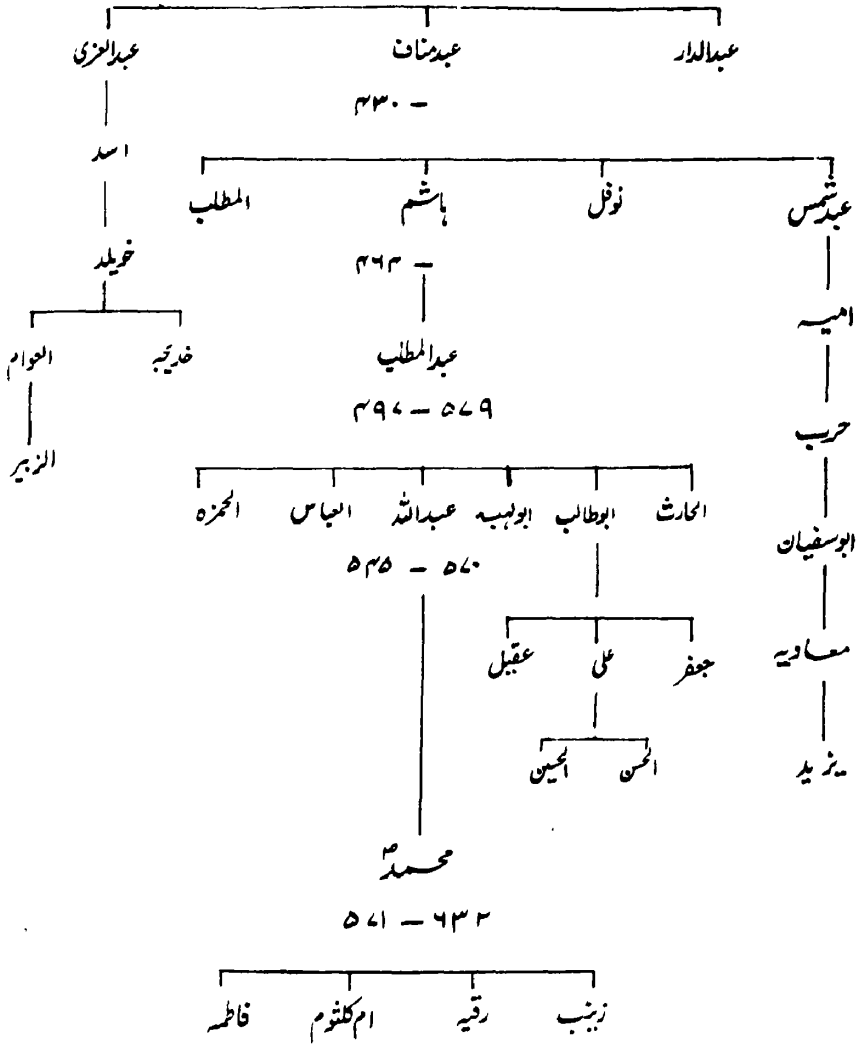
محمدؐ بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدمناف بن قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان

حضرت محمدؐ

۱

جب وقت حضرت محمدؐ صاحب کے ظہور کا ہوا، ملک عرب میں بہت سی مذہبی، مجلسی اور اخلاقی برائیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ انسانی زندگی کو لوگ کھلونوں کی طرح بے حقیقت سمجھتے تھے۔ ذرا سی بات پر کسی کی جان لے لینا ان کے لئے محض تماشا تھا۔ عورتوں کو بہت ذلیل سمجھا جاتا تھا۔ ایک ایک مرد آٹھ آٹھ دس دس بلکہ اس سے بھی زیادہ شادیاں کرسکتا تھا۔ لڑکیوں کا پیدا ہونا بہت برا خیال کیا جاتا تھا۔ لڑکیوں کو زندہ قبر میں دبا دیا جاتا تھا۔ غلاموں کی تجارت عام تھی۔ شراب خوری کی یہ حالت تھی کہ لوگوں کے گھروں میں گھڑے کے گھڑے بھرے رکھے رہتے تھے۔ لوگ شراب میں بدمست ہوکر بہت سی بے ہودہ کارروائیاں کرتے تھے۔ قمار بازی بہت زوروں پر تھی۔ بت پرستی کا یہ حال تھا کہ ہر ایک گھرانے اور خاندان میں علیٰحدہ علیٰحدہ بت موجود تھے۔

عرب کی اس افسوس ناک حالت کا نقشہ مولانا حالی صاحب نے اپنی مشہور نظم مسدس حالی میں خوب کھینچا ہے۔ جب عرب کی یہ حالت تھی تو ضروری تھا کہ اس کو دور کرنے کے لئے خداوند تعالےٰ کے اٹل قانون کے مطابق کوئی اس کا خاص بندہ آتا اور اس حالت کو دور کرتا۔

چنانچہ قریش قبیلے میں عبد المطلب کے بیٹے عبداللہ کے ہاں ۲۹ راگست ۵۷۱ء کو حضرت محمد صاحب پیدا ہوئے۔ مگر افسوس کہ ان کے باپ ان کی پیدائش سے چند ماہ پیشتر ہی چوبیس برس کی عمر میں اس جہان سے چل بسے تھے، اور ان کے دادا عبد المطلب نے ان کی پرورش کا انتظام کیا۔ کچھ روز ان کی والدہ حضرت آمنہ نے انھیں اپنا دودھ پلایا پھر ان کو ایک دایہ حلیمہ نامی کے سپرد کر دیا۔ ابھی چھ سال کے ہونے نہ پائے تھے کہ والدہ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اور کچھ عرصے بعد ان کے دادا بھی انتقال فرما گئے اب ان کی پرورش ان کے چچا ابو طالب کے ذمے ہوئی۔

ان میں شروع سے ہی غور و فکر کی عادت تھی۔ اکثر چپ چاپ بیٹھے زندگی کے مختلف مسائل سوچا کرتے تھے۔ ان کے چچا ان کا دل بہلانے اور کچھ کاروبار سکھلانے کی غرض سے، جب وہ تجارت کے سلسلے میں باہر جاتے تو انھیں اپنے ساتھ لے جاتے۔ قدرت نے ان کے اندر شروع سے ہی راست بازی اور دیانت داری کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی۔ بہت سے لوگ آکر ان سے اپنے جھگڑوں اور تنازعوں کا فیصلہ کراتے تھے۔ ان سفروں میں پہاڑوں اور سمندروں کے نظاروں نے ان کے دل پر خدا کی قدرت کا سکّہ خوب بٹھا دیا۔

۲

جب ان کی عمر پچیس برس کی تھی۔ تو انھیں خدیجہ نامی ایک بیوہ نے ان کی شہرت اور دیانت داری کا حال سن کر بلا بھیجا اور بہت سا مال دے کر تجارت کی غرض سے یمن کی طرف بھیجا۔ انھیں چچا کے ساتھ رہتے رہتے تجارت کا کافی تجربہ ہوگیا تھا۔ انھوں نے خدیجہ کے مال کو بہت نفع پر فروخت کیا۔ ان کو دوگنی تنخواہ پیش کی گئی۔ اور ان کی خوبیوں سے

متاثر ہو کر خدیجہ نے ان سے شادی کی درخواست کی۔ چنانچہ انھوں نے اپنے چچا ابو طالب کے مشورہ سے خدیجہ کی درخواست منظور کر کے اس سے شادی کر لی۔ اس وقت خدیجہ کی عمر پینتالیس برس کی تھی۔ اور حضرت صاحب پچیس برس کے تھے۔ پندرہ سال کے بعد حضرت خدیجہ کا انتقال ہو گیا، اور انھیں بہت رنج ہوا۔ ان کی موت کے بعد اکثر حضرت صاحب بہت محبت اور شکر گزاری سے انھیں یاد کیا کرتے تھے۔ حضرت صاحب نے ایک غلام زید نامی کی حالت کمزور دیکھ کر اسے خدیجہ سے مانگ لیا اور فوراً آزاد کر دیا۔ آزادی ملنے پر زید نے اپنے گھر جانا پسند نہیں کیا، بلکہ تمام عمر حضرت محمدؐ صاحب کے پاس رہنے کا فیصلہ کر لیا۔

حضرت صاحب اپنے ہم وطنوں کی جہالت اور خرابیوں کو دیکھ کر ہر وقت اداس رہتے تھے۔ اکثر تنہائی میں اپنا وقت گزارتے اور گڑگڑا کر خدا کی درگاہ میں دعا کرتے کہ اے خدا، انھیں گناہوں سے بچا اور ان کا دل اپنی طرف پھیر۔ آخر خدا نے ان کے پاک دل کو اپنے نور سے بھر دیا۔ اور یہ محسوس کرنے لگے کہ خدا چاہتا ہے کہ میں اس کا رسول بن کر لوگوں کو اس کی پرستش کی طرف راغب کروں۔ جب ان کی عمر چالیس برس کی تھی۔ اور غار حرا میں بیٹھے ہوئے خدا کے دھیان میں محو تھے، تو اچانک ایک آواز ان کے کان میں پڑی کہ "اے محمدؐ! اٹھ اور خدا کا نام لے کر پڑھ، تجھ پر وہ راستہ کھولا گیا ہے، جس کی تو تلاش میں تھا" یہ آواز سن کر وہ کانپ اٹھے۔ گھبرائے ہوئے اور پسینوں میں تر گھر پہنچے اور سارا قصہ حضرت خدیجہؓ کو سنایا۔ انھوں نے حضرت کو تسلی دی اور کہا کہ آپ خدا کے رسولؐ ہیں اور آپ کو ضرور کامیابی حاصل ہوگی۔ یہ کہہ کر وہ ان پر ایمان لائیں۔ اور بعد میں حضرت علیؓ، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت زیدؓ اور چند لوگوں نے انھیں تسلیم کیا۔ اور ان پر ایمان لے آئے۔

تین سال تک تو حضرت محمدؐ صاحب چپکے چپکے اپنے چند دوستوں اور رشتے داروں کو خدا کا حکم سناتے رہے۔ آخر ایک دفعہ تمام اپنے رشتے داروں، دوستوں اور قبیلے والوں کو جمع کر کے ان کو بتلایا کہ میں خدا کی طرف سے تمھیں اس وحدہٗ لاشریک کی پرستش کی تلقین کرنے اور برائیوں سے بچانے کے لئے بھیجا گیا ہوں۔ یہ سن کر لوگوں نے بہت شور مچایا۔ اور کہا کہ تو غلط کہتا ہے۔ مگر انھوں نے کچھ پرواہ نہیں کی اور باقاعدہ مختلف مقامات پر وعظ کرنا شروع کر دیا۔ لوگوں نے حضرت کے چچا ابو طالب کے پاس جا کر کہا تو اپنے بھتیجے کو سمجھا کہ اس کفر سے باز آئے ورنہ ہم اس کے ساتھ بہت برا سلوک کریں گے۔ ابو طالب نے بہت سمجھایا کہ بیٹا مفت میں تم کیوں لوگوں سے بیر باندھتے ہو۔ مزے سے زندگی بسر کرو۔ نہ جانے یہ لوگ غصہ میں آکر کیا کر بیٹھیں۔ مگر محمدؐ صاحب نے کہا کہ چاہے اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے میں اپنے ارادے سے باز نہیں آسکتا۔ خدا نے میرے سپرد یہ کام کیا ہے۔ اس کا بجا لانا میرا فرض ہے۔ چاہے ایسا کرنے میں میری جان تک بھی جاتی رہے۔ جب ابو طالب کو یہ معلوم ہوا کہ محمدؐ اپنے ارادے میں پہاڑ کی طرح مضبوط ہے تو کہا۔ اچھا کچھ ہی ہو میں تیری حفاظت کروں گا۔ چچا کی زبان سے یہ حوصلہ افزا الفاظ سن کر ان کا جوش بہت زیادہ بڑھ گیا۔ اور خوب زور سے اپنے مشن کا پرچار کرنا شروع کر دیا۔

اب حضرت صاحب کے پیروؤں کی تعداد روز بروز زیادہ ہوتی گئی اور ساتھ ہی ساتھ قریشیوں کی مخالفت بھی بڑھ گئی۔ انھوں نے ان کو طرح طرح کے لالچ دیئے۔ دھمکیاں بھی دیں۔ ان کو قتل کرنے کا ارادہ بھی کیا۔ مگر انھوں نے ان کی

مخالفتوں کی مطلق پرواہ نہ کی۔ خود حضرت صاحب کے چچا ابولہب اور اس کی بیوی ان کے سخت مخالف ہوگئے۔ اور انھیں طرح طرح کی اذیتیں پہنچانے لگے یہاں تک کہ جب وہ صبح کو منھ اندھیرے عبادت کے لیے جنگل میں جاتے تو بھی ان کے راستے میں کانٹے بچھا دیتی اور ان کے پاؤں اور پنڈلیاں زخمی ہو جاتے۔ ایک دفعہ جب یہ نماز پڑھ رہے تھے تو ایک شخص نے ان کے گلے میں پٹکا ڈال کر گلا گھونٹنا چاہا۔ مگر حضرت ابوبکر رضہ موقع پر پہنچ گئے اور انھوں نے ان کی جان بچائی۔ جب وہ کھانا کھانے بیٹھتے تو لوگ ان کے کھانے میں کوڑا کرکٹ گرا دیتے۔ کئی دفعہ ان پر گندگی پھینک دیتے۔ ان کی لڑکی کپڑوں پر پانی ڈالتی جاتی اور روتی جاتی۔ مگر یہ کہتے بیٹی کچھ پرواہ نہیں۔ خدا خود میری حفاظت کرے گا۔

اسی طرح ان کے پیروؤں کو بھی لوگ طرح طرح کی تکلیفیں دیتے تھے۔ ان کی چھاتیوں پر پتھر کی سلیں رکھ دیتے، ان کو گرم ریت پر لٹا دیتے۔ ان کی عورتوں کو ننگا کر کے بہت بے عزت کرتے۔ مگر یہ لوگ اعتقاد کے ایسے پکے تھے کہ ہر قسم کا دکھ اٹھا کر بھی اسلام کو نہ چھوڑتے اور ہر حالت میں خدا کا شکر کرتے۔

—— ۳ ——

قریش کے ظلم وستم سے تنگ آکر بہت سے مسلمان حبش کے علاقے میں چلے گئے۔ اور وہاں کے عیسائی بادشاہ نجاشی کی پناہ لی۔ لیکن وہاں بھی مخالفوں نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ اور بادشاہ سے جاکر کہا کہ ان لوگوں نے اپنے باپ دادا کا دین چھوڑ دیا ہے۔ اور ایک نیا دین نکالا ہے۔ جو آپ کے دین کے بھی مخالف ہے۔ انھیں پناہ نہ دو۔ نجاشی نے مسلمانوں کو بلا کر سب حال دریافت کیا۔ اور جب جعفر نے بادشاہ کو بتلایا کہ ہم لوگ پہلے جاہل تھے۔ بت پرستی کرتے تھے۔ گندی اور فحش باتیں بکتے تھے۔ لڑکیوں کو مار ڈالتے تھے۔ شراب پیتے تھے۔ جوا کھیلتے تھے۔ غرض ہر قسم کی بدکاریوں میں مبتلا تھے۔ خدا نے ہمارے لئے رسولؐ بھیجا۔ اور اس نے ہمیں نیکی کی طرف مائل کیا۔ یہ سن کر نجاشی کے دل پر بہت اچھا اثر ہوا۔ اور اس نے کہہ دیا کہ یہ میری پناہ میں آئے ہیں، میں انھیں یہاں سے نکال نہیں سکتا۔ یہ سن کر مخالفین اپنا سا منھ لے کر واپس چلے گئے۔

مسلمانوں کے حبش میں چلے جانے کے بعد حضرت صاحبؐ مکہ میں برابر وعظ کرتے رہے۔ اس اثنا میں دو زبردست ہستیوں نے اسلام قبول کر لیا۔ ایک تو خود ان کے چچا حمزہؓ جو بہت با رسوخ شخص تھے اور دوسرے عمر جو بعد میں حضرت عمر رضہ کہلائے۔ حضرت عمر رضہ پہلے ان کے جانی دشمن تھے۔ اور تلوار گلے میں ڈال کر ان کے قتل کو نکلے تھے۔ مگر قرآن شریف کی چند آیتیں سن کر ان کے پیرو بن گئے۔ اور چار یاروں میں شمار ہونے لگے۔ جب ان کے چچا ابو طالب کا انتقال ہو گیا تو لوگوں کی مخالفت اور بھی بڑھ گئی۔ انھوں نے مکہ چھوڑ کر طائف میں قیام کرنے کا ارادہ کیا۔ مگر وہاں کے لوگ پہلے ہی ان کے مخالف تھے۔ جب ان کا وعظ سنا تو بہت برافروختہ ہوئے۔ اور انھیں وہاں سے نکال دیا۔ مکہ والوں نے انھیں شہر میں داخل نہ ہونے دیا۔ مگر ایک شخص مطعم نامی نے لوگوں کو بہت لعنت ملامت کی اور کہا کہ میں محمدؐ کو اپنی پناہ میں لیتا ہوں۔ اس طرح وہ مکہ میں رہنے لگے۔ مگر شریر لوگ مخالفت سے کب باز آتے تھے۔ انھوں نے مطعم کو بھی تنگ کرنا شروع کر دیا۔ حضرت صاحبؐ نے جب دیکھا کہ میری وجہ سے بیچارے مطعم کو بھی سخت تکلیف دی جاتی ہے تو انھوں نے کہہ دیا کہ میں اب آپ کی پناہ میں رہنا نہیں چاہتا۔ خدا میرا محافظ ہے۔ جو ہوگا میں برداشت کر لوں گا۔ مجھے ہرگز یہ گوارا نہیں کہ میرے سبب سے آپ کو تکلیف ہو۔

اب ان کا وعظ سن کر بہت سے لوگ ان کے پیرو بن گئے۔ طفیل نامی رئیس جو اس ڈر سے کہ ان کا کلام اس کے کان میں نہ پڑ جائے اور اس پر اثر ہو جائے اپنے کان میں روئی ٹھونس لیتا تھا ایک دفعہ جلدی میں ٹھونسنا بھول گیا اور ان کا وعظ سن کر ان کا پیرو بن گیا۔ ایک دفعہ جب وہ تاجروں اور حاجیوں کو وعظ کر رہے تھے۔ تو چند مدینے کے لوگ بھی وہاں موجود تھے۔ ان کا وعظ سن کر وہ ان کے پیرو بن گئے۔ اور اپنے ساتھ اسلام کا واعظ لے گئے۔ وہاں بہت لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔ پھر ان کو مدینہ بلایا۔ چنانچہ بہت سے مسلمان مدینے چلے گئے۔ مدینہ والوں نے حضرت صاحب اور مسلمانوں کا بہت تپاک سے استقبال کیا۔ مسلمانوں کو اپنے گھروں پر ٹھیرایا۔ ان کو کاشت کے لئے اپنی زمینیں دے دیں اور ہر طرح پر ان کو برادرانہ حقوق عطا کئے۔

حضرت صاحبؐ نے کچھ روز مدینہ سے تین میل کے فاصلے پر قبا نامی آبادی میں قیام کیا۔ حضرت علیؓ بھی وہاں پہنچ گئے۔ وہاں انھوں نے پہلی مسجد نماز کے لئے بنوائی۔ اس کے بنانے میں خود آپ نے صحابہ کے ساتھ مل کر مزدوروں کا کام کیا۔ مدینہ والوں کے زور دینے پر آپ مدینہ گئے۔ اور ارادہ کیا کہ جہاں میری اونٹنی ٹھیر جائے گی وہیں قیام کروں گا۔ چنانچہ حضرت ابوایوبؓ کے مکان کے پاس اونٹنی ٹھیر گئی اور آپ نے وہیں قیام کیا۔ وہاں اگرچہ زمین مفت ملتی تھی مگر آپ نے قیمت دے کر زمین خریدی اور یہاں انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ محنت مزدوری کر کے مسجد بنائی۔ اس وقت مسلمانوں کو آزادی کے ساتھ نماز پڑھنا نصیب ہوا۔ اور جمعہ کا دن جماعت کے ساتھ مل کر نماز پڑھنے کے لئے مقرر ہوا۔ مدینے میں مسلمانوں کی رہائش اور گزارے کا تسلی بخش انتظام کر کے آں حضرتؐ نے یہودیوں کے ساتھ عہدنامہ کر کے ان کے ساتھ دوستانہ تعلقات پیدا کر لئے۔ اگرچہ افسوس ہے کہ یہودی لوگ اپنے اقرار پر قائم نہ رہے۔ اور بعد میں مسلمانوں کے مخالفوں کے ساتھ ساز باز کر کے انھیں بہت تکلیف دیتے رہے۔

---- ۴ ----

گو اب مسلمان مدینے میں امن و امان سے رہتے تھے۔ لیکن ان کے دشمنوں کو یہ گوارا نہ تھا۔ کہ وہ اس طرح پر آزادی سے اپنا کام کرتے رہیں۔ وہ تو چاہتے تھے کہ اگر ان کا بس چلے تو مسلمانوں کا نام و نشان صفحۂ ہستی سے مٹا دیں۔ انھوں نے عبداللہ نامی ایک شخص سے جو مدینے میں رہتا تھا اور دل ہی دل میں حضرت صاحب کا روزافزوں رسوخ دیکھ کر بہت جلتا تھا، خط و کتابت کرنی شروع کی اور اس سے کہا کہ حضرت صاحب کو مدینے سے نکال دے۔ مگر جب وہ کچھ نہ کر سکا تو اس نے اور مخالفوں نے آس پاس کے قبیلوں کو مسلمانوں کے برخلاف بہت بھڑکایا۔ اور یہ سب لوگ بہت سی جمعیت لے کر بدر کے مقام پر پہنچ گئے۔ آں حضرت جنگ نہ چاہتے تھے۔ مگر مسلمانوں کی حفاظت کے لئے خدا سے دعا کر کے تین سو آدمی لے کر آگے بڑھے اور ان جاں باز لوگوں نے ایک ہزار آدمیوں کو سخت شکست دی اور بہت سے آدمی قید کر لئے۔ حضرت محمدؐ صاحب نے ان کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا اور ضمانت لے کر انھیں چھوڑ دیا۔

اس شکست سے مخالفوں کو بہت صدمہ پہنچا۔ اور انھوں نے مسلمانوں سے بدلہ لینے کی زبردست تیاریاں شروع کر دیں۔ چنانچہ انھوں نے تین ہزار آدمیوں کی زبردست فوج تیار کی اور بہت سا سامان جنگ جمع کیا۔ بہت سی

عورتیں بھی فوج کے ساتھ ہولیں۔ یہ فوج مدینے کی طرف روانہ ہوئی۔ حضرت صاحبؐ نہیں چاہتے تھے کہ مقابلہ کیا جائے۔ مگر اور مسلمانوں کے زور دینے پر لڑائی کے لئے تیار ہوگئے۔ ان کے پاس صرف سات سو جوان تھے۔ خوب گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ دشمنوں کے بہت سے آدمی کام آئے۔ خود آنحضرت زخمی ہوئے۔ اس خبر سے مسلمان مایوس ہوگئے اور ان کی فوج میں کھلبلی مچ گئی۔ اس لڑائی کے متعلق تحقیق کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ کس کو شکست ہوئی۔ بہرحال طرفین کا سخت نقصان ہوا۔ اس لڑائی میں حضرت صاحبؐ نے اپنے دشمنوں کے لئے دعا مانگی کہ اے خدا انھیں معاف کر کیونکہ یہ نہیں جانتے کہ یہ کیا کر رہے ہیں۔

اس جنگ کے بعد مخالفوں کے حوصلے بڑھ گئے اور انھوں نے پختہ ارادہ کرلیا کہ اب ہم اسلام کو بالکل نیست و نابود کرکے چھوڑیں گے۔ کئی قبیلوں کے لوگوں نے مسلمان بننے کا بہانہ کرکے مسلمانوں کے بہت سے واعظوں کو قتل کر ڈالا۔ یہودی لوگ بھی اسلام کے دشمنوں کے ساتھ مل گئے۔ چنانچہ چوبیس ہزار فوج تیار ہوگئی۔ مگر خدا کی غیبی طاقت مسلمانوں کی امداد کررہی تھی اور ان کا حوصلہ بڑھا رہی تھی۔ چنانچہ انھوں نے مدینے کے اس طرف جہاں پہاڑ نہ تھے۔ ایک خندق کھودنے کا ارادہ کیا۔ جس میں خود حضرت صاحبؐ نے ہاتھ میں پھاوڑہ لے کر مزدوروں کا کام کیا۔ خدا کی کرنی ایسی ہوئی کہ ایک رات سخت آندھی چلی اور موسلا دھار مینہ برسا۔ اور دشمنوں کے سب خیمے اکھڑ گئے۔ ان پر غضب کا خوف طاری ہوگیا۔ وہ سمجھے کہ خدا کی طرف سے قیامت نازل ہوئی ہے۔ ان میں سخت ابتری پھیل گئی اور سب لوگ اپنا بدھنا بوریا باندھ کر چلتے بنے۔ اس طرح یہ میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا۔ درحقیقت اسے غیبی امداد ہی سمجھنا چاہیے۔ ورنہ اگر لڑائی ہوتی تو ایک بھی مسلمان نہ بچ سکتا تھا۔

یہودیوں کی شرارتیں برابر جاری تھیں۔ حضرت صاحبؐ تو ہرچند چاہتے تھے کہ انھیں کسی قسم کی تکلیف نہ دی جائے اور وہ مسلمانوں کے ساتھ صلح کرکے چین سے مدینے میں رہیں۔ لیکن خندق کی لڑائی میں انھوں نے سخت غداری کا ثبوت دیا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنی تقریروں اور نظموں میں مسلمانوں اور خصوصاً حضرت صاحبؐ کی ہجو کرتے رہتے تھے۔ مسلمان عورتوں کو وہ آتے جاتے بہت تنگ کرتے تھے۔ ایک دفعہ زینب نامی یہودی عورت نے حضرت صاحبؐ اور بہت سے مسلمانوں کو دعوت دی اور کھانے میں زہر ملا دیا۔ حضرت صاحبؐ کو شبہ ہوگیا۔ اور خدا کی مہربانی سے سب کی جان بچ گئی۔ اس سازش میں بہت سے بڑے بڑے یہودی شامل تھے۔ اور کوئی ہوتا تو سب یہودیوں کو تلوار کے گھاٹ اتار دیتا۔ مگر آنحضرتؐ نے چند سرغنوں کو ہی سزا دینا کافی سمجھا۔

۵

اب سب کو یقین ہوگیا تھا کہ قریش اب خاموش ہوکر بیٹھ جائیں گے۔ کیوں کہ مسلمانوں کو نیست و نابود کرنا خالہ جی کا گھر نہ تھا۔ حضرت صاحبؐ کا بھی یہ خیال تھا کہ اب قریش دل چھوڑ بیٹھے ہیں۔ اس لئے انھوں نے حج کے ارادہ سے مکے جانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ تیرہ چودہ سو مسلمانوں کو ساتھ لے کر کعبے کی زیارت کو روانہ ہوئے۔ اپنے ساتھیوں کو پہلے ہی حکم دے دیا تھا کہ کوئی شخص ہتھیار یا لڑائی کا سامان اپنے ساتھ نہ لے جائے۔ اور صرف ایک تلوار میان میں

اپنی حفاظت کے لیے رکھے۔ جب وہ مکے کے قریب پہنچے۔ تو قریش کو شبہ ہوا کہ مسلمان مکے پر حملہ کرنے آئے ہیں۔ جب قریش کا قاصد ان کے پاس پہنچا تو انھوں نے کہا کہ ہم محض حج کی نیت سے یہاں آئے ہیں۔ اور ہم چاہتے کہ قریش کے ساتھ صلح ہو جائے۔ چنانچہ کچھ قیل وقال کے بعد صلح کی چند شرطیں طے ہوگئیں۔ اور مسلمان بغیر حج کیے واپس آگئے۔ بعض مسلمانوں نے اس کو بہت برا سمجھا۔ حضرت صاحبؐ نے اس موقع پر صلح کرنا ہی مناسب سمجھا تھا۔ اگر لڑائی ہوتی تو ایک مسلمان بھی زندہ واپس نہ آتا۔ کیوں کہ وہ بالکل جنگ کے لیے تیار تھے۔ یہ واقعہ صلح حدیبیہ کہلاتا ہے۔

اس صلح کے بعد مسلمانوں کی طاقت دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرنے لگی۔ حضرت صاحبؐ نے مختلف مقامات پر اپنے واعظ بھیجے۔ اور مختلف سلطنتوں کے حکمرانوں کو دعوت اسلام دی۔ کئی سلطنتوں نے اسلام کی بہت قدر کی اور مسلمانوں کو وعظ کرنے کی کھلی اجازت مل گئی۔

قریش کے لوگ صلح تو ضرور کر چکے تھے۔ مگر اسلام کی ترقی انھیں ایک آنکھ نہ بھاتی تھی اور وہ اسی تاک میں رہتے تھے کہ جب موقع ملے اسلام کا خاتمہ کر دیں۔ چنانچہ وہ برابر چھیڑ چھاڑ کرتے رہے۔ ایک دفعہ انھوں نے مسلمانوں کے حلیف بنو خزاعہ کے آدمی کو عین کعبے میں قتل کر ڈالا۔ آنحضرتؐ نے قاصد بھیجا کہ کیا آپ حدیبیہ کے صلح نامے کو برقرار رکھنا نہیں چاہتے۔ قریش نے ٹال مٹول کرنا چاہا۔ اور آخر کہہ دیا کہ وہ صلح نامہ قائم نہیں رہ سکتا۔

اب آنحضرتؐ نے فیصلہ کیا کہ روز روز کی جھک جھک ٹھیک نہیں ہے۔ اب قریش کو ایسا سبق سکھانا چاہیئے کہ آئندہ سر اٹھانے کی جرأت نہ کریں۔ چنانچہ انھوں نے زور شور سے مکے پر چڑھائی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اور دس ہزار جرار فوج لے کر ۸ہجری میں مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ قریش پر مسلمانوں کا خوف طاری ہو جائے۔ اور وہ بلا جنگ کئے اطاعت قبول کرلیں۔ چنانچہ مکے سے چند میل کے فاصلے پر ڈیرے ڈال دئے۔ اور سب نے اپنے اپنے خیمہ کے سامنے آگ جلا دی۔ قریش یہ دیکھ کر کہ اس قدر اسلامی لشکر مکے پر چڑھ آیا ہے ڈر گئے۔ ابوسفیان جو اسلام کا جانی دشمن تھا، گو وہ دل میں اسلام کی روحانی قوت کو محسوس کرتا تھا، قاصد بن کر گیا۔ لیکن حضرت صاحبؐ کے نیک سلوک سے متاثر ہوکر اس نے اپنے قصوروں کی معافی مانگ لی۔ حضرت صاحبؐ نے دریا دلی سے اسے معاف کر دیا۔ اور اس نے اسلام قبول کر لیا۔ اس نے واپس جاکر اعلان کر دیا کہ اب اسلام کا مقابلہ کرنا بے سود ہے جو شخص امان چاہتا ہے یا تو میرے گھر میں چلا آئے یا اپنا دروازہ بند کرلے۔ کسی کو ایذا نہیں پہنچے گی۔

اب اسلامی لشکر مختلف طرفوں سے مکے میں داخل ہوا۔ حضرت صاحب نے فوج کے افسروں کو سخت حکم دے دیا کہ مکے والوں پر کسی قسم کی سختی نہ کی جائے۔ آنحضرتؐ نے اپنے رفیقوں کے ساتھ کعبہ میں جاکر نماز پڑھی۔ شہر کے لوگ تھر تھر کانپ رہے تھے کہ نہ جانے اب کیا ہو گا۔ شاید آنحضرتؐ قتل عام کا ہی حکم دے دیں۔ اس لئے بہت سے لوگ شہر سے بھاگ جانے کا انتظام کر رہے تھے۔ جب آپ کو معلوم ہوا کہ لوگ اس قدر خوف زدہ ہو رہے ہیں تو آپ نے اعلان کر دیا "کوئی مسلمان تلوار نہ چلائے۔ اور کوئی شخص شہر چھوڑ کر نہ جائے۔ آج لڑائی اور انتقام کا دن نہیں ہے بلکہ آج شفقت اور رحمت کا دن ہے۔ میں تمھارا دشمن ہو کر نہیں آیا ہوں۔ اور نہ تم سے کسی قسم کا بدلہ لینا چاہتا ہوں۔

میں تم سے وہی سلوک کروں گا۔ جو یوسفؑ نے مصر میں اپنے بھائیوں سے کیا تھا۔ میں تم کو جھڑکی تک بھی نہ دوں گا۔"
یہ اعلان سن کر لوگوں کی جان میں جان آئی۔ اور انھوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب وہ واقعات پیش آئے جن کی مثال شاید ہی دنیا کی تواریخ میں کہیں ملتی ہو۔ ابو سفیان کو جو پہلے مسلمانوں کے خون کا پیاسا تھا، آنحضرت نے مکے میں داخل ہونے سے پہلے ہی معاف کر دیا تھا۔ اس کی بیوی ہندہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ اس کے خاوند نے اسلام قبول کر لیا ہے تو وہ غصے میں آپے سے باہر ہو گئی۔ اور اپنے خاوند کی داڑھی پکڑ کر اسے جوتیوں سے خوب پیٹا۔ اور اس کے منہ پر تھوکا۔ وہ بہت ڈری ہوئی تھی۔ کہ نہ جانے مجھے کیا سزا ملے۔ کیوں کہ اس نے لڑائی میں آنحضرتؐ کے چچا حمزہؓ کی لاش کا پیٹ چاک کر کے اور کلیجہ نکال کر دانتوں سے چبایا تھا۔ جب وہ آں حضرتؐ کے سامنے آئی تو شرم کے مارے منھ پر نقاب ڈال کر آئی۔ آں حضرتؐ نے کہا۔ اے ہندہ میں خوش ہوں کہ تو اپنے اعمال پر پشیمان ہے۔ تو صرف ایک خدا کی پرستش کیا کر۔ ہرگز جھوٹ نہ بولا کر اور ہمیشہ بدکرداری سے پرہیز کیا کر۔ یہ کہہ کر اسے بالکل معاف کر دیا۔ وہ آنحضرتؐ پر ایمان لے آئی۔
عکرمہ کو جس نے مکے میں داخل ہوتے ہی دو بے گناہ مسلمانوں کو تیر مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ اس کی بیوی کی سفارش پر معاف کر دیا۔ اسی طرح ایک شخص ہبار نامی کو جس نے آں حضرتؐ کی لڑکی زینب کو جب کہ وہ حاملہ تھیں، پتھر مار کر ہلاک کر دیا تھا معاف کر دیا۔
طائف کے لوگوں نے جب آں حضرتؐ وہاں گئے تھے تو انھیں پتھر مار مار کر گھائل کر دیا تھا پھر سر اٹھایا۔ ان پر چڑھائی کر کے ان کے قلعے فتح کر لیے۔ اور چھ ہزار فوجیوں کو قید کر لیا۔ لیکن وہاں کے لوگوں کی طرف سے یہ یقین دلانے پر کہ وہ ہمیشہ وفادار رہیں گے سب قیدیوں کو آزاد کر دیا۔ اور کسی کو بھی مسلمان بننے پر مجبور نہ کیا۔ حالاں کہ اگر وہ چاہتے تو سب کو مسلمان بنا سکتے تھے۔
اب اسلام تمام عرب میں پھیل چکا تھا۔ اور عربوں نے آپ کو اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا تھا۔ آپ نے تمام صیغوں کے انتظام کی طرف توجہ کی۔ محصول اور لگان کی وصولی کے قواعد بنائے۔ فوجوں کی باقاعدہ ترتیب اور تربیت کا انتظام کیا۔ سرحد کی حفاظت کے لیے چھاؤنیاں بنائیں۔ ہر ایک کے لئے آمدنی کا خاص حصہ زکوٰۃ میں دینا ضروری قرار دیا۔ مختلف قبیلوں کی بغاوتوں کو رفع کرنے کا خاص انتظام کیا۔
آس پاس کی عیسائی حکومتوں کو اسلام کی ترقی بہت ناگوار گزرتی تھی۔ اور وہ اکثر کچھ نہ کچھ چھیڑ چھاڑ کرتی رہتی تھیں۔ ان کی سرکوبی کا بھی خوب انتظام کیا اور تمام اردگرد کے حاکموں کے ساتھ عہدنامے کر لیے تاکہ تمام ملکوں میں امن و امان قائم رہ سکے۔ اب انھوں نے نہایت دھوم دھام سے حج کی تیاریاں کیں اور اس حج کے موقع پر ایک لاکھ چالیس ہزار مسلمان شامل ہوئے۔ چند ہی سال میں اسلام کا تمام عرب میں پھیل جانا اور مختلف مخالف فرقوں اور قبیلوں کا آں حضرتؐ کا پیرو دین جانا دراصل ایک معجزہ تھا۔ شاید ہی کسی اور پیغمبر کو اپنی زندگی میں اس قدر کامیابی نصیب ہوئی ہو اس حج کے موقع پر ہر طرف بہشتی نظارہ دکھائی دیتا تھا۔ جہاں چھوٹے بڑے امیر و غریب کی کچھ تمیز نہ تھی۔ [illegible]

سانی مساوات کا دلکش اور دل فریب منظر تھا۔ اور سب اپنے محبوب کے گرد جمع ہوکر اپنے خالق خداوند تعالیٰ کی پرستش اور عبادت میں مصروف تھے۔

اب بیس بائیس سال کی لگاتار محنت اور مخالفوں کی سختیوں اور اذیتوں اور نیز جنگ و جدل و ملکی انتظام کی ذمہ داریوں کی وجہ سے آپ کا جسم بہت کمزور ہوگیا تھا۔ اگر کوئی اور ہوتا تو شاید ان مشکلات کا کبھی کا شکار ہوگیا ہوتا۔ مگر انسان آخر انسان ہے اس کی جسمانی طاقتیں آخر جواب دینے لگتی ہیں

چنانچہ آپ ۱۱ھ میں بیمار ہوگئے۔ حضرت عائشہ رض اور ان کے رفیقوں نے ان کی تیمارداری میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ آخری دن مسواک سے منہ صاف کیا اور دوشنبہ کے دن ۸ جون ۶۳۲ء کو اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے۔ مسلمانوں کو ان کی جدائی کا بے حد رنج ہوا۔ مگر حضرت ابوبکر رض نے ان کو بہت بہت دلاسا دیا۔ آخر سب اس واقعہ کو خدا کی مرضی سمجھ کر چھاتی پر پتھر رکھ کرکے بیٹھ گئے۔

— ۶ —

آں حضرتؐ کی عادات بہت سیدھی سادی تھیں۔ ہمیشہ موٹا کپڑا استعمال کرتے تھے۔ کرتہ، چادر اور تہ بند کے سوائے اور کپڑا نہ پہنتے تھے۔ خوراک کی سادگی کا تو یہ حال تھا کہ شاید غریب مزدور بھی آج کل ایسی سادہ خوراک نہ کھاتا ہو۔ جو کا آٹا ہانڈی میں آگ پر چڑھا دیا اور اوپر سے کچھ زیتون کا تیل، زیرہ اور کالی مرچیں ڈال دیں اور آپ کا کھانا تیار ہوگیا۔ اکثر کھجوریں کھا کر ہی گزارہ کر لیا کرتے۔ غرض جو سامنے آتا وہی خدا کا شکر کرکے کھا لیتے تھے۔

صفائی کا بہت خیال رکھتے تھے۔ خود اپنے ہاتھ سے اپنے مکان میں جھاڑو دے لیا کرتے تھے۔ اپنے کپڑے خود دھو لیا کرتے تھے اور پھٹے پرانے کپڑے خود سی لیا کرتے تھے۔ ان کے مکان میں ایک چارپائی، ایک پانی کی ٹھلیا اور ایک بورئے کے سوائے اور سامان موجود نہ رہتا تھا۔ ہمیشہ وہ اپنا کام خود اپنے ہاتھ سے کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ چنانچہ اوائل عمر میں وہ بکریاں چرایا کرتے تھے۔ گھر بار کے کام کاج میں اپنی بیویوں کا ہمیشہ ہاتھ بٹاتے تھے۔ بکریوں کا دودھ دوہ لیتے تھے۔ جوتیاں خود گانٹھ لیتے تھے۔ بازار سے سودا سلف خرید لاتے۔ اونٹوں کو باندھ لیتے۔ اور ان کے آگے چارہ ڈالتے تھے۔ غرض کسی قسم کے کام سے انھیں عار نہ تھی۔ مسلمانوں کے ساتھ مل کر انھوں نے مسجدیں بنائیں۔ مزدوروں کا کام کیا۔ کھانے سے پہلے اور پیچھے ہاتھ دھوتے اور منہ کو خوب صاف کرتے تھے۔ داتن (مسواک) کیا کرتے تھے۔ بالوں میں ہمیشہ کنگھی کرتے اور کبھی کبھی تیل بھی لگایا کرتے تھے۔

انھوں نے اپنی سادہ زندگی سے یہ ثابت کر دیا کہ کسی قسم کا کام یا پیشہ ذلیل نہیں، بشرطیکہ راست بازی اور دیانت داری کو مدنظر رکھا جائے۔

مزاج میں انکساری غضب کی تھی۔ کوئی تعظیم کو کھڑا ہوتا تو اسے منع کر دیتے۔ خواہ کوئی غلام بھی کھانے کو بلاتا تو اس کے ہاں بلاتکلف چلے جاتے اور سب کے ساتھ مل کر کھانا کھاتے۔ جب کسی مجمع میں جاتے تو سب کے ساتھ مل کر بیٹھتے تھے۔ جب کوئی دوسرا بات کرتا تو اس میں ہرگز دخل نہ دیتے تھے۔ اگر کچھ کہنا ضروری ہوتا تو بہت حلیمی اور عاجزی

سے کہتے۔ آپ کا دل دشمنی عداوت، انتقام، سخت گیری اور درشت کلامی کے ناپاک جذبات سے پاک تھا۔ ہمیشہ
اور درگزر کے لئے تیار رہتے تھے۔ جیسا کہ مکے کی فتح کے وقت بہت سے واقعات سے ظاہر ہوا۔ سچائی، دیانت داری
الطاف ان کی فطرت کے جزو بن گئے تھے ہر وقت اپنے پیروؤں کو راست بازی کی تلقین کرتے رہتے تھے۔ ان کی فیاضی بے نظیر
تھی۔ حتی الامکان کسی کے سوال کو رد نہ کرتے تھے۔ خود تکلیف اٹھا کر اور بھوکا رہ کر دوسروں کے سوال کو پورا کرتے تھے۔ مال
دولت ہرگز جمع نہ کرتے تھے بلکہ جب تک مال تقسیم نہ کر دیتے ان کو چین نہ پڑتا تھا۔ غریب، یتیم اور محتاجوں کی امداد کو ہر وقت تیار
رہتے تھے۔ انھوں نے غلاموں کے حقوق آقاؤں پر قائم کئے۔ اور عورتوں اور بچوں کے حقوق مردوں پر قائم کئے۔
جب کسی کی بیماری کی خبر سن لیتے تو اس کی بیمار پرسی کے لئے جاتے۔ جب کوئی فوت ہو جاتا تو اس کے جنازے
کے ساتھ جاتے ــ انسان کا تو ذکر کیا وہ بے زبان جانوروں پر بھی بہت ترس کھاتے تھے۔ چنانچہ انھوں ــ
جانوروں کی لڑائی کو عرب کے ہر مقام پر بالکل بند کر دیا تھا۔ لاغر جانوروں کو دیکھتے تو کہا کرتے اے لوگو! بے زبانوں
کے بارے میں خدا سے ڈرو۔ مہمان نواز اول درجے کے تھے۔ جب کوئی مہمان آ جاتا تو اپنا کھانا اس کو کھلا دیتے۔ آپ
بہت شیریں زبان تھے، سب سے بہت نرمی اور ملائمت سے گفتگو کرتے تھے۔ آپ ہرگز کسی کو بد دعا نہیں دیتے تھے۔
خداوند تعالیٰ کی بخشش و رحمت پر ایسا زبردست اعتقاد رکھتے تھے کہ بڑی بڑی مصیبتوں میں حوصلہ نہ ہارتے تھے۔
اسی وجہ سے مٹھی بھر آدمیوں سے دشمنوں کے ٹڈی دل کا مقابلہ کامیابی سے کرتے رہے۔ غار ثور میں جب جا کر ابوبکر
کے ساتھ چھپے تھے تو دشمنوں کی آہٹ سن کر ابوبکر رض گھبرا گئے اور کہا کہ اے رسول اب ہم دو ہیں۔ زور سے کہا نہیں
ہم تین ہیں۔ یعنی تیسرا خدا ہمارے ساتھ ہے۔ کیسا زبردست ایمان ہے۔

حضرتؐ کے چند واقعات

ہم ذیل میں حضرت صاحبؐ کے متعلق چند روایات درج کرتے ہیں جن سے صاف معلوم ہو جائے گا
خداوند تعالیٰ نے ان کو کیسی کیسی خوبیاں عطا کی تھیں۔

۱۔ ایک یہودی کا کسی مسلمان سے جھگڑا ہو گیا اور فیصلہ آں حضرت پر چھوڑ آگیا۔ حضرت نے بے رو رعایت تحقیق
کی اور فیصلہ یہودی کے حق میں دے دیا۔ اور مسلمانوں کی ناراضگی کی مطلق پروا نہ کی۔

۲۔ ایک شخص کو چوری کے الزام میں گرفتار کر کے ان کے سامنے پیش کیا گیا۔ کئی بڑے بڑے آدمیوں نے
کی سفارش کی مگر آں حضرتؐ نے انصاف کو مدنظر رکھ کر سفارشوں کی مطلق پروا نہ کی۔ اور حکم دے دیا کہ اس کا ہاتھ کا
دیا جائے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اگر میری بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اس کے لئے یہی حکم دیتا کہ اس کے ہا
کاٹ دئے جائیں۔

۳۔ ایک دفعہ ایک یہودی کا کچھ روپیہ حضرت کو دینا تھا۔ وہ یہودی تقاضا کرنے آیا اور سخت کلامی کرنے ا
حضرت عمر رض کو اس پر بہت غصہ آیا مگر حضرت صاحبؐ نے فرمایا۔ اے عمر رض یہ بات ٹھیک نہیں۔ تجھے چاہئے تھا کہ ہم دو
کو نصیحت کرتا کہ قرض خواہ کو نرمی سے مطالبہ کرنا چاہئے۔ اور مجھے نیکی سے روپیہ واپس کرنا چاہئے۔ حضرت نے یہو

کو پاس بٹھایا اور اس کو قرضے سے کچھ زیادہ دے کر رخصت کیا۔ اس نیک سلوک کا یہودی پر ایسا اثر ہوا کہ وہ ان کا مرید بن گیا۔

۴۔ ایک دفعہ آپ اپنے احباب کے ساتھ کہیں دور جنگل میں سیر کو گئے۔ جب کھانا بنانے کی ضرورت پیش آئی تو آپ نے جنگل سے لکڑیاں لانے کا کام اپنے ذمے لیا۔ غرض وہ کبھی اپنے آپ کو بڑا نہیں سمجھتے تھے۔ اور ہمیشہ خواہ کیسا ہی چھوٹا کام ہو کرنے کو تیار ہو جاتے تھے۔

۵۔ ایک دفعہ ایک شخص کو کسی قصور کے عوض آپ کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہ آپ کو دیکھ کر کانپنے لگا۔ آپ نے فرمایا۔ ارے ڈرتا کیوں ہے۔ میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں۔ میں تو ایک غریب قریش عورت کا لڑکا ہوں جو کئی دفعہ غریبی کی وجہ سے سوکھا گوشت کھا کر ہی گزارہ کر لیتی تھی۔

۶۔ ایک دفعہ کئی صحابی جنگ پر گئے ہوئے تھے۔ ان کے گھر کوئی مرد نہ تھا اور عورتوں کو دودھ دوہنا نہ آتا تھا۔ آپ ہر روز ان کے گھر جا کر دودھ دوہ آیا کرتے تھے۔ اسی طرح غریب عورتیں ان کے پاس آ کر مختلف کام بتلا دیتی تھیں۔ اور وہ اٹھ کر سب کے کام کر آتے تھے۔

۷۔ ایک دفعہ مدینے کے چند بدو ان کے ہاں مہمان ہو کر آئے۔ ایک بدو کو زیادہ کھانے کی وجہ سے رات کو بہت دست آ گئے اور بستر خراب ہو گیا۔ وہ صبح ہی شرم کے مارے اٹھ کر چلا گیا۔ آپ نے اٹھ کر اس کی غلاظت کو اپنے ہاتھوں سے صاف کیا۔ لوگوں نے کہا ہمارے ہوتے ہوئے آپ ایسا کام کیوں کرتے ہیں۔ فرمایا اپنے مہمان کی ہر ایک قسم کی خدمت کا میں ہی ذمہ دار ہوں۔

۸۔ ایک دفعہ ایک رئیس نے چار اونٹوں پر غلہ لاد کر آپ کے پاس بھیجا۔ حضرت بلال رضؓ نے غلہ بیچ کر یہودیوں کا قرضہ ادا کیا۔ جب بلال رضؓ واپس آئے تو پوچھا کیا کچھ غلہ بچا ہے۔ جب یہ معلوم ہوا کہ ابھی غلہ باقی ہے۔ تو فرمایا کہ جب تک باقی غلہ غریبوں میں تقسیم نہ ہو جائے میں گھر میں نہیں جا سکتا۔ چنانچہ اس رات مسجد میں ہی قیام کیا۔ اور اگلے دن تمام غلہ تقسیم کرا کے گھر گئے۔

حضرت صاحب کی تعلیم

آپ نے مسلمانوں کے چار فرائض قائم کئے۔ نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ۔ پچھلے دو ان لوگوں کے لئے ضروری قرار دئے جنھیں روپیہ خرچ کرنے کی طاقت ہو۔

انھوں نے ایک خدا اور صرف ایک ہی خدا کی پرستش کی تعلیم دی۔ وہ یہ تعلیم دیتے تھے کہ سب انسان برابر ہیں اور ان کے حقوق بھی برابر ہیں۔

ایسے شخص کو جو بدی کی زندگی بسر کرتا ہے نماز بھی نہیں بچا سکتی۔ تمہارا چلن ہی ہے جس پر سزا اور جزا کا انحصار ہے۔

اے مسلمانو! تم دوسروں کے لئے وہی چاہو جو اپنے لئے چاہتے ہو۔ تب ہی تمہارا ایمان ٹھیک ہو سکتا ہے۔

کسی شخص کی ضرورت کو پورا کر دینا تمام عمر خدا کی عبادت کے برابر ہے۔
ایمان کے بعد سب سے بڑی نیکی خلقت کو آرام پہنچانا ہے۔
جو بڑوں کی تعظیم نہیں کرتا اور بچوں پر شفقت نہیں کرتا وہ میری امت میں نہیں ہے۔
جھگڑا کرنے والا انسان خدا کے نزدیک سب سے زیادہ قابل نفرت ہے۔
جس نے اپنی زبان اور خواہشات نفسانی کو قابو میں رکھا ہے میں اس کے واسطے جنت کا ضامن ہوتا ہوں۔
تمھارا ہمسایہ اگر تم سے امداد مانگے تو اس کی امداد کرو۔ قرض مانگے تو قرض دو۔ اگر تم سے اسے کوئی کام پڑے تو پورا کرو۔ بیمار ہو تو اس کی مزاج پرسی کرو۔ اور مر جائے تو اس کے جنازے کے ساتھ جاؤ۔ جب کوئی خوشی کا موقع ہو تو اسے مبارک باد دو۔ جب اس پر کوئی مصیبت نازل ہو تو اس کے ساتھ ہمدردی ظاہر کرو۔
کچھ پرواہ نہیں اگر دنیا کی اور چیزیں تیرے پاس نہ ہوں۔ مگر یہ چیزیں ضرور ہونی چاہئیں (۱) راست گفتاری (۲) دیانت داری (۳) خوش خلقی (۴) حلال کی کمائی۔
خادم کا قصور دن میں ستر دفعہ معاف کرو۔
اللہ تعالےٰ تمھاری صورتوں اور دولت کو نہیں دیکھتا۔ بلکہ تمھارے کاموں اور دلوں کو دیکھتا ہے۔
ہر ایک نیک کام خیرات ہے۔ کسی کو نیک کام کی ہدایت کرنا بھی خیرات ہے۔ بھولے بھٹکے کو راستہ دکھانا۔ اندھے کی مدد کرنا۔ راستہ میں سے پتھر اور کانٹے اٹھا دینا۔ پیاسے کو پانی پلا دینا۔ یہ سب خیرات کے کام ہیں۔
اے مسلمانو! یاد رکھو۔ ایک بھائی کو دوسرے بھائی کی عزت کرنا لازمی ہے۔ پرائے مال پر نگاہ رکھنا حرام ہے۔ جو جیسا کرے گا۔ ویسا بھرے گا۔ عورتوں کے ساتھ ہمیشہ نیک برتاؤ کرنا۔ کسی کی حق تلفی نہ کرنا۔ اور کسی پر کسی قسم کا ظلم نہ کرنا۔
خدا ایک ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ وہ سارے جہانوں کا مالک ہے۔ اسی کے قبضے میں سب کچھ ہے۔ وہ قادر مطلق ہے۔
جو چیز اولاد کے لئے بازار سے لاؤ سب سے پہلے لڑکی کو دو۔
جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے وہ بدلہ نہیں لیتا۔
ایسا اشارہ کرنا بھی حرام ہے جس سے دوسروں کو رنج پہنچے۔

نوٹ: یہ مضمون رائے صاحب شری لالہ رگھوناتھ سہائے بی اے کا لکھا ہوا ہے۔ وہ تقسیم سے پہلے انجمن اتحاد مذاہب (لاہور) کے صدر تھے۔ انھوں نے ۱۹۴۰ء میں پنجاب آرٹ پریس، بیرون موری دروازہ، لاہور سے ایک کتاب شائع کی تھی۔ اس کے ۱۰۳ صفحات تھے اور اس کا نام تھا: "روشن ستارے"۔ اس کتاب میں دس "نامور مذہبی بزرگوں کے حالات" درج تھے۔ اس کا ایک باب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر تھا۔ یہ باب مکمل طور پر یہاں نقل کیا گیا ہے۔

پیغمبر اسلام

مسلم مورخین کے مطابق، محمدؐ ۲۰ اپریل ۵۷۱ کو عرب کے صحرا میں پیدا ہوئے۔ آپ کے نام کا مطلب ہے "بہت تعریف کیا ہوا"۔ میرے نزدیک وہ تمام فرزندانِ عرب میں سب سے زیادہ عالی دماغ انسان تھے۔ سرخ ریت کے اس ناقابل عبور صحرا میں جتنے شاعر اور بادشاہ ان سے پہلے یا ان کے بعد ہوئے، ان سب پر وہ بدرجہا زیادہ فوقیت رکھتے تھے۔ محمدؐ کا ظہور ہوا تو عرب ایک صحرا تھا، وہ کچھ بھی نہ تھا۔ خالی صحرا سے محمدؐ کی طاقتور روح نے ایک نئی دنیا بنائی۔ نئی زندگی، نیا کلچر، نئی تہذیب اور نئی سلطنت پیدا کی جو مراکش سے انڈیز تک پھیلی ہوئی تھی اور جس نے تین براعظموں (ایشیاء، افریقہ، یورپ) کے خیالات اور زندگی کو متاثر کیا۔

میری اس تحریر کا موضوع ایک ایسے مذہب کے اصولوں کی بابت لکھنا ہے جو کہ تاریخی ہے اور اس کا پیغمبر بھی ایک تاریخی شخصیت ہے۔ سر ولیم میور جیسا ایک معاند ناقد بھی قرآن کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتا ہے: "دنیا میں غالباً قرآن کے سوا کوئی دوسری کتاب نہیں ہے جس کا متن بارہ سو سال گزرنے کے بعد بھی اس درجہ خالص صورت میں محفوظ ہو"۔ میں یہ بھی اضافہ کروں گا کہ حضرت محمدؐ ایک تاریخی شخصیت ہیں۔ آپ کی زندگی کا ہر واقعہ نہایت احتیاط سے منضبط کیا گیا ہے حتیٰ کہ چھوٹی چھوٹی تفصیلات بھی آئندہ نسلوں کے لئے محفوظ کر دی گئی ہیں۔ آپ کی زندگی اور آپ کا کام پراسراریت کے پردہ میں چھپا ہوا نہیں ہے۔ یہ ضرورت نہیں ہے کہ ایک شخص صحیح معلومات کے لئے اس مشکل مہم کو سر کرے کہ وہ بھس کے ڈھیر میں سے چھان کر سچائی کے دانے نکالے۔

میرا کام اس لئے بھی ہلکا ہو چکا ہے کہ وہ زمانہ اب بہت تیزی سے رخصت ہو رہا ہے جب کہ کچھ ناقدین سیاسی اور غیر سیاسی وجوہ سے اسلام کو بہت بگاڑ کر پیش کرتے تھے۔ پروفیسر بیوان "کیمبرج میڈیول ہسٹری" میں لکھتے ہیں "محمدؐ اور اسلام کے بارے میں کتابیں جو یورپ میں ۱۹ویں صدی کے آغاز سے پہلے چھپی تھیں آج ان کو محض قلمی عجوبے سمجھا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اسلام اور تلوار کا نظریہ آج کہیں بھی قابل لحاظ نہیں سمجھا جاتا۔ اسلام کا یہ اصول کہ مذہب میں کوئی زبردستی نہیں، آج سب کو پوری طرح معلوم ہے۔ مشہور مورخ گبن نے لکھا ہے "مسلمانوں کی طرف ایک مجرمانہ اصول منسوب کیا جاتا رہا ہے کہ ہر مذہب کو تلوار کے زور سے ختم کر دیا جائے"۔ مگر گبن کہتا ہے کہ جہالت اور تعصب کا یہ الزام قرآن سے، مسلم فاتحین کی تاریخ سے نیز مسلم عوام کے رویہ سے غلط ثابت ہوتا ہے جو کہ ہمیشہ قانونی اور سماجی طور پر مسیحی عبادت کے ساتھ رواداری کا طریقہ اختیار کرتے رہے ہیں۔ محمدؐ کی زندگی کی عظیم کامیابی صرف اخلاقی طاقت کے ذریعہ ہوئی، تلوار کی کسی مار کے بغیر۔

— ۲ —

قدیم زمانہ میں عربوں کا یہ حال تھا کہ اتنی معمولی سی بات پر وہ چالیس سال تک لڑتے رہے کہ ایک قبیلہ کا ایک اونٹ بھٹک کر دوسرے قبیلہ کی چراگاہ میں چلا گیا۔ اس جنگ میں دونوں قبیلوں کے ستر ہزار آدمی مارے گئے

اور خطرہ پیدا ہو گیا کہ دونوں قبیلوں کی نسل ختم ہو جائے گی۔ ایسے جھگڑالو عربوں کو پیغمبر اسلام نے خود انضباطی اور تنظیم کی تعلیم یہاں تک دی کہ میدان جنگ میں بھی ان کو نماز پڑھنے کا حکم دیا۔

صلح کے لئے آپ کا منصوبہ جب بار بار کوشش کے باوجود ناکام ہو گیا تو ایسے حالات پیدا ہوئے جو آپ کو کھینچ کر میدان جنگ میں لے آئے۔ آپ کا یہ اقدام محض دفاع کے لئے تھا۔ تاہم انھوں نے میدان جنگ کے پورے طریق عمل کو بالکل بدل دیا۔ ان کی پوری زندگی میں جو لڑائیاں ہوئیں، ان سب میں مرنے والوں کی مجموعی تعداد، جب کہ پورا جزیرہ نمائے عرب ان کے جھنڈے کے نیچے آگیا، چند سو سے زیادہ نہیں۔ انھوں نے عرب وحشیوں کو نماز پڑھنا سکھایا، محض انفرادی طور پر نہیں، بلکہ اجتماعی طور پر، حتیٰ کہ انھوں نے ہدایت کی کہ جنگ کے طوفان میں بھی اپنے خدا کے آگے سجدہ کرو۔ جب بھی عبادت کا وقت آجائے، اور یہ روزانہ پانچ وقت آتا ہے، تو اجتماعی عبادت چھوڑی نہیں جا سکتی، حتیٰ کہ ملتوی بھی نہیں کی جا سکتی۔ لشکر کا ایک حصہ اگر دشمنوں سے مقابلہ میں مصروف رہے تو اس کا دوسرا حصہ اپنے خدا کے سامنے اپنے سروں کو جھکا دے۔ جب ایک فریق اپنی عبادت ختم کرے تو وہ مورچہ سنبھال لے اور دوسرا فریق آکر اپنی عبادت کرے۔

وحشت و بربریت کے زمانہ میں میدان جنگ تک پر انسانیت کا اصول جاری کیا گیا۔ سخت ہدایات جاری کی گئیں کہ خیانت نہ کی جائے۔ دھوکا نہ دیا جائے۔ عہد کو توڑا نہ جائے۔ ہاتھ پاؤں نہ کاٹے جائیں۔ عورتوں اور بچوں اور بوڑھوں کو قتل نہ کیا جائے۔ پھل دار درختوں کو نہ کاٹا جائے اور نہ جلایا جائے۔ عبادت گاہوں میں عبادت کرنے والے لوگوں پر زیادتی نہ کی جائے۔ پیغمبر کا خود اپنا طرز عمل اپنے سخت ترین دشمنوں کے ساتھ نمونہ کا طرز عمل تھا۔ مکہ کی فتح کے بعد ان کو پورا اقتدار حاصل ہو گیا تھا، وہ شہر جس نے آپ کا پیغام سننے سے انکار کر دیا تھا۔ جس نے آپ کے اوپر اور آپ کے ساتھیوں کے اوپر شدید ظلم کئے تھے۔ جس نے آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو وطن چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ حتیٰ کہ جب آپ اپنا وطن چھوڑ کر دو سو میل دور (مدینہ) چلے گئے، اس وقت بھی انھوں نے آپ کا بائیکاٹ کرنے اور آپ کو تکلیفیں پہنچانے کا سلسلہ جاری رکھا۔ آج وہ شہر مکہ آپ کے قدموں کے نیچے تھا۔ جنگ کے مسلمہ قوانین کے مطابق وہ ان تمام مظالم کا بدلہ لے سکتے تھے جو آپ پر اور آپ کے لوگوں پر کئے گئے تھے۔ مگر آپ نے ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا۔ محمدؐ کا دل رحم اور محبت کے دودھ سے بھر گیا۔ آپ نے اعلان کیا:

آج تمھارے اوپر کوئی الزام نہیں۔ آج تم سب آزاد ہو۔

یہ ان مقاصد میں سے ایک اہم مقصد تھا کہ کیوں آپ نے دفاع میں جنگ کرنے کی اجازت دی — اس لئے تاکہ انسانوں کو متحد کیا جا سکے۔ اور جب یہ مقصد حاصل ہو گیا تو آپ کے بدترین دشمن تک معاف کر دیئے گئے۔ وہ لوگ جنھوں نے آپ کے محبوب چچا حمزہؓ کو قتل کیا تھا، ان کے مردہ جسم کا مثلہ کیا تھا وہ بھی آپ کی مہربانیوں سے محروم نہ رہے۔

عالمی اخوت اور انسانی مساوات کا اصول جس کی آپ نے تبلیغ کی وہ انسانیت کی سماجی ترقی میں بہت بڑا درجہ رکھتے ہیں۔ تمام بڑے مذاہب نے اس قسم کے اصولوں کی تبلیغ کی ہے مگر پیغمبر اسلام نے اس نظریہ کو حقیقی عمل کی صورت

دے دی اور اس کی اہمیت شاید کچھ دنوں بعد پوری طرح سمجھی جا سکے جب کہ بین اقوامی شعور جاگے گا، نسلی تعصبات ختم ہو جائیں گے اور انسانی اخوت کا ایک طاقت ور نظریہ وجود میں آ جائے گا۔ سروجنی نائیڈو اسلام کے اس پہلو پر بولتی ہوئی کہتی ہیں: "وہ پہلا مذہب تھا جس نے جمہوریت کی تبلیغ کی اور اس کو عمل کی صورت دی۔ کیوں کہ مسجد میں جب اذانیں بلند ہوتی ہیں اور نمازی ایک ساتھ جمع ہوتے ہیں تو اسلام کی جمہوریت روزانہ پانچ بار مجسم ہوتی ہے جب کہ معمولی آدمی اور بادشاہ ایک صف میں شامل ہو کر جھکتے ہیں اور کہتے ہیں: "خدا سب سے بڑا ہے"۔ ہندوستان کی یہ مشہور شاعرہ مزید لکھتی ہے: "میں اسلام کی اس ناقابل تقسیم وحدت کو دیکھ کر بار بار حیران ہوتی ہوں جو کہ آدمی کو طبعی طور پر بھائی بھائی بنا دیتی ہے۔ جب آپ ایک مصری، ایک الجیریائی، ایک ہندستانی یا ترکی سے لندن میں ملتے ہیں تو ان میں جو فرق ملے گا وہ صرف اتنا سا کہ ایک کی پیدائش مصر میں ہوئی اور دوسرے کی ہندستان میں"۔

مہاتما گاندھی اپنے ناقابل تقلید انداز میں لکھتے ہیں "کسی نے کہا ہے کہ جنوبی افریقہ کے لوگ اسلام کے ظہور سے ڈر رہے ہیں ——— وہ اسلام جس نے اسپین کو مہذب بنایا، وہ اسلام جو روشنی کی شمع کو مراکش تک لے گیا اور دنیا کو اخوت کا مقدس پیغام دیا۔ جنوبی افریقہ کے یورپی لوگ اسلام کے ظہور سے ڈر رہے ہیں کیوں کہ اسلام آئے گا تو وہ کالوں اور گوروں میں برابری کا اعلان کرے گا۔ ان کو اس سے ڈرنا ہی چاہئے۔ اگر اخوت ایک گناہ ہے، اگر مختلف نسلوں میں برابری وہ چیز ہے جس سے وہ ڈرتے ہیں تب ان کا ڈر بالکل بجا ہے۔"

ہر سال حج کے موسم میں دنیا اسلام کے اس حیرت ناک بین اقوامی مظاہرہ کو دیکھتی ہے جو کہ نسل، رنگ اور رتبہ کے تمام فرق کو برابر کر دیتا ہے۔ نہ صرف یورپی، افریقی، ایرانی، ہندستانی، چینی سب کے سب ایک خدائی خاندان کے ممبر کی حیثیت سے مکہ میں ملتے ہیں۔ بلکہ سب کے سب ایک قسم کے لباس پہنے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہر آدمی معمولی سفید بغیر سلے ہوئے کپڑے کے دو ٹکڑے لپیٹے ہوئے ہوتا ہے۔ ایک ٹکڑا کمر کے گرد اور دوسرا ٹکڑا کندھے کے اوپر۔ اسی کے ساتھ ننگے سر، بغیر کسی رسم اور کسی دھوم دھام کے اور یہ آواز لگاتے ہوئے "میں حاضر ہوں، خدایا میں حاضر ہوں، تو ایک ہے، تیرا کوئی شریک نہیں، حکم صرف تیرا ہی ہے"۔ اس طرح یہاں ایسی کوئی چیز باقی نہیں رہتی جو چھوٹے اور بڑے کے درمیان فرق کرے اور ہر حاجی یہ احساس لے کر گھر واپس آتا ہے کہ اسلام ایک بین اقوامی اہمیت رکھنے والا دین ہے۔ پروفیسر ہرگرونجی کے الفاظ میں "اقوام کی جمعیت جو پیغمبر اسلام نے بنائی، اس نے بین اقوامی اتحاد اور انسانی اخوت کے اصول کو ایسی عالمی سطح پر قائم کیا ہے جو دوسری قوموں کو روشنی دکھانے والا ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ دنیا کی کوئی بھی دوسری قوم اتحاد اقوام کے لئے اس کے برابر کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔

پیغمبر اسلام نے جمہوری حکومت کو اس کی بہترین صورت میں قائم کیا۔ خلیفہ عمرؓ، خلیفہ علیؓ، جو پیغمبر کے داماد بھی تھے، خلیفہ منصور عباسی جو خلیفہ مامون کے بیٹے تھے اور دوسرے بہت سے خلفاء اور سلاطین اسلامی عدالتوں میں معمولی آدمی کی طرح حاضر ہوئے۔ آج بھی ہم سب جانتے ہیں کہ کالے نیگروؤں کے ساتھ مہذب سفید نسلوں کا سلوک کیا ہوتا ہے۔ اب بلالؓ کی بابت غور کرو جو چودہ سو سال پہلے پیغمبر اسلام کے زمانے میں ایک نیگرو غلام تھے، نماز کے

لئے اذان دینے کا کام ابتدائی اسلام کے زمانے میں ایک عزت کا کام سمجھا جاتا تھا اور یہ باعزت کام اس نیگرو غلام کے سپرد کیا گیا تھا۔ مکہ فتح ہونے کے بعد، پیغمبر نے ان کو حکم دیا کہ وہ نماز کے لئے اذان دیں۔ اور یہ نیگرو غلام، اپنے کالے رنگ اور اپنے موٹے ہونٹوں کے ساتھ مقدس کعبہ کی چھت پر کھڑا ہوا، جو کہ اسلامی دنیا میں سب سے زیادہ تاریخی اور سب سے زیادہ مقدس جگہ ہے۔ اس وقت کچھ مغرور عرب تکلیف کے ساتھ بولے: "اف، یہ کالا حبشی غلام، برا ہو اس کا۔ وہ مقدس کعبہ کی چھت پر کھڑا ہوا ہے اذان دینے کے لئے۔"

غرور اور تعصب کا یہ مزاج پیغمبر اسلام ختم کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے آپ نے اس کا جواب دیتے ہوئے اپنی ایک تقریر میں کہا: ساری حمد اور شکر اللہ کے لئے ہے جس نے ہم کو جاہلیت کے زمانہ کے فخر اور برائی سے نجات بخشی۔ اے لوگو یاد رکھو، تمام انسان صرف دو قسموں میں بٹے ہوئے ہیں، متقی اور اللہ سے ڈرنے والے جو اللہ کے پسندیدہ بندے ہیں۔ دوسرے گنہ گار اور سخت دل جو اللہ کے نزدیک حقیر اور بے قیمت ہیں۔ تمام انسان آدم کی اولاد ہیں اور آدم کو خدا نے مٹی سے پیدا کیا تھا۔" یہی بات قرآن میں اس طرح کہی گئی ہے: اے لوگو ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تم کو مختلف قومیں اور مختلف خاندان بنا دیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ یقیناً اللہ کے نزدیک تمھارا سب سے باعزت وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔ اللہ خوب جاننے والا پوری طرح خبردار ہے (حجرات)

پیغمبر اسلام نے اس طرح اتنی زبردست تبدیلی پیدا کی کہ وہ لوگ جو خالص عرب تھے اور اعلیٰ ترین خاندان سے تعلق رکھتے تھے، انھوں نے اپنی لڑکیاں اس نیگرو غلام کے لئے شادی میں پیش کیں۔ اسلام کے دوسرے خلیفہ جو عمر فاروق کے نام سے مشہور ہیں، جب وہ اس نیگرو غلام کو دیکھتے تو وہ فوراً ان کی تعظیم کے لئے کھڑے ہو جاتے اور ان الفاظ کے ساتھ ان کا استقبال کرتے: "یہ ہمارے معلم آگئے، یہ ہمارے سردار آگئے۔" قرآن اور محمدؐ کے ذریعہ کیسا حیرت ناک انقلاب تھا جو عربوں کے درمیان آیا، وہ عرب جو اس زمانہ میں سب سے زیادہ مغرور قوم کی حیثیت رکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ عظیم ترین جرمن شاعر گوئٹے نے قرآن پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا: "یہ کتاب تمام زمانوں میں سب سے زیادہ مؤثر کتاب کی حیثیت سے باقی رہے گی۔" اور یہی وجہ ہے کہ برنارڈ شا کو یہ کہنا پڑا "اگر کوئی مذہب ہے جو انگلینڈ، نہیں بلکہ یورپ پر اگلے ۱۰۰ سال کے اندر حکومت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے تو وہ اسلام ہے۔"

اسلام کی یہی جمہوری اسپرٹ ہے جس نے عورت کو مرد کی غلامی سے نکالا ــــ سر چارلس ایڈورڈ آرچیبالڈ ہملٹن نے کہا ہے: "اسلام بتاتا ہے کہ انسان پیدائشی طور پر بے گناہ ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ مرد اور عورت دونوں ایک ہی جوہر سے پیدا ہوئے ہیں، دونوں کے اندر ایک ہی روح ہے اور دونوں ذہنی، روحانی اور اخلاقی ترقی کی یکساں قابلیت رکھتے ہیں۔" عربوں کے یہاں یہ زبردست روایت چلی آرہی تھی کہ وراثت کا حق دار وہی ہے جو برچھا چلاتا ہے اور تلوار کے قبضہ کو پکڑنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مگر اسلام صنف نازک کا حمایتی بن کر ظاہر ہوا اور عورتوں کو یہ حق دیا کہ وہ اپنے سرپرستوں کی وراثت میں حصہ دار بن سکتی ہیں۔ اسلام بہت پہلے عورت کو یہ حق دے چکا تھا کہ وہ جائداد کی مالک بن سکتی ہیں۔ اس کے بارہ صدیوں بعد ایسا ہو سکا کہ ۱۸۸۱ میں انگلستان نے، جو کہ جمہوریت کا گہوارہ سمجھا جاتا ہے، اسلام کی اس تعلیم کو

اختیار کیا اور وہاں ایک قانون پاس ہوا جس کا نام تھا شادی شدہ عورتوں کا قانون (دی میرڈ ویمنز ایکٹ) مگر صدیا
پہلے پیغمبر اسلام یہ اعلان کر چکے تھے کہ "عورتیں مرد کا نصف ثانی ہیں۔ عورتوں کا حق ہر حال میں محترم ہے" "دیکھو
رکھو کہ عورتوں کو وہ حق ملتا ہے جو ان کو دیا گیا ہے"

۳

اسلام براہ راست طور پر سیاسی اور اقتصادی نظام سے تعلق نہیں رکھتا۔ مگر بالواسطہ طور پر اور جہا
تک سیاسی اور اقتصادی معاملات انسان کے طور طریقے اور اخلاقیات کو متاثر کرتے ہیں، وہ اقتصادی زند
کے لئے کچھ نہایت اہم اصول مقرر کرتا ہے۔ پروفیسر میسی نن کے مطابق، اسلام مبالغہ آمیز انتہاؤں کے درمیا
توازن کو برقرار رکھتا ہے اور ہمیشہ کردار کی تعمیر پر زور دیتا ہے جو کہ تہذیب کی بنیاد ہے۔ اس کی ضمانت جیت
بنیادی احکام کے ذریعہ کی گئی ہے ــــ اس کا وراثت کا قانون، زکوٰۃ کا نظم اور لازمی نظام، اقتصادی مید
میں تمام سماج دشمن طریقوں کو غیر قانونی قرار دینا جیسے اجارہ داری، سود، پیشگی طور پر طے کی ہوئی اور بغیر کمائی
آمدنیاں، بازار کا سب سامان خرید لینا، ذخیرہ اندوزی، کسی چیز کی مصنوعی قلت پیدا کرنا تاکہ قیمتوں میں اضا
ہو۔ اسی طرح جوا غیر قانونی ہے۔ اس کے برعکس تعلیم گاہوں، عبادت خانوں، اسپتالوں، کنووں، یتیم خانوں
امداد دینا بہت بڑی نیکی قرار دیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پہلی بار ایسا ہوا کہ پیغمبر اسلام کی تعلیم کے تحت یتیم خا
قائم ہوئے۔ دنیا اپنے یتیم خانوں کے لئے اسی پیغمبر اسلام کی احسان مند ہے جو خود بھی ایک یتیم تھے۔ کارلائل
محمدؐ کے بارے میں لکھا ہے: "یہ تمام خوبیاں، انسانیت کی فطری آواز، پارسائی اور مساوات، فطرت کے ا
صحرائی فرزند کے دل میں جاگزیں ہونے کی وجہ سے، آشکارا تھیں"
ایک مورخ نے کہا ہے کہ کسی عظیم انسان کا امتحان تین باتوں کی روشنی میں لینا چاہئے۔ کیا وہ اپنے معاصر
کی رائے میں حقیقی طور سے اونچے اخلاق کا حامل تھا؟ کیا وہ واقعتہً اتنا عظیم تھا کہ اپنے زمانہ کے معیاروں سے
بلند ہو گیا ہو؟ کیا اس نے اپنے بعد آنے والی دنیا کے لئے کوئی مستقل میراث چھوڑی؟ اس فہرست کو مزید بڑھا
جا سکتا ہے، لیکن یہ بات اپنی جگہ واضح ہے کہ پیغمبر محمدؐ عظمت کے اس معیار پر اعلیٰ ترین درجہ میں پورے اترتے
آخری دو باتوں کے بارے میں پہلے ہی اشارہ کیا جا چکا ہے۔
پہلی بات تو یہ ہے کہ کیا پیغمبر اسلام کو ان کے معاصرین نے حقیقتہً اونچے اخلاق کا حامل پایا۔ تاریخی دستا
بتاتی ہیں کہ محمد کے تمام معاصرین، دوست ہوں یا دشمن، سبھی نے ان کی پاک خوبیوں، بے داغ امانت داری، نفا
اچھائیوں، زندگی کے تمام شعبوں میں کامل اخلاص اور امانت کو تسلیم کیا ہے۔ یہاں تک کہ یہودی، اور وہ لو
بھی جو کہ آپ کے پیغام کو نہ مانتے تھے، وہ بھی اپنے ذاتی اختلافات کے سلسلے میں آپ کی انتہائی غیر جانب داری کا
سے آپ کو ثالث مانتے تھے۔ یہاں تک کہ جو آپ کے پیغام کو تسلیم نہیں کرتے تھے وہ بھی یہ کہنے پر مجبور تھے: "اے محمدؐ
کو جھوٹا نہیں کہتے، بلکہ جس نے آپ کو کتاب اور پیغام دیا ہے اس کا انکار کرتے ہیں۔" ان کا خیال تھا کہ آ

بز کا سایہ ہے۔ انھوں نے آپ کے علاج کے لئے تشدد کو بھی اپنایا۔ لیکن ان میں جو عمدہ ترین لوگ تھے
، نے دیکھا کہ ایک نیا نور آپ پر نازل ہوا ہے اور انھوں نے اس نور کو پانے کے لئے پیش قدمی کی۔ پیغمبر اسلام
یخ کا قابل ذکر واقعہ ہے کہ آپ کے قابل ترین رشتہ دار، چچازاد بھائی، آپ کو قریب سے جاننے والے عزیز
ت، سب پر آپ کے پیغام کا گہرا اثر ہوا اور سب آپ کے خدائی الہام کی صداقت سے متاثر ہوئے۔ اگر یہ شریف
ل، صاحب علم اور آپ کی ذاتی زندگی کو قریب سے جاننے والے مرد اور عورت آپ کے اندر ذرہ برابر بھی
ازی، دھوکہ، دنیا داری یا ایمان کی کمی پاتے تو اخلاقی زندگی، روحانی بیداری اور اجتماعی اصلاح کے
، میں محمدؐ کا منصوبہ ناکام ہوگیا ہوتا اور ساری عمارت چند لمحوں میں ٹوٹ کر زمین پر آرہتی۔ اس کے برعکس
تے ہیں کہ آپ کے ماننے والے آپ پر اتنا زیادہ فدا تھے کہ خود اختیاری طور پر انھوں نے آپ کو اپنی زندگی کا
ن لیا تھا۔ انھوں نے آپ کی خاطر ظلم اور بھوک کا مقابلہ کیا۔ شدید ترین تشدد اور قبیلہ سے اخراج کی وجہ سے
ٰ ذہنی کرب کے باوجود آپ کے لئے ان لوگوں کا ایمان، بھروسہ، اطاعت اور تعظیم برقرار رہی۔ اگر انھوں نے
بذر میں ذرا سی بھی خامی دیکھی ہوتی تو کیا ایسا ہوسکتا تھا۔

اسلام کے ابتدائی مومنین کی تاریخ پڑھئے تو بے گناہ مردوں اور عورتوں پر ہونے والے ظلم سے ہر دل پگھل
ا۔ معصوم عورت سمیہ کو نیزے مار مار کر ٹکڑے کر دیا گیا۔ خباب بن ارت کو جلتے ہوئے کوئلے پر لیٹنے پر مجبور کیا گیا۔
ہ بھی اس حال میں کہ بے رحم ظالم اپنا پیر ان کے سینے پر رکھے ہوئے تھا، تاکہ وہ حرکت نہ کرسکیں جس کی وجہ سے
جلد کے اندر کی چربی پگھل گئی۔ خباب بن عدی کو ظالمانہ طور سے جسم کے ایک حصہ کو کاٹ کر اور ان کا زندہ گوشت
ر ہلاک کیا گیا اور جب اس ظلم کے درمیان ان سے پوچھا گیا کہ کیا وہ یہ تمنا نہیں کرتے کہ خود محمدؐ ان کی جگہ ہوتے جو کہ
نت اپنے گھر میں اپنے خاندان کے ساتھ تھے۔ اس حالت میں بھی مظلوم نے چیخ کر کہا کہ اگر محمدؐ کو کانٹا بھی چبھے تو وہ
درا پنے پورے خاندان کو قربان کر دیں گے تاکہ آپ کو کانٹے کی تکلیف نہ ہو۔ اس قسم کے درجنوں دل سوز واقعات
لئے جاسکتے ہیں۔ لیکن یہ واقعات کیا ظاہر کرتے ہیں؟ ایسا کیوں ہوا کہ اسلام کے ان مرد عورت جاں نثاروں نے
ا اپنا ایمان محمدؐ کے حوالے کر دیا، بلکہ انھوں نے اپنے جسموں، دلوں اور روحوں کو بھی آپ پر نچھاور کر دیا۔ کیا محمدؐ
یب ترین معتقدین کا یہ مضبوط ایمان و یقین اس بات کی اعلیٰ ترین گواہی نہیں ہے کہ آپ اپنے پیغام کے بارے میں
تھے اور اپنے کام میں انتہائی حد تک خود کو کھپائے ہوئے تھے۔

اور یہ لوگ معمولی حیثیت یا کمتر ذہنی سطح کے لوگ نہیں تھے۔ بالکل ابتدائی دور سے ہی، آپ کے گرد کہ کا کھن جمع
تھا۔ یہ شریف ترین لوگ تھے جو کہ منصب، جاہ، ثروت اور ثقافت کے مالک تھے۔ ان میں آپ کے قریبی رشتہ دار بھی
کہ آپ کی زندگی کے داخلی اور خارجی پہلوؤں سے خوب واقف تھے۔ اور آپ کے بعد اسلام کے پہلے چار خلیفہ
ا ابتدائی زمانہ کے مومنین میں سے تھے جنھوں نے عظیم ذمہ داریاں اٹھائیں۔ انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا کا کہنا ہے
ہ تمام نبیوں اور دینی شخصیات میں سب سے زیادہ کامیاب ہیں۔" لیکن یہ کامیابی کسی اتفاقی واقعہ کی

مرہونِ منت نہیں ہے۔ یہ کوئی غیر متوقع واقعہ نہیں تھا۔ یہ کامیابی صرف اس لئے ہو سکی کہ معاصرین نے پیغمبر کو حقیقی اخلاق اور عالی ظرفی کا حامل پایا۔ یہ کامیابی آپ کی قابلِ تعریف اور پوری طرح چھا جانے والی شخصیت کا نتیجہ تھی۔

۴

محمدؐ کی شخصیت کے بارے میں مکمل صداقت کو جاننا بہت ہی مشکل ہے۔ میں تو صرف اس کی بعض جھلکیوں کو پا سکتا ہوں۔ کتنے خوبصورت مناظر یکے بعد دیگرے ڈرامائی طور پر سامنے آتے رہتے ہیں ——— محمدؐ پیغمبر، محمدؐ جنرل، محمدؐ حکمراں، محمدؐ غازی، محمدؐ تاجر، محمدؐ مبلغ، محمدؐ فلسفی، محمدؐ سیاست داں، محمدؐ خطیب، محمدؐ مصلح، محمدؐ یتیموں کا ملجا، غلاموں کا حامی، محمدؐ جج، محمدؐ پیشوا۔ ان تمام خوبصورت ادوار میں، انسانی اعمال کے ان تمام دائروں میں آپؐ ایک ہیرو معلوم ہوتے ہیں۔

یتیمی کی حالت بے چارگی کی آخری انتہا ہے اور اس دنیا میں آپ کی زندگی اسی انتہا سے شروع ہوئی۔ حکمرانی مادی طاقت کی انتہا ہے، اور اس دنیا میں آپ کی زندگی اسی پر ختم ہوئی۔

ایک یتیم بچے اور مظلوم مہاجر سے ابتدا کرکے آپ ایک پوری قوم کے روحانی اور مادی حاکم اعلیٰ اور اس کی تقدیر کے مالک بن گئے۔ اس عمل کے دوران پیش آنے والے امتحانات و ترغیبات، مشکلات و تغیرات، روشنیاں اور سائے، اونچ نیچ، دہشت اور عظمت کے دوران وہ دنیا کے امتحان میں کامیاب ہوکر زندگی کے ہر میدان میں ایک نمونہ بن کر ظاہر ہوئے۔ ان کی کامیابیاں زندگی کے کسی ایک میدان سے متعلق نہیں بلکہ انسانی زندگی کے تمام احوال پر حاوی ہیں۔

مثال کے طور پر عظمت اگر یہ ہے کہ بربریت اور مکمل اخلاقی تاریکی میں پڑی ہوئی قوم کو پاک کیا جائے تو جس نے اس پوری قوم کی کایا پلٹ دی، اس گری ہوئی قوم کو اتنا اونچا اٹھا دیا کہ وہ تہذیب و معرفت کی روشنی کی حامل بن گئی، اس عظیم شخصیت کو عظمت کا دعویٰ کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔ اگر عظمت یہ ہے کہ کسی سوسائٹی کے متنوع عناصر کو آپس میں بھائی چارگی اور خیر خواہی کے روابط میں جوڑ دیا جائے تو صحرا میں ہونے والے نبی کو عظمت کے امتیاز کا پورا حق حاصل ہے۔ اگر عظمت ذلیل کن توہمات اور ہر قسم کی مہلک عادتوں میں مبتلا قوم کی اصلاح کرنا ہے، تو پیغمبر اسلام نے لاکھوں آدمیوں کے دل سے توہمات اور غیر معقول خوف کو نکال باہر کیا۔ اگر عظمت بلند اخلاق کا مظاہرہ ہے، تو محمدؐ کے دوستوں، دشمنوں سبھی نے ان کو "الامین" اور "الصادق" کا لقب دیا تھا۔ اگر فاتح عظیم ہوتا ہے، تو محمدؐ بھی ایک مجبور یتیم اور عام انسان کی زندگی سے بلند ہو کر جزیرۂ عرب کے حاکم بن گئے جو کہ خسرو اور قیصر کا ہم پلہ منصب تھا۔ محمدؐ وہ تھے جنھوں نے ایک عظیم سلطنت قائم کی جو کہ ان گزری ہوئی چودہ صدیوں میں بھی برقرار ہے۔ اگر لیڈر کے لئے اس کے تابعین کا احترام اس کی عظمت کا معیار ہے تو پیغمبر کا نام آج بھی دنیا بھر میں پھیلے ہوئے کروڑوں لوگوں کے لئے جادو کی حیثیت رکھتا ہے۔

انھوں نے ایتھنز، روم، فارس، ہندوستان یا چین میں فلسفہ کی تعلیم نہیں حاصل کی تھی۔ لیکن انھوں

Unlettered himself, he could yet speak with an eloquence and fervour which moved men to tears of ecstasy. Born an orphan and blessed with no worldly goods, he was loved by all. He had studied at no military academy; yet he could organise his forces against tremendous odds and gained victories through the moral forces which he marshalled. Gifted men with a genius for preaching are rare. Descartes included the perfect preacher among the rarest kind in the world. Hitler in his *Mein Kampf* has expressed a similar view. He says: "A great theorist is seldom a great leader. An agitator is far more likely to possess these qualities. He will always be a better leader. For, leadership means ability to move masses of men. The talent to produce ideas has nothing in common with capacity for leadership". But, he says: "the union of the theorist, organiser, and leader in one man is the rarest phenomenon on this earth; therein consists greatness." In the person of the Prophet of Islam the world has seen this rarest phenomenon on the earth, walking in flesh and blood.

And more wonderful still is what the Reverend Bosworth Smith remarks: "Head of the State as well as the Church, he was Caesar and Pope in one; but, he was Pope without the Pope's claims, and Caesar without the legions of Caesar, without a standing army, without a bodyguard, without a palace, without a fixed revenue. If ever any man had the right to say that he ruled by a right divine, it was Muhammad, for he had all power without its instruments and without its supports. He cared not for the dressings of power. The simplicity of his private life was in keeping with his public life."

نے انسانیت کو لافانی حیثیت کے حامل عظیم ترین حقائق سے باخبر کیا۔ محمدؐ خود تو ان پڑھ تھے، لیکن وہ اتنی فصاحت اور جوش سے بولتے تھے کہ لوگ بے اختیار رو پڑتے تھے۔ اگرچہ محمدؐ یتیم اور دنیا کی دولتوں سے محروم پیدا ہوئے تھے، لیکن پھر بھی سب ان سے محبت کرتے تھے۔ انھوں نے کسی فوجی کالج میں تعلیم نہیں حاصل کی تھی، لیکن پھر بھی بڑی بڑی مشکلات پر قابو پا کر انھوں نے اپنی فوجوں کو منظم کیا اور اپنی ماہرانہ اخلاقی قوتوں کے بل پر جنگیں جیت لیں۔ خوبیوں سے بھرپور ایسے لوگ بہت نادر ہیں جن میں دوسروں کو بھی دعوت دینے کا ملکہ ہو۔ دیکارٹ نے کہا ہے کہ مکمل داعی دنیا کی سب سے نادر مخلوقات میں سے ایک ہے۔ ہٹلر نے بھی اپنی سوانح عمری "میری جدوجہد" میں اسی قسم کی رائے کا اظہار کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے: ایک عظیم نظریہ ساز شاذونادر ہی ایک عظیم قائد ہوتا ہے۔ احتجاجی لیڈر ان خوبیوں کا اور بھی کم حامل ہوتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ایسا آدمی بہتر لیڈر ہو کیوں کہ قیادت کے لئے عوام کو حرکت میں لانے کی خصوصیت ضروری ہے۔ افکار پیدا کرنے کی صلاحیت، قائدانہ صلاحیت کے ساتھ کوئی قدر مشترک نہیں رکھتی۔ پیغمبر اسلام کی ذات میں دنیا نے اس نادر ترین مظہر کو بھی حقیقی وجود کی صورت میں دیکھ لیا۔ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات وہ ہے جس کا اظہار پروفیسر باسورتھ اسمتھ نے کیا ہے: "وہ ریاست اور چرچ (دینی تنظیم) دونوں کے سربراہ تھے، وہ ایک ساتھ پوپ اور قیصر دونوں تھے۔ لیکن وہ ایسے پوپ تھے، جو پوپ کے دعووں سے خالی تھا۔ وہ ایسے قیصر تھے جو قیصر کی فوجوں کے بغیر تھا۔ نہ ان کے پاس ہر وقت تیار کھڑی رہنے والی فوج تھی، نہ ذاتی حفاظتی کارکن نہ ہی محل، نہ ہی کوئی مقررہ ٹیکس کی آمدنی۔ اگر کسی کو کبھی یہ دعویٰ کرنے کا حق ہو کہ اس نے خدائی حق کے ذریعہ حکومت کی ہے، تو وہ محمد ہی ہوں گے، کیوں کہ ان کے پاس تمام اختیارات تھے، لیکن ان تمام ذرائع و وسائل کے بغیر جن سے وہ اختیارات حاصل کئے جاتے ہیں اور باقی رکھے جاتے ہیں۔ انھوں نے طاقت کے نمائش اور رکھ رکھاؤ کا کبھی خیال نہیں کیا۔ ان کی نجی زندگی کی سادگی ویسی ہی تھی جیسی ان کی عام زندگی۔"

مکہ فتح ہونے کے بعد ایک ملین مربع میل سے زیادہ زمین ان کے قدموں کے نیچے آگئی۔ پورے جزیرۂ عرب کا حکمراں ہونے کے باوجود وہ اپنے جوتے اور کھردرے اونی کپڑے خود ٹھیک کرتے تھے۔ بکریوں کو دوہتے تھے۔ زمین کو جھاڑو دیتے تھے۔ آگ جلاتے تھے اور خاندان کے چھوٹے چھوٹے کام کرتے تھے۔ مدینہ کا پورا شہر، جہاں آپ رہتے تھے، آپ کے آخری دنوں میں بہت مال دار ہوگیا تھا۔ ہر جگہ وہاں سیم و زر کی فراوانی تھی۔ لیکن خوش حالی کے ان دنوں میں بھی کئی کئی ہفتے اس طرح گزرتے تھے کہ جزیرۂ عرب کے حکمراں کے گھر میں آگ نہیں جلتی تھی۔ ان کا سارا کھانا ان دنوں میں پانی اور کھجور ہوتی تھی۔ پورا خاندان بہت سی راتوں کو بھوکا سوتا تھا کیوں کہ شام کو انھیں کھانے کو کچھ بھی میسر نہ ہو سکا تھا۔ ایک لمبے مشغول دن کے بعد وہ کسی نرم بستر پر نہیں سوتے تھے، بلکہ کھجور کے پتے کی بنی ہوئی چٹائی پر۔ راتوں کو وہ اکثر رو رو کر اپنے خالق سے دعا کرتے تھے کہ انھیں اپنے مشن کو پورا کرنے کی طاقت عطا فرمائے۔ روایتوں میں آیا ہے کہ ان کی آواز رونے کی وجہ سے ایسی ہو جاتی تھی جیسے کہ کوئی پتیلی آگ پر ہو اور اس کا ابلنا شروع ہو گیا ہو۔ ان کی موت کے دن ان کا سارا اثاثہ چند سکے تھے، جس کا کچھ حصہ قرضہ ادا کرنے کے لئے دے دیا گیا اور باقی ایک غریب کو دے دیا گیا جو ان کے گھر خیرات مانگنے آیا تھا۔ جس کپڑے

یں ان کی زندگی تمام ہوئی اس میں بہت سے پیوند لگے ہوئے تھے۔ وہ گھر جس سے ساری دنیا میں روشنی پھیلی، تاریک تھا کیونکہ اس کے پاس دیا جلانے کے لئے تیل نہیں تھا۔ حالات بدل گئے، لیکن اللہ کے پیغمبر نہیں بدلے۔ جیت میں اور ہار میں، حکمرانی میں یا بدحالی میں، فراوانی میں یا محتاجی میں وہ ایک ہی آدمی تھے۔ ہر حال میں ان کا سلوک ایک ہی تھا۔ جس طرح اللہ پاک کے طریقے اور قوانین ایک ہیں اسی طرح سے اللہ کے انبیاء بھی بدلنے والے نہیں ہوتے۔

۵

ایک ضرب المثل میں کہا گیا ہے کہ امانت دار آدمی اللہ کی بہترین مخلوق ہے۔ محمدؐ امانت دار سے بھی کچھ زیادہ تھے ان کے پور پور میں انسانیت رچی بسی ہوئی تھی۔ انسانی ہمدردی، انسان دوستی ان کی روح کی موسیقی تھی۔ ان کا مشن ہی یہ تھا کہ انسان کی خدمت کی جائے۔ انسان کو بلند کیا جائے، پاک کیا جائے، تعلیم دی جائے۔ دوسرے لفظوں میں انسان کو انسان بنایا جائے۔ یہی ان کی زندگی کا سارا مدعا تھا۔ ان کے خیالات، الفاظ اور اعمال سب کا مقصد انسانیت کی بہتری تھی۔

دکھاوا ان میں بالکل نہیں تھا اور وہ انتہائی حد تک بے غرض تھے۔ انھوں نے اپنے لئے کون سے مائٹیل چنے ؟ صرف دو : اللہ کا بندہ اور اس کا رسول۔ پہلے بندہ پھر رسول۔ وہ اسی طرح پیغمبر تھے، جس طرح دوسرے بہت سے پیغمبر تھے جو دنیا کے مختلف حصوں میں آچکے ہیں، جن میں بعضوں کو ہم جانتے تھے اور بعض دوسرے ہمارے لئے نامعلوم ہیں۔ اگر کوئی ان حقائق پر ایمان نہیں رکھتا ہے تو وہ مسلم نہیں باقی رہتا۔ اس بات پر ایمان ہر مسلم کے عقیدہ کا جزء ہے۔ ایک یوربین مؤلف نے لکھا ہے: "ان کے زمانے کے حالات اور ان کے پیروؤں کا آپ پر انتہائی حد تک اعتقاد کو دیکھتے ہوئے سب سے بڑی معجزانہ بات یہ ہے کہ محمدؐ نے کبھی معجزات پر قادر ہونے کا دعویٰ نہیں کیا"۔ محمدؐ سے معجزے بھی ہوئے، لیکن ان کا مقصد اپنے دین کا پروپیگنڈہ کرنا نہ تھا بلکہ انھوں نے ان معجزات کو صرف اللہ سے اور اللہ کے فہم و ادراک سے بالا طریقۂ کار سے منسوب کیا۔ وہ صاف کہتے تھے کہ دوسروں کی طرح وہ بھی ایک عام آدمی ہیں۔ وہ زمین و آسمان کے خزانوں کی ملکیت کا دعویٰ نہیں کرتے تھے، نہ ہی وہ غیب کو جاننے کا دعویٰ کرتے تھے۔ یہ سب اس وقت ہوا جب معجزات کو عام بات سمجھا جاتا تھا اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ کوئی بھی مقدس شخص چٹکیوں میں معجزات لا سکتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جزیرۂ عرب کے اندر اور باہر ہر جگہ مافوق الفطرت عقائد کی حکمرانی تھی۔ انھوں نے اپنے پیروؤں کی توجہ فطرت اور فطری قوانین پر غور کرنے کے لئے دلائی، تاکہ وہ اللہ کی عظمت کو صحیح طرح سے سمجھ سکیں۔ قرآن کا کہنا ہے: "آسمان اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کو ہم نے کھیل کے طور پر نہیں بنایا۔ ان کو ہم نے برحق پیدا کیا ہے۔ مگر اکثر لوگ نہیں جانتے" (دخان ۳۹-۳۸)

دنیا کوئی واہمہ نہیں ہے، نہ ہی دنیا بلا مقصد پیدا کی گئی ہے۔ دنیا برحق پیدا کی گئی ہے۔ قرآن کی وہ آیات جو فطرت کا مطالعہ کرنے کی دعوت دیتی ہیں وہ نماز، روزہ، حج وغیرہ کے بارے میں حکم دینے والی آیات کی مجموعی تعداد سے بھی زیادہ ہیں۔ قرآن کے اثر کے تحت مسلمانوں نے فطرت کا عمیق مطالعہ شروع کیا، اور اسی وجہ سے سائنسی مطالعہ اور تجربہ کا وہ مزاج پیدا ہوا جو کہ یونانیوں کے یہاں معدوم تھا۔ جبکہ مسلم ماہر نباتات ابن بیطار نے (علم نباتات) پر ساری دنیا کے پودے جمع کرکے ایک ایسی کتاب لکھی جس کو مئیر (Mayer) نے اپنی کتاب (Gesch der Botanika) میں "محنت کا مینار" بتایا ہے،

جب کہ البیرونی نے چالیس سال تک سفر کرکے معدنیات کے نمونے حاصل کئے، جبکہ مسلم علمائے فلکیات بارہ بارہ سال سے زیادہ کے مطالعوں کو مدون کر رہے تھے۔ ارسطو نے فزکس پر بغیر ایک بھی تجربہ کئے ہوئے قلم اٹھایا، طبعی تاریخ پر اس نے اتنی لاپرواہی سے لکھا کہ اس نے اس بات کی بھی ضرورت نہیں سمجھی کہ "انسان کے دانت جانور سے زیادہ ہوتے ہیں" کا دعویٰ کرنے سے پہلے اس کی تصدیق بھی کرلیتا جو کہ کتنا آسان کام تھا۔ جالینوس نے، جس کو قدیم علم تشریح کا سب سے بڑا استاد سمجھا جاتا ہے، لکھا ہے کہ نچلا جبڑا دو ہڈیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس بات کو صدیوں تک تسلیم کیا جاتا رہا یہاں تک کہ عبداللطیف نے انسانی ڈھانچہ کا مطالعہ کیا۔ اس قسم کے بہت سے واقعات بیان کرنے کے بعد رابرٹ بریفالٹ نے (The Making of History) میں لکھا ہے: "ہماری سائنس عربوں کی صرف اس حد تک مقروض نہیں ہے کہ انھوں نے حیرت انگیز دریافتیں کیں یا انقلابی نظریات کی بنیاد ڈالی۔ ہماری سائنس عرب تہذیب کی اس سے کہیں زیادہ مقروض ہے: وہ خود اپنے وجود کے لئے عرب تہذیب کی مقروض ہے۔" اسی مؤلف نے مزید لکھا ہے: "یونانیوں نے نظاموں کی بنیاد رکھی، عمومیات کا رواج دیا اور نظریات بنائے، لیکن تلاش کے صبر آزما طریقے، ایجابی معلومات کا جمع ہونا، سائنس کے دقیق طریقے، مفصل اور طویل تجربات، تجرباتی مطالعہ — یہ سب چیزیں یونانی مزاج کے لئے اجنبی تھیں۔ جس چیز کو ہم یورپ میں سائنس کہتے ہیں، وہ تلاش کے نئے طریقوں، تجربات، مطالعہ، وزن کرنے اور ریاضیات کی ترقی کی وجہ سے وجود میں آئی ہے اور یہ طور و طریقے یونانیوں کو معلوم نہ تھے۔ ... عربوں نے اس مزاج اور طور طریقوں کو یورپ میں روشناس کرایا۔"

پیغمبر محمدؐ کی تعلیمات کی عملی نوعیت نے ہی سائنسی اسپرٹ کو جنم دیا۔ ان کی تعلیمات نے روزمرہ کی محنت اور دنیاوی امور کو احترام و تقدس عطا کیا۔ قرآن کا کہنا ہے کہ اللہ نے انسان کو عبادت کرنے کے لئے پیدا کیا ہے۔ لیکن یہاں عبادت کا اپنا خاص مفہوم ہے۔ اسلام میں اللہ کی عبادت صرف نماز تک محدود نہیں ہے، بلکہ ہر وہ کام جو اللہ کی خوشنودی اور انسانیت کی بھلائی کے لئے کیا جائے وہ بھی عبادت ہی کا جزء ہے۔ زندگی کے تمام معاملات اسلام کی نظر میں تقدس کے حامل ہیں بشرطیکہ ان کو امانت داری، انصاف اور خالص نیت سے کیا جائے۔ اسلام نے "دینی" اور "غیر دینی" معاملات کی حدبندی کا خاتمہ کردیا۔ قرآن کا کہنا ہے کہ اگر تم پاک و طاہر غذا کھا کر اللہ کا شکر ادا کرو تو یہ بھی ایک عبادت ہے۔ پیغمبر اسلام کا کہنا ہے کہ اپنی بیوی کے منہ میں لقمہ رکھنا بھی ایک نیکی ہے جس کا بدلہ اللہ عطا کریں گے۔ پیغمبر کے ایک قول میں آیا ہے کہ "اگر کوئی اپنی دل کی خواہش کو بھی پورا کرے تو اللہ پاک اس کو اجر دے گا بشرطیکہ اس کو حاصل کرنے کے طریقے جائز رہے ہوں۔" یہ سن کر ایک صحابی نے کہا: اے اللہ کے رسول ایسا کرکے وہ انسان صرف اپنے دل کی خواہش کو پورا کر رہا ہے۔ پیغمبر نے فوراً جواب دیا: "اگر وہ اپنی خواہش پورا کرنے کے لئے کوئی غلط طریقہ اپناتا تو اس کو سزا ملتی، تو صحیح طریقہ اپنانے کی وجہ سے اسے انعام کیوں نہیں ملے گا۔"

دین کو پوری طرح سے زندگی کو بہتر بنانے کے لئے وقف ہونا چاہئے نہ کہ وہ صرف چند دنیوی زندگی سے ماورا امور سے متعلق ہو۔ دین کے اس نئے تصور نے نئی اخلاقی قدروں کو جنم دیا۔ پیغمبر اسلام کی تعلیمات کی ایک خاص بات یہ ہے کہ روزمرہ کی زندگی میں انسانیت کے مختلف امور پر اس کا اثر بہت قوی ہے۔ عوام پر اس کا گہرا اثر، حقوق و واجبات

ے تصورات کا تعین، جاہل وحشی اور عقل مند فلسفی دونوں کے لئے یکساں طور پر مناسب اور بدلنے کی صلاحیت رکھنے والا ہونا ان تعلیمات کی خصوصیات میں سے ہے۔

لیکن یہ بات ٹھیک سے ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ اچھے اعمال کی تاکید اعتقاد کی درستگی کو قربان کرکے نہیں کی گئی ہے۔ ایسے مدارس فکر بھی ہیں جو اعمال کو قربان کرکے متعینہ اعتقاد کی دعوت دیتے ہیں، یا اعتقاد کو قربان کرکے عمدہ اعمال کی دعوت دیتے ہیں، لیکن اسلام صحیح اعتقاد اور صحیح اعمال پر قائم ہے۔ وسائل اتنے ہی اہم ہیں جتنے نتائج۔ اور نتائج اتنے ہی اہم ہیں جتنے وسائل۔ ان دونوں کے درمیان زندہ وحدت ہے۔ دونوں ایک ساتھ زندہ ہیں اور نشوونما پاتے ہیں۔ اگر آپ ان دونوں کو الگ الگ کر دیں تو دونوں میں اضمحلال پیدا ہو جائے گا اور دونوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اسلام میں عقیدہ کا تعلق اعمال سے ختم نہیں کیا جا سکتا ہے۔ صحیح علم کو صحیح عمل میں تبدیل کرکے صحیح نتائج حاصل کئے جاتے ہیں ——— "جو ایمان لاتے ہیں اور اچھے اعمال کرتے ہیں وہی جنت میں داخل ہوں گے"——— یہ الفاظ قرآن میں بار بار کم از کم پچاس بار دہرائے گئے ہیں۔ غور و فکر کی ہمت افزائی کی گئی ہے، لیکن غور و فکر خود ایک مقصد نہیں ہے۔ اسلام کے دائرہ میں ان لوگوں کا وجود نہیں ہے جو اعتقاد تو رکھتے ہیں لیکن ان پر عمل نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں کا تصور بھی ناقابل فہم ہے جو ایمان تو رکھیں لیکن عمل غلط کریں۔ الٰہی قانون صرف معیاروں کا قانون نہیں، بلکہ محنت و عمل کا قانون ہے۔ الٰہی قانون نے انسان کے لئے دائمی ترقی کا راستہ بتایا ہے جس میں انسان علم سے عمل کی طرف اور عمل سے اطمینان کی طرف ترقی کرتا ہے۔

وہ صحیح اعتقاد کون سا ہے جس سے صحیح عمل خود بخود ابلتا ہے اور جس سے مکمل سکینت حاصل ہوتی ہے؟ یہ مرکزی اعتقاد توحید ہے۔ "خدا کے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے" کا اعتقاد ہی وہ محور ہے جس کے گرد اسلام کی ساری تعلیمات اور سارے اعمال گھومتے ہیں۔ خدا ہر طرح سے ایک نادر شے ہے، نہ صرف اپنے الٰہی وجود کی وجہ سے بلکہ اپنی الٰہی صفات کی وجہ سے بھی۔

ٹامس کارلائل نے لکھا ہے کہ اسلامی تعلیم کے مطابق ہماری ساری طاقت خدا کی اطاعت میں چھپی ہوئی ہے۔ چاہے وہ ہمارے ساتھ کچھ بھی کر رہا ہو، چاہے وہ موت یا موت سے بدتر کوئی چیز بھیج رہا ہو، وہ بہر حال ہمارے لئے اچھی ہے اور یوں ہم اپنے کو خدا کے سپرد کر دیتے ہیں۔ کارلائل مزید لکھتا ہے "گوئٹے کا کہنا ہے کہ اگر اسلام یہی ہے تو کیا ہم سب اسلام میں نہیں رہ رہے ہیں۔ ہاں ہم سب جو اخلاقی زندگی رکھتے ہیں اسلام ہی میں رہ رہے ہیں۔ یہ وہ سب سے بڑی حکمت ہے جو کہ اب تک آسمان نے زمین پر آشکارا کی ہے۔

نوٹ: یہ مضمون ایک انگریزی کتاب "محمد دی پرافٹ آف اسلام" کے کچھ اجزا کا ترجمہ ہے۔ یہ کتاب پروفیسر کے۔ ایس۔ راما کرشنا راؤ (ہیڈ ڈپارٹمنٹ آف فلاسفی، گورنمنٹ کالج فار ویمن، میسور) کی لکھی ہوئی اور بورڈ آف اسلامک پبلیکیشنز دہلی کی طرف سے پہلی بار ۱۹۷۹ میں شائع ہوئی ہے۔

MOHAMMAD:
ON TOP OF THE HUNDRED BESTS

(Mohammad) was the only man in history who was supremely successful on both the religious and the secular levels. Of humble origins, Mohammad founded and promulgated one of the world's greatest religions and became an immensely effective political leader. Today, thirteen centuries after his death, his influence is still powerful and pervasive. The Bedouine tribesmen of Arabia had been no match for the larger armies of the kingdomes in the settled agricultural areas to the north. However, unified by Mohammad for the first time in history, and inspired by their fervent belief in the one true God, these small Arab armies now embarked upon one of the most astonishing series of conquests in human history. For a while, it must have seemed that the Muslims would overwhelm all of Christian Europe. However, in 732, at the famous battle of Tours, a Muslim army which had advanced into the centre of France, was at last defeated by the Franks. Nevertheless, in a scant century of fighting, these Bedouin tribesmen,, inspired by the word of the prophet, had carved out an empire stretching from the borders of India to the Atlantic ocean—the largest empire that the world had yet seen. Of many important historical events, one might say that they were inevitable and would have occured even without the particular political leader who guided them. But this cannot be said of the Arab conquests. Nothing similar had occured before Mohammad, and there is no reason to believe that the conquests would have been achieved without him We see then, that The Arab conquests of the seventh century have continued to play an important role in human history, down to the present day. It is this unparalleled combination of secular and religious influence which I feel entitles Mohammad to be considered the most influential single figure in human history.

Dr. Michael H. Hart, The 100, New York 1978.

آپ سب سے بڑے تھے

میرا یہ انتخاب کہ محمدؐ دنیا کی تمام انتہائی باا ثر شخصیتوں میں سرفہرست ہیں، کچھ قارئین کو اچنبھے میں ڈال سکتا ہے۔ کچھ اور لوگ اس پر معترض ہوسکتے ہیں۔ مگر محمد تاریخ کے واحد شخص تھے جنھوں نے اعلیٰ ترین کامیابی حاصل کی، مذہبی سطح پر بھی اور دنیادی سطح پر بھی۔ محمدؐ نے معمولی حیثیت سے آغاز کرکے ایک عظیم ترین مذہب کی بنیاد رکھی اور اس کو پھیلایا۔ وہ انتہائی موثر سیاسی لیڈر بن گئے۔ ان کی وفات کے تیرہ صدیوں بعد آج بھی ان کے اثرات غالب اور طاقتور ہیں۔

اس کتاب میں جن اہم تاریخی شخصیتوں کا انتخاب کیا گیا ہے، ان کی اکثریت اس خوش قسمتی کی مالک تھی کہ وہ تہذیب کے مرکزوں میں پیدا ہوئی اور وہاں پلی بڑھی۔ وہ ایسی قوموں کے فرد تھے جن میں اعلیٰ تمدن تھا یا ان کو سیاسی مرکزیت حاصل تھی۔ مگر محمد ۵۷۰ء میں مکہ کے شہر میں پیدا ہوئے جو جنوبی عرب میں واقع تھا اور اس وقت دنیا کا ایک پس ماندہ علاقہ سمجھا جاتا تھا۔ تجارت، آرٹ اور علم میں اس کو کوئی مرکزیت حاصل نہ تھی۔ چھ سال کی عمر میں یتیم ہوکر ان کی پرورش ایک معمولی ماحول میں ہوئی۔ اسلامی روایات مزید بتاتی ہیں کہ وہ بے پڑھے لکھے تھے۔ ان کی اقتصادی حالت ۲۵ سال کی عمر میں صرف اس وقت بہتر ہوئی جب کہ انھوں نے ایک دولت مند بیوہ سے شادی کی جن کی عمر ۴۰ سال تھی۔ تاہم چالیس سال کی عمر تک بظاہر کوئی ایسی علامت نہ تھی کہ وہ کوئی ممتاز شخصیت کے انسان ہیں۔

بیشتر عرب اس وقت آسمانی کتاب سے محروم تھے۔ وہ بہت سے دیوتاؤں پر عقیدہ رکھتے تھے۔ تاہم مکہ میں محدود تعداد میں کچھ یہودی اور عیسائی تھے۔ محمدؐ نے سب سے پہلے انھیں سے واحد اور قادر مطلق خدا کا تصور لیا جو تمام کائنات کا حکمراں تھا۔ جب ان کی عمر چالیس سال کی ہوئی تو محمدؐ کو یقین ہوگیا کہ یہ ایک سچا خدا (اللہ) ان سے کلام کر رہا ہے۔ اور اس نے سچے مذہب کی تبلیغ کے لئے ان کا انتخاب کر لیا ہے۔

تین سال تک محمدؐ صرف اپنے قریبی دوستوں اور متعلقین پر تبلیغ کرتے رہے۔ پھر تقریباً ۶۱۳ء میں انھوں نے عوام میں تبلیغ شروع کی۔ دھیرے دھیرے لوگوں نے ان کے مذہب کو قبول کرنا شروع کیا تو مکہ کے سرداران کو اپنے لئے ایک خطرناک مصیبت سمجھنے لگے۔ ۶۲۲ء میں محمدؐ کو اپنی حفاظت کا خطرہ محسوس ہونے لگا اور وہ مدینہ چلے گئے جو مکہ کے شمال میں تقریباً ۲۰۰ میل کے فاصلہ پر واقع تھا۔ یہاں ان کو قابل لحاظ سیاسی طاقت کی حیثیت حاصل ہوگئی۔

یہ ہجرت پیغمبر کی زندگی میں ایک نقطۂ انقلاب تھا۔ مکہ میں ان کے ساتھیوں کی تعداد صرف چند تھی۔ مدینہ میں ان کے ساتھیوں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ انھوں نے جلد اتنا اثر پیدا کر لیا کہ عملاً وہ مدینہ کے مطلق حکمراں بن گئے۔ اگلے چند سال میں، جب کہ محمدؐ کے ساتھیوں کی تعداد تیزی سے بڑھی، مدینہ اور مکہ کے درمیان جنگوں کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا یہ جنگ ۶۳۰ء میں ختم ہوئی جب کہ محمدؐ دوبارہ فاتح کی حیثیت سے مکہ میں داخل ہوئے۔ ان کی زندگی کے بقیہ ڈھائی سالوں میں عرب قبیلے بہت تیزی سے ان کے نئے مذہب میں داخل ہوگئے۔ ۶۳۲ء میں جب محمدؐ کا انتقال ہوا تو وہ تمام جنوبی عرب کے حکمراں بن چکے تھے۔

عرب کے بدو قبائل ماضی سے سخت جنگ جو چلے آرہے تھے۔ مگر ان کی تعداد کم تھی اور وہ اختلاف اور باہمی لڑائیوں کے نتیجہ میں برباد ہو رہے تھے۔ وہ شمالی عرب کے زرعی علاقوں میں آباد شہنشاہیتوں کی بڑی فوجوں سے کوئی نسبت نہ رکھتے تھے۔ تاہم محمدؐ نے پہلی بار ان کو منظم کیا۔ ایک خدا پر پُرجوش اعتقاد سے مسلح ہو کر یہ چھوٹی عرب فوجیں انسانی تاریخ کی سب سے حیرت ناک فتوحات کے لئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ عرب کے شمال مشرق میں ساسانیوں کی عظیم نو پارسی شہنشاہیت تھی عرب کے شمال جنوب میں بازنطینی یا مشرقی رومی شہنشاہیت تھی جس کا مرکز قسطنطنیہ تھا۔ عددی اعتبار سے عرب اپنے حریفوں کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہ رکھتے تھے۔ تاہم جنگ کے میدان میں پُرجوش عربوں نے بہت تیزی سے تمام میسوپوٹامیہ، شام اور فلسطین کو فتح کرلیا۔ ۶۴۲ میں مصر کو بازنطینی سلطنت سے توڑ لیا گیا۔ ایرانی فوجیں، ۶۳۷ میں قادسیہ اور ۶۴۲ میں نہاوند کی جنگوں میں پسپا کر دی گئیں۔

مگر یہ عظیم فتوحات، جو کہ محمدؐ کے قریبی ساتھیوں اور ابتدائی خلفاء ابوبکرؓ اور عمر بن الخطابؓ کی رہنمائی میں انجام پائیں، عرب پیش قدمیوں کی انتہا نہ تھیں۔ ۷۱۱ تک عرب فوجوں نے شمالی افریقہ سے لے کر بحر اٹلانٹک تک مکمل طور پہ فتح کرلیا تھا۔ یہاں سے وہ شمال میں مڑے اور آبنائے جبرالٹر کو پار کرتے ہوئے اسپین کی گاتھ سلطنت کو مغلوب کرکے اس پر قبضہ حاصل کرلیا۔

تھوڑی دیر کے لئے محسوس ہونے لگا کہ مسلمان تمام مسیحی یورپ پر قابض ہو جائیں گے۔ مگر ۷۳۲ میں تورس کی مشہور جنگ میں ایک مسلمان فوج، جو کہ فرانس کے مرکز تک پہنچ چکی تھی، بالآخر فرانسیسیوں کے ہاتھوں شکست کھا گئی۔

تاہم ان بدو قبائل نے، جو کہ پیغمبرؐ کی تعلیمات سے متاثر تھے، ایک صدی کی قلیل مدت میں ایک ایسی سلطنت قائم کرلی جو ہندستان کی سرحدوں سے لے کر بحر اٹلانٹک کے ساحل تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ اتنی بڑی سلطنت تھی جیسی سلطنت اس سے پہلے تاریخ نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ تمام ممالک جو عربوں نے فتح کئے، ہر جگہ بہت بڑے پیمانہ پر لوگوں نے نئے مذہب کو قبول کرلیا۔

یہ تمام فتوحات مستقل ثابت نہ ہو سکیں۔ ایرانی اگرچہ پیغمبرؐ کے مذہب پر قائم رہے، تاہم انھوں نے عربوں کے اقتدار سے آزادی حاصل کرلی۔ اسپین میں سات سو سال کی جنگوں کے بعد آخرکار عیسائیوں نے پورے جزیرہ نما کو دوبارہ فتح کرلیا۔ تاہم میسوپوٹامیہ اور مصر جو کہ قدیم تہذیب کے گہوارہ رہے ہیں، بدستور عرب باقی رہے اور اسی طرح شمالی افریقہ کا پورا ساحلی علاقہ بھی۔ نیا مذہب، بلاشبہ درمیانی صدیوں میں مسلمانوں کی ابتدائی مقبوضہ سرحدوں سے بہت آگے تک پھیلتا رہا۔ آج اس کے ماننے والوں کی تعداد افریقہ اور وسط ایشیا میں دسیوں ملین ہے اور پاکستان اور شمالی ہندوستان اور انڈونیشیا میں اور بھی زیادہ ہے۔ انڈونیشیا میں اسلام ایک اتحادی عامل ثابت ہوا ہے۔ تاہم برصغیر ہند میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان کشاکش اتحاد کے راستہ میں ایک بڑی رکاوٹ رہی ہے

اب اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ محمدؐ کے اثرات مجموعی طور پر انسانی تاریخ کے اوپر کیا ہیں۔ تمام مذاہب کی طرح اسلام اپنے پیروؤں کی زندگی کو غیر معمولی طور پر متاثر کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے تمام بڑے مذاہب کے بانیوں نے

ہماری اس کتاب میں نمایاں طور پر جگہ پائی ہے۔ چوں کہ عیسائی سرسری اندازہ کے مطابق، دنیا میں مسلمانوں کے مقابلہ میں تقریباً دگنی تعداد میں ہیں۔ ابتدائی طور پر یہ بات عجیب معلوم ہوگی کہ محمدؐ کو ہم نے اس کتاب میں مسیحؑ سے اوپر رکھا ہے۔ ہمارے اس فیصلہ کے دو بڑے وجوہ ہیں۔ اول محمدؐ نے اسلام کی ترقی میں اس سے کہیں زیادہ اہم حصہ ادا کیا ہے جتنا مسیحؑ نے عیسائی مذہب کی ترقی کے لئے کیا ہے۔ مسیحیت کی بنیادی اخلاقیات، جس حد تک وہ یہودیت سے مختلف ہیں، ان کی تعلیم اگرچہ حضرت مسیح نے دی۔ مگر مسیحی الٰہیات کا وضع کرنے والا اصلاً سینٹ پال ہے۔ وہی اس کا اصل مبلغ ہے اور عہد نامہ جدید کے بڑے حصہ کا مصنف بھی۔

مگر اسلام کی الٰہیات اور اس کے بنیادی اخلاقی اصول دونوں کو دینے والے خود محمدؐ تھے۔ مزید یہ کہ نئے مذہب کی تبلیغ میں انھوں نے کلیدی حصہ ادا کیا اور اسلام کے مذہبی اعمال کو قائم کیا۔ پھر وہی ہیں جو کہ مسلمانوں کی مقدس کتاب قرآن کے مصنف ہیں، جو کہ محمدؐ کے کچھ واردات قلب کا ریکارڈ ہے اور جس کی بابت ان کا یقین تھا کہ وہ براہ راست خدا کی طرف سے ان پر الہام کیا گیا ہے۔ ان الہامات کا اکثر حصہ محمدؐ کی زندگی ہی میں صحت کے ساتھ لکھ لیا گیا تھا اور ان کی وفات کے جلد ہی بعد ان کو ایک مستند مجموعہ کی صورت میں مرتب کر لیا گیا۔ اس لئے قرآن قریبی طور پر محمدؐ کے خیالات اور تعلیمات کی نمائندگی کرتا ہے اور بڑی حد تک ان کے بولے ہوئے اصل الفاظ کا بھی۔ مسیحؑ کی تعلیمات کے بارے میں اس قسم کا تفصیلی مجموعہ موجود نہیں۔ قرآن چوں کہ مسلمانوں کے لئے اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ بائبل مسیحیوں کے لئے۔ اس لئے قرآن کے واسطے سے مسلمانوں کے اوپر محمدؐ کا اثر غیر معمولی رہا ہے۔ اغلب ہے کہ محمدؐ کے اضافی اثرات اسلام پر اس سے بہت زیادہ ہوں جتنا کہ مسیحؑ اور سینٹ پال کا مجموعی اثر مسیحیت پر۔ البتہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خالص مذہبی سطح پر محمدؐ کے اثرات انسانی تاریخ پر اتنے ہی ہیں جتنے مسیحؑ کے ہیں۔ مزید یہ کہ محمدؐ (بمقابلہ مسیحؑ کے) دنیاوی لیڈر بھی تھے اور مذہبی لیڈر بھی۔ درحقیقت عرب فتوحات کے پیچھے قوت محرکہ کی حیثیت سے ان کو تمام زمانوں میں سب سے زیادہ بااثر سیاسی لیڈر کہا جا سکتا ہے۔

اکثر اہم تاریخی واقعات کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ناگزیر تھے اور جس خاص سیاسی لیڈر نے اس کی رہنمائی کی، اس کے بغیر بھی وہ وقوع میں آتے۔ مثال کے طور پر، جنوبی امریکہ اس وقت بھی اسپین سے آزادی حاصل کر لیتا اگر سائمن بولیور کا سرے سے وجود نہ ہوتا۔ مگر یہی بات عرب فتوحات کے بارے میں نہیں کہی جا سکتی۔ محمدؐ سے پہلے عرب میں اس قسم کا کوئی واقعہ ظہور میں نہیں آیا۔ اور یہ یقین کرنے کی کوئی بنیاد نہیں ہے کہ ان کے بغیر بھی یہ فتوحات حاصل ہوتیں۔ انسانی تاریخ میں اس سے ملتی جلتی فتوحات صرف منگولوں کی ہیں جو انھوں نے تیرھویں صدی میں حاصل کیں۔ یہ فتوحات بنیادی طور پر چنگیز خاں کے اثر سے ہوئیں۔ تاہم یہ فتوحات عربوں کی فتوحات سے وسیع تر ہونے کے باوجود مستقل قائم نہ رہ سکیں اور آج منگولوں کے پاس صرف وہی علاقے ہیں جو ان کے پاس چنگیز خاں سے پہلے تھے۔

عربوں کی فتوحات کا معاملہ بالکل مختلف ہے، عراق سے مراکش تک عرب قوموں کا ایک پورا سلسلہ پھیلا ہوا ہے جو نہ صرف اسلام میں اپنے عقیدہ کی وجہ سے متحد ہیں بلکہ عربی زبان، تاریخ اور کلچر بھی سب کا ایک ہے۔ مسلم مذہب میں قرآن

کی مرکزیت اور یہ واقعہ کہ وہ عربی زبان میں لکھا گیا ہے، اس نے غالباً عربی کو اس سے بچایا ہے کہ وہ مختلف اور ایک دوسرے کے لئے ناقابل فہم زبانوں میں تقسیم ہو جائے۔ حالاں کہ درمیانی تیرہ صدیوں میں ایسا ہوتا بالکل قرین قیاس تھا۔ عرب ریاستوں میں اختلاف اور تقسیمیں یقیناً موجود ہیں اور وہ قابل لحاظ ہیں، مگر جزئی عدم اتحاد کو دیکھ کر ہمیں اتنا اندھا نہیں ہونا چاہیئے کہ ہم ان اہم اتحادی اجزاء کو نہ دیکھیں جو مسلسل ان کے درمیان پائے جارہے ہیں۔ مثال کے طور پر ۱۹۷۳-۷۴ کی سردیوں میں عربوں نے تیل کا بائیکاٹ کیا تو ایران اور انڈونیشیا اس میں شریک نہیں ہوئے۔ مگر یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ تمام عرب ریاستیں اور صرف عرب ریاستیں اس منصوبہ میں شریک ہوئیں۔

ہم دیکھ رہے ہیں کہ ساتویں صدی میں عربوں کی فتوحات انسانی تاریخ میں مسلسل اہم حصہ ادا کر رہی ہیں۔ یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ مذہبی اور دنیاوی اثرات کا یہی بے نظیر اجتماع ہے جو میری نظر میں محمد کو اس لائق بناتا ہے کہ ان کو تاریخ کا سب سے زیادہ با اثر واحد شخص قرار دیا جائے۔ (انگریزی سے ترجمہ)

یہ مضمون مائیکل ہارٹ (پیدائش ۱۹۳۲) کی کتاب ایک سو (The 100) سے ماخوذ ہے۔ مصنف ایک امریکی عالم فلکیات ہیں اور اسی کے ساتھ مورخ بھی۔ انھوں نے اور ان کی اعلیٰ تعلیم یافتہ بیوی نے مل کر دنیا کی مشہور شخصیتوں کا مطالعہ کیا ہے۔ اس مطالعہ کا حاصل انھوں نے ۵۷۲ صفحات کی ایک انگریزی کتاب کی صورت میں پیش کیا ہے۔ اس کتاب میں ایک سو ایسے آدمیوں کے حالات درج ہیں جنھوں نے مصنف کے نزدیک تاریخ پر نمایاں ترین اثرات ڈالے۔ کتاب میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو سرفہرست رکھا گیا ہے۔ کیوں کہ مصنف کے مطالعہ کے مطابق وہ تاریخ کے سب سے بڑے انسان ہیں۔ انسانی تاریخ پر آپ نے جو اثرات ڈالے وہ کسی دوسرے واحد شخص نے نہیں ڈالے۔ اس کتاب میں نمبر ۳ پر حضرت مسیحؑ، نمبر ۱۶ پر حضرت موسیٰؑ اور نمبر ۵۱ پر حضرت عمر بن الخطابؓ کو رکھا گیا ہے۔ یہاں کتاب کے اس حصہ کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق ہے۔

کتاب میں اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو غیر معمولی خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔ تاہم طریق مطالعہ کے اعتبار سے اس میں وہ خامیاں موجود ہیں جو غیر مسلم سیرت نگاروں کے یہاں اکثر پائی جاتی ہیں۔ مثلاً یہ کہنا کہ آپ نے ابتداءً یہودیوں اور عیسائیوں سے توحید کا تصور لیا۔ یا یہ کہ آپ قرآن کے مصنف تھے۔ یہ باتیں نہ صرف ہمارے عقائد کے خلاف ہیں بلکہ خالص علمی پہلو سے بھی بالکل بے بنیاد ہیں اور ان کے رد میں اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ان مزعومات کے علمی اور تاریخی طور پر باطل ثابت ہونے کے باوجود مغربی علماء کیوں انھیں دہراتے رہتے ہیں۔ اس کی وجہ ان کا مخصوص ذہن ہے، وہ "علم" کے کسی غیر زمینی ماخذ کو نہیں مانتے۔ اس لئے ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک شخص نے زمین سے ماوراء کسی ذریعہ سے کیسے علم حاصل کر لیا۔ جب آدمی کے ذہن میں کوئی بات بیٹھ جائے تو اس کے خلاف کوئی بات، خواہ وہ کتنی ہی مدلل ہو، اس کے ذہن کی پکڑ میں نہیں آتی۔ وہ اپنی بات کو اس طرح دہراتا رہتا ہے جیسے کہ وہ بدستور ایک مسلمہ صداقت ہے۔ خواہ اس کو کتنے ہی معقول دلائل سے رد کیا جا چکا ہو۔ (مترجم)

شکار کرنے والے

کرنل جے پال نے اپنی شکاری یادداشتوں پر ایک کتاب شائع کی ہے جس کا نام ہے عظیم شکار:

Great Hunt, Lt. Col. Jaipal, Carlton Press, New York 1982

جم کاربٹ (Jim Corbett) ایک شکاری تھا، وہ شیر کو گولی مار کر ہلاک کرنے سے خاص دلچسپی رکھتا تھا، تاہم اپنے اس قاتلانہ فعل کے لئے اس کے پاس ایک خوبصورت توجیہہ تھی۔ "میں گاؤں والوں کو مردم خور شیروں سے بچانے کے لئے ان کا شکار کرتا ہوں" اسی طرح اکثر شکاریوں کے پاس اپنے وحشیانہ کھیل کی خوبصورت تاویلات موجود ہوتی ہیں۔ مگر کرنل جے پال کو اس قسم کی فرضی توجیہات تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ انھوں نے صفائی کے ساتھ اس بات کو تسلیم کر لیا ہے جس کو دوسرے لوگ صفائی کے ساتھ تسلیم نہیں کرتے۔

کرنل جے پال کے لئے گھڑیال کو مارنا ایک پسندیدہ کھیل تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ وہ منظر بڑا دلچسپ ہوتا تھا جب کہ میں گھڑیال کے پیچھے رینگ کر چلتا۔ پھر کبھی گھڑیال چھپ سے پانی میں کود پڑتا۔ اور جب اس کو گولی لگتی تو وہ عجیب طریقے سے اپنی دم پٹکتا اور اپنا منھ کھول دیتا یہ سب چیزیں مجھ کو بڑی عجیب قسم کی پُرجوش مسرت دیتی تھیں:

All this gave me quite a lot of thrills

انسان کے مزاج میں یہ بات داخل ہے کہ وہ دوسرے کی گھات میں لگے۔ وہ دوسرے کو ستانے کے منصوبے بنائے اور جب دوسرے کو ستانے میں کامیاب ہو جائے تو اپنی کامیابی پر خوشی کے قہقہے لگائے۔ یہی مزاج انسان کے امتحان کا اصل پرچہ ہے۔ جو اپنے اس مزاج سے مغلوب ہو کر اپنے بھائی کا شکار کرنے لگے وہ جہنمی ہے اور جو شخص اپنے اس مزاج پر قابو پا لے اور دنیا میں اس طرح رہے کہ وہ دوسرے انسانوں کے لئے رحمت بنا ہوا ہو وہی وہ شخص ہے جس کے لئے آخرت میں جنت کے دروازے کھولے جائیں گے۔

موت کا حملہ

سکندر اعظم (۳۲۳ - ۳۵۶ ق م) یونانی بادشاہ فلپ کا لڑکا تھا۔ اس نے تخت ملنے کے بعد دس سال کی مدت میں اس زمانہ کی معلوم دنیا کا بیشتر حصہ فتح کر ڈالا۔ مصر کا شہر اسکندریہ اس کے فتح مصر کی یادگار کے طور پر اب بھی موجود ہے۔ مگر بالآخر اس کا انجام کیا ہوا۔ وہ عراق کے قدیم شہر بابل کے ایک محل میں اسی طرح بے بسی کے ساتھ مر گیا جس طرح ایک غریب اور کمزور آدمی اپنی جھونپڑی میں مرتا ہے۔ اس نے اپنی زندگی میں جو چاہا وہ پایا اور پھر سب کچھ پاکر خالی ہاتھ اس دنیا سے چلا گیا۔ اس کی وسیع سلطنت اس کے مرنے کے بعد اس کے تین فوجی سرداروں میں تقسیم ہو گئی، کیونکہ اس کا واحد بیٹا اس کی زندگی ہی میں قتل کیا جا چکا تھا۔

سکندر کی عظمت کا یہ حال تھا کہ جولیس سیزر ایک بار اسپین میں سکندر کے مجسمہ کے سامنے سے گزرا تو اس کو دیکھ کر وہ بے اختیار رونے لگا۔ اس نے کہا کہ سکندر نے جو فاتحانہ کارنامے دس برس کی مدت میں انجام دئے اس کا دسواں حصہ بھی میں اب تک انجام نہ دے سکا۔

سکندر مخالفت کو بالکل برداشت نہیں کرتا تھا۔ اس کا نظریہ تھا کہ مخالفت شروع ہوتے ہی اس کو فوراً کچل دینا چاہئے۔ کہا جاتا ہے کہ سکندر کی غیر معمولی فتوحات کا باعث اس کی برق رفتاری تھی۔ اچانک پہنچ کر دشمن کو دبوچ لینے کی صلاحیت اس کے اندر دنیا کے تمام جنرلوں سے زیادہ تھی۔ مگر موت اس سے بھی زیادہ تیز رفتار ثابت ہوئی۔ ۱۳ جون ۳۲۳ ق م کو جب موت اس کے اوپر حملہ آور ہوئی تو اس کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اپنے آپ کو بالکل بے بسی کے ساتھ موت کے حوالے کر دے۔

موت اس لئے آتی ہے کہ وہ انسان کو بتائے کہ وہ خدا کے آگے کس قدر بے بس ہے۔ آدمی ہر روز اپنے چاروں طرف موت کے واقعات کو دیکھتا ہے مگر وہ اس سے کوئی سبق نہیں لیتا۔ وہ زندگی کی اس سب سے بڑی حقیقت کو بھولا رہتا ہے، یہاں تک کہ موت آکر اس سے خود اس مہلت کو چھین لیتی ہے کہ وہ سوچے اور اس سے سبق لے۔ موت آدمی کے لئے سب سے بڑا سبق ہے۔ مگر موت سے آدمی سب سے کم جو چیز لے رہا ہے وہ یہی ہے۔

چھت کے لئے فرش

ایک شخص کا قول ہے کہ سر کے اوپر چھت ہونے کے لئے ضروری ہے کہ تمھارے پیروں کے نیچے ایک فرش موجود ہو :

To have a roof over your head you need a floor under your feet

چھت اوپر ہوتی ہے مگر وہ ہمیشہ نیچے کے فرش کے اوپر کھڑی ہوتی ہے۔ اگر فرش نہ ہو تو چھت کھڑی کرنا بھی ممکن نہیں۔ یہی معاملہ زندگی کا ہے۔ آپ کو پہلے نیچے کی زمین تیار کرنی ہوگی، اس کے بعد ہی آپ اوپر کی ترقیوں کے مالک بن سکتے ہیں۔

فرینکلن کا قول ہے "ٹوٹی ہوئی کشتی کو ساحل کے قریب ہی رہنا چاہئے"۔ اگر آدمی اس حقیقت کا لحاظ نہ کرے کہ اس کی کشتی ٹوٹی ہوئی ہے اور جوش میں آکر اپنی کشتی کو بیچ سمندر میں ڈال دے تو ایسا جوش ہمیشہ الٹا پڑے گا۔ وہ اس کی کشتی کو بھی ڈبائے گا اور خود اس کو بھی۔ اگر آپ کی کشتی ٹوٹی ہوئی ہے تو آپ یا تو ساحل پر رہئے جہاں پانی بھی کم ہوتا ہے اور خطرہ کے وقت بچاؤ کی تدبیر بھی قریب ہی مل جاتی ہے۔ اور اگر آپ ساحل پر رہنے پر قانع نہیں ہیں تو پہلے اپنی کشتی کو درست کیجئے۔ ایسی حالت میں آپ کے عمل کا آغاز لازماً کشتی کو درست کرنے سے ہونا چاہئے نہ کہ ساحل کو چھوڑ کر پانی کے منجدھار میں داخل ہو جانے سے۔

اس اصول کا تعلق زندگی کے ہر معاملے سے ہے۔ اگر آپ ایک مکان بنانا چاہتے ہیں تو پہلے آپ کے پاس تعمیر کا ضروری سامان ہونا چاہئے۔ اگر آپ کسی زبان میں ایک اخبار نکالنا چاہتے ہیں تو اس زبان میں اخبار پڑھنے والوں کی ایک بڑی تعداد ہونی چاہئے۔ اگر آپ الکشن میں حصہ لینا چاہتے ہیں تو آپ کے حلقۂ انتخاب میں ایسے ووٹر ہونے چاہئیں جو آپ کو ووٹ دیں۔ ابتدائی بنیاد کے بغیر کوئی بھی کام نہیں کیا جاسکتا، خواہ وہ فرد سے متعلق ہو یا قوم سے متعلق۔

ایک پرانی کہاوت ہے "خود کو بدل دو، قسمت اپنے آپ بدل جائے گی" اس کا مطلب یہ ہے کہ مصیبت کا سبب آدمی کے اندر ہوتا ہے نہ کہ اس کے باہر۔ آدمی اگر سوچے کہ جو مسئلہ پیدا ہوا ہے اس کا اصل سبب کہاں ہے تو معلوم ہوگا کہ اس کا سبب اس کی اپنی کوتاہی ہے۔ جب ناکامی کا اصل سبب اپنی کوتاہی ہے تو دوسرے کے خلاف شور وغل کرنے سے کیوں کر ایسا ہو سکتا ہے کہ ناکامی کامیابی میں

تبدیل ہو جائے۔

ایک شخص نے دکان کھولی۔ اس کی دکان چلی نہیں۔ یہاں تک کہ دیوالیہ پن کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ ایک روز اس کے دوست نے کہا "تمھاری دکان اس لئے نہیں چل رہی ہے کہ تمھارے گاہکوں کو پاس کا دکان دار توڑ لیتا ہے"۔ یہ سن کر دکان دار بولا "تم غلط کہتے ہو، میرے گاہک کو دوسرا دکان دار توڑتا ہے تو میں دوسرے دکان دار کے گاہک کو کیوں نہیں توڑ لیتا" دکان دار نے معاملہ کو گہرائی کے ساتھ دیکھا۔ وہ سوچنے لگا کہ آخر میری ناکامی کا بنیادی سبب کیا ہے۔ وہ اس رائے پر پہنچا کہ اس کی ناکامی کا بنیادی سبب یہ ہے کہ وہ گاہکوں کے ساتھ خوش اخلاقی سے بات نہیں کرتا۔ اس نے طے کر لیا کہ وہ اپنی اس کمزوری کو دور کرے گا۔

اس نے اپنے اوپر قابو پانا شروع کیا۔ اب کوئی گاہک اس کی دکان پر آتا تو وہ نہایت میٹھے انداز میں بولنے کی کوشش کرتا۔ دھیرے دھیرے اس کا بولنے کا انداز بدل گیا اور اسی کے ساتھ اس کی دکان کی حالت بھی۔ اس نے جب یہ کیا کہ اپنے اندر کی بنیادی کمزوری دور کر لی تو بقیہ کمیاں اپنے آپ دور ہوتی چلی گئیں۔

حواس نہ کھوئیے

"اعتماد زندگی ہے اور بے اعتمادی موت"۔ پرم ہنس کے اس قول کی تشریح ملکۂ برطانیہ کے ایک واقعہ سے بہت اچھی طرح ہوتی ہے۔

لندن میں بکنگھم پیلیس ملکۂ الزبتھ کی شاہی قیام گاہ ہے۔ ۱۳ جولائی ۱۹۸۲ کو یہ واقعہ ہوا کہ ایک اجنبی شخص ملکۂ برطانیہ کے سونے کے کمرے میں گھس گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹوٹی ہوئی ایش ٹرے تھی جو دھار دار آلے کا کام کر سکتی تھی۔ یہ امکانی طور پر ایک خطرناک ہتھیار تھا۔ ملکہ نے جب اچانک ایک غیر شخص کو ایسی حالت میں کمرے میں پایا تو ان کو خطرہ کا احساس ہوا۔ ملکہ کا ہاتھ فوراً مخصوص بٹن پر پہنچ گیا۔ یہ محل کی ایک خاص گھنٹی ہے جو خطرہ کے وقت حفاظتی عملہ کو خبردار کرنے کے لئے بجائی جاتی ہے۔ ملکہ نے بٹن بار بار دبائی مگر گھنٹی خاموش تھی۔ کسی سبب سے وہ بج نہ سکی۔

یہ بڑا نازک لمحہ تھا۔ ملکہ ایک تنہا خاتون کی حیثیت سے کمرے میں تھیں۔ دوسری طرف ایک طاقت ور مرد دھار دار آلہ لئے کھڑا تھا۔ ملکہ اگر آنے والے آدمی پر بگڑ جائیں یا اس کو نکل جانے کا زبانی حکم دیتیں

وہ فوراً غصہ میں آکر ٹوٹ پڑتا اور ملکہ کا کام تمام کر دیتا۔ مگر ملکہ نے حاضر دماغی سے کام لیا۔ انھوں نے
قوتوں کو سنبھالا اور آنے والے آدمی سے نرمی کے انداز میں بات شروع کر دی۔ ملکہ نے اجنبی آدمی
سگرٹ پیش کی اور اپنی ٹھنڈی باتوں سے اس کی توجہ دوسری طرف موڑ دی۔ انھوں نے نہ تو آدمی کو
بھلا کہا اور نہ محل کے اندر بلا اجازت گھس آنے پر کوئی تنبیہ کی۔ اس طرح انھوں نے اجنبی آدمی کو
س منٹ تک ادھر ادھر کی باتوں میں مشغول رکھا۔ اتنی دیر میں محل کے حفاظتی آدمی پہنچ گئے اور مذکورہ
ص گرفتار کر لیا گیا۔

ملکہ برطانیہ کی خود اعتمادی نے ان کو ایک بڑے خطرے سے بچا لیا۔ اگر وہ اعتماد کھو دیتیں تو شاید
دن برطانی قوم اپنی ملکہ کا ماتمی دن منانے کی تیاریاں کر رہی ہوتی۔

نازک وقت میں اپنے اعتماد کو بحال رکھنا اور اپنے دماغ کو حاضر رکھنا بے حد اہمیت رکھتا ہے
رہ کے وقت گھبرا اٹھنا اپنے معاملہ کو خود اپنے ہاتھوں بگاڑ لینا ہے۔ آدمی اگر حوصلہ نہ کھوئے اور اپنے
ش و حواس کو درست رکھے تو یقیناً وہ بچ جائے گا۔ اس کا دماغ ایسی تدبیر ڈھونڈنے میں کامیاب
جائے گا جو اس کو خطرے کے کنارے پہنچ کر بھی خطرہ سے بچا لے۔

ڈاکٹر ہیوگو کا قول ہے کہ احتیاط دانش مندی کی سب سے ہونہار اولاد ہے۔ حقیقت یہ
کہ زندگی کی بہت سی کامیابیوں کا تعلق محتاط عمل میں ہے نہ کہ پرجوش اقدام میں۔ عقل مندی کے بہت
پہلو ہیں اور اس میں شک نہیں کہ احتیاط اکثر اوقات سب سے بڑی عقل مندی ہوتی ہے۔ مگر احتیاط
طریقہ پر پوری طرح وہی شخص عمل کر سکتا ہے جو حالات کی شدت کے باوجود اپنے حواس کو بحال رکھے۔ جو
ی بھی صورت میں مغلوب الحال نہ ہو جائے۔

جب بھی آدمی کے ساتھ کوئی خلاف امید صورت پیش آتی ہے یا وہ کسی خطرہ میں گھر جاتا ہے
وہ جذبات سے مغلوب ہو کر بے سوچی سمجھی کارروائی شروع کر دیتا ہے۔ اس قسم کی کارروائی
ی کو مزید بربادی کے سوا کسی انجام تک نہیں پہنچاتی۔ اگر آدمی ہمت نہ ہارے اور گھبرائے بغیر اپنے
ل کا نقشہ بنائے تو وہ ہر مشکل صورت حال سے بآسانی باہر آ سکتا ہے۔ حتیٰ کہ شیکسپیئر (۱۶۱۶-۱۵۶۴)
الفاظ میں اکثر اوقات وہ مسکراہٹ سے وہ چیز حاصل کرے گا جس کو وہ تلوار کے ذریعہ حاصل نہیں
ر سکا تھا۔

ٹ: یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۱۶-۱۷ اگست ۱۹۸۲ کو نشر کی گئی۔

احیاءِ اسلام

مولانا وحید الدین خاں

موجودہ زمانہ میں اسلام کو زندہ کرنے کا طریقہ کیا ہے۔ اس سوال کے جواب میں پچھلی ایک صدی کے اندر ہزاروں کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مگر ان کتابوں کی بنیاد پر اٹھنے والی تحریکیں، غیر معمولی ترقی اور مقبولیت کے باوجود، اصل مقصد میں ناکام رہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کتابوں کا جواب صحیح نہ تھا۔

احیاء اسلام جدید تاریخ کی پہلی کتاب ہے جس میں آپ اس سوال کا حقیقی اور مدلل جواب پائیں گے۔

الاسلام اور ظہور اسلام (مولفہ مولانا وحید الدین خاں) کے بعد احیاء اسلام کا مطالعہ آپ کے لئے نہایت ضروری ہے۔

الاسلام	عصری اسلوب میں قرآن وحدیث کی تشریح
ظہور اسلام	عصری علوم اور تاریخ کی روشنی میں اسلام کا مطالعہ
احیاء اسلام	اسلام اور عہد حاضر کا مطالعہ۔ اور مستقبل کا پروگرام

قیمت بارہ روپے

مکتبہ الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی

تذکیر القرآن

جلد اوّل سورۂ فاتحہ ـ سورۂ توبہ

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی تفصیلات اور غیر متعلق معلومات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام وخواص دونوں کے لئے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبین قرآن کے لئے فہم قرآن کی کنجی ہے۔

ہدیہ مجلد: پچاس روپے

گھڑا پاپ کا پھوٹے گا
کالا دھندہ چھوٹے گا

- جیسے گھن لگ جانے سے کوئی ہرا بھرا پیڑ سوکھ کر ٹھونٹھ ہو جاتا ہے۔ ویسے ہی کالا دھن کسی ملک کی معیشت کو کھوکھلا کر ڈالتا ہے۔
- کالا دھن مہنگائی کی آگ میں تیل ڈالتا ہے۔ اس کی روک تھام میں ہی آپ کی بھلائی ہے۔
- کالے دھن سے نپٹنے کے لئے اشیائے ضروریہ کے قانون، چور بازاری کو روکنے اور اشیاء ضروریہ کی بہم رسانی کے قانون کو سختی سے لاگو کیا جا رہا ہے۔

اس سے سماج اور معیشت کو راحت ملے گی۔

تفصیلی معلومات کے لئے اس کوپن کا استعمال کریں

ڈپٹی ڈائریکٹر، ماس میلنگ یونٹ
ڈائرکٹوریٹ آف ایڈورٹائزنگ اینڈ وژول پبلسٹی
بی۔ بلاک، کستوربا گاندھی مارگ، نئی دہلی 110001
نے 20 نکاتی پروگرام سے متعلق معلوماتی کتابچہ اردو/ہندی/انگریزی میں بھیجیں۔

نام ______________
پتہ ______________
پن کوڈ ______________

نیا
20 نکاتی
پروگرام

davp 82/290

ثانی آتنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ سے شائع کیا

REGD.NO. D. (DN) 532 NOVEMBER 1982

AL-RISALA MONTHLY

JAMIAT BUILDING QASIMJAN STREET DELHI-110006 (INDIA) PHONE 232231

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

نمبر	کتاب	قیمت
۱-	تذکیر القرآن	۵۰-۰۰
۲-	الاسلام	۱۵-۰۰
۳-	مذہب اور جدید چیلنج	۱۵-۰۰
۴-	ظہور اسلام	۱۵-۰۰
۵-	دین کیا ہے ؟	۲-۰۰
۶-	قرآن کا مطلوب انسان	۵-۰۰
۷-	تجدید دین	۳-۰۰
۸-	اسلام دین فطرت	۳-۰۰
۹-	تعمیر ملت	۳-۰۰
۱۰-	تاریخ کا سبق	۳-۰۰
۱۱-	مذہب اور سائنس	۵-۰۰
۱۲-	عقلیات اسلام	۳-۰۰
۱۳-	فسادات کا مسئلہ	۲-۰۰
۱۴-	انسان اپنے آپ کو پہچان	۱-۰۰
۱۵-	تعارف اسلام	۲-۵۰
۱۶-	اسلام پندرھویں صدی میں	۲-۰۰
۱۷-	راہیں بند نہیں	۳-۰۰
۱۸-	دینی تعلیم	۳-۰۰
۱۹-	ایمانی طاقت	۳-۰۰
۲۰-	اتحاد ملت	۳-۰۰
۲۱-	سبق آموز واقعات	۳-۰۰
۲۲-	اسلامی دعوت	۳-۰۰
۲۳-	زلزلۂ قیامت	۴-۰۰
۲۴-	سچا راستہ	۱-۰۰
۲۵-	نار جہنم	۳-۰۰
۲۶-	باغ جنت	۳-۰۰
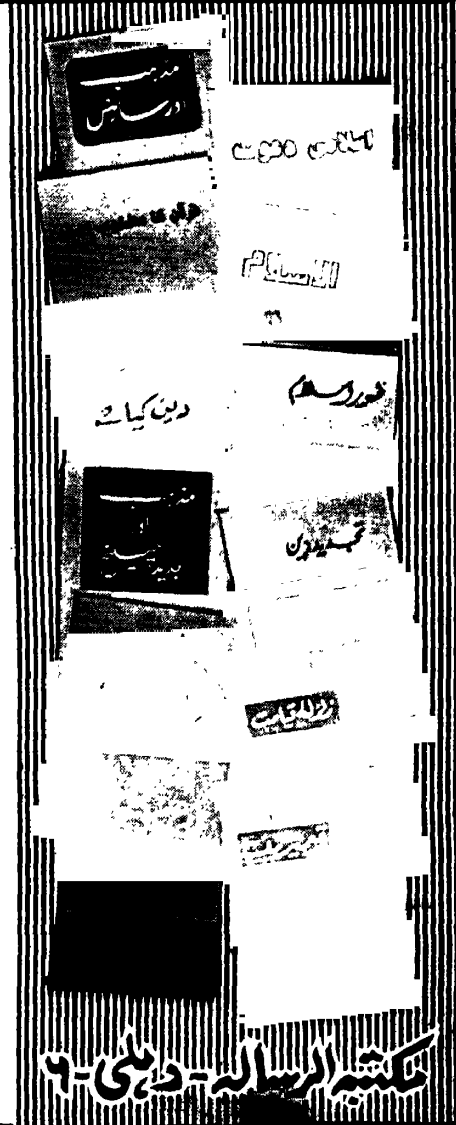
الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

دوسروں کو اپنی مصیبت کا ذمہ دار ٹھہرانے سے
نفرت اور مایوسی کا ذہن ابھرتا ہے ———
اور اپنے کو ذمہ دار ٹھہرانے سے عمل کرنے کا

دسمبر ۱۹۸۲ □ قیمت فی پرچہ — تین روپے □ شمارہ ۷۳

اسلامی مرکز کا ترجمان

الرسالہ

دسمبر ۱۹۸۲
شمارہ ۷۳

جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دھلی ۱۱۰۰۰۶ (انڈیا)

ضروری گزارش

پوسٹیج میں غیر معمولی اضافہ کی وجہ سے وی پی کے اخراجات بہت بڑھ گئے ہیں۔ ایسی حالت میں ایک غیر ضروری نقصان سے بچنے کی صورت یہ ہے کہ بذریعہ وی پی روانگی کو کم کیا جائے۔ جو لوگ پانچ سے لے کر دس پرچوں تک کی ایجنسی لئے ہوئے ہیں ان سے ہماری گزارش ہے کہ مندرجہ ذیل دو صورتوں میں سے کوئی ایک صورت اختیار کرکے ادارہ کے ساتھ تعاون فرمائیں۔

۱۔ ایک سال یا اس سے کم مدت کی رقم پیشگی روانہ فرمائیں تاکہ الرسالہ ان کے نام سادہ ڈاک سے بھیجا جا سکے۔

۲۔ ہم کو اجازت دیں کہ دو مہینے کا الرسالہ سادہ ڈاک سے بھیجنے کے بعد ہر تیسرے ماہ کا پرچہ وی پی سے اس طرح بھیجا جائے کہ اس میں تینوں مہینے کی رقم شامل کرکے یکجا طور پر وی پی کر دی جائے۔

منیجر ماہنامہ الرسالہ

زر تعاون سالانہ ۳۶ روپیہ • خصوصی تعاون سالانہ دو سو روپے • بیرونی ممالک سے ۲۰ ڈالر امریکی

مصلحین کو برداشت نہ کرنا

یہود کے اندر جب بگاڑ آیا تو ان کے درمیان خدا نے دینی مصلحین اٹھائے جو ان کی غلطیوں پر ٹوکتے تھے اور ان کو صحیح راستہ دکھاتے تھے مگر یہود نے ان مصلحین کو رد کر دیا۔ انھوں نے ان کو ہر قسم کی تکلیفیں پہنچائیں۔ حتی کہ انھیں قتل کر ڈالا۔ قرآن میں یہود کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ــــــ جو لوگ اللہ کی نشانیوں کا انکار کرتے ہیں اور پیغمبروں کو ناحق ہلاک کرتے ہیں اور ان لوگوں کو ہلاک کرتے ہیں جو انھیں انصاف کا حکم دیتے ہیں، تم انھیں دردناک عذاب کی خوش خبری دے دو۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا اور آخرت میں ضائع ہو گئے اور ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا (آل عمران ۲۲-۲۱)

یہود کی تاریخ بتاتی ہے کہ انھوں نے یسعیاہ نبی کا قتل کیا۔ یرمیاہ نبی کا قتل کیا۔ زکریا نبی کا قتل کیا۔ یحییٰ نبی کا قتل کیا۔ عیسیٰ مسیح کو بھی (اپنے خیال کی حد تک) قتل کر ڈالا۔ ایک حدیث ابن ابی حاتم اور ابن جریر نے ان الفاظ میں نقل کی ہے:

عن ابی عبیدۃ بن الجراح قال قلت: یا رسول اللہ ای الناس اشد عذابا یوم القیامۃ۔ قال رجل قتل نبیا او من امر بالمعروف ونھی عن المنکر۔ ثم قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا ابا عبیدۃ قتلت بنو اسرائیل ثلاثۃ واربعین نبیا من اول النھار فی ساعۃ واحدۃ۔ فقام مائۃ وسبعون رجلا من بنی اسرائیل فامروا من قتلھم بالمعروف ونھوھم عن المنکر فقتلوھم جمیعا من آخر النھار من ذلک الیوم (تفسیر ابن کثیر)

ابوعبیدہ بن جراح کہتے ہیں کہ میں نے کہا کہ اے خدا کے رسول، قیامت میں سب سے زیادہ سخت عذاب کس کو ہوگا۔ آپ نے فرمایا وہ شخص جس نے نبی کو قتل کیا یا اس کو جو بھلائی کا حکم دیتا تھا اور برائی سے روکتا تھا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے ابوعبیدہ یہود نے ایک صبح کو ایک وقت میں ۴۳ نبیوں کو قتل کیا۔ اس کے بعد ایک سو ستر آدمی بنی اسرائیل کے اٹھے اور انھوں نے قتل کرنے والوں کو بھلائی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا شروع کیا تو انھوں نے ان سب کو اسی دن شام تک قتل کر ڈالا

جو لوگ اصلاح کا مقصد لے کر اٹھتے ہیں ان کو قوم کے بگاڑ پر تنقید کرنی ہوتی ہے۔ یہ تنقید لوگوں کے لئے بے حد ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ کیونکہ اس سے ان کی فخر اور گھمنڈ کی نفسیات کو چوٹ لگتی ہے، وہ ایسے مصلحین کے درپے ہو جاتے ہیں۔ وہ ان کو بدنام کرتے ہیں۔ ان کی معاشیات کو اجاڑتے ہیں۔ اس قسم کی کارروائیوں کے بعد بھی جب ان کی زبان بند نہیں ہوتی تو وہ ان کو ہلاک کر ڈالتے ہیں۔

دلیل میں الحاد

قرآن کی سورہ نمبر ۴۱ کے پانچویں رکوع میں خدا کی ان نشانیوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جو زمین و آسمان میں بکھری ہوئی ہیں ـــــ رات، دن، سورج، چاند، پانی، سبزہ، وغیرہ۔ پھر ارشاد ہوا ہے:

ان الذین یلحدون فی آیاتنا لا یخفون علینا افمن یلقی فی النار خیر ام من یاتی آمنا یوم القیامۃ اعملوا ماشئتم انہ بما تعملون بصیر (حم سجدہ ۴۰)

جو لوگ ہماری نشانیوں میں الحاد کرتے ہیں وہ ہم سے چھپے ہوئے نہیں ہیں۔ کیا وہ شخص بہتر ہے جو آگ میں ڈالا جانے والا ہے یا وہ جو قیامت کے دن امن کے ساتھ آئے گا۔ جو جی چاہے کرو، خدا تمھارے اعمال کو خوب دیکھ رہا ہے۔

الحاد کے معنی ہیں انحراف۔ بات سے اصل معنی لینے کے بجائے اس کو کسی اور طرف پھیر دینا (قال ابن عباس: الالحاد وضع الکلام علیٰ غیر مواضعہ، تفسیر ابن کثیر)

خدا کا رسول اپنے پیغام کی صداقت ثابت کرنے کے لئے زمین و آسمان کی نشانیاں پیش کرتا تو منکرین کہتے کہ یہ نشانیاں تو فلاں فلاں طبیعی اسباب کے تحت ظاہر ہو رہی ہیں، ان کا تمھارے پیغام کی صداقت سے کیا تعلق ۔ ایک واقعہ جس سے حق کی تصدیق نکل رہی تھی اس کو کسی اور طرف پھیر کر اپنے آپ کو حق سے محروم کر لیتے۔

یہی معاملہ وہ دوسرے دلائل کے ساتھ کرتے تھے۔ خدا کا رسول ایک واضح دلیل دیتا جو عقلی طور پر پوری طرح سمجھ میں آنے والی ہو۔ مگر وہ اس کو صحیح رخ سے لینے کے بجائے الٹے رخ پر موڑ دیتے۔ وہ طرح طرح کی لفظی بحثیں نکال کر یہ ظاہر کرتے کہ یہ دلیل دلیل نہیں ہے۔ اگر وہ دلیل ہوتی تو وہ ضرور اس کو مان لیتے۔

جب بھی کوئی سچی دعوت اٹھتی ہے، وہ کھلے کھلے دلائل کی بنیاد پر اٹھتی ہے۔ اسی کے ساتھ اللہ اس کی تائید کے لئے اس کے گرد و پیش مختلف نشانیاں ظاہر کرتا ہے جو اس کے برحق ہونے کی تصدیق کر رہی ہوں ۔ مگر غافل اور سرکش انسان طرح طرح کی تاویل و توجیہہ نکال کر اپنے کو مطمئن کر لیتا ہے۔ جس واقعہ میں خدا نے اس کے لئے اقرار کا سامان رکھا تھا اس سے وہ الحاد و انکار کی غذا لینے لگتا ہے۔ وہ علم و عقل کا مدعی بن کر علم و عقل کا خاتمہ کر دیتا ہے۔

کیسی عجیب ہے وہ محرومی جو کامیابی کے چراغ جلا کر حاصل کی جا رہی ہو۔

خود جاننا پڑتا ہے

ٹیلر ماسٹر کو جب آپ کوٹ سینے کے لئے دیتے ہیں تو وہ آپ کے جسم کا ناپ لیتا ہے۔ ناپ لینے کا مقصد آپ کے جسم کی بناوٹ کا اندازہ کرنا ہے تاکہ کوٹ آپ کے جسم پر بالکل فٹ آجائے اور اس میں کہیں شکن یا جھول نہ ہو۔ مگر ٹیلر ماسٹر جسم کے جن چند حصوں کا ناپ لیتا ہے اتنا ہی علم ایک کامیاب کوٹ تیار کرنے کے لئے کافی نہیں۔ ایک صحیح کوٹ تیار کرنے کے لئے ٹیلر ماسٹر کو بہت سی اور باتیں بطور خود جاننی پڑتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جسم کے نشیب و فراز اس سے کہیں زیادہ ہیں کہ اس کے ہر حصے کا مکمل ناپ لیا جا سکے۔ ایک ٹیلر ماسٹر جسم کے جن حصوں کا ناپ لیتا ہے، اگر اس کی واقفیت بس اتنی ہی ہو تو وہ کبھی ایک معیاری کوٹ تیار کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

یہی بات زندگی کے دوسرے معاملات کے لئے بھی صحیح ہے۔ ایک گھر چلانے کا معاملہ ہو یا دینی مشن چلانے کا۔ ملت کی تعمیر کی مہم ہو یا اسلام کی اشاعت کی، ہر ایک اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے جب کہ اس کو ایسے افراد ہاتھ آجائیں جو بتائے بغیر باتوں کو جانیں، جو تفصیلات جانے بغیر ہر موقع پر اطمینان بخش جواب پالیں۔

جو لوگ صرف فہرست میں درج شدہ باتوں کو جانیں اور جہاں فہرست ختم ہو وہیں اپنے کام کو بھی ختم سمجھ لیں، ایسے لوگ کبھی کوئی بڑا کام نہیں کر سکتے۔ اسی طرح جب کوئی مشن چلایا جاتا ہے تو بار بار ایسی باتیں پیش آتی ہیں جن کے بارے میں پہلے سے اندازہ نہ تھا یا ان کے بارے میں پیشگی طور پر لوگوں کو خبردار نہیں کیا جا سکا تھا۔ ایسے موقع پر ضرورت ہوتی ہے کہ لوگ بتائے بغیر باتوں کو جان لیا کریں۔ اور اگر ان کا شعور اتنا ترقی یافتہ نہیں ہے تو ذمہ داروں پر اعتماد کرتے ہوئے اس کو قبول کر لیں اور اپنے آپ کو اس کے مطابق بنا لیں۔ جس مشن کے افراد میں یہ صلاحیت نہ ہو وہ بار بار خود ساختہ شکایت لے کر بیٹھ جائیں گے، معاملات کی حقیقت جانے بغیر وہ بطور خود ایک رائے قائم کریں گے اور پھر روٹھ کر الگ ہو جائیں گے۔

کسی مشن کو کامیابی تک پہنچانے کے لئے بہت گہرا شعور اور بہت بڑا دل درکار ہوتا ہے۔ جن لوگوں کے اندر یہ صلاحیت نہ ہو، وہ صرف تاریخ کے کوڑا خانہ میں جگہ پائیں گے، خواہ دیواری پوسٹروں میں وہ اپنے آپ کو تاریخ ساز کیوں نہ لکھتے رہیں۔

غلطی پر غلطی

آدمی اگر اپنی غلطی نہ مانے تو وہ ہمیشہ دوسرے کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ دوسرے کو برا ظاہر کرکے اپنی برائی پر پردہ ڈال سکے۔

ایک آدمی بے روزگار تھا۔ اس کے دوست نے کہا کہ تم کوئی کاروبار کرو۔ آدمی نے کہا میرے پاس سرمایہ نہیں۔ دوست نے کہا کہ تم کسی طرح پانچ ہزار روپے فراہم کرلو تو میں تم کو پانچ ہزار روپے بطور قرض دے دوں گا۔ پھر تم دس ہزار روپے سے اپنا کام کرلینا۔ آدمی نے کہیں سے پانچ ہزار روپے حاصل کئے۔ اس کے بعد جب اس نے دوست سے وعدہ کے مطابق رقم مانگی تو اس نے عذر کردیا۔ اس کے بعد دوست کا یہ حال ہوا کہ وہ اس آدمی کو مستقل برا کہتا رہتا۔ ہر موقع پر اسے غلط ثابت کرنے کی کوشش کرتا۔

دوست ایسا کیوں کرتا تھا۔ جواب یہ ہے کہ اپنے احساس جرم کو دوسرے کے اوپر ڈالنے کے لئے۔ یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ میں روپیہ دینے کے لئے تو تیار تھا۔ مگر یہ آدمی اس قابل ہی نہ تھا کہ اس کو روپیہ دیا جائے۔ اس کی اپنی نالائقی نے اس کو روپیہ سے محروم رکھا نہ کہ میری کوتاہی نے۔ انسان یا تو اپنی غلطی مانے گا یا دوسرے کو غلط کہے گا۔ وہ بیک وقت دونوں سے بچ کر نہیں رہ سکتا۔

ایسا آدمی بطور خود یہ سمجھتا ہے کہ وہ ہوشیاری کر رہا ہے۔ حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے ایک جرم کو دو جرم بنا رہا ہے۔ پہلے مرحلہ میں دوست صرف وعدہ خلافی کا مجرم تھا، اب وہ جھوٹا الزام لگانے کا بھی مجرم بن گیا۔

جب بھی آدمی سے کوئی غلطی ہو تو بہترین بات یہ ہے کہ وہ اس کا اعتراف کرے۔ غلطی کا اعتراف بات کو وہیں کا وہیں ختم کر دیتا ہے۔ مگر جب آدمی غلطی کا اعتراف نہ کرے تو لازماً ایسا ہوگا کہ وہ دوسرے کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کرے گا اور اس طرح غلطی پر غلطی کرتا چلا جائے گا۔ آدمی یا تو اپنے کو غلط مان کر مطمئن ہوتا ہے یا دوسرے کو غلط ثابت کرکے۔ اگر وہ پہلا کام نہ کرے تو ضرور اس کو دوسرا کام کرنا پڑے گا۔ اور دوسرا کام یقینی طور پر اس کے لئے پہلے سے زیادہ برا ہوگا۔

غلطی کرنا بشری کمزوری ہے۔ مگر جھوٹا الزام لگانا سرکشی ہے۔ اور کمزوری کے مقابلہ میں سرکشی یقیناً زیادہ بڑا جرم ہے۔

مواقع کا استعمال

امریکہ میں ان انتہائی بڑے بڑے تاجروں کا مطالعہ کیا گیا ہے جو ترقی کے بلند ترین مقام تک پہنچے ہیں۔ ان کی غیر معمولی ترقی کا راز کیا ہے، اس سلسلے میں مختلف باتیں کہی گئی ہیں — بڑھی ہوئی محنت، کام کی اتنی دھن کہ بیوی بچے، چھٹی، تفریح، تمام چیزیں ثانوی بن جائیں، وغیرہ۔ تاہم ان کی بڑی بڑی ترقیوں میں جو چیز فیصلہ کن طور پر اہم ترین ہے وہ ایک تحقیق کرنے والے کے الفاظ (ریڈرز ڈائجسٹ مئی ۱۹۸۲) میں یہ ہے کہ ایسے لوگ مواقع کو پہچاننے کے ماہر ہوتے ہیں۔ اپنی ترقی کے کسی بھی موقع کو فوراً استعمال کرنے سے وہ کبھی نہیں چوکتے :

They are masterful opportunists, keenly alert to any chance for personal advancement

حقیقت یہ ہے کہ بڑی ترقی مواقع کو عین وقت پر استعمال کرنے ہی کا دوسرا نام ہے۔ خواہ یہ شعوری طور پر ہو یا اتفاقی طور پر۔ آدمی خواہ کسی بھی میدان میں ہو، اس کو ہمیشہ چوکنا رہنا چاہئے اور جب کوئی موافق موقع سامنے آئے تو فوراً اس کو استعمال کرنا چاہئے۔ کیونکہ ایک موقع ہمیشہ صرف ایک بار آتا ہے، وہ دوسری بار کبھی نہیں آتا۔ جس نے کسی موقع کو پہلی بار کھو دیا اس نے گویا ہمیشہ کے لئے اسے کھو دیا۔

نئے مواقع بالکل چھپے ہوئے نہیں ہوتے، ان کا اندازہ بہت سے لوگوں کو ہو جاتا ہے۔ مگر آگے بڑھ کر ان کو استعمال کرنے والے ہمیشہ بہت کم ہوتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ نئے مواقع کو استعمال کرنے میں ہمیشہ کچھ خطرہ کا پہلو بھی ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ ایک مستقبل کی چیز ہوتا ہے اس لئے اس کے ساتھ امید اور اندیشہ دونوں ہی لگے ہوتے ہیں، جو لوگ کاہلی کرتے ہیں یا سوچ بچار میں رہتے ہیں وہ محروم رہ جاتے ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ مستعدی دکھاتے ہیں اور خطرہ مول لے کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ وہ کامیاب رہتے ہیں۔

امکانات کو پہچانئے، کوئی موقع پیدا ہو تو فوراً اس کو استعمال کیجئے، آپ یقیناً بڑی بڑی کامیابیاں حاصل کریں گے۔

کمزوری نعمت ثابت ہوئی

گاندھی جی اپنی کتاب تلاش حق (My Experiments with Truth) میں لکھتے ہیں کہ وہ پیدائشی طور پر شرمیلے تھے۔ ان کا یہ مزاج بہت عرصہ تک باقی رہا۔ جب وہ تعلیم کے لئے لندن میں تھے تو وہ ایک ویجیٹیرین سوسائٹی کے ممبر بن گئے۔ ایک بار انھیں سوسائٹی کی میٹنگ میں تقریر کے لئے کہا گیا۔ وہ کھڑے ہوئے۔ مگر کچھ بول نہ سکے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اپنے خیالات کو کس طرح ظاہر کریں۔ بالآخر وہ شکریہ کے چند کلمات کہہ کر بیٹھ گئے۔ ایک اور موقع پر ان کو مدعو کیا گیا کہ وہ سبزی خوری کے بارے میں اپنے خیالات ظاہر کریں۔ اس بار انھوں نے اپنے خیالات ایک کاغذ پر لکھ لئے۔ مگر جب وہ کھڑے ہوئے تو وہ اپنا لکھا ہوا بھی نہ پڑھ سکے۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر ایک شخص نے مدد کی اور ان کی لکھی ہوئی تحریر کو پڑھ کر سنایا۔

گاندھی جی نے وکالت کا امتحان پاس کرنے کے بعد بمبئی میں پریکٹس شروع کی۔ مگر یہاں بھی ان کا شرمیلا پن ان کے لئے رکاوٹ بن گیا۔ پہلا کیس لے کر جب وہ جج کے سامنے کھڑے ہوئے تو حال یہ ہوا کہ ان کا دل بیٹھنے لگا اور وہ کچھ بول نہ سکے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے موکل سے کہا کہ میں تمھارے کیس کی وکالت نہیں کرسکتا۔ تم کوئی دوسرا وکیل تلاش کرلو۔

بظاہر یہ سب کمی کی باتیں ہیں۔ مگر گاندھی جی لکھتے ہیں کہ یہ کمیاں بعد کو میرے لئے بہت بڑی نعمت (Advantage) ثابت ہوئیں۔ اس سلسلے میں ان کے الفاظ یہ ہیں :

> My hesitancy in speach, which was once an annoyance is now a pleasure, Its greatest benefit has been that it has taught me the economy of words. I have naturally formed the habit of restraining my thoughts. And I can now give myself a certificate that a thoughtless word hardly ever escaped my tongue or pen.

بولنے میں میری یہ ہچکچاہٹ جو کبھی مجھے تکلیف دہ معلوم ہوتی تھی، اب وہ میرے لئے ایک مسرت ہے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اس نے مجھے مختصر الفاظ میں بولنا سکھایا۔ میرے اندر فطری طور پر یہ عادت پیدا ہوگئی کہ میں اپنے خیالات پر قابو رکھوں۔ اب میں اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مشکل ہی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی لایعنی لفظ میری زبان یا قلم سے نکلے۔

گاندھی جی اپنی اس خصوصیت میں مشہور ہیں کہ وہ بہت سوچی سمجھی بات بولتے تھے اور سادہ اور مختصر الفاظ میں کلام کرتے تھے۔ مگر یہ امتیازی خصوصیت ان کو صرف ایک غیر امتیازی خصوصیت کے ذریعہ حاصل ہوئی۔ وہ یہ کہ وہ اپنے بڑھے ہوئے شرمیلے پن کی وجہ سے ابتداءً لوگوں کے سامنے بول ہی نہیں پاتے تھے۔

ہیروؤں کی نرسری

پروفیسر ہٹی نے عرب مسلمانوں کی غیر معمولی ترقیات کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انھوں نے مختلف شعبوں میں جو کارنامے انجام دئے، تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ خالد بن ولید اور عمرو بن عاص کی فوجی مہمیں جو عراق، ایران، شام اور مصر میں جاری ہوئیں وہ بلاشبہ تاریخ کی انتہائی کامیاب مہموں میں سے تھیں۔ ان کی ان جنگی مہموں کا مقابلہ بالکل بجا طور پر نپولین، ہنی بال اور سکندر کی جنگی مہموں سے کیا جاسکتا ہے۔

اس طرح کی مثالیں بیان کرتے ہوئے ان کے قلم سے یہ الفاظ نکلے ہیں کہ پیغمبر کی وفات کے بعد عرب کی بنجر زمین گویا جادو کے زور سے ہیروؤں کی نرسری میں تبدیل ہوگئی۔ ایسے ہیرو جن کے مثل کہیں اور پانا بے حد مشکل ہے۔ تعداد کے اعتبار سے بھی اور خصوصیت کے اعتبار سے بھی:

> After the death of the Prophet sterile Arabia seems to have been converted as if by magic into a nursery of heroes the like of whom both in number and quality is hard to find anywhere.
> P.K. Hitti, History of the Arabs (1979) P. 142

یہی کسی تحریک کی کامیابی کا سب سے بڑا راز ہے۔ وہی تحریک عظیم تحریک ہے جس نے اپنے عمل کے دوران عظیم انسان پیدا کئے ہوں۔ کیونکہ عظیم انسان ہی در اصل کوئی عظیم واقعہ ظہور میں لاتے ہیں نہ کہ شاعری اور خطابت کے ہنگامے۔

اسلامی انقلاب ایسی تحریک کے ذریعہ وجود میں آتا ہے جو اپنے گرد جمع ہونے والے افراد میں اعلیٰ حوصلہ اور اونچا کردار پیدا کرے۔ جس کے نتیجہ میں انسانی معاشرہ ہیروؤں کی نرسری کی مانند بن گیا ہو۔ اس کے برعکس جن لوگوں کی مثال ایسی ہو جیسے جھاڑ جھنکاڑ کا جنگل، وہ زمین کو صرف فساد سے بھریں گے، ایسے لوگ کبھی اسلامی انقلاب برپا کرنے والے نہیں بن سکتے۔

جواب کا طریقہ

ایک آدمی نے ایک بزرگ کی تعریف کی۔ اس نے کہا کہ وہ ایسے پہنچے ہوئے بزرگ تھے کہ وہ نماز کی حالت میں مرے۔ گویا ان کی موت خدا کی گود میں ہوئی۔ سننے والا کچھ دیر چپ رہا، اس کے بعد بولا: خدا کے رسول کی وفات ہوئی تو وہ اپنی اہلیہ کی گود میں تھے اور بزرگ کی وفات خدا کی گود میں ہوئی۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ بزرگ خدا کے رسول سے بھی زیادہ پہنچے ہوئے تھے۔ یہ جواب اتنا وزنی تھا کہ اس کو سن کر آدمی خاموش ہو گیا۔

سننے والے نے مذکورہ بزرگ کے حالات پڑھے تھے۔ اس میں اس کو کہیں یہ بات نہیں ملی تھی کہ بزرگ کی موت نماز کی حالت میں ہوئی۔ تاہم اس نے سوچا کہ اگر میں یہ کہتا ہوں کہ یہ بات کہاں لکھی ہے یا کس ذریعہ سے ثابت ہوتی ہے تو خواہ مخواہ کی بحث شروع ہو جائے گی اور وہ کہیں ختم نہ ہوگی۔ چنانچہ اس نے اس سوال کو نہیں چھیڑا۔ اس نے ایسی بات کہی جو نہ صرف یقینی تھی بلکہ اپنے عمومی پہلو کی بنا پر وہ آدمی کو چپ کر دینے والی تھی۔ چنانچہ لمبی بحث کی نوبت نہیں آئی اور ایک ہی جملہ سارے سوال کا جواب بن گیا۔

یہی ایسے معاملات میں جواب دینے کا صحیح طریقہ ہے۔ اگر آدمی ایسا کرے کہ وہ مخاطب کی بات سنتے ہی فوراً اس سے الجھ نہ جائے بلکہ تھم کر سوچے کہ اس کا صحیح اور مؤثر جواب کیا ہو سکتا ہے تو یقینی طور پر وہ ہر سوال کا ایسا جواب پالے گا جو اس قدر فیصلہ کن ہو کہ لمبی بحث و تکرار کی نوبت نہ آئے اور صرف ایک جملہ پورے سوال کے لئے فیصلہ کن بن جائے۔

سب سے برا جواب وہ ہے جس میں سوال کرنے والا اور جواب دینے والا دونوں الجھ جائیں اور بالآخر اس طرح الگ ہوں کہ دونوں میں سے کوئی ہار ماننے کے لئے تیار نہ ہوا تھا۔ اور سب سے اچھا جواب وہ ہے جب کہ جواب دینے والا ایسا سوچا سمجھا ہوا وزنی جواب دے جس کے بعد سوال کرنے والے کی سمجھ ہی میں نہ آئے کہ اس کے آگے وہ کیا کہہ سکتا ہے۔

برف کی طرح

سورۃ العصر کی تفسیر کے تحت امام رازی نے لکھا ہے:

عن بعض السلف، فهمت معنى السورة من بائع الثلج - كان يصيح ويقول: ارحموا من يذوب رأس ماله، ارحموا من يذوب رأس ماله - فقلت هذا معنى ان الانسان لفي خسر - يمر به العصر فيمضي عمره ولا يكتسب فاذا هو خاسر

بعض سلف سے منقول ہے کہ میں نے سورہ عصر کا مفہوم ایک برف بیچنے والے سے سمجھا جو آواز لگا رہا تھا اور کہہ رہا تھا: اس آدمی پر رحم کرو جس کا سرمایہ پگھلا جا رہا ہے۔ اس آدمی پر رحم کرو جس کا سرمایہ پگھلا جا رہا ہے۔ یہ سن کر میں نے کہا یہ ہے مطلب انسان کے گھاٹے میں رہنے کا۔ آدمی پر زمانہ گزرتا ہے، اسی کے ساتھ اس کی عمر بھی گزر رہی ہے۔ اب جو شخص کسب نہیں کرتا وہ گھاٹے میں ہے

برف ایک ایسا اثاثہ ہے جو ہر وقت پگھلتا رہتا ہے، وہ پگھل پگھل کر کم ہوتا رہتا ہے، یہاں تک کہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ برف کے دکان دار کی کامیابی یہ ہے کہ وہ برف کے پگھلنے سے پہلے اس کو بیچ ڈالے اور اپنے اثاثہ کو رقم کی صورت میں تبدیل کرے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے گا تو بالآخر اس کا برف ختم ہو جائے گا اور اس کے پاس کچھ بھی باقی نہ رہے گا۔ برف کے دکان دار کو کامیابی تو اپنی کوششوں سے حاصل ہوگی۔ مگر ناکامی کے لئے اس کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ناکامی تو اپنے آپ اس کی طرف دوڑی چلی آرہی ہے۔

یہی معاملہ انسان کی زندگی کا بھی ہے۔ انسان کی عمر محدود ہے۔ وہ ہر روز گھٹتی رہتی ہے۔ آج اگر آپ کی عمر کے سو دن باقی تھے تو کل ۹۹ دن باقی رہیں گے۔ پرسوں ۹۸ دن، نرسوں ۹۷ دن۔ اس طرح کم ہوتے ہوتے سارے دن ختم ہو جائیں گے۔ ایسی حالت میں کامیاب وہ ہے جو مستعدی دکھائے اور اپنی عمر کو وقت پورا ہونے سے پہلے استعمال کرلے۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو عمر کی مدت گھٹتے گھٹتے ایک روز ختم ہو جائے گی اور اس کے بعد وہ اس حال میں اس دنیا سے چلا جائے گا کہ اس نے اپنی زندگی سے کچھ بھی حاصل نہیں کیا تھا۔

مردار سے زیادہ متعفن

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

والذی نفسی بیدہ لا تقوم الساعۃ حتی یبعث اللہ امراء کذبۃ ووزراء فجرۃ واعوانا خونۃ وعرفاء ظلمۃ وقراء فسقۃ سیماھم سیمی الرھبان وقلوبھم انتن من الجیفۃ اھواءھم مختلفۃ فیفتح اللہ لھم فتنۃ غبراء مظلمۃ فیتھاوکون فیھا

اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔ قیامت قائم نہ ہوگی جب تک وہ دور نہ آجائے جس میں جھوٹے حکمراں، بُرے وزراء، بد دیانت ملازمین حکومت، ظالم قائدین ظہور میں نہ آجائیں۔ اس زمانہ میں ایسے فاسق علماء ہوں گے جن کا ظاہر پارساؤں جیسا ہوگا اور ان کے دل مردار سے زیادہ متعفن ہوں گے۔ ان کی خواہشات ایک دوسرے سے الگ ہوں گی۔ اس زمانہ میں اللہ ایک ایسا اندھا فتنہ برپا کرےگا جس میں لوگ حیران و سرگرداں ہو کر رہ جائیں گے۔

اس حدیث میں جو تصویر پیش کی گئی ہے وہ کافروں اور مشرکوں کی نہیں ہے۔ کافر اور مشرک تو ہمیشہ ہی ایسے ہوتے ہیں۔ یہ خود مسلمانوں کے بگاڑ کے زمانہ کی حالت ہے۔ یہ ان لوگوں کی تصویر ہے جو اپنے کو مسلمان کہیں گے اور اس پر فخر کریں گے کہ وہ افضل الانبیاء کے امتی ہیں۔

یہ زمانہ کب آئے گا۔ اس کی ایک قطعی اور کھلی ہوئی پہچان ہے۔ اور وہ ہے —— لوگوں کی خواہشات کا ایک دوسرے سے مختلف ہو جانا۔ اور اس کے نتیجہ میں لوگوں کے اندر باہمی ٹکراؤ کا پیدا ہونا۔ غور سے دیکھئے تو یہ علامت آج پوری طرح ظاہر ہو چکی ہے۔ آج مسلم افراد، مسلم اداروں اور مسلم قوموں کا سب سے نمایاں وصف باہمی اختلاف ہے۔ شخصی آرزوئیں اور گروہی مصلحتیں لوگوں کے اوپر اتنا چھا چکی ہیں کہ ہر ایک اپنے خول میں بند ہے، کوئی دوسرے سے ملنے کے لئے تیار نہیں۔ علماء کے لئے دین ایک سستی تجارت بن چکا ہے۔ ان کے سینہ میں ذاتی مفاد اور ذاتی نمائش کے سوا اور کچھ نہیں۔ تاہم وہ پارسائی کا جھوٹا لبادہ اپنے اوپر ڈالے ہوئے ہیں تاکہ لوگوں کی نظر میں مقدس بنے رہیں، تاکہ وہ دین کے نام پر عوام کا استغلال کر سکیں۔

جب امت پر یہ وقت آتا ہے تو ہر ایک اپنی خواہش کے مطابق دین کی تشریح کرنے لگتا ہے۔ فکری اختلافات بے پناہ حد تک بڑھ جاتے ہیں۔ حق، اپنی تمام تابانیوں کے باوجود، انسانی آوازوں میں گڈمڈ ہو کر رہ جاتا ہے۔

ایک سفر

لندن میں ایک علمی ادارہ ہے جس کا نام ہے مسلم انسٹی ٹیوٹ۔ اس ادارہ کے تحت لندن میں حج کے موضوع پر ایک بین اقوامی سمینار (۳ تا ۷ اگست ۱۹۸۲) ہوا۔ اس سمینار میں شرکت کے لئے مجھے بھی دعوت دی گئی تھی۔ اس سلسلہ میں لندن کا سفر ہوا۔ اگرچہ مجھے ایک مہینہ کا ویزا ملا تھا اور وہاں بہت سے دوستوں نیز اسلامی اداروں کی طرف سے تقاضا ہوا کہ میں زیادہ مدت تک قیام کروں۔ مگر بعض ضرورتوں کی وجہ سے مجھے ایک ہفتہ میں واپس آنا پڑا۔

اگست ۱۹۸۲ کی پہلی تاریخ تھی۔ برٹش ایر ویز کا ہوائی جہاز مجھ کو لے کر دہلی سے بارہ ہزار کیلومیٹر دور لندن کی طرف جا رہا تھا۔ زمین کی اونچ نیچ سے بے نیاز ہو کر وہ ایک ہزار کیلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑ رہا تھا۔ میں نے سوچا "یہ خدا کا کیسا عجیب احسان ہے کہ اس نے انسان کے قابو میں ایسی سواری دے دی جس کو رواں کرنے کے لئے دریاؤں پر پل بنانے کی ضرورت نہیں۔ جس کی راہ میں پہاڑ اور سمندر حائل نہیں ہوتے۔ آبادیوں کی ناہمواریاں جس کا راستہ نہیں روکتیں۔ وہ زمین کا سہارا لئے بغیر ہوا کے دوش پر ادھر سے اُدھر اڑتا ہے اور تمام سواریوں سے زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ آدمی کو اس کی منزل پر پہنچا دیتا ہے۔

تاہم عام ذوق کے خلاف میرے لئے ہوائی جہاز کوئی پسندیدہ سواری نہیں۔ جب بھی میں ہوائی جہاز میں سفر کرتا ہوں تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں اڑن جیل میں بند ہو گیا ہوں۔ میری طبیعت میں آزادی پسندی بہت زیادہ ہے۔ ایسی کوئی زندگی مجھے عذاب معلوم ہوتی ہے جس میں میرے اوپر خارجی پابندیاں لگی ہوئی ہوں۔ خواہ اس پابندی کا مقام کوئی شاندار محل ہی کیوں نہ ہو۔ ہوائی جہاز کی اس ایک خصوصیت کے سوا کہ وہ تیزی سے سفر طے کرا دیتا ہے، باقی ہر چیز میرے ذوق کے خلاف ہے۔ آپ کار میں جا رہے ہوں تو اس کو کسی بھی جگہ روک کر باہر آ سکتے ہیں۔ ٹرین میں یہ نفسیاتی اطمینان ہوتا ہے کہ ضرورت ہو تو زنجیر کھینچ کر ٹرین کو روکا جا سکتا ہے۔ مگر ہوائی جہاز کے اندر داخل ہونے کے بعد بس "زنجیر" میں بندھ جانا ہے۔ یہاں تک کہ وہ خود ہی اعلان کر دے کہ منزل آ گئی، اب آپ باہر نکلنے کے لئے آزاد ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی ہر خوبی جھوٹی ہے، کیونکہ ہر خوبی کے ساتھ کوئی خرابی لگی ہوئی ہے۔ یہاں ہوائی سفر بھی جھوٹا ہے اور یہاں کا زمینی عیش بھی جھوٹا۔ لوگ جھوٹی تسکین کے حصول کے لئے اپنی ساری طاقت ضائع کر رہے ہیں۔ اور جب زندگی اپنے انجام کو پہنچتی ہے اور سچی تسکین کا وقت آتا ہے تو معلوم

ہوتا ہے کہ ان کے اندر وہ طاقت اور صلاحیت ہی نہیں کہ وہ سچی خوشی سے لطف اندوز ہوسکیں۔

ہمارا پہلا ٹھہراؤ دبئی تھا۔ یہاں ایک گھنٹہ کا موقع تھا۔ ہوائی جہاز سے اتر کر میں اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ واحد تاثر جو ذہن نے قبول کیا وہ یہ کہ آج کی دنیا تہذیب کی دنیا ہے۔ دبئی بظاہر ایک مسلم ملک ہے۔ مگر یہاں، دوسری ہر جگہ کی طرح، تمام چیزیں مغربی انداز میں ڈوبی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ تعمیر، لباس، سواری، فرنیچر، آرائش، غرض کوئی چیز ایسی نہیں جس پر مغربی چھاپ کا نشان نظر نہ آتا ہو۔ ایسی حالت میں احیاء اسلام کی جدوجہد کا آغاز تہذیب کے میدان میں انقلاب کی جدوجہد سے ہوگا نہ کہ سیاست کے میدان میں انقلاب کی دوڑ لگانے سے۔ سیاست زندگی کا آخری نقطہ ہے اور آخری نقطہ پر آپ اپنے سفر کا پہلا قدم نہیں رکھ سکتے۔

ہمارا دوسرا ٹھہراؤ کویت تھا۔ یہاں جہاز تقریباً ایک گھنٹہ رکا۔ دبئی سے کویت کی پرواز تمام کی تمام سمندر (خلیج عرب) کے اوپر سے ہوتی ہے۔ ہمارا جہاز ۳۵ ہزار فٹ کی بلندی پر اڑ رہا تھا۔ نیچے سمندر کی سطح پر جگہ جگہ سمندری جہاز چل رہے تھے۔ بظاہر دونوں بالکل دو قسم کی سواریاں ہیں۔ مگر حقیقۃً دونوں ایک ہیں۔ دونوں کے دونوں تیر رہے ہیں۔ ایک ہوا کی سطح پر تیر رہا ہے اور دوسرا سمندر کی سطح پر۔

ہوائی جہاز میں مسافروں کی رہنمائی کے لئے جگہ جگہ اندراجات ہیں۔ یہ اندراجات انگریزی کے ساتھ عربی میں بھی نظر آئے۔ مثلاً انگریزی زبان میں لکھا ہوا ہے No Smoking تو عربی زبان میں اس کے ساتھ ممنوع التدخین بھی درج ہے۔ انگریزی میں (Please Lock Door) درج ہے تو عربی میں الرجاء قفل الباب ہے۔ انگریزی میں (Waste Disposal) ہے تو عربی میں رمی الفضلات۔ اسی طرح کویت میں مسافروں کے درمیان روزانہ اخبارات تقسیم ہوئے تو انگریزی کارجین کے ساتھ السیاسۃ (کویت کا عربی اخبار) بھی تقسیم کیا گیا۔ یہ گویا عرب دنیا کی اس اہمیت کا اعتراف تھا جو تیل کی دولت کے نتیجہ میں اسے حاصل ہوئی ہے۔

دہلی سے کویت تک جہاز کی بہت سی سیٹیں خالی تھیں۔ کویت میں کثیر تعداد میں عرب مرد اور عرب عورتیں جہاز میں سوار ہوئیں اور تمام سیٹیں بھر گئیں۔ یہ سارے لوگ لندن جا رہے تھے۔ میرے قریب کی سیٹ پر ایک غیر مسلم تھے جو لندن کے باشندہ ہیں۔ ان سے میں نے پوچھا "عرب مرد اور عورتیں اتنی بڑی تعداد میں کس لئے لندن جاتے ہیں"۔ ان کا مختصر جواب یہ تھا: خرید و فروخت اور تفریح کے لیے

عرب ملکوں کو جدید دنیا میں جو اہمیت حاصل ہوئی ہے وہ تیل کی قدرتی دولت کی وجہ سے ہے

نہ کہ کسی ذاتی صلاحیت کی وجہ سے۔ تیل کی دریافت بالکل "جدید" دریافت نہیں ہے۔ تیل کے چشمے قدیم زمانہ میں بھی زمین کی سطح پر جگہ جگہ بہہ پڑے تھے اور انسان ابتدائی طور پر معدنی تیل سے واقف تھا۔ مگر قدیم زمانہ میں کار اور ہوائی جہاز اور دوسری مشینی چیزیں وجود میں نہ آئی تھیں جو تیل کے ایندھن سے متحرک ہوتی ہیں۔ تیل کی اہمیت اسی وقت ہے جب کہ مشینی صنعت کا دور وجود میں آچکا ہو۔ مشینی صنعت کے بغیر تیل کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دنیا میں کس طرح ایک چیز کی اہمیت دوسری چیز کے ساتھ بندھی ہوئی ہے۔

ہوائی جہاز میں مسافروں کے لئے گانے اور موسیقی کا انتظام ہوتا ہے۔ مگر اس طرح نہیں کہ لاؤڈ اسپیکر پر ریکارڈ بجا کر سب کا سکون برباد کیا جا رہا ہو۔ بلکہ یہ کام ایک خاموش انتظام کے تحت ہوتا ہے۔ ہوائی جہاز کی طرف سے کان میں لگانے کا ایک خاص آلہ دیا جاتا ہے جس کو ہیڈسیٹ (Headset) کہتے ہیں۔ اس کا ایک حصہ ڈاکٹروں کے اسٹتھ اسکوپ کی طرح کان میں لگا کر دوسرا حصہ کرسی کے ہتے میں بنے ہوئے خانہ میں جوڑ دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد فوراً ہی گانے اور موسیقی کی آواز کان میں آنا شروع ہو جاتی ہے۔ اس طرح یہ ہوتا ہے کہ جو شخص سننا چاہتا ہے وہی سنتا ہے اور جو نہیں سننا چاہتا اس کے کان اس طرح اس سے محفوظ رہتے ہیں گویا یہاں گانے اور موسیقی کا کوئی وجود ہی نہیں۔ پھر یہ واقعہ ہوا کہ ایک ایر ہوسٹس کو مجھے ایک ہوائی ہدایت کی طرف متوجہ کرنا تھا جس کی، اس کے خیال کے مطابق، میں "خلاف ورزی" کر رہا تھا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوئی تو اس کا پہلا جملہ یہ تھا: (Excuse me please) یعنی یہ کہنے کے لئے مجھے معاف کیجئے ....

یہ دو مثالیں ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ جدید تہذیب نے کس قسم کے آداب کو دنیا میں رواج دیا ہے۔ یہ آداب دو متعین اصولوں پر قائم ہیں: اپنی ذات کی تکمیل، مگر اس طرح کہ دوسرے کی ذات کو کوئی گزند نہ پہنچے۔

دہلی سے لندن کا سفر ۱۰ گھنٹے کا تھا۔ دہلی سے ہم صبح ۷ بجے روانہ ہوئے تھے۔ گویا جب ہم لندن پہنچے تو ہندستانی وقت کے لحاظ سے شام کے ۷ بج چکے تھے۔ دہلی سے میں فجر کی نماز پڑھ کر روانہ ہوا تھا۔ اس لحاظ سے لندن میں پہنچتے ہی مجھ پر مغرب کا وقت آجانا چاہئے تھا۔ مگر میں لندن میں پہنچا تو غروب آفتاب میں ابھی تقریباً پانچ گھنٹے باقی تھے۔ لندن کا وقت، ہندستان کے لحاظ سے تقریباً پانچ گھنٹے پیچھے ہے۔ چنانچہ لندن پہنچ کر میں نے اطمینان کے ساتھ عصر کی نماز ادا کی۔ اور پہلی اگست کو وہاں مغرب کی نماز اس وقت پڑھی جبکہ دہلی والوں کی گھڑی میں رات کا ایک بج رہا تھا۔

کامن ویلتھ کے باشندوں کے لئے باہمی سفر میں پیشگی ویزا لینا ضروری نہیں۔ ان کا ویزا (انٹری سرٹیفکٹ) مقام پر پہنچ کر ہوائی اڈہ پر بن جاتا ہے۔ ہوائی جہاز سے باہر آنے کے بعد سب سے پہلے میں متعلقہ کاونٹر پر پہنچا۔ وہاں ایک انگریز نوجوان تھا۔ اس نے میرا پاسپورٹ اور لندن کے میزبان کی طرف سے میرے نام دعوت نامہ دیکھا۔ اس کے بعد پوچھا کیا انگریزی میں بول سکتے ہیں۔ میں نے کہا ہاں۔ پھر اس نے کچھ مختصر سوال کئے اور چند منٹ میں ضروری اندراجات کرکے پاسپورٹ اور کاغذات میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا "شکریہ"

اس کے بعد دوسرا کام یہ تھا کہ اپنا وہ سامان لگیج سے حاصل کروں جس کو میں نے دہلی میں برٹش ایرویز کے حوالے کیا تھا۔ بین اقوامی ہوائی اڈوں پر یہ قاعدہ ہے کہ سامان ہوائی جہاز سے اتار کر ایک خاص طرح کی پٹی پر رکھ دیا جاتا ہے جو گھوم گھوم کر لوگوں کے سامنے آتی رہتی ہے۔ مسافر اس کے چاروں طرف کھڑے رہتے ہیں۔ اور اپنا اپنا سامان پہچان کر اس سے اتار لیتے ہیں۔ یہاں سیکڑوں کی تعداد میں سامان ہوتا ہے۔ ہوائی اڈہ کا کوئی آدمی وہاں نگرانی کے لئے موجود نہیں ہوتا۔ مگر کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی شخص کسی دوسرے کا سامان لے کر روانہ ہو جائے۔ ہر آدمی صرف اپنا سامان اتارتا ہے اور اس کو ایک خاص طرح کی گاڑی پر رکھ کر باہر آجاتا ہے۔ میں نے بھی اپنا سامان لے لیا اور باہر نکل آیا۔

اس دیانت داری کا راز بے نیازی ہے۔ یہ تمام مسافر خوش حال ہوتے ہیں۔ ان کو کسی دوسرے کا بکس یا کسی کا بیگ چرانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کیونکہ ویسا ہی یا اس سے اچھا ان کے پاس پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بہت سی اخلاقی خرابیاں غربت اور جہالت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں اور غربت اور جہالت کو دور کرکے انھیں بآسانی ختم کیا جا سکتا ہے۔

جدید طرز کی عمارتوں والے شہر کو دیکھ کر کوئی شخص لندن اترے تو وہاں کی سڑکوں پر چلتے ہوئے اس کا فوری احساس یہ ہوگا کہ وہ ایک ایسے شہر میں چل رہا ہے جو جدید تمدنی معیار سے پیچھے ہے۔ یہاں کے مکانات عام طور پر قدیم انداز کے ہوتے ہیں۔ جدید عمارتوں کی دنیا میں لندن قدیم عمارتوں کا شہر ہے۔

لندن کی سڑکوں کے دونوں طرف قدیم طرز کے مکانات کا منظر عام ہے۔ مگر خود سڑکوں کا حال یہ ہے کہ ان پر ہر وقت انتہائی جدید طرز کی کاروں کا سیلاب بہتا رہتا ہے۔ آدمی یہاں سفر کرتے ہوئے ایسا محسوس کرتا ہے کہ وہ دو طرفہ کھڑے ہوئے قدیم ماحول میں ایک جدید سفر کر رہا ہے یا دوسرے درجہ کے ایک شہر میں اول درجہ کی سواری پر رواں دواں ہے۔ دوسری طرف عرب شہروں کا حال یہ ہے کہ وہ اپنی ماڈرن عمارتوں اور شاندار کاروں کے ساتھ یہ منظر پیش کرتے ہیں جیسے کہ انھوں نے "جدید" کو لینے کے شوق میں اپنی

"قدامت" کو سراسر خیرباد کہہ دیا ہے۔ جب کہ لندن کا تمدنی ماحول اپنی خاموش زبان میں یہ کہتا ہوا نظر آتا ہے کہ اس نے جدید کو ضرور لیا ہے۔ مگر اس نے جدید کو اس طرح لیا ہے کہ اس کی قدامت اس سے چھوٹنے نہ پائے۔

۳ اگست کو مندوبین کا قافلہ لندن کو دیکھنے کے لئے پورے شہر میں گھمایا گیا، ایک عجیب تجربہ یہ ہوا کہ یہاں کی کئی چیزیں اس سے کم "عظیم" ہیں جتنا کہ پڑھ کر یا سن کر ہم نے سمجھ لیا تھا، مشہور بگ بین ٹاور بظاہر دیکھنے میں صرف چھوٹا بین ٹاور معلوم ہوا۔ بکنگھم پیلیس نئی دہلی کے راشٹرپتی بھون کے مقابلہ معمولی نظر آیا۔ اسی طرح یہاں کے پارلیمنٹ ہاؤس کی عمارت نئی دہلی کے پارلیمنٹ ہاؤس کی عمارت کے مقابلہ میں غیر اہم دکھائی دی۔ البتہ ہائیڈ پارک کافی بڑا تھا، اس سے بھی بہت بڑا جو تصوراتی طور پر ہم نے سمجھ رکھا تھا۔

انگریز اپنے ماضی کی روایات کا بے حد احترام کرتے ہیں اور ان کو باقی رکھنے میں فخر محسوس کرتے ہیں ان کا یہ مزاج ان کی قومی زندگی کا بہت بڑا اثاثہ ہے۔ قوموں کے اندر کردار پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ان کے درمیان کوئی مشترکہ عقیدہ ہو جس کی غیر مشروط وفاداری ہر ایک کا جزء ایمان بنی ہوئی ہو۔ زندہ اسلامی معاشرہ میں خدا کا عقیدہ یہی فعل انجام دیتا ہے۔ انگریز اپنے ماضی کی روایات کو اسی مقصد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ ان کا ماضی خود اپنے تسلسل کے نتیجہ میں ان کے درمیان موجود ہے۔ اگر وہ کوئی نیا اجتماعی عقیدہ بنائیں اور ماضی کی روایات کو توڑ کر نئے عقیدہ کو اس کی جگہ رائج کرنا چاہیں تو قدیم کا تقدس تو ضرور ٹوٹ جائے گا مگر جدید کا تقدس قائم ہونا سخت مشتبہ رہے گا۔ اس کا زندہ نمونہ ہندستان اور پاکستان کی صورت میں دیکھا جا سکتا ہے جہاں یہ اندیشہ اپنی بدترین صورت میں واقعہ بن چکا ہے۔ کسی مفکر نے صحیح کہا ہے کہ زندگی میں ایک چھوٹی سی روایت بھی لمبی تاریخ کے بعد قائم ہوتی ہے:

It requires a lot of history to make a little tradition

لندن میں پانچ لاکھ سکھ ہیں۔ ان کے تقریباً دو سو گوردوارے ہیں۔ مسلمانوں کی تعداد بھی لندن میں تقریباً پانچ لاکھ اور پورے برطانیہ میں تقریباً ۲۵ لاکھ ہے۔ ان میں سے ۵ ہزار نو مسلم ہیں۔ لندن میں تقریباً سو مسجدیں ہیں اور پورے برطانیہ میں تقریباً چھ سو۔ یہ سب لوگ یہاں کی اصطلاح میں ایشیائی کہے جاتے ہیں۔ یہ بظاہر مختلف مذہب کے لوگ ہیں۔ مگر ان کے مسائل مشترک ہیں: اپنے تشخص (Identity) کو کس طرح برقرار رکھا جائے۔ ان کے درمیان کمیونٹی سنٹر اور مذہبی سنٹر کی مقبولیت کی ایک خاص نفسیاتی وجہ یہی ہے۔

باہر سے جو مسلمان یہاں آکر آباد ہوئے ہیں ان میں جو حساس ہیں ان کے لئے سب سے بڑا مسئلہ بچوں کی اخلاقی اور مذہبی تربیت کا مسئلہ ہے۔ یہ بچے یا تو مقامی بچوں کی طرح بالکل آزاد ہو رہے ہیں۔

اور اگر ان کے گھر کا دباؤ ان پر شدید ہو تو ان کے اندر دوہری شخصیت پرورش پا رہی ہے۔ ایک وہ جو ان کے ماں باپ ان کے اندر اتارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسری وہ جو اسکول اور ٹیلی وژن اور ماحول کے اثر سے ان کے اندر پیدا ہو رہی ہے۔

اس صورت حال کا واحد فائدہ جن لوگوں کے حصہ میں آیا ہے وہ مذہبی پیشوا اور قائدین ہیں۔ اس کی وجہ سے ان لوگوں کو ایک نیا شاندار مشغلہ ہاتھ آگیا ہے۔ لندن میں اور اس طرح کے دوسرے ملکوں میں بیرونی باشندے جو اپنے پردیسی ماحول میں "اجنبیت" کے مسئلہ سے دوچار ہیں، وہ مایوسانہ تدبیر کے طور پر اپنے وطن سے اپنے مذہبی پیشواؤں کو بلاتے ہیں اور ان کے ذریعہ سے اپنے کچھ مذہبی جلسے یا قومی تقریبات مناکر یہ تسکین حاصل کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنے تشخص کو قائم رکھنے کا فی انتظام کر لیا ہے۔ اس طرح کی وقتی اور نمائشی چیزوں سے اصل مسئلہ تو حل نہیں ہوتا البتہ ان کے پیشواؤں کو اس چیز کا موقع مل جاتا ہے جس کو ایک شخص نے بجا طور پر جھوٹی امیدوں کی تجارت (False Hopes Business) کہا ہے۔

انگلستان میں اور دوسرے مغربی ممالک میں بعض مسائل نہایت عجیب ہیں۔ مثلاً یہاں کتا آدمی کے مقابلہ میں زیادہ قابل لحاظ ہے۔ بے کار کتوں کے لئے کتا گھر (Dogs' Home) بنے ہوئے ہیں جیسے ہندستان میں ناکارہ گایوں کے لئے گوشالے بنائے جاتے ہیں۔ تاہم یہاں کے کتا گھر اتنے اعلیٰ اور صاف ستھرے ہوتے ہیں کہ ہندستان کے گوشالوں سے ان کو کوئی نسبت نہیں۔

یہاں کے مالک مکان ایسے شخص کو اپنا مکان کرایہ پر دینے میں متردد ہوتے ہیں جن کے ساتھ کئی بچے ہوں اس کے مقابلہ میں وہ ایسے جوڑے کو کرایہ کا مکان دینے پر راضی ہو جاتے ہیں جن کے درمیان تیسرا صرف ایک کتا ہو۔ ان کا خیال ہے کہ کتا انسان کے بچوں سے زیادہ مہذب ہوتا ہے۔ بچے مکان کو خراب کرتے ہیں جب کہ کتے کے متعلق اطمینان ہے کہ وہ اس طرح رہے گا کہ مکان میں کوئی خرابی نہ پیدا کرے۔

لندن میں سو سے کچھ اوپر مسجدیں ہیں۔ یہ مسجدیں زیادہ تر رہائشی مکانات کے کمروں میں قائم کی گئی ہیں۔ البتہ پارک روڈ پر ایک باقاعدہ مسجد تعمیر کی گئی ہے جو کافی وسیع اور شاندار ہے اور اس کے ساتھ کلچرل سنٹر بھی قائم ہے۔ یہاں میں نے ۳ اگست کو عصر کی نماز پڑھی۔

مرکزی لندن کے ایک ہوٹل میں ہمارے لئے قیام کا انتظام تھا، اس میں ایک بڑا کمرہ نماز کے لئے خاص کیا گیا تھا۔ یہاں پانچوں وقت جماعت کے ساتھ نماز ادا کی جاتی تھی، مختلف ملکوں سے آئے ہوئے لوگوں کے مسلک بھی الگ الگ تھے۔ کوئی ایک ہاتھ کان پر رکھ کر اذان دیتا تھا اور کوئی دونوں ہاتھ۔ کوئی ہاتھ لٹکا کر نماز پڑھتا تھا کوئی ہاتھ باندھ کر۔ کوئی نماز کے بعد اجتماعی دعا کرتا تھا اور کوئی بغیر دعا کے نماز

ختم کر دیتا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔ مگر ان اختلافی مسائل پر یہاں نہ کوئی بحث ہوتی تھی اور نہ اختلاف۔ ہر ایک دوسرے کے مسلک پر اعتراض کئے بغیر اپنے مسلک کے مطابق نماز پڑھتا اور پھر باہم اس طرح ملتا جیسے ان کے درمیان کوئی فرق ہی نہیں۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ "مغربی علماء" ان "مشرقی علماء" سے بہتر ہیں جو انھیں امور پر باہم لڑتے رہتے ہیں حتیٰ کہ دینی مسجدیں اور مدرسے الگ الگ بنا لیتے ہیں۔ یہ در اصل میدان اختلاف میں فرق کا سوال ہے نہ کہ خود اختلاف کا۔ مشرقی علماء جب کسی مختلف مسلک والے آدمی پر تنقید کرتے ہیں تو وہ کفر و فسق کی اصطلاحوں میں کلام کرتے ہیں۔ اس کے برعکس مغربی تعلیم یافتہ لوگ اس معاملہ میں اپنے مغربی اساتذہ کی نقل کرتے ہیں، وہ اپنی اختلافی شدت کو حسین الفاظ اور خوبصورت اصطلاحات میں چھپا لیتے ہیں۔

ایک نوجوان جو ملیشیا سے آئے تھے۔ جوش و خروش کے ساتھ کہہ رہے تھے کہ ہم ملیشیا میں ایران کی اسلامی حکومت کے حق میں عوامی رائے کو موبیلائز کرنا چاہتے ہیں۔ مگر بعض اسلامی جماعتیں جن کو مخالف اسلام حکومتوں سے مدد ملتی ہے وہ ہم کو اس سے روکتی ہیں۔ اس کے نتیجہ میں وہاں مسلمان دو حصوں میں بٹ گئے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ کے اپنے ملک میں خود بہت سے اہم دینی مسائل ہیں، پھر آپ ان میں اپنی طاقت صرف کیجئے۔ آپ کو باہر کے مسائل میں اتنا زیادہ اپنے کو شامل کرنے کی کیا ضرورت۔ ان کا جواب یہ تھا: دنیا کی واحد اسلامی حکومت پر طاغوتی طاقتیں حملہ کر رہی ہیں پھر ہم خاموش کس طرح رہ سکتے ہیں۔

اس واقعہ کا ذکر میں نے ڈاکٹر اشفاق احمد صاحب (آسٹریلیا) سے کیا۔ انھوں نے بہت عمدہ بات کہی۔ انھوں نے کہا کہ اصل مسئلہ آدمی کی نفسیات (Psyche) کا ہے۔ اور نفسیات صرف دو قسم کی ہوتی ہے یا دنیوی یا اخروی۔ آدمی کی نفسیات اگر دنیوی طرز کی ہے تو وہ انھیں مسائل کو اہمیت دے گا جن میں کوئی دنیوی یا سیاسی پہلو ہو۔ وہ ان مسائل کی اہمیت کو نہیں سمجھ سکتا جو اپنے اندر اخروی پہلو رکھتے ہیں۔ آپ کو سب سے پہلے لوگوں کی نفسیات بدلنی چاہئے۔ اس کے بعد ہی وہ صحیح اسلامی طرز کو اختیار کر سکتے ہیں۔

۷ اگست کو ہم نے جمعہ کی نماز پارک روڈ پر لندن کی جامع مسجد میں پڑھی۔ کافی بڑی مسجد ہے۔ نمازیوں کی کثرت سے اس کے تمام گوشے بھرے ہوئے تھے۔ منبر کی طویل عربی تقریر دہلی کی جامع مسجد کی اردو تقریروں سے کچھ مختلف نظر نہیں آئی۔ اس فرق کے ساتھ کہ دہلی میں مسلمانوں پر ہندستانی ظلم کے خلاف داویلا ہوتا ہے اور وہاں فلسطینیوں پر یہودی ظلم کے خلاف داویلا کیا جا رہا تھا۔

نماز ادا کر کے ہم لوگ باہر نکلے تو ایرانیوں کی ایک جماعت سڑک کے کنارے مسجد کے گیٹ کے پاس کھڑی ہوئی تھی۔ ایک صاحب مجتہد والے لباس میں تھے اور بقیہ مغربی لباس میں۔ یہ لوگ مسلسل نعرے لگا رہے

INTERNATIONAL
HAJJ SEMINAR
LONDON

14–17 Shawwal 1402 / 4–7 August 1982
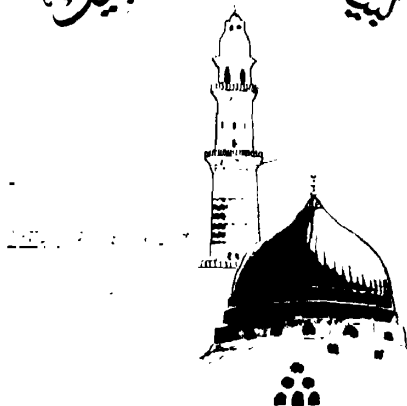
The International Hajj Seminar held in London from August 4-7, 1982, (Shawwal 13-16, 1402) attracted scholars, journalists and workers in the Islamic movement from all parts of the world. The seminar, held by the Muslim Institute of London, represented the geographical diversity of the *Ummah* as well as the many Schools of Thought in Islam.

The seminar produced papers and discussions on all aspects of Hajj and on the current situation, future imperatives and problems of the *Ummah* as a whole. Since the seminar was held in a free and non-governmental framework, it provided a unique opportunity for Muslims of all shades of opinion to express and exchange views on all topics of relevance to the Muslim *Ummah*.

Dr Al-Husseini of Iraq talked of the 'Philosophical Dimensions of Hajj,' but perhaps the best demonstration of philosophy of Hajj came from Maulana Waheed-uddin Khan, the well-known scholar from India, who put the Hajj in the context of the call to Islam (*da'wa*). He pointed out that the basic task of most prophets was the communication of the faith: but to the Prophet Ibrahim was assigned the special task of establishing the supremacy of religion, and to the Prophet Muhammad that of establishing its dominance. He explained that the divine scheme for universal guidance was divided into two stages: an initial one in Palestine and a final one in the Hejaz. The Ka'aba is thus the centre of the Islamic message and the Hajj is the annual gathering of those committed to its dissemination.

تھے۔ بہت سے لوگوں کے بیک وقت بولنے کی وجہ سے اتنا شور ہو رہا تھا کہ ان کے الفاظ سمجھنے میں مجھے دیر لگی۔ ان کے نعرے یہ تھے:

اللہ اکبر خمینی رہبر۔ مرگ بر منافق۔ مرگ بر امریکہ۔ حزب فقط حزب اللہ رہبر فقط روح اللہ۔ لا شرقیہ لا غربیہ جمہوریہ اسلامیہ

یہ لوگ اچھل رہے تھے، ہاتھ پھینک رہے تھے اور چیخ چیخ کر نعرے لگا رہے تھے۔ دل کا حال تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ مگر جہاں تک ظاہر کا تعلق ہے، مجھے ان کے چہروں پر دینی سنجیدگی نظر نہ آئی۔ میں نے سوچا: آج اگر صحابہ کرام ہوتے تو کیا وہ اسی طرح عمل کرتے۔

میرا مقالہ (حج کی دعوتی اہمیت) ۶ اگست ۱۹۸۲ کو صبح کی نشست میں تھا۔ میں اپنا مقالہ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں تیار کر کے لے گیا تھا۔ مگر وہاں ایک قابل لحاظ تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو اردو جانتے اور سمجھتے تھے۔ نیز تقریر کے ساتھ فوری ترجمہ کا عمدہ انتظام تھا۔ اس لئے میں نے اپنا مقالہ اردو میں پڑھا۔ البتہ مقالہ شروع کرنے سے پہلے چند جملے انگریزی میں کہے جن کا خلاصہ یہ تھا:

I am going to present my paper in Urdu. As the Arabic and English versions may be heard on your headsets, I hope you will not mind it

مسلم انسٹی ٹیوٹ (لندن) کی فرمائش پر میں نے دو مضامین تیار کئے تھے۔ ایک، حج کے فلسفے کے بارے میں۔ اور دوسرا حج کے مسائل پر۔ یہ دونوں مقالے (حج کی دعوتی اہمیت، حج کا طریقہ) دو الگ الگ پمفلٹ کی صورت میں انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے شائع کر کے تقسیم کئے گئے۔ اس کے علاوہ سمینار کے آخری دن ۷ اگست کو میری ایک تقریر ہوئی۔ اس تقریر میں حج کے اخلاقی پہلو کی وضاحت کی گئی۔ اس تقریر کا انگریزی ترجمہ بھی سائیکلو اسٹائل کر کے تقسیم کیا گیا۔ کناڈا کے پندرہ روزہ اخبار (کریسنٹ انٹرنیشنل) نے لندن کے حج سمینار پر جو رپورٹ شائع کی ہے اس کا ایک حصہ علیحدہ صفحہ پر نقل کیا جا رہا ہے۔

۸ اگست ۱۹۸۲ کی صبح کو ۱۰ بجے میں لندن سے واپس روانہ ہوا۔ تقریباً ۱۳ گھنٹے کی پرواز کے بعد مجھے رات کو دہلی پہنچ جانا چاہئے تھا۔ مگر وقت میں فرق کی وجہ سے یہ ہوا کہ جب میں دہلی پہنچا تو یہاں کی مقامی گھڑیوں میں صبح کے چار بج رہے تھے۔ لندن جاتے ہوئے میں نے تقریباً پانچ گھنٹے "حاصل" کئے تھے۔ لندن سے واپسی میں میں نے پانچ گھنٹے کھو دئے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر پانے کے لئے آدمی کو کچھ کھونا پڑتا ہے۔ اس دنیا میں کھوئے بغیر کسی کے لئے کچھ پانا ممکن نہیں۔

مدافعت نہ کہ جارحیت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعثت کے بعد مکہ میں تیرہ سال تک رہے۔ اس مدت میں مکہ کے منکروں کی طرف سے ہر قسم کا ظلم کیا گیا۔ مگر آپ صرف صبر کرتے رہے۔ آپ اپنے ساتھیوں سے ہمیشہ یہ کہتے کہ اپنے ہاتھ روکے رکھو (کفوا ایدیکم) ہجرت کے بعد قریش سے لڑائیاں شروع ہوئیں۔ مگر یہ لڑائیاں آپ کے لئے مدافعانہ لڑائیاں تھیں۔ کیونکہ ان لڑائیوں میں جارحیت کا مظاہرہ اولاً قریش کی طرف سے کیا گیا (وھم بدؤاکم اول مرۃ) سورۂ بقرہ میں مسلمانوں کو جنگ کا حکم دیتے ہوئے کہا گیا ہے وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم (۱۹۰) اس کی تشریح میں حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ کہتے ہیں: ای الذین یبدؤنکم بالقتال (یعنی ان سے جنگ کرو جنھوں نے تم سے جنگ میں ابتدا کی ہے)

ابتدائی تین بڑے غزوات مدینہ کی سرحد پر یا اس سے بہت قریب ہوئے۔ مدینہ سے مکہ کا فاصلہ ۲۰۰ میل ہے۔ مگر اسلام کا پہلا غزوہ بدر (رمضان ۲ھ) بدر نامی مقام پر ہوا جو مدینہ سے صرف ۲۰ میل کے فاصلہ پر ہے۔ دوسرا بڑا غزوہ احد (شوال ۳ھ) احد پہاڑ کے پاس ہوا جو مدینہ سے ۲ میل کے فاصلہ پر ہے۔ تیسرا بڑا غزوہ احزاب (ذی قعدہ ۵ھ) عین مدینہ کی سرحد پر ہوا۔ گویا ہر بار آپ کے مخالفین چڑھائی کرکے آپ کے مقام پر آئے۔ نہ کہ آپ چڑھائی کرکے ان کے مقام پر گئے۔

ان غزوات کا جغرافی محل وقوع ہی یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ آپ کے مخالفین نے آپ پر جارحانہ اقدام کیا تھا اور آپ صرف مدافعت میں ان کا مقابلہ کرنے کے لئے نکلے۔ یہ عملی دلیل اتنی واضح ہے کہ اس کے بعد کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں۔

اصل یہ ہے کہ اسلام کا انحصار اصلاً جس چیز پر ہے وہ دعوت ہے۔ دعوت اسلام کی سب سے بڑی قوت ہے جو ہمیشہ دوسری تمام قوتوں پر بالاثابت ہوتی ہے۔ اسلام کی پالیسی ہمیشہ یہ رہتی ہے کہ وہ اپنی اس بے خطا قوت کو استعمال کرے۔ اسلام میں صبر کی تاکید اسی لئے کی گئی ہے کہ مقابلہ کے میدان کو دعوت سے باہر نہ جانے دیا جائے۔ الا یہ کہ فریق ثانی خود ہی اپنی کارروائیوں کی وجہ سے مجبور کر دے۔

یہ یہودیت ہے

مفسر قرآن مولانا شبیر احمد عثمانی سورہ مائدہ (آیت ۲۷) کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "بنی اسرائیل کو جب یہ حکم دیا گیا کہ ظالموں اور جابروں سے قتال کرو تو وہ خوف زدہ ہو کر بھاگنے لگے۔ اس کے مقابلہ میں انتقی اور مقبول بندوں کا قتل جو شدید ترین جرائم میں سے ہے اس کے لئے یہ ملعون ہمیشہ مستعد اور تیار نظر آتے ہیں۔ پہلے بھی کتنے نبیوں کو قتل کیا اور آج بھی خدا کے سب سے بڑے پیغمبر کے خلاف ازراہ بغض وحسد کیسے کیسے منصوبے گانٹھتے رہتے ہیں۔ گویا ظالموں اور شریروں کے مقابلہ سے جان چرانا اور بے گناہ معصوم بندوں کے خلاف قتل وسزا کی سازشیں کرنا یہ قوم (یہود) کا شیوہ رہا ہے اور اس پر نحن ابناء اللہ واحباءہ کا دعویٰ بھی رکھتے ہیں صفحہ ۱۴۴)

مولانا عثمانی کا مذکورہ اقتباس ایک اہم قرآنی حقیقت کو بتا رہا ہے۔ قرآن میں یہود کو ملعون قرار دیا گیا ہے۔ یہ ملعونیت نسل اور قوم کی بنا پر نہیں ہے بلکہ کردار کی بنا پر ہے۔ مزید قرآن میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ اس کا تعلق صرف یہود سے نہیں ہے۔ نام نہاد مسلمان اگر اسی قسم کے کردار کا ثبوت دیں تو ان کا انجام بھی وہی ہوگا جو یہود کے لئے مقدر کیا گیا ہے (لیس بامانیکم ولا امانی اهل الکتاب من یعمل سوءًا یجز بہ، النساء ۱۲۳)

یہود کا ایک کردار، قرآن کے مطابق یہ ہے کہ آدمی کا یہ حال ہو کہ شریر قسم کے لوگوں سے معاملہ پڑے تو وہ بزدل بن جائے اور سیدھے سادے نیک لوگوں کے لئے وہ بھیڑیا ثابت ہو۔ خدا کا خوف اس کے ہاتھ اور پاؤں کو نہ روکے مگر جب معاملہ طاقت ور قسم کے لوگوں سے ہو تو وہ فوراً درست ہو جائے۔ حق اور انصاف کی بات اس پر اثرانداز نہ ہو مگر ڈنڈے کی منطق سامنے ہو تو وہ فوراً راہ راست پر آجائے۔

اس قسم کا کردار یہودی کردار ہے۔ وہ خواہ غیر یہودیوں سے ظاہر ہو، اس کا انجام خدا کے یہاں وہی ہے جو معروف یہودیوں کے لئے مقدر کیا گیا ہے۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَأَنْ لَّمْ يَلْبَثُوٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُوْنَ بَيْنَهُمْ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿۴۵﴾ وَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۴۷﴾

اور جس دن اللہ ان کو جمع کرے گا، گویا کہ وہ بس دن کی ایک گھڑی دنیا میں تھے۔ وہ ایک دوسرے کو پہچانیں گے۔ بے شک سخت گھاٹے میں رہے وہ لوگ جنھوں نے اللہ سے ملنے کو جھٹلایا اور وہ راہ راست پر نہ آئے۔ ہم تم کو اس کا کوئی حصہ دکھا دیں جس کا ہم ان سے وعدہ کر رہے ہیں یا تمھیں وفات دے دیں، بہر حال ان کو ہماری ہی طرف لوٹنا ہے، پھر اللہ گواہ ہے اس پر جو کچھ وہ کر رہے ہیں۔ اور ہر امت کے لئے ایک رسول ہے۔ پھر جب ان کا رسول آجاتا ہے تو ان کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور ان پر کوئی ظلم نہیں ہوتا ۴۷ - ۴۵

آج آخرت انسان کے سامنے نہیں ہے۔ آج ایک دیکھنے والے کو اسے تصور کی نگاہ سے دیکھنا پڑتا ہے۔ اس لئے جو شخص آخرت کے معاملہ میں سنجیدہ نہ ہو اس کو آخرت بہت دور کی چیز معلوم ہوگی۔ مگر جب آخرت سب سے بڑی حقیقت کی حیثیت سے انسان کے اوپر ٹوٹ پڑے گی اور وہ اس کو اس کی تمام سنگینیوں کے ساتھ اپنی آنکھ سے دیکھنے لگے گا، اس وقت وہ اپنی موجودہ سرکشی کو بھول جائے گا، اس وقت اس کو دنیا کے وہ لمحات بہت حقیر معلوم ہوں گے جن کی وجہ سے وہ غفلت میں پڑ گیا تھا اور آخرت کے بارے میں سوچنے پر تیار نہ ہوتا تھا۔

آخرت کسی اجنبی دنیا میں واقع نہیں ہوگی بلکہ ہماری جانی پہچانی دنیا میں واقع ہوگی۔ وہاں آدمی اپنے آپ کو اسی ماحول میں پائے گا جس ماحول میں اس نے اس سے پہلے حق کا انکار کیا تھا، وہ اپنے آپ کو انھیں لوگوں کے درمیان دیکھے گا جن کے بل پر وہ سرکشی کرتا تھا مگر اس دن وہ لوگ اس کے کچھ کام نہ آئیں گے۔ اس وقت ہر بات اس کے ذہن میں اس طرح تازہ ہوگی گویا اس پر کوئی مدت گزری ہی نہیں۔

داعی اور مدعو کا معاملہ آسمان کے نیچے پیش آنے والے تمام معاملات میں سب سے زیادہ نازک معاملہ ہے۔ داعی اگر فی الواقع حق کو لے کر اٹھا ہے تو وہ اس دنیا میں خدا کا نمائندہ ہے۔ اس کا اقرار خدا کا اقرار ہے اور اس کا انکار خدا کا انکار۔ ایسا ایک واقعہ انجام سے خالی نہیں ہو سکتا۔ داعیٔ حق کے ظہور کے بعد لازماً ایسا ہوتا ہے کہ اس کی زبان سے جاری ہونے والے ربانی کلام کے سامنے تمام لوگ بے دلیل ہو کر رہ جاتے ہیں۔ یہ باطل

کے اوپر حق کی پہلی فتح ہے۔ دوسری فتح آخرت میں ہوگی جب کہ اس کے مخالفین خدا کے اذن سے اس کے مقابلہ میں بے زور ہو کر رہ جائیں گے۔ پہلا واقعہ لازمی طور پر اسی دنیا میں پیش آتا ہے اور دوسرا واقعہ بھی جزئی طور پر موجودہ دنیا میں ظاہر ہوتا ہے اگر خدا اس کو موجودہ دنیا میں ظاہر کرنا چاہے۔

یہ معاملہ ہر گروہ کے ساتھ پیش آنا لازمی ہے جب کہ وہ براہ راست خدا کے سامنے کھڑا ہونے سے پہلے موجودہ دنیا میں بالواسطہ طور پر نمائندۂ خدا کے سامنے کھڑا کیا جائے۔ اس طرح خدا دیکھتا ہے کہ کون ہے جو اس وقت اپنے آپ کو خدا کے حوالے کر دیتا ہے جب کہ خدا ابھی غیب میں ہے اور کون ہے جو ایسا نہیں کرتا۔ پہلی قسم کے لوگوں کے لئے جنت ہے اور دوسری قسم کے لوگوں کے لئے دوزخ۔

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿٤٨﴾ قُل لَّا أَمْلِكُ لِنَفْسِي ضَرًّا وَلَا نَفْعًا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ ۗ لِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ۚ إِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً ۖ وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ﴿٤٩﴾ قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَتَاكُمْ عَذَابُهُ بَيَاتًا أَوْ نَهَارًا مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُونَ ﴿٥٠﴾ أَثُمَّ إِذَا مَا وَقَعَ آمَنتُم بِهِ ۚ آلْآنَ وَقَدْ كُنتُم بِهِ تَسْتَعْجِلُونَ ﴿٥١﴾ ثُمَّ قِيلَ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا ذُوقُوا عَذَابَ الْخُلْدِ هَلْ تُجْزَوْنَ إِلَّا بِمَا كُنتُمْ تَكْسِبُونَ ﴿٥٢﴾

اور وہ کہتے ہیں کہ یہ وعدہ کب پورا ہوگا اگر تم سچے ہو۔ کہو میں اپنے واسطے بھی برے اور بھلے کا مالک نہیں، مگر جو اللہ چاہے۔ ہر امت کے لئے ایک وقت ہے۔ جب ان کا وقت آجاتا ہے تو پھر نہ وہ ایک گھڑی پیچھے ہوتے اور نہ آگے۔ کہو کہ بتاؤ، اگر اللہ کا عذاب تم پر رات کو آپڑے یا دن کو آجائے تو مجرم لوگ اس سے پہلے کیا کر لیں گے۔ پھر کیا جب عذاب واقع ہو چکے گا تب اس پر یقین کرو گے۔ اب قائل ہوئے اور تم اسی کا تقاضا کرتے تھے، پھر ظالموں سے کہا جائے گا کہ اب ہمیشہ کا عذاب چکھو۔ یہ اسی کا بدلہ مل رہا ہے جو کچھ تم کماتے تھے۔

۴۸ - ۵۲

انسان موجودہ دنیا میں اپنے کو آزاد پاتا ہے۔ وہ بظاہر دیکھتا ہے کہ وہ جو چاہے کرے، کوئی اس کو پکڑنے والا نہیں، کوئی اس کو سزا دینے والا نہیں۔ یہ صورت حال اس کو بھلاوے میں ڈال دیتی ہے۔ حتی کہ خدا کا داعی جب اس کو اس کے عمل کے انجام سے ڈراتا ہے تو وہ خدا کے داعی کا مذاق اڑانے لگتا ہے۔ وہ کہتا ہے ـــــ ہماری سرکشی پر تم جس عذاب کی دھمکی دے رہے ہو وہ کب پوری ہوگی۔

اس قسم کی باتوں کا سبب نادانی کے سوا اور کچھ نہیں۔ کیونکہ یہ پکڑ خود داعیٔ حق کی طرف سے نہیں آنے والی ہے بلکہ خدا کی طرف سے آنے والی ہے۔ اور خدا ہر آن اپنی دنیا میں بتا رہا ہے کہ اس کا طریقہ جلدی کا طریقہ نہیں۔

کشتی میں سوراخ ہو اور کوئی ملاح اس کی پروانہ کرتے ہوئے اپنی کشتی کو دریا میں ڈال دے تو خدا کا لازمی قانون ہے کہ ایسی کشتی پانی میں ڈوب جائے۔ مگر ایسی کشتی فوراً پانی میں نہیں ڈوبتی بلکہ خدا کی سنت کے مطابق اپنے مقرر وقت پر ڈوبتی ہے۔ اس قسم کی مثالیں دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں جو انسان کو خدائی سنت کا تعارف کرا رہی ہیں مگر ان کو دیکھنے کے باوجود وہ کہتا ہے کہ اگر ان اعمال پر خدا کا عذاب ہے تو وہ عذاب جلد کیوں نہیں آجاتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان خدا کی پکڑ کے بارے میں سنجیدہ نہیں۔

زلزلہ اور طوفان خدائی واقعات ہیں۔ یہ واقعات بتاتے ہیں کہ جب معاملہ خدا اور انسان کے درمیان ہو تو فیصلہ کا اختیار تمام تر صرف فریق اول کو ہوتا ہے۔ مگر انسان اس پہلو پر غور نہیں کرتا۔ وہ صرف یہ دیکھتا ہے کہ خدا کا قانون فوراً حرکت میں نہیں آرہا ہے اور چونکہ وہ فوراً حرکت میں نہیں آتا اس لئے وہ غفلت میں پڑا رہتا ہے۔ مگر جب خدا کا فیصلہ آئے گا تو اس وقت انسان اپنے کو بے بس پاکر سب کچھ مان لے گا۔ حالانکہ اس وقت کا ماننا کچھ کام نہ آئے گا۔ کیونکہ وہ عمل کا انجام پانے کا وقت ہوگا نہ کہ عمل کرنے کا۔

وَيَسْتَنْبِئُونَكَ أَحَقٌّ هُوَ ۖ قُلْ إِي وَرَبِّي إِنَّهُ لَحَقٌّ ۖ وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ ﴿٥٣﴾ وَلَوْ أَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِي الْأَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهِ ۗ وَأَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَأَوُا الْعَذَابَ ۖ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ۚ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿٥٤﴾ أَلَا إِنَّ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ أَلَا إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٥٥﴾ هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٥٦﴾

اور وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ کیا یہ بات سچ ہے۔ کہو کہ ہاں میرے رب کی قسم یہ سچ ہے اور تم اس کو تھکا نہ سکو گے۔ اور اگر ہر ظالم کے پاس وہ سب کچھ ہو جو زمین میں ہے تو وہ اس کو فدیہ میں دے دینا چاہے گا اور جب وہ عذاب کو دیکھیں گے تو اپنے دل میں پچھتائیں گے۔ اور ان کے درمیان انصاف سے فیصلہ کردیا جائے گا اور ان پر ظلم نہ ہوگا۔ یاد رکھو جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اللہ کا ہے، یاد رکھو اللہ کا وعدہ سچا ہے مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔ وہی زندہ کرتا ہے اور وہی مارتا ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے ۵۳ — ۵۶

عرب کے لوگوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ اگر تم نے اپنی اصلاح نہ کی تو تم کو آخرت کا

عذاب پکڑلے گا۔ اس کے جواب میں وہ آپ کی بات کا مذاق اڑانے لگے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ لوگ آخرت کے منکر تھے۔ وہ دراصل پیغمبر اسلام کی تنبیہ کو بے وزن سمجھ رہے تھے نہ کہ نفس آخرت کو۔ پیغمبر اسلام کی عظمت اس وقت تک مسلّم نہ ہوئی تھی۔ اس وقت آپ کے مخاطبین آپ کو ایک معمولی انسان کے روپ میں دیکھتے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ایسے معمولی انسان کی بات نہ ماننے سے ان کے اوپر خدا کا عذاب کیسے آجائے گا۔ انھیں آپ کے نمائندۂ خدا ہونے پر شک تھا نہ کہ خود خدا اور آخرت پر۔

یہ تقابل حقیقۃً اقرار آخرت اور انکار آخرت کے درمیان نہ تھا۔ بلکہ بڑی شخصیت کے دین اور چھوٹی شخصیت کے دین کے درمیان تھا۔ وہ ماضی کے مشہور بزرگوں کے ساتھ اپنے کو منسوب کرتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو مسلّمہ شخصیتوں کے دین پر سمجھتے تھے۔ اس کے مقابلہ میں جب وہ سامنے کے پیغمبر کو دیکھتے تو وہ ان کو ایک معمولی انسان کے روپ میں نظر آتا۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ تاریخ کی جن بڑی بڑی شخصیتوں کے ساتھ وہ اپنے کو وابستہ کئے ہوئے ہیں، ان سے وابستگی ان کے لئے باعث نجات نہ ہو۔ بلکہ نجات کے لئے یہ ضروری ہو کہ وہ اپنے آپ کو اس شخص کے ساتھ وابستہ کریں جس کو بظاہر کوئی تقدس اور عظمت حاصل نہیں۔ یہی وہ نفسیات تھی جس کی وجہ سے ان کو یہ جرأت ہوئی کہ وہ آپ کا مذاق اڑائیں۔

آدمی ایک حساس مخلوق ہے۔ وہ تکلیف کو برداشت نہیں کرسکتا۔ دنیا میں جب تک اس کو عذاب کا سامنا نہیں ہے وہ حق کا مذاق اڑاتا ہے۔ وہ اس کو بے نیازی کے ساتھ ٹھکرا دیتا ہے۔ مگر جب آخرت کا عذاب سامنے ہوگا تو اس پر اتنی گھبراہٹ طاری ہوگی کہ سب کچھ اس کو حقیر معلوم ہونے لگے گا۔ ساری دنیا کی دولت اور تمام دنیا کی نعمت بھی اگر اس کے پاس ہو تو عذاب کے مقابلہ میں وہ اتنی بے قیمت نظر آئے گی کہ وہ چاہے گا کہ سب کچھ دے کر صرف اتنا ہوجائے کہ وہ اس تکلیف سے نجات پاجائے۔

مگر آخرت کا مسئلہ کوئی سودے بازی کا مسئلہ نہیں۔ وہ تو اپنے کئے کا انجام بھگتنے کا مسئلہ ہے۔ زندگی اور موت کے بارے میں خدا کا جو منصوبہ ہے اس کا یہ لازمی جزء ہے۔ خدائی انصاف کا تقاضا ہے کہ وہ ہو۔ اور خدائی قدرت اس بات کی ضمانت ہے کہ وہ بہرحال ہوکر رہے گا۔

اس کے پیش آنے میں جو کچھ دیر ہے وہ صرف اس مقررہ وقت کے آنے کی ہے جب کہ موجودہ امتحان کی مدت ختم ہو اور سارے انسان خدا کے یہاں اپنے آخری انجام کا فیصلہ سننے کے لئے حاضر کردئے جائیں۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُم مَّوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِى ٱلصُّدُورِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ ﴿٥٧﴾ قُلْ بِفَضْلِ ٱللَّهِ وَبِرَحْمَتِهِۦ فَبِذَٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوا۟ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ ﴿٥٨﴾ قُلْ أَرَءَيْتُم مَّآ أَنزَلَ ٱللَّهُ لَكُم مِّن رِّزْقٍ فَجَعَلْتُم مِّنْهُ حَرَامًا وَحَلَٰلًا قُلْ ءَآللَّهُ أَذِنَ لَكُمْ أَمْ عَلَى ٱللَّهِ تَفْتَرُونَ ﴿٥٩﴾ وَمَا ظَنُّ ٱلَّذِينَ

يَفْتَرُونَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۶۰﴾

اے لوگو، تمھارے پاس تمھارے رب کی جانب سے نصیحت آگئی اور اس کے لئے شفا رجو سینوں میں ہوتی ہے اور اہل ایمان کے لئے ہدایت اور رحمت۔ کہو کہ یہ اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے ہے۔ اب چاہئے کہ لوگ خوش ہوں، یہ اس سے بہتر ہے جس کو وہ جمع کر رہے ہیں۔ کہو، یہ بتاؤ کہ اللہ نے تمھارے لئے جو رزق اتارا تھا، پھر تم نے اس میں سے کچھ کو حرام ٹھہرایا اور کچھ کو حلال۔ کہو، کیا اللہ نے تم کو اس کا حکم دیا ہے یا تم اللہ پر جھوٹ لگا رہے ہو۔ اور قیامت کے دن کے بارے میں ان لوگوں کا کیا خیال ہے جو اللہ پر جھوٹ لگا رہے ہیں۔ بیشک اللہ لوگوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے، مگر اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے ۶۰ — ۵۷

انسان ایک نفسیاتی مخلوق ہے۔ نفسیات کے بننے سے وہ بنتا ہے اور نفسیات کے بگڑنے سے وہ بگڑ جاتا ہے۔ خدا کی کتاب کی صورت میں جو ہدایت اتری ہے وہ انسان کے لئے سراسر رحمت ہے۔ اس میں انسان کے لئے بہترین نصیحت موجود ہے۔ مگر اس نصیحت کو پانے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی نے اپنی راست فکری نہ کھوئی ہو۔ جو شخص اپنی راست فکری کی صلاحیت کو بگاڑ لے، اس کے لئے خدا کا نصیحت نامہ بے اثر رہے گا۔

موجودہ دنیا کی چیزیں اور اس کی رونقیں آدمی کے سامنے "نقد" ہوتی ہیں۔ آدمی ہر آن ان کی لذت اور خوبی کا تجربہ کرتا ہے، اس کے مقابلہ میں آخرت کی نعمتیں صرف "وعدہ" کی حیثیت رکھتی ہیں۔ آدمی صرف ان کے بارے میں سنتا ہے، وہ ان کا تجربہ نہیں کرتا۔ اس بنا پر اکثر لوگ دنیا کی نقد چیزوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ مگر جو شخص گہرائی کے ساتھ سوچے گا وہ اس بات پر خوش ہوگا کہ خدا نے اپنی ہدایت اتار کر اس کے لئے ابدی نعمتوں کے حصول کا دروازہ کھول دیا ہے۔

اللہ نے جو کچھ انسان کو دیا ہے، خواہ وہ زرعی پیداوار کی صورت میں ہو یا دوسری صورت میں، سب کا سب رزق ہے۔ آدمی اگر ان چیزوں کو خدا کا دیا ہوا سمجھے اور خدا کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق ان میں تصرف کرے تو اس کے اندر خدا کے شکر کا جذبہ ابھرے گا۔ مگر شیطان ہمیشہ اس کوشش میں رہتا ہے کہ وہ اس نسبت کو بدل دے، تاکہ اس "رزق" کے استعمال کے وقت آدمی کو خدا کی یاد نہ آئے بلکہ دوسری دوسری چیزوں کی یاد آئے —— قدیم زمانہ میں شیطان نے پیداوار میں مفروضہ دیوی دیوتاؤں کے مراسم مقرر کئے تاکہ آدمی ان کو لیتے ہوئے خدا کو یاد نہ کرے بلکہ دیوی دیوتاؤں کو یاد کرے۔ موجودہ زمانہ میں یہی مقصد شیطان مادی توجیہات کے ذریعہ حاصل کر رہا ہے۔ وہ خدا کی طرف سے ملنے والی چیز کو مادی عوامل کے تحت ملنے والی چیز بنا کر لوگوں کو دکھا رہا ہے تاکہ لوگ جب ان نعمتوں کو پائیں تو وہ اس کو خدا کا رزق نہ سمجھیں بلکہ صرف مادہ کا کرشمہ سمجھیں۔

قومی مقابلے

غالباً ۱۹۳۲ کا واقعہ ہے، ڈی اے وی کالج لاہور میں تاریخ کے استاد لالہ ابلاغ رائے نے ایک مقالہ شائع کیا۔ یہ مقالہ اخبار ٹریبیون میں چھپا۔ اس میں انھوں نے تحقیقات پیش کرتے ہوئے ثابت کیا تھا کہ جنوبی امریکہ کی دریافت کرنے والے ایک ہندو مذہبی رہنما تھے جن کا نام ارجن دیو تھا۔ ارجنٹینا (Argentina) انھیں ارجن دیو کے نام پر ہے جو جنوبی امریکہ کا ایک ساحلی ملک ہے۔

لالہ ابلاغ رائے کا یہ مقالہ شائع ہوا تو مسلمانوں میں کھلبلی شروع ہوئی۔ مسلمانوں کو نظر آیا کہ ہندو ان سے بازی لے گئے ہیں۔ اس کے بعد مولانا ظفر علی خاں اٹھے اور انھوں نے مسلمانوں کے جذبات کی تسکین کا سامان فراہم کیا۔ مولانا ظفر علی خاں نے اپنے اخبار زمیندار میں ایک مضمون شائع کیا۔ اس میں انھوں نے ثابت کیا کہ جنوبی امریکہ کی دریافت ایک مسلم درویش حضرت شیخ چلی رحمۃ اللہ علیہ نے کی تھی۔ چنانچہ جنوبی امریکہ کا ایک ملک آج تک انھیں کے نام پر منسوب چلا آرہا ہے۔ اس ملک کا نام چلی (Chile) ہے (ہفت روزہ اخبار جہاں کراچی، ۶ فروری ۱۹۷۷)

یہ ایک دلچسپ مثال ہے جو بتاتی ہے کہ موجودہ صدی کے نصف اول میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں کس قسم کے قومی مقابلے جاری تھے۔ اس مزاج کا یہ نتیجہ ہوا کہ مسلمان اپنے حقیقی دین کو زندہ کرنے کے بجائے اس کوشش میں لگ گئے کہ وہ ہندو قوم کی ہر چیز کا ایک اسلامی جواب اپنے یہاں فراہم کریں — جنم اشٹمی کے جواب میں جشن میلاد، ہولی کے جواب میں شب برات، ہندو مہا بھارت کے جواب میں شاہنامہ اسلام، ڈاوری کے جواب میں جہیز، کریاکرم کے جواب میں میت کی رسوم، حتی کہ بت پرستی کے جواب میں قبر پرستی، وغیرہ اس قسم کی بے شمار رسوم جو ہمارے یہاں نظر آتی ہے وہ سب اسی جوابی ذہنیت کا نتیجہ ہے۔

اس کوشش میں مسلمانوں نے اپنے قومی فخر کے لئے تو ضرور نئے نئے سامان فراہم کرلئے مگر اصلی اور حقیقی دین سے وہ دن بدن دور ہوتے چلے گئے۔ ان کا دین حقیقۃً خدا کا دین نہ رہا بلکہ خدا کے دین کا ہندستانی اڈیشن بن کر رہ گیا۔

قومی ریس سے پیدا ہونے والا مذہب قومی مذہب ہے نہ کہ خدائی مذہب۔ ایسے مذہب سے قومی جذبات کو تسکین مل سکتی ہے۔ مگر وہ خدا کو خوش کرنے کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔ خدا اس مذہب کو زندہ کرنے سے خوش ہوگا جو اس نے اتارا ہے نہ کہ اس مذہب سے جو ہم خود اپنے قومی کارخانہ میں ڈھال کر تیار کرلیں۔

نسئ اور کبیسہ کا فرق

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ایک اعتراض کرتا ہے۔ بظاہر دیکھنے والوں کو اس کا اعتراض درست نظر آتا ہے۔ مگر جب گہرائی کے ساتھ اس کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اعتراض محض ایک سرسری رائے زنی تھی نہ کہ حقیقی معنوں میں کوئی واقعی اعتراض۔ وہ الفاظ کا ایک مجموعہ تھا نہ کہ معانی کا اظہار۔ اس سلسلہ میں یہاں ایک مثال لیجئے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

ان عدة الشھور عند اللہ اثنا عشر شھرا فی کتاب اللہ یوم خلق اللہ السمٰوٰت و الارض منھا اربعة حرم ذلک الدین القیم فلا تظلموا فیھن انفسکم وقاتلوا المشرکین کافة کما یقاتلونکم کافة واعلموا ان اللہ مع المتقین۔ انما النسئ زیادة فی الکفر یُضَلُّ بہ الذین کفروا یحلونہ عاما ویحرمونہ عاماً لیواطئوا عدة ما حرم اللہ فَیُحِلّوا ما حرم اللہ زین لھم سوء اعمالھم واللہ لا یھدی القوم الکافرین (التوبہ ۳۶-۳۷)

مہینوں کا شمار کتاب الٰہی میں اللہ کے نزدیک بارہ مہینے ہیں جس روز اس نے آسمان اور زمین پیدا کئے۔ ان میں چار مہینے حرمت کے ہیں۔ یہی دین قیم ہے۔ پس تم ان میں اپنا نقصان نہ کرو۔ اور مشرکین سے سب سے لڑو جیسا کہ وہ تم سب سے لڑ رہے ہیں۔ اور جان لو کہ اللہ متقیوں کے ساتھ ہے۔ مہینوں کو ہٹانا کفر کی بڑھائی ہوئی بات ہے جس سے اہل کفر گمراہ کئے جاتے ہیں کہ وہ حرام مہینہ کو کسی سال حلال کر لیتے ہیں اور کسی سال اس کو حرام رکھتے ہیں تاکہ اللہ نے جو مہینے حرام کئے ہیں ان کی گنتی پوری کر لیں۔ پھر وہ اللہ کے حرام کئے ہوئے کو حلال کر لیتے ہیں۔ اور اللہ منکروں کو راستہ نہیں دکھاتا۔

اس آیت میں نسئ (مہینوں کو ہٹانے) کا جو ذکر ہے اس پر بعض لوگوں نے یہ اعتراض کیا ہے کہ یہ ایک فلکیاتی مسئلہ کو غیر ضروری طور پر کفر و اسلام کا مسئلہ بناتا ہے۔ انھوں نے اسے قمری سال کو شمسی سال کے مطابق بنانے کے معنی میں لیا اور پھر کہا کہ اس معاملہ کا اسلام اور کفر سے کیا تعلق۔ مگر یہ اعتراض نسئ اور کبیسہ کے فرق کو ملحوظ نہ رکھنے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ قرآن کی مذکورہ آیت میں نسئ کو زیادة فی الکفر کہا گیا ہے نہ کہ کبیسہ کو۔ اگرچہ نسئ میں بھی مہینوں کو ہٹانے کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے اور کبیسہ میں بھی مہینوں کو ہٹانے کا۔ مگر دونوں چیزیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ نسئ سے مراد حرام مہینہ کو اس کی جگہ سے ہٹا کر غیر حرام مہینہ کو وہاں رکھنا ہے۔ جب کہ کبیسہ کا مطلب یہ ہے کہ قمری مہینوں کے دنوں میں اضافہ کر کے (یا اس کو ہٹا کر) شمسی مہینوں کے برابر کر لیا جائے۔ اول الذکر ایک مذہبی معاملہ ہے۔ اور دوسرا

خالص شماریاتی معاملہ۔

ابراہیمی شریعت میں سال کے چار مہینے (ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم، رجب) حرام مہینے قرار دے گئے تھے۔ ان مہینوں میں لڑائی اور خوں ریزی مطلق طور پر ممنوع تھی۔ بعد کے زمانہ میں جب قبائل عرب میں سرکشی پیدا ہوئی تو انھوں نے اس قانون کی پابندی سے بچنے کے لئے نسئ کا طریقہ ایجاد کیا۔ نسئ کے لفظی معنی ہیں ہٹانا، چنانچہ جب کوئی قبیلہ کسی وجہ سے دوسرے قبیلہ پر چڑھائی کرنا چاہتا اور وہ حرام مہینہ تو قبیلہ کا سردار یہ اعلان کر دیتا کہ امسال ہم نے فلاں مہینہ کو ہٹا دیا ہے۔ مثلاً محرم کو حرام مہینوں سے نکال کر اس کی جگہ صفر کو حرام کر دیا ہے اور صفر کو اس کی جگہ سے ہٹا کر وہاں محرم کا مہینہ رکھ دیا ہے یہ نسئ ہے اور اسی کو قرآن میں زیادۃٌ فی الکفر کہا گیا ہے۔

۱۔ کبیسہ اس کے برعکس ایک خالص کلینڈر کا معاملہ ہے۔ اس کی دو صورتیں ہیں۔ اول یہ کہ شمسی گردش کے مطابق سال ¼ ۳۶۵ دن کا ہوتا ہے۔ جب کہ ہمارا سال ۳۶۵ دن کا شمار ہوتا ہے۔ یہ ¼ دن جمع ہو کر چوتھے سال ۳۶۶ دن بن جاتے ہیں۔ سال کبیسہ اس سال کو کہتے ہیں جو ۳۶۶ دن کا اس بنا پر ہر چوتھے سال شمسی کلنڈر میں فروری کا مہینہ ۲۹ دن کا کر دیا جاتا ہے تاکہ سال کے ایا برابر کئے جا سکیں۔

سال کبیسہ چونکہ ہمیشہ چار سال پر پیش آتا ہے، اس لئے اس کی سادہ پہچان یہ ہے کہ اس کا عد ٹھیک چار پر برابر برابر تقسیم ہو جاتا ہے۔ مثلاً ۱۹۸۰، ۱۹۸۴ وغیرہ۔ یہ وہی چیز ہے جس کو انگریزی میں کا سال (Leap Year) کہا جاتا ہے۔

۲۔ کبیسہ کی دوسری صورت وہ ہے جو قمری مہینوں کے ساتھ پیش آتی ہے۔ ۳۵۴ دنوں قمری سال شمسی سال سے ۱۱ دن کم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے دونوں کے درمیان ہر ۳۳ سال میں ایک سال کا اور ہر ایک صدی میں ۳ سال کا فرق ہو جاتا ہے۔ اس فرق کو ختم کرنے کے لئے کچھ قوموں نے دنوں کے اضافہ (Intercalation) کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ وہ ہر سال قمری مہینوں میں ایک ایک دن کا اضافہ کر کے سال میں گیارہ دن بڑھا لیتے ہیں اور اس طرح قمری کلینڈر کو شمسی کلینڈر کے مطابق کر لیتے ہیں۔

مذکورہ تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام میں جو چیز منع کی گئی ہے وہ سادہ طور پر صرف مہینہ کی تبدیلی نہیں ہے بلکہ خدا کے حرام کو حلال کرنے کے لئے مہینوں میں تبدیلی ہے۔ گویا اصل برائی حرام و حلال قوانین کو بدلنا ہے نہ کہ محض مہینوں کو (کیلنڈر کی درستگی کے لئے) بدلنا۔

کائناتی منصوبہ بندی

موجودہ زمانہ میں آواز کی رفتار سے زیادہ تیز چلنے والے ہوائی جہاز بنائے گئے ہیں۔ یہ جہاز بننے کے بعد جب امریکہ میں اڑائے گئے تو معلوم ہوا کہ وہ انسانی صحت کے لئے خطرہ ہیں۔ کیونکہ ان کی وجہ سے ہوا میں گیسوں کا قیمتی تناسب بدل جاتا ہے۔ چنانچہ امریکہ میں اس قسم کے جہازوں کی پرواز پر پابندی لگا دی گئی۔

یہی معاملہ انسان کے تمام منصوبوں کا ہے۔ آدمی ایک گھر بناتا ہے مگر جب وہ اس میں رہنا شروع کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں فلاں فلاں کمی رہ گئی۔ وہ سڑکیں اور لائنیں بچھاتا ہے مگر کچھ عرصہ کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ ضرورت کے مطابق کرنے کے لئے اس میں فلاں فلاں ترمیم کی ضرورت ہے۔ اسی طرح انسانی تمدن کے ہر شعبہ میں ترمیم و اصلاح کا کام مسلسل جاری رہتا ہے

یہ انسانی تعمیرات کا حال ہے مگر کائنات کے عظیم کارخانے کا معاملہ اس سے سراسر مختلف ہے۔ کائنات میں بے شمار چیزیں ہیں ——— ستارے، زمین، معدنیات، پہاڑ، عرقیات، گیسیں، درخت، جانور، روشنی، حرارت، کشش، انسان وغیرہ۔ یہ چیزیں بے شمار صورتوں میں وسیع کائنات کے اندر پھیلی ہوئی ہیں۔ مگر وہ اول روز سے انتہائی کامل صورت میں موجود ہیں۔ ان کے خالق کو انھیں پیدا کرنے کے بعد دوبارہ نظر ثانی کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

سورج اور زمین کا فاصلہ، معدنیات میں جواہر کی ترکیب، پانی اور ہوا میں گیسوں کا تناسب درخت اور پودوں کی نشوونما کا اصول، حیوان اور انسان کا جسمانی ڈھانچہ۔ غرض ہر چیز اول روز سے کامل اور مکمل ہے۔ کسی چیز میں بھی ادنیٰ نظر ثانی کی ضرورت نہیں۔ ہر چیز عین ویسی ہے جیسا کہ فی الواقع اسے ہونا چاہئے۔

یہ واقعہ ثابت کرتا ہے کہ جس ہستی نے کائنات کو بنایا ہے وہ قادر مطلق ہے اور اسی کے ساتھ عالم الغیب بھی ——— مکمل قدرت اور غیب سے کامل آگہی کے بغیر ایسا معیاری منصوبہ بنانا ممکن نہیں جس میں کبھی نظر ثانی کی ضرورت پیش نہ آئے۔

اس دن کیا ہوگا

خدا ہر چیز کا مالک ہے۔ دنیا میں کسی کو جو کچھ ملتا ہے خدا کے دئے سے ملتا ہے۔ خدا کے سوا کسی کے پاس کوئی چیز ہی نہیں جو وہ کسی کو دے سکے۔ ایسی حالت میں اگر کچھ لوگ ایسا کریں کہ ایک شخص کو جائز طور پر ملی ہوئی چیز کو اس سے چھیننے لگیں تو گویا وہ خدا کے دئے کو چھین رہے ہیں، وہ خدا کے منصوبہ کو باطل کرنا چاہتے ہیں۔

دنیا میں ایک شخص کو مکان ملے مگر کچھ لوگ اس کو بے گھر کرنے کی سازشیں کریں۔ اس کی معاش کا جائز انتظام ہو مگر لوگ اس کی معاشیات کو تباہ کرنے پر اتر آئیں۔ اس کو عزت کی زندگی حاصل ہو مگر لوگ اس کو بے عزت کرنے کی کارروائیاں کریں۔ وہ سکون و عافیت کے ساتھ اپنے ماحول میں رہ رہا ہو مگر لوگ اس کو جھوٹے مقدمات میں الجھا کر اس کے سکون کو غارت کرنے لگیں۔ ایسا ہر واقعہ خدا کے انتظام میں مداخلت ہے۔ یہ بے اختیار مخلوق کا ایسے خالق سے لڑنا ہے جو تنہا اور مکمل طور پر ہر قسم کا اختیار رکھتا ہے۔

ایسے واقعات کا مطلب یہ ہے کہ —— خدا نے چاہا مگر بندوں نے نہ چاہا۔ خدا نے اپنے فیصلہ کے تحت تقسیم رزق کا ایک انتظام کیا مگر بندے اس تقسیم کو ماننے پر راضی نہ ہوئے۔ خدا کے مقابلہ میں بندوں کی یہ سرکشی موجودہ دنیا میں بظاہر کامیاب نظر آتی ہے۔ مگر یہ کامیابی صرف اس لئے ہے کہ موجودہ دنیا میں لوگوں کو امتحان کی آزادی حاصل ہے، جیسے ہی امتحان کی مدت ختم ہوگی، آدمی اپنے آپ کو اتنا بے زور پائے گا کہ اس کے پاس الفاظ بھی نہ ہوں گے کہ وہ کسی کے خلاف بولے، اس کے پاس دل بھی نہ ہوگا کہ کسی کو ملیامیٹ کرنے کا منصوبہ بنائے۔

موجودہ دنیا میں انسان کو آزادی حاصل ہے۔ یہاں کسی کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ خدا کے چاہے کو باطل کرے، وہ خدا کے تقسیم رزق کو کھنڈت کرنے کی کوشش کرے۔ مگر ایسے لوگوں کا حال اس وقت کیا ہوگا جب امتحان کی موجودہ آزادی ختم ہو چکی ہوگی۔ جب وہی ہوگا جو خدا چاہے اور وہ نہ ہو سکے گا جو خدا نہ چاہے، اس روز خدا کہے گا —— میں دیتا ہوں جس کو چاہوں، اب جس کو کرنا ہے میرے چاہے کو باطل کرے۔

خود پسندی خدا کو پسند نہیں

حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ نیا کرتا پہنا۔ میں گھر میں چل رہی تھی اور کپڑے کی طرف دیکھتی جاتی تھی۔ اتنے میں میرے والد ابوبکر میرے یہاں آئے۔ انھوں نے پوچھا تم کیا دیکھ رہی ہو، خدا تمھاری طرف دیکھنے والا نہیں۔ میں نے کہا، کیوں،۔ انھوں نے کہا۔ "کیا تم کو نہیں معلوم کہ بندے کے اندر جب زینت دنیا کی وجہ سے عجب (خود بینی) پیدا ہو جاتی ہے تو اس کا خدا اس سے ناراض ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ اس زینت کو چھوڑ دے۔ حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ اس کے بعد میں نے وہ کپڑا اتارا اور اس کو صدقہ کر دیا۔ حضرت ابوبکر نے کہا امید ہے کہ یہ تمھارے لئے کفارہ بن جائے (کنز العمال جلد ۸)

درمیانی انداز کا کپڑا پہنو

حضرت وقدان تابعی کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبد اللہ بن عمر سے سنا۔ ان سے ایک آدمی نے دریافت کیا تھا کہ میں کپڑوں میں سے کون سا کپڑا پہنوں۔ انھوں نے جواب دیا کہ ایسا کپڑا پہنو کہ نادان لوگ تمھاری تحقیر نہ کریں اور سنجیدہ لوگ تم کو سخت سست نہ کہیں۔ آدمی نے پوچھا کہ وہ کپڑا کون سا ہے۔ انھوں نے جواب دیا وہ کپڑا جس کی قیمت ۵ درہم اور دس درہم کے بیچ میں ہو۔ (سمعت ابن عمر وسأله رجل ما البس من الثیاب؟ قال: مالا یزدریک فیه السفهاء ولا یعتبك به الحلماء، قال: ماهو؟ قال: مابین الخمسة الی العشرین درهما، حلیۃ الاولیاء لابی نعیم)

دسترخوان پر اپنے قریب کی پلیٹ سے کھانا

حضرت عمرو بن ابی سلمہ کہتے ہیں کہ میں نے ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھانا کھایا۔ تو میں پیالہ کے ہر طرف سے ہاتھ بڑھا کر گوشت لینے لگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھ کر کہا جو تمھارے قریب ہے اس میں سے کھاؤ (کل مما یلیك، کنز العمال جلد ۸)

اللہ اپنے نبی سے کس چیز پر راضی ہوا

حضرت عطاء خراسانی تابعی کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کے گھر دیکھے ہیں۔ وہ کھجور کی ٹہنیوں کے تھے۔ ان کے دروازوں پر ٹاٹ کے پردے پڑے ہوئے تھے جو کالے بال سے تیار کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد خلیفہ ولید بن عبد الملک اموی کی طرف سے مدینہ کے حاکم کے پاس خط آیا جس میں مسجد نبوی کی نئی تعمیر کا حکم تھا اور یہ ہدایت دی گئی تھی کہ ازواج رسول کے حجرے توڑ کر مسجد نبوی میں داخل کر دئے جائیں۔ اس حکم کو معلوم کرکے مدینہ کے بہت سے لوگ رو پڑے۔ حضرت ابوامامہ انصاری نے کہا کاش کہ یہ حجرے اسی طرح چھوڑ دئے جاتے اور گرائے نہ جاتے تاکہ لوگ بڑی بڑی عمارتیں بنانے سے رک جاتے۔ اور وہ دیکھ

لیتے کہ اللہ اپنے نبی سے کس چیز پر راضی ہوا حالانکہ دنیا کے خزانوں کی چابیاں اس کے ہاتھ میں تھیں (لیتھا ترکت فلم تھدم حتی ینقص الناس عن البنار ویدوا ما رضی اللہ لنبیہ ومفاتیح خزائن الدنیا بیدہ، طبقات ابن سعد جلد ۸)

بیٹی کے نکاح کے لئے غریب دیندار کو پسند کرنا

حضرت ابوالدرداء انصاری کی ایک لائق لڑکی تھی جس کا نام درداء تھا۔ یزید ابن معاویہ نے درداء سے نکاح کا پیغام دیا۔ حضرت ابوالدرداء نے انکار کر دیا۔ اس کے بعد ایک عام مسلمان نے درداء سے نکاح کا پیغام دیا۔ حضرت ابوالدرداء نے اس کو قبول کرلیا اور اپنی بیٹی کا اس سے نکاح کر دیا۔ لوگوں میں اس بات کا چرچا ہوا کہ امیر معاویہ کے لڑکے نے ابوالدرداء کے یہاں پیغام دیا مگر اس کو انھوں نے رد کر دیا اور کمزور مسلمانوں میں سے ایک شخص نے پیغام دیا تو اس کو انھوں نے قبول کرلیا اور اس کے ساتھ اپنی لڑکی بیاہ دی۔ حضرت ابوالدرداء نے اس کو سنا تو کہا۔ اس رشتہ میں میں نے درداء کا لحاظ کیا۔ تمھارا کیا خیال ہے۔ جب درداء کے سرہانے غلاموں کی قطار کھڑی ہوتی اور وہ اپنے آپ کو ایسے گھر میں پاتی جس کو دیکھ کر آنکھیں چکا چوند ہوں تو ایسے وقت میں اس کا دین کہاں رہ جاتا (این دینھا منھا یومئذ، حلیۃ الاولیاء لابی نعیم)

سکھ کا راز قناعت ہے

حضرت سعد نے اپنے بیٹے سے کہا: اے میرے بیٹے، جب تم مال طلب کرو تو اس کو قناعت کے ساتھ طلب کرو۔ کیونکہ جس کے اندر قناعت نہ ہو مال اس کے لئے کافی نہیں ہو سکتا (اذا طلبت الغنار فاطلبہ بالقناعۃ فانہ من لم یکن لہ قناعۃ لم یغنہ مال، کنز العمال جلد ۲)

ہر آدمی یا جنت کی طرف جارہا ہے یا دوزخ کی طرف

مسلم بن بشیر کہتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ اپنی بیماری میں روئے۔ ان سے پوچھا گیا کہ اے ابو ہریرہ کیا چیز آپ کو رلا رہی ہے۔ انھوں نے کہا: میں تمھاری اس دنیا کے لئے نہیں روتا۔ بلکہ میں تو اس لئے روتا ہوں کہ میرا سفر لمبا ہے اور زادراہ کم ہے۔ میں نے ایک ایسے ٹیلہ پر صبح کی ہے جو جنت یا دوزخ کی طرف اتر رہا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ مجھے ان دونوں میں سے کس طرف چلایا جائے گا (بکی ابو ھریرۃ رضی اللہ عنہ فی مرضہ فقیل لہ ما یبکیک یا ابا ھریرۃ، قال اما انی لا ابکی علی دنیاکم ھٰذہ ولکنی ابکی لبعد سفری وقلۃ زادی۔ اصبحت فی صعود مھبطۃ علی جنۃ ونار فلا ادری ای ایھما یُسلک بی،

طبقات ابن سعد جلد ۴)

آخرت کے بدلے دنیا

ان الذین یکتمون ما انزل اللہ من الکتاب ویشترون بہ ثمنا قلیلا اولئک ما یاکلون فی بطونھم الا النار ولا یکلمھم اللہ یوم القیامۃ ولا یزکیھم ولھم عذاب الیم۔ اولئک الذین اشتروا الضلالۃ بالھدی والعذاب بالمغفرۃ فما اصبرھم علی النار
(البقرہ ۱۷۴ - ۱۷۵)

جو لوگ اللہ کی اتاری ہوئی کتاب کو چھپاتے ہیں اور اس کے بدلے میں تھوڑی قیمت حاصل کرتے ہیں، وہ اپنے پیٹوں میں صرف آگ بھرتے ہیں۔ اللہ قیامت کے دن ان سے بات نہ کرے گا اور نہ ان کو پاک کرے گا اور ان کے لئے دکھ بھرا عذاب ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی اور نجات کے اوپر عذاب کو ترجیح دی۔ وہ کس قدر جری ہیں آگ کے اوپر۔

یہود کے علمار آسمانی کتابوں کا علم رکھتے تھے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حق کی دعوت اٹھائی تو وہ اپنے علم کی بنا پر سمجھ گئے کہ یہ خالص حق کی دعوت ہے۔ مگر اس کے باوجود انھوں نے اس کا اقرار نہ کیا۔ ان میں سے بہت لوگ آپ کے مخالف بن کر کھڑے ہو گئے۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ آپ کی دعوت کو ماننے میں انھیں اپنی دنیا لٹتی ہوئی نظر آتی تھی۔

ایک عرصہ کی روایات کے نتیجہ میں قوم کے اندر ان کی بڑائی قائم ہو چکی تھی۔ دینی پیشوائی کے نام پر وہ عوام کا مرجع بنے ہوئے تھے۔ جب بھی کوئی شخص دینی جذبہ سے کوئی رقم خرچ کرتا تو وہ اس کو انھیں علمار کو یا ان کے ادارہ کو دیتا۔ ایسی حالت میں علمار یہود کو محسوس ہوا کہ رسول اللہ کو رسول ماننے کے بعد یہ سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ اس میں انھیں اپنی حیثیت کی نفی نظر آئی۔ انھوں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ سوچا کہ جب ہم یہ اعلان کر دیں گے کہ حق وہ ہے جس کو محمد بن عبداللہ پیش کر رہے ہیں تو اس کے بعد یہ ہوگا کہ جو لوگ حق کے نام پر ہماری طرف راغب ہیں وہ محمد بن عبداللہ کی طرف راغب ہو جائیں گے اور ہماری کوئی قیمت لوگوں کے درمیان باقی نہ رہے گی۔

اللہ کی نظر میں یہ بہت بڑا جرم ہے۔ یہ جنت کے بدلے جہنم کو ترجیح دینا ہے۔ ایسا آدمی آخرت میں اسی چیز کو پائے گا جس کو اس نے دنیا میں اپنے لئے پسند کیا تھا۔ آخرت میں خدا اس کو نظر انداز کر دے گا جس طرح دنیا میں اس نے خدا کو نظر انداز کیا تھا۔ اللہ اس کی طرف نہ دیکھے گا، کیونکہ اس نے اللہ کی طرف نہیں دیکھا۔ کیسا عجیب انجام ہے جس طرف یہ لوگ چلے جا رہے ہیں۔

اخلاص کافی نہیں

ہرمزان (یا ہرمز) قدیم ایرانی سلطنت کا ایک فوجی سردار تھا۔ جنگ قادسیہ میں وہ ایرانیوں کی طرف سے مسلمانوں سے لڑ رہا تھا۔ اس جنگ میں جب اس کو شکست ہوئی تو وہ بھاگ کر خوزستان آیا اور یہاں اپنی فوجیں جمع کرکے ایران کے اس سرحدی علاقہ پر اپنی خود مختار حکومت قائم کرلی۔

مسلم فوج نے کوفہ وبصرہ سے نکل کر اس پر حملہ کیا۔ ہرمزان کو شکست ہوئی اور اس نے جزیہ ادا کرنے کی شرط پر مسلمانوں سے صلح کرلی۔ مگر موقع پاتے ہی اس نے بغاوت کردی۔ دوبارہ مسلم فوج آئی۔ مقابلہ ہوا جس میں ہرمزان کو شکست ہوئی۔ ہرمزان نے ایک نئے مقام پر پناہ لی۔ جس کا نام رام ہرمز تھا۔ اس نے پھر جزیہ کی شرط پر صلح کی پیش کش کی۔ جس کو مسلمانوں نے منظور کرلیا۔ مگر ہرمزان نے کچھ عرصہ بعد دوبارہ بغاوت کردی۔ چنانچہ ابوموسیٰ اشعری کی سرکردگی میں اسلامی فوج نے اس پر حملہ کیا۔ ہرمزان کو شکست فاش ہوئی۔ اس کا شہر تشتر مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا۔ ہرمزان تشتر کے قلعہ میں محصور ہوگیا۔

ہرمزان نے دیکھا کہ بہت جلد مسلمان اس کے قلعہ پر قابض ہوجائیں گے، اس نے مسلمانوں کے سردار کے پاس یہ درخواست بھیجی کہ میں اس شرط پر اپنے آپ کو تمھارے سپرد کرنے کے لئے تیار ہوں کہ مجھ کو خلیفہ عمر کی خدمت میں بھیجا جائے اور میرے معاملہ کو انھیں کے فیصلہ پر چھوڑ دیا جائے۔

چنانچہ ہرمزان کو انس بن مالک اور دوسرے لوگوں کی نگرانی میں مدینہ لایا گیا۔ حضرت عمر نے ہرمزان سے کہا کہ تم نے بار بار بدعہدی کی ہے اور بدعہدی کی سزا تم جانتے ہو کہ قتل ہے۔ ہرمزان نے کہا کہ مجھے ڈر ہے کہ آپ میری بات سنے بغیر ہی مجھے قتل نہ کردیں۔ حضرت عمر نے کہا کہ نہیں، تمھاری بات ضرور سنی جائے گی، اس کے بعد ہرمزان نے پینے کے لئے پانی مانگا۔ پانی آیا تو پیالہ ہاتھ میں لے کر اس نے کہا کہ مجھے ڈر ہے کہ آپ مجھے پانی پینے کی حالت میں قتل نہ کردیں۔ حضرت عمر نے کہا نہیں۔ تم اندیشہ نہ کرو۔ جب تک تم پانی نہ پی لوگے، تم کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ ہرمزان نے اس کے فوراً بعد پیالہ کا پانی زمین پر گرادیا اور کہا کہ آپ مجھے اب قتل نہیں کرسکتے۔ کیونکہ آپ اس پانی پینے تک کے لئے مجھے امان دے چکے ہیں۔

حضرت عمر نے یہ سن کر کہا: تو جھوٹ بولتا ہے۔ ہم نے تو تجھ کو امان نہیں دی ہے اور تو قتل

کیاجائے گا۔ انس بن مالک فوراً کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے کہا: امیرالمومنین، ہرمز صحیح کہتا ہے۔ آپ کہہ چکے ہیں کہ جب تک تم پانی نہ پی لوگے تم قتل نہ کئے جاؤگے اور پانی اس نے پیا نہیں۔ حضرت عمر اگرچہ انس بن مالک کی دلیل سے مطمئن نہ تھے۔ مگر معاملہ کی نزاکت کی بنا پر خاموش ہو گئے۔

اب ہرمزان نے دوسری ہوشیاری یہ کی کہ کلمہ پڑھ لیا اور مسلمان بن کر مدینہ میں رہنے لگا اور عمومی اسلامی قاعدہ کے مطابق دو ہزار دینار سالانہ کا وظیفہ بھی بیت المال سے حاصل کر لیا۔

انھیں دنوں ایک ایرانی غلام ابولولو فیروز مدینہ میں رہتا تھا۔ یہ مغیرہ بن شعبہ کا غلام تھا۔ ہرمزان اور ابولولو فیروز دونوں مسلمانوں سے اس بات پر ناراض تھے کہ انھوں نے ایران کی کیانی عظمت کو مٹا دیا اور ان کے قومی فخر کا خاتمہ کر دیا۔ اس مشترک جذبہ نے دونوں کو ایک دوسرے سے قریب کر دیا۔ ان میں رازدارانہ باتیں ہونے لگیں۔ کیانی عظمت کو واپس لانے کے بارے میں وہ اپنے خواب کو واقعہ نہیں بنا سکتے تھے۔ اپنے انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے وہ مسلمانوں کی تخریب کے منصوبے بنانے لگے۔

جلد ہی اس کا ایک موقع انھیں میسر آگیا۔ ابولولو فیروز ایک روز مدینہ کے بازار میں تھا کہ اس کی ملاقات خلیفہ عمر سے ہو گئی۔ اس نے کہا اے امیرالمومنین، میرا آقا مغیرہ مجھ سے بہت زیادہ محصول لیتا ہے، آپ اس کو کم کرا دیجئے۔ حضرت عمر نے پوچھا کتنا۔ ابولولو نے کہا دو درہم روز۔ حضرت عمر نے کہا تم کیا کام کرتے ہو۔ اس نے کہا کہ آہنگری، نقاشی اور نجاری۔ حضرت عمر نے کہا کہ جب تم اتنے ہنر جانتے ہو تو پھر یہ رقم تمھارے لئے زیادہ نہیں ہے۔ ابولولو کو یہ بات سخت ناگوار گزری۔ کیونکہ حضرت عمر نے مذکورہ معاملہ میں ابولولو کے بجائے مغیرہ بن شعبہ کی حمایت کی تھی۔

اس کے بعد حضرت عمر نے ابولولو سے پوچھا کہ میں نے سنا ہے کہ تم ایسی چکی بنانا جانتے ہو جو ہوا کے زور سے چلتی ہے۔ تم مجھ کو بھی ایسی ایک چکی بنا دو۔ ابولولو نے جواب دیا کہ اچھا۔ میں آپ کے لئے ایسی چکی بناؤں گا جس کی آواز مشرق و مغرب کے لوگ سنیں گے۔

اب ہرمز اور ابولولو کے خواب کی تکمیل کا وقت آگیا۔ دونوں نے خفیہ سازش کر کے زہر میں بجھا ہوا ایک خنجر تیار کیا۔ اس کے بعد ابولولو ایک روز فجر کے وقت اندھیرے میں مدینہ کی مسجد میں داخل ہوا۔ اس کی آستین میں مذکورہ خنجر چھپا ہوا تھا۔ جب نماز کھڑی ہوئی تو وہ صف اول میں شامل ہو گیا۔ حضرت عمر نے امامت کے مقام پر کھڑے ہو کر نماز شروع کی تو ابولولو اچانک تیزی سے صف سے نکلا اور حضرت عمر پر پے بہ پے چھ وار کئے۔ حضرت عمر بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ بعد کو اسی میں آپ کا انتقال ہو گیا۔

حقیقت پسند بنئے

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی سب سے بڑی کمزوری ان کی منفی ذہنیت ہے۔ وہ دنیا کی تمام قوموں کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔ وہ غیر اقوام کی تمام کارروائیوں کو اس نظر سے دیکھتے ہیں کہ وہ ان کے خلاف دشمنی کی بنا پر کی گئی ہیں۔ اس منفی ذہن نے ان کی پوری سوچ کو غیر حقیقت پسندانہ بنا دیا ہے۔ آپ درخت کے نیچے ہیں اور اوپر سے پکا ہوا پھل آپ کے سر پر گر پڑتا ہے، اب اگر آپ یہ سوچیں کہ درخت نے آپ کی ضد میں آپ کے سر پر اپنا پھل گرایا ہے تو کبھی آپ معاملہ کا صحیح حل تلاش کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

مثال کے طور پر امریکا فلسطینی مسلمانوں کے مقابلہ میں اسرائیلی یہودیوں کا ساتھ دیتا ہے۔ تمام دنیا کے مسلمان اس کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ امریکا مسلمانوں کا دشمن ہے اور اس دشمنی کی وجہ سے وہ مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن کا ساتھ دے رہا ہے۔ مگر اصل یہ ہے کہ یہ دنیا مفادات کی دنیا ہے۔ امریکہ اس لئے اسرائیل کا ساتھ دیتا ہے کہ اس سے اس کا مفاد وابستہ ہے نہ کہ محض کسی کی ضد یا دشمنی کی وجہ سے۔

اسرائیل کی مدد سے امریکہ دو طرفہ مفاد حاصل کر رہا ہے۔ ایک یہ ہے کہ اس طرح وہ تیل پیدا کرنے والے خلیجی ممالک کو مسلسل دباؤ کی حالت میں رکھے ہوئے ہے۔ اس صورت حال کی بنا پر یہ ممالک مجبور ہیں کہ وہ امریکہ سے امریکہ کی شرائط پر معاملہ کریں نہ کہ خود اپنی شرائط پر۔

دوسرا فائدہ کاروباری فائدہ ہے۔ موجودہ زمانہ میں ترقی یافتہ ملکوں کا ایک نہایت محفوظ بزنس یہ ہے کہ وہ کمزور یا غیر ترقی یافتہ ممالک کو امداد کے نام پر قرض دیں اور اس پر ان سے سود وصول کریں۔ امداد کی رقم کی واپسی تو قسطوں میں ہوتی ہے مگر سود کی رقم ہر سال پوری کی پوری ادا کی جاتی ہے۔ یہ قرضے ترقیاتی کاموں میں بھی دئے جاتے ہیں مگر ان کی سب سے بڑی مد جدید ہتھیاروں کی خریداری ہے۔ ترقیاتی قرضے تو دوسرے ملکوں سے بھی ملتے ہیں مگر جنگی ہتھیاروں کی تجارت امریکہ کی اجارہ داری ہے۔ اسرائیل اور عربوں میں مسلسل جنگ کی حالت امریکہ کو موقع دے رہی ہے کہ وہ اسرائیل کے ہاتھ قیمتی ہتھیار قرض کی بنیاد پر فراہم کرے اور اس پر اس سے بھاری سود وصول کرے۔ چنانچہ ایک اقتصادی رپورٹ کے مطابق اسرائیل امریکی قرضوں پر سود کی جو رقم ادا کرتا ہے اس کی سالانہ مقدار ۹۱۰ ملین ڈالر ہے۔ عرب ممالک امریکہ سے مہنگے داموں جو ہتھیار خریدتے ہیں ان کی مقدار اس کے علاوہ ہے۔

کہاں سے کہاں تک

لندن کے برٹش میوزیم میں جو نادر چیزیں محفوظ ہیں ان میں سے ایک سونے کا وہ سکہ ہے جو قدیم انگلینڈ کے علاقہ مرشیا (Mercia) کے بادشاہ اوفا ریکس (Offa Rex) کے زمانہ میں ڈھالا گیا تھا۔ اس بادشاہ کا زمانہ ۷۹۶ ــ ۷۵۷ء ہے۔ اس سکہ کی شکل بالکل مسلمانوں کے دینار جیسی ہے۔ شاہ اوفا ریکس کے نام کے گرد اس پر ایک عربی فقرہ درج ہے جس میں سکہ ڈھالنے کی تاریخ (۷۷۴ء) اور کلمہ توحید دونوں صاف پڑھے جاتے ہیں۔ سکہ کے دوسری طرف بغداد کے دو سکہ گروں کے نام عربی رسم خط میں لکھے ہوئے ہیں۔

Charles Oman,
History of England before the Norman Conquest (1910)

برٹش میوزیم میں اس قسم کی ایک اور مثال موجود ہے۔ یہ نویں صدی کی ایک آئرش صلیب ہے جس کے مرکز میں شیشہ کے مسالہ پر کوفی حروف میں "بسم اللہ" لکھا ہوا ہے۔

Legacy of Islam, Compiled by Sir Thomas Arnold,
Oxford University Press London

آٹھویں اور نویں صدی عیسوی میں مسلمان صنعت و حرفت میں اتنا آگے بڑھے ہوئے تھے کہ دوسری قومیں اندھی تقلید کی حد تک ان کی پیروی کرتی تھیں (جیسا کہ موجودہ زمانہ میں برعکس صورت میں نظر آتا ہے) اس زمانہ میں یورپ کے حکمراں اپنے سکے ڈھالنے کے لئے بغداد کے کاریگر بلاتے تھے اور اپنے سکہ پر کلمہ توحید کو مونوگرام کے طور پر لکھتے تھے، نیز عربی زبان اور اسلامی تہذیب کا اس قدر غلبہ تھا کہ اس کی چھاپ نہ صرف سکہ جیسی چیزوں پر بلکہ خالص مذہبی نشانات پر بھی دکھائی دیتی تھی۔

یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلم ممالک کے مقابلہ میں مغرب کو جو صنعتی اور سائنسی فوقیت حاصل ہے وہی برعکس شکل میں کسی وقت مسلمانوں کو حاصل تھی۔ مسلمانوں نے بدویت اور شتربانی کے مقام سے آغاز کر کے ہجرت کے صرف دو سو برس بعد یہ حیثیت حاصل کر لی تھی کہ وہ دنیا کے امام بن گئے۔ ایران کے اصطخر، مصر کے ممفس اور یورپ کے روم کی جگہ اب دنیا کا تمدنی مرکز بغداد تھا۔

دور اول میں اسلام کو عالمی سطح پر پھیلانے میں مسلمانوں کو جو شاندار کامیابی حاصل ہوئی اس کا سبب احتجاج اور مطالبہ کی سیاست نہ تھی، بلکہ دنیا کے لئے ان کا رحمت اور برکت بن جانا تھا۔

خدا کی اس دنیا میں جو اصول کارفرما ہے وہ یہ ہے کہ جو اپنے کو نفع بخش ثابت کرے اس کو قیام اور استحکام حاصل ہو (واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض) مسلمان نفع بخشی کے اس معیار پر پورے اترے، یہی وجہ ہے کہ ان کو دنیا کی امامت حاصل ہوئی، وہ قوموں کے لئے مرجع تقلید بن گئے۔

"صحرائے عرب کے ایک کنارے مکہ کے گمنام مقام پر اسلام نے جنم لیا" ایک مستشرق لکھتا ہے "اور وہاں سے نکل کر اس نے قلیل عرصہ میں مشرق قریب اور مشرق وسطیٰ کو حیرت انگیز طور پر فتح کر لیا۔ اور پھر ایک طرف شمالی افریقہ کے راستے سے اسپین اور دوسری طرف ایران کے راستے سے چین کی سرحدوں تک جا پہنچا۔ مشرقی یورپ میں اسلام کی پیش قدمی کی آخری حد بوڈاپسٹ (ہنگری) تھی جہاں آج بھی دریائے ڈانوب کے کنارے "گل بابا" کا ترکی طرز کا مزار نشانی کا کام دے رہا ہے۔

اسی سیلاب کا کرشمہ تھا کہ وحشی عربوں نے ایک عالمی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ جہاں ایک طرف ان کی زبان اس وقت کی معلوم دنیا کے آخری کناروں تک پھیلتی چلی گئی، وہاں دوسری طرف انھوں نے نہ صرف اس زمانے کے انسانی علوم کو حاصل کیا اور ان سے فائدہ اٹھایا بلکہ انھیں ترقی بھی دی۔ ساتویں صدی عیسوی میں دمشق کی اموی خلافت نے عربوں کی عالمی سلطنت کی سیاسی اور اقتصادی بنیاد رکھی اور آٹھویں صدی عیسوی کے وسط میں عباسی خلافت جس کا پایۂ تخت بغداد منتقل ہو چکا تھا، تاریخ کی عظیم ترین تہذیب کو وجود میں لانے کا باعث بنی۔

اس تہذیب کے علم برداروں کا مقصد اشاعت اسلام تھا مگر انھوں نے ماحول کی ہر جائز چیز کو لیا اور اس سے اسلام کو تقویت پہنچائی، یونانی اور رومی تہذیب میں خاص چیز اس کے طبیعی علوم تھے جن سے عرب اور غیر عرب مسلمانوں کو نئی نئی تحقیقات کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ وہ طبیعیات، کیمیا، الجبرا اور سائنس میں ایسے شان دار نتائج تک پہنچے کہ آج تک ان علوم کی مختلف شاخوں میں سینکڑوں فنی اصطلاحات اپنے عربی الاصل ہونے کی یاد دلاتی ہیں۔ شروع میں وہ فلسفہ میں یونانیوں کے گویا شاگرد تھے مگر آخر میں وہ خود استاد بن گئے۔

فلکیات کے مطالعہ کے لئے مسلمانوں نے جگہ جگہ رصد گاہیں قائم کی تھیں اس سلسلہ میں اشبیلیہ کی رصد گاہ کے بارے میں ڈریپر نے لکھا ہے کہ مسلمانوں (Moors) کے اسپین سے ملک بدر ہو جانے کے بعد یہ رصد گاہ کلیسا کے گھنٹہ گھر میں تبدیل کر دی گئی کیونکہ اسپینی باشندے اس کے استعمال کا کوئی اور طریقہ جانتے ہی نہ تھے۔ جغرافیہ میں نویں صدی کے نصف اول میں خوارزمی اور اس کے شرکار کار نے معلوم کیا تھا کہ زمین کا محیط بیس ہزار میل اور اس کا نصف قطر ۶۵۰۰ میل ہے۔ یہ

صحت حیرت انگیز ہے۔ دنیائے اسلام میں یہ سرگرمیاں ایسے زمانے میں جاری تھیں جب کہ سارا کا سارا یورپ زمین کے چپٹی ہونے کا قائل تھا۔

Edward Mc Nall Burns, Western Civilization, P. 264

جہاں تک تہذیب اور کلچر کا تعلق ہے، تیرھویں صدی کے وسط تک اسلام دنیا کے تمام ملکوں کے مقابلہ میں سب سے آگے رہا ہے۔ اسپین میں عربوں نے پختہ بازار بنوائے اور ان میں رات کو روشنی کا انتظام کیا۔ ان میں جو دولت مند تھے وہ اپنے مکانوں کو پانی کے نلوں اور فواروں کی مدد سے ٹھنڈا رکھا کرتے تھے۔ اس کے مقابلہ میں مسیحی یورپ کے شہروں میں لوگوں کو کیچڑ اور اندھیرے میں دھکے کھانے پڑتے تھے۔ مسلمانوں کے یہاں شفاخانے تھے، کتب خانے تھے، ایسی درس گاہیں تھیں جہاں دینیات سے لے کر طب تک ہر چیز پڑھائی جاتی تھی۔ دمشق، بغداد، قاہرہ اور قرطبہ میں لکڑی، لوہے، چاندی اور سوت کا ایسا اعلیٰ درجہ کا سامان بنتا تھا جو اسکینڈے نیویا تک کی دور دراز ریاستوں میں جاکر مہنگے داموں بکتا تھا۔ اس زمانہ میں یورپ کا ٹکنکل علم اور اس کی سائنس عرب مسلمانوں کے مقابلہ میں بالکل ہیچ تھی۔

علوم کی تمام شاخوں میں مسلمان اتنے آگے تھے کہ یورپ کے لئے ان کی تقلید کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ بریفالٹ نے لکھا ہے کہ "راجر بیکن نے عربی سائنس سیکھی تھی۔ نہ تو راجر بیکن کو اور نہ اس کے بعد اس کے کسی ہم نام کو یہ حق پہنچتا ہے کہ تجربی طریق کی ترویج کا سہرا اس کے سر باندھا جائے۔ راجر بیکن کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ وہ مسیحی یورپ میں مسلم سائنس اور طریقہ کا مقلد اور مبلغ تھا۔ وہ یہ اعلان کرنے سے کبھی نہ تھکتا تھا کہ اس کے ہم عصروں کے لئے حقیقی علم تک رسائی حاصل کرنے کا کوئی راستہ عربی سائنس کے سوا نہیں ہے:

Briffault, The Making of Humanity.

بارھویں صدی کے آخر تک ابن رشد کو یورپ میں اس قدر مقبولیت ہوگئی اور اس کا فلسفہ راسخ عیسائیوں کے حق میں اتنا زبردست خطرہ بن گیا کہ ۱۲۱۰ء میں پیرس یونیورسٹی کونسل کو ارسطو کی طبیعی تاریخ اور اس پر لکھی ہوئی ابن رشد کی شرحوں کی تعلیم و تدریس کو ممنوع قرار دینا پڑا۔ اگرچہ ایک صدی بعد اسی یونیورسٹی کا یہ حال ہوا کہ اس نے اپنے فارغ التحصیل طلبہ کو حلف دینا شروع کر دیا کہ وہ صرف ان چیزوں کی تعلیم اور تدریس کریں گے جو ابن رشد کی شرح کے مطابق ارسطو کے خیالات سے ہم آہنگ ہو۔
(راشڈل، یونیورسٹیز، صفحہ ۳۶۸)

ابن رشد نے یورپ کے دماغ پر چار سو سال سے زیادہ عرصہ تک حکمرانی کی اور اطالوی نشأۃ ثانیہ کی بنیادیں اسی نے رکھیں۔ کولٹن ابن رشد کی اثر انگیزی کا موازنہ موجودہ زمانے میں ڈارون کی اثر انگیزی سے کرتا ہے مگر اس موازنہ کے درست اترنے کے لئے ڈارونیت کو ابھی مزید تین سو سال تک زندہ رہنا ہوگا۔

سترھویں صدی کے آخر میں اسلام کی فوجی طاقت کو دھکا لگتا ہے اور اٹھارویں صدی میں یورپ کی فوج سائنس، مسلمان اقوام کے فن جنگ پر قطعی طور پر سبقت لے جاتی ہے۔ اسی زمانے کا واقعہ ہے کہ ایک انگریزی دستہ نے ہندستان کے مسلم فرماں روا کی دس ہزار فوج کو شکست دی۔ کیونکہ مؤخرالذکر نے پچھلے ڈیڑھ سو سال میں نہ تو سامان جنگ میں اور نہ فن جنگ میں ترقی کا کوئی قدم آگے بڑھایا تھا۔ مسلمانوں کی زبردست سلطنتیں یورپی فوجوں کے حملہ کی تاب نہ لاکر پاش پاش ہوگئیں اور ایشیا اور افریقہ، جہاں اسلام کو غلبہ حاصل تھا یورپ کو غلبہ حاصل ہوگیا۔ یورپ میں فلسفہ، علم السنہ، علم آثار قدیمہ اور تاریخ تہذیب کے ذخیرے بڑھتے چلے گئے۔ ان سے بھی بڑھ کر یورپ کی تکنکل ایجادات کا وہ لامتناہی سلسلہ تھا جنھوں نے پوری زندگی کی کایا پلٹ دی۔ یورپ نے ان ایجادات کی مدد سے اسلامی مشرق کو پہلے اقتصادی طور پر اور اس کے بعد سیاسی طور پر غلام بنالیا۔ مشینی صنعت نے جدید طرز پر منظم یورپ کی مصنوعات سے اسلامی دنیا کے بازاروں کو، جو اس وقت تک قرون وسطیٰ کی حالت میں پڑے ہوئے تھے، اس طرح بھر دیا کہ مشرق کی ہاتھ سے بنی ہوئی مصنوعات ان مشینی مصنوعات کے مقابلہ کی تاب نہ لاکر ختم ہوگئیں۔

اس تمام عرصہ میں اسلامی مشرق گہری نیند سوتا رہا۔ ہنگری نژاد ڈاکٹر عبدالکریم جرمانوس کے الفاظ میں "ابن خلدون کے بعد جس کا انتقال ۱۴۰۶ء میں ہوا، اسلامی مشرق نے دنیا کے سامنے پہلے کی طرح اعلیٰ پیمانے کے تخلیقی کارنامے پیش نہیں کئے۔ اس کی صنعتیں زمانے سے پیچھے رہ گئیں۔ اس کی اقتصادی زندگی خام اجناس پیدا کرنے والی ابتدائی زرعی معیشت کی دیہی رومانی فضا میں کھوئی رہی۔ مسلمانوں کی درس گاہوں میں آج بھی وہی درسی کتابیں پڑھاتی ہیں جو ایک ہزار سال پہلے پڑھائی جاتی تھیں۔"

اٹھارھویں صدی کی ابتدا میں یورپی عالموں نے مشرق قدیم کے زیر زمین مدفون آثار اور اس کی ادبی یادگاروں کی تلاش شروع کی۔ وہ انھیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر باہر لائے اور دنیا کو ان سے متعارف کرایا۔ یہاں تک کہ آج اس کرہ زمین میں کوئی ایسا مخفی کونہ موجود نہیں ہے جس میں بسنے والے انسانوں

کی صحیح صحیح نسلی خصوصیات یورپی علماء کے ہاتھوں جمع کی ہوئی ہیں پڑھنے کو نہ مل جائیں۔

ڈنمارک کے ماہر آثار قدیمہ نیو بر کو جب اٹھارھویں صدی کے نصف آخر میں یمن کے کتبات ملے تو عرب کا کوئی شیخ انھیں پڑھ کر سمجھ نہیں سکتا تھا۔ اس کو ان کتبات کی نقلیں جرمنی کے شہر ریسکے میں بھیجنی پڑیں۔ جہاں سے فوراً ان کا صحیح حل بھیج دیا گیا۔ عرب کی تاریخ، عربی علم اللسان، عرب کا جغرافیہ اور عربی میں علوم دینیہ کی کتابیں یورپی علماء نے قابل اعتماد طریقہ پر چھاپیں اور بقول ڈاکٹر جرمانوس "آج بھی یورپ ہی وہ سرزمین ہے جہاں عرب، ایرانی اور ترک طلبہ یورپی استادوں کی زیر نگرانی اپنے کلچر کا خصوصی مطالعہ کرنے کے لئے آتے ہیں۔"

جہاں یورپ بغیر کسی بندش کے آزادانہ آگے بڑھتا رہا، اسلام کے حامل جمود میں مبتلا رہے۔ ایک وقت تھا کہ پادریوں اور راہبوں نے عربی ذرائع سے اپنا مسیحی علم کلام پڑھا تھا۔ ساتویں صدی ہجری میں موصل میں کمال الدین بن یونس اور دمشق میں عزالدین اربلی عیسائیت کے اتنے بڑے عالم تھے کہ عیسائی ان سے اپنے مذہب کی کتابیں پڑھتے تھے۔ وہ توریت اور انجیل کی اتنی اعلیٰ تعلیم دیتے تھے اور اس خوبی سے ان کی شرح کرتے تھے کہ اس زمانے کے عیسائی علماء بھی ایسی تعلیم نہ دے سکتے تھے۔ اس کے بعد جب زوال آیا تو یہ عالم ہوا کہ ترکوں کے اقتدار کے زمانہ میں مصر کے ایک شخص کو اپنے لڑکے کی تعلیم کے لئے ایک عیسائی راہب کو مقرر کرنا پڑا۔ آج بھی مسلمان نوجوان اعلیٰ تعلیم کے لئے مغربی یونیورسٹیوں میں داخلے لے رہے ہیں۔

بعد کے زمانے میں مشرق محض قدیم کتابوں کی خشک تشریحات اور ان کی نقلیں کرنے میں لگا رہا۔ اس نے اپنے آپ کو اس حد تک ماضی کے حوالے کر دیا کہ وہ اس کے اندر محدود ہو کر فرسودگی کی نذر ہوگیا۔ ایک زمانہ تھا کہ عباسی دور میں کاغذ سازی ایک گھریلو صنعت بن چکی تھی یا اب یہ حال ہوا کہ یورپ میں صدیوں تک چھاپہ خانوں میں کتابیں چھپتی رہیں اور اس کے بعد کہیں جا کر ۱۷۲۹ء میں ترکی کے شیخ الاسلام نے باقاعدہ فتوے کے ذریعے کتابوں کے چھاپہ خانہ کو عمل شیطانی کے الزام سے بری ہونے کا اعلان کیا۔ مسلمان جو کسی وقت علم طب کے امام تھے وہ چیچک کے ٹیکہ کو خوف زدہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ حتیٰ کہ علی الاعلان کہا گیا کہ چوہوں اور بیماریاں پھیلانے والے دوسرے جانوروں کو مارنا دراصل اجنبیوں کا ایک بہانہ ہے تاکہ وہ مسلمانوں کے زنان خانوں میں داخل ہو کر ان کی عورتوں کی بے حرمتی کریں۔ انگریزی زبان کو شیطان کی زبان کہا گیا اور دو سو برس تک اس کا پڑھنا ممنوع رہا۔ اسلام کا دینیاتی نظام آج بھی ارسطو کی منطق پر مبنی ہے جس کو جدید دنیا کے علماء منطق کب کا رد کر چکے ہیں، ایک مستشرق کے الفاظ میں:

"منصور حلاج کی زندہ کھال کھینچی گئی کیونکہ اس نے اپنے اندر خدا کو پایا تھا۔ باب کو ۱۸۵۰ میں ایران میں اس لئے گولی سے مار دیا گیا کہ وہ اپنے آپ کو امام موعود سمجھتے تھے۔ مرزا غلام احمد قادیانی نے انکشاف کیا کہ مسیح اور کرشن کی روح ان کے اندر حلول کر گئی ہے۔ مگر یہ لوگ جو مابعد الطبیعیاتی دنیا میں اتنی بلند پروازی دکھا رہے تھے ان میں کوئی ایک بھی ایسا شخص پیدا نہیں ہوا جو انسانیت کو سائنٹفک علوم میں کوئی نیا طریقہ یا کوئی نئی دریافت دیتا"

جو قوم قدیم زمانہ میں سربلندی کے اعلیٰ ترین مقام پر پہنچی تھی، وہ موجودہ زمانہ میں تمام قوموں سے پیچھے کیوں ہو گئی۔ اس سوال کا جواب بالکل سادہ ہے۔ وہ یہ کہ موجودہ زمانہ میں اس نے اپنے آپ کو اور اپنی امکانیات کو استعمال ہی نہیں کیا۔

مسلمان پچھلے سو سال سے ان قوموں کے خلاف لڑائی بھڑائی میں مشغول ہیں جنھوں نے ان کے اوپر غلبہ حاصل کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ان کی ترقی کی اصل رکاوٹ دوسرے لوگ ہیں۔ اس لئے جب تک ان دوسروں کے اوپر قابو نہ پایا جائے، ترقی کی سمت میں اپنے سفر کا آغاز نہیں کیا جا سکتا۔ یہی ذہن ہماری ناکامی کا سب سے بڑا سبب ہے۔ اس کی وجہ سے ابھی تک مسلمانوں کے درمیان ان کی تعمیر نو کا آغاز ہی نہیں ہوا۔ جب آپ کا ذہن یہ ہو کہ کچھ خارجی دشمن ہیں جو آپ کے راستہ کی رکاوٹ بنے ہوئے ہیں تو ان دشمنوں کو ختم کرنے سے پہلے آپ کے اندر یہ ذہن ہی نہیں ابھرے گا کہ آپ کو اس راستہ پر اپنا سفر شروع کرنا چاہئے۔

امریکہ نے ۱۹۴۵ میں جاپان میں بم گرا کر اس کو تباہ کر دیا اور اس میں اپنی فوجیں اتار دیں۔ جاپان کے اوپر امریکہ کا فوجی اور سیاسی قبضہ ہو گیا۔ جاپانی اگر امریکہ کو اپنے مصائب کا ذمہ دار ٹھہرا کر ان کے خلاف لڑائی جاری کر دیتے تو انھیں دوبارہ اپنے مستقبل کی طرف سفر کے لئے کوئی آغاز نہ ملتا۔ وہ بس سیاست کی شمشان بھومی پر قربانیاں دیتے رہتے۔ مگر انھوں نے امریکی قبضہ کو تسلیم کر لیا۔ اس کا فوری فائدہ یہ ہوا کہ ان کو معلوم ہو گیا کہ اپنی تعمیر نو کا آغاز انھیں کہاں سے کرنا چاہئے۔ انھوں نے فوجی اور سیاسی میدان کو امریکہ کے حوالے کر کے دوسرے میدانوں میں یکسوئی کے ساتھ اپنی جدوجہد شروع کر دی۔ اس کے بعد جو واقعہ ہوا وہ یہ کہ صرف ۲۵ سال میں جاپانیوں کو نہ صرف دوسرے دائروں میں غلبہ حاصل ہو گیا بلکہ خود اس دائرہ میں بھی جس کو ابتداءً انھوں نے امریکہ کے حوالے کر دیا تھا۔

مسلمانوں کے ساتھ یہی واقعہ ڈیڑھ سو سال پہلے پیش آیا۔ مگر انھوں نے غالب قوموں

کی بالاتری کو تسلیم نہیں کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو اپنی تعمیر نو کا آغاز ہی نہ مل سکا۔ مسلمان تقریباً ڈیڑھ سو
سال سے غیر اقوام سے ان میدانوں میں لڑ رہے ہیں جہاں انھوں نے اپنا غلبہ قائم کر رکھا ہے۔ دوسرے
میدان جو خارجی غلبہ کے باوجود ابھی تک ان کے لئے کھلے ہوئے ہیں وہاں وہ اپنی قوتیں صرف نہیں
کرتے۔ گویا جہاں موجودہ حالات میں آغاز ممکن ہے وہاں سے آغاز نہیں کرتے۔ اور جہاں سے
آغاز ممکن نہیں ہے وہاں لاحاصل قربانیاں دے رہے ہیں۔ اس کا انجام وہی ہوا ہے جو ہو سکتا
تھا —— وہ آج بھی اسی مقام پر پڑے ہوئے ہیں جہاں وہ ڈیڑھ سو سال پہلے تھے۔

تعارفی سٹ

اسلام کے تعارف پر ہم نے پانچ کتابوں کا ایک سٹ تیار کیا ہے جو مدارس میں ابتدائی اسلامی تعلیم
کے لئے بھی مفید ہے اور اسلام کے عمومی تعارف کے لئے بھی۔ یہ سٹ حسب ذیل ہے۔

۱۔ سچا راستہ	ایک روپیہ پچاس پیسے
۲۔ دینی تعلیم	تین روپیہ
۳۔ حیات طیبہ	دو روپیہ پچاس پیسے
۴۔ باغ جنت	تین روپیہ
۵۔ نار جہنم	تین روپیہ

اس تعارفی سٹ کو اردو کے علاوہ دوسری زبانوں میں شائع کرنے کے لئے جو لوگ کوئی تعاون کریں
وہ انشاء اللہ خدا کے یہاں اس کا اجر پائیں گے۔

مکتبہ الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

مولانا وحید الدین خاں

موجودہ زمانہ میں اسلام کو زندہ کرنے کا طریقہ کیا ہے۔ اس سوال کے جواب میں پچھلی ایک صدی کے اندر ہزاروں کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مگر ان کتابوں کی بنیاد پر اٹھنے والی تحریکیں، غیر معمولی ترقی اور مقبولیت کے باوجود، اصل مقصد میں ناکام رہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کتابوں کا جواب صحیح نہ تھا۔

احیاء اسلام جدید تاریخ کی پہلی کتاب ہے جس میں آپ اس سوال کا حقیقی اور مدلل جواب پائیں گے۔

الاسلام اور ظہور اسلام (مؤلفہ مولانا وحید الدین خاں) کے بعد احیاء اسلام کا مطالعہ آپ کے لئے نہایت ضروری ہے۔

الاسلام	عصری اسلوب میں قرآن و حدیث کی تشریح
ظہور اسلام	عصری علوم اور تاریخ کی روشنی میں اسلام کا مطالعہ
احیاء اسلام	اسلام اور عہد حاضر کا مطالعہ۔ اور مستقبل کا پروگرام

قیمت بارہ روپے

مکتبہ الرسالہ
جمعیۃ بلڈنگ ـ قاسم جان اسٹریٹ ـ دہلی ۱۱۰۰۰۶

تذکیر القرآن

جلد اوّل

سورۃ فاتحہ ۔ سورۃ توبہ

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت
کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی
مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی تفصیلات اور غیر متعلق معلومات کو چھوڑتے ہوئے
س میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے تذکیری پہلو
و نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام وخواص دونوں کے لئے یکساں طور پر مفید ہے۔
ہ طالبین قرآن کے لئے فہم قرآن کی کنجی ہے۔

ہدیہ مجلد: پچاس روپے

مکتبہ الرسالہ

جمعیۃ بلڈنگ ـ قاسم جان اسٹریٹ ـ دہلی ۱۱۰۰۰۶

ایجنسی : ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دلچسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ یک وقت سال بھر کا زرتعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت ——— الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کرکے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا۔ بشرطیکہ پرچے خراب نہ ہوئے ہوں۔

دوسری صورت ——— الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ ۱۳۵ روپے یا ماہانہ ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی سے شائع کیا

Regd. R.N. No. 28822/76
Regd. D(DN) No. 532

December 19[illegible]
Issue No. 7[illegible]

AL-RISALA MONTHLY

Jamiat Building, Qasimjan Street, Delhi - 110 006 (India)
Telephone : 232231, 526851